زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

لاہور

غزل نمبر

(ترمیم و اضافہ کے ساتھ)

فروری ۱۹۶۰ء

LIBRARY
JAMIA

قیمت فی جلد
35.00
روپے

مرتبہ

محمد طفیل

(طبع ثالث)

سالانہ قیمت
۴ روپے

ادارہ فروغِ اردو ، لاہور

Revised Price Rs. 35/-

ترتیب

57863
11-10-1976

اساتذۂ غزل

۱ - ولی دکنی محمد ولی اللہ ، ۱۷
۲ - میر میر تقی میر ، ۲۲
۳ - سودا محمد رفیع ، ۲۷
۴ - درد خواجہ میر درد ، ۳۲
۵ - مصحفی شیخ غلام ہمدانی ، ۳۷
۶ - حسن میر غلام حسن ، ۴۲
۷ - جرأت شیخ قلندر بخش ، ۴۷
۸ - انشاء سید انشاء اللہ خاں ، ۵۲
۹ - نظیر سید ولی محمد اکبر آبادی ، ۵۷
۱۰ - غالب اسد اللہ خاں غالب ، ۶۲
۱۱ - مومن حکیم محمد مومن خاں ، ۶۷
۱۲ - ذوق شیخ محمد ابراہیم ذوق ، ۷۲
۱۳ - ظفر ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ ، ۷۷
۱۴ - شیفتہ نواب محمد مصطفیٰ خاں ، ۸۲
۱۵ - ناسخ شیخ امام بخش ، ۸۷
۱۶ - آتش خواجہ حیدر علی ، ۹۲
۱۷ - امیر منشی امیر احمد مینائی ، ۹۷
۱۸ - داغ نواب مرزا خاں ، ۱۰۲
۱۹ - حالی خواجہ الطاف حسین ، ۱۰۷
۲۰ - اکبر سید اکبر حسین الہ آبادی ، ۱۱۲
۲۱ - شاد سید علی محمد عظیم آبادی ، ۱۱۷
۲۲ - ریاض ریاض احمد خیر آبادی ، ۱۲۲
۲۳ - آزاد حکیم الطاف احمد انصاری ، ۱۲۷
۲۴ - آرزو سید افواد حسین لکھنوی ، ۱۳۲
۲۵ - اقبال ڈاکٹر محمد اقبال ، ۱۳۷
۲۶ - حسرت سید فیض الحسن موہانی ، ۱۴۲
۲۷ - اصغر سید اصغر حسین گونڈوی ، ۱۴۸
۲۸ - فانی شوکت علی بدایونی ، ۱۵۳
۲۹ - مجگر علی سکندر مراد آبادی ، ۱۵۸
۳۰ - جوش شبیر حسن خلیق آبادی ، ۱۶۳
۳۱ - فراق رگھوپتی سہائے ، ۱۶۸
۳۲ - حفیظ عبد الحفیظ جالندھری ، ۱۷۳
۳۳ - یگانہ سید واجد حسین عظیم آبادی ، ۱۷۸
۳۴ - سیماب سید عاشق حسین اکبر آبادی ، ۱۸۳
۳۵ - اثر جعفر علی خاں لکھنوی ، ۱۸۸

اساتذۂ غزل (۲)

۳۶ - سراج دکنی ، میر سراج الدین ، ۱۹۵
۳۷ - آبرو شاہ مبارک ، ۱۹۶
۳۸ - حاتم شیخ ظہور الدین عرف شاہ حاتم ، ۱۹۷
۳۹ - فغاں اشرف علی خاں ، ۱۹۸
۴۰ - مظہر میرزا مظہر جان جاناں ، ۱۹۹
۴۱ - سوز سید محمد میر ، ۲۰۰
۴۲ - قائم محمد قیام الدین ، ۲۰۱
۴۳ - یقین انعام اللہ خاں ، ۲۰۲
۴۴ - بیان خواجہ احسن اللہ ، ۲۰۳
۴۵ - ہدایت ہدایت اللہ خاں ، ۲۰۴
۴۶ - بیدار میر محمدی ، ۲۰۵
۴۷ - تاباں میر عبد الحی ، ۲۰۶
۴۸ - اثر سید محمد میر ، ۲۰۷
۴۹ - حسرت جعفر علی ، ۲۰۸
۵۰ - رنگین سعادت یار خاں ، ۲۰۹
۵۱ - نصیر شاہ نصیر الدین عرف میاں کلو
۵۲ - محسن میر نظام الدین

۵۳ ۔ شہید ۔ کرامت علی ، ۲۱۲
۵۴ ۔ وزیر ۔ خواجہ محمد وزیر لکھنوی ، ۲۱۳
۵۵ ۔ صبا ۔ میر وزیر علی ، ۲۱۴
۵۶ ۔ نسیم ۔ پنڈت دیا شنکر ، ۲۱۵
۵۷ ۔ رند ۔ نواب سید محمد خاں ، ۲۱۶
۵۸ ۔ نسیم ۔ نواب اصغر علی خاں ، ۲۱۷
۵۹ ۔ ظہیر ۔ ظہیر الدین ، ۲۱۸
۶۰ ۔ سالک ۔ مرزا قربان علی بیگ ، ۲۱۹
۶۱ ۔ مجروح ۔ میر مہدی ، ۲۹۲
۶۲ ۔ جلال ۔ حکیم سید محمد ضامن علی لکھنوی ، ۲۲۱
۶۳ ۔ تسلیم ۔ شیخ امیر اللہ ، ۲۲۲
۶۴ ۔ صابر ۔ مرزا قادر بخش ، ۲۲۳
۶۵ ۔ نظام ۔ سید نظام شاہ رامپوری ، ۲۲۴
۶۶ ۔ بیان ۔ یزدانی سید مرتضیٰ کیرمٹی ، ۲۲۵
۶۷ ۔ حفیظ ۔ محمد علی جونپوری ، ۲۲۶
۶۸ ۔ بیخود ۔ عبدالعلی بدایونی ، ۲۲۷
۶۹ ۔ چکبست ۔ برج نرائن ، ۲۲۸
۷۰ ۔ قلم ۔ طباطبائی ، سید علی حیدر ، ۲۲۹
۷۱ ۔ سلیم ۔ وحید الدین ، ۲۳۰
۷۲ ۔ خوشتر ۔ سید کاظم علی بلگرامی ، ۲۳۱
۷۳ ۔ محشر ۔ مرزا کاظم حسین ، ۲۳۲
۷۴ ۔ منصور ۔ سید افتخار حسین خیر آبادی ، ۲۳۳
۷۵ ۔ شبلی ۔ مولوی شبلی نعمانی ، ۲۳۴
۷۶ ۔ حسن ۔ حسن رضا خاں ، بریلوی ، ۲۳۵
۷۷ ۔ نسیم ۔ حسین نسیم جونپوری ، ۲۳۶
۷۸ ۔ بیخود ۔ سید وحید الدین دہلوی ، ۲۳۷
۷۹ ۔ ساحر ۔ پنڈت امرناتھ ، ۸
۸۰ ۔ سائل ۔ نواب سراج الدین احمد خاں ، ۲۳۹
۸۱ ۔ شاعر ۔ آغا ظفر علی بیگ قزلباش ، ۲۴۰
۸۲ ۔ صفی ۔ سید علی نقی ، ۲۴۱
۸۳ ۔ ثاقب ۔ ذاکر حسین لکھنوی ، ۲۴۲
۸۴ ۔ ناطق لکھنوی ، حکیم سعید احمد ، ۲۴۳
۸۵ ۔ ناطق گلاوٹھوی ، ۲۴۴
۸۶ ۔ عزیز ۔ مرزا محمد ہادی ، ۲۴۵
۸۷ ۔ جلیل ۔ سید جلیل حسن مانک پوری ، ۲۴۶
۸۸ ۔ احسن ۔ حافظ علی احسن مارہروی ، ۲۴۷
۸۹ ۔ نوح ۔ محمد نوح ناروی ، ۲۴۸
۹۰ ۔ کیفی ۔ برج موہن دتاتریہ ، ۲۴۹
۹۱ ۔ جوہر ۔ محمد علی ، ۲۵۰
۹۲ ۔ دل ۔ ضمیر حسن خاں شاہجہانپوری ، ۲۵۱
۹۳ ۔ بیدم ۔ بیدم شاہ وارثی ، ۲۵۲
۹۴ ۔ حشر ۔ آغا محمد شاہ کاشمیری ، ۲۵۳
۹۵ ۔ وحشت ۔ سید رضا علی کلکتوی ، ۲۵۴
۹۶ ۔ آسی ۔ عبدالباری ، ۲۵۵
۹۷ ۔ تاجور ۔ احسان اللہ نجیب آبادی ، ۲۵۶
۹۸ ۔ تپش ۔ عبداللطیف ، ۲۵۷
۹۹ ۔ ظفر تاباں ، ۲۵۸
۱۰۰ ۔ عندلیب شادانی ، ۲۵۹
۱۰۱ ۔ علی اختر حیدر آبادی ، ۲۶۰
۱۰۲ ۔ تلوک چند محروم ، ۲۶۱

غزلِ قدیم

۱۰۳ ۔ آرزو ۔ سراج الدین علی خاں ، ۲۶۵
۱۰۴ ۔ آزردہ ۔ مفتی صدر الدین ، ۲۶۵
۱۰۵ ۔ آشفتہ ۔ بھورے خاں ، ۲۶۶
۱۰۶ ۔ آشفتہ ۔ مرزا رضا قلی ، ۲۶۶
۱۰۷ ۔ آصف ۔ آصف الدولہ بہادر ، ۲۶۷
۱۰۸ ۔ آفتاب ۔ شاہ عالم بادشاہ دہلی ، ۲۶۷
۱۰۹ ۔ احسان ۔ منشی احسان علی شاہجہانپوری ، ۲۶۸
۱۱۰ ۔ احسن ۔ میرزا احسن ، ۲۶۸
۱۱۱ ۔ اختر ۔ نواب واجد علی شاہ ، ۲۶۹

۱۱۲ - اثر نواب سید امداد امام ، ۲۶۹
۱۱۳ - ارشد میرزا امجد علی گورگانی ، ۲۷۰
۱۱۴ - اسد میرامانی ، ۲۷۰
۱۱۵ - اسمٰعیل مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی ، ۲۷۱
۱۱۶ - اسیر مظفر علی ، ۲۷۱
۱۱۷ - افسوس میر شیر علی ، ۲۷۲
۱۱۸ - اشتیاق ولی اللہ سرمندی ، ۲۷۲
۱۱۹ - الم صاحب میر ، ۲۷۳
۱۲۰ - امانت سید آغا حسن لکھنوی ، ۲۷۳
۱۲۱ - امانی میرامانی ، ۲۷۴
۱۲۲ - امید قزلباش خاں ، ۲۷۴
۱۲۳ - امیر نواب محمد یار خاں ، ۲۷۵
۱۲۴ - امین خواجہ امین الدین ، ۲۷۵
۱۲۵ - انجام عمدۃ الملک امیر خاں ، ۲۷۶
۱۲۶ - انس لکھنوی ، میر ببر علی ، ۲۷۶
۱۲۷ - بحر شیخ امداد علی ، ۲۷۷
۱۲۸ - برق لکھنوی ، میرزا محمد رضا ، ۲۷۷
۱۲۹ - بسمل سید امین الحسن موہانی ، ۲۷۸
۱۳۰ - بقا شیخ بقاء اللہ ، ۲۷۸
۱۳۱ - بہار گلشن الدولہ ، ۲۷۹
۱۳۲ - بیباک سید حسین احمد شاہجہانپوری ، ۲۷۹
۱۳۳ - بیتاب عظیم آبادی ، ۲۸۰
۱۳۴ - تجلی میاں حاجی ، ۲۸۰
۱۳۵ - تسکین میر حسین ، ۲۸۱
۱۳۶ - تسلی لالہ ٹیکا رام ، ۲۸۱
۱۳۷ - تشنہ محمد علی ، ۲۸۲
۱۳۸ - تنہا محمد عیسیٰ ، ۲۸۲
۱۳۹ - ثاقب نواب شہاب الدین خاں ، ۲۸۳
۱۴۰ - جوان مرزا نعیم بیگ ، ۲۸۳
۱۴۱ - جوشش شیخ محمد روشن ، ۲۸۴
۱۴۲ - حزیں میر محمد باقر ، ۲۸۴
۱۴۳ - حسامی مرزا حسام الدین حیدر ، ۲۸۵
۱۴۴ - حسین سید صادق علی ، ۲۸۵
۱۴۵ - حیا مرزا رحیم الدین ، ۲۸۶
۱۴۶ - حیران میر حیدر علی ، ۲۸۶
۱۴۷ - خاکسار محمد یار ، ۲۸۷
۱۴۸ - خلیق میر متقن ، ۲۸۷
۱۴۹ - دلیر سید امیر حسین بارہروی ، ۲۸۸
۱۵۰ - دیوانہ رائے سرب سکھ ، ۲۸۸
۱۵۱ - راسخ حافظ عبدالرحمٰن ، ۲۸۹
۱۵۲ - راقم خواجہ قمرالدین ، ۲۸۹
۱۵۳ - رخشاں نواب ضیاء الدین خاں ، ۲۹۰
۱۵۴ - رسا رامپوری ، ۲۹۰
۱۵۵ - رشک میر علی اوسط ، ۲۹۱
۱۵۶ - رشکی نواب محمد علی خاں ، ۲۹۱
۱۵۷ - زکی نواب محمد زکریا خاں ، ۲۹۲
۱۵۸ - سجاد میر سجاد اکبرآبادی ، ۲۹۲
۱۵۹ - سحر بھوپالی ، ۲۹۳
۱۶۰ - سلیمان نواب سلیمان شکوہ ، ۲۹۳
۱۶۱ - شاد مہاراجہ سرکشن پرشاد ، ۲۹۴
۱۶۲ - شاد حکیم سید محمد غازی پوری ، ۲۹۴
۱۶۳ - شرر مولوی عبدالحلیم لکھنوی ، ۲۹۵
۱۶۴ - شفق عماد پوری ، ۲۹۵
۱۶۵ - شوق شیخ احمد علی قدوائی ، ۲۹۶
۱۶۶ - شیدا شیخ الملک حکیم اجمل خاں ، ۲۹۶
۱۶۷ - صبا لالہ کاجی مل ، ۲۹۷
۱۶۸ - صفیر سید فرزند احمد بلگرامی ، ۲۹۷
۱۶۹ - ضیا میر ضیاء الدین ، ۲۹۸
۱۷۰ - صنعت ، شیخ کریم الدین مرادآبادی ، ۲۹۸
۱۷۱ - طاہر فرخ آبادی ، ۲۹۹

۱۹۲ - عاجز حارث الدین خاں ، ۲۹۹
۱۹۳ - عارف حکیم شہاب جان خاں ، ۳۰۰
۱۹۴ - عبرت اکبر حسین مرزا ، ۳۰۰
۱۹۵ - قدرت شاہ قدرت اللہ ، ۳۰۱
۱۹۶ - قلق آفتاب الدولہ ۳۰۱
۱۹۷ - قدوی بریلوی ، ۳۰۲
۱۹۸ - فراق شاہ اللہ ، ۳۰۲
۱۹۹ - فقیر میر شمس الدین ، ۳۰۳
۲۰۰ - قدر سید غلام حسین بلگرامی ، ۳۰۳
۲۰۱ - عشق ۳۰۴
۲۰۲ - عظیم مرزا عظیم بیگ ۳۰۴
۲۰۳ - کمال شاہ کمال الدین ، ۳۰۵
۲۰۴ - گستاخ کرامت اللہ خاں رامپوری ، ۳۰۵
۲۰۵ - گویا نواب فقیر محمد خاں ، ۳۰۶
۲۰۶ - مائل مرزا محمد یار بیگ ، ۳۰۶
۲۰۷ - محب شیخ ولی اللہ ، ۳۰۷
۲۰۸ - محنت میرزا حسین علی ، ۳۰۷
۲۰۹ - محوی مولوی محمد حسین لکھنوی ، ۳۰۸
۲۱۰ - مرتضیٰ صغیر علی ، ۳۰۸
۲۱۱ - مضطر حکیم اسد علی خاں ، ۳۰۹
۲۱۲ - معروف مرزا الٰہی بخش ، ۳۰۹
۲۱۳ - مقتول مرزا ابراہیم بیگ ، ۳۱۰
۲۱۴ - منت میر قمرالدین ، ۳۱۰
۲۱۵ - منتظر میاں فدا الاسلام ، ۳۱۱
۲۱۶ - منیر سید اسمٰعیل حسین شکوہ آبادی ، ۳۱۱
۲۱۷ - مہر مرزا حاتم علی ، ۳۱۲
۲۱۸ - ناظم نواب محمد یوسف علی خاں والی رامپور ۳۱۲
۲۱۹ - نثار محمد امان ، ۳۱۳
۲۲۰ - ندرت شعیب احمد میرٹھی ، ۳۱۳
۲۲۱ - نظر لکھنوی ، نوبت رائے ، ۳۱۴
۲۲۲ - نوا ظہور اللہ بدایونی ، ۳۱۴
۲۲۳ - نیاز شاہ نیاز احمد بریلوی ، ۳۱۵
۲۲۴ - واقف شاہ واقف ، ۳۱۵
۲۲۵ - وحید الہ آبادی ، ۳۱۶
۲۲۶ - وفا حکیم عبدالہادی خاں رامپوری ، ۳۱۶
۲۲۷ - ولا مظفر علی خاں ، ۳۱۷
۲۲۸ - ہادی میر محمد جواد ، ۳۱۷
۲۲۹ - ہاشمی میر ہاشمی ، ۳۱۸
۲۳۰ - ہجر نواب کاظم علی خاں شاہجہانپوری ، ۳۱۸
۲۳۱ - ہوس نواب مرزا محمد تقی ، ۳۱۹

متعرفین جدید

۲۳۲ - فیض احمد فیض ، ۳۲۳
۲۳۳ - اختر شیرانی ، ۳۲۶
۲۳۴ - تاثیر ، ۳۲۹
۲۳۵ - عبدالمجید سالک ۳۳۲
۲۳۶ - عابد علی عابد ، ۳۳۵
۲۳۷ - حفیظ ہوشیارپوری ، ۳۳۸
۲۳۸ - صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ، ۳۴۱
۲۳۹ - چراغ حسن حسرت ، ۳۴۴
۲۴۰ - احسان دانش ، ۳۴۷
۲۴۱ - ساغر نظامی ، ۳۵۰
۲۴۲ - اختر انصاری ، ۳۵۳
۲۴۳ - شاد عارفی ، ۳۵۶
۲۴۴ - نہال سیوہاروی ، ۳۵۹
۲۴۵ - اسرار الحق مجاز ، ۳۶۲
۲۴۶ - معین احسن جذبی ، ۳۶۵
۲۴۷ - احمد ندیم قاسمی ، ۳۶۸
۲۴۸ - عبدالحمید عدم ، ۳۷۱
۲۴۹ - سیف الدین سیف ، ۳۷۴
۲۵۰ - ظہیر کاشمیری ، ۳۷۷

۲۳۱ – فیض شنجانی ، ۳۸۰
۲۳۲ – ساحر لدھیانوی ، ۳۸۳
۲۳۳ – عروج سلطان پوری ، ۳۸۶
۲۳۴ – شکیل بدایونی ، ۳۸۹
۲۳۵ – فضل احمد کریم فضلی ، ۳۹۲
۲۳۶ – ناصر کاظمی ، ۳۹۵
۲۳۷ – ابن انشا ، ۳۹۸
متغزلین جدید (۲)
۲۳۸ – آنند نرائن ملا ، ۴۰۳
۲۳۹ – روش صدیقی ، ۴۰۴
۲۴۰ – پراجی ، ۴۰۵
۲۴۱ – جوش ملسیانی ، ۴۰۶
۲۴۲ – جلال الدین اکبر ، ۴۰۰
۲۴۳ – آل احمد سرور ، ۴۰۸
۲۴۴ – اہر القادری ، ۴۰۹
۲۴۵ – سراج الدین ظفر ، ۴۱۰
۲۴۶ – مختار صدیقی ، ۴۱۱
۲۴۷ – یوسف ظفر ، ۴۱۲
۲۴۸ – انجم رومانی ، ۴۱۳
۲۴۹ – قیوم نظر ، ۴۱۴
۲۵۰ – عبدالمجید حیرت ، ۴۱۵
۲۵۱ – سکندر علی وجد ، ۴۱۶
۲۵۲ – ادیب سہارنپوری ، ۴۱۷
۲۵۳ – ذوالفقار علی بخاری ، ۴۱۸
۲۵۴ – غلام ربانی تاباں ، ۴۱۹
۲۵۵ – راز مرادآبادی ، ۴۲۰
۲۵۶ – مجید امجد ، ۴۲۱
۲۵۷ – شان الحق حقی ، ۴۲۲
۲۵۸ – باقی صدیقی ، ۴۲۳
۲۵۹ – جگن ناتھ آزاد ، ۴۲۴
۲۶۰ – عرش ملسیانی ، ۴۲۵
۲۶۱ – ظہور نظر ، ۴۲۶
۲۶۲ – ضیا جالندھری ، ۴۲۷
۲۶۳ – احمد ریاض ، ۴۲۸
۲۶۴ – احمد راہی ، ۴۲۹
۲۶۵ – عارف عبدالمتین ، ۴۳۰
۲۶۶ – شہرت بخاری ، ۴۳۱
۲۶۷ – شہزاد احمد شہزاد ، ۴۳۲
۲۶۸ – سلام مچھلی شہری ، ۴۳۳
۲۶۹ – شاعر لکھنوی ، ۴۳۴
۲۷۰ – جعفر طاہر ، ۴۳۵
۲۷۱ – حبیب الشعر ، ۴۳۶
۲۷۲ – کلیم احسن کلیم ، ۴۳۷
۲۷۳ – سلیم احمد ، ۴۳۸
۲۷۴ – فوز گلوری ، ۴۳۹
۲۷۵ – اصغر سلیم ، ۴۴۰
۲۷۶ – ساغر صدیقی ، ۴۴۱
۲۷۷ – عظیم مرتضیٰ ، ۴۴۲
۲۷۸ – جمیل ملک ، ۴۴۳
غزل جدید
۲۷۹ – ہری چند اختر ، ۴۴۷
۲۸۰ – شعری بھوپالی ، ۴۴۷
۲۸۱ – اسد ملتانی ، ۴۴۸
۲۸۲ – کشفی ملتانی ، ۴۴۸
۲۸۳ – عشرت رحمانی ، ۴۴۹
۲۸۴ – شوکت تھانوی ، ۴۴۹
۲۸۵ – وحید قریشی ، ۴۵۰
۲۸۶ – خلیل الرحمن اعظمی ، ۴۵۰
۲۸۷ – قریش کمار شاد ، ۴۵۱
۲۸۸ – شعیب حزیں ، ۴۵۱

۲۸۹ — نخشب جارچوی، ۴۵۲
۲۹۰ — ہاشم جان کیف، ۴۵۲
۲۹۱ — حمید انیم، ۴۵۳
۲۹۲ — تابش دہلوی، ۴۵۳
۲۹۳ — اختر ہوشیارپوری، ۴۵۴
۲۹۴ — اقبال صفی پوری، ۴۵۴
۲۹۵ — خاطر غزنوی، ۴۵۵
۲۹۶ — احمد فراز، ۴۵۵
۲۹۷ — فارغ بخاری، ۴۵۶
۲۹۸ — رضا ہمدانی، ۴۵۶
۲۹۹ — سلیم واحد سلیم، ۴۵۰
۳۰۰ — احمد ظفر، ۴۵۷

مینائے غزل

۳۰۱ — ماہ لقا چندا بی بی، ۴۶۱
۳۰۲ — ادا جعفری بدایونی، ۴۶۲
۳۰۳ — زہرہ نگاہ، ۴۶۳
۳۰۴ — اختر نواب اختر محل، ۴۶۴
۳۰۵ — شیریں نواب شاہ جہان بیگم، ۴۶۴
۳۰۶ — نزاکت، ۴۶۵
۳۰۷ — عالم نواب بادشاہ محل، ۴۶۵
۳۰۸ — مشتری قمر جان لکھنوی، ۴۶۶
۳۰۹ — زہرہ امراؤ جان لکھنوی، ۴۶۶
۳۱۰ — نازک زینت بیگم، ۴۶۷
۳۱۱ — موتی موتی جان، ۴۶۷
۳۱۲ — شیریں، ۴۶۸

اختتامیہ

۳۱۳ — لطیف محمدی جان صاحبہ، ۴۶۸
۳۱۴ — شباب حسین باندی بنارسی، ۴۶۹
۳۱۵ — ولیر امراؤ جان، ۴۶۹
۳۱۶ — نور جہاں ناز، ۴۷۰
۳۱۷ — شوخ شہزادی جان اکبرآبادی، ۴۷۰
۳۱۸ — محمد حسین آزاد، ۴۷۳
۳۱۹ — آسی غازی پوری، ۴۷۳
۳۲۰ — مرزا ہادی رسوا، ۴۷۴
۳۲۱ — رشح عظیم آبادی، ۴۷۵
۳۲۱ — بے نظیر شاہ، ۴۷۵
۳۲۲ — ناصحی صادق اخگر، ۴۷۶
۳۲۳ — مائل دہلوی، ۴۷۶
۳۲۱ — نظم اکبرآبادی، ۴۷۶
۳۲۵ — [illegible] زاں مہر، ۴۷۷
۳۲۶ — تاجب کاکوری، ۴۷۷
۳۲۷ — امجد حیدر آبادی، ۴۷۸
۳۲۸ — جگر بریلوی، ۴۷۸
۳۲۹ — قمر بدایونی، ۴۷۹
۳۳۰ — امید امیٹھوی، ۴۷۹
۳۳۱ — نواری لال مشعل، ۴۸۰
۳۳۲ — وحشی شاہجہانپوری، ۴۸۰
۳۳۳ — برق دہلوی، ۴۸۱
۳۳۴ — کیفی چریاکوٹی، ۴۸۱
۳۳۵ — اقبال احمد سہیل، ۴۸۲
۳۳۶ — اکبر حیدری، ۴۸۲
۳۳۷ — فانی جائسی، ۴۸۳
۳۳۸ — جگت موہن لال رواں، ۴۸۳
۳۳۹ — اطہر ہاپوڑی، ۴۸۴
۳۴۰ — بتاب عظیم آبادی، ۴۸۴
۳۴۱ — سید اختر علی تلہری، ۴۸۵
۳۴۲ — حیرت بدایونی، ۴۸۵
۳۴۳ — نشتر جالندھری، ۴۸۶
۳۴۴ — بحم آفندی، ۴۸۶
۳۴۵ — محسن گورکھپوری، ۴۸۷
۳۴۶ — میکش اکبرآبادی، ۴۸۷

۳۴۷ - بیزار لکھنوی ، ۴۸۷
۳۴۸ - جلیل قدوائی ، ۴۸۸
۳۴۹ - اثر صہبائی ، ۴۸۹
۳۵۰ - امین حزیں ، ۴۸۹
۳۵۱ - عبدالمجید بھٹی ، ۴۹۰
۳۵۲ - واثق جونپوری ، ۴۹۰
۳۵۳ - ن۔م۔ راشد ، ۴۹۱
۳۵۴ - جمیل مظہری ، ۴۹۱
۳۵۵ - یاس نگار اختر ، ۴۹۲
۳۵۶ - علی سردار جعفری ، ۴۹۲
۳۵۷ - محمود جالندھری ، ۴۹۳
۳۵۸ - ڈاکٹر مسعود حسن ، ۴۹۳
۳۵۹ - خلیم قریشی ، ۴۹۴
۳۶۰ - حامد عزیز مدنی ، ۴۹۴
۳۶۱ - نشور ملیک ، ۴۹۵
۳۶۲ - صدق حاسی ، ۴۹۵
۳۶۳ - خمار بارہ بنکوی ، ۴۹۶
۳۶۴ - نشور واحدی ، ۴۹۶

(۲)

۳۶۵ - یگانہ مصطفیٰ قلی خاں ، ۴۹۷
۳۶۶ - حلیم محمد حسین ، ۴۹۷
۳۶۷ - محسن محمد محسن ، ۴۹۸
۳۶۸ - ممتاز حافظ فضلو ، ۴۹۸
۳۶۹ - مجذوب ، مرزا غلام حیدر ، ۴۹۹
۳۷۰ - ماہر فخرالدین خاں ، ۴۹۹
۳۷۱ - غضنفر غضنفر علی خاں ، ۵۰۰
۳۷۲ - نصرت ، ۵۰۰
۳۷۳ - سحر شیخ امان علی ، ۵۰۱
۳۷۴ - قلق سید مرزا ، ۵۰۱
۳۷۵ - ذکی مہدی علی خاں ، ۵۰۲
۳۷۶ - قبول مرزا مہدی علی خاں ، ۵۰۲
۳۷۷ - سحر نواب علی خاں ، ۵۰۳
۳۷۸ - آباد مرزا مہدی حسن خاں ، ۵۰۳
۳۷۹ - ماہ مرزا عنایت علی بیگ ، ۵۰۴
۳۸۰ - خلیل دوست علی ، ۵۰۴
۳۸۱ - منتہی مرزا مہتاب بیگ ، ۵۰۵
۳۸۲ - اعظم مرزا اعظم علی ، ۵۰۵
۳۸۳ - اشرف سید سادات حسین ، ۵۰۶
۳۸۴ - اسد نواب سلیمان خاں ، ۵۰۶
۳۸۵ - واسطی سید فضل رسول خاں ، ۵۰۷
۳۸۶ - جوش نواب احمد حسن خاں ، ۵۰۷
۳۸۷ - جنوں علی محمد خاں ، ۵۰۸
۳۸۸ - ہوش نواب نیاز احمد خاں ، ۵۰۸
۳۸۹ - ریحان دیا کرشن ، ۵۰۹
۳۹۰ - نخور محمد جعفر ، ۵۰۹
۳۹۱ - عیشی طالب علی خاں ، ۵۱۰
۳۹۲ - غافل منور خاں ، ۵۱۰
۳۹۳ - مسرور شیخ میر بخش ۵۱۱
۳۹۴ - اختر محمد صادق خاں ، ۵۱۱
۳۹۵ - صاحب وشیفتہ بلچی زاں ، ۵۱۲
۳۹۶ - جوشش شیخ محمد روشن ، ۵۱۲
۳۹۷ - بتاب سنتو کھ رائے ، ۵۱۳
۳۹۸ - گرفتار سنگی بیگ ، ۵۱۳
۳۹۹ - حسن خواجہ حسن ، ۵۱۴
۴۰۰ - حاموش شاہ معین الدین ، ۵۱۴
۴۰۱ - فیضی میر شمس الدین ، ۵۱۵
۴۰۲ - راقم بندرابن ، ۵۱۵
۴۰۳ - وفا نول رائے ، ۵۱۶
۴۰۴ - لطف مرزا علی ، ۵۱۶
۴۰۵ - مائل میر محدی ، ۵۱۷

۴۰۶ - عشق رکن الدین ، ۵۱۷
۴۰۷ - شاعر مہ لقا ، ۵۱۸
۴۰۸ - جوہر رادھو رام ، ۵۱۸
۴۰۹ - جوہر جواہر سنگھ ، ۵۱۹
۴۱۰ - ذاکر ذاکر علی ، ۵۱۹
۴۱۱ - سحر اقبال بہادر ، ۵۲۰
۴۱۲ - عزیز ولایت حسین ، ۵۲۰
۴۱۳ - احسن مضمونی ، مہدی حسن ، ۵۲۱
۴۱۴ - سرور [illegible] ، ۵۲۱
۴۱۵ - تشنہ حافظ [illegible] ، ۵۲۲
۴۱۶ - شوق جگموہن ناتھ ، ۵۲۲
۴۱۷ - طالب لطافت علی ، ۵۲۳
۴۱۸ - [illegible] محمد وزیر علی ، ۸۲۳
۴۱۹ - [illegible] ۵۲
۴۲۰ - کھلی رضی الدین حسن ، ۵۲۴
۴۲۱ - آسی [illegible] ۵۲۵
۴۲۲ - [illegible] ہرمراد شاہ ، ۵۲۵
۴۲۳ - وسیم محمد عسکری ، ۵۲۶
۴۲۴ - کامل علی میاں ، ۵۲۶
۴۲۵ - جگر بسوانی ، ۵۲۷
۴۲۶ - [illegible] بسوانی ، ۵۲۷
۴۲۷ - ہمدم حکیم فیروز الدین ۵۲۸
۴۲۸ - حالب بشارت علی ۵۲۸
۴۲۹ - [illegible] محمد دین ، ۵۲۹
۴۳۰ - حامی پیروز یزدانی ، ۵۲۹
۴۳۱ - نیرنگ میر غلام کھیک ، ۵۳۰
۴۳۲ - ازل عبدالمجید ، ۵۳۰
۴۳۳ - شوق ظہیر حسن ، ۵۳۱
۴۳۴ - ناظم میر ناظر حسین ، ۵۳۱
۴۳۵ - حیرت امداد حسین خاں ، ۵۳۲
۴۳۶ - سجاد سجاد علی ، ۵۳۲
۴۳۷ - شیدا رام رچھپال سنگھ ، ۵۳۳
۴۳۸ - شمس سیتانی ، عبدالرحمن ، ۵۳۳
۴۳۹ - اشک واجد علی خاں ، ۵۳۴
۴۴۰ - اطہر [illegible] ، ۵۳۴
۴۴۱ - زاہد عابد حسین ، ۵۳۵
۴۴۲ - عیش [illegible] خاں ، ۵۳۵
۴۴۴ - نیر واسطی ، حکیم سید علی احمد ، ۵۳۶
۴۴۵ - عبرت محمد تبارک علی ، ۵۳۶
۴۴۶ - ہادی پھل نہری ، ۵۳۷
۴۴۷ - [illegible] ۵۳۷
۴۴۸ - رفا پنڈت میلا رام ، ۵۳۸
۴۴۹ - نظیر [illegible] ۵۳۸
۴۵۰ - طالب بدایونی ، ۵۳۹
۴۵۱ - ثاقب محمد صدیق ، ۵۳۹
۴۵۲ - حرماں فرید احمد ، ۵۴۰
۴۵۳ - حاصی کرمانی ، ۵۴۰
۴۵۴ - لطیف انور گورداسپوری ، ۵۴۱
۴۵۵ - منظور چودھری منظور احمد ، ۵۴۱
۴۵۶ - پیام محمد [illegible] ، ۵۴۲
۴۵۷ - [illegible] نیازی ، محمد حیات خاں ، ۵۴۲
۴۵۸ - کسری منہاس ، غلام حسن ، ۵۴۳
۴۵۹ - تبسم عبدالرشید ، ۵۴۳
۴۶۰ - ضیا جعفری ، سید عنایت علی شاہ ، ۵۴۴
۴۶۱ - ولی شاہ ولی الرحمن ، ۵۴۴
۴۶۳ - اختر اختر رضوی ، سید اختر احمد ، ۵۴۵
۴۶۴ - جگر شاہ نصیر الدین ، ۵۴۵
۴۶۵ - تمنا [illegible] الدین حبیبی
۴۶۶ - وفا محمود عالم ، ۵۴۶
۴۶۷ - شمس مینری ، حافظ شمس الدین ، ۵۴۷
۴۶۸ - بیدل عبدالمنان ، ۵۴۷

۴۶۹ — میر نیازی ، ۵۴۸۰
۴۷۰ — نشتر سنڈر ، ۵۴۸

حصۂ نثر

اردو غزل اور متغزلین
(صنفِ غزل کے بارے میں نقادانِ فن کا اظہارِ خیال)

۱ — حالی ، ۵۵۰
۲ — عبدالسلام ندوی ، ۵۷۵
۳ — حامد حسن قادری ، ۵۷۹
۴ — ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ، ۵۸۲
۵ — نیاز فتحپوری ، ۵۸۳
۶ — ڈاکٹر یوسف حسین خاں ، ۵۸۴
۷ — ڈاکٹر سید عبداللہ ، ۵۸۵
۸ — علیم الدین احمد ، ۵۸۶
۹ — سید اعجاز حسین ، ۵۹۳
۱۰ — آل احمد سرور ، ۵۹۵
۱۱ — عبادت بریلوی ، ۵۹۸
۱۲ — سید وقار عظیم ، ۵۹۹
۱۳ — ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، ۶۰۲
۱۴ — سید باقر حسین ، ۶۰۴
۱۵ — فیض احمد فیض ، ۶۰۶
۱۶ — سردار جعفری ، ۶۰۶

(۲)
(تذکرہ نویسوں کی آرا
ممتاز شعرا کے بارے میں)

۱۷ — شمس الدین ولی ، ۶۰۸
۱۸ — میر سراج الدین سراج دکنی ، ۶۰۸
۱۹ — میاں نجم الدین شاہ مبارک آبرو ، ۶۰۹
۲۰ — ظہور الدین شاہ حاتم ، ۶۱۰
۲۱ — اشرف علی خاں فغاں ، ۶۱۰
۲۲ — میر تقی میر ، ۶۱۰
۲۳ — مرزا محمد رفیع سودا ، ۶۱۱
۲۴ — خواجہ میر درد ، ۶۱۲
۲۵ — مظہر جان جاں ، ۶۱۲
۲۶ — سید محمد میر سوز ، ۶۱۳
۲۷ — شیخ قیام الدین قائم ، ۶۱۳
۲۸ — انعام اللہ خاں یقین ، ۶۱۴
۲۹ — میر محمدی بیدار ، ۶۱۴
۳۰ — میر عبدالحی تاباں ، ۶۱۴
۳۱ — سید محمد میر اثر ، ۶۱۵
۳۲ — رنگین ، ۶۱۵
۳۳ — مصحفی ، ۶۱۵
۳۴ — میر غلام حسن حسن ، ۶۱۶
۳۵ — شیخ مکند رنجش جرأت ، ۶۱۶
۳۶ — انشاء اللہ خاں انشا ، ۶۱۷
۳۷ — نظیر اکبر آبادی ، ۶۱۷
۳۸ — نصیر ، ۶۱۷
۳۹ — میر نظام الدین ممنون ، ۶۱۸
۴۰ — اسد اللہ خاں غالب ، ۶۱۸
۴۱ — مومن ، ۶۱۹
۴۲ — ذوق ، ۶۱۹
۴۳ — بہادر شاہ ظفر ، ۶۲۰
۴۴ — نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ ، ۶۲۰
۴۵ — ناسخ ، ۶۲۰
۴۶ — آتش ، ۶۲۱
۴۷ — شہیدی ، ۶۲۱
۴۸ — مرزا قربان علی سالک ، ۶۲۱

۴۹ — میر حمدی مجروح ، ۶۲۱
۵۰ — میر حسین مسکین ، ۶۲۲
۵۱ — نواب مرزا خاں داغ ، ۶۲۲
۵۲ — منشی امیر احمد امیر ، ۶۲۲
۵۳ — خواجہ الطاف حسین حالی ، ۶۲۲
۵۴ — حکیم ضامن علی جلال ، ۶۲۲
۵۵ — شیخ امیر اللہ تسلیم ، ۶۲۲
۵۶ — سید اکبر حسین اکبر ، ۶۲۳
۵۷ — شاد عظیم آبادی ، ۶۲۳
۵۸ — ریاض خیرآبادی ، ۶۲۳
۵۹ — آرزو لکھنوی ، ۶۲۴
۶۰ — اقبال ، ۶۲۴
۶۱ — حسرت موہانی ، ۶۲۵
۶۲ — اصغر گونڈوی ، ۶۲۵
۶۳ — فانی بدایونی ، ۶۲۶
۶۴ — جگر مرادآبادی ، ۶۲۶
۶۵ — جوش ملیح آبادی ، ۶۲۷
۶۶ — فراق گورکھپوری ، ۶۲۷
۶۷ — اثر لکھنوی ، ۶۲۷
۶۸ — یاس یگانہ ، ۶۲۷
۶۹ — حفیظ جالندھری ، ۶۲۷
۷۰ — سیماب اکبرآبادی ، ۶۲۸
سمپوزیم ، ۶۲۹

اُردو غزل کا مستقبل
حصہ لینے والے :-

۱ — چراغ حسن حسرت ،
۲ — عبدالمجید سالک ،
۳ — ابواللیث صدیقی ،
۴ — وقار عظیم ،
۵ — عبادت بریلوی ،
۶ — حفیظ جالندھری ،
۷ — حامد علی خاں ،
۸ — صوفی تبسم ،
۹ — احمد ندیم قاسمی ،
۱۰ — سبط حسن ،
۱۱ — احسان دانش
۱۲ — ظہیر کاشمیری
۱۳ — حبیب اشعر ،

شعرائے متغزلین

۱ — از شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ، ۶۴۹
۲ — از محمد عبداللہ قریشی ، ۶۷۹

محمد طفیل پرنٹر پبلشر ایڈیٹر نے نقوش پریس اُردو بازار لاہور سے چھپوا کر ادارۂ فروغ اُردو لاہور سے شائع کیا

طلوع

شعروں کے انتخاب کا معاملہ ہو یا غزلوں کے انتخاب کا معاملہ، اس کا معیار ہمیشہ ذاتی پسند رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی کسی کے انتخاب سے متعمر بہ شعر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ شعری انتخابات کے سلسلے میں بعض نقادوں نے ہماری رہنمائی بھی کی اور بعضوں نے ہمیں گمراہ بھی کیا۔ یہ گمراہی اور یہ رہنمائی صرف ذاتی پسند کی بدولت ہوئی۔ جب مولانا نیاز فتح پوری مومن کو غالب سے بڑا شاعر مانتے ہیں تو ہمیں ان کی نیت پر شک نہیں کرنا چاہیے وہ بعض تمام ایسا ہی سمجھتے ہی ہوں گے۔ یہ ذکر تو الگ رہا کہ مومن کو غالب سے بڑا شاعر قرار دینا غالب ہی نہیں بلکہ خود مومن کے ساتھ بھی سنگدلی ہے۔ اسی طرح جب حسرت نے اس صدی کے تین ہی کو نیر و شمس و آرزو دے دیا ــــ ہم ایسے تمام جھگڑوں سے اپنا دامن بچانا چاہتے ہیں ہمیں تو انتخاب دوں سے صرف اسی شکایت ہے کہ ان میں سے بیشتر ٹکسالے فقیر بننے میں پوری سعادت مندی کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔ یہی سبب ہوا کہ جو بعض اچھا کہنے والے رہ گئے تو بس رہ ہی گئے۔ حالانکہ ذرا سی نگاہ نقاد کے پاس بیباکی کی پوری پوری صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ وہ اگر چاہے تو مرے ہوئے اچھے شاعروں کو زندہ کر سکتا ہے ہم میں سے بعضوں کو اتنا بھی علم نہیں ہے کہ یہ غزل ؎

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں میرا غم سے سینہ فگار ہے

غلطی کی نہیں ہے بلکہ ایک اُمّی شاعر حسامی کی ہے۔ ہم میر و غالب کو جانتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ بعض شاعر ایسے بھی تھے جنھوں نے ایسے ایسے شعر بھی کہے ہیں :-

جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے
ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے (آصف)

یوں نے آنکھوں سے لے لیا اس کو
پھول جو دستِ باغباں سے گرا (میر مستحسن خلیق)

آیا جو میکشی کو چمن میں وہ بادہ نوش
ہر ایک گل کے ہاتھ میں اک جام دے گیا (میر امانی اسد)

اس نمبر میں جتنے بڑے بڑے شعرا ہیں ان کی غزلوں پر بیشک جھوم جھوم جایئے۔ لیکن ان شعراء کو ضرور پڑھئے جن کی ایک ایک یا دو دو غزلیں پیش کی جا رہی ہیں۔ انھوں کہ اتنے مختصر وقت میں ہمیں ایسے شعرا کا زیادہ کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ ورنہ ہم اپنی تمام تر توجہ اس حصّہ پر صرف کر دیتے۔ ضرورت ہے کہ کوئی ان زندہ رہنے والے گمنام شاعروں پر کام کرے۔ جب مجھ ایسا شعر دشمن بھی اس کلام کی افادیت سے منکر نہیں ہو سکا تو اردو شاعری پر کام کرنے والے کیوں خاموش ہیں؟

ہم نے اس نمبر کی ترتیب میں کن کن امور کا خیال رکھا، اور کیسے کیسے صبر آزما مراحل سے گذرے اور کون کون سے تذکروں سے استفادہ کیا، اس کی کہانی کافی لمبی ہے۔ ہم یہاں صرف ایک امر کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہم نے زیادہ سے زیادہ موجودہ دور کے شعراء کی فنی صلاحیتوں کو آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس دھن میں اتنا آگے بڑھ گئے کہ منزل ہی پیچھے رہ گئی۔ بعض شاعروں کو ہم اس نمبر میں شامل بھی کرنا چاہتے تھے، لیکن وقت کی کوتاہی کے باعث ہماری دسترس ان کے کلام تک نہ ہو سکی اس لیے بادلِ نخواستہ انھیں چھوڑنا پڑا ——— نہ جانے ہم اتنی احتیاطوں کے باوجود کہاں تک کامیاب ہوئے؟

اس نمبر میں بعض شعرا کی دس غزلیں بھی ہیں، چھ بھی، دو بھی اور ایک بھی ——— اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ ایک غزل والا شاعر ہر حال میں چھ غزلوں والے شعرا سے کمتر گننے والا ہے۔ بلکہ بعض مجبوریاں رہی ہیں جن کی بنا پر ایسا کرنا پڑا ——— ویسے ہماری کوشش یہ ہے کہ متقدمین اور متوسطین میں سے ولی، میر، سودا، درد ایسے درجہ اوّل کے شعرا کے ساتھ دورِ متاخرین کے درجہ اوّل کے شعرا اقبال، حسرت، حفیظ اور فراق تک کو ایک ساتھ جگہ ملے تاکہ ان کا شعری مرتبہ پہچاننے کے ساتھ ساتھ اردو غزل کی ارتقائی منزلوں کا بھی سراغ مل سکے۔ اس طرح ہم نے درجہ دوم اور سوم کے مرتبہ کے شعرا کو ایک ساتھ لانا چاہا۔ یہاں یہ اعتراف کر لیا جائے تو بہتر ہوگا کہ پرانے شعرا سے اس صدبندی میں ہم سے ضرور زیادتی ہوئی ہے (ایک مجبوری تھی اس لیے کہ باوجود انتہائی کوشش کے بعض اہم شعرا کے ہمیں دواوین ہی نہیں ملے) لیکن حتی الامکان موجودہ شعرا کے ساتھ پورے دیانتدارانہ خلوص سے کام لیا گیا ہے۔

اس شمارہ کا سرورق عبدالرحمٰن چغتائی کی فنکارانہ صلاحیتوں کی ایک تابندہ مثال ہے جس کے لیے ہم ان کے شکر گذار ہیں۔

اگر اس نمبر کے سلسلہ میں حبیب اشعر، ملک اسلم، نگین احسن کلیم، محمد عبداللہ قریشی اور ڈاکٹر وحید قریشی نے میری بھرپور اعانت نہ کی ہوتی تو یہ کام مجھ اکیلے کے بس کا نہ تھا۔

محمد طفیل

۱۰ مئی ۱۹۵۴ء

(۲)

یہی حرکت بات ہے کہ جب مجھے معاملاتِ حسن و عشق کا کچھ بھی پتہ نہ تھا (پتہ تو خیر اب بھی نہیں ہے) میں نے ایک بڑی خوبصورت کاپی خریدی تھی اور اس کے پہلے صفحے پر لکھا تھا ؎

کھنچتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

بعد کے صفحات میں، وہ تمام اشعار لکھے تھے۔ جو مجھے کسی نہ کسی وجہ سے پسند آئے تھے۔ پچپنے کی عادت نے "بڑھاپے" میں بھی پیچھا نہ چھوڑا اور ۱۹۵۶ء میں میں نے غزل نمبر کے نام سے نقوش کا ایک نمبر شائع کر دیا۔ جو خلافِ امید اتنا مقبول ہوا کہ میں "حیران" رہ گیا تھا ـــــ معلوم ہوا، ابھی میری طرح کے صاحبانِ دل موجود ہیں ـــــ جی بہت خوش ہوا۔

۱۹۵۶ء میں جب میں نے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا تو اسے اور "معتبر" بنانے کے لیے غزل سے متعلق، جو کارآمد قسم کا نثر کا حصہ بھی شامل کر دیا اور ساتھ ہی جو جو کلام کے شعرا پہلے ایڈیشن میں رہ گئے تھے۔ انہیں بھی ڈھونڈھ ڈھانڈھ کا لایا۔ پہلے شمارہ کی ضخامت ۴۸۰ صفحات تھی۔ دوسرے ایڈیشن کی نوبت ۶۵۰ صفحات تک پہنچی۔ موجودہ ایڈیشن کی ضخامت ۷۵۲ صفحات ہے۔ پہلے ایڈیشن میں ۲۱۸ شعرا کا کلام درج تھا۔ دوسرے ایڈیشن میں ۳۶۶ شعرا کا اور موجودہ ایڈیشن میں ۴۷۰ شعرا کا کلام پیش کیا جا رہا ہے) غرض میں نے جس کام کو پہلے پہل ہنسی مذاق میں کیا تھا، اُسے اب پوری توجہ اور سنجیدگی سے نبھانا پڑا۔ میرے ذہنی توازن کے مطابق، اب تو یہ نمبر ایک کارِ مہم قسم کا تذکرہ ـــ اور بے شمار دوستوں کے دل کی دھڑکن بن جائے گا۔

میں نے اس نمبر کی ترتیب پھر بدل دی ہے۔ جو میرے نزدیک پہلے ایڈیشنوں سے بہرحال بہتر ہے ممکن ہے اب بھی بعض پرانی روش کے دوستوں کو یہ ترتیب بھی پسند نہ آئے۔ مگر میں کیا کروں۔ ذہنی فاصلے ہوتے ہوتے ہی کم ہوں گے ـــــ اور پھر میری دشواریاں، اسے کون جانے!

یہیں میں جو شعر اپنی کاپی کے پہلے صفحے پر لکھا تھا ـــــ اس کی صداقت آج معلوم ہوئی!

محمد طفیل

۱۵ر جنوری ۱۹۶۰ء

اساتذۂ غزل

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

اقبالؔ لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود
تجھ سے حسرتؔ نام روشن شاعری کا ہو گیا

جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

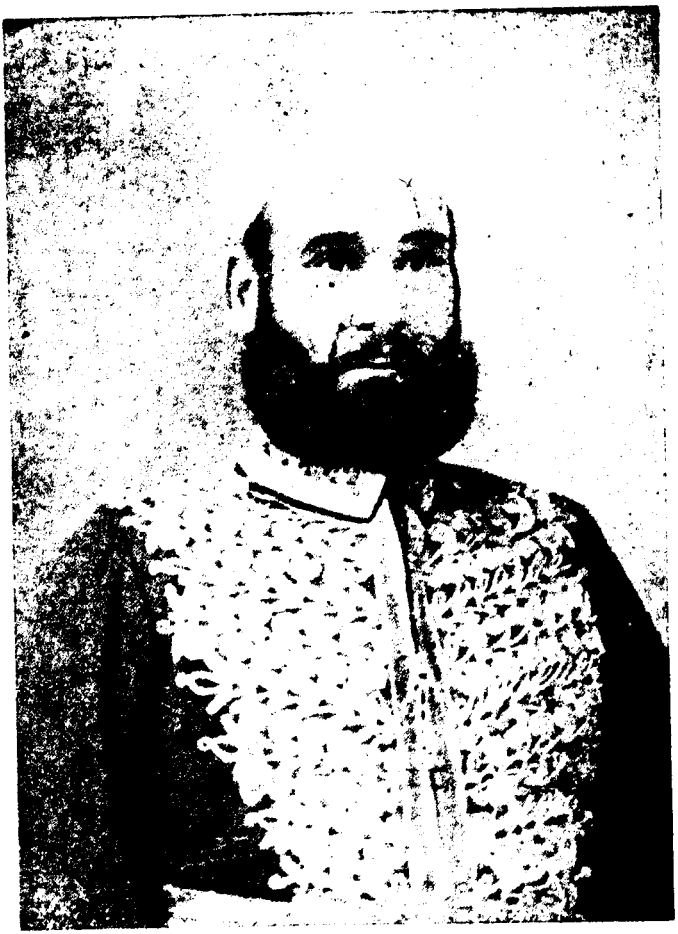

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دُھوم ہماری زباں کی ہے

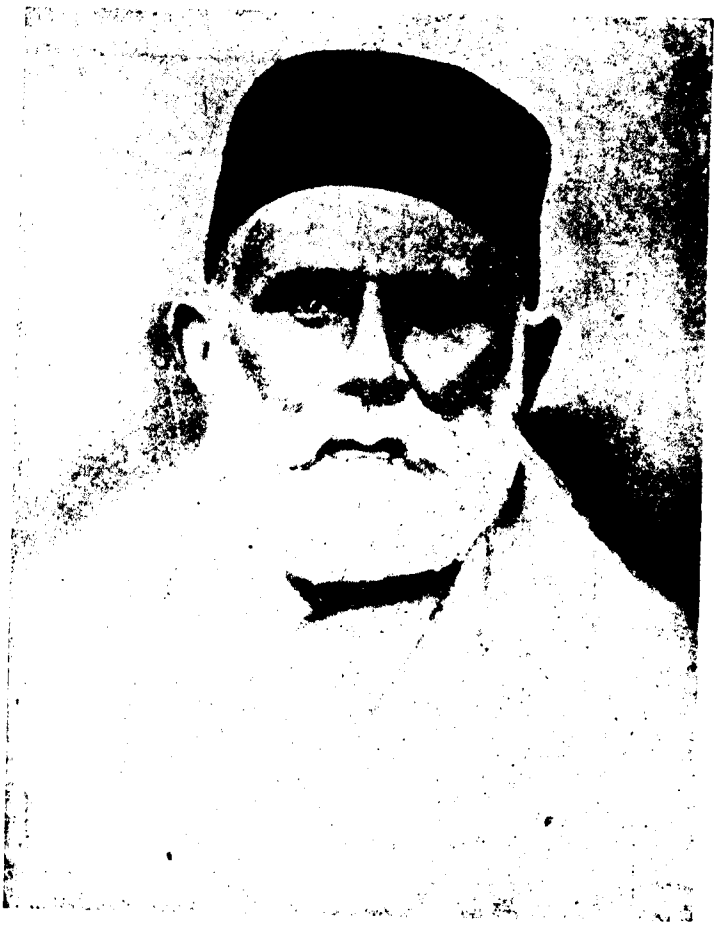

بہت جی خوش ہؤا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

ترے کلام کا جن کو مزا نہیں اے شادؔ
یقین مان کہ دل ہی نہیں گداز اُن کے

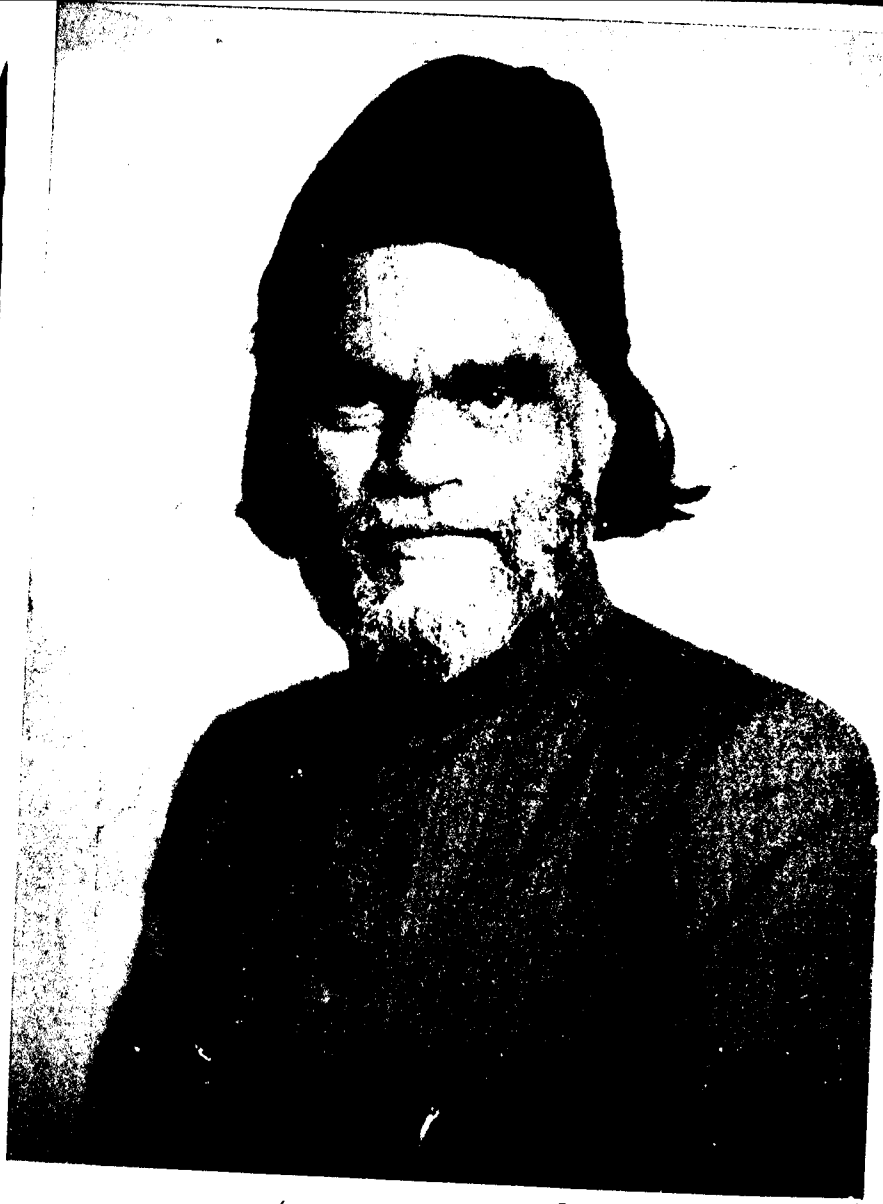

جگر! میں نے چھپایا لاکھ اپنا درد و غم لیکن
عیاں کر دی مری صورت نے سب کیفیتِ دل کی

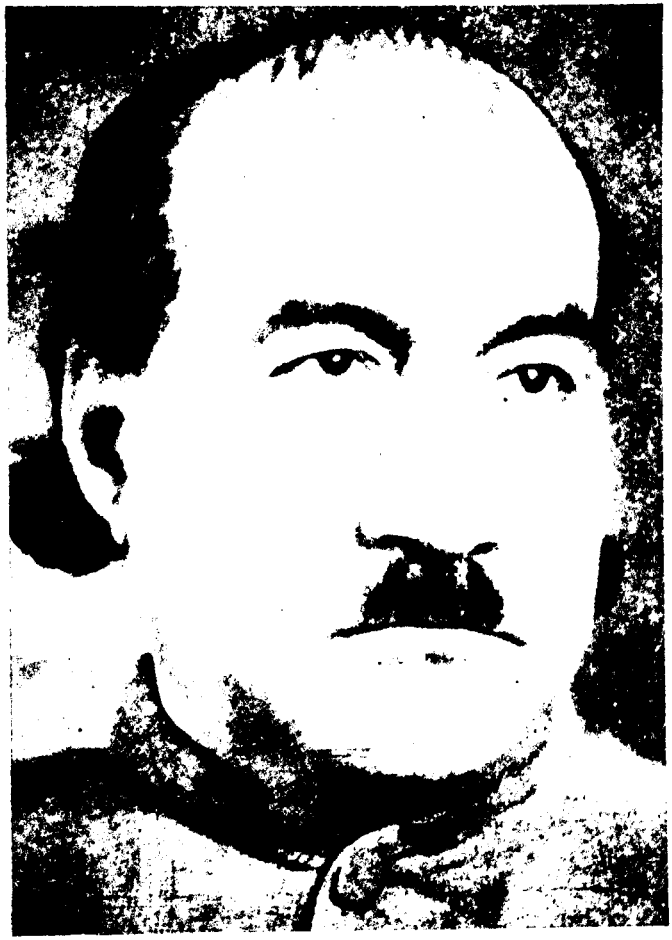

بہت جی خوش ہُوا اے ہم نشیں کل جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمُونے پائے جاتے ہیں

ہم نے بھی آج فراق کو دیکھا
سوزِ مکمل، دردِ مجسم

تشکیل و تکمیل فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا
اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خُدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

آپ بھولے تو نہ ہوں گے مجھ کو
آپ کا اخترؔ شیرانی ہوں

ولی دکنی

○

یاد کرنا ہر گھڑی اُس یار کا
ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں
تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا

عاقبت کیا ہووے گا، معلوم نئیں
دل ہُوا ہے مبتلا دیدار کا

کیا کہے تعریف دل ہے بے نظیر
حرف حرف اُس مخزنِ اسرار کا

گر ہوا ہے طالبِ آزادگی
بندہ مت ہو سبحہ و زنار کا

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

اے ولی ہونا سری جن پر نثار
مدعا ہے چشمِ گوہر بار کا

○

میں تجھے آیا ہوں ایماں بوجھ کر
باعثِ جمعیتِ جاں بوجھ کر

بلبلِ شیراز کوں کرتا ہوں یاد
حسن کوں تیرے گلستاں بوجھ کر

دل چلا ہے عشق کا ہو جو ہری
لب ترے لعلِ بدخشاں بوجھ کر

ہر نگہ کرتی ہے نظارے کی مشق
خط کو تیرے خطِ ریحاں بوجھ کر

اے سجن آیا ہوں ہو بے اختیار
تجھ کوں اپنا راحتِ جاں بوجھ کر

زلف تیری کیوں نہ کھاوے پیچ و تاب
حال مجھ دل کا پریشاں بوجھ کر

رحم کر اُس پر کہ آیا ہے ولی
درد دل کا تجھ کوں درماں بوجھ کر

○

فدائے دلبرِ رنگیں ادا ہوں
شہیدِ شاہدِ گل گوں قبا ہوں

ہر اک مہ رو کے ملنے کا نہیں ذوق
سخن کے آشنا کا آشنا ہوں

کیا ہوں ترک نرگس کا تماشا
طلب گارِ نگاہِ باحیا ہوں

نہ کہہ شمشاد کی تعریف مجھ پاس
کہ میں اُس سرو قد کا مبتلا ہوں

کیا میں عرض اس خورشید رو سوں
تو شاہِ حسن میں تیرا گدا ہوں

سدا رکھتا ہوں شوق اس کے سخن کا
ہمیشہ تشنۂ آبِ بقا ہوں

قدم پر اس کے رکھتا ہوں سدا سر
ولی ہم مشربِ رنگِ حنا ہوں

○

میں عاشقی میں تب سوں افسانہ ہو رہا ہوں
تیری نگہ کا جب سوں دیوانہ ہو رہا ہوں

اے آشنا کرم سوں یک بار آ درس دے
تجھ باج سب جہاں سوں بیگانہ ہو رہا ہوں

باتاں لگن کی مت پوچھ اے شمعِ بزمِ خوبی
مدت سوں تجھ جھلک کا پروانہ ہو رہا ہوں

شاید وہ گنج خوبی آوے کسی طرف سوں
اس واسطے سراپا ویرانہ ہو رہا ہوں

سودائے زلفِ خوباں رکھتا ہوں دل میں دائم
زنجیرِ عاشقی کا دیوانہ ہو رہا ہوں

بر جا ہے گر سنوں نئیں ناصح تری نصیحت
میں جامِ عشق پی کر مستانہ ہو رہا ہوں

کس سوں ولی اُلجھ کا احوال جا کہوں میں
سر تا قدم میں غم سوں غم خانہ ہو رہا ہوں

○

خوب رو خوب کام کرتے ہیں
یک نگہ میں غلام کرتے ہیں

دیکھ خباں کو وقت ملنے کے
کس ادا سوں سلام کرتے ہیں

کیا وفادار ہیں کہ ملنے میں
دل سوں سب رام رام کرتے ہیں

کم نگاہی سوں دیکھتے ہیں ولے
کام اپنا تمام کرتے ہیں

کھولتے ہیں جب اپنی زلفاں کو
صبح عاشق کوں شام کرتے ہیں

صاحب لفظ اس کو کہہ سکھیے
جس سوں خوباں کلام کرتے ہیں

دل لجاتے ہیں اے ولی میرا
سرو قد جب خرام کرتے ہیں

○

کیا مجھ عشق کوں ظالم نے آب آہستہ آہستہ
کہ آتش گل کوں کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ

وفاداری نے دلبر کی بجھایا آتش غم کوں
کہ گرمی دفع کرتا ہے گلاب آہستہ آہستہ

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں گل رو سوں
خطاب آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

مرے دل کوں کیا بے خود تری انکھیاں نے آخر کوں
کہ جیوں بے ہوش کرتی ہے شراب آہستہ آہستہ

ہوا تجھ عشق سوں اے آتشیں رو دل مرا پانی
کہ جیوں گلتا ہے آتش سوں گلاب آہستہ آہستہ

ادا و ناز سوں آتا ہے وہ روشن جبیں گھر سوں
کہ جیوں مشرق سوں نکلے آفتاب آہستہ آہستہ

ولی مجھ دل میں آتا ہے خیال یار بے پروا
کہ جیوں آنکھیں میں آتا ہے خواب آہستہ آہستہ

○

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اُسے زندگی کیونہ بھاری لگے

نہ چھوڑے محبت دمِ مرگ تک
جسے یار جانی سوں یاری لگے

نہ ہووے اُسے جگ میں ہرگز قرار
جسے عشق کی بے قراری لگے

ہر اک وقت مجھ عاشقِ پاک کوں
پیارے تری بات پیاری لگے

ولی کوں کہے تو اگر یک بچن
رقیباں کے دل میں کٹاری لگے

○

ترا لب دیکھ حیواں یاد آوے
ترا مکھ دیکھ کنعاں یاد آوے

ترے دو نین جب دیکھوں نظر بھر
مجھے تب نرگستاں یاد آوے

تری زلفاں کی طولانی کوں دیکھے
مجھے لیل زمستاں یاد آوے

ترے خط کا زمرد رنگ دیکھے
بہارِ سنبلستاں یاد آوے

ترے مُکھ کے چمن کے دیکھنے کوں
مجھے فردوسِ رضواں یاد آوے

تری زلفاں میں یو مُکھ جو کہ دیکھے
اُسے شمعِ شبستاں یاد آوے

جو کُئی دیکھے میری انکھیاں کو روتے
اُسے ابرِ بہاراں یاد آوے

جو میرے حال کی گردش کوں دیکھے
اُسے گردابِ گرداں یاد آوے

ولی میرا جنوں جو کئی کو دیکھے
اُسے کوہ و بیاباں یاد آوے

○

سرو و مے و گاویں ہم، اگر وہ عشوہ ساز آوے
بجاویں طبل شادی کے اگر وہ دل نواز آوے

خمارِ ہجر نے جس کے دیا ہے درد سے محکوں
رکھوں نشہ من انکھیاں میں گر وہ مست ناز آوے

جنونِ عشق میں محکوں نہیں زنجیر کی حاجت
اگر میری خبر لینے کوں وہ زلفِ دراز آوے

ادب کے اہتمام آگے نہ پاوے بار واں ہرگز
ترے سایے کی پابوسی کوں گر رنگِ ایاز آوے

عجب نئیں گر گلاں دوڑیں پکڑ کر صورتِ قمری
ادا سوں جب چمن بھیتر وہ سرو سرفراز آوے

پرستش اُس کی میرے سر پہ ہوئے سرستی لازم
صنم میرا رقیباں کے اگر ملنے سوں باز آوے

ولی اس گوہرِ کان حیا کی کیا کہوں خوبی
مرے گھر اس طرح آتا ہے جوں سینے میں راز آوے

○

صنم میرا سخن سوں آشنا ہے
مجھے فکرِ سخن کرنا بجا ہے

چمن میں وصل کے ہر جلوہ یار
گلِ رنگیں بہارِ مدعا ہے

نہ بخشے کیوں ترا خط زندگانی
کہ موجِ چشمۂ آبِ بقا ہے

تغافل نے ترے زخمی کیا مجھ
تری یہ کم نگاہی تیر سا ہے

نہیں واں آبِ غیر از آبِ خنجر
شہادت گاہِ عاشق کربلا ہے

غنیمت بوجھ ملنے کوں ولی کے
نگاہِ پاک بازاں کیمیا ہے

میر تقی میر

○

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت؟
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

ہر زخم جگر دار و رفوگر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینے کو پہکا ہے پریشاں نظری کا

صد موسم گل ہم کو تہ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھی بے بال و پری کا

اس رنگ سے جھمکے ہے پلک پر کہ کہے تو
ٹکڑا ہے ترا اشک عقیق جگری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغ سحری کا

○

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے
جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

بس اے میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

○

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دم کے جانے کا نہایت غم رہا

حسن تھا تیرا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا

دل نہ پہنچا گوشۂ دامان تک
قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا

سنتے ہیں لیلیٰ کے خیمہ کو سیاہ
اس میں مجنوں کا ولے ماتم رہا

جامۂ احرام زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نامحرم رہا

زلفیں کھولے تو تو ٹک آیا نظر
عمر بھر یاں کام دل برہم رہا

اس کے لب سے تلخ ہم سنتے رہے
اپنے حق میں آبِ حیواں سم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

صبح پیری شام ہونے آئی میرؔ
تو نہ جیتا، یاں بہت دن کم رہا

○

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت جا کے تھے صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اور گئے، پر سجدہ ہر ہر گام کیا

کس کا کعبہ کیسا قبلہ، کون حرم ہے، کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

صبح چمن میں اس کو کہیں تکلیف ہوا لے آئی تھی
رخ سے گل کو مول لیا، قامت سے سرو غلام کیا

ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیئے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو، ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

○

یا نہ یاں لعل سیہ بخشا شداراں
نہ ہوا کہ صبح ہووے شب تیرہ روزگاراں
ولی عید سب نے پہنے طرب و خوشی کے جامے
نہ ہوا کہ ہم بھی بدلیں یہ لباس سوگواراں
لیں خاک کو اس کی تو ضیا نہ دیجو جنبش
کہ بھرے ہیں اس زمیں میں جگر جگر فگاراں
رکھے تاج زر کو سر پر تہمن زمانہ میں گل
نہ شگفتہ ہو تو اسا کہ خزاں ہے یہ بہاراں
نہیں نکلو کو چشم عبرت یہ نمود میں سے ورنہ
کہ گئے ہیں خاک میں مل کئی تجھ سے تاج داراں
تو جہاں سے دل اٹھا، ہاں نہیں رسم دردمندی
کسی نے بھی یوں نہ پوچھا ہوئے خاک یاں ہزاراں
یہ رنا تھا میر کہ نے کہ فسانہ خواب لائے
تری سرگزشت سن کر گئے اور خواب یاراں

○

یارو! مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں
اب رو تو جام خالی ہی دو میں نشے میں ہوں

ایک ایک قطرہ دور میں یوں ہی مجھے بھی دو
جام شراب پُر نہ کرو، میں نشے میں ہوں

مستی سے در ہی ہے مری گفتگو کے بیچ
جو چاہو تم بھی مجھ کو کہو میں نشے میں ہوں

یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانند جام مے
یا تھوڑی دور ساتھ چلو میں نشے میں ہوں

معذور ہوں جو پاؤں مرا بے طرح پڑے
تم سرگراں تو مجھ سے نہ ہو میں نشے میں ہوں

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میر جی
جوں شیشہ میرے منہ نہ لگو میں نشے میں ہوں

○

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دلِ پُرخوں کی اک گلابی سے

جی ڈوبا جائے ہے سحر سے آہ
رات گزرے گی کس خرابی سے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

برقع اُٹھتے ہی اِک چمکا
داغ ہوں اس کی بے حجابی سے

کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

○

فقیرانہ آئے، صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
جو کچھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم — سو اس عہد کو اب وفا کر چلے
شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی — کہ مقدور تک تو دوا کر چلے
وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے — ہر اک چیز سے دل اُٹھا کر چلے
کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ — سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے
بہت آرزو تھی گلی کی تری — سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے
دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا — ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے

ق

جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی — حقِ بندگی ہم ادا کر چلے
پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے — نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے
کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میرؔ
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

○

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے

لگنے نہ دے بس ہو تو اس کے گوہر گوش کو بالے تک
اس کو فلک چشم مہ و خور کی پتلی کا تارا جانے ہے

آگے اس متکبر کے ہم خدا خدا کیا کرتے ہیں
کب موجود خدا کو وہ مغرور خود آرا جانے ہے

عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں
جی کے زیاں کو عشق میں اس کے اپنا وارا جانے ہے

چارہ گری بیماری دل کی رسم شہر حسن نہیں
ورنہ دلبر ناداں بھی اس درد کا چارا جانے ہے

کیا ہی شکار فریبی پر مغرور ہے وہ صیاد بچہ
طائر اڑتے ہوا میں سارے اپنا اتارا جانے ہے

مہر و وفا و لطف و عنایت ایک سے واقف ان میں ہے
اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارا جانے ہے

عاشق تو مردہ ہے ہمیشہ اٹھتا ہے دیکھے سے اس کے
یار کے آجانے کو یکایک عمر و وبارا جانے ہے

کیا کیا آفتیں سر پر اس کے لاتا ہے معشوق اپنا
جس بے دل بے تاب و تواں کو عشق کا مارا جانے ہے

رخنوں سے دیوار چمن کے منہ کو لے ہے چھپا یعنی
ان سوراخوں کے تئیں رہنے کو سو کا نظارا جانے ہے

تشنہ خوں ہے اپنا کتنا میر بھی ناداں تلخی کش
دم دار آب تیغ کو اس کے آب گوارا جانے ہے

○

ہستی اپنی احباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

میر اُن نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

سودا

○

ندہ رہنیں اس کی تجلی کے بیاں کا
ں شمع سا پایا ہو اگر صرف زباں کا

دے کو تعیین کے در دل سے اٹھا دے
ھلتا ہے ابھی پل میں طلسماتِ جہاں کا

لک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ!
وں شمعِ حرم رنگ جھمکتا ہے بتاں کا

س گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب چشم کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا

دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
لیکن نہیں خواہاں کوئی واں جنسِ گراں کا

ق

سودا جو کبھو گوش سے عبرت کے سنے تو
مضمون یہی ہے جرسِ دل کی فغاں کا

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

○

دل! امت ٹپک نظر سے کہ پایا نہ جائے گا
جوں اشک پھر زمیں سے اٹھایا نہ جائے گا

رخصت ہے باغباں کہ ٹک اک دیکھ لیں چمن
جاتے ہیں واں جہاں سے پھر آیا نہ جائے گا

تیغِ جفائے یار سے دل! سر نہ پھیریو
پھر منہ وفا کو ہم سے دکھایا نہ جائے گا

آوے گا وہ چمن میں نہ اے ابرِ جب تلک
پانی گلوں کے منہ سے چوایا نہ جائے گا

ق

ظالم! میں کہہ رہا کہ تو اس خوں سے درگزر
سودا کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا

دامانِ داغِ تیغ جو دھویا، تو کیا ہوا
عالم کے دل سے داغ ہٹایا نہ جائے گا

○

نہ غنچے گل کے کھلتے ہیں، نہ نرگس کی کھلیں کلیاں
چمن میں لے کے خمیازہ کسی نے انکھڑیاں ملیاں

کسی مہتاب نے دیکھا ہے تجھ خورشید تاباں کو
پھرے ہے ڈھونڈتا ہر شب جہان آباد کی گلیاں

تبسم یوں نمایاں ہے مسی آلودہ دنداں سے
نہ ہو ابر سیہ میں اس طرح بجلی کی چمپلیاں

لب و لہجہ ترا سا ہے کہیں خوبان عالم میں
غلط ہے یہ زبانوں پر کہ سب مصری کی ہیں ڈلیاں

دوانہ ہو گیا سودا تو آخر ریختہ پڑھ پڑھ
نہ میں کہتا تھا اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

○

گدا، دست اہل کرم دیکھتے ہیں
ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں

نہ دیکھا جو کچھ جام میں جم نے اپنے
سو یک قطرۂ مے میں ہم دیکھتے ہیں

یہ رخشش میں ہم کو سے بے اختیاری
تجھے تیری کھا کر قسم دیکھتے ہیں

غرض کفر سے کچھ نہ دیں سے ہے مطلب
تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں

جو بے لب جو ہیں اے باغباں ہم
چمن کو ترے کوئی دم دیکھتے ہیں

مٹا جائے ہے حرف حرف آنسوؤں سے
جو نامہ اسے کر رقم دیکھتے ہیں

اکڑ سے نہیں کام سنبل کے ہم کو
کسی زلف کا پیچ و خم دیکھتے ہیں

مگر تجھ سے رنجیدہ خاطر ہے سودا
اسے تیرے کوچے میں کم دیکھتے ہیں

○

باتیں کدھر گئیں وہ تری بھولی بھولیاں
دل لے کے بولتا ہے جواب تو یہ بولیاں

ہر بات ہے لطیفہ و ہر اک سخن ہے رمز
ہر آن ہے کنایہ و ہر دم ٹھٹھولیاں

حیرت نے اس کو بند نہ کرنے دیں پھر کبھو
آنکھیں جب آرسی نے تکے مکھ پہ کھولیاں

اندام گل پہ ہو نہ قبا اس مزے سے چاک
جوں خوش چھبوں کے تن پہ مسکتی ہیں چولیاں

کس طرح ہووے آنکھوں کی کاوش سے دل کو چین
مژگاں نہ کر سکیں تو نگاہیں چھولیاں

کیا چاہیے تجھے یہ سر انگشت پر حنا
جس بے گنہ کے خون میں چاہیں ڈبولیاں

سودا کے دل سے صاف نہ رہتی تھی زلف یار
شانے نے بیچ پڑ کے گرہ اس کی کھولیاں

○

غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں
جلوہ گہ یار مرا ورنہ کہاں ہے کہ نہیں

مہر ہر ذرہ میں مجھ کو ہی نظر آتا ہے؟
تم بھی ٹک دیکھو تو صاحب نظراں! ہے کہ نہیں

پاس ناموس مجھے عشق کا ہے اے بلبل!
ورنہ یاں کون سا انداز فغاں ہے کہ نہیں

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے پھرتا ہوں
کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

جرم ہے اس کی جفا کا کہ وفا کی تقصیر
کوئی کہو لو میاں منہ میں زباں ہے کہ نہیں

ق

پوچھا اک روز میں سودا سے کہ اے آوارہ
تیرے رہنے کا معین بھی مکاں ہے کہ نہیں

یک بیک ہو کے برآشفتہ لگا یوں کہنے
کچھ تجھے عقل سے بہرہ بھی یہاں ہے کہ نہیں

دیکھا میں قصر فریدوں کے در اوپر اک شخص
حلقہ زن ہو کے پکارا کوئی یاں ہے کہ نہیں

○

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

بیاضہ ہے مرے ساتھ خدا جانے اور نہ
کافی ہے تسلی کو مرے ایک اشارہ بھی

اے ابر بہاری ہے تجھے رونے کی ہمارے
تجھ چشم سے ٹپکا ہے کبھو لخت جگر بھی

کس مست کی موہوم پہ نازاں ہے تو اے یار
کچھ اپنے شب و روز کی ہے تجھ کو خبر بھی

تنہا ترے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش
رہتا ہے سدا چاک گریبان سحر بھی

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

○

جوں غنچہ تو چمن میں بند قبا کو کھولے
پھر گل سے اے پیارے بلبل کچھ نہ بولے

آوے گا وہ چمن میں تڑکے ہی مے کشی کو
شبنم سے کہہ رے بلبل پیمانے گلوں کے دھولے

باغ جہاں میں آکر کچھ ہم نے پھل نہ پایا
اک دل ملا کہ جس میں سو سینکڑوں پھپھولے

ایسا ہی جاؤں جاؤں کرتے ہو تو سدھارو
اس دل پہ کل جو ہونی سو آج ہی وہ ہولے

کہ بولنا ادا ہے ہر ہر سخن پہ نہ اتنا
منہ جائے چشم عاشق تو بھی وہ لب نہ کھولے

چشم پر آب ہوں میں جوں آئینہ جہاں کی
رک رک کے پڑ گئے ہیں چھاتی میں سب پھپھولے

کون ایسا اب کہے ہے سودا گلی میں اس کی
آنکھ کو لے چلیں ہم دل کھول کر تو رو لے

○

ساون کے بادلوں کی طرح سے بھرے ہوئے
یہ وہ ہیں نین جن سے کہ جنگل ہرے ہوئے

اے دل! یہ کس سے بگڑی کہ آتی ہے فوج اشک
لخت جگر کی نعش کو آگے دھرے ہوئے

انصاف اپنا سونپئے کس کو یہ جز خدا
منصف جو بولتے ہیں تو تجھ سے ڈرے ہوئے

نزدیک اپنے رہنے سے مت کر ہمیں تو منع
ہیں لاکھ کوس جب ترے دل سے پرے ہوئے

سودا نکل نہ گھر سے کہ اب تجھ کو ڈھونڈتے
لڑکے پھریں ہیں پتھروں سے دامن بھرے ہوئے

○

نسیم ہے ترے کوچے میں اور صبا بھی ہے
ہماری خاک سے دیکھو تو! کچھ رہا بھی ہے

ترا غرور، مرا عجز، تا کجا ظالم!
ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے

جلے ہے شمع سے پروانہ اور ہیں تجھ سے
کہیں ہے مہر بھی جگ میں، کہیں وفا بھی ہے

ستم روا ہے اسیروں پہ اس قدر صیاد!
چمن چمن کہیں بلبل کی اب نوا بھی ہے

سمجھ کے رکھیو قدم دشت خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

خواجہ میر درد

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن
میں جو پہنچا تو کہا: خیر! یہ مذکور نہ تھا

باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے
وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

پرورش غم کی ترے ہاں تئیں تو کی دیکھا
کوئی بھی داغ تھا سینے میں کہ ناسور نہ تھا

محتسب! آج تو میخانے میں تیرے ہاتھوں
دل نہ تھا کوئی جو شیشے کی طرح چور نہ تھا

دردؔ کے ملنے سے اے یار! برا کیوں مانا
اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجومِ یاس! جی گھبرا گیا

تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے، جز جفا
پردہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا

کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری
جی میں یہ کس کا تصور آ گیا

میں نے تو ظاہر نہ کی تھی دل کی بات
پر مری نظروں کے ڈھب سے پا گیا

پی گئی کتنوں کا تو موتیِ یاد
غم ترا کتنے کلیجے کھا گیا

مٹ گئی تھی اس کے جی سے تو جھجک
دردؔ کچھ بک بک کے تو چونکا گیا

○

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ
کہ جس کو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا

یگانہ ہے تو آہ! بیگانگی میں
کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں
ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

کیا مجھ کو داغوں نے سرو چراغاں
کبھو تو نے آ کر تماشا نہ دیکھا

تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے
ادھر تو نے لیکن نہ دیکھا نہ دیکھا

حجاب رخ یار تھے آپ ہی ہم
کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

شب و روز اے درد پڑے ہو اس کے
کسو نے جسے یاں نہ سمجھا، نہ دیکھا

○

مژگان تر ہوں یا رگ تاک بریدہ ہوں
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں، غرض آفت رسیدہ ہوں

کھینچے ہے دور آپ کو میری فروتنی
افتادہ ہوں پہ سایۂ قد کشیدہ ہوں

ہر شام مثل شام ہوں میں تیرہ روزگار
ہر صبح مثل صبح گریباں دریدہ ہوں

کرتی ہے بوئے گل تو مرے ساتھ اختلاط
پر آہ! میں تو موج نسیم وزیدہ ہوں

چاہے ہے یہ مری دل کہ بعد مرگ
کنج مزار میں بھی نہ میں آرمیدہ ہوں

اے درد جا چکا ہے مرا کام ضبط سے
میں غم زدہ تو قطرۂ اشک چکیدہ ہوں

○

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں
ہم آئینہ کے سامنے جب آکے ہو کریں

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو!
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

سرتا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم
پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں

ہر چند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں نا قبول
منہ پھیر لے وہ جس کے مجھے رو برو کریں

نے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہی اعتبار
کس بات پر چمن ہوس رنگ و بو کریں

ہے اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدانِ شہر
اے دردؔ آکے بیعتِ دستِ سبو کریں

○

سمجھنا فہم گر کچھ ہے طبیعی سے الٰہی کو
شہادت غیب کی خاطر تو حاضر ہے گواہی کو

نہیں ممکن کہ ہم سے ظلمت امکان زائل ہو
چھڑاوے آہ کوئی کیونکہ ننگی سے سیاہی کو

عجب عالم ہے یاں ادھر سے ہیں ہستی مٹاتی ہے
ادھر سے نیستی آتی ہے دوڑی عذر خواہی کو

نہ رہ جائے کہیں تو زاہد محروم رحمت سے
گنہ گاروں میں سمجھا کر یو اپنی بے گناہی کو

نہ لازم ہستی اس کو نہ ہستی ہی ضروری ہے
بیاں کیا کیجئے اے دردؔ امکن کی تباہی کو

○

ہر طرح زمانہ کے ہاتھوں سے ستم دیدہ
گر دل ہوں تو آزردۂ خاطر ہوں تو رنجیدہ

ہم گلشنِ دوراں میں اے خفتگیٔ طالع!
سرسبز تو ہیں، لیکن جوں سبزۂ خوابیدہ

اے شورِ قیامت! ارہ او دھر ہی میں کہتا ہوں
چونکے نہ ابھی یاں سے کوئی دلِ شوریدہ

اوروں سے تو ہنستے ہو نظروں سے ملا نظریں
ادھر کو نظر کوئی پھینکی بھی تو دُزدیدہ

مجھ پر بھی تو یہ عقدہ تو کھول صبا! بابے
زلفوں نے کسے بھیجا یہ نامۂ پیچیدہ

بدخواہ بھی عالم گر ہووے تو ہو، لیکن
یارب! نہ کسی کے ہوں دشمن یہ دلِ دودیدہ

کرتا ہے جگہ دل میں جوں ابروئے پیوستہ
اے درد یہ تیرا تو ہر مصرعِ چسپیدہ

○

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وحدت میں تیری، حرف دوئی کا نہ آسکے
آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے
نقشِ قدم کی طرح نہ کوئی اٹھا سکے

قاصد! نہیں یہ کام ترا، اپنی راہ لے
اُس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

غافل! خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

یارب! یہ کیا طلسم ہے اور اک دو فہم یاں
دو ڈھے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے

گو بحث کر کے بات بٹھائی پہ کیا حصول
دل سے اُٹھا خلاف، اگر تو اُٹھا سکے

اخفائے رازِ عشق نہ ہو آبِ اشک سے
یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

مستِ شرابِ عشق وہ بے خود ہے جس کو حشر
اے درد! چاہیے لائے بخود پھر، نہ لا سکے

○

قسمتِ چند اپنے ذمہ دھر چلے
جس لئے آئے تھے ہم سو کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا
ایک تم آئے ادھر اُودھر چلے

دوستو! دیکھا تماشا یاں کا بس
تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

آہ! بس جی مت جلا تب جانئے
جب کوئی افسوں ترا اس پر چلے

ایک میں دل ریش کہیں ویسا ہی دوست
زخم کتنوں کے سنا ہے بھر چلے

ڈھونڈتے مر آپ کو اس کو پرے
شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے

ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے
وہ ہی اٹھے آگیا جب بھر چلے

ہم جہاں میں آئے تھے تنہا ولے
ساتھ اپنے اب اُسے لے کر چلے

جوں شرر اے ہستیٔ بے بود یاں
بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے

ساقیا! یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

دردؔ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کدھر چلے؟

○

اہلِ فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے
لوحِ مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے

فارغ ہو بیٹھ فکر سے دونوں جہان کی
خطہ جو ہے سو آئینۂ دل پہ زنگ ہے

حیرت زدہ نہیں ہے فقط تو ہی آئینہ
یاں تک بھی جس کی آنکھ کھلی ہے سو دنگ ہے

اس ہستیٔ خراب سے کیا کام تھا ہمیں
اے نشۂ ظہور! یہ تیری ترنگ ہے

گل گیر! منہ پسار نہ تو شمع کی طرف
اس کی زبان ہی اسے کامِ نہنگ ہے

کب ہے دماغ عشقِ بتانِ فرنگ کا
مجھ کو تو اپنی ہستی ہی قیدِ فرنگ ہے

عالم سے اختیار کی ہر چند صلح کل
پر اپنے ساتھ مجھ کو شب و روز جنگ ہے

میں کیا کہوں تجھے نظر آتا نہیں ہے کیا
اس کارگاہِ جہان کا جو کچھ کہ ڈھنگ ہے

غنچہ شگفتہ ہووے ہی ہووے کہ اس میں دردؔ
دیکھا چمن میں جا کے تو کچھ اور رنگ ہے

مصحفی

○

سرِ شام اس نے منہ سے جو رُخِ نقاب اٹھا
نہ غروب ہونے پایا وہیں آفتاب اٹھا

میں حسابِ بوسہ جی میں کہیں اپنے کر رہا تھا
وہ لگا مجھی سے کرنے طلب اور حساب اٹھا

مہ چاردہ کا عالم میں دکھاؤں گا فلک کو
اگر اس نے پردہ منہ سے شبِ ماہتاب اُلٹا

جو خفا ہوا میں جی میں کسی بات پر شبِ وصل
سحر اُٹھ کے میرے آگے وہی اس نے خواب اُلٹا

بہ سوالِ بوسہ اُس نے مجھے رُک کے دی جو گالی
میں ادب کے مارے اس کو نہ دیا جواب اُلٹا

میں ہوا ہوں جس پہ عاشق یہ شگوفہ ماجرا ہے
کہ مرے عوض لگا ہے اُسے اضطراب اُلٹا

میں عجب یہ دم دیکھی کہ بروزِ عید شرماں
وہی وضع بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

نہیں جائے شکوہ اس میں ہمیں مصحفی ہمیشہ
یہ زمانے کا رہا ہے یونہی انقلاب اُلٹا

○

آج کچھ سینے میں دل ہے خود بخود بے تاب سا
کر رہا ہے بے قراری پارۂ سیماب سا

جوں گُلِ تر کیا ہی اُس سے جھلکے ہے اس کا بدن
وہ جو پیراہن گلے میں اُس کے ہے اک آب سا

میں ہوں اور خلوت ہے اور پیشِ نظر معشوق ہے
ہے تو بیداری و لے کچھ دیکھتا ہوں خواب سا

کل شبِ تاریک میں جونہی ہوا وہ بے نقاب
جلوہ گر رُوئے زمیں پر ہو گیا مہتاب سا

کیا کہوں حسن و لطافت جامۂ شبنم سے ہے
نکلا ہی پڑتا ہے وہ گورا بدن مہتاب سا

مصحفی کیوں لختِ دل رونے کا کھاتا ہے قسم
ہے نمایاں کچھ تو آنکھوں میں تری خونناب سا

○

سو سو طرح کا حادثہ تجھ پر گزر چکا
پر اے دل ایک روز نہیں تو نہ مر چکا

اتنا بھی خال و خط کا بنانا ہے کیا یہاں
بس رکھو آئینہ کہاں منکھڑا سنور چکا

اس ہاتھ سے یہ دل نہ تسلی ہوا دریغ
سو مرتبہ میں دل کے اوپر ہاتھ دھر چکا

اے یار وقتِ چہرہ خراشی و مُو کنی
کیا کیا نہ تیرے ہاتھ سے مجھ پر گزر چکا

اک سر پہ خاک ڈالنی باقی رہی ہے سو
دیکھو گے شام و صبح کہ میں وہ بھی کر چکا

کتنا ہی میں بسا رہوں اُسے ویک مصحفی
نقشہ اگر یہی ہے تو جی سے بسر چکا

○

جی جائے گا یہ اُن کا کسی کا
یوں کرتے ہیں امتحاں کسی کا

مکھڑے سے نقاب مت اُٹھاؤ
کیا فائدہ سود و زیاں کسی کا

بُز آہ و وہاں کوئی کرے کیا
کچھ بس نہ چلے جہاں کسی کا

آزردہ کریں ہیں اس طرح داہ
دل صفت ہیں یا کہ میاں کسی کا

تا فصلِ دگر رہا نہ ہرگز
اس باغ میں آشیاں کسی کا

دیتے نہیں مصحفی پھر اس کو
دل لیویں جو یہ بتاں کسی کا

○

نالہ چمن میں جب وہ گلِ اندام آگیا
گل کو شکستِ رنگ کا پیغام آگیا

اُٹھا جو صبح خواب سے وہ مستِ پُر خمار
خورشید کف کے بیچ لئے جام آگیا

افسوس ہے کہ ہم تو رہے مست خواب صبح
اور آفتابِ عمر لبِ بام آگیا

سوچے تھا اہلِ جرم سے کس کو کروں میں قتل
اتنے میں اس کو یاد مرا نام آگیا

سمجھے جائے رحم حال پہ یاں اُس اسیر کے
جو گرتے ہی ہوا سے نہ دام آگیا

کوئی تڑپ تڑپ کے دی حسرت میں اپنی جان
بارے ٹک ایک دل کو تو آرام آگیا

سمجھو خدا کے واسطے پیارے بُرا نہیں
دو دن اگر کسی کے کوئی کام آگیا

کر قطع کب گیا ترے کوچے سے مصحفی
گر صبح کو گیا، وہیں پھر شام آگیا

○

گر اُس منہ سے برقع کبھی کھل گیا
تو دیکھو گے مہ خاک میں رُل گیا

گیا جان سے ایک عالم میاں
ولیکن نہ تیرا تغافل گیا

رہا ہے کہاں ہم میں آرام صبر
وہ طاقت گئی وہ تحمل گیا

ہمیں دے گیا داغ جاتے ہوئے
غرض اس گلستاں سے جو گل گیا

وہی رنگ گل ہے وہی پھپھے
چمن سے کہاں شورِ بلبل گیا

لگی چوٹ دل کو مرے داغ سے
سحر نالہ کرتا جو بلبل گیا

میں کہتا تھا عاشق نہ ہو مصحفی
تو ایسی ہی باتوں میں تو کھل گیا

○

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا
ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا

میرے پہلو میں رات جاگا وہ
ماہ تھا یا ہلال تھا کیا تھا

چمکی بجلی سی پر نہ سمجھے ہم
حسن تھا یا جمال تھا کیا تھا

جس کو ہم روزِ ہجر سمجھے تھے
ماہ تھا یا وہ سال تھا کیا تھا

مصحفی شب جو چپ تو بیٹھا تھا
کیا تجھے کچھ ملال تھا کیا تھا

○

خورشید کو سائے میں زلفوں کے چھپا رکھا
چتون کو دکھا خوبیِ سرمے کو لگا رکھا

سویا تھا لپٹ کر میں اُس ساتھ دلے اس نے
پہلو سے مرے پہلو تا صبح جدا رکھا

کس منہ سے اجل کو اب منہ اپنا دکھا دیں گے
ہم میں تری اُلفت نے کہہ تو ہی کہ کیا رکھا

قاصد جو گیا میرا لے نامہ تو پھر اس نے
نامے کے کئے پُرزے قاصد کو بٹھا رکھا

کس لب کے تبسم نے چھیڑا تھا نمک اُن پر
زخموں کے الم نے شب تا صبح مزا رکھا

کیا جانئے کب کا تھا یہ میرا فلک دشمن
جو اس مہ تاباں کو تجھ سے جدا رکھا

اے مصحفی میں کس کی رفتار کا شیدا تھا
ہر شعر میں میں نے جو انداز نیا رکھا

○

ہے یہ عشق آفت و بلا تو نہیں
اس کا مارا کوئی جیا تو نہیں

دل کی تڑپوں میں آن نکلے ہے
دیکھو کشتۂ ادا تو نہیں

پوچھتا کیا ہے حال دل کا مرے
او میاں تجھ سے کچھ چھپا تو نہیں

یعنی عاشق ہو اور ہرجائی
اب تلک ہم نے یہ سنا تو نہیں

بات پر اس کی میں جو کل بولا
کہا کچھ ذکر آپ کا تو نہیں

5786
11.10.1966

○

ہے ماہ کہ آفتاب کیا ہے
دیکھو تو یہ تہ نقاب کیا ہے

میں نے تجھے تو نے مجھ کو دیکھا
اب مجھ سے تجھے حجاب کیا ہے

آئے ہو تو کوئی دم تو بیٹھو
اے قبلہ یہ اضطراب کیا ہے

اس بن ہمیں جاگتے ہی گزری
جانا نہ یہی کہ خواب کیا ہے

مجکو بھی لگے وہ عاشقوں میں
اس بات کا سو حساب کیا ہے

اس میکدۂ جہاں میں یارو
مجھ سا بھی کوئی خراب کیا ہے

قسمت میں ہمارے مصحفی ہائے
کیا جانے ثواب عذاب کیا ہے

میر حسن

○

عشق کا راز گر نہ کھل جاتا
اس قدر تو نہ ہم سے شرماتا

آ کے تب بیٹھتا ہے وہ ہم پاس
آپ میں جب ہمیں نہیں پاتا

زندگی نے وفا نہ کی ورنہ
میں تماشا وفا کا دکھلاتا

مر گئے ہم تو کہتے کہتے حال
کچھ تو تو بھی زباں سے فرماتا

سب یہ باتیں ہیں چاہ کی ورنہ
اس قدر تو نہ ہم پہ جھنجھلاتا

میں نہ سنتا کسی کی بات حسنؔ
دل جو باتیں نہ مجھ کو سنواتا

○

جاتا تھا اس کے کھوج میں، میں بے خبر چلا
بارے اسی نے ٹوک کے پوچھا، کدھر چلا

جس اشتیاق سے کہ میں آتا ہوں تیرے پاس
کیا ہو جو آوے تو بھی یوں ہی بے خبر چلا

غیروں میں اس نے منہ تو چھپایا تھا مجھ کو دیکھ
پر میں بھی اس کی چھیڑ سے منہ ڈھانپ کر چلا

کس میں رکھوں گا اب مئے حسرت کو میں بھلا
شیشہ تو دل کا خونِ جگر ہی سے بھر چلا

لکھنے کی یاں نہ تاب نہ پڑھنے کا واں دماغ
کہہ دیں گے کچھ زبانی، اگر نامہ بر چلا

قتل

کچھ رات غیر کی جو کہیں نکلی اس سے بات
سن سن کے میں خفا ہو، وہیں روٹھ کر چلا
غصہ میں دیکھ مجھ کو لگا کہنے: اور لو!
اک بات بس کہی نہ کہی، یہ تو مر چلا
اب کوئی آوے یا کہ نہ آوے حسنؔ کو کیا
بے چارہ اپنی جان سے آپ ہی گزر چلا

○

غم خانۂ دل عیش کا گھر ہووے گا یارب
آباد کبھی یہ بھی نگر ہووے گا یارب!

جب دیکھوں ہوں اس کو تو یہ آتا ہے مجھے رشک
کس کس کا یہ منظورِ نظر ہووے گا یارب!

بالا ئی تو ہے غیروں سے اور اب ہم سے ولیکن
کیا جانئے! وہ شوخ کدھر ہووے گا یارب

جان و دل و دیں کھوئے اک اس کی نظر پر
ایسا بھی کوئی اور نبشہ ہووے گا یارب!

رونے سے مرے سنگ تلک ہو گئے پانی
دل میں کبھی اس کے بھی اثر ہووے گا یارب

داغوں کو ترے غم کے جو رکھتے تر و تازہ
یہ میرے سوا کس کا جگر ہووے گا یارب!

رہتے ہی گزرتی ہے شب و روز حسن کو
اور اس سے تو کیا حال تبر ہووے گا یارب

○

دل غم سے ترے لگا گئے ہم
کس آگ سے گھر جلا گئے ہم

ماتم کدۂ جہاں میں جوں شمع
رو رو کے جگر بہا گئے ہم

مانند حباب اس جہاں میں
کیا آئے تھے اور کیا گئے ہم

کھویا گیا اس میں گو دل اپنا
پر یار! تجھے تو پا گئے ہم

تھا ہم میں اور اس میں وہ جو پردہ
سو اس کو حسن اٹھا گئے ہم

○

اس کی جب بزم سے ہم ہو کے تنگ آتے ہیں
اپنے ساتھ آپ ہی کرنے کو ہونے جنگ آتے ہیں

حسن میں جب تئیں گرمی نہ ہو، اجی دیوے کون
شمع قصوے کے کب گرد پتنگ آتے ہیں!

دل کو کس بوقلموں بلوہ نے ہے خون کیا
اشک آنکھوں سے جو یہ رنگ برنگ آتے ہیں

آہ تعظیم کو اٹھتی ہے مرے سینے سے
دل پہ جب اس کی نگاہوں کے خدنگ آتے ہیں

شرط گر پوچھو، تو ہے اس میں بھی قسمت ورنہ
عاشقی کرنے کے ہر ایک کو ڈھنگ آتے ہیں

حیرت افزا ہے عجب کوچۂ دلدار حسنؔ!
جو وہاں جاتے ہیں اس طرف سے دنگ آتے ہیں

○

ہم نہ نکہت ہیں، نہ گل ہیں، جو مہکتے جاویں
آگ کی طرح جدھر جاویں، دہکتے جاویں

اے خوشا مست! کہ تابوت کے آگے جس کے
آب پاشی کے بدل مے کو چھڑکتے جاویں

جو کوئی آوے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے
ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جاویں

غیر کو راہ ہو گھر میں ترے، سبحان اللہ!
اور ہم دور سے در کو ترے تکتے جاویں

وقت اب وہ ہے کہ ایک ایک حسنؔ ہو کے تنگ
صبر و تاب و خرد و ہوش کھسکتے جاویں

○

مجھ کو عاشق کہہ کے اُس کے روبرو مت کیجیو!
دوستاں! گر دوست ہو تو یہ کبھو مت کیجیو!

جس ادا کا کشتہ ہوں میں وہ ہے میرے ہی ساتھ
اس ادا کو مبتذل اے خوب رُو مت کیجیو!

وقتِ رخصت دل نے اتنا ہی کہا رو کر کہ بس
اب پھر آنے کی مرے تو آرزو مت کیجیو!

میں تو یوں ہی تم سے دیوانہ سا بکتا ہوں کہیں
اس کے آگے دوستاں! یہ گفتگو مت کیجیو!

زلف کے کوچہ سے ہو گلشن میں گزرے ہے صبا
آج واں جا کر گلوں کو کوئی بو مت کیجیو!

کل کے جھگڑے میں بھلا ہے کس کے یار واجق بطرف؟
واجبی جو ہو، سو کیجیو! میری رُو مت کیجیو!

واں حسنؔ ہرگز نہیں ہے ڈھیل پھر جانے میں کچھ
آشنائی پر بھروسہ اس کی تو مت کیجیو!

○

ہمدم! نہ پوچھ مجھ سے؟ غرض اک بلا ہے وہ
جو رو برو ہو اس کے سو جانے کہ کیا ہے وہ

بیگانہ وار بھی نہ ملا ہم سے وہ کبھی
ہم سادہ دل یہ جانتے تھے آشنا ہے وہ

ہجراں تو ہے، پہ یہ نہیں معلوم کچھ ہمیں
ہم آپ سے جُدا ہیں کہ ہم سے جُدا ہے وہ

پھر پھر کے پوچھتے ہو عبث آرزوئے دل
تم جانتے تو ہو کہ مرا مدعا ہے وہ

میں نے تو بات بھی نہیں کی اس سے ہم نشیں!
اک یہ بھی چونچلا ہے کہ ناحق خفا ہے وہ

معذور رکھ حسنؔ کو جو بے طاقتی کرے
عاشق ہے، دردمند ہے اور مبتلا ہے وہ

○

سیر نے تجھ سے مری جان! جدھر کو چلیے
تو ہی تو ساتھ نہ ہووے، تو کدھر کو چلیے

خواہ کعبہ ہو کہ بت خانہ غرض ہم سے سن
جس طرف دل کی طبیعت ہو، اُدھر کو چلیے

زلف تک رُخ سے نگہ جاوے نہ اک دن کے سوا
شام کو پہنچیے منزل، جو سحر کو چلیے

جب میں چلتا ہوں ترے کوچہ سے کترا کے کبھی
دل مجھے پھیر کے کہتا ہے: اِدھر کو چلیے

ان دنوں رات اسی فکر میں کٹتی ہے حسن
صبح کب ہووے کہ پھر یار کے گھر کو چلیے

○

دل برسے ہم اپنے جب ملیں گے
اس گم شدہ دل سے تب ملیں گے

یہ کس کو خبر ہے اب کے بچھڑے
کیا جانیے: اس سے کب ملیں گے

دنیا ہے، سنبھل کے دل لگانا
یاں لوگ عجب عجب ملیں گے

ظاہر میں تو ڈھب نہیں ہے کوئی
ہم یار سے کس سبب ملیں گے

آرام حسن تبھی تو ہوگا،
اس لب سے جب اپنے لب ملیں گے

جرأت

○

تجھے دیکھے سے وہ جیتا تھا اور ہم اس پہ مرتے تھے
یہی راتیں تھیں اور باتیں تھیں وہ دن کیا گزرتے تھے

وہ سوزِ دل سے بھر لاتا تھا اشک سرخ آنکھوں میں
اگر ہم جی کی بے چینی سے آہِ سرد بھرتے تھے

بیاں ہم وصل میں کرتے جو دردِ ہجر سے مرنا
تو وہ کہتا خدا شاہد ہے اس کا ہم بھی مرتے تھے

کسی دھڑکے سے روتے تھے جو ہم وصل کی شب کو
وہ ہم کو منع کرتا تھا ہم اس کو منع کرتے تھے

ملی رہتی تھیں نظریں غلبۂ الفت سے آپس میں
نہ خوف اوس کو کسی کا تھا نہ ہم لوگوں سے ڈرتے تھے

سو اب صد حیف اوس خورشید رُو کے ہجر میں جرأت
نہیں آتیں یہ اور باتیں ہیں وہ دن کیا گزرتے تھے

○

سنا ہے وہ خدا نا کردہ ہے بیمار کیا کیجے
عیادت کو بھی جانا ہے ہمیں دشوار کیا کیجے

خیال اوس کی جوانی کا گزرنے ہے تو شب کو
لگا کے چھت سے آنکھیں رہتے ہیں بیدار کیا کیجے

کسی کو بھیج بھی سکتے نہیں احوال پرسی کو
مگر یہ چپکے چپکے کہتے ہیں ہر بار کیا کیجے

کفِ افسوس ملتے ہیں کہ جرأت ہم نہیں اس جا
نہیں تلوے تو سہلاتے گھڑی دو چار کیا کیجے

سچ تو یہ ہے بے جگہ ربط ان دنوں پیدا کیا
سچ ہے ہر دم یہی ہم کو کہ ہم نے کیا کیا

وہ گیا اُٹھ کر جدھر کو میں اِدھر حیران سا
اوس کے جانے پر بھی کتنی دیر تک دیکھا کیا

میری اور اوس شوخ کی صاحب سلامت ہو چکی
صبر و طاقت نے کہا لو ہم نے تو مجرا کیا

دمبدم حسرت سے دیکھوں کیوں نہ سوئے چرخ میں
اس نے اوروں کا کیا اوس کو ہمیں جس کا کیا

مل گئے تھے ایک بار اوس کے جو میرے لب سے لب
عمر بھر ہونٹوں پہ اپنے میں زباں پھیرا کیا

جب تلک کرتے رہے مذکور اوس کا مجھ سے لوگ
جی میں کچھ سوچا کیا میں اور دل دھڑکا کیا

دل ملے پر بھی ملاپ ایسی جگہ ہوتی رہی
ہم اِدھر تڑپا کئے اور وہ اُدھر تڑپا کیا

سوزشِ دل کیا کہوں میں جب تلک جیتا رہا
ایک انگارا سا پہلو میں میرے دہکا کیا

○

خیالِ وصل میں اوس کے عجب باتیں بناتا ہوں
مگر بیٹھا ہے وہ گویا اور اوس کو میں مناتا ہوں

گلی میں اوس کی جب جاتا ہوں تن کر اک چچا
کچھ ایسا ہی سُن آتا ہوں کہ بس اُن سے سُن آتا ہوں

گلے لگتا نہیں گر عیدِ قرباں کو ہی تو میرے
تو لے خنجر ہی کو اپنے گلے سے میں لگاتا ہوں

تماشا ہے کہ ہے مدہوش وہ تو نشہ مے سے
پھر اس محفل سے میں اوٹھتے ہوئے کیوں لڑکھڑاتا ہوں

کسے سے کس کے رنجیدہ ہوئے ایسے یہ بندے سے
ذرا سمجھو تو صاحب میں تو آپ ہی کا کھاتا ہوں

کسے گر کوئی وہ ناگن نہیں پر دل کو ڈستی ہے
تو اوس کی زلف کی میں یہ پہیلی بوجھ جاتا ہوں

کہوں کیا درد ہجراں سے مری کیا شکل ہے جرأت
کسی صورت نہیں آرام کیا ایدا اُٹھاتا ہوں

کبھی جو یاد آتا ہے وہ ہنسنا بولنا اُس کا
تو پھر رو کے دیا اپنی آنکھوں سے بہاتا ہوں

کبھی اوس کا جو بلوانا وہ مجھ کو یاد آتا ہے
تو بیٹھے بیٹھے کیا جانوں کہ کیدھر کو میں جاتا ہوں

کبھی گھبرا کے سر اپنا پٹکتا ہوں میں بالیں سے
کبھی بستر پہ بیتابی کے مارے تلملاتا ہوں

کبھی آواز اوس کی سی جو آجاتی ہے کانوں میں
تو دل پر ہاتھ رکھ کر دھیان اُدھر کو لگاتا ہوں

پھر اوس میں گر تسلی کو کوئی پاس آن بیٹھے ہے
تو مطلع پڑھ کے یہ روتا ہوں اور اوس کو رُلاتا ہوں

قرار اوس شعلہ رُو کے ہجر میں کیا خاک پاتا ہوں
نظر آتی ہے اک آتش جدھر کو آنکھ اُٹھاتا ہوں

○

ذرا ہم اس سے لگ چلنے کے سو سو ڈھب لگاتے ہیں
رسائی جو نہیں پاتے تو کیسا کیا تلملاتے ہیں

غضب یہ ہے کہ واں جاتے ہیں تو خالی پھر آتے ہیں
اگر جاتے نہیں تو جی ہی سے ہم اپنے جاتے ہیں

ملی رہتی تھیں جو نظروں سے نظریں سو کہاں اب تو
کبھی ہم اتفاقاً اک جھلک سی دیکھ پاتے ہیں

نظر آتا ہے باہم اب جو وصل و ہجر کا عالم
کبھی روتے ہیں آپ اپنے پر اور گہ مسکراتے ہیں

خدا شاہد ہے دو میں جان میں بس جان آتی ہے
کبھی صاحب جو آواز اپنے بندے کو سناتے ہیں

غرض یہ آتشِ دل اور بھی بھڑکے ہے نالے سے
لگی کہ گرچہ اشکِ چشم تنہا ہی بجھاتے ہیں

برنگِ موج جب بیتاب ہوتا ہے یہ دل بر میں
تو ہم رو رو کے دریا اپنی آنکھوں سے بہاتے ہیں

قلق گزرے ہے یہ دل پر کہ بس میں مرنے لگتا ہوں
دکھانے میں جو صورت آپ کچھ عرصہ لگاتے ہیں

مناسب گرچہ جانا بار بار اُس جا نہیں جرأت
دلے کیا کیجے بیتابی سے ہم لاچار جاتے ہیں

○

ہے غضب اپنی طبیعت اوس پہ ہے آئی ہوئی
جس پہ پڑتی ہے نگہ ہر اک کی للچائی ہوئی

یاد آجاتی ہے تو روتا ہوں کیا منہ ڈھانپ کے
بھولی بھولی صورت اور وہ آنکھ شرمائی ہوئی

چھاؤنی برسات میں چھائی کہاں جلد آؤ جی
جی گھٹاتی ہے ہمارا یہ گھٹا چھائی ہوئی

کون رخصت ہو کے یہ ہم سے گیا یارب جو آہ
صبر نے مجرا کیا رخصت تکیائی ہوئی

شب تصور میں کسی مہرو کی آنکھوں کے حضور
چار سُو اک نور کی چادر تھی پھیلائی ہوئی

ناتواں دیکھا جو مجھ کو تو یہ ہنس کر بول اُٹھے
بارے اب تو کچھ بہت ان میں توانائی ہوئی

سامنے میرے جو منہ کر کے نہیں تم بیٹھتے
کیا کسی کے سامنے ہے یہ قسم کھائی ہوئی

پر یہ حیرت ہے مجھے اُس پر نہ تم ٹھہرے رہے
بات جو مدت سے ہے آپس میں ٹھہرائی ہوئی

خیر تو ہے اے دلِ وحشت زدہ یہ کیا ہوا
یوں جو تم مت میں مری یہ دشت پیمائی ہوئی

پا برہنہ، مُو پریشاں، آہ بر لب، رنگ زرد
دست بر سینہ ہے اور صورت سے گھبرائی ہوئی

دوڑ دھڑ آنے سے جرأت کے رکو مت کیا کرے
اس بچارے کی طبیعت تم پہ ہے آئی ہوئی

○

ہ آنچل میں ٹک لطف اُٹھانے دے مجھے
اے ترے پاؤں پڑوں ہاتھ لگانے دے مجھے

گزشت آتے ہی کیا پوچھے ہے اے جان مری
سب سناؤں گا تجھے آپ میں آنے دے مجھے

ب تو دم کہنے لگا ضبطِ محبت سے ہے
ایک دو اشک تو آنکھوں سے بہانے دے مجھے

ھ سے پوچھے ہے بگڑ کر وہ حقیقت میری
کچھ تو اے بے خبری بات بنانے دے مجھے

ٹکی باندھنے سے بات نہ کھل جائے کہیں
حیرتِ حسن پلک تک تو ملانے دے مجھے

ہ دل جس کا ملا ہووے نہ دل سے میرے
لب سے پھر اپنے وہ لب کیونکہ ملانے دے مجھے

ر بھی وار لگاتے اوسے کیا لگتا ہے
جو کہ زخموں پہ نمر ہم بھی لگانے دے مجھے

ٹکیاں پاؤں کی اپنے وہ دبوائے ہے
پر پاس اوس کو نہ دوں بیٹھنے جی میں دلا
ضبط کر ضبط درہِ ضبط بٹھانے دے مجھے

رہا وہ بھی مزہ ہائے فلک سے وہ عدو
کہ نہ رنجش کا بھی کچھ لطف اُٹھانے دے مجھے

امت سے بٹھانا وہ اور اوس کا یہ کہنا
پھر نہیں آنے کا یاں میں نہیں جانے دے مجھے

تو بھی پھر پوچھیو جرأت سبب حیرانی
پہلے آئینہ ذرا اس کو دکھانے دے مجھے

○

جب یہ سنتے ہیں کہ ہمسائے میں آپ آئے ہوئے
کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

آپ سے میں تو نہ جاتا پہ کروں کیا کہ کہیں
دل بیتاب لیے جائے ہے دوڑائے ہوئے

گھر میں بے یار ہے بے شکل اپنی یہ دل کے ہمراہ
دو گنہ گار ہوں جوں قید میں بٹھلائے ہوئے

آئے تم دست بہ قبضہ ہو تو پھر دیر ہے کیا
سر تسلیم کو ہم بیٹھے ہیں نہوڑائے ہوئے

آج بھی اوس کے جو آنے کی نہ ٹھہری تو بس آہ
ہم وہ کہ بیٹھیں گے جو دل میں ہیں ٹھہرائے ہوئے

پیرہن چاک ترے در پہ جو کل کرتا تھا
آج لوگ اوس کو لیے جاتے ہیں کفنائے ہوئے

مردنی پھر گئی منہ پر مرے جن کی خاطر
رنگ رو کیا وہ پڑے پھرتے ہیں چمکائے ہوئے

ابرِ تصویر کے مانند ہم اوس محفل میں
رو نہیں سکتے ہیں اشک آنکھوں میں بھر لائے ہوئے

لوگ گو ہم سے یہ کہتے ہیں کہ چلتے ہو جی واں
اپنے بیگانے سب اوس بزم میں ہیں آئے ہوئے

دل میں ہم سوچ کے اس بات کو رو دیتے ہیں
کیا کہیں ان سے کہ ہیں ہم تو نکلوائے ہوئے

کر کے موزوں اونھیں جرأت غزل اک اور بھی پڑھ
دل میں جو تازہ مضامین ہیں ٹھہرائے ہوئے

○

تمہارا دل حرام اس ناز پہ ہر آن لوٹے ہے
ترا امن بھی قدموں پر ترے اے جان لوٹے ہے

یہ ہے چھوڑ کر تو جس کو اے آبادیٔ عالم
وہ مضطر کیا در و دیوار خانہ ویران لوٹے ہے

ترے ہے چاندنی کی سیر جب وہ مہ بیٹھ کشتی میں
تو کیا کیا موج پر عکس رخ تابان لوٹے ہے

دیا یہ خانۂ قاتل میں کس بے چین کو جانے
جو در پر نعرۂ بسمل سنا پڑا دان لوٹے ہے

ترے ہے جب کہ تیرے مضطرب کے چشم سے آنسو
تو کیا کیا خاک پر جوں گوہر غلطان لوٹے ہے

چھپاتا ہے گل زخم سے تو جو اپنے مکھڑے کو
ترا اس بات پر کیا کیا ترا حیران لوٹے ہے

سرود اب طرفہ اوس مطرب کے کا رقص لاتا ہے
کہ ہر اک بیکلی سے اوس کی سن کنتان لوٹے ہے

خفا مجھ سے نہ ہو کر لوٹ جاؤں تیرے قدموں پر
کروں میں کیا کہ تجھ پر دل مرا اے جان لوٹے ہے

کرے گا کام آخر وہ پاجامہ تمامی کا
کہ اک بیکلی سی چلنے میں تر دامان لوٹے ہے

تصور میں جو دل کے زلف کا اوس کی ہے لہرانا
تو اک چھاتی پر اس کی سانپ سا ہر آن لوٹے ہے

اور آتا ہے جو سونا یاد باہم بستر گل پر
تو ساری رات انگاروں پہ دے دے جان لوٹے ہے

کہے اشعار بیتابی کے تو نے ایسے اے جرأت
کہ پڑھ کر ہر سخنداں اب ترا دیوان لوٹے ہے

○

دل میں کیا کیا آئے ہے بات اور کیا کیا جائے ہے
کان میں آواز اوس کی سی جوں ہی آجائے ہے

بستر اندوہ پر جب یاد آتے ہیں وہ عیش
پھر نہ لیٹا جائے ہے مجھ سے نہ بیٹھا جائے ہے

بزم میں آنکھوں تلے پھر جائے ہے جب اوس کی شکل
آنکھ بھر کر پھر سوے کس کو دیکھا جائے ہے

چھیڑنے کو مجھ سے یہ آزردہ وہ ہوتا نہیں
وقت رنجش تو بھلا کیوں مسکراتا جائے ہے

کیا ہجوم بدگمانی گھیر لیتا ہے مجھے
جب پہ سنتا ہوں کہیں گھر سے وہ تنہا جائے ہے

بس دل عشاق پر بجلی سی پڑ جاتی ہے آہ
جب کمند ناز کو اپنے وہ چمکا جائے ہے

دیکھ کر تصویر اوس کی ہو گیا تصویر میں
اب نہ دست و پا ہی ہلتے ہیں نہ بولا جائے ہے

بیٹھے یاں مت سچ بتاؤ لو خبر عاشق کی تم
زندگی کا اوس کی واں نقشہ تو بگڑا جائے ہے

لے گیا اک راہ چلتا دین و دل صبر و قرار
اب وہ یاد آتا ہے تو بس جی ہی نکلا جائے ہے

کیا کہوں اے ہم نشیں اپنی تو وہ حالت ہوئی
جوں کسی کا قافلہ رستہ میں لوٹا جائے ہے

اشک خونی دیکھ چہرے پر مرے بولا وہ شوخ
دن بدن رنگ اب تو جرأت کا چمکتا جائے ہے

انشاؔ

○

اے عشق! مجھے شاہدِ اصلی کو دکھا لا
قم باذنی وفقک اللہ تعالیٰ

ہے تجھ کو جنوں کی قسم اے جذبِ محبت
اس نورِ تجلی کی جھلک مجھ کو دکھا لا

سو جھے سے مجھے عالمِ اطلاق کی منزل
الفت نے جو تقلید کے ٹھکانے سے نکالا

ہر چند کہ عاصی ہوں پہ امت میں ہوں اس کی
جس کا ہے قدم عرشِ معلیٰ سے بھی بالا

مولائے جہاں، رہ بر عشاق محمدؐ
صد عقدۂ مشکل کا مرے کھولنے والا

○

جگر کی آگ مجھے جس سے جلد وہ شے لا
لگا کے برف میں ساقی صراحی مے لا

قدم کو ہاتھ لگاتا ہوں، اٹھ کہیں گھر چل
خدا کے واسطے! اتنے تو پاؤں مت پھیلا

نکل کے وادیٔ وحشت سے دیکھ اے مجنوں!
کہ زور دھوم سے آتا ہے ناقۂ لیلیٰ

گرا جو ہاتھ سے فرہاد کے کہیں تیشہ
درونِ کوہ سے نکلی صدائے واویلا

نزاکت اس کے یہ مکھڑے کی دیکھ اے انشاؔ
نسیمِ صبح جو چھو جائے، رنگ ہو میلا

○

اچھا جو خفا ہم سے ہو تم اے صنم اچھا
لو ہم بھی نہ بولیں گے خدا کی قسم اچھا

مشغول کیا چاہیے اس دل کو کسی طور
لے لیویں گے ڈھونڈ اور کوئی یار ہم اچھا

گرمی نے کچھ آگ اور ہی سینے میں لگا دی
ہر طور غرض آپ سے ملنا ہے کم اچھا

اغیار سے کرتے ہو مرے سامنے باتیں
مجھ پر یہ لگے کرنے نیا تم ستم اچھا

کہہ کر گئے: آتا ہوں کوئی دم میں میں تم پاس
پھر دے چلے کل کی سی طرح مجھ کو دم اچھا

اس ہستیٔ موہوم سے میں تنگ ہوں انشا
واللہ کہ اس سے ہے برا تب عدم اچھا

○

اے آتشِ فراق! مرا بلبلے سوز داغ
جھلکے ہے دل میں دور سے جوں دیر کا چراغ

آنکھوں میں تا کہ نشۂ وحدت کا ہو طلوع
ساقی! مئے مغانہ سے بھر دے مرا ایاغ

بیٹھا ہے آج مجلسِ رنداں میں شیخ یوں
طوطی کے پاس جیسے کوئی ہم قفس ہو زاغ

پیدا لگاوٹ آہ کسی ساتھ کیجیے
لیکن دل و دماغ کہاں کس کو یہ فراغ

پہنچوں میں کس کی کہنہ حقیقت کو آج تک
انشا مجھے ملا نہیں اپنا ہی کچھ سراغ

○

ل مجھ سے لے پری! تجھے انسان کی قسم
دیتا ہوں تجھ کو تخت سلیماں کی قسم!
کروبیاں کی تجھ کو قسم اور عرش کی
زہرا کی قسم! تجھے رضوان کی قسم
طوبیٰ کی، سلسبیل کی کوثر کے جام کی
حور و قصور و جنت و غلمان کی قسم
روح القدس کی تجھ کو قسم اور مسیح کی
مریم کی تجھ کو عفت و دامان کی قسم
تجھ کو محمد عربی کی قسم ہے اور
مولا علیؑ کی شاہ خراسان کی قسم
توریت کی قسم، قسم انجیل کی تجھے
تجھ کو قسم زبور کی، فرقان کی قسم
ملت میں جس کی تو ہے، اسی کی قسم تجھے
اور اپنے دین و مذہب و ایمان کی قسم
دامن کو میرے ہاتھ سے اب چھوڑ دے بتاں
تجھ کو سحر کے چاک گریبان کی قسم
مدت سے تیرے چاہ ذقن میں غریق ہوں
باللہ! مجھ کو یوسف کنعان کی قسم
قیدی ہوں میں ترا، بخدا، زندگی خدا
اور اس عزیز مصر کے زندان کی قسم
موسیٰ کی ہے تجھے قسم اور کوہ طور کی
نور و فروغ و جلوۂ لمعان کی قسم
سوگند اب ہنسی کی تجھے کچھ دلا سے
سن تجھ کو اپنے ناز کی اور آن کی قسم
تجھ کو قسم ہے غنچۂ زخم جگر کی، تاک کی
اور شور عندلیب غزلخوان کی قسم
سونے کی گانے کی قسم اور رود نیل کی
فرعون کی قسم تجھے ہامان کی قسم
بستہ مرا ہے خانۂ غمخواران قیس
قیلیٰ کی ہے تجھے صف مژگان کی قسم
ایسی بڑی قسم بھی نہ مانے تو ہے تجھے
مجنوں کے قبلہ گاہ ابوالحجان کی قسم
کونے میں باغ کے جو وہ رہتا ہے الغیث
تجھ کو اسی کی شوکت ذی شان کی قسم
دیو سفید کی قسم اور کوہ قاف کی
باغ ارم کی اور پرستان کی قسم
دونا ہماری کی قسم، زرطوا پیر کی
کالی بلا کی، غول بیابان کی قسم
قسمیں تو ساری ہو چکیں باقی رہی ہے ایک
پیپل تلے کے جھٹنے کی، شیطان کی قسم!

ہاں پھر تو کہیو! ہانے وہ کس طرح ہو غضب
انشا نہ چھیڑ! تجھ کو مری جان کی قسم!

○

دھوم اتنی ترے دیوانے مچا سکتے ہیں
کہ ابھی عرش کو چاہیں تو ہلا سکتے ہیں

مجھ سے اغیار کوئی آنکھ ملا سکتے ہیں
منہ تو دیکھو وہ مرے سامنے آ سکتے ہیں

حضرت دل تو بگاڑ آئے ہیں اس سے لیکن
اب بھی ہم چاہیں تو پھر بات بنا سکتے ہیں

شیخی اتنی نہ کر اے شیخ! کہ رندان جہاں
انگلیوں پہ تجھے چاہیں، تو نچا سکتے ہیں

تو گروہ فقرا کو نہ سمجھ بے جبروت
ذات مولا میں یہی لوگ سما سکتے ہیں

چارہ گر اپنے تو معروف بہ دل ہیں لیکن
کوئی تقدیر کے لکھے کو مٹا سکتے ہیں

○

جوں صبا اڑ جائیں اور تیری بہاریں لوٹ جائیں
تجھ کو جو گھوریں الٰہی! ان کے دیدے پھوٹ جائیں

ان سے کیا کوئی پر آوے جو ذرا سی بات پر
تک ہی ہو کھا اٹھیں اور پنے ماتھے کوٹ جائیں

دور بلا بودن بہ از یم بلا مشہور ہے
کاش! جو ہونی ہو جلدی ہو بلا سے چھوٹ جائیں

بزم خوباں میں نہ انشا ایک سے آنکھیں لڑا
خاطر نازک بہت ان کی ہیں شاید ٹوٹ جائیں

○

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار، بیٹھے ہیں

کہاں صبر و تحمل، آہ ننگ و نام کیا شے ہے
یہاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

○

تصنع آتا ہے، دل کو تھام تو لو
بولیو مت، مگر سلام تو لو

کون کہتا ہے بولو، مت بولو
ہاتھ سے میرے ایک جام تو لو

انھیں باتوں پہ لوٹتا ہوں میں
گالی پھر دے کے میرا نام تو لو

یک نگہ پر بکے ہے انشا آج
مفت میں مول اک غلام تو لو

○

چھیڑنے کا تو مزہ تب ہے کہو اور سنو
بات میں تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو

تم کہو گے جسے کچھ کیوں نہ کہے گا تم کو
چھوڑ دو یوں سے گا بھلا دیکھ تو لو اور سنو

یہی انصاف ہے کچھ سوچ تو دل میں اپنے
تم تو سو کہہ لو مری اک نہ سنو اور سنو

آپ ہی آپ مجھے چھیڑو، رکو پھر آپی
آپ ہی بات میں پھر روٹھ اٹھو اور سنو

آفریں تم پہ، یہی چاہیے شاباش تمھیں
دیکھ روتا مجھے یوں ہنسنے لگو اور سنو

بات میری نہیں سنتے، جو اکیلے مل گئے
ایسے ہی ڈھب سے مناؤں کہ سنو اور سنو

نظیر اکبرآبادی

○

ملا آج وہ مجھ کو چنپل چھبیلا
ہوا رنگ سن کر رقیبوں کا نیلا

لیا جس نے مجھ سے عداوت کا پنجہ
سنقی علیہم حدۂ یا ثقیلا!

حل اس کی یلعقل کے کوچے سے اے دل
تو پڑھنا: ثم الفیل والا خلیلا

لہاں میں ہزاروں اگر آہ کا دم
ڈھانت جبالا کثیبا مہیلا

نظیر اس کے فضل و کرم پر نظر رکھ!
نقل: حسبی اللہ نعم الوکیلا

○

نظر پڑا اک بت پری وش، نرالی تج دھج، نئی ادا کا
جو عمر دیکھو، تو دس برس کی، پہ قہر آفت، غضب خدا کا

جو شکل دیکھو، تو بھولی بھولی جو باتیں سنئے، تو میٹھی میٹھی
پہ دل وہ پتھر کہ سر اڑا دے، جو نام لیجے کبھی وفا کا

جو گھر سے نکلے تو یہ قیامت کہ چلتے چلتے قدم قدم پر
کسی کو ٹھوکر، کسی کو جھڑکی، کسی کو گالی، کسی کو لٹاکا

یہ راہ چلتے میں چلبلاہٹ کہ دل کہیں ہے، نظر کہیں ہے
کہاں کا اونچا، کہاں کا نیچا، خیال کس کو، قدم کی جا کا

لڑا دے آنکھیں وہ بے حجابی کہ پھر پلک سے پلک نہ مارے
نظر جو نیچی کرے، تو گویا کھلا سراپا چمن حیا کا

یہ چنچلاہٹ، یہ چلبلاہٹ، خبر نہ سر کی، نہ تن کی سدھ بدھ
جو چیرا بکھرا، بلا سے بکھرا، نہ بند باندھا کبھو قبا کا

گلے لپٹنے میں یہ شتابی کہ تسلی بجلی کے اضطرابی
کہیں جو چمکا، چمک چمک کر، کہیں جو لپکا، تو پھر چھپا کا

نہ وہ سنبھالا کسی کے سنبھلے، نہ وہ منایا منے کسی کے
جو قتل عاشق پہ آ کے مچلے، تو خیر کا پھر نہ آشنا کا

نظیر ہٹ جا، پرے سرک جا، بدل لے صورت، چھپا لے منہ کو
جو دیکھ لیوے گا وہ ستم گر، تو یار ہو گا ابھی جھڑکا

○

کلاہِ گردوں اگر جہاں میں جو خاک میری کو جام کرتا
تو میں صنم کے لبوں سے مل کر عجب یہ عیشِ مدام کرتا

جو پاتا لذت بہ سانِ مستاں منے خجستہ سے تیری زاہد
تو صومعے سے نکل کے اپنے وہ میکدے میں قیام کرتا

○

وہ بزمِ اپنی تھی مے کشی کی وہ سیر ہوجاتے مست بجود
جو شیخ بھی واں سے رینگ کے آتے تو میں بھی جھک کے سلام کرتا

کبھو دیکھوں نہ سنبلِ باغ کو میں مجھے اس خمِ زلف دوتا کی قسم
نہ نگہ کروں عارضِ گل کی طرف، مجھے اس رخِ مہر و وفا کی قسم

جو زلفیں مکھڑے پہ کھول دیتا صنم ہمارا، تو پھر یہ گردوں
نہ دن دکھاتا، نہ شب بتاتا، نہ صبح لاتا، نہ شام کرتا

یوں پھرے ہے چمن کی فضا میں صبا، وہ ہزار طرح سے ہو نافہ کشا
مرے دل کو نہ ہو کبھی اس کی ہوا، مجھے کرے صنم کی ہوا کی قسم

نظیر آخر کو ہار کر میں گلی میں اس کی گیا تھا بکنے
تماشا ہوتا جو مجھ کو لے کر وہ شوخ اپنا غلام کرتا

جونہی آیا ادھر کو وہ چشمِ سیہ وہیں لے گیا دل کو بہ سیرِ نگہ
رہی عقل و خرد کو نہ جی میں جگہ، مجھے اس بتِ ہوش ربا کی قسم

بدن اس کا ہے رو کشِ برگِ سمن مرے ہیں جو آوے وہ رشکِ چمن
کھلے غنچۂ دل مرا گل کے نمن، مجھے اس گلِ بند قبا کی قسم

لگی مہندی جو ہاتھوں میں اس کے میاں تو وہ سرخی کچھ ایسی ہے لالہ فشاں
وہ شفق جو کہ صبح کو ہووے عیاں سو وہ کھاتی ہے اس کی حنا کی قسم

میں نے دیکھا نظیر جو اس کے تئیں تو وہ شرم سے ہو گیا سرو قریں
لیا نیچی نگاہوں سے جاں و دل و دیں میں کہوں کیا اب اس کی حیا کی قسم

○

دُور سے آئے تھے ساقی، سُن کے میخانے کو ہم
بس ترستے ہی چلے، افسوس! پیمانے کو ہم

مے بھی ہے مینا بھی ہے ساغر بھی ہے ساقی نہیں
دل میں آتا ہے لگا دیں آگ مے خانے کو ہم

بہ کو پھنسنا تھا قفس میں، کیا گلہ صیاد کا
بس ترستے ہی رہے ہیں آب و دانے کو ہم

طاق و رو میں صنم کے، کیا خدائی رہ گئی؟
اب تو پوجیں گے الٰہی کافر کے بت خانے کو ہم

باغ میں لگتا نہیں، صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

کیا ہوئی تقصیر ہم سے تو بتا دے اے نظیرؔ!
تاکہ شادی مرگ سمجھیں ایسے مر جانے کو ہم

○

کل نظر آیا چمن میں اک عجب رشکِ چمن
گل رخ و گل گوں و گل قبا و گل عذار و گل بدن

مہر طلعت، حور پیکر، مشتری رُو، مہ جبیں
سیم بر، سیماب طبع و سیم ساق و سیم تن

نازنیں، ناز آفریں، نازک بدن، نازک کمر
غنچہ لب، رنگیں ادا، شکر دہاں، شیریں سخن

زلف و کاکل، خال و ابرو کے ہیں یہ جاروں غلام
مشکِ تبت، مشکِ چیں، مشکِ ختا، مشکِ ختن

مبتلا ایسوں کے جو ہوتے ہیں وے ہیں اے نظیرؔ
بے قرار و دل فگار و خستہ جان و بے وطن

○

لیتا ہے جان میری تو میں سر بہ دست ہوں
اے یار! میں تو کشتۂ روزِ الست ہوں

یک دم کی زندگی کے لئے مت اُٹھا مجھے
اے بے خبر! میں نقشِ زمیں کا نشست ہوں

تو مست کر! شراب سے اے گُل بدن مجھے
میں آپ اپنے شیشۂ دل کا شکست ہوں

دُور از طریق مجھ کو سمجھنا نہ زاہدا!
گر تو خدا پرست ہے، میں بُت پرست ہوں

○

کیوں نہ ہو بام پہ وہ جلوہ نما تیسرے دن
ماہ بھی چھپ کے نکلتا ہے ولا تیسرے دن

ہاتھ سے اب تو قلم رشکِ مسیحا، رکھ دے
نسخے بدلے ہیں جہاں کے حکما تیسرے دن

غرقِ دریائے محبت کی نہیں ملتی لاش
ورنہ ڈوبا ہُوا نکلے ہے سدا تیسرے دن

دل بیمار رہے عشق میں کیوں کر سرسبز
خاک سے دانے کو ہے نشو و نما تیسرے دن

چھوڑ مت زلف کے مارے کو تو دریا میں ہنوز
سانپ کے کاٹے کو دیتے ہیں بہا تیسرے دن

تین دن چشم کے بیمار کا کر اپنے علاج
ہوتی معلوم ہے تاثیرِ دوا تیسرے دن

لوگ کہتے ہیں کہ ہیں پھول ترے کشتے کے
مہندی ہاتھوں میں تو قاتل نہ لگا تیسرے دن

عمر یک ہفتہ نہیں باغ میں اے گل! مت بھول
رنگ بدلے ہے زمانے کی ہوا تیسرے دن

چار حرف اس بتِ پرخوں کے پر بھیج نظیر
آپ سے آپ جو ہو جائے خفا تیسرے دن

○

خدا کسی سے کسی کا غرض حبیب نہ ہو
یہ داغ وہ ہے کہ دشمن کو بھی نصیب نہ ہو

خدا جو ہم کو کرے اس صنم کے کوچہ سے
الٰہی! راہ میں ایسا کوئی رقیب نہ ہو

علاج کیا کریں حکماء، تپ جدائی کا
سوائے وصل کے اس کا کوئی طبیب نہ ہو

نظیر اپنا تو معشوق خوب صورت ہے
جو حسن اس میں ہے ایسا کوئی عجیب نہ ہو

○

تاب اس کے دیکھنے کی نہ لائے، چلے گئے
کیا کیا پری جوان تھے آئے، چلے گئے

دارا رہا، نہ جم نہ سکندر سا بادشاہ
تخت زمیں پہ سینکڑوں آئے، چلے گئے

آدم رہا، نہ کوئی پیمبر رہا یہاں
وہ بھی اسی زمیں میں سمائے، چلے گئے

عالم تھا یہ زلیخا کا یوسف کی چاہ میں
رقعے ہزاروں بیاہ کے آئے چلے گئے

میرزا غالب

○

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما — کام گر رک گیا، روا نہ ہوا

ہزنی ہے کہ دل ستانی ہے — لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

○

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

سادگی ہائے تمنا، یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

آہ! وہ جرأتِ فریاد کہاں
دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا

پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

○

ر چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

تی صبر طلب اور تمنا بے تاب
کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

خور سے ہے شبنم کو، فنا کی تعلیم
ہی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

نظر میش نہیں، فرصتِ ہستی غافل
بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

تی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
ہر رگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

○

وہ فراق، اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خط و خال کہاں

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جائیں، گرہ میں مال کہاں؟

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں؟

○

ب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

نہیں ہم کو بھی رنگارنگ تم آرایاں
لیکن اب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو گئیں

ثبات اُلنقش گردوں دن کے پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

یں بیعقوب نے کوئی نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

قیبوں سے ہونا خوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ری زد کو دعا سمجھے اور جانے اثر
قدرت حق سے یہی جو چند بیاں اگر واں ہو گئیں

ی ہے داغ اس گھر کی راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

ن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سُن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

اہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب اہل کے پار
جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

رو کا میں نے اور سینہ میں ابھریں بے شمار
میری آہیں بخیہ چاکِ گریباں ہو گئیں

لیا بھی ہیں تو انکی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ دربار ہو گئیں

نہ ہے وہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

دہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

○

دل ہی تجھے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، غیر ہمیں اٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکس رُخ سہی، سامنے تیر کے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حسن اور اس پہ حسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرور و عزّ و ناز، یاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں! وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی!
جس کو ہو دین و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں

○

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
نیند آتی ہے پر نہیں آتی

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

○

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش! پوچھو کہ مدعا کیا ہے

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے، وفا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا، دعا کیا ہے

ہاں! بھلا کر! ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

○ ○

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سنو! گر برا کہے کوئی
نہ کہو! گر برا کرے کوئی

روک لو! گر غلط چلے کوئی
بخش دو! گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

پھر گرمِ نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمک داں کئے ہوئے

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیٔ داماں کئے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دل دار کھولنا
جاں نذرِ دل فریبیٔ عنواں کئے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

مومن

○

ہوئے نہ عشق میں جب تک وہ مہرباں نہ ہوا
بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا

خدا کی یاد دلاتے تھے، نزع میں احباب
ہزار شکر! کہ اس دم وہ بدگماں نہ ہوا

سنے نہ غیر، مجھے بزم سے اٹھانے پر
سبک ہے وہ کہ تری طبع پر گراں نہ ہوا

دیت میں روزِ جزا، لے رہیں گے قاتل کو
ہمارا جان کے جانے میں بھی زیاں نہ ہوا

وہ آئے بہرِ عیادت، تو تھا میں شادیِ مرگ
کسی سے چارۂ بیدادِ آسماں نہ ہوا

ملی نہیں ہے یہ چپ لذتِ ستم سے کہ میں
حریفِ کشمکشِ نالہ و فغاں نہ ہوا

دمِ حساب رہا روزِ حشر بھی یہی ذکر
ہمارے عشق کا چرچا کہاں کہاں نہ ہوا

ہے شرط ہم پہ عنایت میں گو نہ گونہ ستم
کبھی محبتِ دشمن کا امتحاں نہ ہوا

وہ حالِ زار ہے میرا کہ گاہ غیر سے بھی
تمہارے سامنے یہ ماجرا بیاں نہ ہوا

امید وعدۂ دیدار، حشر پر مومن
تو بے مزہ تھا کہ حسرت کشِ بتاں نہ ہوا

○

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج، راحت فزا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

اس نے کیا جانے کیا کیا لے کر
دل کسی کام کا نہیں ہوتا

نارسائی سے دم رکے تو رکے
میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حالِ دل یار کو لکھوں کیوں کر
ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

رحم کر اپنی جانِ غیر نہ ہو
سب کا دل ایک سا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو
دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرضِ مضطرب مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

○

رو یا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح
اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح

مر چک کہیں کہ اس غمِ ہجراں سے چھوٹ جائے
کہتے تو ہیں بھلے کی، ولیکن بری طرح

نے تابِ ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں
کم بخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح

لگتی ہیں گالیاں بھی ترے منہ سے کیا بھلی
قربان جیسے! پھر مجھے کہہ لے اسی طرح

پامال ہم نہ ہوتے فقط جورِ چرخ سے
آئی ہماری جان پہ آفت کئی طرح

بنے جائے واں بنے ہے نہ بن جائے چین ہے
کیا کیجیے! ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح

ہوں جاں بلب بتانِ ستم گر کے ہاتھ سے
کیا سب جہاں میں جیتے ہیں مومن اسی طرح

○

قہر ہے موت ہے قضا ہے عشق
سچ تو یہ ہے بری بلا ہے عشق!

اثرِ غم ذرا بتا دینا
وہ بہت پوچھتے ہیں: کیا ہے عشق؟

آفتِ جاں ہے کوئی پردہ نشیں
کہ مرے دل میں آ چھپا ہے عشق

بوالہوس اور لافِ جاں بازی
کھیل ہی کیا سمجھ لیا ہے عشق

سوجھے کیوں کر فریبِ دل داری
دشمنِ آشنا نما ہے عشق!

کس ملاحت سرشت کو چاہا
تلخ کامی پہ با مزا ہے عشق

ہم کو ترجیح تم پہ ہے یعنی
دل رُبا حسن و جاں رُبا ہے عشق

دیکھئے! کس جگہ ڈبو دے گا
میری کشتی کا ناخدا ہے عشق

وصل میں احتمالِ شادیِ مرگ
چارہ گر! درد بے دوا ہے عشق

اب تو دل! عشق کا مزہ چکھا
ہم نہ کہتے تھے کیوں بُرا ہے عشق

آپ مجھ سے بنا ہیں گے، سچ ہے
با وفا حسن، بے وفا ہے عشق

قیس و فرہاد و وامق و مومن
مر گئے سب ہی کیا وبا ہے عشق

○

اب اور سے تو لگائیں گے ہم
جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

برباد نہ جائے گی گدورت
کیا کیا تری خاک اڑائیں گے ہم

دل دے کے اک اور لالہ رُو کو
ہر داغ پہ داغ کھائیں گے ہم

لب کا ترے دعویٰ مسیحی
مر اور پہ آزمائیں گے ہم

گر تیری طرف کو بے قراری
کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم

گر دیکھ کے ہنس دیا ہمیں تو
منہ پھیر کے مسکرائیں گے ہم

گر خواب میں آن کر جگایا
سوتے مُردے جگائیں گے ہم

آتا ہے گلے سے دھیان تیرے
خاطر میں ستم نہ لائیں گے ہم

بُت خانہ چمن ہو گو ترا گھر
مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

○

کہتے ہو، تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

رہتے ہیں جمع گوشۂ چلمن میں حاصل و علم
آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں

آنکھ اس کی پھر گئی تھی، دل اپنا بھی پھر گیا
یہ اور انقلاب ہوا، انقلاب میں!

بدنام میرے گریۂ رسوا سے ہو چکے
اب عذر کیا رہا، نگہِ بے حجاب میں

مطلب کی جستجو نے یہ کیا حال کر دیا
حسرت بھی اب نہیں دلِ ناکامیاب میں

ناکامیوں سے کام رہا عمر بھر ہمیں
پیری میں یاس ہے، جو ہوس تھی شباب میں

دونوں کا ایک حال ہے یہ مدعا ہو کاش!
وہ ہی خط اس نے بھیج دیا کیوں جواب میں

تقدیر بھی بُری مری، تدبیر بھی بُری
بگڑے وہ پرسشِ سببِ اجتناب میں

کیا جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں
بے بادہ مست ہوں میں شبِ ماہتاب میں

پیہم سجود، پائے صنم پر دمِ وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

○

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
سنو! ذکر ہے کئی سال کا، کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا

کہا میں نے بات وہ کوٹھے کی، مرے دل سے صاف اتر گئی
وہ بگڑنا وصل کی رات کا، وہ نہ ماننا کسی بات کا

وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا، تمھیں یاد ہو کہ یاد ہو

○

اُٹھے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں، عذرِ جفا کے ساتھ

بہرِ عیادت آئے وہ، لیکن قضا کے ساتھ
دم ہی نکل گیا مرا، آوازِ پا کے ساتھ

بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے
اُٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ

وہ لالہ رُو گیا نہ ہو گلگشتِ باغ کو
کچھ رنگ بُوئے گل کے عوض ہے صبا کے ساتھ

اس کی گلی کہاں؟ یہ تو کچھ باغِ خلد ہے
کس جائے مجھ کو چھوڑ گئی موت لا کے ساتھ

آتی ہے بُوئے داغ، شبِ تارِ ہجر میں
سینہ بھی چاک ہو نہ گیا ہو، قبا کے ساتھ

تھے وعدے سے پھر آنے کے خوش، یہ خبر نہ تھی
ہے اپنی زندگانی اسی بے وفا کے ساتھ

اللہ ری گمرہی، بتِ دُبت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

○

ا وک ادا ز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے، کئی بے جاں ہوں گے

تاب نظارہ نہیں، آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر، جو حیراں ہوں گے

تو کہاں جائے گی، کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے

ہم نکالیں گے منہ اے موج ہوا، بل تیرا
اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

منت حضرت عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لیے شرمندۂ احساں ہوں گے

چاک پردہ سے یہ عنقے ہیں تو اے پردہ نشیں!
ایک میں کیا کہ کبھی چاک گریباں ہوں گے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں وہی خار مغیلاں ہوں گے

سنگ اور ہاتھ وہی، وہ ہی سر و داغ جنوں
وہی ہم ہوں گے، وہی دشت و بیاباں ہوں گے

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

○

وہ کہاں ساتھ سلاتے ہیں مجھے
خواب کیا کیا نظر آتے ہیں مجھے

اس پری وش سے لگاتے ہیں مجھے
لوگ دیوانہ بناتے ہیں مجھے

یارب! ان کا بھی جنازہ اٹھے
یار اس کو سے اٹھاتے ہیں مجھے

بے وفائی کا عدو کی ہے گلا،
لطف میں بھی وہ ستاتے ہیں مجھے

حیرت حسن سے یہ شکل بنی!
کہ وہ آئینہ دکھاتے ہیں مجھے

پھونک دے آتش دل داغ مرے
اس کی خو یاد دلاتے ہیں مجھے

گر کہے غمزہ، کسے قتل کروں
تو اشارت سے بتاتے ہیں مجھے

میں تو اس زلف کی بو پر غش ہوں
چارہ گر مشک سنگھاتے ہیں مجھے

شعلہ رو کہتے ہیں اغیار کو وہ
اپنے نزدیک جلاتے ہیں مجھے

جاں گئی، پر نہ گئی جور کشی
بعد مردن بھی دباتے ہیں مجھے

وہ جو کہتے ہیں تجھے آگ لگے
مژدۂ وصل سناتے ہیں مجھے

اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں
تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے

مومن اور دیر خدا خیر کرے
طور بیڈھب نظر آتے ہیں مجھے

ذوقؔ

○

اسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا
اگر پایا، تو کھوج اپنا نہ پایا

مقدر ہی پہ گر سود و زیاں ہے
تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا

رہا ٹیڑھا مثالِ نیشِ کژدم
کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا

احاطے سے فلک کے ہم تو باہر
نکل جاتے، مگر رستا نہ پایا

جہاں دیکھا، کسی کے ساتھ دیکھا
کبھی ہم نے تجھے تنہا نہ پایا

کہے کیا ہائے زخمِ دل ہمارا
دہن پایا، لبِ گویا نہ پایا

کبھی تو، اور کبھی بیزار ہا غم
غرض خالی دلِ شیدا نہ پایا

نظیر اس کا کہاں عالم میں اے ذوقؔ
کہیں ایسا نہ پائے گا، نہ پایا

○

کسی بے کس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو، اس کو گر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو، جو خاک ہوا اکسیر بن جاتا
اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

نہیں وہ قول کا سچا، ہمیشہ قول دے دے کر
جو اس نے ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا تو کیا مارا

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

دلِ سنگینِ خسرو پر بھی ضرب اے کوہ کن پہنچا
اگر تیشہ سرِ کہسار پر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے پر
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

دلِ بدخواہ میں تھا مارنا، یا چشمِ بد بیں میں
فلک پر ذوقؔ تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

○

کیا آئے تم جو آنے کی گھڑی دو گھڑی کے بعد
سینے میں ہو گئی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد

کیا رو کا اپنے گریہ کو ہم نے کہ لگ گئی!
پھر وہ ہی آنسوؤں کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

کوئی گھڑی اگر وہ ملائم ہوئے تو کیا
کہہ بیٹھیں گے پھر ایک کڑی دو گھڑی کے بعد

کہتا رہا کچھ اُن سے عدو دو گھڑی تلک!
غمّاز نے پھر اور جڑی دو گھڑی کے بعد

تھے دو گھڑی سے شیخ جی شیخی بگھارتے
ساری وہ شیخی اُن کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

○

ہاں! نالۂ دمِ نا وک فگنی خوب نہیں
ابھی چھاتی مری تیروں سے چھنی خوب نہیں

گل پریشان ہوا ہنس کے چمن میں آخر!
دیکھ اے غنچہ یہاں خندہ زنی خوب نہیں

یہ نہیں شیشۂ مے ہے کسی مے خوار کا دل
محتسب دیکھ کہ دل شکنی خوب نہیں

بات تو ہم نے بنائی تھی وہاں خوب، مگر
تھی جو بگڑی ہوئی قسمت تو بنی خوب نہیں

خلشِ خار کا کھٹکا ہے بغل میں موجود
دیکھ! گل ہے دعویٔ نازکِ بدنی خوب نہیں

○

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

ناخن نہ دے خدا تجھے اے پنجۂ جنوں
دے گا تمام عقل کے بخیے ادھیڑ تو

اے زاہدِ دو رنگ نہ پیرِ آپ کو بنا
مانندِ صبح کاذب ابھی ہے ادھیڑ تو

اس صیدِ مضطرب کو تامل سے ذبح کر
دامانِ واسکیں نہ لہو میں لتھیڑ تو

آوارگی سے کوئے محبت کی ہاتھ اٹھا
اے ذوقؔ یہ اٹھا نہ سکے گا کھکیڑ تو

○

تیز اس نے جو کی تیغ ستم اور زیادہ
مشتاقِ شہادت ہوئے ہم او۔ زیادہ

کچھ کی رسمِ شوق نے تاثیر چو پیدا
اُٹھنے لگا قاصد کا قدم اور زیادہ

دشمن کی نہ جا سیدھی نگاہوں پہ کہ جوں تیغ
سیدھی ہے تو اک اس میں ہے دم اور زیادہ

ہے نکہتِ ریحاں کا دماغ اب کسے تجھ بن
آتا ہے مرا ناک میں دم اور زیادہ

جو کچھ قناعت میں ہیں تقدیر پہ شاکر
ہے ذوقؔ برابر اُنھیں کم اور زیادہ

○

ترے کوچے کو وہ بیمارِ غم دارالشفا سمجھے
اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے

وہی کچھ تلخ کام اس زندگانی کا مزا سمجھے
کہ جو زہراب تیغ یار کو آبِ بقا سمجھے

ستم کو ہم کرم سمجھے، جفا کو ہم وفا سمجھے
اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت سے خدا سمجھے

بجھے اے سنگ دل! آرامِ جانِ مبتلا سمجھے
پڑیں پتھر سمجھ پر ایسی ہم سمجھے تو کیا سمجھے

حساب اعلانیہ پوچھے مجھ سے میرے قتل کنے زخموں کا
حساب دوستاں در دل اگر وہ دل رُبا سمجھے

محبت سے ذرا گر موم ہو اس دل شکن کا دل
دلِ شکستہ میرا اپنے حق میں مومیا سمجھے

عدو آیا ہے بن کر نامہ بر، لکھا نصیبوں کا!
کریں گے لے کے خط کیا؟ مدعی سے مدعا سمجھے

نشانِ کار ہم نے پنجۂ تقدیر کو سونپا!
خود کے تیز ناخن، ناخنِ انگشتِ پا سمجھے

مجھے ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات دو تک اس کی
کوئی جانے تو کیا جانے، کوئی سمجھے، تو کیا سمجھے

○

خوب روکاشکایتوں سے مجھے
تو نے مارا عنایتوں سے مجھے

کہتے کیا کیا ہیں دیکھ تو اغیار
یار! تیری حمایتوں سے مجھے

واجب القتل اُس نے ٹھہرایا
آیتوں سے، روایتوں سے مجھے

سمجھے ہے واجب الرعایت دوست
دشمنوں کی رعایتوں سے مجھے

کر نہ گریے میں تو کمی اے چشم!
شوق کم ہے کفایتوں سے مجھے

○

الٰہی! کس بے گنہ کو مارا، سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے
کہ آج کوچے میں شور اس کے بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلْتُنِیْ ہے

زمیں پہ نورِ قمر کے گرنے سے صاف اظہارِ روشنی ہے
کہ ہیں جو روشن ضمیر اُن کا فروغ، اُن کی فروتنی ہے

بسترِ جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا، یہ اس کی فروتنی ہے
وگرنہ قندیلِ عرش میں بھی اسی کے جلوے کی روشنی ہے

ہوئے ہیں تر گریۂ ندامت سے اس قدر آستین و دامن
کہ میری تر دامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے

ہوئے ہیں اس اپنی سادگی سے ہم آشنا جنگ و آشتی سے
اگر نہ ہو یہ تو پھر کسی سے نہ دوستی ہے نہ دشمنی ہے

نہیں ہے قانع کو خواہشِ زر، وہ مفلسی میں بھی ہے تونگر
جہاں میں مانندِ کیمیا گر، ہمیشہ محتاج دل غنی ہے

کوئی ہے کافر کوئی مسلماں، جدا ہے ہر اک کی راہِ ایماں
جو اس کے نزدیک رہبری ہے وہ اس کے نزدیک رہزنی ہے

○

ابر تر، آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
برقِ مضطر، تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

خط میں لکھوا کر انھیں بھیجا تو مطلع درد کا!
دردِ دل اپنا جتانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

تیغ تو ادھی پڑی تھی، گر پڑے ہم آپ سے
دل کو قاتل کے بڑھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

واں ہلے ابرو، یہاں گردن پہ پھیری ہم نے تیغ
بات کا ایسا بھی پانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

سن کے آہ ان کی از خود رفتہ ہو جاتے ہیں ہم
پیشوا لیتے کو جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

ہم نے پہلے ہی کہا تھا، تو لڑے گا ہم کو قتل
تیوروں کا تاڑ جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

کیا ہوا اے ذوق، ہیں جس پر خدا
یک سکھر میں سماکا

بہادر شاہ ظفر

○

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تو نے
کیوں خرد مند بنایا، نہ بنایا ہوتا

غالباً بے کسی کے یے گرچہ بنایا تھا مجھے
کاش! خاکِ درِ جانانہ بنایا ہوتا

نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو
خم کا خم تو نہ پیمانہ بنایا ہوتا

صوفیوں کے جو نہ تھا لائقِ صحبت تو مجھے
قابلِ جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا

تھا جلانا ہی اگر دوریٔ ساقی سے مجھے
تو چراغِ درِ میخانہ بنایا ہوتا

شعلۂ حسن چمن میں نہ دکھایا اس نے
ورنہ بلبل کو بھی پروانہ بنایا ہوتا

کہہ رہ دنیا میں خرابی ہے ظفر
کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

○

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اٹھا، وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہے پردہ میں اب نہ وہ پردہ نشیں، کوئی دوسرا اس کے سوا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

ترے رخ کے خیال میں کون سے دن اٹھے مجھ پہ نہ فتنۂ روزِ جزا
تری زلف کے دھیان میں کون سی شب مرے سر پہ ہجوم بلا نہ رہا

ہمیں ساغر و بادہ کے دینے ہیں تو کرے دیر جو ساقیٔ قہر و غضب
کہ یہ عہدِ نشاط، یہ دورِ طرب، نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا،

کئی روز میں آج وہ ماہ لقا ہوا میرے جو سامنے جلوہ نما
مجھے صبر و قرار ذرا نہ رہا، اسے پاسِ حجاب و حیا نہ رہا

ترے خنجر و تیغ کی آب رواں ہوئی جبکہ سبیلِ ستم زدگاں
گئے کتنے ہی قافلے خشک زباں کوئی تشنۂ آب بقا نہ رہا

مجھے صاف بتائے نگار اگر تو یہ پوچھوں میں رو رو خونِ جگر
ملے پاؤں سے کس کے ہیں دیدۂ تر، کفِ پا پہ جو رنگِ حنا نہ رہا

اسے چاہا تھا میں نے کہ روک رکھوں مری جان بھی جائے تو جانے نہ دوں
کیے لاکھ فریب کروڑ فسوں نہ رہا، نہ رہا، نہ رہا، نہ رہا،

ملے یوں تو ہزاروں ہیں تیر ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
ولے ناز و کرشمہ کی تیغ دو دم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

○

کسی نے اس کو سمجھایا تو ہوتا
کوئی یاں تک اُسے لایا تو ہوتا

مزا رکھتا ہے زخمِ خنجرِ عشق
کبھی اے بوالہوس کھایا تو ہوتا

یہ نخلِ آہ ہوتا بید ہی کاش
نہ ہوتا گو ثمر، سایا تو ہوتا

جو کچھ ہوتا سو ہوتا تو نے تقدیر
وہاں تک مجھ کو پہنچایا تو ہوتا

کیا کس جرم پر تو نے مجھے قتل
ذرا تو دل میں شرمایا تو ہوتا

دل اس کی زلف میں الجھا ہے کب سے
ظفر اک روز سلجھایا تو ہوتا

○

نہ ہرگز درد دل سے میں کراہا
غرض پوشیدہ الفت کو نباہا

محبت کے یہ معنی ہیں کہ میں نے
وہی چاہا کہ جو کچھ تو نے چاہا

فقیروں سے نہ پوچھو لذتِ عشق
اہاہا! اہاہا!! اہاہا!!!

صَرَفْتُ الْعُمْرَ فِی لَهْوٍ وَلَعِبٍ
فَآهَا! ثُمَّ آهَا!! ثُمَّ آهَا

ظفر کو باز رکھ اعمالِ بد سے
خطا بخشا! کریم گارا! الٰہا!

○

یار تھا گلزار تھا، مے تھی، فضا تھی، میں نہ تھا
لائقِ بوسِ جاناں، کیا حنا تھی، میں نہ تھا

ہاتھ کیوں باندھے مرے پہلا اگر چوری گیا
یہ سراپا شوخیٔ دزدِ حنا تھی، میں نہ تھا

بے خودی میں لے لیا بوسہ، خطا کیجے معاف
یہ دلِ بے تاب کی ساری خطا تھی، میں نہ تھا

ہائے ساقی! یہ ہجومِ ساماں اور عاشق واں نہ ہو
بار تھا، سبزہ تھا، بدلی تھی، ہوا تھی میں نہ تھا

میں سسکتا رہ گیا اور مر گئے فرہاد و قیس
کیا انھیں دونوں کے حصے میں قضا تھی میں نہ تھا؟

میں نے پوچھا کیا ہوا وہ آپ کا حسن و شباب
سن کے بولا وہ صنم، شانِ خدا تھی، میں نہ تھا

اے ظفر یہ دل پہ میرے داغ کیسا رہ گیا
خانۂ باغِ بہار میں خلقِ خدا تھی، میں نہ تھا

○

پسِ مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اسے آہ دامنِ باد نے سرِ شام ہی سے بجھا دیا

مجھے دفن کرنا تو جس گھڑی تو یہ اس سے کہنا کہ اے پری
وہ جو تیرا عاشقِ زار تھا، تہِ خاک اس کو دبا دیا

دمِ غسل سے مرے پیشتر اسے ہمدموں نے یہ سوچ کر
کہیں جائے اس کا زوالِ دل، مری لاش پر سے ہٹا دیا

میری آنکھ جھپکی تھی ایک پل مرے دل نے چاہا کہ اٹھ کے چل
دلِ بیقرار نے ادھر ادھر، وہیں چٹکی لے کے جگا دیا

میں نے دل دیا میں نے جان دی، مگر آہ تو نے نہ قدر کی
کسی بات کو جو کبھی کہا، اسے چٹکیوں میں اڑا دیا

○

جلایا آپ ہم نے ضبط کر کے آہِ سوزاں کو
جگر کو، سینے کو، پہلو کو، دل کو، جسم کو، جاں کو

ہمیشہ کنجِ تنہائی میں ہم مونس سمجھتے ہیں
الم کو، یاس کو، حسرت کو، بیتابی کو، حرماں کو

ترے انداز و رُوئی و قد و زلفِ خط سے ہے تجلّت
سمن کو، ارغواں کو، سرو کو، سنبل کو، ریحاں کو

جگر کن کن کو دُوں دل میں ترے غمزوں سے ہے قتّال
کٹاری کو، چھری کو، بانک کو، خنجر کو، پیکاں کو

ترے دندان و لب نے کر دیا بے قدر عالم میں
گہر کو، لعل کو، یاقوت کو، ہیرے کو، مرجاں کو

دلا کر آنکھ اُس سے ہم نے دشمن کر لیا اپنا
نگہ کو، ناز کو، انداز کو، ابرو کو، مژگاں کو

نہیں تعقل، دعا دیتا ہے شیشہ دم بدم ساقی
سبُو کو، خم کو، مے کو، مے کدہ کو، مے پرستاں کو

نہ ہو جب تو ہی اے ساقی! بھلا پھر کیا کرے کوئی
ہوا کو، ابر کو، گل کو، چمن کو، صحنِ بستاں کو

بنایا اے ظفر خالق نے کب انسان سے بہتر
ملک کو، دیو کو، جن کو، پری کو، حور و غلماں کو

○

بہار آئی ہے بھر دے بادۂ گل گوں سے پیمانہ
رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد مے خانہ

اسی رشکِ پری پر جان دیتا ہوں میں دیوانہ
ادا جس کی ہے بانکی، ترچھی چتون، چال مستانہ

نہ جانے کیوں کر مرے اور اس پری پیکر کے یارانہ
وہ بے پروا ہیں سودائی، وہ سنگیں دل، میں دیوانہ

مجھے آنا ملے کیوں کر تری محفل میں جانانہ
مری صورت فقیرانہ، ترا دربار شاہانہ

غزالِ دشت بولے دیکھ کر مجنوں کی ہیئت کو
یہ وحشی مر گیا بس ہو چکا آباد ویرانہ

ہمارے اور تمہارے عشق کا چرچا ہے شہروں میں
کوئی سُنتا نہیں اب لیلیٰ و مجنوں کا افسانہ

گزر یارب! گلستاں میں ہوا ہے کس شرابی کا
کہ شاخیں جھومتی ہیں، نالۂ بلبل ہے مستانہ

ظفر وہ زاہدِ بے درد کی "ہو حق" سے بہتر ہے
کرے گر رند دردِ دل سے ہائے و ہوئے مستانہ

○

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل! کبھی ایسی تو نہ تھی

تیری آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

مکھ رخسار نے کس کے ہے تجھے چمکایا
تاب تجھ میں مہ کامل کبھی ایسی تو نہ تھی

کیا سبب تو جو بگڑتا ہے ظفر سے ہر بار
خو تری حور شمائل کبھی ایسی تو نہ تھی

○

تری جو پا زیب سر کا جھومر زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر
ہوئے ہیں جلوہ نما چمک کر زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

وفور اشکوں کا ہے ہمارے نکلتے باتوں میں ہیں شرارے
نہ کیوں کہ ہوں عرش پہ چھما در زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

پھپھولے پاؤں میں ہیں نمایاں تو سر پہ داغ جنوں فراواں
نہ دیکھیں دیوانے تیرے کیوں کر زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

ذرا جبیں عرق فشاں پر تو اپنی، افشاں دکھائے چن کر
کہ تا نظر آویں ماہ پیکر زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

ادھر تو فوارے چھوٹتے ہیں ادھر ہیں اشجار پر چراغاں
نئی ہے سیر اک چمن کے اندر زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

نہ سبزہ و گل نہ جوش شبنم نہ چہکے بلبل نہ ہو ا پہ ہر دم
نظر شب آتے تھے مجھ کو یکسر زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

زمیں نہایت ہی تھی یہ مشکل ظفر ہے استاد پر وہ کامل
غرض دکھا دی وہی بنا کر زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

شیفتہ

○

جفا و جور کا اس سے گلا کیا — جو پوچھے : مہربانی کیا ، وفا کیا
وہ بے پروا ، جواب نامہ لکھتے — خدا جانے کہ دشمن نے لکھا کیا
نہ لکھنا تھا غمِ ناکامیٔ عشق — جوابِ نامۂ بے مدعا کیا
ہمیں تھا آپ قصدِ عرضِ احوال — جو وہ خود پوچھتے ہیں پوچھنا کیا
کہا کل میں نے اے سرمایۂ ناز! — تلوّن سے ہے تم کو مدعا کیا
کبھی مجھ پر عتابِ بے سبب کیوں — کبھی بے وجہ غیروں سے وفا کیا
کبھی محفل میں وہ بے باکیاں کیوں — کبھی خلوت میں یہ شرم و حیا کیا
کبھی تمکینِ صولت آفریں کیوں — کبھی الطافِ جرأت آزما کیا
کبھی وہ طعنہ ہائے جاں گزا کیوں — کبھی یہ غمزہ ہائے جاں فزا کیا
کبھی شعروں سے میرے نغمہ سازی — کبھی کہنا کہ یہ تم نے کیا کیا
کبھی بے جرم یہ آزردہ ہونا — کہ کیا طاقت جو پوچھوں میں خطا کیا
کبھی اس دشمنی پر بہرِ تسکیں — پئے ہم جلوہ ہائے دل رُبا کیا
یہ سب طول اس نے کن کر بے تکلف — جواب اک مختصر مجھ کو دیا کیا

ابھی اے شیفتہ واقف نہیں تم
کہ باتیں عشق میں ہوتی ہیں کیا کیا

○

اُٹھے نہ چھوڑ کے ہم آستانِ بادہ فروش
طلسمِ ہوش رُبا ہے ، دکانِ بادہ فروش

کھلا جو پردۂ روئے حقائقِ اشیا
کھلی حقیقتِ رازِ نہانِ بادہ فروش

فسردہ طینتی و کاہلی سے ہم نے کبھی
شباب میں بھی نہ دیکھی دکانِ بادہ فروش

قدح سے دل ہے مرا دور سے عشق عرض
میں وہ نہیں کہ نہ سمجھوں زبانِ بادہ فروش

عجب نہیں کہ کسی روز وہ بھی آ نکلیں
کہ ہے گزرگہِ خلقِ آستانِ بادہ فروش

مئے سرور کے اسرار آپ آ کر دیکھ
نہ پوچھ مجھ سے کہ ہوں رازداں بادہ فروش

شراب دیکھ کہ کس رنگ کی پلاتا ہے
جُز اس کے اور نہیں امتحانِ بادہ فروش

تری شمیم نے گلزار کو کیا برباد
تری نگاہ نے لوٹی دکانِ بادہ فروش

عبث ہے شیفتہ ہر اک سے پوچھتے پھرنا
ملے گا بادہ کشوں سے نشانِ بادہ فروش

○

کچھ درد ہے مطربوں کی لَے میں
کچھ آگ بھری ہوئی ہے نے میں

کچھ زہر اُگل رہی ہے بُلبُل
کچھ زہر ملا ہوا ہے مے میں

بدمست جہاں ہو رہا ہے
ہے یار کی بُو ہر ایک شے میں

ہے مستیٔ نیم جام کا ڈر
انوار ہے جامِ مے پیے میں

مے خانہ میں قدم نہ رکھیں
زہدِ جسم و بارگاہِ کے میں

کچھ شیفتہ یہ غزل ہے آفت
کچھ درد ہے مطربوں کی لَے میں

○

گرم جوشی ہے، مگر فرقِ شرارت میں نہیں
چھیڑ کس بات میں، طعنہ کس اشارت میں نہیں

رات ساقی نے کہا: جس کے یہ سب جلوے ہیں
وہ عبارت میں نہیں اور اشارت میں نہیں

ہم کو مقصد سے زیادہ ہے ادب میں کوشش
ورنہ کچھ غیر سوا ہم سے جسارت میں نہیں

رند فارغ بھی ہوئے جامِ سحر گاہی سے
اور زاہد ابھی آہنگِ طہارت میں نہیں

فرحتِ نفس جو وہ ہے تو یہ ہے راحتِ روح
کیا بزرگی میں مزہ ہے جو حقارت میں نہیں

اہلِ دانش کے فوائد کی تو کیا بات، مگر
غور سے دیکھو تو عاشق بھی خسارت میں نہیں

جامِ مے دے کہ وہاں کام پڑا ہے مجھ کو
کہ صبا کو بھی جہاں دخل سفارت میں نہیں

قتل و غارت کہ سمجھتے ہو جسے امرِ عظیم
یہ تو داخل بھی وہاں ناز و شرارت میں نہیں

دل کے بدلے میں طلب گار نہیں کچھ تم سے
شیفتہ زمرۂ اصحابِ تجارت میں نہیں

○

مت چھیڑ کہ یار سے جُدا ہوں
اے مرگ! میں آپ مر رہا ہوں

ممکن نہیں بن ملے رہا ہوں
بیگانۂ آشنا نما ہوں

بلبل کُنے سے بگڑ گئے تھے
دیوانہ میں جان کر بنا ہوں

کہتا ہوں جو غیر سے نہ ملنے
کہتا ہے کہ کیا میں بے وفا ہوں

روشن ہے مری سیاہ بختی
منت کشِ سایۂ ہما ہوں

بیگانہ وشی ستم ہے ان کی
غیروں کو بھی یار جانتا ہوں

اس غیرتِ گُل سے ربط معلوم
ہر چند میں ہمدمِ صبا ہوں

ہمدم! نہ سہی محبت اس کو
اس بات پہ کیا اسے نہ چاہوں؟

منکشف ہُوا فروغِ مے سے
ذرہ میں کس آفتاب کا ہوں

میں شیفتہ ہوں عزیز دل ہا
شیریں گفتار، خوش ادا ہوں

○

ہے گو نہ گو نہ شک ابھی عفوِ گناہ میں
جو ہے زبان پر وہ نہیں ہے نگاہ میں

تمکین، اضطراب ہے، بیدادِ التفات
کیا شوخیٔ اثر ہے سراسیمہ آہ میں

ہر خارہ خس ہے وجد میں، ہر سنگ و خشت مست
کیا مے کشوں نے آ کے کہا خانقاہ میں؟

دشمن سے بھی زیادہ ہے، گو دوست کیوں نہ ہو
ہاں جائے جو کوئی ترے کوچہ کی راہ میں

صیاد دل فریب کا اللہ رے لطفِ عام
بے زخم ایک صید نہیں صید گاہ میں

دن رات جلوے دیکھتے ہیں مہر و ماہ کے
یہ روشنی نہ مہر میں دیکھی، نہ ماہ میں

تجھ کو نظر نہ آئے، تو اپنا علاج کر
ہے مرغزارِ جلوہ نما برگِ کاہ میں

دھوکا بھی کو صرف نہیں میلِ یار کا
دیکھا بڑے بڑوں کو اسی اشتباہ میں

ہر شیوہ اس کا اپنی جگہ میں تمام ہے
اعجاز بات میں ہے، تو جادو نگاہ میں

افسردہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
ملاقت میں کچھ مزہ ہے نہ لذت گناہ میں

○

شوخی نے تیری لطف نہ رکھا حجاب میں
جلوے نے تیرے آگ لگائی نقاب میں

آتشکدہ ہو چرخ میں لا آسمان کو
آ رقص کر! زمین کو ڈال اضطراب میں

سو مہر کا فروغ ہے واں جلوہ گاہ میں
سو باغ کی شمیم ہے واں نخت خواب میں

وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا
وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

سالک کی یہ مراد کہ مجھ سا ہو نفس بھی
رہزن کو یہ خیال کہ رہرو ہو خواب میں

اس صوت جاں نواز کا ثانی بنا نہیں
کیا ڈھونڈتے ہو بربط و عود و رباب میں

اے وائے! روزِ حشر اگر ہم سے ہو سوال
جو کچھ کیا ہے ہم نے شبِ ماہتاب میں

شرم گنہ سے نہ بیم عقوبت، یہ سنگ ہے
ہے ہے اٹھائی اس نے اذیت عتاب میں

دلی نہ جانے آنکھ جو ساقی سے شیفتہ
ہ کو تو خاک لطف نہ آئے شراب میں

○

کیوں کر مجھے خط رقم کریں گے
کیا غیر کا سر قلم کریں گے

ہم پیشہ ہے اضطراب و شوخی
کس واسطے مجھ سے رم کریں گے

اتنی بھی بری ہے بے قراری
اب آپ سے اُنس کم کریں گے

مرنے کا مرے نہ ذکر کرنا
قاصد! وہ بہت الم کریں گے

آرام کی فکر اب ہوئی ہے
تم سے نہ ہوا، وہ ہم کریں گے

دلی میں تو شیفتہ ہے استاد
ہم قصد سوئے عجم کریں گے

○

سحر گئے جو وہ گلگشتِ گلستاں کے لیے
صبا پیش میں ہے گل ہائے بے خزاں کے لیے

انھیں ہے ہم سے محبت عمل کی کیا حاجت
اگر کرو تو کرو ان کے پاسباں کے لیے

وہ اپنے باغ میں ہم کو ضرور رکھتے گا،
جو بلبلوں کو نہ دے حکم آشیاں کے لیے

کرم کرم نہ سمجھ، گر کسی غرض سے ہو
ستم ستم نہ سمجھ گر ہو امتحاں کے لیے

کب آپ آئے کہ طاقت نہیں الٹنے کی
کب آپ آئے کہ جنبش نہیں زباں کے لیے

نہ میکدہ میں ترانہ، نہ خانقہ میں سماع
دعائے خیر ہے اس آفتِ جہاں کے لیے

زیاں ہے عشق میں ہم خود بھی جانتے ہیں مگر
معاملہ ہی کیا ہو اگر زیاں کے لیے؟

ہمارے ساتھ ہیں وہ موشگافیاں کہ نہ پوچھ
یہ نکتہ بس ہے کہ آفت ہے نکتہ داں کے لیے

اثر اگرچہ بنا بہرِ نازِ دل کشِ دوست
مگر کچھ اپنی بھی آہِ جگر فشاں کے لیے

یہ ضبطِ راز کی تعلیم شیفتہ بے جا
زبان ہم کو ملی ہے اگر بیاں کے لیے

○

بچتے ہیں اس قدر جو اُدھر کی ہوا سے ہم
واقف ہیں شیوۂ دلِ شورش ادا سے ہم

چلتے ہیں میکدہ کو، کہاں یہ عزیز واں
رخصت تو ہو لیں کبر و نفاق و ریا سے ہم

اے جوشِ رشکِ قربِ عدو، اب تو مت اٹھا
بیٹھے ہیں دیکھ بزم میں کس التجا سے ہم

ہے جامہ پارہ پارہ، دل و سینہ چاک چاک
دیوانہ ہو گئے گلِ جیبِ قبا سے ہم

کیا جانتے تھے صبح وہ محشر قد آئے گا
شامِ شبِ فراق نہ مرتے بلا سے ہم

بیگانہ جب سے یار ہمارا ہے رقیب سے
امید قطع کر چکے، ہر آشنا سے ہم

بلبل یہ کہہ رہی ہے سرِ شاخسار
بدمست ہو رہے ہیں چمن کی ہوا سے

کم التفات ہم سے سمجھتے ہیں اہلِ
شرمندہ ہو گئے تری شرم و حیا سے

ہاں شیفتہ پھر اس میں نصیحت ہی
سنتے ہیں حرفِ تلخ کو سمعِ رضا سے

ناسخ لکھنوی

○

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

چمکنا برق کا لازم پڑا ہے آبِ باراں میں
تصور چاہیئے رونے میں اس کے روئے خنداں کا

کفن کی جب سفیدی دیکھتا ہوں کنجِ مرقد میں
تو عالم یاد آتا ہے شبِ مہتابِ ہجراں کا

دیا میرے جنازے کو جو کاندھا اس پری رُو نے
گماں ہے تختۂ تابوت پر تختِ سلیماں کا

وہ شوخ فتنہ انگیز اپنی خاطر میں سمایا ہے
کہ یک گوشہ ہے صحرائے قیامت اس کے داماں کا

تہِ شمشیرِ قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ
کہ عالم ہر دہانِ زخم پر ہے رُوئے خنداں کا

○

ساتھ اپنے جو مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر مجھ کو دلِ زار نے سونے نہ دیا

خواب ہی میں نظر آتا وہ شبِ ہجر کہیں
سو مجھے حسرتِ دیدار نے سونے نہ دیا

خفتگی بخت کی کیا کہیے کہ جز خوابِ عدم
عمر بھر دیدۂ بیدار نے سونے نہ دیا

یہی صیاد گلا کرتا ہے میرا، ہر صبح
نالۂ مرغِ گرفتار نے سونے نہ دیا

سمجھے تھے بعد فنا پائیں گے راحت ناسخ
حشر تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

○

کیوں دکھائی اے فلک! بے یار صبح
ہے شفق سے مجھ پہ آتش بار صبح

یاں کسی خورشید رُو کی یاد میں
ہوتی ہے ہر رات سو سو بار صبح

زلف سے رخسار کو ہوتا ہے ربط
کیوں شبِ فرقت سے ہے بیزار صبح

وصل کا ساماں ہے آج اے فلک!
شام سے کر پیشتر تیار صبح

حسن کا عالم بھی کیسا عالم ہے واہ
زلفِ جاناں شام ہے، رخسار صبح

وصل میں تھا صبح سے بیزار میں
ہجر کی شب مجھ سے ہے بیزار صبح

شام کیا ہو تیرے گھر میں بار یاب
نور سے ہیں سایۂ دیوار صبح

ہے یہاں کس کو شبِ فرقت میں ہوش
ہو چکی ہوگی ہزاروں بار صبح

○

تو مجھ سے ہو ہم کنار قاصد
کر لوں میں تجھ کو پیار قاصد

برآئی ترے قدم کی دولت
امید امیدوار قاصد

آنکھوں سے نکالوں پاؤں پھیلا
گر کوئی چھپا ہو خار قاصد

گر جاں بھی دوں تجھے تو کم ہے
ہوں سخت میں شرمسار قاصد

ناسخ یہی تجھ سے پوچھتا
کیسا ہے مزاجِ یار قاصد

○

سب ہمارے پاؤں میں زنجیر لیے پھرتے ہیں
ہم سرِ زلفِ گرہ گیر لیے پھرتے ہیں

کون تھا صید وفادار کہ اب تک صیاد
بال و پر اس کے ترے تیر لیے پھرتے ہیں

تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لیے پھرتے ہیں

جوہرِ تیغ ہے جلا کس کو عداوت ہوگی
آپ کیوں ہاتھ میں شمشیر لیے پھرتے ہیں

○

دل میں پوشیدہ تپِ عشق نہاں رکھتے ہیں
آگ ہم سنگ کی مانند نہاں رکھتے ہیں

مثلِ پروانہ نہیں کچھ زر و مال اپنے پاس
ہم فقط تم پہ فدا کرنے کو جاں رکھتے ہیں

محفلِ یار میں کچھ بات نہ نکلی منہ سے
کہنے کو شمع کی مانند زباں رکھتے ہیں

ہوگیا زرد، پڑی جس کی حسینوں پہ نظر
یہ عجب گل ہیں کہ تاثیرِ خزاں رکھتے ہیں

ہم عوض ملکِ جہاں ملکِ سخن اے ناسخ
گو نہیں حکمِ رواں طبعِ رواں رکھتے ہیں

○

روز ہے گرمیٔ بازار ترے کوچے میں
جمع ہیں تیرے خریدار ترے کوچے میں

دیکھ کر تجھ کو، قدم اُٹھ نہیں سکتا اپنا
بن گئے صورتِ دیوار ترے کوچے میں

دیر ویراں ہے ترے عہد میں، کعبہ ہے خراب
جمع ہیں کافر و دیں دار ترے کوچے میں

روز ہی عشق نے یہ تفنہ تراوازی کی
ہم ہیں زنداں میں، دلِ زار ترے کوچے میں

آرزو ہے جو مروں میں، تو یہاں مدفن ہو
ہے جگہ تھوڑی سی درکار ترے کوچے میں

حالِ دل کہنے کا ناسخ جو نہیں پاتا بار
پھینک جاتا ہے وہ اشعار ترے کوچے میں

○

مجھ کو اب ساقیٔ گلفام سے کچھ کام نہیں
مے سے کچھ کام نہیں، جام سے کچھ کام نہیں

دل میں خوش آئی ہیں صحرا کی ببولیں پُرخار
اب تمنائے سر و گلِ اندام سے کچھ کام نہیں

اپنے آرام سے ہوں دشت جنوں میں تنہا
کسی محبوبِ دل آرام سے کچھ کام نہیں

خانہ برباد ہوں صحرا میں بگولوں کی طرح
سقف و دیوار و در و بام سے کچھ کام نہیں

طائرِ روحِ رمیدہ کی طرح چھوٹا ہوں
اب تو صیاد ترے دام سے کچھ کام نہیں

اتنی مدت سے ہوں غربت میں وطن بھول گیا
مجھ کو اب نامۂ و پیغام سے کچھ کام نہیں

○

اس ابر میں یار سے جدا ہوں
بجلی کی طرح تڑپ رہا ہوں

امید وصال اب کہاں سے
اس گل سے برنگِ بُو جدا ہوں

گلچیں ہوں اگر تو ہوں میں بے برگ
بلبل ہوں اگر تو بے نوا ہوں

سر رکھ کے کبھی وہ سو گیا تھا
اب تک زانو کو سونگھتا ہوں

آئینہ دل میں ہے ترا عکس
دن رات میں تجھ کو دیکھتا ہوں

ہے مہر و وفا سراسر اس میں
ناسخ کیوں کر اسے نہ چاہوں

○

رفعت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں
جس سرزمیں کے ہم ہیں وہاں آسماں نہیں

دو روز ایک وضع پہ رنگِ جہاں نہیں
وہ کون سا چمن ہے کہ جس کو خزاں نہیں

دشمن اگر وہ دوست ہوا ہے تو کیا عجب
یاں اعتبارِ دوستیِ جسم و جاں نہیں

منعم کے شکر میں بھی بلائیں کبھی کبھی
تنہا برائے لذتِ دنیا زباں نہیں

پژمردہ ایک ہے تو شگفتہ ہے دوسرا
باغِ جہاں میں فصلِ بہار و خزاں نہیں

آتش لکھنوی

○

سن تو سہی، جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا، غائبانہ کیا؟

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زرِ بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا، خزانہ کیا

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا، تو ہے آئینہ خانہ کیا

صیاد! اسیرِ دامِ رگِ گل ہے عندلیب
دکھلا رہا ہے چھپ کے اسے دام و دانہ کیا

طبل و علم نہ پاس ہے اپنے، نہ ملکِ مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

آتی ہے کس طرح سے مری قبضِ روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا

ترچھی نگہ سے طائرِ دل ہو چکا شکار
جب تیر کج پڑے گا، اڑے گا نشانہ کیا

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

○

شبِ وصل تھی، چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا، خدا مہرباں تھا

مبارک شبِ قدر سے بھی وہ شب تھی
سحر تک مہ و مشتری کا قراں تھا

وہ شب تھی کہ تھی روشنی جس میں دن کی
زمیں پر سے اک نور تا آسماں تھا

نکالے تھے دو چاند اُس نے مقابل
وہ شب، صبحِ جنت کا جس پر گماں تھا

عروسی کی شب کی حلاوت تھی حاصل
فرح ناک تھی روح، دل شادماں تھا

مشاہد جمالِ پری کی تھیں آنکھیں
مکانِ وصال اک طلسمی مکاں تھا

حضوری نگاہوں کو دیدار سے تھی،
کھلا تھا وہ پردہ کہ جو درمیاں تھا

حقیقت دکھاتا تھا عشقِ مجازی
نہاں جس کو سمجھے ہوئے تھے عیاں تھا

بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قصہ ہے جب کا، کہ آتش جواں تھا

○

تیری جو یاد اے دل خواہ! بھولا
باللہ بھولا، واللہ بھولا!!

فرقت کی شب میں جاں سوز دل نے
اُف اُف کیا جو، آہ آہ بھولا

کچھ رکھ نہ پاکو، جا دل سے غافل
پھیرا اس نے گھایا، جو راہ بھولا

زنار ڈالا، تسبیح پھینکی!
عشقِ صنم میں اللہ بھولا!

خود نے گرایا اس کو نظر سے
جو ذرہ تیری درگاہ بھولا

محروم رکھتا ساقی نے ہم کو
اپنے گدا کو جسم جاہ بھولا

بُت خانہ چھوڑا، باز آئے بت سے
وہ تھمر بھولا، وہ شاہ بھولا

شرطِ وفا کی کس بے وفا سے
آتش سا عارف، آگاہ بھولا

○

ترے کوچہ کا ہے اے خانہ خراب افسانہ آج
شیخ کعبہ چھوڑتا ہے، برہمن بت خانہ آج

خوب رُو تجھ سا کوئی بازارِ عالم میں نہیں
قیمتِ یوسف نہ تھی، جو ہے ترا بیعانہ آج

آمد آمد اس سراپا نور کی ہے بزم میں
شمع اُڑ جاوے، جو ہاتھ آئیں پر پروانہ آج

ہم نشیں! کہتے ہیں: ذکرِ عیش، نصفِ عیش ہے
میں کہوں، تو سن! جمالِ یار کا افسانہ آج

مجھ سے دریا نوش کو ساقی پلاتا ہے شراب
دیکھتا ہوں میں بھی ظرفِ شیشہ و پیمانہ آج

نقشِ آسیب پری ہے صورتِ زیبا تری
ہوش میں آتا ہے تجھ کو دیکھ کر دیوانہ آج

میرے مرنے کی دعا مانگے وہ بت پڑھ کر نماز
کس طرف جا کر کروں میں سجدۂ شکرانہ آج

نزع کی مشکل بھی آساں ہوتی ہے آتش نہ ڈر
شاہِ مرداں سے طلب کر، ہمتِ مردانہ آج

○

غیرتِ مہر، رشکِ ماہ ہو تم
خوبصورت ہو، بادشاہ ہو تم

کیوں کر آنکھیں نہ ہم کو دکھلاؤ
کیسے خوش چشم، خوش نگاہ ہو تم

حسن میں آپ کے ہے شانِ خدا
عشق بازوں کے سجدہ گاہ ہو تم

ہر لباس آپ کو ہے زیبندہ
جامہ زیبوں کے بادشاہ ہو تم

فوق ہے سارے خوش جمالوں پر
وہ ستارے جو ہیں تو ماہ ہو تم

کیوں محبت بڑھائی تھی تم سے
ہم گنہ گار، بے گناہ ہو تم

جو کہ حق وفا بجا لائے
شاہد اللہ ہے، گواہ ہو تم

ہے تمہارا خیال پیشِ نظر
جس طرف جائیں، سیرِ راہ ہو تم

دونوں بندے اسی کے ہیں آتش
خواہ ہم اس میں ہو دیں خواہ ہو تم

○

خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری
خوشا دماغ، جسے تازہ رکھے بو تیری

مری طرف سے صبا! کہیو میرے یوسف سے
نکل چکی ہے بہت، پیرہن سے بو تیری

شبِ فراق میں اے روزِ وصل! تا دمِ صبح
چراغ ہاتھ میں ہے اور جستجو تیری

جو ابر گریہ کناں ہے، تو برقِ خندہ زناں
کسی میں خو ہے ہماری، کسی میں خو تیری

کسی طرف سے تو نکلے گا آخر اے شہِ حسن!
فقیر دیکھتے ہیں راہ، کو بہ کو تیری

زمانہ میں کوئی تجھ سا نہیں ہے سیف زباں
رہے گی معرکہ میں آتش آبرو تیری

○

یہ آرزو تھی، تجھے گُل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بیتاب، گفتگو کرتے

پیام بر نہ میسّر ہوا، تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

جو دیکھتے تری زنجیرِ زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ، جو باراں کی آرزو کرتے

○

اے صنم! جس نے تجھے چاند سی صورت دی ہے
اسی اللہ نے مجھ کو بھی محبت دی ہے

تیغ بے آب ہے، نے بازوئے قاتل کمزور
کچھ گراں جانی ہے، کچھ موت نے فرصت دی ہے

کوئی اسیر، غنی دل نہیں رکھتی ایسا
خاکساری نہیں دی ہے، مجھے دولت دی ہے

فرقتِ یار میں رو رو کے بسر کرتا ہوں
زندگانی مجھے کیا دی ہے، مصیبت دی ہے

یادِ محبوب فراموش نہ ہووے اے دل!
حسنِ نیت نے مجھے عشق سی نعمت دی ہے

گوش پیدا کیے سننے کو ترا ذکرِ جمال
دیکھنے کو ترے، آنکھوں میں بصارت دی ہے

لطفِ دل بستگیٔ عاشقِ شیدا کو نہ پوچھ!
وہ جہاں سے اس اسیری نے فراغت دی ہے

کہ یار کے مضمون کو باندھو آتش!
زلفِ خوباں سی مرے تم کو طبیعت دی ہے

○

دہن پہ ہیں ان کے گماں کیسے کیسے
کلام ہوتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

تمہارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں
گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

بہار آئی ہے، نشہ میں جھومتے ہیں
مریدانِ پیرِ مغاں کیسے کیسے

نہ مڑ کر بھی بے درد قاتل نے دیکھا
تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے!

نہ گورِ سکندر، نہ ہے قبرِ دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے!

غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

تری کاکلِ قدرت کے قربان آنکھیں
دکھائے ہیں خوش رُو جواں کیسے کیسے

کرے جس قدر شکرِ نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

○

ہوائے دورِ مئے خوشگوار، راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی، بہار راہ میں ہے

گدا نواز کوئی شہ سوار راہ میں ہے
بلند آج نہایت غبار، راہ میں ہے

عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ہستی میں
نہ کوئی شہر، نہ کوئی دیارِ راہ میں ہے

طریقِ عشق میں اے دل! عصائے آہ ہے شرط
کہیں چڑھاؤ، کسی جا اُتار، راہ میں ہے

نہ بدرقہ ہے، نہ کوئی رفیق ساتھ اپنے
فقط عنایتِ پروردگار، راہ میں ہے

نہ جائیں آپ ابھی دوپہر ہے گرمی کی
بہت سی گرد، بہت سا غبار، راہ میں ہے

تلاشِ یار میں کیا ڈھونڈیے کسی کا ساتھ
ہمارا سایہ، ہمیں ناگوار، راہ میں ہے

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار، راہ میں ہے

مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے، دشمن ہزار، راہ میں ہے

پتہ یہ کوچۂ قاتل کا سن رکھ اے قاصد!
بجائے سنگِ نشاں، اک مزار، راہ میں ہے

تھکیں جو پاؤں، تو چل سر کے بل، نہ ٹھیر آتش
گلِ مراد ہے منزل میں، خار، راہ میں ہے

امیر مینائی

○

ناوکِ ناز سے مشکل ہے بچانا دل کا
دردِ اُٹھ اُٹھ کے بتاتا ہے ٹھکانا دل کا

آج اس شوق سے پیکاں مرے دل میں آیا
آگیا یاد کسی شوخ پہ آنا دل کا

ہائے وہ پہلی ملاقات میں میرا رُکنا
اور اُس کا وہ لگاوٹ سے بڑھانا دل کا

متصل آہ کی پہلو سے صدا آتی ہے
اب وہ ہے درد کا گھر تھا جو ٹھکانا دل کا

جی لگے آپ کا ایسا کہ کبھی جی نہ بھرے
دل لگا کر جو سُنیں آپ فسانہ دل کا

تیر پر تیر لگا کر وہ کہا کرتے ہیں
کیوں جی تم کیسں سمجھتے تھے لگانا دل کا

پھیر کر منہ مجھے تڑپاتے ہیں اور کہتے ہیں
رُخ بدل کر ہم اڑاتے ہیں نشانہ دل کا

ہنگامِ وصل میں اس شوخ کی کہتی ہے امیر
ہو جسے حکم اڑائے وہ نشانہ دل کا

○

گذشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا سا نشانِ سرِ مزار ہوں میں

نگاہِ کرم سے مجھ کو نہ دیکھ اے دوزخ
خبر نہیں تجھے کس کا گنہگار ہوں میں

پھر اس کی شانِ کریمی کے حوصلے دیکھے
گنہگار یہ کہہ دے گناہ گار ہوں میں

جو مست ہوش میں آنے کا قصد کرتا ہے
پکارتا ہے یہ ساقی کہ ہوشیار ہوں میں

حضور! وصل کی حسرت ازل سے ہے مجھ کو
خیال کیجیے کب سے امیدوار ہوں میں

وہ بیقرار ہوں دیکھے اگر تڑپ میری
قرار بھی یہ پکارے کہ بے قرار ہوں میں

بڑے مزے سے گذرتی ہے بیخودی میں امیر
وہ دن خدا نہ دکھائے کہ ہوشیار ہوں میں

○

رہے تصویرِ حیرانی ہم ان کے روبرو برسوں
لبِ خاموش سے کی دردِ دل کی گفتگو برسوں

نہیں مٹتی ہے دل سے مر کے ان کی آرزو برسوں
یہ وہ گل ہے کہ مرجھا کے بھی دیتا ہے بُو برسوں

فنا کے بعد ایسے بے کسوں کو کون پوچھے گا ؟
مگر اے بے کسی رویا کرے گی مجھ کو تو برسوں

نہ کر اے یاس! یوں برباد میرے خانۂ دل کو
اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں

سراپا جُرم ہوں لیکن وہ رندِ پاک طینت ہوں
کیا زاہد نے امیر آبِ خجلت سے وضو برسوں

تمہاری اک نگاہِ ناز نے توڑا اثار سے میں
بنایا چشمِ دل نے جو طلسمِ آرزو برسوں

کہاں ہوں گی امیر ایسی ادائیں حور و غلماں میں
رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

○

اس کی حسرت ہے، جسے دل سے مٹا بھی نہ سکوں
ڈھونڈنے اس کو چلا ہوں، جسے پا بھی نہ سکوں

ان کے غصّے کے مٹانے کی ہیں سو تدبیریں
لاگ کی آگ نہیں ہے کہ بجھا بھی نہ سکوں

چٹکیاں لینے سے دل میں وہ کریں کیا انکار
داغ کچھ درد نہیں ہے کہ دکھا بھی نہ سکوں

میں اگر گھر سے نکلتا ہوں، تو گھر کیوں ہے اداس
کیا دمِ بازپسیں ہے کہ پھر آ بھی نہ سکوں

کوئی پوچھے تو محبت سے، یہ کیا ہے انصاف
وہ مجھے دل سے بھلائے، میں بھلا بھی نہ سکوں

نقشِ ہستی میں ابھی محو کیے دیتا ہوں
خطِ تقدیر نہیں ہے کہ مٹا بھی نہ سکوں

○

یہ تو میں کیوں کہوں تیرے خریداروں میں ہوں
تو سراپا ناز ہے، میں ناز برداروں میں ہوں

جان پر صدمہ، جگر میں درد، دل کا حال زار
گھر کا گھر بیمار کس کس کے پرستاروں میں ہوں

وہ کوئے شانِ رحمت نے دکھائے روزِ حشر
بیخ اٹھا ہر بے گنہ میں بھی گنہ گاروں میں ہوں

صبح سے مطلب نہ گل سے کام کیا جانوں انھیں
میں تمھارے سینہ چاکوں میں دل افگاروں میں ہوں

پھیر تو دیکھو! میری میت پر جو آئے، یہ کہا
تم وفاداروں میں ہو، یا میں وفاداروں میں ہوں

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ
اے اسیرانِ قفس! میں نو گرفتاروں میں ہوں

بے گناہوں میں چلا زاہد جو اس کو ڈھونڈنے
مغفرت بولی ادھر آ، میں گنہ گاروں میں ہوں

بے گناہوں کا تو وحشی ان کے آگے کیا مجال
ڈرتے ڈرتے منہ سے نکلا میں گنہ گاروں میں ہوں

آپکا تھا رحم اس کو سن کے میری بے کسی
درد ظالم بول اٹھا میں اس کے غمخواروں میں ہوں

○

صورتِ غنچہ کہاں تا لبِ تکلم مجھ کو
منہ کے سو ٹکڑے ہوئے جو تبسم مجھ کو

وقتِ فرصت تھا میں عبرت کدۂ ہستی میں
کفِ افسوس ملے جس نے کیا گم مجھ کو

ایک کو ایک سے بڑھ کر ترے جلوے کا ہے شوق
آنکھ کہتی ہے نگہ پر ہو تقدم مجھ کو

واہ اے بیخودیٔ شوق کیا خوب سلوک
اس کو جب ڈھونڈھ نکالا تو کیا گم مجھ کو

خلوتِ وصل میں کچھ کام نہیں ساقی کے
جامِ مے بھر کے پلاؤں میں تمھیں تم مجھ کو

میں تو کیا، عکس سے وہ آئینہ رو کہتا ہے
پیار کی آنکھ سے دیکھا نہ کرو تم مجھ کو

دیکھتا ہوں کبھی آئینہ تو روتا ہوں امیر
اپنی صورت پہ خود آتا ہے ترحم مجھ کو

○

کہہ رہی ہے حشر میں وہ آنکھ شرمائی ہوئی
ہائے اک مجمع اس بھری محفل میں رسوائی ہوئی

آئینے میں ہر ادا کو دیکھ کر کہتے ہیں وہ
آج دیکھا چاہیے کس کس کی ہے آئی ہوئی

کہہ تو اے گل چیں! اسیرانِ قفس کے واسطے
توڑلوں دو چار کلیاں میں بھی مرجھائی ہوئی

میں تو رازِ دل چھپاؤں پر چھپا رہنے بھی دے
جان کی دشمن، یہ ظالم آنکھ للچائی ہوئی

کیوں ترے لب پر تبسم مجلسِ ماتم میں ہے
یہ ہنسی بھی کیا مرے پھولوں میں ہے آئی ہوئی

گرد اُڑی عاشق کی تربت سے تو جھنجھلا کر کہا
واہ سر چڑھنے لگی، پاؤں کی ٹھکرائی ہوئی

شعر گلدستے ہیں مجھ افسردہ دل کے کیا امیرؔ
دامنِ گلچیں میں کچھ کلیاں ہیں مرجھائی ہوئی

○

جب سے بلبل تو نے دو تنکے لیے
ٹوٹتی ہیں بجلیاں ان کے لیے

ہے جوانی خود جوانی کا سنگھار
سادگی گہنا ہے اس سن کے لیے

کون ویرانے میں دیکھے گا بہار
پھول جنگل میں کھلے کن کے لیے

ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا
میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لیے

باغباں! کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنی ہیں ایک کم سن کے لیے

سب حسیں ہیں زاہدوں کو ناپسند
اب کوئی حور آئے گی ان کے لیے

وصل کا دن اور اتنا مختصر
دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے

صبح کا سونا جو ہاتھ آتا امیرؔ
بھیجتے تحفہ مؤذن کے لیے

○

چھے جیسی ہو، مریضوں کا خیال اچھا ہے
رہ سے جاتے ہیں تم کہتے ہو حال اچھا ہے

تو سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے
سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

کچھ لے لیل و پروانہ کی بے تابی کو
جز، اچھا، نہ حسینوں کا وصال اچھا ہے

کیا اس کا تصور، تو پکارا یہ شوق
ل میں تم جائے الٰہی! یہ خیال اچھا ہے

رق اگر نامیٔ رفتار میں اچھی ہے امیر
ئی حسن میں وہ برق جمالی اچھا ہے

○

آنکھ اس کے حضور رو رہی ہے
ساتھ اپنے مجھے ڈبو رہی ہے

دیدار کہاں کہ دور ہے حشر
قسمت ابھی اپنی سو رہی ہے

کیا باغ میں دیکھتی ہے شبنم
جو گل کی ہنسی پہ رو رہی ہے

اللہ رے حسن جلوہ رز
زاہد کے حواس کھو رہی ہے

کیا کشتی و ناخدا کا شکوہ
تقدیر ہمیں ڈبو رہی ہے

نرگس کو صبا، نہ چھیڑ اتنا
سونے دے غریب سو رہی ہے

گلشن میں جو آبرو ہے دھواں دھار
مے خوار دل اس پہ دھوم ہو رہی ہے

اس تیغ کے منہ پڑے نہ بجلی
کیوں جان سے ہاتھ دھو رہی ہے

کیا شوخ ہے اس کی یاد مژگاں
دل میں نشتر چبھو رہی ہے

ہم جاگ رہے ہیں ہجر کی شب
تقدیر ہماری سو رہی ہے

احساں ہے امیر چشم تر کا
نامے کی سیاہی دھو رہی ہے

داغ دہلوی

○

اللہ رے مرتبہ مرے عجز و نیاز کا
گویا جواب ہے یہ ترے کبر و ناز کا

عالم تمام چشمۂ حیرت نگر بنا!
منہ دیکھتا ہے آئنہ، آئینہ ساز کا

ہر پنجۂ راہِ کعبہ و بت خانہ ایک ہے
اے راہ رو ہے کام یہاں امتیاز کا

دنیا بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم
کن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

رُتبے سے میرے قصر و سخر کو رتبہ کیا
میں ہوں غلام، شاہِ عراق و حجاز کا

مجھ کو نہ کیوں کہ اس کی خلائی سے فخر ہو
محمود ایک بندہ ہے جس کے ایاز کا

کونین جس کے ناز سے چمکا رہے ہیں داغ
میں ہوں نیاز مند اسی بے نیاز کا

○

اب دل ہے مقام بے کسی کا
یوں گھر نہ تباہ ہو کسی کا

کس کس کو مزہ ہے عاشقی کا
تم نام تو لو، بھلا کسی کا

گلشن میں ترے لبوں نے گویا
رس چوس لیا، کلی کلی کا

اتنی ہی تو بس کسر ہے تم میں
کہنا نہیں مانتے، کسی کا!

آغاز کو کون پوچھتا ہے
انجام اچھا ہو، آدمی کا

کہتے ہیں اُسے زبانِ اُردو
جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

○

ناطے سے یا لحاظ سے، میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے، آپ کا ایمان تو گیا

دل لے کے مفت کہتے ہیں، کچھ کام کا نہیں
اُلٹی شکایتیں ہوئیں، احسان تو گیا

دیکھا ہے بت کدہ میں جو اے شیخ، کچھ نہ پوچھ
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

افشائے رازِ عشق میں گو ذلتیں ہوئیں
لیکن اسے جتا تو دیا، جان تو گیا

ہوش و حواس و تاب و تواں داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں، سامان تو گیا

○

پکارتی ہے خموشی مری، فغاں کی طرح
نگاہیں کہتی ہیں سب رازِ دل زباں کی طرح

بگڑ گئی ہے یہاں بے طرح، جہاں کی طرح
کہاں کی وضع، کماں کی ادا، کماں کی طرح

چھڑائے قید سے اے قید! ہم اسیروں کو
لگا دے آگ قفس میں بھی آشیاں کی طرح

جلا کے داغِ محبت نے دل کو خاک کیا
بہار آئی مرے باغ میں، خزاں کی طرح

جو اب خضر ہیں وہ مُردہ دل کہ جن کو یہاں
ملی ہے مرگِ ابد، عمرِ جاوداں کی طرح

یہ سدِ راہ ہوا، کس کا پاسِ رسوائی
رُکے ہوئے ہیں مرے اشکِ کارواں کی طرح

ادائے مطلبِ دل ہم سے سیکھ جائے کوئی
انہیں سنا ہی دیا حال، داستاں کی طرح

ہم اپنے ضعف کے صدقے، بٹھا دیا ایسا
ملے نہ در سے ترے سنگِ آستاں کی طرح

خدا قبول کرے داغ! تم جو کوئے عدم
چلے ہو عشقِ بتاں لے کے ارمغاں کی طرح

○

سوز و گداز عشق کا لذت چشیدہ ہوں
مانندِ آبلہ، ہمہ تن آب دیدہ ہوں

گر تو نہ ہو، تو پھر کسی کافر کا دل لگے
دوزخ میں آرمیدہ، ارم سے رمیدہ ہوں

نازک مزاجیوں نے مجھے، تجھ سا کر دیا
اے بے خبر! میں اپنے سے آپ ہی کشیدہ ہوں

افتادگی پہ بھی نہ گئی اس کی جستجو!
گویا زمیں پہ سایۂ مرغِ پریدہ ہوں

اے داغ! جس کے واسطے روزِ جزا بنا
وہ کون ہے، وہ میں ہی تو آفت رسیدہ ہوں

○

سازِ یہ کینہ ساز کیا جانیں
ناز والے نیاز کیا جانیں

کب کسی در کی جبہہ سائی کی
شیخ صاحب نماز کیا جانیں

جو رہِ عشق میں قدم رکھیں
وہ نشیب و فراز کیا جانیں

پوچھئے میکشوں سے لطفِ شراب
یہ مزہ پاکباز کیا جانیں

حضرتِ خضر جب شہید نہ ہوں
لطفِ عمرِ دراز کیا جانیں

جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

○

صوفی نے تیری کام کیا اک نگاہ میں
صوفی ہے بت کدہ میں، صنم خانقاہ میں

آنکھیں بچھائیں ہم نے تو عدو کی بھی راہ میں
پر کیا کریں، کہ تو ہے ہماری نگاہ میں

بڑھتا ہوں آگے پوچھ کے نقشِ مقامِ عشق
جو خفتہ مجھ غریب کو ملتا ہے راہ میں

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا تمہاری نگاہ میں

راتیں مصیبتوں کی جو گزری تھیں آج تک
ماتم کو آئی ہیں مرے روزِ سیاہ میں

دل تو بر پہ ہے، ناز ہے تجھے زاہد اس قدر
جو ٹوٹ کر شریک ہو میرے گناہ میں

آتی ہے بات بات مجھے یاد بار بار
کہتا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں

کیسا نظارہ، کس کا اشارہ، کہاں کی بات
سب کچھ ہے اور کچھ نہیں، نیچی نگاہ میں

مشتاق اس صدا کے بہت دردمند تھے
اے داغ! تم تو بیٹھ گئے ایک آہ میں

○

چاک ہو پردۂ وحشت، مجھے منظور نہیں
ورنہ یہ ہاتھ، گریباں سے کچھ دور نہیں

وصل سے یاس ہوا ایسا دل رنجور نہیں
بُت اگر دُور ہے مجھ سے، تو خدا دور نہیں

چھین لیں دل کو اگر وہ، تو یہ مجبوری ہے
میں کہے جاؤں گا، محتاج ہوں مقدور نہیں

لب تک آئی تھی شکایت کہ محبت نے کہا
دیکھ! پچھتائے گا، خاموش! یہ دستور نہیں

رات دن نامہ و پیغام کہاں تک ہوں گے
صاف کہہ دیجئے، ملنا ہمیں منظور نہیں

کیا کرے داغ کوئی اس کی محبت کا علاج
وہ کلیجا ہی نہیں، جس میں یہ ناسور نہیں

○

اشکِ خوں رنگ لائے جاتا ہے
داغ اپنی جماسے جاتا ہے

کتنا باوضع ہے خیال اُس کا
بے کہے میں بھی آئے جاتا ہے

دیکھنا رشک اس کی محفل کا
ایک کو ایک کھائے جاتا ہے

وہ جدھر کو گئے اُٹھا یہ شور
وہ قیامت اُٹھائے جاتا ہے

آتشِ شوق کیا بجھے ناصح!
تو پتنگے لگائے جاتا ہے

○

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے
دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے

ہم نکمے ہوئے زمانے کے
کام ایسا سکھا دیا تو نے

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے
دل بے مدعا دیا تو نے

بے طلب جو ملا، ملا مجھ کو
بے غرض جو دیا، دیا تو نے

عمرِ جاوید، خضر کو بخشی
آبِ حیواں پلا دیا تو نے

نارِ نمرود کو کیا گلزار
دوست کو یوں بچا دیا تو نے

کہیں مشتاق سے حجاب ہوا
کہیں پردہ اُٹھا دیا تو نے

جس قدر میں نے تجھ سے خواہش کی
مجھ کو اس سے سوا دیا تو نے

مٹ گئے دل سے نقشِ باطل سب
نقشہ اپنا جما دیا تو نے

مجھ گنہ گار کو، جو بخشش دیا
تو جہنم کو کیا دیا تو نے؟

داغ کو، کون دینے والا تھا
جو دیا، اے خدا! دیا تو نے

مولانا حالی

○

پیش از ظہورِ عشق، کسی کا نشاں نہ تھا
تھا حسن میزباں، کوئی میہماں نہ تھا

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

کیا جانتے تھے، جائے گا جی اک نگاہ میں
یہ دل کی احتیاط، مگر بیم جاں نہ تھا

کچ سے کہ پاسِ خاطرِ نازک عذاب ہے
تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا

رات ان کو بات بات پہ سو سو دیئے جواب
مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

رونا ہے یہ کہ آپ بھی ہنستے ہیں اور نہ یاں
طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

بزمِ سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار
شب انجمن میں حالیؔ جادو بیاں نہ تھا

○

رنج اور رنج بھی تنہائی کا
وقت پہنچا مری رسوائی کا

عمر شاید نہ کرے آج وفا
کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا
کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا

اس سے نادان ہی بن کر ملیئے!
کچھ اجارہ نہیں دانائی کا

کچھ تو ہے قدر تماشائی کی
ہے جو یہ شوق خود آرائی کا

اس کو چھوڑا تو ہے لیکن اے دل!
مجھ کو ڈر ہے تری خود رائی کا

بزمِ دشمن میں نہ جی سے اُترا
پوچھنا کیا تری زیبائی کا

محتسب! عذر بہت ہیں، لیکن
اذنِ ہم کو نہیں گویائی کا

ہوں گے حالیؔ سے بہت آوارہ
گھر ابھی دور ہے رسوائی کا

○

قلق اور دل میں سوا ہو گیا
دلاسا تمھارا بلا ہو گیا

دکھانا پڑے گا مجھے زخمِ دل
اگر تیر اس کا خطا ہو گیا

سبب ہو نہ ہو، لب پہ آنا ضرور
مرا شکر اس کا گلا ہو گیا

وہ امید کیا، جس کی ہو انتہا
وہ وعدہ نہیں، جو وفا ہو گیا

ہوا کے لگے دم آخر فنا
مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا

نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت
وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا

سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد
ابھی کیا تھا، اور کیا سے کیا ہو گیا

ٹپکتا ہے اشعار حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

○

اُس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے، نہ در کی صورت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضرؑ کی صورت

دیکھئے شیخ! مصور سے کہے یا نہ کہے
صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت

واعظو! آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

شوق میں اس کے مزا، درد میں اس کے لذت
ناصحو! اس سے نہیں کوئی مفر کی صورت

کیا خبر زاہدِ قانع کو کہ کیا چیز ہے حرص
اس نے دیکھی ہی نہیں کیسۂ زر کی صورت

حملہ اپنے پہ بھی اک بعدِ ہزیمت ہے ضرور
رہ گئی ہے یہی اک فتح و ظفر کی صورت

رہنماؤں کے ہوئے جاتے ہیں اوسان خطا
راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت

اُن کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے میہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

○

آئے بڑھے نہ قصۂ عشق بتاں سے ہم
سب کچھ کہا، مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

اب بھاگتے ہیں سایۂ معشوق بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

خود رفتگیٔ شب کا مزہ بھولتا نہیں
آئے ہیں آج آپ میں یارب! کہاں سے ہم

دردِ فراق و شکِ عدو تک گراں نہیں
تنگ آ گئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم

جنت میں تو نہیں اگر اے زخمِ تیغِ عشق!
بدلیں گے تجھ کو زندگیٔ جاوداں سے ہم

لینے دو چین کوئی دمِ اے منکر و نکیر!
آئے ہیں آج چھوٹ کے قیدِ گراں سے ہم

ہنستے ہیں اس کے گریۂ بے اختیار پر
بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرزِ بیاں سے ہم!

دلکش ہر ایک قطعۂ صحرا ہے راہ میں
ملتے ہیں جا کے دیکھئے کب کارواں سے ہم

لذت ترے کلام میں آئی کہاں سے ہے
پوچھیں گے جا کے حالیؔ سحر بیاں سے ہم

○

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

ہیں دورِ جامِ اوّلِ شب میں خودی سے دور
ہوتی ہے آج دیکھئے ہم کو سحر کہاں

یارب! اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط، مگر اس قدر کہاں

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق،
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

بس ہو چکا بیاں کسل و رنجِ راہ کا
خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں

کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو، تو زباں میں اثر کہاں

حالیؔ نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں

○

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح
لگا دو آگ کوئی آشیاں میں

کوئی دن بوالہوس بھی شاد ہو لیں
دھرا کیا ہے اشارات نہاں میں

نیا ہے، لیجئے جب نام اُس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں

دلِ پُر درد سے کچھ کام لوں گا
اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

○

حق وفا کے جو ہم جتانے لگے
آپ کچھ کہہ کے مسکرانے لگے

تھا یہاں دل میں طعن دشمنِ عدو
عذر ان کی زباں پہ آنے لگے

ہم کو جینا پڑے گا فرقت میں
وہ اگر ہمت آزمانے لگے

ڈر ہے، میری زباں نہ کھل جائے
اب وہ باتیں بہت بنانے لگے

جان بچتی نظر نہیں آتی !
غیر الفت بہت جتانے لگے

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم!
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

جی میں ہے، لوں رضائے پیرِ مغاں
قافلے پھر حرم کو جانے لگے

سرِ باطن کو فاش کر ، یارب!
اہلِ ظاہر بہت ستانے لگے

وقتِ رخصت تھا سخت حالی پر
ہم بھی بیٹھے تھے، جب وہ جانے لگے

○

جس کو غصّے میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے
آج دل لے گا، اگر کل نہ لیا، یاد رہے

شوق بڑھتا گیا، جُوں جُوں رُکے اس شوخ سے ہم
یہ سبق وہ ہے کہ بھُولے سے سوا یاد رہے

ہم بھی آدابِ شریعت سے تھے آگاہ مگر
نہ ہو برتاؤ میں جو رسم، وہ کیا یاد رہے

یاد آؤ گے بہت، لطف سمجھ کر کیجے!
اس بھلائی کا ہے انجام بُرا، یاد رہے

شیخ! یاں شرم گنہ، شوق بھلا دیتا ہے
تو یہ ان کی ہے، جنھیں اپنی خطا یاد رہے

خضر نے پاؤں اگر دشتِ فنا میں رکھا
بھول جائیں گے رہِ آبِ بقا، یاد رہے

چارہ گر! کار بہ اندازۂ تدبیر نہیں
کیجئو ہمت: اگر وقتِ دعا یاد رہے

ابھی جانا نہیں حالی نے کہ کیا چیز ہیں وہ
حضرت اس لطف کا پائیں گے مزا، یاد رہے

○

دھوم تھی اپنی پارسائی کی
کی بھی اور کس سے آشنائی کی

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم میں طاقت نہیں جدائی کی

منہ کہاں تک چھپاؤ گے ہم سے
تم کو عادت ہے خود نمائی کی

لاگ میں ہیں لگاؤ کی باتیں
صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی

دل بھی پہلو میں ہو، تو یاں کس سے
رکھیے امید دل ربائی کی

نہ ملا کوئی غارتِ ایماں
رہ گئی شرم پارسائی کی

موت کی طرح جس سے ڈرتے تھے
ساعت آ پہنچی اس جدائی کی

زندہ پھرنے کی ہے ہوس حالی
انتہا ہے یہ بے حیائی کی

اکبر الہ آبادی

○

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکہ تو نہیں مارا چوری تو نہیں کی ہے

ناتجربہ کاری سے واعظ کی یہ باتیں ہیں
اس رنگ کو کیا جانے پوچھو تو کبھی پی ہے؟

اُس مے سے نہیں مطلب دل جس سے ہے بیگانہ
مقصود ہے اس مے سے دل ہی میں جو کھنچتی ہے

اے شوق وہی مے پی اے ہوش ذرا سو جا
مہمانِ نظر اس دم اک برقِ تجلی ہے

واں دل میں کہ صدمے دو یاں جی میں کہ سب سہ لو
اُن کا بھی عجب دل ہے میرا بھی عجب جی ہے

ہر ذرہ چمکتا ہے، انوارِ الٰہی سے
ہر سانس یہ کہتی ہے ہم ہیں تو خدا بھی ہے

سورج میں لگے دھبا فطرت کے کرشمے ہیں
بُت ہم کو کہیں کافر اللہ کی مرضی ہے

○

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارہ نہیں ہوتا
آنکھ اُن سے جو ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا

جلوہ نہ ہو معنی کا تو صورت کا اثر کیا
بلبل گلِ تصویر کا شیدا نہیں ہوتا

اللہ بچائے مرضِ عشق سے دل کو
سنتے ہیں کہ یہ عارضہ اچھا نہیں ہوتا

تشبیہ ترے چہرے کو کیا دوں گلِ تر سے
ہوتا ہے شگفتہ مگر اتنا نہیں ہوتا

میں نزع میں ہوں آئیں تو احسان ہے اُن کا
لیکن یہ سمجھ لیں کہ تماشا نہیں ہوتا

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

○

چمن کی یہ کیسی ہوا ہو گئی
کہ صرصر سے بدتر صبا ہو گئی

عیادت کو آئے شفا ہو گئی
علالت ہماری دوا ہو گئی

وہ اُٹھے تو لاکھوں ہی فتنے اُٹھے
چلے تو قیامت بپا ہو گئی

محبت کی گرمی بھی کیا چیز ہے
طبیعت ہری کیا سے کیا ہو گئی

لگاوٹ بہت ہے تری آنکھ میں
اسی سے تو یہ فتنہ زا ہو گئی

بتوں نے بھلایا جو دل سے مجھے
مرے ساتھ یادِ خدا ہو گئی

انہیں نے عطا کی تھی جانِ حزیں
ہوا خوب انہیں پر فدا ہو گئی

○

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

معرفت خالق کی عالم میں بہت دشوار ہے
شہر تن میں جب کہ خود اپنا پتہ ملتا نہیں

زندگانی کا مزہ ملتا تھا جن کی بزم میں
ان کی قبروں کا بھی اب مجھ کو پتہ ملتا نہیں

کشتیٔ دل کی الٰہی بحرِ ہستی میں ہو خیر
ناخدا ملتے ہیں لیکن باخدا ملتا نہیں

صرف ظاہر ہو گیا سرمایۂ زیب و صفا
کیا تعجب ہے جو باطن باصفا ملتا نہیں

پختہ طبعوں پر حوادث کا نہیں ہوتا اثر
کوہساروں میں نشانِ نقشِ پا ملتا نہیں

شیخ صاحب برہمن سے لاکھ برتیں دوستی
بے بھجن گائے تو مندر سے ٹکا ملتا نہیں

○

آہ جو دل سے نکالی جائے گی
کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی
یاد ان کی ہے بہت عزت پسند
آہ بھی دل سے نکالی جائے گی
نرخ کہتی ہے کہ روٹی مجھ سے جان
حشر کہتا ہے منالی جائے گی
اس نزاکت پر یہ شمشیر جفا
آپ سے کیونکر سنبھالی جائے گی
بے تکلف چاہیئے سوز و گداز
شمع کیوں سانچے میں ڈھالی جائیگی
کیا غم دنیا کا ڈر مجھ رند کو
اور اک بوتل چڑھالی جائے گی
زندگی کی کل ہے پیچیدہ تو خیر
سانس لے کر چلا لی جائے گی
شیخ کی دعوت میں مے کا کام کیا
احتیاطاً کچھ منگالی جائے گی
یاد آبرو میں ہے اکبر محو کیوں
کب تری یہ کج خیالی جائے گی

○

تیرے سحر نظر سے ہوا یہ جنوں مرے دل کی تو اس میں خطا ہی نہ تھی
ترے کوچے میں آ کے میں بیٹھ رہا بجز اس کے کچھ اور دوا ہی نہ تھی

ہوئی طبع جو مائل داد بلا میں تمہاری ہی زلف سیہ میں پھنسا
مرے دامن دل کو جو کھینچ سکے کوئی اور تو ایسی بلا ہی نہ تھی

کیا صحبت غیر نے قہر و غضب مجھے کوئی امید رہی نہیں اب
دم چند کو مجھ سے ملے بھی جو کل، وہ نظر ہی نہ تھی وہ ادا ہی نہ تھی

نہ سہی تو پھر اس میں تھی کس کی خطا، یہ گلا ہے مری ہی طرف سے بجا
مرے عشق کا رنگ تو خوب رہا، مگر آپ میں بوئے وفا ہی نہ تھی

میں وطن سے حزیں و ملول پھرا، نہ وہ بزم ملی نہ وہ یار ملے،
گل و لالہ و سرو کا ذکر کجا، وہ چمن ہی نہ تھا وہ ہوا ہی نہ تھی

غم ہجر میں جی سے گیا جو گذر، تو یہ اکبر زار نے خوب کیا
کہ علاج فراق تو تھا ہی یہی، بجز اس کے کچھ اور دوا ہی نہ تھی

○

ے سب بھی ہے عنبر افشاں عروج بھی ہے مرجیں کا
ہونے کی وہ اجازت محل نہیں ہے نہیں نہیں کا

ہر ذوق سجود پیدا ستارہ ہو اوج پر جبیں کا
ان سجدہ زمیں پر ہو تو فخر ہے وہ رُخ زمیں کا

ں اس گل کے پاس آئی تو میرے دل کو ہوا یہ کھٹکا
ی گفتگو نہ یہ کھلائے پیام لائی نہ ہو کہیں کا

ہ در پہ بری نظر ہے نہ لالہ و گل کی کچھ خبر ہے
و نخ دل کے لیے ہے کافی تصور اس روئے آتشیں کا

○

نظر کو ہو ذوق معرفت کا کرے تو شوق اضطراب پیدا
سوال پیدا جو ہوں گے دل میں انھیں سے ہوں گے جواب پیدا

کرو نہ کچھ فکر جام و ساقی بہار آنے تو دو چمن میں
گلوں سے ٹپکے گا رنگ مستی ہوا کرے گی شراب پیدا

نہ آس کو ٹوٹنے کا موقع نہ شوق گستاخیوں کا حامی
اداؤں میں کچھ لگاوٹیں ہیں نگاہ سے ہے عتاب پیدا

ہر اک کے لائق ہے اس کی زینت نہ ہے تری شان تیری قدرت
کہ آنکھ کو اشک سے ہے بھرتی گہر سے کرتی ہے آب پیدا

یہ منزل حرص مال و دولت نہ دے گی دنیا میں تم کو راحت
ہوس بڑھائے گی تشنگی کو نظر کرے گی سراب پیدا

○

کبھی جو دعویٔ منصور میں شک آتا ہے
خیالِ یار مجھے آئنہ دکھاتا ہے

وہ بات ہوں کہ جو لاتی ہے جوش میں دل کو
وہ حال ہوں کہ جسے سُن کے وجد آتا ہے

ہمیں تو آٹھ پہر رہتی ہے تمہاری یاد
کبھی تمھیں بھی ہمارا خیال آتا ہے؟

نہ جانے کا تو نہیں جانتے بہانہ کچھ
ہزار حیلہ نہ آنے کا تم کو آتا ہے

وہ میکدہ ہے ہمارا کہ جس میں مستوں سے
ہزار ساغرِ جم روز ٹوٹ جاتا ہے

نہ پوچھیے ستم جوشِ حسرتِ دیدار
یہ جانِ زار کو آنکھوں میں کھینچ لاتا ہے

دُوئی کا دخل نہیں بزمِ وصل میں منظور
وگرنہ آپ میں آنا تو مجھ کو آتا ہے

فنا کا خوف کچھ اہلِ حیات ہی کو نہیں
ہوا سے شمع کا شعلہ بھی کانپ جاتا ہے

خدا کے واسطے یاد خدا کرا اے اکبر
بتوں کے عشق میں جان اپنی کیوں گنواتا ہے

○

اس میں عکس آپ کا اُتاریں گے
دل کو اپنے یونہی سنواریں گے

آپ ناحق پہ اور ہم حق پر
آپ سے ہم کبھی نہ ہاریں گے

عشق کہتا ہے لطف ہوں گے بڑے
ہجر کہتا ہے جان ماریں گے

لیجئے جان، ہے یہی جو خوشی
کیجئے، ظلم، دم نہ ماریں گے

دل کی افسردگی نہ جائے گی
ہاں وہ چاہیں گے تو اُبھاریں گے

پند اکبر کو دیں گے کیا ناصح
گل کو کیا باغباں سنواریں گے

شاد عظیم آبادی

○

کچھ کہے جاتا تھا عزق اپنے ہی افسانے میں تھا
مرتے مرتے ہوش باقی تیرے دیوانے میں تھا

مسکرا کر جھانکتی تھی کس ادا سے اک پری
چہرۂ ساقی کا شاید عکس پیمانے میں تھا

ہائے وہ خود رنگی الجھے ہوئے سب سر کے بال
وہ کسی میں اب کہاں جو تیرے دیوانے میں تھا

دیکھتا تھا جس طرف اپنا ہی جلوہ تھا عیاں
میں نہ تھا وحشی کوئی اس آئینہ خانے میں تھا

بوریا تھا، کچھ شبینہ مے تھی یا ٹوٹے سبو
اور کیا اس کے مواستوں کے ویرانے میں تھا

ہنستے ہنستے رو دیا کرتے تھے سب بے اختیار
اک نئی ترکیب کا درد اپنے افسانے میں تھا

شاد کچھ پوچھو نہ مجھ سے میرے دل کے داغ کو
ٹمٹماتا سا چراغ اک اپنے ویرانے میں تھا

○

دل تو بدنام ہے اک عمر سے کیا اس کا گلہ
کہتے آتی ہے حیا یہ تمنا، یہ امیدیں، جنھیں برسوں پالا، کب مری ہوں گی بھلا
وہ تری کج کلاہی، کج ادائی، بانکپن، دلبری، عشوہ گری
کون خنجر کھا کے گرا، کون بچا، کون مرا، پھر کے دیکھا نہ ذرا
بان مارا تری آنکھوں نے، جو کی پھر کے نگاہ، نہ ملی دل کو پناہ
یار! کیا قہر ہے چلتا ہوا جادو تیرا، لاکھ روکا، نہ رکا
رُت پھری، ساری ہری ڈالوں میں پھوٹی کونپل، ہو گئے پھول بھی پھل
اک یہ اُجڑا ہوا دل ہے کہ نہ پھولا نہ پھلا، اور سوکھا ہی کیا
کالی کالی وہ گھٹائیں، وہ پپیہوں کی پکار، دھیمی دھیمی وہ پھوار
اب کے ساون بھی ہمارا یوں ہی روتے میں کٹا، کیا کہیں چپ کے سوا
بوسہ لینے کا مری خاک کو بھی ہے ارماں، تاب اُٹھنے کی کہاں؟
جامہ زیبی کا بھلا، اے صنم تنگ قبا، کچھ تو دامن کو جھکا!
فتنہ خو، آفت جاں، سنگ دل، آشوب جہاں، دشمن امن و اماں
سرو، ریحاں، گلہاں، خسرو، فلیم جفا، بانی مکر و دغا!
رس بھری ہائے وہ آنکھیں تری کالی کالی، بے پیے متوالی!
سانولا رنگ، نمک ریز، جراحات جفا، اُف کہاں دھیان گیا
دیکھنا تیرا کنکھیوں سے ہے آڑی برچھی، یار اس کی نہ سہی
کب کو گنتی میں ہے وہ گھاؤ جو اوچھا سا لگا، پھر کے پھر دیکھ ذرا
آنکھیں روئی ہوئی، آواز ہے بھرائی ہوئی، مانگ گھڑائی سو دل

○

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم

اے درد! بتا کچھ تو ہی بتا، اب تک یہ معمہ حل نہ ہوا
ہم میں ہے دلِ بیتاب نہاں یا آپ دلِ بیتاب ہیں ہم

میں حیرت و حسرت کا مارا، خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے، آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

ہو جائے بکھیڑا پاک کہیں، پاس اپنے بلا لیں بہتر ہے؛
اب دردِ جدائی سے ان کے اے آہ! بہت بیتاب ہیں ہم

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں، منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہلِ زمانہ! قدر کرو نایاب نہ ہوں کم یاب ہیں ہم

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شادؔ یہ کہلا بھیجا ہے:
آ جاؤ، جو تم کو آنا ہو، ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

○

اسیرِ جسم ہوں، میعادِ قید لا معلوم،
یہ کس گناہ کی پاداش ہے، خدا معلوم!

تری گلی بھی مجھے یوں تو کھینچتی ہے بہت
دراصل ہے مری مٹی کہاں کی، کیا معلوم

تعلقات کا الجھاؤ، ہر طرح ظاہر
گرہ کشائیِ تقدیرِ نارسا معلوم!

سفر ضرور ہے اور عذر کی مجال نہیں
مزہ تو یہ ہے نہ منزل، نہ راستا معلوم

دعا کروں نہ کروں سوچ ہے یہی کہ تجھے
دعا کے قبل مرے دل کا مدعا معلوم

سنی حکایتِ ہستی، تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم

طلب کریں بھی تو کیا شے طلب کریں اے شادؔ
ہمیں کو آپ نہیں اپنا مدعا معلوم

○

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

ہوں اس کوچے کے ہر ذرّہ سے واقف
ادھر سے عمر بھر آیا گیا ہوں

دلِ مضطر سے پوچھ اے رونقِ بزم
میں خود آیا نہیں، لایا گیا ہوں

سویرا ہے بہت اے شورِ محشر
ابھی بے کار اٹھوایا گیا ہوں

لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے
بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں

کہاں میں اور کہاں اے شادؔ دنیا
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

○

کہاں یہ تاب کہ چھک چھک کے یا گرا کے پیوں
ملے بھرا ہوا ساغر تو ڈگڈگا کے پیوں

ہزار تلخ ہے، پیرِ مغاں نے جب دی ہے
خدا نکردہ جو میں منہ بنا بنا کے پیوں

مزہ ہے بادہ کشی کا وہیں تو اے ساقی!
پیوں جواب، تو ترے آستاں پہ آ کے پیوں

میں وہ نہیں کہ خود اپنے قدح کی خیر مناؤں؟
پیوں تو بزم میں دس پانچ کو پلا کے پیوں

زمیں پہ جام کو رکھ دے، ذرا ٹھہر ساقی!
میں اس پہ ہولوں تصدق، تو پھر اٹھا کے پیوں

وہ میکدہ ہے، نہ ساقی ہے، کچھ نہ پوچھو شادؔ
میں کس کے گھر میں پیوں، کس کے گھر سے لا کے پیوں

○

ہاں تک ہو بسر کر زندگی عالی خیالوں میں
ا دیتا ہے کامل بیٹھنا صاحب کمالوں میں

باں ہیں حلق میں سینے میں اک مدت سے پھالے ہیں
را جانے بھری تھی کس غضب کی آگ نالوں میں

ری آنکھوں سے دیکھو حسن صورت کے علاوہ بھی
ہت سی خوبیاں ہیں اور بھی صاحب جمالوں میں

رے پہلو سے آخر اُٹھ گیا غم خوار گھبرا کر
ہت مشکل ہے آکر بیٹھنا آشفتہ حالوں میں

جو آنکھیں ہوں تو چشم غور سے اوراقِ گل دیکھو
کسی کے حسن کی شرحیں لکھی ہیں ان رسالوں میں

غم اس الجھاؤ سے چھٹنے کا اے دل تجھ کو ناحق ہے
و دیکھا تیرے لیے کنگھی نہ کرتے اپنے بالوں میں

خوشا وہ صدر میں جن کو جگہ وہ شاہِ خوباں دے
ہمارا ذکر کیا اے شادؔ! ہم ہیں رستہ حالوں میں

○

نگاہیں ہیں کچھ ایسے ادا و ناز ان کے
کہ بچتے جاتے ہیں لغزش سے پاکباز ان کے

تجھی کو زیغ میں پوچھا ترے خموشوں نے
اخیر وقت جب آیا پھیے نہ راز ان کے

نظر اٹھانے میں ہوتا ہے باز پرس کا ڈر
جھکائے رکھتے ہیں گردن کو سرفراز ان کے

دلوں میں گھر نہیں کرتے جو خود پسندی سے
پھرے ہیں کعبہ سے پیچھے نہ پڑھ نماز ان کے

مراد یہ ہے کہ آئے نہ راستی پہ کبھی
فلک کو پھانستے ہیں گیسوئے دراز ان کے

جنھوں نے ناز اُٹھائے نہ ناز والوں کے
پسند آئیں گے کیوں کر وہاں نیاز ان کے

تعلقات ہیں دنیا کے پھنس چکے تھے ہم
بچائے جاتے ہیں گیسوئے فتنہ ساز ان کے

اجل کے غمزۂ بے جا سمائیں کیا دل میں
تمام عمر اٹھائے ہوئے ہیں ناز ان کے

نہیں پسند جنھیں شادؔ عاشقانہ کلام
معاف کر دو انھیں دل نہیں گداز ان کے

○

ایک تم اور لاکھ ادائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے
ترچھی نگاہیں شنگ قبائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

بھر میں اپنا اور ہی عالم ابر بہاراں دیدۂ پُرنم
ضد کہ ہمیں وہ آپ بُلائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

اپنی ادا سے آپ کھٹکنا، اپنی ہوا سے آپ جھجکنا!
چال میں لغزش منہ پہ حیائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

ہاتھ میں آئی تیغ پکڑنا، تاکہ لگے بھی زخم تو اچھا
قصد کہ پھر جی بھر کے ستائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

کالی گھٹائیں باغ میں جھولے دھانی دوپٹے اُلٹ چھٹکائے
مجھ پہ یہ قدغن آپ نہ آئیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

پچھلے پہر اٹھ اٹھ کے نمازیں ناک رگڑنی سجدے پہ سجدے
جو نہیں جانے اُس کی دعائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

شادؔ نہ وہ دیدار پرستی اور نہ وہ بے نشہ کی مستی
تجھ کو کہاں سے ڈھونڈ کے لائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

○

نگہ کی برچھیاں جو سہ سکے سینا اسی کا ہے
ہمارا آپ کا جینا نہیں جینا اسی کا ہے

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

مکدر یا مصفا جس کو یہ دونوں ہی یکساں ہوں
حقیقت میں وہی مے خوار ہے پینا اسی کا ہے

امیدیں جب بڑھیں حد سے طلسمی سانپ ہیں زاہد
جو توڑے یہ طلسم اے دوست گنجینہ اسی کا ہے

کدورت سے دل اپنا پاک رکھ اے شادؔ پیری میں
کہ جس کو منہ دکھانا ہے یہ آئینہ اسی کا ہے

ریاض خیرآبادی

○

ہنگامِ نزع، گریہ یہاں بے کسی کا تھا
تم ہنس پڑے یہ کون سا موقع ہنسی کا تھا

دل نے مجھے خراب کیا کہنے یار میں
دشمن پہ اعتبار مجھے دوستی کا تھا

یہ اپنی وضع اور یہ دشنام سے فروش
سن لو جو پی گئے، یہ مزہ مفلسی کا تھا

وہ کیوں ٹھہرتے نزع میں بالیں غیر پر
کوئی معاملہ یہ گھڑی دو گھڑی کا تھا

حسرت سے کوئی سوئے فلک دیکھتا تھا آج
لب پر گلہ کسی کا، نہ شکوہ کسی کا تھا

اہلِ حرم بھی آ کے ہوئے تھے شریکِ دور
کچھ اور رنگ آج مری مے کشی کا تھا

لوٹے مزے حیا کے، اٹھائے ادا کے لطف
پہروں سے آج مجھ کو، تصور کسی کا تھا

زاہد تمام عمر فرشتہ بنا رہا
اس نے کیا جو کام، یہ کام آدمی کا تھا

جس انجمن میں بیٹھ گیا، رونق آ گئی
کچھ آدمی ریاض عجب دل لگی کا تھا

○

وہ ستاتا ہے، ستاتے جو نہیں تم مجھ کو
دھوکے دیتا ہے بری طرح تو ہم مجھ کو

پارسائی کا یقیں غیر کو دلواتے ہیں
اور جو بے ساختہ آ جائے تبسم مجھ کو

خانقاہیں تو ہزاروں ہیں گرجی بھی لگے
کہیں تھوڑی سی جگہ دے دو پسِ خم مجھ کو

جس کے ہر ذرے میں تھا وادیٔ ایمن پنہاں
بے خودی نے اسی صحرا میں کیا گم مجھ کو

داد خواہوں میں دمِ حشر جو دیکھا ہے ریاض
پیار سے پوچھتے ہیں: بھول گئے تم مجھ کو

○

وارفتہ آج کیسی طبیعت چمن میں تھی
صحرا سے کچھ سوا مجھے وحشت چمن میں تھی

بے دورِ جام، باغ میں گزرا تمام وقت
کل ساتھ ساتھ گردشِ قسمت چمن میں تھی

اجڑا جب آشیاں، تو خزاں کیا، بہار کیا
تنکوں سے آشیاں کی محبت چمن میں تھی

صیاد گھر ترا مجھے جنت سہی، مگر
جنت سے بھی سوا مجھے راحت چمن میں تھی

صحرا کی دیکھ بھال بھی کچھ تھی مرے سپرد
تنکے چنوں چمن کے یہ خدمت چمن میں تھی

اللہ! اس طرح کی جنوں آفریں بہار
جوشِ بہار تھا کہ قیامت چمن میں تھی

سامان سب تھے، آج خدا نے بچا لیا
توبہ کے بعد کچھ مری نیت چمن میں تھی

کل ہم گئے تھے، آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے
بے شمع و گل ریاض کی تربت چمن میں تھی

○

پی لی ہم نے شراب پی لی
تھی آگ مثالِ آب پی لی

اچھی پی لی، خراب پی لی
جیسی پائی شراب پی لی

عادت سی ہے نشہ ہے نہ اب کیف
پانی نہ پیا شراب پی لی

چھوڑے کئی دن گزر گئے تھے
آئی شبِ ماہتاب پی لی

منہ چوم لے کوئی اس ادا سے
سرکا کے ذرا نقاب پی لی

منظور تھی شستگی زباں کی
تھوڑی سی شرابِ ناب پی لی

○

او کوسنے والے اب دعا دے
اتنا کہہ دے خدا شفا دے

قطرہ جسمِ بادہ کا مزا دے
شبنم مری پیاس تو بجھا دے

درماں کی طرح تڑپ مزا دے
یارب مجھے دردِ لا دوا دے

صیاد نہ باغ کی ہوا دے
وہ دور سے آشیاں دکھا دے

سب مے کدے ہیں اس سے خالی
دل کو مرے بے خودی نہ دے

یہ دولتِ حسن و دولتِ عشق
بس کی نہیں جسے خدا دے!

میری شبِ غم کی صبح ہو جائے
تو رُخ سے ذرا نقاب اٹھا دے

وہ تارِ نفس کہاں سے لاؤں
ٹوٹے ہوئے دل کی جو صدا دے

گائیں وہ اے ریاض! شرمائیں
تو رو کے یہی غزل سنا دے

○

گُل مرقعے ہیں ترے چاک گریبانوں کے
شکل معشوق کی انداز ہیں دیوانوں کے

کعبہ و دیر میں ہوتی ہے پرستش کس کی
مے پرستو! یہ کوئی نام ہیں میخانوں کے

جامِ توبہ شکن، توبہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

پر پرواز بنے خود شرر شمع کبھی
شرر شمع بنے پر کبھی پروانوں کے

ذکر کیا اہلِ جنوں کا کہ جب آئی ہے بہار
وہ تو وہ، رنگ بدل جاتے ہیں ویرانوں کے

آج بُت بیٹھے ہیں تقدیر کے مالک بن کر
اب جو لکھا ہے مقدر میں مسلمانوں کے

وسعتِ ذات میں گم، وحدتِ کثرت ہے ریاض
جو بیاباں ہیں، وہ ذرّے ہیں بیابانوں کے

○

جی اُٹھے حشر میں پھر جی سے گزرنے والے
یاں بھی پیدا ہوئے پھر آپ پہ مرنے والے

ہے اُداسی شبِ ماتم کی سہانی کیسی
چھاؤں میں تاروں کی نکلے ہیں سنورنے والے

ہم تو سمجھے تھے کہ دشمن پہ اُٹھایا خنجر
تم نے جانا کہ ہمیں تم پہ ہیں مرنے والے

عمر کیا ہے ابھی کم سن ہیں، نہ تنہا لیٹیں
سو رہیں پاس مرے خواب میں ڈرنے والے

نزع میں حشر کے وعدے سے یہ تسکیں بخشی
چین سے سو رہے منہ ڈھانپ کے مرنے والے

صبر کی میرے، مجھے داد ذرا دے دینا
او مرے حشر کے دن فیصلہ کرنے والے

کیا مزہ دیتی ہے بجلی کی چمک مجھ کو ریاضؔ
مجھ سے لپٹے ہیں مرے نام سے ڈرنے والے

○

کوئی جانے، یہی ہیں ایک جلوا دیکھنے والے
یہ موسیٰؑ اچھے آئے جا کے تنہا دیکھنے والے

نئی ناقوس میں پھونکی ہے حس نے روح وہ میں ہوں
ابھی موجود ہیں اہلِ کلیسا دیکھنے والے

کھلیں گی بے ثباتی دیکھ کر آنکھیں حبابوں کی
یہی ہیں سر اٹھا کر جوشِ دریا دیکھنے والے

ہم اپنی وضع رندانہ کریں کیوں ترکِ محشر میں
یہی ہوں گے وہاں بھی اہلِ دنیا دیکھنے والے

گرے غش کھا کے موسیٰ، تو صدا یہ طور سے آئی
کھلیں آنکھیں تری کچھ تو نے دیکھا دیکھنے والے؟

سنو افسانۂ جم! جام رکھ کر سامنے اُن کے
ابھی دو چار ہیں جم کا زمانا دیکھنے والے

نشیمن میں نہیں ہیں، تو شرار و برق کیوں جائیں
یہ جا کر، کون میرا آشیانا دیکھنے والے

یہ جتنے پینے والے ہیں ریاضؔ ان سب کے مرشد میں
ہمیشہ جامِ مے میں نورِ حق کا دیکھنے والے

○

وحدت پکارتی ہے، وہ کثرت سے دُور ہے
ہر انکشاف، رازِ حقیقت سے دُور ہے

دونوں ہیں ایک میرے لیے عیش ہو کہ غم
میرا مقام دوزخ و جنت سے دُور ہے

ہل چل میں حشر کی، نہیں موقع وصال کا
وقتِ وفائے عہد، قیامت سے دُور ہے

آئینۂ مثال میں ہوں، حسنِ بے مثال
لیکن وہ عکس ہوں کہ جو صورت سے دُور ہے

میں نے کریم جان کے تجھ کو، کیے گناہ
بخشے نہ تو مجھے، تری رحمت سے دُور ہے

توبہ کے بعد بھی مجھے پہنچے نہ تجھ سے فیض
ساقی یہ تیری چشمِ مروّت سے دُور ہے

اے شیخ! اس کی چھاں بھی نہیں خلد کو نصیب
یاروں کا مے کدہ تری جنت سے دُور ہے

اس کی بلا سے چاہے قیامت کبھی نہ آئے
ہو جائے صبح، یہ شبِ فرقت سے دُور ہے

پینے کے تو نہیں پس توبہ کبھی ریاض
ساغر سے ہاتھ اُٹھائیں یہ حضرت سے دُور ہے

○

جس دن سے حرام ہو گئی ہے
مے، خلد مقام ہو گئی ہے

قابو میں ہے ان کے وصل کا دن
جب آئے ہیں شام ہو گئی ہے

آتے ہی قیامت اس گلی میں
پامالِ خرام ہو گئی ہے

توبہ سے ہماری بوتل اچھی
جب ٹوٹی ہے، جام ہو گئی ہے

کچھ زہر نہ تھی شرابِ انگور
کیا چیز حرام ہو گئی ہے

مے نوش ضرور ہیں وہ نااہل
جن پر یہ حرام ہو گئی ہے

بجھ بجھ کے جلی تھی قبر پر شمع
جل جل کے تمام ہو گئی ہے

ہر بات میں ہونٹ پر ہے دشنام
اب حسنِ کلام ہو گئی ہے

ہے دُور ابھی ریاض منزل
دن ختم ہے، شام ہو گئی ہے

آزاد انصاری

○

لطف کی آنکھوں سے کیا دیکھا!
آہ! کسی مصرف کا نہ رکھا

آج تک آنکھیں ڈھونڈ رہی ہیں
آہ! وہ پیارا پیارا جلوہ

رحم نہ کھانا، ٹھیک نہیں ہے
دیکھو! سستا کر کچھ نہ ملے گا

دامنِ غفلت چھوٹ نہ جائے
آنکھ اٹھا کر، دیکھ نہ لینا

زیست کے دن کاٹے نہیں کٹتے
کاش! ترا ارمان نہ ہوتا

آہ ہماری ناؤ کی حالت
موجیں حائل، طوفاں برپا

آزاد آپ اور قیدِ علائق
"مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ"

○

مے پی، دل کو غم سے نہ پاٹ
خوش جی، اور خوش جی کر کاٹ

آہ! خیالِ فرقتِ دوست
جی بھی بے کل، دل بھی اُچاٹ

جور و جفا کی خُو تو نہ ڈال
مہر و وفا کی جڑ تو نہ کاٹ

رہرو حیرت! دیکھ کے چل
غافل! آگے راہ نہ گھاٹ

ارض و فلک، سب سرگرداں
جس کو دیکھو، بارہ باٹ

آزاد آپ اور اتنی دُون
"بل بے تدی تیرا پاٹ"

○

کس کی لگاوٹ، کس کی لاگ!
بھاگ! بلائے عشق سے بھاگ

زلفوں والو! یہ اندھیر
دُہرے دُہرے کالے ناگ

ماشاء اللہ! طرزِ کلام
جیسے کوئی دلکش راگ

قتلِ جہاں اور پھر یہ ستم
"ہولی ہے ہولی" بھاگ ہے بھاگ!

میرا سر اور تیرا در
دھن مری قسمت، دھن مرے بھاگ

خوابِ غفلت، ٹھیک نہیں
جاگ! اے غافل، وقت ہے جاگ

حیف آزادِ دانا حیف
تم اور اُلفت کا کھڑاگ

○

امید، سو وہ مفقود۔ ارمان، سو وہ معدوم
اے وائے دلِ مرحوم! صد وائے دلِ مرحوم

طالب ہوں مگر ناکام۔ سائل ہوں، مگر محروم
تقدیر، مری تقدیر۔ مقسوم، مرا مقسوم

اب دل کی نہ کچھ پوچھو، اب دل کا خدا حافظ
مانوس نہ کچھ مایوس، مسرور نہ کچھ مغموم

بس عذرِ خطا کب تک، بس شکرِ جفا کب تک
ظاہر ہے کہ تو ظالم ثابت ہے کہ ہم مظلوم

قسمت سے وہ ملزم ہوں، شامت سے وہ مجرم ہوں
جو داد سے بھی محروم، بے داد سے بھی محروم

غمخوار یہ کہتے ہیں: "درمانِ غم آساں ہے!"
آثار یہ کہتے ہیں: "خیریتِ جاں معلوم"

آزاد کی مے خواری، آزاد کا حصہ تھی
جب پی تو یہ کہہ کر پی: "النادرُ کالمعدوم"

○

نہ پوچھو! کون ہیں، کیوں راہ میں ناچار بیٹھے ہیں
مسافر ہیں، سفر کرنے کی ہمت ہار بیٹھے ہیں

اُدھر پہلو سے تم اُٹھے، اِدھر دنیا سے ہم اُٹھے
چلو، ہم بھی تمہارے ساتھ ہی تیار بیٹھے ہیں

کسے فرصت، کہ فرضِ خدمتِ الفت بجا لائے
نہ تھے بے کار بیٹھے ہو، نہ ہم بے کار بیٹھے ہیں

جو اُٹھے ہیں، تو گرمِ جستجوئے دوست اُٹھے ہیں
جو بیٹھے ہیں، تو محوِ آرزوئے یار بیٹھے ہیں

مقامِ دستگیری ہے کہ تیرے رہروِ الفت
ہزاروں جستجو میں گر کے ہمت ہار بیٹھے ہیں

نہ پوچھو، کون ہیں، کیا مدعا ہے، کچھ نہیں بابا
گدا ہیں اور زیرِ سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

یہ ہو سکتا نہیں، آزاد سے مے خانہ خالی ہو
وہ دیکھو، کون بیٹھا ہے، وہی سرکار بیٹھے ہیں

○

سخت مشکل ہے کہ اس کا جاننا ممکن نہیں
اور بے جانے، ہمارا ماننا ممکن نہیں
زندگی بھر جاننے کی کوششیں کرنے کے بعد
صرف یہ جانا: یہاں کچھ جاننا ممکن نہیں
وہ یہ کہتے ہیں: ہمیں پہچاننے کی سعی کر
اور یہاں اپنے کو بھی پہچاننا ممکن نہیں
وحدتِ بے لوث ہاتھ آئے تو کیوں کر ہاتھ آئے
کثرتیں اتنی ہیں، جن کا چھاننا ممکن نہیں
مادّے کی ساری تعریفات برحق، لیکن اب
روح کو آلودگی میں سانا ممکن نہیں
رازِ عالم تازباں لانا تو ممکن ہے مگر
سارے عالم سے لڑائی ٹھاننا ممکن نہیں
کچھ ہو، اب ناقص کو کامل جاننا امرِ محال
کچھ ہو، اب ممکن کو واجب ماننا ممکن نہیں
منکرِ عرفانِ حق! جا، شبہ و شک بالکل فضول
ظرف قابل لے کے آ، عرفان ناممکن نہیں
عقل والو! عقل پر غرّہ تو اک حد تک درست
لیکن اس کو عقل سے پہچاننا ممکن نہیں
حضرتِ آزاد اب ہم ہیں اور اک ایسا جہاں
جس جہاں کو منقلب کر دو، ماننا ممکن نہیں

○

(بہ صنعت ترصیع جدید)

وہ تیرا دل میں رہ کر، آنکھ سے مستور ہو جانا
وہ میرا باوجودِ قرب تجھ سے دور ہو جانا

وہ تیرا، میری امیدوں کو بے دردی سے ٹھکرانا
وہ میرا شیشۂ دل، سنگِ غم سے چُور ہو جانا

وہ تیرا جور پر تاکیدِ شکرِ جور فرمانا
وہ میرا امتثالِ امر سے معذور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو آخر مژدۂ یاس دنا دینا
وہ میری غم نصیب امید کا مہ رو ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو آخر اپنی منزل کا پتا دینا
وہ میری جد و جہدِ شوق کا مشکور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو اپنے درد کی دولت عطا کرنا
وہ میرے دامنِ امید کا بھر پور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو اپنی لم یزل الفت عطا کرنا
وہ میرا سرمدی تسکین سے معمور ہو جانا

خوشا آزاد کا فیضانِ صحبت جس نے سمجھایا
خدا کا قرب کیا شے ہے خودی سے دور ہو جانا

○

جو حال دیکھتے ہو، وہ خود عرضِ حال ہے
درویش ہوں، فقیر ہوں، صورت سوال ہے

اب دل ہے اور دل میں تمہارا خیال ہے
اور وہ خیال، جس کا بھلانا محال ہے

ایسا نہ ہو کہ ضبطِ شکایت نہ ہو سکے!
للہ یہ نہ پوچھ کہ "جی کیوں نڈھال ہے؟"

اچھا! اک آرزو نہ سہی، دل کا کیا علاج
دل بھی تو آرزو کی طرح پائمال ہے

اے طاقتِ جواب! یہ بے اعتنائیاں؟
کم بخت! دیکھ تو، کوئی پرسانِ حال ہے

یہ کون چاہتا ہے کہ "افشائے راز ہو!"
یہ عرض تھی کہ "ضبطِ تمنا محال ہے!"

آزاد دل کا درد چھپانے سے فائدہ؟
صورت ہی کہہ رہی ہے: طبیعت نڈھال ہے

○

تو اور پاسِ خاطرِ اہلِ وفا کرے
امید تو نہیں ہے۔ مگر ہاں خدا کرے

تکرارِ لن ترانی پہ ہم روا نہ رکھ
ایسا نہ ہو کہ شوقِ تماشا گلا کرے

کیا فائدہ؟ کہ شکوۂ جور و جفا کروں
کیا جانتا نہیں ہوں کہ تو اور وفا کرے؟

شاید تمھیں ہنوز یہ الفاظ یاد ہوں
"تجھ سے دغا کرے تو خدا سے دغا کرے"

اب میں ہوں اور کوششِ ترکِ تعلقات
شاید یہی علاج کوئی فائدا کرے!

درویش کی پرکھ ہے تو درویش کی سنو!
درویش کی صدا ہے کہ "داتا بھلا کرے"

آزاد! اجرِ خوفِ جزا، امرِ حق سہی
لیکن تری بلا، غمِ روزِ جزا کرے

○

بے خبر! وجہ بنائے دوسرا بھی عشق ہے
کارِ انساں ہی نہیں، کارِ خدا بھی عشق ہے

ہم قاتل بھی ہے، تریاقِ شفا بھی عشق ہے
موت بھی ہے، موت کے دکھ کی دوا بھی عشق ہے

رہرو! راہِ محبت میں نڈر آگے بڑھو
صرف رہزن ہی نہیں ہے، رہنما بھی عشق ہے

مشکلاتِ عشق سے گھبرا نہ جانا چاہیے
مشکلاتِ عشق کا مشکل کشا بھی عشق ہے

شیخ صاحب! عشق کارِ اہلِ عصیاں ہی نہیں
پیر و مرشد! مسلکِ اہلِ صفا بھی عشق ہے

زندگی میں ترکِ شغلِ عشق کیوں کر کیجیے!
زندگی بھی، زندگی کا مدعا بھی عشق ہے

آؤ! اب آزاد! آسن مار بیٹھیں اور جپیں
آتما بھی عشق ہے، پرماتما بھی عشق ہے

آرزو لکھنوی

○

کس مست سے ساقی آنکھ لڑی متوالا بنا لہرا کے گرا
آگے تو یہیں اور کٹھن دل پہلے ہی ٹھوکر کھا کے گرا

دل شوق کے جوش میں دوڑ پڑا اور شوق تو ہوتا ہے اندھا
در بند پڑا تھا قسمت کا ٹکر جو لگی تیورا کے گرا

کیا عشق کی منزل بھی کٹھن بندھ بندھ کر ہمت ٹوٹ گئی
جو ایک قدم چل کر سنبھلا وہ دو قدم آگے جا کے گرا

سلگی ہوئی ہے غم کی بھٹی دل کیوں نہ پگھل کر ہو پانی
جو قطرہ آنسو بن کے بہا لہرا کے چلا تیورا کے گرا

جو نالہ فلک سے ٹکرایا وہ آرزو اک تارا ٹوٹا
دشمن کی طرف جو لپکا تھا وہ شعلہ بھی پر آ کے گرا

○

سمجھے جی کا اگلا سا جلنا کہاں اب
دھواں سا تو ہے تو نکلنا کہاں اب

وہ ہر آنے والے پہ دھوکا انہی کا
وہ گھبرا کے گھر سے نکلنا کہاں اب

رہا کرتا ہے جی بھی ڈوبا ہوا سا
وہ ہاتھوں کلیجہ اچھلنا کہاں اب

پڑے رہتے ہیں یونہی منہ کو لپیٹے
وہ اٹھ اٹھ کے پہروں ٹہلنا کہاں اب

ملک ہو کسی کی تو ہو کیں بھی اٹھیں
تڑپ کر وہ کروٹ بدلنا کہاں اب

گلی تک تقاضے کا لگانا بجھانا
جلانا کہاں اب سے جلنا کہاں اب

اٹھا اور گرا آرزو اس گلی میں
نہیں پاؤں جمتے سنبھلنا کہاں اب

○

سب کی مٹھیاں پلٹ گئیں سنکیں بندھی ہوئی ہوائیں
جی ہی نہیں اُداس اُداس کرتا ہے بن بھی سائیں سائیں
اچھا ہے جو گزر چکی آپ بھی اس کو بھول جائیں
سنتا ہے کون دھرکے کہانی لمبی کتھا کسے سنائیں
کوس کوس تھے چاہ کے دھوپ میں تیور آ گئے
ہم یہی سوچتے رہے چھاؤں ملے تو بیٹھ جائیں
یوں نہ مار کر پھک لمبی سی سانس لی تھی کیوں
پھر ہوئی ویسی ہی کھٹک کاہے کی ہے یہ کیا بتائیں
آگ سی ہے لگی ہوئی چھوڑو ہٹو الگ رہو
بجلی ہے ایک ایک نس ہاتھ کہیں نہ جھلس جائیں
جس نے کہ چین کھو دیا ہے وہی جی کا چین بھی
یہ بھی نہیں کہ رکھیں دھیان یہ بھی نہیں کہ بھول جائیں
چاند سے سنہ کی ہے وہ چھوٹ جیسے دمکتی بجلیاں
دیکھنے کی تھر تھکی آنکھیں رہیں کہ چھوٹ جائیں!
چپ ہیں تو یہ کہ چپ ہو کیوں بولیں تو ہاں یہ کیا کہا
بھید ہی بھید تو ہیں سب کس سے بتائیں کیا بتائیں
اس کی گلی میں آدھمے آرزو اب نہیں گئے کیا
اس سے ہو جانا ہے تو کار اس سے ہو چلے جھائیں جھائیں

○

بھولے بن کر حال نہ پوچھو بنتے ہیں انشک تو بننے دو
جس سے بڑھے بے چینی دل کی ایسی قسمتی رہتے دو

رسمیں اس اندھیر نگر کی نئی نہیں یہ پرانی ہیں
مہر پہ ڈالو رات کا پردہ ماہ کو روشن رہنے دو

روح نکل کر باغ جہاں سے باغ جناں میں جا پہنچے
چہرے پہ اپنے میری نگاہیں اتنی دیر تو رہنے دو

خندۂ گل بلبل میں ہوگا گل میں نغمہ بلبل کا
قصہ ایک زبانیں دو ہیں آپ کہو یا کہنے دو

اپنا جنون شوق دیا کیوں خوف جو ہار سوائی کا
بات کرو خود قابل شکوہ اُلٹے مجھ کو ہنسنے دو

○

اوّلِ شب وہ بزم کی رونق شمع بھی تھی پروانہ بھی
رات کے آخر ہوتے ہوتے ختم تھا یہ افسانہ بھی

قید کو توڑ کے نکلا جب میں ٹوٹے بکھرے ساتھ مرے
دشتِ عدم تک جنگل جنگل ہمراہ تھا صحرا نہ بھی

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

خون ہی کی شرکت ہو نہ کہیں ہو نکہت چینے جھگڑے کیا
اپنوں سے وہ دیکھ رہا ہوں جو نہ کرے بیگانہ بھی

ایک لگی کے دو ہیں اثر اور دونوں جب مراتب میں
تو جو لگائے شمع کھڑی ہے رقص میں ہے پروانہ بھی

دونوں جو لائقِ نگاہ ہوں ہیں بستی کیا ویرانہ کیا
اٹھ کے چلا جب کوئی بگولا دوڑ پڑا دیوانہ بھی

وحدت میں کی کثرت پیدا جلووں کی پاشانی نے
ایک سی جا تھا کچھ دن پہلے کعبہ بھی بتخانہ بھی

غنچے چپ ہیں گل ہیں ہوا پر کس سے کہئے جی کا حال؟
خاک نشیں اک سبزہ ہے سو اپنا بھی بیگانہ بھی

حسن و عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ ادھر سے ہوتی ہے
شمع کا شعلہ جب لہرایا اڑ کے چلا پروانہ بھی

دورِ مسرت آرزو اپنا کیسا زلزلہ آگیں تھا
ہاتھ سے منہ تک آتے آتے چھوٹ پڑا پیمانہ بھی

○

ہوگئیں کیاریاں ہری جیسے کہ رُت پلٹ گئی
کون یہ مسکرا دیا، ہنسنے لگی کلی کلی!

کھلنے کی آس میں یہاں ڈال گئے تھے اک کلی
روکے اُٹھا رہے ہیں آج پنکھڑیاں ملی ملی

تاروں کو دیکھتے ہیں سب اور یہ دیکھتا ہوں میں
آئی کہاں سے یہ چمک کس کی ہے یہ بھلا بھلی

سب سے بڑا ہُوا تھا دن آئے تھے دیکھنے سبھی
آنکھیں جو چوندھیا گئیں مچ گئی جیسے کھل بلی

دن کی بھی آس ہے یہاں رات کی مکر چاندنی
کتنی رُتیں پلٹ گئیں ڈال کبھی نہ یہ پھلی

چاہ کے ساتھ جی کی تھاہ پائی ہے اور نہ پاؤ گے
ایک ہے دوسرے کی آڑ دونوں ہیں یوں گھلی ملی

اس کے لیے کہ آرزو ہنستا ہُوا تھا ساتھ ساتھ
ڈھونڈھتا ہوں بن کے بن چھان پھرا گلی گلی

○

گھم بات سہیلی ایسی بس وہی بوجھے جس کو بجھائے
بھید نہ پائے تو گھبرائے بھید جو پائے تو گھبرائے

بھولی باتیں بنانے والا ہنس کے ہنسائے روکے رُلائے
جب وہ بلائیں اسے کیا کہیے جائے تو منہ نکمارہ جائے

جس کو اکیلے میں آ کر دھیان تمارہ رکے ستائے
چپکے چپکے بیٹھا روئے آنسو پونچھے اور رہ جائے

اچھا اچھا ہنس لو ہنسو اب نہ کہو گے کوئی بات
ایسا بھولا کوئی نہیں ہے جان چلے پھر دھوکا کھائے

ساری کہانی بے چینی کی ماتھے پہ لکھ دیتی ہے
ایسی بات کہ گھٹتے گھٹتے منہ تک آئے اور رہ جائے

چاہ کی بات کھٹکتا کانٹا جس کی بے چینی میں چین
منہ سے نکالے تو پچھتائے جی میں رکھے تو پچھتائے

چھپے چھپے گی چاہت کیوں کر جب اس میں یہ کھٹکا ہے
اپنی بیتی ایک کہے اور جگ بیتی کا بھرم کھل جائے

چھیڑ کے پوچھو پوچھ کے بجھو سن کے نہ ایسی بات سناؤ
آس لگا کر کہنے والا اپنا سا منہ لے کر رہ جائے

بک نہ سننے والے سے کہنا پتھر سے ٹکرانا ہے
بات بھی وہ جو ڈرتے ڈرتے جھجکے ادھوری منہ تک آئے

چاہت کی ہر بات ہے اُلٹی مت الٹی رونا اُلٹا
جتنا مسوسو جی اور اُلٹے بوند نکلے ندی بہہ جائے

سکھ بھی وہی دیتا ہے دکھ بھی پھر کہے کا رونا ہے
یہ تو ہے اپنی اپنی بھاون جیسا مانگے ویسا پائے

ہانے کی چوٹ نہ سہنے والا کھوٹ بھی کرتے ڈرتا ہے
جیسے بے بس سانپ چھلا پٹے کھا کھا کر رہ جائے

آرزو ایسے یوں بہتیرے ہنس مکھ پتھر کوئی نہیں
چین بجھ لے بے چینی کو ہائے کرے اور ہنستا جائے

○

دکھ روگ کو چاہت کے سکھ روگ بنانا ہے
دہکا ہوا انگارا چھاتی سے لگانا ہے

کھسیانی ہنسی ہنسا اک بات بنانا ہے
ٹپکے ہوئے آنسو کو پلکوں سے اُٹھانا ہے

کیوں مرتے ہیں ہم تم پر اس کیوں کو نہ کچھ پوچھو
پانی نہیں پینا ہے اور پیاس بجھانا ہے

جو آپ سے گزرا ہے پہنچا ہے وہی تجھ تک
جو آپ کو بھولا ہے اس نے تجھے جانا ہے

ہم یونہی نہیں چپ ہیں کیوں چپ ہیں نہ یہ پوچھو
بات اپنی بنانا ہے بھید ان کا چھپانا ہے

اٹھنا ری چوکھٹ سے اور سوچ کے پر رکھنا
جائیں تو کدھر جائیں پچھتا کے پھر آنا ہے

چپ ایک پہیلی ہے سوچو گے تو بوجھو گے
تم سے وہی کہنا ہے جو سب سے چھپانا ہے

دکھ میں بھی ہنسی آئے یہ آن ہے چاہت کی
چڑھتی ہوئی ندی ہے اور پیر کے جانا ہے

ہاں آرزو اچھا ہے جو اور بھی دکھ جھیلو
سمجھایا ہے جب تم کو کہنا نہیں مانا ہے

○

آگئی پیری، جوانی ختم ہے
صبح ہوتی ہے، کہانی ختم ہے

حسرتوں کا دل سے قبضہ اٹھ گیا
خاصبوں کی حکمرانی ختم ہے

ہوگیا ذوقِ نظارہ خود فنا
یا بہارِ بوستانی ختم ہے

ماجرائے غم چراغِ صبح کا
ختم اور اپنی زبانی ختم ہے

صورتِ تیغ بستہ ہے جوشِ گداز
بہتے دریا کی روانی ختم ہے

ذکرِ غم میں لذتِ غم پھر کہاں
اپنے ساتھ اپنی کہانی ختم ہے

آرزو تھا اک اندھیرے کا چراغ
اس کی بھی اب ضوفشانی ختم ہے

○

ہیرا بھی ہے دل تو پتھر ہے، یوں قدر نہیں کچھ ہوتی ہے
ہاں پانی ہو کر بہہ نکلے، پھر جو قطرہ ہے موتی ہے

سو پٹے کھائے زمانے نے، اور دل کا رنج خوشی نہ بنا
کیا موت کی نیند میں ہے قسمت جو ایک ہی کروٹ سوتی ہے

وہ نازِ غضب یہ نازِ ستم، دم بند ہے اور جینا مشکل
چپ ہیں تو ستائے جاتے ہیں، بولیں تو شکایت ہوتی ہے

غم خوار ہی جب کاوش رکھیں، راحت کی امید کروں کس سے
اب نیند بھی راتوں کو آکر کانٹے آنکھوں میں چبھوتی ہے

اس فیصلے پر تیرے ظالم، رونے کے ہے قابل حالتِ دل
ٹوٹا نہ اگر تو پتھر ہے اور چور ہوا تو موتی ہے

الفت میں خوشی پر پہری حیرت میں ہیں جو یہ کیا جانیں
پڑتا ہے داغ کلیجے میں اور مُہر لبوں پر ہوتی ہے

اے آرزو اب ہم چشموں میں ہے ظرف کا اس کے خدا حافظ
جس دل میں جہاں کی نیرنگی سب سرد و گرم سموتی ہے

علامہ اقبال

○

کبھی اے حقیقتِ منتظر، نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طلب آشنائے خروش ہو تو نوا ہے، محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا، کہ چھپا ہوا ہو، سکوتِ پردۂ ساز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو، تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

دمِ طوف، کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی، تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو، ترے عفوِ بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی، تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

○

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ! کیا چاہتا ہوں

ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی،
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

ذرا سا تو دل ہوں، مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل!
چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں، سزا چاہتا ہوں

○

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں
اگر کچھ آشنا ہوتا، مذاقِ جبہہ سائی سے
تو سنگِ آستانِ کعبہ، جا ملتا جبینوں میں
کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے موسیٰ
کہ لیلیٰ کی طرح، تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں
مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں
مجھے رو کے گا تو اے ناخدا! کیا غم ہے ڈوبے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں
جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں
تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو
کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے نوشۂ چینوں میں
محبت کے لیے دل ڈھونڈ! کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں
خموش اے دل! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے، محبت کے قرینوں میں
برا سمجھوں انھیں مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں خود بھی تو ہوں اقبال اپنے نکتہ چینوں میں

○

چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں، سورج میں، تارے میں

شریعت کیوں گریباں گیر ہو، ذوقِ تکلم کی!
چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں

جو ہے بیدار انساں میں، وہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں، پھول میں، حیواں میں، پتھر میں، ستارے میں

مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں

نہیں منعم فوابِ آخرت کی آرزو مجھ کو
وہ سودا کر ہوں جس نے نفع دیکھا ہے خسارے میں

صلائے لن ترانی سن کے اے اقبال میں چپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے مارے میں

○

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب! رہنے والے ہیں

علاج درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں
جسے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں

بھلا بھولا ہے یارب! چین میری امیدوں کا
بندھا کاغذ میں دے کر یہ کھلونے میں نے پالے ہیں

یہ دیکھو! مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سینکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

نہیں بیگانگی اچھی، رفیقِ راہ منزل ہے
ٹھہر جا، اے شرر! ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں

امید حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ درد انگیز نالے ہیں

○

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینہ میں اسے اور ذرا تھام ابھی

پختہ ہوتی ہے، اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گام عمل
عقل بھی سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغام ابھی

شیوۂ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی
تو ہے زناری بت خانۂ ایام ابھی

عذر پرہیز پہ کہتا ہے بگڑ کر ساقی
ہے ترے دل میں وہی کاوشِ انجام ابھی

سعیِ پیہم ہے ترازوئے کم و کیفِ حیات
تیری میزاں ہے شمار سحر و شام ابھی

ابرِ نیساں! یہ تنک بخشی شبنم کب تک؟
میرے کہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی

بادہ گردانِ عجم وہ، عربی میری شراب
میرے ساغر سے جھجکتے ہیں مے آشام ابھی

خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
نوگرفتار، پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی

○

نہ آتے، ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار! کیا تھی

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ، مستی میں ہشیار کیا تھی

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد!
مگر یہ بتا! طرزِ انکار کیا تھی؟

کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی، تیری گفتار کیا تھی

○

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا، تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

منصور کو ہوا لبِ گویا پیامِ موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

ہو دید کا جو شوق، تو آنکھوں کو بند کر!
ہے دیکھنا یہی، کہ نہ دیکھا کرے کوئی

عذر آفرینِ جرمِ محبت ہے حسنِ دوست
محشر میں عذرِ تازہ نہ پیدا کرے کوئی

نظارہ کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

کھل جائیں کیا مزے ہیں تمنائے شوق کے
دو چار دن جو میری تمنا کرے کوئی

○

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

نہ کر دیں مجھ کو مجبورِ نوا فردوس میں حوریں
مرا سوزِ درو یوں پھر گرمیٔ محفل نہ بن جائے

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے

کہیں اس عالمِ بے رنگ و بو میں بھی طلب میری
وہی افسانۂ دنبالہ محمل نہ بن جائے

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

○

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن؟

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن!

من کی دنیا! من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا! تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن!

حسرت موہانی

○

سرگرم ناز آپ کی شانِ جفا ہے کیا
باقی ستم کا اور ابھی حوصلہ ہے کیا

آنکھیں تری جو ہوش ربائی میں فرد ہیں
ان میں یہ سحر کارئ رنگِ حیا ہے کیا

گر جوششِ آرزو کی ہیں کیفیتیں یہی
میں بھول جاؤں گا کہ مرا مدعا ہے کیا

آتے ہیں وہ خیال میں کیوں میرے بار بار
عشقِ خدا نما کی یہی ابتدا ہے کیا

اک برقِ مضطرب ہے کہ اک سحر بے قرار
کچھ پوچھئے نہ وہ نگہِ فتنہ زا ہے کیا

اس درجہ دل پذیر ہے آہنگِ نغمہ کیوں
پنہاں لباسِ درد میں تیری صدا ہے کیا

چل بھی دیئے وہ چھین کے صبر و قرارِ دل
ہم سوچتے ہی رہ گئے یہ ماجرا ہے کیا

نزدیک بامِ یار سے ہے نردبانِ عشق
اے دل! یہ جائے حوصلہ ہے کھٹکتا ہے کیا

حسرت جفائے یار کو سمجھا جو تو وفا
آئینِ اشتیاق میں یہ بھی روا ہے کیا

○

لایا ہے دل پر کتنی خرابی
اے یار! تیرا حسن شرابی

پیراہن اس کا ہے سادہ لیکن
یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی

ق

عشرت کی شب کا وہ دورِ آخر
نورِ سحر کی وہ لاجوابی
پھرتی ہے اب تک دل کی نظر میں
کیفیت ان کی وہ نیم خوابی
بزمِ طرب ہے وہ بزم کیوں ہو
ہم غم زدوں کو واں باریابی

ق

اس نازنیں نے باوصفِ عصمت
کی وصل کی شب وہ بے حجابی
شوقِ اپنی بھولا گستاخ دستی
دل ساری شوخی حاضر جوابی
وہ روئے زیبا ہے جانِ خوبی
ہیں وصف جس کے سارے کتابی
اس قیدِ غم پر قربان حسرت
عالی جنابی، گردوں رکابی

○

بھلاتا لاکھ ہوں، لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی! ترکِ الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں

نہ چھیڑ اے ہم نشیں! کیفیت صہبا کے افسانے
شرابِ بیخودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

رہا کرتے ہیں قیدِ ہوش میں اے وائے ناکامی
وہ دشتِ خود فراموشی کے چکر یاد آتے ہیں

نہیں آتی، تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں، تو اکثر یاد آتے ہیں

حقیقت کھل گئی حسرت ترے ترکِ محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

○

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

بے زبانی ترجمانِ شوقِ بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگارِ عیش کی
اب نظر کا ہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں

التفاتِ یار تھا اک خوابِ آغازِ وفا
سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

تیری بے صبری ہے حسرت خامکاری کی دلیل
گریۂ عشاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

○

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جائیے
بندہ پرور! جائیے، اچھا خفا ہو جائیے

میرے حدِ جرم پر مطلق نہ کیجے التفات
بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر کج ادا ہو جائیے

خاطرِ محروم کو کر دیجئے مجروح اور
درپئے ایذائے جانِ مبتلا ہو جائیے

راہ میں ملئے کبھی مجھ سے تو از راہِ ستم
ہونٹ اپنا کاٹ کر فوراً جدا ہو جائیے

گر نگاہِ شوق کو محوِ تماشا دیکھئے
قہر کی نظروں سے مصروفِ سزا ہو جائیے

میری تحریرِ ندامت کا نہ دیجے کچھ جواب
دیکھ لیجے اور تغافل آشنا ہو جائیے

مجھ سے تنہائی میں گر ملئے تو دیجے گالیاں
اور بزمِ غیر میں جانِ حیا ہو جائیے

ہاں! یہی میری وفائے بے اثر کی ہے سزا
آپ کچھ اس سے بھی بڑھ کر پُر جفا ہو جائیے

جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش سے
اب نہ ملئے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائیے

دل سے یادِ روزگارِ عاشقی دیجے نکال
آرزوئے شوق سے نا آشنا ہو جائیے

کاوشِ دردِ جگر کی لذتوں کو بھول کر!
مائلِ آرام و مشتاقِ شفا ہو جائیے

ایک بھی ارماں نہ رہ جائے دلِ مایوس میں
یعنی آخر بے نیازِ مدعا ہو جائیے

بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد
اس قدر بیگانۂ عہدِ وفا ہو جائیے

ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو، مگر
سراپا ناز سے کیوں کر خفا ہو جائیے

چاہتا ہے مجھ کو تو بھولے نہ بھولوں میں تجھے
تیرے اس طرزِ تغافل کے فدا ہو جائیے

کشمکش ہائے الم سے اب یہ حسرت جی میں ہے
چھوٹ کے ان جھگڑوں سے مہمانِ قضا ہو جائیے

○

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے

باہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے

بار بار اُٹھنا اسی جانب نگاہِ شوق کا
اور ترا اعرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے

تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے

کھینچ لینا وہ مرا پردہ کا کونا، دفعتہً
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

جان کر سوتا تجھے وہ قصدِ پا بوسی مرا
اور ترا ٹھکرا کے سر، وہ مسکرانا یاد ہے

تجھ کو تنہا جب کبھی پانا، تو از راہِ لحاظ
حالِ دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے

جب سوا میرے تمہارا کوئی دیوانہ نہ تھا
سچ کہو! کچھ تم کو بھی وہ کارخانا یاد ہے

غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے

آگیا گر وصل کی شب بھی کہیں ذکرِ فراق
وہ ترا رو رو کے مجھ کو بھی رُلانا یاد ہے

دوپہر کی دھوپ میں میرے بُلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

آج تک نظروں میں ہے وہ صحبتِ راز و نیاز
اپنا جانا یاد ہے، تیرا بلانا یاد ہے

میٹھی میٹھی چھیڑ کی باتیں ترا لیل و نہار کی
ذکرِ دشمن کا وہ باتوں میں اُڑانا یاد ہے

دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے
جب منا لینا، تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے

پڑ گئی تھی ہم سے تم سے گر کبھی ملتے تھے جس جگہ
مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

شوق میں مہندی کے وہ بے دست و پا ہونا ترا
اور مرا وہ چھیڑنا، وہ گدگدانا یاد ہے

باوجود ادعائے اتقا حسرت مجھے
آج تک عہدِ ہوس کا وہ فسانا یاد ہے

○

یاد ہیں سارے وہ عیش باز افادت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغاز الفت کے مزے

وہ سراپا ناز تھا، بیگانہ رسم جفا
اور مجھے حاصل تھے لطف بے نہایت کے مزے

حسن سے اپنے وہ غافل تھا، میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ نا واقفیت کے مزے

میری جانب سے نگاہ شوق کی گستاخیاں
یار کی جانب سے آغاز شرارت کے مزے

یاد ہیں وہ حسن و الفت کی ترائی شوخیاں
التماس عذر و تمہید شکایت کے مزے

صحتیں لاکھوں مری بیماری غم پر نثار
جس میں اٹھے بارہا ان کی عیادت کے مزے

○

تجھ کو پاس وفا ذرا نہ ہوا — ہم سے پھر بھی ترا گلا نہ ہوا
ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی — دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا
جاں نثار دوست ہوئی — شادی مرگ کا بہانہ ہوا
کٹ گئی احتیاط عشق میں عمر — ہم سے اظہار مدعا نہ ہوا
کچھ عجب چیز ہے وہ چشم سیاہ — تیر جس کا کبھی خطا نہ ہوا
حیف ہے اس کی بادشاہی پر — تیرے کوچہ کا جو گدا نہ ہوا
مر مٹے ہم تو مٹ گئے سب رنج — یہ بھی اچھا ہوا، برا نہ ہوا
جب تلک میرے دل میں جان رہی — درد مایوس مرحبا نہ ہوا
مل گئی مجھ کو صبر عشق کی داد — وہ جو شرمندۂ جفا نہ ہوا

قانع رنج عشق تھا حسرت
عیش دنیا سے آشنا نہ ہوا

○

یہ کار رہے، با صفا ہو گئے ہم
ترے عشق میں کیسے کیا ہو گئے ہم

نہ جانا کہ شوق اور بھڑکے گا میرا
وہ سمجھے کہ اس سے جدا ہو گئے ہم

دمِ واپسیں آئے پرسش کو ناحق
بس اب جاؤ تم سے خفا ہو گئے ہم

جب ان سے ادب نے نہ کچھ منہ سے مانگا
تو اک پیکرِ التجا ہو گئے ہم

فنا ہو کے راہِ محبت میں حسرت
سزاوارِ خلدِ بقا ہو گئے ہم

○

ہم حال انھیں یوں دل کا سنانے میں لگے ہیں
کچھ کہتے نہیں پاؤں دبانے میں لگے ہیں

اور ایسے کہاں چیرہ دستی کے مرقعے
اے دل! جو ترے آئنہ خانے میں لگے ہیں

کہنا ہے انھیں یہ کہ نہ ہم ہوں گے مخاطب
پر کہتے نہیں زلف بنانے میں لگے ہیں

کچھ ہوش سر و پا کا نہیں، ابرِ خرابات
ابھی ہے گھٹا، دھوم مچانے میں لگے ہیں

قاتل! ترے دامن پہ مرے خون کے دھبے
کچھ اور بھی خنجر سے چھٹانے میں لگے ہیں

ہر دم ہے یہ ڈر، پھر نہ بگڑ جائیں وہ حسرت
پھر دوں انھیں رو رو کے منانے میں لگے ہیں

اصغر گونڈوی

○

زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا
رُخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

آئے تھے سبھی طرح کے جلوے مرے آگے
میں نے مگر اے دیدۂ حیراں نہیں دیکھا

اس طرح زمانہ کبھی ہوتا نہ پُر آشوب
فتنوں نے ترا گوشۂ داماں نہیں دیکھا

ہر حال میں بس پیشِ نظر ہے وہی صورت
میں نے کبھی روئے شبِ ہجراں نہیں دیکھا

کچھ دعویٔ تمکیں ہے معذور بھی زاہد
مستی میں تجھے چاک گریباں نہیں دیکھا

روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

کیا کیا ہوا ہنگامِ جنوں یہ نہیں معلوم
کچھ ہوش جو آیا، تو گریباں نہیں دیکھا

شائستۂ صحبت کوئی ان میں نہیں اصغر
کافر نہیں دیکھے، کہ مسلماں نہیں دیکھا

○

ترے جلووں کے آگے ہمتِ شرح و بیاں رکھ دی
زبانِ بے سخن رکھ دی نگاہِ بے زباں رکھ دی

مٹی جاتی تھی بلبل جلوۂ گل ہائے رنگیں پر
چھپا کر کس نے ان پردوں میں برقِ آشیاں رکھ دی

نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا؟ اے واعظِ ناداں!
ہزاروں بن گئے کعبے جہاں میں نے جہاں رکھ دی

قفس کی یاد میں یہ اضطرابِ دل معاذ اللہ!
کہ میں نے توڑ کر ایک ایک شاخِ آشیاں رکھ دی

کرشمے حسن کے پنہاں تھے شاید رقصِ بسمل میں
بہت کچھ سوچ کر ظالم نے تیغِ خوں فشاں رکھ دی

الٰہی کیا کیا تو نے کہ عالم میں تلاطم ہے!
غضب کی ایک مشتِ خاک زیرِ آسماں رکھ دی

○

جانِ بلبل کا نشاں ہیں نہ پریشاں کوئی
اب چمن میں نہ رہا شعلۂ عریاں کوئی

بے حجابا ہوا گر حسن، تو وہ بات کہاں
چھپ کے جس شان سے ہوتا ہے نمایاں کوئی

خرمنِ گل سے لپٹ کر وہیں مر جانا تھا
اب کرے کیوں گلِ رعنا گی داماں کوئی

کیا مرے حال پہ سچ مچ انہیں غم تھا قاصد؟
تو نے دیکھا تھا ستارہ سرِ مژگاں کوئی؟

کیا کرے زاہدِ بے چارہ اسے کیا معلوم؟
رحم کرتا ہے بہ اندازۂ عصیاں کوئی

دل میں اک بوند لہو کی نہیں، رونا کیسا
اب ٹپکتا نہیں آنکھوں سے گلستاں کوئی

اب اسے ہوش کہوں یا کہ جنوں اے اصغر
مجھ کو ہر تار میں ملتا ہے گریباں کوئی

○

کیا کہئے! جاں نوازیٔ پیکانِ یار کو
سیراب کر دیا دلِ منت گزار کو

جوشِ شباب انشۂ صہبا، ہجومِ شوق
تعبیریں بھی کرتے ہیں فصلِ بہار کو

ہر ذرہ آئینہ ہے کسی کے جمال کا
یوں ہی نہ جانئے مری مشتِ غبار کو

میرے مذاقِ شوق کا اس میں بھرا ہے رنگ
میں خود کو دیکھتا ہوں کہ تصویرِ یار کو

ہاں! اے نگارِ خوبی و اے جانِ دلبری
تو نے حیات بخشی ہے صبحِ بہار کو

اس جوبنِ چمن سے سیراب ہے فضا
روکو نہ اپنی لغزشِ مستانہ وار کو

تھی بجھے دوست موجِ نسیمِ سحر کے ساتھ
یہ اور لے اڑی مری مشتِ غبار کو

یہ رازِ دل ہے، ہستیٔ کل کائنات ہے
دیکھیں حضورِ دیدۂ امیدوار کو

کچھ اور ہی فضا دلِ بے مدعا کی ہے
دیکھا ہے روز وصل و شبِ انتظار کو

اصغر نشاطِ روح کا اک کھل گیا چمن
جنبش ہوئی جو خامۂ رنگیں نگار کو

○

صحن حرم نہیں ہے یہ کوئے بتاں نہیں
اب کچھ نہ پوچھئے کہ کہاں ہوں جہاں نہیں

مدت ہوئی کہ چشمِ تحیر کو ہے سکوت
اب جنبشِ نظر میں کوئی داستاں نہیں

اب ہو تو سنگ و خشت سے سر کو سکون ہو
وہ آستاں نہیں تو کوئی آستاں نہیں

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائیگاں ہے، وہی رائیگاں نہیں

کسبِ حیات تو نہ سہی ہر مراد سے ہے
مرنا پسندِ خاطرِ ارباب جاں نہیں

تسلیم مجھ کو خانۂ کعبہ کی منزلت
سب کچھ سہی، مگر وہ ترا آستاں نہیں

ہوتا ہے رازِ عشق و محبت انھیں سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں

فطرت سنا رہی ہے ازل سے اسی طرح
لیکن ہنوز ختمِ مری داستاں نہیں

دیکھوں! ہجومِ غم میں وہ لے کس طرح خبر
یہ اس کا امتحاں ہے، مرا امتحاں نہیں

اب اس نگاہِ ناز سے ربطِ لطیف ہے
مجھ کو دماغِ صحبتِ روحانیاں نہیں

○

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا، اسے غمِ جاناں بنا دیا

یوں مسکرائے، جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

اے شیخ! وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی
کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا

کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیرِ عشق کی
جب خاک کر دیا اسے عرفاں بنا دیا

اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے سو حزن
آج اس کو حسن و عشق کا ساماں بنا دیا

مجبوریِ حیات میں رازِ حیات ہے
زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنا دیا

وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا انھیں انساں بنا دیا

ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے تیر و تیغ
تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

بلبل بہ آہ و نالہ و گل مست رنگ و بو
مجھ کو شہیدِ رسمِ گلستاں بنا دیا

کہتے ہیں: اک فریبِ مسلسل ہے زندگی
اس کو بھی وقفِ حسرت و حرماں بنا دیا

عالم سے بے خبر بھی ہوں عالم میں بھی ہوں میں
ساقی نے اس مقام کو آساں بنا دیا

اس حسن کاروبار کو مستوں سے پوچھئے
جس کو فریبِ ہوش نے عصیاں بنا دیا

○

جلوہ ترا اب تک ہے نہاں چشمِ بشر سے
ہر ایک نے دیکھا ہے تجھے اپنی نظر سے

یہ عارضِ پر نور پہ زلفیں ہیں پریشاں
کم بخت! نکل گرہی شامِ و سحر سے

غم واقعِ آلام ہے، تریاق ہے لیکن
کچھ اور ہی ہو جاتی ہے ساقی کی نظر سے

وہ شوخ بھی معذور رہے مجبور رہوں میں بھی
کچھ فتنے اُٹھے حسن سے کچھ حسنِ نظر سے

اس عالمِ ہستی میں نہ مرنا ہے نہ جینا
تو نے کبھی دیکھا نہیں ہستوں کی نظر سے

جاں بازوں کے سینے میں ابھی اور بھی دل ہیں
پھر دیکھئے کب بارِ محبت کی نظر سے

○

نہ ہوگا کاوشِ بے مدعا کا راز داں برسوں
وہ زاہد، جو رہا سرگشتۂ سود و زیاں برسوں

کچھ اس انداز سے چھیڑا تھا میں نے نغمۂ رنگیں
کہ فرطِ ذوق سے جھومی ہے شاخِ آشیاں برسوں

جبینِ شوق لائی ہے وہاں سے داغِ ناکامی
یہ کیا کرتی رہی کم بخت، سنگِ آستاں برسوں

وہی تھا حال میرا، جو بیاں میں آ نہ سکتا تھا
جسے کرتا رہا افشا سکوتِ رازداں برسوں

نہ پوچھو! مجھ پہ کیا گزری ہے میری شوخیِ حسرت سے
قفس کے سامنے رکھا رہا ہے آشیاں برسوں

خموشیِ آرزو ہو، نغمۂ خاموشِ الفت بن
یہ کیا اک شیوۂ فرسودۂ آہ و فغاں برسوں

نہ کی کچھ لذتِ افتادگی میں عمر بھر میں نے
مجھے دیکھا کیا اٹھ کر غبارِ کارواں برسوں

وہاں کیا ہے؟ نگاہِ ناز کی ہلکی سی جنبش ہے
مزے لے لے کے اب تڑپا کریں اربابِ جاں برسوں

محبت ابتدا سے تھی مجھے گلہائے رنگیں سے
رہا ہوں آشیاں میں لے کے برقِ آشیاں برسوں

میں وہ ہرگز نہیں جس کو قفس سے موت آتی ہو!
میں وہ ہوں جس نے خود دیکھا نہ سوئے آشیاں برسوں

○

کوئی محفل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے
غبارِ قیس خود اُٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے

قفس کیا؟ حلقۂ دامِ بلا؟ رسمِ اسیری کیا؟
چمن پر مٹ گیا جو، ہر طرح آزاد ہوتا ہے

بہار انجام سمجھوں اس چمن کا یا خزاں سمجھوں
زبانِ برگِ گل سے کچھ کو کیا ارشاد ہوتا ہے

سمائے جا رہے ہیں اب وہ جلوے دیدہ و دل میں
یہ نظارہ ہے یا ذوقِ نظر برباد ہوتا ہے

یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

یہاں مستوں کے سر الزامِ ہستی ہی نہیں اصغر
پھر اس کے بعد ہر الزام بے بنیاد ہوتا ہے

○

وہ نغمہ بلبلِ رنگیں نوا اک بار ہو جائے
کلی کی آنکھ کھل جائے، چمن بیدار ہو جائے

نظر وہ ہے جو اس کونین و مکاں سے پار ہو جائے
مگر جب رُخ پہ تاباں پڑ پڑے بیکار ہو جائے

تم اُس کافر کا ذوقِ بندگی اب پوچھتے کیا ہو
جسے طاقِ حرم بھی ابروئے خمدار ہو جائے

سحر لائے گی کیا پیغامِ بیداریٔ شبستاں میں
نقابِ رُخ اُلٹ دو خود سحر بیدار ہو جائے

یہ اقرارِ خودی ہے دعویٔ ایمان و دیں کیسا؟
ترا اقرار جب ہے خود سے بھی انکار ہو جائے

نظر اس حسن پر ٹھیرے تو آخر کس طرح ٹھیرے
کبھی خود پھول بن جائے، کبھی رخسار ہو جائے

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

فانی بدایونی

○

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں دل بیٹھ گیا، جی چھوٹ گیا

فصلِ گل آئی یا اجل آئی، کیوں در زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آپہنچا، یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

پھیلے کیا دامن کی خبر اور دستِ جنوں کو کیا کہیے
بخیے ہی تا حد سے دل کا دامن مدت گزری چھوٹ گیا

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے، کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر ایک اک ساتھی چھوٹ گیا

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن!
غربت جن کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

○

پھر وہ اندازِ نظر یاد آیا
چاکِ دل تا بہ جگر یاد آیا

ذوقِ ارباب نظر یاد آیا
سجدہ، بے منتِ سر یاد آیا

ہر تبسم پہ یہ کہا تا ہوں فریب
کہ اُنھیں دیدۂ تر یاد آیا

پھر ترا نقشِ قدم ہے درکار
سجدۂ راہ گذر یاد آیا!

جمع کرتا ہوں غبارِ رہِ دوست
سرِ شوریدہ مگر یاد آیا

ہائے وہ معرکہ ناوکِ ناز
دل بچایا، تو جگر یاد آیا

آئینہ اب نہیں دیکھا جاتا
میں بہ عنوانِ دگر یاد آیا

درد کو بھر ہے مرے دل کی تلاش
خانہ برباد کو گھر یاد آیا

اس کو بھولے تو ہوئے ہو فانی
کیا کروگے وہ اگر یاد آیا

○

ضبط اپنا شعار تھا، نہ رہا
دل پہ کچھ اختیار تھا، نہ رہا

دلِ مرحوم کو خدا بخشے
ایک ہی غم گسار تھا، نہ رہا

آ کر وقتِ سکونِ مرگ آیا
نالۂ ناخوش گوار تھا، نہ رہا

اُن کی بے مہریوں کو کیا معلوم
کوئی امیدوار تھا، نہ رہا

آہ کا اعتبار بھی کب تک
آہ کا اعتبار تھا، نہ رہا

کچھ زمانے کو سازگار سہی
جو ہمیں سازگار تھا، نہ رہا

اب گریباں کہیں سے چاک نہیں
شغلِ فصلِ بہار تھا، نہ رہا

موت کا انتظار باقی ہے
آپ کا انتظار تھا، نہ رہا

مہرباں! یہ مزارِ فانی ہے
آپ کا جاں نثار تھا، نہ رہا

○

جی ڈھونڈتا ہے گھر کوئی دونوں جہاں سے دُور
اس آپ کی زمیں سے الگ، آسماں سے دُور

شاید ہیں در خورِ نگہِ گرم بھی نہیں!
بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دُور

وہ پوچھتے ہیں اور کوئی دیتا نہیں جواب
کس کی وفا ہے دسترسِ امتحاں سے دُور

آنکھیں چُرا کے آپ نے افسانہ کر دیا
جو حال تھا زباں سے قریب اور بیاں سے دُور

ہے منعِ راہِ عشق میں دیر و حرم کا ہوش
یعنی کہاں سے پاس ہے منزل کہاں سے دُور

تا عرضِ شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دُور

فانی دکن میں آ کے یہ عقدہ کھُلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دُور

○

آپ سے شرحِ آرزو تو کریں
آپ تکلیفِ گفتگو تو کریں!

وہ یہیں ہیں، جو وہ کہیں بھی نہیں
آئیے! دل میں جستجو تو کریں!

اہلِ دنیا مجھے سمجھ لیں گے
دل کسی دن ذرا لہو تو کریں!

رنگ و بُو کیا ہے یہ تو سمجھا دو
سیرِ دنیائے رنگ و بو تو کریں!

تم سے ملنے کی آرزو ہی سہی!
تم سے ملنے کی آرزو تو کریں

وہ اُدھر رُخ اِدھر ہے میت کا
رُخ فانی کو قبلہ رُو تو کریں

○

مشتاق خبردار رہیں دل سے، جگر سے
ملتی ہے زمانے کی نظر اُن کی نظر سے

دل جن سے ملے اب وہ نگاہیں نہیں ملتیں
ملنے کو تو ملتی ہے نظر اُن کی نظر سے!

پیکاں کے بھی ٹکڑے ہیں رفو کے بھی ہیں ٹانکے
سینے میں دھواں خیر ہے اٹھتا ہے کدھر سے

کیا پھر ترے ناوک نے کیا عزم نوازش
بیتاب کی آتی ہے صدا چاکِ جگر سے

کس صبح کے مشتاق کا ماتم ہے کہ فانی
روتی ہے گلے مل کے سحر، شبِ سحر سے!

○

یہ خنجر بھی جو پہلو میں نہیں ہونے پاتے
مرکے شرمندۂ قاتل نہیں ہونے پاتے

حرم و دیر کی گلیوں میں پڑے پھرتے ہیں
جو ہم رنداں میں جو شامل نہیں ہونے پاتے

موج نے ڈوبنے والوں کو بہت کچھ پہنچا
رُخ مگر جانبِ ساحل نہیں ہونے پاتے

تو کہاں ہے کہ تری راہ میں یہ کعبہ و دیر
نقشِ بن جاتے ہیں منزل نہیں ہونے پاتے

کوئی چٹکی سی کلیجے میں لیے جاتا ہے
ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

تیرا انعام سمجھتا ہوں ان ارمانوں کو
میری کوشش کا جو حاصل نہیں ہونے پاتے

خود تجلی کو نہیں اذنِ حضوری فانی
آئینے اُن کے مقابل نہیں ہونے پاتے

○

اس کشاکش ہستی میں کوئی راحت نہ ملی جو غم نہ ہوئی
تدبیر کا حاصل کیا کہیے! تقدیر کی گردش کم نہ ہوئی

اللہ رے سکونِ قلب اس کا، دل جس نے لاکھوں توڑ دیے
جس زلف نے دنیا برہم کی وہ آپ کبھی برہم نہ ہوئی

غم راز ہے اُن کی تجلی کا، جو عالم بن کر عام ہوا
دل راز ہے اُن کی تجلی کا جو راز رہی عالم نہ ہوئی

دل کی یہ ویرانی ہی عجب ہے وہ بھی آخر کیا کرتے
جب دل میں ان کے رہتے بستے یہ ویرانی کم نہ ہوئی

انسان کی ساری ہستی کا مقصد ہے فانی ایک نظر
یعنی وہ نظر، جو دل میں اُتر کر زخم بنی، مرہم نہ ہوئی

○

نظر آج ان سے رہ گئی مل کے
آخری کچھ پیام تھے دل کے

تو نے دیکھے ہیں اے نسیم سحر!
کچھ نرالی تھے شمع محفل کے

خلش دیں ہمارے دم کے ساتھ
آج کانٹے نکل گئے دل کے

پھول کو بھول جانے والے
کل یہ چھینٹے تھے خون بسمل کے

تیز تر جادۂ وفا سے گزر!
مٹ رہے ہیں نشان منزل کے

مل بھی جاتے ہیں چھوٹنے والے
چھوڑ جاتا ہے یوں کوئی مل کے

خاک ہے تو اسی گلی کی خاک
اللہ اللہ یہ حوصلے دل کے!

اُن کی نظریں ہی کچھ کہیں تو کہیں
ان کی نظروں نے کیا کیا مل کے

مرگ فانی میں اب تو دیر نہ کر
سہل فرمانے والے مشکل کے

○

دُنیا میری بلا جانے، مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

آبادی بھی دیکھی ہے، ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اُجڑے اور پھر نہ بسے، دل وہ نرالی بستی ہے

عجز گناہ کے دم تک ہیں عصمت کامل کے جلوے
پستی ہے تو بلندی ہے، راز بلندی پستی ہے

جان ہی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی، ان داموں تو سستی ہے

وحشت دل سے پھرنا ہے، اپنے خدا سے پھر جانا
دیوانے یہ ہوش نہیں، یہ تو ہوش پرستی ہے

جاگ سونا ہے تیرے بغیر، آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دنیا بستی تھی، اب بھی دنیا بستی ہے

آنسو تھے سو خشک ہوئے، جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے، کھلتی ہے نہ برستی ہے

دل کا اُجڑنا سہل سہی، بسنا سہل نہیں ظالم!
بستی بسنا کھیل نہیں، بستے بستے بستی ہے

فانی جس میں آنسو کیا، دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے! وہ آنکھ اب پانی کی دو بوند کو ترستی ہے

جگر مرادآبادی

○

تیرا تصور شب ہمہ شب — خلوت غم بھی بزم طرب
دعوئ شوق اور شکوہ طلب — شرم! دل آرام طلب
باتیں ہیں وہ مقصود ہے ایک — تیری طلب یا اپنی طلب
آ ہی گیا اک مست شباب — شیشہ بدست و نغمہ بلب
ختم ہوا انعام فراق — آ ہی گیا پیغام طلب
بیت گئی جو دل پہ نہ پوچھ — ہجر کی شب اور آخر شب
حسن مکمل جذب و گریز — عشق مسلسل ترک طلب

ترک طلب اور طلب یہاں تک
دیکھ تو میرا حسن طلب

○

دنیا کے ستم یاد، نہ اپنی ہی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

کیا لطف کہ میں اپنا پتہ آپ بتاؤں
کیجے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

میں ترک رہ و رسم جنوں کر ہی چکا تھا
کیوں آ گئی ایسے میں تری لغزش پا یاد

کیا جانئے، کیا ہو گیا ارباب جنوں کو
جینے کی ادا یاد، نہ مرنے کی ادا یاد

مدت ہوئی اک حادثۂ عشق کو لیکن
اب تک ہے ترے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد

○

یہ دن بہار کے اب کے بھی راس آ نہ سکے
کہ غنچے کھل تو سکے، کھل کے مسکرا نہ سکے

مری تباہیِ دل پر تو رحم کھا نہ سکے
مگر کبھی وہ نظر سے نظر ملا نہ سکے

یہ آدمی ہے وہ پروانہ شمعِ دانش کا
جو روشنی میں رہے، روشنی کو پا نہ سکے

انھیں سعادتِ منزل رسی نصیب ہو کیا
وہ پاؤں راہِ طلب میں جو ڈگمگا نہ سکے

نہ جانے آہ! کہ ان آنسوؤں پہ کیا گذری
جو دل سے آنکھ تک آئے، مژہ تک آ نہ سکے

کریں گے مر کے بقائے دوام کیا حاصل
جو زندہ رہ کے مقامِ حیات پا نہ سکے

زہے خلوصِ محبت! کہ حادثاتِ جہاں
مجھے تو کیا، مرے نقشِ قدم مٹا نہ سکے

مری نظر سے گریزاں بہت رہے لیکن
مرے خلوصِ محبت سے بچ کے جا نہ سکے

یہ مہرو ماہ مرے ہم سفر رہے برسوں
پر اس کے بعد مری گرد کو بھی پا نہ سکے

مری نظر نے شبِ غم انھیں بھی دیکھ لیا
وہ بے شمار ستارے کہ جگمگا نہ سکے

نیا زمانہ بنانے چلے تھے دیوانے
نئی زمین، نیا آسماں بنا نہ سکے!

○

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

ہائے وہ کیونکر جی بہلائے
غم بھی جس کو راس نہ آئے

دل پہ کچھ ایسا وقت پڑا ہے
بھاگے میسر راہ نہ پائے

جھوٹی ہے ہر ایک مسرت
روح اگر تسکین نہ پائے

حسن وہی ہے حسن جو ظالم
ہاتھ لگائے ہاتھ نہ آئے

ضبطِ محبت، شرطِ محبت
جی ہے کہ ظالم اُمڈا آئے

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو
روح سنے اور روح سنائے

راہِ طلب آسان ہوئی ہے
زلف و مژہ کے سائے سائے

○

کوئی یہ کہہ دے گلشن گلشن — لاکھ بلائیں ایک نشیمن
کاکل پیچاں، قامت رعنا — دل سادہ دست نہ دامن سادہ
پھول کھلے ہیں گلشن گلشن — لیکن اپنا اپنا دامن
عمریں بیتیں، صدیاں گزریں — ہے وہی اب تک عقل کا بچپن
عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے — عشق ہے کار شیشہ و آہن
برق کو ہے شاید اللہ اللہ! — جس کا نشیمن
بیٹھے ہم ہر بزم میں لیکن — چھا کے اٹھے اپنا دامن
دل کہ مجسم آئینہ ساماں — اور وہ ظالم آئینہ دشمن
غیر مزاج حسن کی یارب! — تیز بہت ہے دل کی نظر کن
تجھ سا حسیں اور خوبیٔ محبت — وہم ہے شاید خوش خیالی دامن
آج نہ جانے راز یہ کیا ہے — ہجر کی رات اور اتنی روشن
آ، کہ نہ جانے تجھ بن کب سے — روح ہے لاشہ، جسم ہے مدفن

ق

کام و دہن رہا اور آزادی — نام پڑے اور تھوڑے درشن
شمع ہے لیکن صندلی صندلی — سایہ ہے لیکن روشن روشن
علم ہی ٹھیرا علم کا باغی — عقل ہی نکلی عقل کی دشمن

ق

مستی شاعر، اللہ اللہ — حسن کی منزل عشق کا مسکن
رنگیں فطرت، سادہ طبیعت — فرش نشیں اور عرش نشیمن
کانٹوں کا بھی حق ہے کچھ آخر
کون چھڑائے اپنا دامن

○

سراپا حقیقت، مجسم فسانا
محبت کا عالم، جنوں کا زمانا

وہ پہلے پہل دو نواں جانب عالم
ادا بے تعلق، نظر محرمانہ

نظر اٹھتے اٹھتے، نظر سے ملتے
وہ جھکتے دلوں کا وہ نازک فسانہ

طبیعت شگفتہ، مگر کھوئی کھوئی
ہر انداز دلکش، مگر والہانہ

وہ شعر و ترنم کا پر کیف موسم
وہ اشک و تبسم کا رنگیں زمانہ

عزیز و جمیل، اگر زخم خوردہ
شکست محبت، مگر فاتحانہ

○

یہ ترا جمالِ کامل، یہ شبابِ کا زمانہ
دلِ دشمناں سلامت، دلِ دوستاں نشانہ

مجھے عشق کی صداقت پہ بھی شک سا ہو چلا ہے
مرے دل سے کہہ گئی کیا؟ وہ نگاہِ ناتوانہ

مری زندگی تو گزری ترے ہجر کے سہارے
مری موت کو بھی پیارے! کوئی چاہیے بہانہ

میں وہ صاف ہی نہ کہہ دوں، جو ہے فرق تجھ میں مجھ میں
ترا درد، درد تنہا، مرا غم، غمِ زمانہ

مرے دل کے ٹوٹنے پر ہے کسی کو ناز کیا کیا؟
مجھے اے جگر مبارک! یہ شکستِ فاتحانہ

○

کسی صورت نمودِ سوزِ پنہانی نہیں جاتی
بجھا جاتا ہے دل چہرے کی تابانی نہیں جاتی

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

جلے جاتے ہیں بڑھ بڑھ کر مٹے جاتے ہیں گر گر کر
حضورِ شمع پروانوں کی نادانی نہیں جاتی

وہ یوں دل سے گذرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پہ گذرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

جگر وہ بھی سراپا محبت ہی محبت ہیں
مگر ان کی محبت صاف پہچانی نہیں جاتی

○

عجب عالم سا دل پر چھا رہا ہے
حسیں جیسے کوئی شرما رہا ہے

وہ زلفیں دوش پر بکھری ہوئی ہیں
جہانِ آرزو لہرا رہا ہے

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں
محبت کا زمانہ آ رہا ہے

وہ خود سکین خاطر کر رہے ہیں
مگر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے

طبیعت ہے کہ ٹھہری جا رہی ہے
زمانہ ہے کہ گزرا جا رہا ہے

مری روداد غم وہ سن رہے ہیں
تبسم سا لبوں پر آ رہا ہے

جگر ہی کا نہ ہو افسانہ کوئی
در و دیوار کو حال آ رہا ہے

○

محبت صلح بھی پیکار بھی ہے
یہ شاخِ گل بھی ہے تلوار بھی ہے

طبیعت عشق کی خود دار بھی ہے
ادھر نازک مزاجِ یار بھی ہے

یہ فتنے زن سے اک دنیا ہے نالاں
انھیں سے گرمیٔ بازار بھی ہے

غنیمت ہے کہ اس دورِ ہوس میں
ترا ملنا بہت دشوار بھی ہے

خبردار اے سبک سارانِ ساحل
یہ ساحل ہی کبھی منجدھار بھی ہے

جو کوئی سن سکے تو نکہتِ گل
شکستِ رنگ کی جھنکار بھی ہے

جوشؔ ملیح آبادی

○

سوزِ غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا

وہ کریں بھی تو کن الفاظ میں تیرا شکوہ
جن کو تیری نگہِ لطف نے برباد کیا

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا، میں نے تجھے یاد کیا

اے میں سو جان سے اس طرزِ تکلم کے نثار
پھر تو فرمائیے! کیا آپ نے ارشاد کیا

اس کا رونا نہیں کیوں تم نے کیا دل برباد
اس کا غم ہے کہ بہت دیر میں برباد کیا

اتنا مانوس ہوں فطرت سے کلی جب چٹکی
جھک کے میں نے یہ کہا: مجھ سے کچھ ارشاد کیا؟

مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا!

○

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلالِ روزِ حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا

یہی تو ہیں دو ستون محکم، انہیں پہ قائم ہے نظمِ عالم
یہی تو ہے رازِ عکس و آدم نگاہ میری شباب تیرا

صبا تصدق ترے نفس پر، چمن ترے پیرہن پہ قرباں
شمیمِ دوشیزگی میں کیسا بسا ہوا ہے شباب تیرا

تمام محفل کے روبرو گو، اٹھائیں نظریں ملائیں آنکھیں
سمجھ سکا ایک بھی نہ لیکن سوال میرا جواب تیرا

ہزار شانِ خیر ادا سے لچکیں، ہو جانہ تیرا سا لوچ پیدا
شفق نے کتنے ہی رنگ بدلے ملا نہ رنگِ شباب تیرا

ادھر مرا دل تڑپ رہا ہے تری جوانی کی جستجو میں
ادھر مرے دل کی آرزو میں مچل رہا ہے شباب تیرا

کرے گی دونوں کا چاک پردہ یہ ہے گا دونوں کو کر کے رسوا
یہ شورشِ ذوق و دید میری یہ اہتمامِ حجاب تیرا

جڑیں پہاڑوں کی ٹوٹ جاتیں فلک تو کیا عرش کانپ اٹھتا
اگر میں دل پر نہ روک لیتا تمام زورِ شباب تیرا

بھلا ہوا جوشؔ نے اٹھایا نگاہ کا چشم تر سے پردہ
بلا سے جاتی رہیں گر آنکھیں کھلا تو بندِ نقاب تیرا

○

پہچان گیا، سیلا ہے اس کے سینے میں ارمانوں کا
دیکھا جو سفینے کو میرے جی چھوٹ گیا طوفانوں کا

یہ شوخ فضا، یہ تازہ چمن، یہ مست گھٹا، یہ سرد ہوا
کافر ہے اگر اس وقت بھی کوئی رُخ نہ کرے میخانوں کا

یہ کس کی حیات افروز نظر نے چھیڑ دیا ہے عالم کو
ہر خاک کے ذرّے میں ہنگامہ ہے لاکھوں جانوں کا

مطرب! ربط ہاتھ سے رکھ دے ماضی نے در کھول دیا
فریاد کہ چھُو کر ٹوٹ گیا، پھر کانٹا سا ارمانوں کا!

ہاں! ظلم و ستم سے بھی قدرے پڑتی ہیں خراشیں سینے میں
سب سے ہے مہلک زخم مگر اے حسن ترے ارمانوں کا

اے دینِ وفا! اے جانِ کرم! یوں غم میں نہ میرا ہاتھ بٹا
مرجاؤں گا میں اے شمع! خدارا! روپ نہ بھر پروانوں کا

دنیا نے فسانوں کو بخشی افسردہ حقائق کی تلخی!
اور ہم نے حقائق کے نقشے میں رنگ بھرا افسانوں کا

کم بخت جوانی سینے میں ناگن کی طرح لہراتی ہے
ہر موجِ نفس اک طوفاں ہے کونین مگن ارمانوں کا

اے جوش! جنوں کی شام و سحر میں وقت کی یہ رفتار نہیں
داناؤں کی طولانی صدیاں اور ایک نفس دیوانوں کا

○

ہٹ گئے دل سے تیرگی کے حجاب
آفریں! اے نگاہِ عالم تاب

آڑے آیا نہ کوئی مشکل میں!
مشورے دے کے ہٹ گئے احباب

کیا قیامت تھی صبر کی تلقین!
اور بھی روح ہو گئی بے تاب

بارے اُٹھے تو ناصحِ مشفق!
ہاں کدھر ہے صراحیٔ مے ناب

ہاں! اثر اب ہُوا محبت کا
ہم سے آنے لگا ہے اُن کو حجاب

شب، جو وہ بیٹھے میرے پہلو میں
مسکرانے لگی شبِ مہتاب

جوشؔ کھلتی تھی جن سے دل کی کلی
کیسے وہ لوگ ہو گئے نایاب

○

عشوؤں کو جبیں ہی نہیں آفت کیے بغیر
تم، اور مان جاؤ شرارت کیے بغیر!

اہلِ نظر کو یار دکھاتا رہو وفا
اے کاش! ذکرِ دوزخ و جنت کیے بغیر

اب دیکھ اس کا حال کہ آتا نہ تھا قرار
خود تیرے دل کو جس پہ عنایت کیے بغیر

اے ہم نشیں محال ہے ناصح کا ٹالنا!
یہ اور یہاں سے جائیں نصیحت کیے بغیر

تم کتنے تند خو ہو کہ پہلو سے آج تک
اک بار بھی اٹھے نہ قیامت کیے بغیر

چلتا نہیں ہے محفلِ حسنِ جواں میں کام
ہر جنبشِ نظر سے عبادت کیے بغیر

مانا کہ ہر قدم پہ قیامت سے پھر بھی جوش
بنتا نہیں کسی سے محبت کیے بغیر!

○

جہنم سرد ہے جنت کے دکھلائے جاتے ہیں
سرِ محشر پجاری حسن کے بلوائے جاتے ہیں

غضب ہے یہ ادا اُن کی وہ آرائشِ گیسو
جھکی جاتی ہیں آنکھیں خود بخود شرمائے جاتے ہیں

سحر کی ضو، شفق کی سرخیاں برسات کے بادل
مجھے ہمراز پا کر یہ مناظر کھائے جاتے ہیں

نہ جانے کتنی رنگیں صحبتیں ہیں میری نظروں میں
بس اے مطرب! مری آنکھوں میں آنسو آئے جاتے ہیں

شبِ وعدہ یہ کیسی تیرگی ہے؟ وقت کیا ہوگا
تمناؤں کے غنچے ہم نفس کھلائے جاتے ہیں

کوئی حد ہی نہیں اس احترامِ آدمیت کی!
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

بہت جی خوش ہوا اے ہم نشیں کل جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

○

قوم انساں کا راہِ دہر میں تھم تھم ہی جاتا ہے
چلے کتنا ہی کوئی بچ کے ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے

نظر ہو خواہ کتنی ہی حقائق آشنا پھر بھی!
ہجومِ کشمکش میں آدمی گھبرا ہی جاتا ہے

خلافِ مصلحت میں بھی سمجھتا ہوں، مگر واعظ
وہ آئے ہیں تو چہرہ پر تغیر آ ہی جاتا ہے

ہوائیں زور کتنا ہی لگائیں آندھیاں بن کر
مگر جو گھر کے آتا ہے وہ بادل چھا ہی جاتا ہے

شکایت کیوں اسے کہتے ہو؟ یہ فطرت ہے انساں کی
مصیبت میں خیالِ عیشِ رفتہ آ ہی جاتا ہے

بجھتی ہیں مآلِ گل، مگر کیا زورِ فطرت ہے!
سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسم آ ہی جاتا ہے

○

اٹھی وہ گھٹا، رنگ سامانیاں کر
گھر پاسبانیاں کر، زر افشانیاں کر!
وہ چمکے عنادل، وہ سنکیں ہوائیں
گلوں کی طرح چاک دامانیاں کر
صراحی جھکا اور دھومیں مچا دے!
گلابی اُٹھا اور گل افشانیاں کر!
مثالِ داغِ ہوش اور مدہوش بن جا
اُٹھا جامِ زر اور سلطانیاں کر!
نگاہوں سے برسا دے ابرِ جوانی!
مے لالہ گوں سے گلستانیاں کر
سمندر پہ چل اور الیاسؑ بن جا!
ہواؤں پہ اُڑ اور سلیمانیاں کر
صبا کی طرح کنج میں رقص فرما
بگولوں کی مانند جولانیاں کر
سکوں پاؤں چومے وہ ہلچل مچا دے
خرد سر جھکا دے وہ نادانیاں کر!
قلم کھول کر جوششِ بدمستیوں کے
جہاں داریاں کر، جہاں بانیاں کر!

○

جہاں ہے شوق وہاں کیف و کم کی بات نہیں
جہاں بھی وہ لے چلے وہیں ٹھہر جاؤں
ازل سے وحشت آوارگی کا شوق ہے دل کو
جا رہی ہے مری خوئے اعتبار مجھے
گدائے راہ ہے رحم و خطا سے حلقہ بگوش
خود اپنا ذوق اسیری ہے پاؤں کی زنجیر
دل اپنی وضع محبت سے ہے پریشاں تر
جہاں خدا سے جو بہشتی نہیں نگاہ مری
مرے وجود کی بنیاد ہے عبادت پر
کسی کے عشوہ و رعنائی پہ مرتا ہوں
یہاں مزاج کی افتاد میں ہے ذوق سجود
یہ طرز شیفتگی دل کا اک تقاضا ہے
کرم فروشیٔ آں محترم کی بات نہیں

دیار عشق میں دیر و حرم کی بات نہیں
عرب کی بات نہیں ہے عجم کی بات نہیں
غزال دشت کے انداز رم کی بات نہیں
کسی کے قول کسی کی قسم کی بات نہیں
جہاں پناہ کے طبل و علم کی بات نہیں
حضور! آپ کی زلفوں کے خم کی بات نہیں
خطا معاف! یہ لطف و کرم کی بات نہیں
یہ تشنہ جام کی ہے فرقِ جم کی بات نہیں
بہار کو ترو باغ ارم کی بات نہیں
کسی کی بخشش وام و درم کی بات نہیں
کسی کی شوخیٔ نقش قدم کی بات نہیں

○

نمایاں منتہائے سعی پیہم ہوتی جاتی ہے
طبیعت بے نیاز ہر دو عالم ہوتی جاتی ہے
اٹھی جاتی ہے دل سے ہیبت آلام روحانی
جراحت ہر قلب زار مرہم ہوتی جاتی ہے
کنارہ کر رہا ہے رفتہ رفتہ ہیجان سرتابی!
کہ گرد جستجو کے ذوق میں خم ہوتی جاتی ہے
جنوں کا چھا رہا ہے زندگی پہ اک دھندلکا سا
خرد کی روشنی سینے میں مدھم ہوتی جاتی ہے
نسیم بے نیازی آ رہی ہے بام گردوں سے
عروس مدعا کی زلف برہم ہوتی جاتی ہے
نمایاں ہو چلا ہے اک جہاں چشم تصور پہ
نظر شاید حریف ساغر جم ہوتی جاتی ہے
گرہ ہوں کھل رہی ہے ہر نفس ذوق تماشا کی
کہ ہر اونی اسی شے اب اک عالم ہوتی جاتی ہے
فضا میں کانپتی ہیں دھندلی دھندلی نقرئی شکلیں
ہر اک تمثیل پاکیزہ مجسم ہوتی جاتی ہے
نہ جانے سینۂ احساس پر یہ رات ہے کس کا
طبیعت بے نیاز شادی و غم ہوتی جاتی ہے
سمجھ میں آئیں کیا باریکیاں قانون قدرت کی
عبارت کثرت معنی سے مبہم ہوتی جاتی ہے
عجل تھا جس کی شورش سے تلاطم بحر ہستی کا
مرے دل میں وہ ہلچل جوش اب کم ہوتی جاتی ہے

فراق گورکھپوری

○

آج بھی قافلۂ عشق رواں ہے کہ جو تھا
وہی میل اور وہی سنگِ نشاں ہے کہ جو تھا

پھر ترا غم وہی رسوائے جہاں ہے کہ جو تھا
پھر فسانہ بھی وہی حسن بیاں ہے کہ جو تھا

منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ گذراں ہے کہ جو تھا

منزلیں عشق کی تا حدِ نظر سوتی ہیں
کوئی رہرو نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے کہ جو تھا

یوں تو اس دور میں بے کیف سی ہے بزمِ حیات
ایک ہنگامہ سرِ راہِ جنوں گراں ہے کہ جو تھا

جو بھی کر جور و ستم جو بھی کر احسان و کرم
تجھ پہ اے دوست وہی وہم و گماں ہے کہ جو تھا

آنکھ جھپکی کہ اُدھر ختم ہوا روز وصال
پھر بھی اس دن پہ قیامت کا گماں ہے کہ جو تھا

قرب ہی کم ہے نہ دوری ہی زیادہ لیکن
آج وہ ربط کا احساس کہاں ہے کہ جو تھا

پھر سرِ میکدۂ عشق ہے اک بارشِ نور
چھلکے جاموں سے چراغاں کا سماں ہے کہ جو تھا

آج بھی آگ وہی ہے دلِ انساں میں فراق
آج بھی سینوں سے اٹھتا وہ دھواں ہے کہ جو تھا

○

یہ نکہتوں کی نرم روی یہ ہوا یہ رات
یاد آ رہے ہیں عشق کو ٹوٹے تعلقات

مایوسیوں کی گود میں دم توڑتا ہے عشق
اب بھی کوئی بنالے تو بگڑی نہیں ہے بات

کچھ اور بھی تو ہو ان اشارات کے سوا
یہ سب تو اے نگاہِ کرم بات بات بات

اک عمر کٹ گئی ہے ترے انتظار میں
ایسے بھی ہیں کہ کٹ نہ سکی جن سے ایک رات

ہم اہلِ انتظار کے آہٹ پہ کان تھے
ٹھنڈی ہوا تھی، غم تھا تاروں ڈھل چکی تھی رات

یوں تو ہزار بانکی سجیلی اٹھی وہ نگاہِ ناز!
دیکھا مگر دلوں میں ہو سی گئی کوئی واردات

جن کا سراغ پا نہ سکی غم کی روح بھی
ناداں! ہوئے ہیں عشق میں ایسے بھی سانحات

ہر سعی و ہر عمل میں محبت کا ہاتھ ہے
تعمیرِ زندگی کے سمجھ کچھ دقیقہ رکات

مجھ کو تو غم نے فرصتِ غم بھی نہ دی فراق
دے فرصتِ حیات نہ جیسے غمِ حیات

غزل نمبر

○

یہ نرم نرم ہوا جھلملا رہے ہیں چراغ
ترے خیال کی خوشبو سے بس رہے ہیں دماغ

دلوں کو تیرے تبسم کی یاد یوں آئی
کہ جگمگا اٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ

تمام شعلۂ گل ہے تمام موجِ بہار
کہ تا حدِ نظر شوق جھلملاتے ہیں باغ

نئی زمیں نیا آسماں نئی دنیا
سنا تو ہے کہ محبت کو ان دنوں ہے فراغ

جو بچھ چکے ہیں تری آنکھ کے پاؤں دھرتا ہے
اسی کے نقشِ کفِ پا سے جل اٹھے ہیں چراغ

نگاہیں صبح کو پہنچیں ایک عالم کی
کہ جل رہا ہے کسی پھوٹتی کرن کا سراغ

دلوں میں داغِ محبت کا اب یہ عالم ہے
کہ جیسے بند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات چراغ

فراقِ بزمِ چراغاں ہے محفلِ رنداں
بجے ہیں پگھلی ہوئی آگ سے چھلکتے ایاغ

○

جو لاگ گہِ حیات کہیں ختم ہی نہیں
منزل نہ کر حدود سے دنیا بنی نہیں

مانا کہ تیرے لطف و کرم میں کمی نہیں
آسان اس قدر تو تری دوستی نہیں

کچھ ٹھوکریں تو کھا چکے اٹھنے کی منزلیں
پائے طلب کو ننگِ سلامت روی نہیں

کب دیکھئے دلوں کو ملے اذنِ یاس ابھی
بیگانہ وار کہتی ہے وہ آنکھ ابھی نہیں

بیخود سے تھے تو وقت کا یہ بھی فریب تھا
ہم اور تجھ کو دل سے بھلا دیں کبھی نہیں

نیند آ چلی ہے انجمِ شامِ ابد کو بھی
آنکھ اہلِ انتظار کی اب تک لگی نہیں

بادِ بہار دیکھ کے کس طرح یہ کہیں
رنگینیوں کی جان تری سادگی نہیں

اے دوست یوں تو ہجر تری حسرت کچھ کہیں
لیکن یہ زندگی تو کوئی زندگی نہیں

اے حشر کاروانِ دو عالم بچھڑ کے
اے خضرِ راہ یہ تو کوئی رہبری نہیں

یہ کیفیت سکوتِ سحر میں کہاں کی ہے
وہ شام ہے جو صبح بھی ہو کر کٹی نہیں

شاید کسی کو مانگتی ہیں آج بھی فراق
گو زندگی میں یوں مجھے کوئی کمی نہیں

○

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

تم نے پوچھا بھی نہیں ہم نے بتایا بھی نہیں
کونسا راز وہ ایسا تھا کہ جانا بھی نہیں

یہ بھی سچ ہے کہ محبت پہ نہیں میں مجبور
یہ بھی سچ ہے کہ ترا حسن کچھ ایسا بھی نہیں

بدگماں ہو کے مل اے دوست جو ملنا ہے تجھے
بے جھجکتے ہوئے ملنا کوئی ملنا بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں
لیکن اس جلوہ گہِ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجشِ بے جا بھی نہیں

مدتیں گذریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

تجھ سے سنبھلیں تو سنبھالیں اپنے جانِ بے باک
میں اٹھاتا حدِ آداب تماشا بھی نہیں

ہائے وہ رازِ محبت جو چھپائے نہ بنے
ہائے وہ داغِ محبت جو ابھرتا بھی نہیں

آہ یہ مجمعِ احباب یہ بزمِ خاموش
آج محفل میں فراقِ سخن آرا بھی نہیں

○

شامِ غم کچھ اس نگاہِ ناز کی باتیں کرو
بے خودی بڑھتی چلی ہے راز کی باتیں کرو

یہ سکوتِ ناز یہ دل کی رگوں کا ٹوٹنا
خامشی میں کچھ شکستِ ساز کی باتیں کرو

نکہتِ زلفِ پریشاں داستانِ شامِ غم
صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو

ہر رگِ دل وجد میں آتی رہے دکھتی رہے
یونہی اس کے جاں بجانِ ناز کی باتیں کرو

جو عدم کی جان ہے جو ہے پیامِ زندگی
اس سکوتِ راز اس آواز کی باتیں کرو

عشق رسوا ہو چلا ہے کیف سا بیزار سا
آج اس کی نرگسِ خمّاز کی باتیں کرو

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

جس کی فرقت نے پلٹ دی عشق کی کایا فراق
آج اس عیسیٰ نفس دمساز کی باتیں کرو

○

رب سے کہو آج اس انداز سے گائے
ہر دل کو لگے چوٹ سی ہر آنکھ بھر آئے
چوٹ جو گیا جانے کہاں سے ابھر آئے
وہ درد و خشوں کو جو انسان بنائے
ہ دل کو پھر اک شاید رعنا نظر آئے
زلفیں کہے کج کلہے تنگ قبائے
ر رتی ادا، شعلہ قبا، پیکر رنگیں
دل ہلنے مدھر کو پہلو میں دبائے
زندا ہو گداز، ف یہ تبسم کی گھلاوٹ
لجے کی کھنک لو جو ستاروں سے چرائے
ہ مستی قامت کہ گھٹا جھوم کے اٹھے
وہ چستی ہر عضو کہ بجلی کو خجل آئے
س نس میں کوئی جیسے ولی چٹکیاں بھرے
رگ رگ میں کلی جیسے چٹکتی چلی جائے
دوشیزہ جوانی کی ادھر ٹوٹتی انگڑائی
تصویر ادھر قوس و قزح کھینچتی جائے
وہ شوخیٔ محتاط کے بچتے ہوئے انداز
دنیا بھی نہ پہنچے وہ قیامت بھی اٹھائے
یہ کم نگہی چشم فسوں ساز کی کیسی
دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنائے
کچھ ایسی بھی گزری ہیں ترے ہجر میں تا ہیں
دل درد سے خالی ہو مگر نیند نہ آئے

○

زہے آب و گل کی یہ کیمیا، ہے چمن کہ معجزۂ نمو
نہ خزاں سے کچھ نہ بہار کچھ وہی خار و خس وہی رنگ و بو
ہوئی ختم صحبت مے کشی ابھی داغ سینوں میں رہ گیا
کہ طلوع ہونے سے رہ گئے کئی آفتاب خم و سبو
کئی لاکھ پھولوں نے پیرہن سر باغ بن کے اڑا دیئے
زہے فصل گل وہ ہوا چلی کہ چمن کی لے اڑی آبرو
جسے اپنے آپ کہتے بھی مجھے آج لاکھ حجاب ہے
وہ زمانہ عشق کو یاد ہے مری عرض غم ترے روبرو
ہوئی وارداتِ سحر عیاں تو گلوں کا سینہ دھڑک گیا
یہ چلی کہ تیغ نسیم نے کئی ہاتھ اچھال دیا لہو
وہی آنکھ جام مے حیا، وہی آنکھ جام جہاں نما
جو نگاہ اٹھتی نہیں کبھی وہ نگاہ جاتی ہے چار سو
یہ کہاں سے بزم خیال میں امنڈ آئیں چہروں کی بدلیاں
کوئی مہ جبیں کوئی خود فشاں کوئی زہرہ وش کوئی شعلہ رو
گئے باغ حسن عدن عدن گئے راغ حسن ختن ختن
تب و تاب روئے سحر نمو، خم و پیچ زلف سیاہ مو
مری شاعری نے کھلائے گل سر نوک خار چمن چمن
جو کہے یہ دعوے حریف نے رگ فکر دینے لگی لہو
تجھے اہل دل کی خبر نہیں کہ جہاں میں گنج لٹا گئے
یہ گداگران دیار غم، یہ تلندران تہی کدو
اب اسی کا نکیہ زمانے میں یہ سنا ہے مرجع خلق ہے
جو فراق تیرے لیے پھرا کبھی در بدر کبھی کو بہ کو

○

رُکی رُکی سی شبِ مرگ ختم پہ آئی
وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی
یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیاں بھی چھوڑ گئی ہیں ساتھ
مسافروں سے کہو اُن کی رہگزر آئی
فضا تبسمِ صبحِ بہار تھی لیکن
پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی
کہیں نمائے مکاں میں ہے ہم نوا بھی سکوں
مگر یہ بات محبت کی بات پر آئی
کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی تھی
امیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی
کہاں ہر ایک سے انسانیت کا بار اُٹھا
کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی
دلوں میں آج تری یاد قدرتوں کے بعد
بہ چہرۂ متبسم بہ چشمِ تر آئی
فضا کو جیسے کوئی راگ چیرتا جائے
تری نگاہ دلوں میں یونہی اُتر آئی
ذرا وصال کے بعد آئنہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی
عجب نہیں کہ چمن در چمن بنے ہر پھول
کلی کلی کی صبا جا کے گود بھر آئی
شبِ فراق اُٹھے دل میں اور بھی کچھ درد
کہوں یہ کیسے تری یاد رات بھر آئی

○

دنیا دنیا عالم عالم تھے اک رو ریہی ویرانے
وادی وادی جنگل جنگل چھان گئے تیرے دیوانے
ذہن چھپا کر اٹھے دلوں میں ایمانوں کو لوٹنے والے
بات وہ کہہ اے عشق کہ سن کر سب قاتل ہوں گی صافی
اُسی دروے دنیا غافل اُسی درد کا گھر گھر چرچا
ایک شبِ غم کی سو راتیں ایک محبت سو افسانے
اور دل سے بھی بس کے روکے جھٹلا چکا پیار کیا تھا
وہ بھی تھے ترے عشق کے حیلے وہ بھی تھے ترے غم کے بہانے
تو نے ہوا کی بزم لہو کی اپنی گوں پہ لگانا چاہا
صید گہ ہستی میں ناداں یونہی خطا ہوتے ہیں نشانے
غفلت ہو تو کوئی چونکائے جاگے ہوؤں کو کون جگائے
ہائے وہ کاروانِ جہاں خود جس سے نکلیں بے عملی کے بہانے
حسن کے پاس اس کا نہیں چارہ عشق کا اس میں کیا ہے اجارا
یونہی پھرتی ہیں نگاہیں یوں ہی مل جاتے ہیں زمانے
اس کی نظر پہ حیراں حیراں مجبوری بھی آزادی بھی
وہی کے جو سب کے دل میں سب کی سے اور اپنی مانے
دنیا اپنے رنگ محل میں خوابِ خوشی کے دیکھ رہی ہے
جس میں خوشی نے آنکھیں کھولیں تھے وہ محبت کے افسانے
حسن و محبت آپ اپنی توہین ہیں گر معصوم نہ ہوں
تھوڑی میر کو بھولے بن میں ہم بھی سیانے تم بھی سیانے
امن و اماں کی دنیا میں بھی ایسوں کے کب ٹھٹے ہیں ٹھکانے
کئی بار تو عشق گیا ہے مر کے مر کے منہ میں جان بچانے
شعلۂ گل پہ چادرِ شبنم سرتاسر تصویرِ حیات
رو لینا ہے ہنستے ہنستے ہنس لینا ہے غم کے بہانے
ذرہ ذرہ، تارا تارا قطرہ قطرہ، دریا دریا
ہوش خرد ہیں حیراں حیراں کیا کوئی سمجھے کیا کوئی جانے

سامنے کی چیزیں بھی فراق انسان کو چونکا دیتی ہیں
بزم میں جاگتا خواب یہ دیکھا ہیں چراغ ہمیں پروانے

حفیظ جالندھری

○

اودل توڑ کے جانے والے، وفا کی بات بتاتا جا
اب میں دل کو کیا سمجھاؤں، مجھ کو بھی سمجھاتا جا

ہاں، میرے مجروح تبسم خشک لبوں تک آتا جا
پھول کی ہستی بو دیسی ہے کھلتا جا مرجھاتا جا

میری چپ رہنے کی عادت جس کا یہ بدنام ہوئی
اب وہ حکایت عام ہوئی ہے سنتا جا شرماتا جا

یہ دکھ درد کی برکھا بندے دین ہے تیرے داتا کی
شکر نعمت بھی کرتا جا، دامن بھی پھیلاتا جا!

جینے کا ارمان کروں یا مرنے کا سامان کروں
عشق میں کیا ہونا ہے ناصح عقل کی بات بجھاتا جا

تجھ کو ابر آلود دنوں سے کام نہ چاندنی راتوں سے
بھلاتا ہے باتوں سے بہلاتا جا بھلاتا جا!

دونوں سنگِ راہِ طلب ہیں، راہنما بھی منزل بھی
ذوقِ طلب! ہر ایک قدم پر دونوں کو ٹھکراتا جا

نغمے سے جب پھول کھلیں گے چننے والے چن لیں گے
سننے والے سن ہی لیں گے تو اپنی دھن میں گاتا جا

آخر تجھ کو بھی موت آئی۔ خیر حفیظ خدا حافظ
لیکن جاتے جاتے پیالے وجہِ مرگ بتاتا جا

○

کوئی دوا نہ دے سکے، مشورۂ دعا دیا
چارہ گر دوں نے اور بھی درد کا دل بڑھا دیا

ذوقِ نگاہ کے سوا، شوقِ گناہ کے سوا
مجھ کو خدا سے کیا ملا، مجھ کو بتوں نے کیا دیا

تھی نہ خزاں کی روک تھام دامنِ اختیار میں
ہم نے بھری بہار میں اپنا چمن لٹا دیا

حسنِ نظر کی آبرو صنعتِ برہمن سے ہے
جس کو صنم بنا لیا، اس کو خدا بنا دیا

داغ ہے مجھ پہ عشق کا میرا گناہ بھی تو دیکھ
اُس کی نگاہ بھی تو دیکھ جس نے یہ گل کھلا دیا

عشق کی مملکت میں ہے شورشِ عقل نامراد
اُبھرا کہیں جو یہ فساد دل نے وہیں دبا دیا

نقشِ وفا تو میں ہی تھا، اب مجھے ڈھونڈتے ہو کیا
حرفِ غلط نظر پڑا، تم نے مجھے مٹا دیا

خبثِ دروں کو کھا دیا، ہر دہنِ غلیظ نے
کچھ نہ کہا حفیظ نے، ہنس دیا مسکرا دیا

○

جھگڑا دانے پانی کا ہے، دام و قفس کی بات نہیں
اپنے بس کی بات نہیں، ہیا و کے بس کی بات نہیں

جانے سے پہلے یار ہمارے قید وفا سے چھوٹ گئے
سارے رشتے ٹوٹ گئے اک تارِ نفس کی بات نہیں

تیرا پھولوں کا بستر بھی راہ گزارِ سیل میں ہے
آقا - اب یہ بندے ہی کے خار و خس کی بات نہیں

دونوں ہجر میں رو دیتے ہیں، دونوں وصل کے طالب ہیں
حسن بھلا کیسے پہچانے، عشق ہوس کی بات نہیں

نوش ہے عنواں نیش عنیمہ ان شیریں افسانوں کا
تذکرہ ہے انسانوں کا یہ مور و مگس کی بات نہیں

کارِ مغاں یہ قند کا شربت بیچنے والے کیا جانیں!
تلخی و مستی بھی ہے غزل میں خالی رس کی بات نہیں

تشکیل و تکمیلِ فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں

○

اے دوست مٹ گیا ہوں فنا ہو گیا ہوں میں
اس دردِ دوستی کی دوا ہو گیا ہوں میں

قائم کیا ہے میں نے عدم کے وجود کو
دنیا سمجھ رہی ہے، فنا ہو گیا ہوں میں

ہمت بلند تھی، مگر افتاد دیکھنا!
چپ چاپ آج محوِ دعا ہو گیا ہوں میں

نا آشنا ہیں تربتِ دیوانگی سے دوست
کم بخت جانتے نہیں، کیا ہو گیا ہوں میں

ہنسنے کا اعتبار نہ رونے کا اعتبار
کیا زندگی ہے جس پہ فدا ہو گیا ہوں میں

ہاں کیفِ بے خودی کی وہ ساعت بھی یاد ہے
محسوس ہو رہا تھا خدا ہو گیا ہوں میں!

○

مستوں پہ انگلیاں نہ اٹھاؤ بہار میں
دیکھو تو — ہوش ہے بھی کسی ہوشیار میں

کچھ محتسب کا خوف ہے کچھ شیخ کا لحاظ
پیتا ہوں چھپ کے دامنِ ابرِ بہار میں

وہ سامنے دھری ہے صراحی بھری ہوئی
دونوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں

جھوٹی تسلیوں سے نہ بہلاؤ، جاؤ جاؤ
جاؤ — کہ تم نہیں ہو مرے اختیار میں!

اللہ بات کیا ہے کہ دیوانگی مری!
دیوانگی نہیں فطرتِ ہوشیار میں

وہ عندلیبِ گلشنِ معنی ہوں میں حفیظؔ
سوزِ سخن سے آگ لگا دوں بہار میں

○

جوانی کے ترانے گا رہا ہوں — وہی چنگاریاں سلگا رہا ہوں

مری بزمِ وفا سے جانے والو — ٹھہر جاؤ، کہ میں بھی آ رہا ہوں

بتوں کو قول دیتا ہوں وفا کا — قسم اپنے خدا کی کھا رہا ہوں

وفا کا! ازمی تھا یہ نتیجہ! — سزا اپنے کیے کی پا رہا ہوں

خدا لگتی کہو بتخانے والو! — تمہارے ساتھ میں کیسا رہا ہوں

نہ ہے وہ گوشۂ راحت کہ جس میں — ہجومِ رنج لے کر جا رہا ہوں

نئے کعبے کی بنیادوں سے پوچھو — پرانے بتکدے کیوں ڈھا رہا ہوں

نہیں کانٹے بھی کیا اب اٹھے چمن میں — کوئی رو کے مجھے میں جا رہا ہوں

ہوئی جاتی ہے کیوں بیتاب منزل — مسلسل چل رہا ہوں آ رہا ہوں

حفیظؔ اپنے پرائے بن رہے ہیں
کہ میں دل کو زباں پر لا رہا ہوں

○

ناکامیٔ عشق، یا کامیابی
دونوں کا حاصل خانہ خرابی
آنکھیں یہ مست، پھر التجا بی
بادہ شبانہ، جام آفتابی
پھولوں میں وہ پھول، رنگوں میں وہ رنگ
لب لعل نابی، عارض گلابی
دنیا و دیں سے بیگانہ ہو جا
دیوانہ ہو جا، بن جا شرابی
اُن کا بہانہ، رجعت گوئی
یہ اِبتسم خضر جوابی
دیدار کر دے، کافر بنا دے
یہ پردہ داری، یہ بے حجابی
ہیں تختِ دل پر سرکار، ورنہ
تختہ اُلٹ دیں، ہم انقلابی
دربان سے ہوں دست و گریباں
الحمد للہ یہ باریابی!

○

کہہ گئے الفراق یار انے
رہ گئے ناتمام افسانے
دوستی اب گلے کا ہار نہیں
تار ٹوٹا بکھر گئے دانے
صبح دم اپنی اپنی راہ لگے
شمع کے جاں نثار پروانے
ساقیا! یہ رواروی کا ہے دور
بھر دے بھر دے کچھ اور پیمانے
ماتمِ اہلِ ظرف کے دن ہیں
احتراماً ہیں بند مے خانے
زندگی سے نپٹ رہا ہوں ابھی
موت کیا ہے مری بلا جانے
کر رہا ہوں تلاش اپنوں کی!
جب سے گم ہو گئے ہیں بیگانے
ہم نے روکا حفیظ کو ورنہ
اور بھی کچھ لگے تھے فرمانے!
تنگ و دو ہے ترے جلو میں حفیظ
اور کیا چاہتا ہے دیوانے

○

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آسکے
تم نے ہمیں بھلا دیا، ہم نہ تمھیں بھلا سکے

تم ہی نہ سُن سکے اگر، قصۂ غم سُنے گا کون
کس کی زباں کھلے گی پھر، ہم نہ اگر سُنا سکے

ہوش میں آچکے تھے ہم، جوش میں آچکے تھے تم
بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اُٹھا سکے

رونقِ بزم بن گئے۔ لب پہ حکایتیں رہیں!
دل میں شکایتیں رہیں لب نہ مگر ہلا سکے

عجز سے اور بڑھ گئی، برہمیٔ مزاجِ دوست
اب وہ کرے علاج دوست، جس کی سمجھ میں آسکے

ایسا ہو کوئی نامہ بر، بات پہ کان دھر سکے
سُن کے یقین کر سکے، جا کے انھیں سنا سکے

شوق وصال ہے یہاں، لب پہ سوال ہے یہاں
کس کی مجال ہے یہاں، ہم سے نظر ملا سکے؟

اہلِ زباں تو ہیں بہت، کوئی نہیں ہے اہلِ دل
کون تیری طرح حفیظ، درد کے گیت گا سکے

○

وہ سرخوشی دے کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کر دے
مرے خیالوں میں رنگ بھر دے مرے لہو کو شراب کر دے

یہ خوب کیا ہے یہ زشت کیا ہے یہاں کی اصلی سرشت کیا ہے
بڑا مزا ہو تمام چہرے اگر کوئی بے نقاب کر دے!

کہو تو رازِ حیات کہہ دوں حقیقتِ کائنات کہہ دوں
وہ بات کہہ دوں کہ پتھروں کے جگر کو بھی آب آب کر دے

خلافِ تقدیر کر رہا ہوں، پھر ایک تقصیر کر رہا ہوں
پھر ایک تدبیر کر رہا ہوں، خدا اگر کامیاب کر دے

ترے کرم کے معاملے کو ترے کرم ہی پہ چھوڑتا ہوں
مری وفائیں شمار کر لے، مری وفا کا حساب کر دے

حفیظ سب سے بڑی خرابی ہے عشق میں لطف کامیابی
کسی کی دنیا تباہ کر دے، کسی کی عقبےٰ خراب کر دے

میرزا یاس یگانہ

○

مجھے دل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

بُرا ہو پائے سرکش کا کہ تھک جانا نہیں آتا
کبھی گمراہ ہو کر راہ پر آنا نہیں آتا

مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
بہانہ کر کے تنہا پار اتر جانا نہیں آتا

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا

اسیرو! شوقِ آزادی مجھے بھی گدگداتا ہے
مگر چادر سے باہر پاؤں پھیلانا نہیں آتا

دلِ بے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھیس کا مہماں
وہ آنسو کیا پیئے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا

سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں کون ہوں کیا ہوں
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

○

ہنوز زندگیٔ تلخ کا مزا نہ ملا
کمالِ صبر ملا، صبرِ آزما نہ ملا

مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں ہے
مزاجِ اس دلِ بے اختیار کا نہ ملا

جواب کیا وہی آوازِ بازگشت آئی
قفس میں نالۂ جانکاہ کا مزا نہ ملا

امید وارِ رہائی قفس بدوش چلے
جہاں اشارۂ توفیقِ خاطبا نہ ملا

ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ قفس
عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا

ہزار ہا اسی جانب ہے منزلِ مقصود
دلیلِ راہ کا غم کیا، ملا ملا نہ ملا

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستا نہ ملا

خوشا نصیب جسے فیضِ عشق شور انگیز
بقدرِ ظرف ملا ظرف سے سوا نہ ملا

بگڑ میں آگیا جب عذرِ فطرتِ مجبور
گناہ گارِ ازل کو نیا بہانہ ملا

○

لاتی ہے آخر ایک جنبشِ لب کیا
دیکھئے دکھاتا ہے وعدۂ تذبذب کیا

ر میں ستوالی، دو ہی گھونٹ میں خالی
یہ بھری جوانی کیا، جذبۂ لبالب کیا

عائیں لیتا جا گالیاں بھی دیتا جا
تازگی تو کچھ پہنچے، چاہتا رہوں لب کیا

ت آگئی آخر کہہ گیا خدا لگتی
راستی کا پھل پاتا، بندۂ مقرب کیا

سیدھی خنّاره اپنی کہہ تو اُٹھی کہہ
سادہ ہے تو کیا جانے بھانپنے کا ہے ڈھب کیا

جہاد میں دل کے سب فساد ہیں دل کے
بے دلوں کا مطلب کیا اور ترکِ مطلب کیا

ہے گا سجدہ بھی جب کسی کی یاد آئی
یاد جانے کب آئے زندہ داریٔ شب کیا

رکے دن کا تھوڑی دیر کا جھگڑا
دیکھنا ہے یہ ناداں جینے کا ہے کرتب کیا

لے ہت پنے ڈس چکے بہت کالے
موذیوں کے موذی کو فکرِ نیشِ عقرب کیا

میرزا یگانہ واہ! زندہ باد! زندہ باد!
اک بلائے بے زباں جب تم کہے تھے اب کیا

○

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

پیامِ زیبِ ایسا کہ کچھ سُنا نہ گیا
اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا

ہنسی میں وعدۂ فردا کو ٹالنے والو!
لو دیکھ لو وہی کل آج بن کے آ نہ گیا

گناہِ زندہ دلی کہئے یا دلِ آزاری
کسی پہ ہنس لیے اتنا کہ پھر ہنسا نہ گیا

سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے ترانۂ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سُنا نہ گیا

کروں تو کس سے کروں دردِ نارسا کا گِلہ
کہ مجھ کو لے کے دلِ دوست میں سما نہ گیا

بتوں کو دیکھ کے سب نے خدا کو پہچانا
خدا کے گھر تو کوئی بندۂ خدا نہ گیا

کرشن کا ہوں پجاری علی کا بندہ ہوں
یگانہ شانِ خدا دیکھ کر رہا نہ گیا

○

لذتِ زندگی مبارکباد
کل کی کیا فکر، ہر تجھے باد باد

اے خوشا زندگی کہ پہلوئے شوق
دوست کے دم قدم سے ہے آباد

دل سلامت ہے، درد دل نہ سہی
درد جاتا رہا کہ درد کی یاد؟

زیست کے ہیں یہی مزے واللہ
چار دن شاد چار دن ناشاد

کون دیتا ہے داد ناکامی
خونِ فرہاد بر سرِ فرہاد

صبر اتنا نہ کر کہ دشمن پر
تلخ ہو جائے لذتِ بیداد

صلح کر لے یگانہ غالب سے
وہ بھی اُستاد تم بھی اُن کے استاد

○

جب تک خلشِ درد خدا داد رہے گی
دنیا دلِ ناشاد کی آباد رہے گی

دنیا کی ہوا راس نہ آئے گی کسی کو
ہر سر میں ہوائے عدم آباد رہے گی

چونکائے گی رہ رہ کے تو غفلت کا مزہ کیا
ساتھ اپنے اجل صورتِ ہمزاد رہے گی

دل اور دھڑکتا ہے ادب گاہِ قفس میں
شاید یہ زباں تشنۂ فریاد رہے گی

جو خاک کا پتلا وہی صحرا کا بگولا
مٹنے پہ بھی اک ہستیٔ برباد رہے گی

ہر شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

شہرہ ہے یگانہ تری بیگانہ روی کا
واللہ یہ بیگانہ روی یاد رہے گی

○

مزاج آپ کا دنیا سے کچھ کشیدہ سہی
غریب کھاؤ گے پھر بھی فریب دیدہ سہی

یہ سبزہ باغ کا عالم یہ رنگِ لیل و نہار
بہل ہی جائے گا دل آپ سے رمیدہ سہی

یہ غنچہ کیسا کہ دیکھے سے دل دھڑکتا ہے
ارے یہ ایک ہی فتنہ ہے، نو دمیدہ سہی

نگاہِ شوق کی گرمی خدا کی قدرت ہے
مزے پہ آ ہی گیا حسن، نارسیدہ سہی

کھٹکتی رہتی ہے دل میں نگاہِ دزدیدہ
خطائے حسن کہے کون چشمِ دیدہ سہی

نگاہِ حسن سے اب تک وفا ٹپکتی ہے
ستم رسیدہ سہی، پیرہن دریدہ سہی!

فریبِ ابرِ کرم بھی بڑا سہارا ہے
بلا سے نخلِ تمنا خزاں رسیدہ سہی

پتے کی کہیے تو ظالم کا رنگ اڑتا ہے
زبانِ حال سے اک حرفِ ناشنیدہ سہی

قریب ہوں مگر اتنا کہ جیسے کوسوں دور
مجھے نہ دیکھ سکو گے، زمانہ دیدہ سہی

مری نظر کی خطا ہو گی یا گلوں کی خطا
تمہارے راج میں کانٹا ہی برگزیدہ سہی

یگانہ ٹھن گئی بیڈھب تو سوچتے کیا ہو
شریکِ کار نہیں تو نہیں حریدہ سہی

○

حسن پر فرعون کی پھبتی کہی
ہاتھ لانا یار کیوں کیسی کہی!

دامنِ یوسفؑ ہی پھٹ کر کا رہا
عشق اور ترکِ ادب؟ اچھی کہی

کوئی ضد تھی یا سمجھ کا پھیر تھا
من گئے وہ میں نے جب اُلٹی کہی

درد سے پہلے کروں فکرِ دوا
واہ یہ اچھی اٹوانسی کہی

دوست سے پردہ کیا یہ کیا کیا
آپ بیتی چھوڑ جگ بیتی کہی

شک ہے کافر کو مرے ایمان میں
جیسے میں نے کوئی سُنّہ دیکھی کہی

کیا خبر تھی یہ خدائی اور ہے
ہائے میں نے کیوں خدا لگتی کہی

مفت میں سُن لی یگانہ کی غزل
اَن سُنی کر دی جو مطلب کی کہی

○

کس کی آواز کان میں آئی؟ دور کی بات دھیان میں آئی
ایسی آزاد روح اس تن میں کیوں پرائے مکان میں آئی
آپ آتے رہے بلاتے رہے آنے والی اک آن میں آئی
ہائے کیا کیا نگاہ بھٹکی ہے جب کبھی امتحان میں آئی
علم کیا علم کی حقیقت کیا جیسی جس کے گمان میں آئی
حسن کیا خواب ہے ہوا بیدار جان تازہ جہان میں آئی
جان لیوا ہے یہ کڑی تیوری یہ کشش کس کمان میں آئی
بات ادھوری مگر اثر دونا اچھی لکنت زبان میں آئی
آنکھ نیچی ہوئی ارے یہ کیا؟
کیوں غرض درمیان میں آئی

○

کارگاہ دنیا کی نیستی بھی ہستی ہے
اک طرف اُجڑتی ہے ایک سمت بستی ہے
بے دلوں کی ہستی کیا، جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
خواب ہے نہ بیداری ہوش ہے نہ مستی ہے
کیا سنائے دل کیا ہے خاک ہے مگر کیسی؟
لجھیے تو الجھن ہے نیچیے تو سستی ہے
خضر منزل اپنا ہوں اپنی راہ چلتا ہوں
میرے حال پر دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے
کیا کہوں سفر اپنا ختم کیوں نہیں ہوتا
فکر کی بلندی یا حوصلہ کی پستی ہے
حسن بے تماشا کی دھوم کیا معمہ ہے
کان بھی ہیں نامحرم آنکھ بھی ترستی ہے
چونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
چاں سے تو کافر پر سادگی برستی ہے
ترک لذت دنیا کیجیے تو کس دل سے
ذوق پارسائی کیا فیض تنگدستی ہے
دیدنی ہے یاس اپنے رنج و غم کی طغیانی
جھوم جھوم کر کیا کیا یہ گھٹا برستی ہے

سیماب اکبرآبادی

○

رات کا جانا، وداعِ شیشہ و پیمانہ تھا
صبح کا تارا نہ تھا، قفلِ درِ مے خانہ تھا

حسن تنگ آکر بھڑک اُٹھا فضائے طور سے
طالبِ دیدار کا ارمان سستا خانہ تھا

ڈھونڈتا پھرتا تھا چشمِ آرزو کی روشنی
میں شبِ فرقت اندھیری رات کا پروانہ تھا

میری خاکستر سے پیدا تھا جہانِ آرزو
جو پتنگا دل کے شعلوں سے اُڑا، پروانہ تھا

کیف اے ساقی! ہُوا مجھ کو نہ ہونے کی طرح
کچھ مرے انداز سے چھوٹا ترا پیمانہ تھا

○

اب تو یہ حال ہے نظر سوگوار کا
کیفِ جمال ہے نہ مزہ انتظار کا

کہتے ہیں جس کو نزع کا عالم جہان میں
پچھلا پہر ہے میری شبِ انتظار کا

دل سرگرانِ حسرتِ دیدار رہ گیا
آنکھوں نے لطف لوٹ لیا انتظار کا

منہ زرد داغ یاس میں پلکیں بھری ہوئی
عالم تو دیکھئے سحرِ انتظار کا

یہ نازِ منفعل، یہ ادائیں حجاب کی
منہ ہو تو چوم لوں نگہِ شرمسار کا

سیمابؔ کیا سناؤں میں اپنا کسی کو حال
زندہ ہوں اور شکر ہے پروردگار کا

○

نامہ گیا کوئی، نہ کوئی نامہ بر گیا
تیری خبر نہ آئی زمانہ گزر گیا

ہنستا ہوں یوں کہ ہجر کی راتیں گزر گئیں
روتا ہوں یوں کہ لطفِ دعائے سحر گیا

اب مجھ کو ہے قرار تو سب کو قرار ہے
دل کیا ٹھہر گیا کہ زمانہ ٹھہر گیا

یارب! انہیں میں واقفِ سودا و زندگی
اتنا ہی یاد ہے کہ جیا اور مر گیا

○

جتنے ستم کیے تھے کسی نے عتاب میں
وہ بھی ملا لیے کرمِ بے حساب میں

حسرت کو گھر کہیں نہ ملا اضطراب میں
لٹنے کو آ گئی دلِ خانہ خراب میں

اُٹھا ہے ابر مے کدہ دستِ دعا کے ساتھ
اتنی برس پڑے کہ نہا لوں شراب میں

آ، اے گلِ فسردہ! لگا لوں تجھے گلے
تو بھی تو میری طرح کٹا ہے شباب میں

ہر چیز پر بہار، ہر اک شے پہ حسن تھا
دنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب میں

○

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
اک آئنہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

صبر آ ہی جائے گر ہو بسر ایک حال میں
امکاں اک اور ظلم ہے قیدِ محال میں

آزردہ اس قدر ہوں سرابِ خیال سے
جی چاہتا ہے تم بھی نہ آؤ خیال میں

تنگ آ کے توڑتا ہوں طلسمِ خیال کو
یا مطمئن کرو کہ تمھیں ہو خیال میں

دنیا ہے خواب حاصلِ دنیا خیال ہے
انسان خواب دیکھ رہا ہے خیال میں

بجلی گری اور آنچ نہ آئی کلیم پر
شاید ہنسی بھی آ گئی ان کو جلال میں

عمرِ دو روزہ واقعی خواب و خیال تھی
کچھ خواب میں گزر گئی، باقی خیال میں

○

جنوں پہنچا بیاباں میں، بہار آئی گلستاں میں
یہ دونوں کیوں نہ آ بیٹھے مرے چاکِ گریباں میں

یہ کس کافر نے بھیں انگڑائیاں صحنِ گلستاں میں
قیامت چھپتی پھرتی ہے گلوں کے چاکِ دامان میں

دلِ غمگیں! مدارات ستم کی بات رہ جائے
لہو کی بوند بن کر جذب ہو جا، نوکِ پیکاں میں

ذرا کھل کر پکار اے صور! مجنوں بیابانِ الفت کو
یہ دیوانے کہیں بیٹھے نہ رہ جائیں بیاباں میں

○

طولِ رہِ حیات سے گھبرا رہا ہوں میں
گھبرا رہا ہوں اور چلا جا رہا ہوں میں

چھوتی نہیں مجھے پرِ جبریل کی ہوا
یہ کن بلندیوں پہ اڑا جا رہا ہوں میں

پھر دے رہا ہوں فطرتِ انساں کو درسِ ناز
پھر آستانِ حسن سے ٹھکرا رہا ہوں میں

کیوں میرے ساقیا بادہ پہ تجھ کو یقیں نہیں
ساقی ترے لبوں کی قسم کھا رہا ہوں میں

تحلیلِ ہوش ہے مری روحِ ہر نفس
تعمیرِ کائنات میں کام آ رہا ہوں میں

○

برباد حسنِ ظن سے مآلِ وفا نہ ہو
ایسا نہ ہو کہ حق محبت ادا نہ ہو

الجھا رہا ہوں زلفِ تصور میں دستِ شوق
اور اس طرح کہ موجِ ہوا آشنا نہ ہو

وہ سرخوشی کا وقت ہے جب کائنات میں
دل بولتا ہو اور کوئی بولتا نہ ہو!

آ، اور آخری نگہِ یاس دیکھ جا!
شاید پھر اس کے بعد حیات روا نہ ہو

○

کیوں ہنسی تو اے اجل! فانی اگر سمجھا مجھے
ایک دن سب کو فنا ہے کیا تجھے اور کیا مجھے

ہے حصولِ آرزو کا راز، ترکِ آرزو
میں نے دنیا چھوڑ دی، تو مل گئی دنیا مجھے

کہہ کے سویا ہوں یہ اپنے اضطرابِ شوق سے
جب وہ آئیں قبر پر فوراً جگا دینا مجھے

صبح تک کیا کیا تری امید نے طعنے دیئے
آگیا تھا شامِ غم اک نیند کا جھونکا مجھے

دیکھتے ہی دیکھتے دنیا سے میں اٹھ جاؤں گا
دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی دنیا مجھے

○

چمک جگنو کی برقِ بے اماں معلوم ہوتی ہے
قفس میں رہ کے قدرِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

چمن کے سانحے کو مدتیں گزریں مگر اب بھی
چمکتی ہے جو بجلی آشیاں معلوم ہوتی ہے

ترقی پر ہے روز افزوں خلش دردِ محبت کی
جہاں محسوس ہوتی تھی وہاں معلوم ہوتی ہے

قفس کی تیلیوں میں جانے کیا ترکیب رکھی ہے
کہ ہر بجلی قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

جعفر علی خاں اثر لکھنوی

○

حیا میں اک ادا نکلی، اداؤں سے حجاب آیا
شباب آیا ادا میں، اس انداز سے ان کا شباب آیا
جوانی اور آئینہ، تبسم اور انگڑائی
حیا سے اختیار آئی، اداؤں پر عتاب آیا
وہی آنکھیں کہ جن سے بادۂ گلگوں چھلکتا تھا
وہی نرگس کی کلیاں تھیں جہاں ہنگامِ خواب آیا
بگڑنا، روٹھنا، باتیں بنانا مجھ سے آتی ہیں
مگر اے دل نہ کوئی ان کے طعنوں کا جواب آیا؟
نظر اٹھی نظر کے ساتھ اک موجِ شراب اٹھی
مجسم کیفِ رنگیں بن کے وہ مستِ شباب آیا
گلوں کی گود میں جیسے نسیم آکر مچل جائے
اسی انداز سے ان پُرخمار آنکھوں میں خواب آیا
بسا پھولوں کی نکہت میں لیے مستی شرابوں کی
مہکتا، لہلہاتا ایک کافر کا شباب آیا
نہ دینا داد شوخی کی خطا تھی، اب یہ تہمت ہے
نگاہیں اٹھ گئیں کیوں جب ادھر وہ بے نقاب آیا
اثر کو بوسہ میں پاؤ تو کہہ دو کوئی کہتا تھا
کہاں ہے، کیا ہوا، جا کر نہ وہ خانہ خراب آیا

○

مثالِ برگِ خزاں رسیدہ ہوا ہے زرد آفتاب کیسا
مگر قیامت قریب آئی، کھلا ہے بندِ نقاب کیسا

دلِ ستم کش کو بجلیوں کا خزانہ جس نے بنا دیا ہے
تری نظر میں نہاں تھا ظالم یہ محشرِ اضطراب کیسا

کبھی ہے تکیہ ترے کرم پر، کبھی ہے خوفِ عتاب دل میں
یہی ہے جنت، یہی ہے دوزخ، عذاب کیسا ثواب کیسا

میں ان کے جلووں کا آئنہ ہوں وہ میری حیرت کا آئنہ ہیں
جہاں یہ عالم ہو محویت کا، سوال کیسا، جواب کیسا

بجائے مے یاد میں کسی کی پیا ہے خونناب دل وگرنہ
تمہاری آنکھوں سے آج ٹپکا اثر یہ رنگِ شراب کیسا

○

کاہے کو ایسے ڈھیٹ تھے پہلے، جھوٹی قسم جو کھاتے تم
غیرت سے آجاتا پسینا، آنکھ نہ ہم سے ملاتے تم

حیف تمہیں فرصت ہی نہیں ہے، ورنہ کیا کیا حسرت تھی
حال ہمارا کچھ سُن لیتے، کچھ حال اپنا سناتے تم

ننگ ہے ملنا، عار تکلم، ایک زمانہ ایسا تھا
بزم میں اپنی ہم کو بلا کر عزت سے جھلاتے تم

ہم وہ نہیں، یا تم وہ نہیں، تم ہنستے ہو اور ہم روتے ہیں
یا بجلی الٹی جاتی تھی، جتنا ہمیں سمجھاتے تم

وضع بھی کوئی شے ہے آخر، دل کو اثرؔ سمجھانا تھا
در سے کسی کے اک بار اُٹھ کر کاش دوبارہ نہ جاتے تم

○

صحرا سے چلے ہیں سُوئے گلشن
خونیں جگرانِ چاک دامن

پیغام بہار دے رہی ہے
داغوں کی جھلک دلوں کی اُلجھن

رقصاں ہے نسیم برگ گُل پر
شبنم میں ہے گھنگروؤں کی چھن چھن

غنچوں کے بدن میں سنسنی ہے
مستی میں چھوا صبا نے دامن

دل کش نہ ہو کیوں کلام اثرؔ کا
سیکھا ہے یہ اس نے میرؔ سے فن

○

دل کا ہے رونا کھیل نہیں ہے، سو کو کیا جانے دو
تھمتے ہی تھمتے اشک تھمیں گے، ناصح کو سمجھانے دو

اُٹھ گئیں شریلیں مٹ گئیں قیدیں طاقت دل جب طاق ہوئی
ضبط کی آخر حد بھی ہے کوئی، اب تو یہ پردہ اٹھانے دو

کہتے ہی کہتے حال کہیں گے، ایسی تمہیں جلدی کیا ہے
دل تو ٹھکانے ہونے دو، اور آپ میں ہم کو آنے دو

مجھ کو تڑپتا چھوڑ نہ جائے ایسی کوئی تدبیر کرو
زخمی تیغ ناز وادا سے ہاتھ نہ اس کو اٹھانے دو

بزم طرب میں دیکھ کے مجھ کو پھیریں آنکھیں ساقی نے
میرے لیے تھے زہر ہلاہل، رس کے بھرے پیمانے دو

خود سے گریباں پھٹتے تھے اکثر چاک ہوا میں اڑتے تھے
اب وہ جنوں کا جوش نہیں، آئی بہار تو آنے دو

یاد دل گم گشتہ میں، میں ٹھنڈی آہیں بھرتا تھا
ہنس کے ستمگر کہتا کیا ہے، بات ہی کیا ہے جانے دو

صورت منزل کیا نظر آئے، ثبت ہیں دل پر نقش خودی
عقل ہے دشمن فکر ہے رہزن ٹھوکریں کچھ دن کھانے دو

دل کو اثر کے لوٹ لیا ہے، شوخ نگہ اک کافر نے
کوئی نہ اس کو روئے سے روکو، آگ لگی ہے بجھانے دو

○

کھوئے ہوئے سے رہتا دن کو روتے پھرتا راتوں کو
جو ہیں عاقل وہ کیا سمجھیں، عشق و جنوں کی باتوں کو

صبح کو جلوہ بر سر منبر، شب کو پیر مغاں
اب کیسے تو بھلا کیا کہیے ایسی مقدس ذاتوں کو

وہ جو رہے آئے، بادل چھائے، اگر جے برسے کھل بھی گئے
اس کے سوا ہم بھر کے مائے کیا جانیں برساتوں کو

بات یہ اور ہے شوق کے ہاتھوں خون دل عاشق ہو جائے
کام نہیں کچھ خونریزی سے تیرے حنائی ہاتھوں کو

شرم و حیا ہے ناز و ادا ہے، عشوہ و کرشمہ شوخی بھی
کیا کیا نہ لیے جاتا ہیں ہے دل لینے کی گھاتوں کو

کیا کیا ہم پر لطف و کرم ہے، کیسی کیسی مہر و وفا
تیغ اگر سونت سکتے نہیں تو کیوں چھیڑو ان باتوں کو

وید کی عشرت، محویت، بیخبری، بیہوشی مے خوار کی سی
شوق نے ختم نہیں یہ کیا پر لطف ملاقاتوں کو

غم میں وہ لذت پائی ہم نے، ذوق طلب پہ نثار کیا
حسن قبول عطا جو ہوا بھی شب کی مناجاتوں کو

ہو نہ ہو سب ہے اپنی بیتی لاکھ کرو انکار اثرؔ
نیند آنکھوں کی اڑاتے ہو کہہ کہہ کے فسانہ راتوں کو

○

تھی کی ذرا جو آنکھ جوانی گذر گئی بدلی کی چھاؤں تھی اِدھر آئی اُدھر گئی
مشاطۂ بہار عجب گُل کتر گئی منہ بند جو کلی تھی کھلی اور سنور گئی
پیشِ جمالِ یار کرن آفتاب کی شرما کے چاہتی تھی کہ پلٹے بکھر گئی
مل کر بھبھوت چہرے پہ تاروں کی چھاؤں کا دھونی رمائے در پہ یہ کس کے سحر گئی
کیا جانے آنکھ مار کے کیا کہہ گئی شفق پھولوں کی گود موجِ نسیم آ کے بھر گئی
سینے میں اور تاب دے شعلے کے شوق کے سجدہ غلط اگر نہ تجلی نکھر گئی
تیری ہی جلوہ زار ہے دنیائے رنگ و بُو اے وائے وہ نظر جو حجابات پر گئی
اب ہاتھ ملتے ہیں کہ دمِ عرض ما مرا کہنے کی بات دھیان سے کیسی اُتر گئی

کچھ دن کی اور کشمکشِ زیست ہے اثرؔ
اچھی بُری گذرنی تھی جیسی گذر گئی

○

کہ ہر قدم پہ لچکتی رہی
یہ بجلی سوئے دل لپکتی رہی

ادب لاکھ تھا پھر بھی اس کی طرف
نظر میری اکثر بہکتی رہی

اگر ہونٹ سی بھی لیے کیا ہوا
نگاہوں سے الفت ٹپکتی رہی

غبارِ دلِ مضطرب چھپ گیا
صبا اپنا دامن جھٹکتی رہی

نہ کھلنے پہ بھی میرے دل کی کلی
گلِ تر کی صورت مہکتی رہی

دلِ زار کی آہ بھی زار تھی
اگر آئی لب پر سسکتی رہی

اثرؔ کی سی شیوا بیانی کہاں
بہت یوں تو بلبل چہکتی رہی

○

کچھ نشیمن تو گلوں سے چھا گئے
دور کچھ بجلی کی زد میں آ گئے

سر جھکا کر کچھ کہا، شرما گئے
دلدہی کو آئے تھے تڑپا گئے

جرم ٹھہرا ہے وفا کا ذکر بھی
ہم سزا اپنے کئے کی پا گئے

منزلِ عشق اب نگاہوں سے سمٹ
پاؤں تو اس راہ میں تھرا گئے

آنے والے آ، کہاں تک انتظار
چاند ڈوبا، تارے بھی کجلا گئے

بجلیوں میں بجلیاں مل ہو گئیں
ناگہاں دو دل جہاں ٹکرا گئے

سعیِ ضبطِ اشک کے باوصف اثرؔ
چند افسانے مژہ تک آ گئے

○

دلہن بنی ہوئی اب کی چمن میں آئی ہے
بہار ہو کے تری انجمن میں آئی ہے

شمیمِ دوست لیے پیرہن میں آئی ہے
نسیمِ ہوش اڑاتی چمن میں آئی ہے

ظہورِ عشق حقیقت طراز تھا ورنہ
یہ دل کشی کہیں دار و رسن میں آئی ہے

بسائی جاتی ہے اس میں قمیصِ یوسف کی
ہوا جو مصر سے بیت الحزن میں آئی ہے

وہ بوئے خوں ہے کہ گھٹتا ہے دم معاذ اللہ
بہار وادیٔ زخمِ کہن میں آئی ہے

یہ کس کی خاک ہے جو حسرتِ نشیمن میں
صبا کے دوش پہ صحنِ چمن میں آئی ہے

نسیمِ صبح کے جھونکے مہک وہ پھولوں کی
نفس نفس میں نئی روحِ تن میں آئی ہے

بقدرِ ذوق نہیں جوئے شیر موجِ افزا
سوائے تیشہ سر کو ہمکن میں آئی ہے

گمان ہوتا ہے اُف ری کلام کی گرمی
زبانِ شعلہ اثرؔ کے دہن میں آئی ہے

اساتذۂ غزل

(۲)

سراج دکنی

○

لیا ہے نقدِ جانِ بلبلاں، یعنی خراج اپنا
چلایا خسروِ گل نے اسی رنگوں رواج اپنا

اے غم! صبح آنے کی خبر ہے سرو قامت کی
قیامت کل تو آتی ہے، عمل کر لے تو آج اپنا

لگا کر مالکہ جوگن ہوئی تیری باغ کو تج کر
مگر کوئی سرو قد کے واسطے چھوڑے ہے راج اپنا

ترا غم زہر تھا پر نوشِ دارو جان کر کھایا
کیا ہے اپنے ہاتھوں دل ہمارے نے علاج اپنا

وہ ظالم ہم کو جلتا دیکھ کر اتنا بھی نہیں کہتا
کہ کیا ثابت قدم ہے، کیوں نہ ہو آخر سراج اپنا

○

خبر تہیۂ عشق سن نہ جنوں رہا، نہ پری رہی
نہ تو تُو رہا، نہ تو مَیں رہا، جو رہی سو بیخبری رہی

شہِ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی، نہ جنوں کی جامہ دری رہی

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زباں سے کروں بیاں
کہ شرابِ حسرت و آرزو خمِ دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتابِ عقل کی طاق پر جو دھری تھی سو وہ دھری رہی

ترے جوشِ حیرتِ حُسن کا اثر اس قدر ہے یہاں ہوا
کہ نہ آئینے میں جلا رہی، نہ پری میں جلوہ گری رہی

کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراج کو
نہ خطر رہا نہ حذر رہا، جو رہی سو بے خطری رہی

شاہ مبارک آبروؔ

○

جان! اگر دشمن ہوئے ہو تم ہمارے اس قدر
تو ہمارے دل کو کیوں لگتے ہو پیارے اس قدر

کاہ گاہے پیار کی آنکھوں سے کرتا ہے نگاہ
مہرباں ہوتا چلا ہے اب تو بارے اس قدر

دیکھنے کو دوڑتے ہیں لوگ بھونچپا سمجھ
آہ سے دل کے نکلتے ہیں شرارے اس قدر

عاجزوں کو بے گنہ آزار دینا خوب نہیں
ڈر خدا سے! آبروؔ کو مت ستا رے اس قدر

○

دیکھو تو جان! تم کو مناتا ہوں کب ستی
بولو خدا کے واسطے! اک لال لب ستی

یہ جانو ہر ایک سے لالچ نہیں ہے خوب
ہے بھیک مانگ کھانا بھلا اس کسب ستی

پانی میں ڈوب، آگ میں جل کر مرو، پن ایک
عاشق نہ ہو، پکار کے کہتا ہوں سب ستی

باندھا ہے برگِ تاک کا کیوں سر پہ سیرا
کیا آبروؔ کا بیاہ ہے بنت العنب ستی

شاہ حاتم

○

عاشق کا جہاں میں گھر نہ دیکھا
ایسا کوئی دربدر نہ دیکھا

جیسا کہ اُڑے ہے طائرِ دل
ایسا کوئی تیز پر نہ دیکھا

خوبانِ جہاں ہوں جس سے تسخیر
ایسا کوئی ہم ہُنر نہ دیکھا

اس تیغ نگہ سے ہو مقابل
ایسا کوئی بے جگر نہ دیکھا

جو آب ہے آبرو میں حاتم!
ایسا کوئی ہم گہر نہ دیکھا

○

تمہارے عشق میں ہم ننگ و نام بھول گئے
بہاں کے کام تھے جتنے، تمام بھول گئے

گئے تھے زعم میں اپنے پر اس کو دیکھتے ہی
جو دل نے ہم سے کہے تھے پیام بھول گئے

تری طرف ہوئی صورت گرانِ چیں کی نگاہ
قلم کو ہاتھ سے رکھ، اپنا کام بھول گئے

تری یہ زلفِ گرہ گیر دیکھ کر صیاد
شکار آپ ہوئے، صید و دام بھول گئے

بڑا غضب ہے کہ حاتم کو تم نہ پہچانا
وہی قدیم تمہارا غلام بھول گئے

اشرف علی خان فغاںؔ

○

کہتے ہیں: فصلِ گُل تو چمن سے گُذر گئی
اے عندلیب! تو نہ قفس بیچ مر گئی

شکوہ تو کیوں کرے ہے مرے اشکِ سُرخ کا
تیری کب آستیں مرے لوہو سے بھر گئی

تنہا اگر میں یار کو پاؤں، تو یُوں کہوں
انصاف تو نہ چھوڑ، مروّت اگر گئی

مجھ سے جو پُوچھتے ہو، تو ہر حال شکر ہے
یُوں بھی گزر گئی مری، دوں بھی گزر گئی

آخر فغاںؔ وُہی ہے، اسے کیوں بھُلا دیا
وہ کیا ہوئے تپاک، وہ اُلفت کدھر گئی!

○

ظالم! تجھے قسم ہے، جو اس کو جلا نہ دے
یہ دل بھی دل نہ ہووے، جو تجھ کو دُعا نہ دے

قاتل کے کیوں قدم سے تڑپ کر پڑا ہے دُور
بسمل! تو اپنے ہاتھ سے شرطِ وفا نہ دے

بے طرح جوشِ گُل نے چمن میں لگائی آگ
ڈرتا ہوں آشیانے کو کافر جلا نہ دے

تیرے ہی دل سے پُوچھیے اس غم کو ہاں فغاںؔ
الفت بُری بلا ہے، کسی کو خُدا نہ دے

میرزا مظہر جانِ جاناں

○

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے! بس چلتا نہیں، کیا مفت جاتی ہے بہار

لالہ و گل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور
کیا قیامت ہے مؤوں کو بھی ستاتی ہے بہار

نرگس و گل کی کھلی جاتی ہیں کلیاں دیکھو سب
پھر انہیں خوابیدہ فتنوں کو جگاتی ہے بہار

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن میں لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں، آتی ہے بہار

شاخِ گل ہنتی نہیں پر بلبلوں کو باغ میں
ہاتھ اپنے کے اشارے سے بلاتی ہے بہار

○

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اس کو داغ و دل رہا ہے

نہ تو ملنے کے اب قابل رہا ہے
نہ مجھ کو وہ داغ و دل رہا ہے

نہیں آتا کسی تکیہ اُپر خواب
یہ سر پاؤں سے تیرے ہل رہا ہے

خدا کے واسطے! اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

میر سوز

○

یہ تیرا عشق کب کا آشنا تھا
کہاں کا جان کو میری دھرا تھا

وہ ساعت کون سی تھی یا الٰہی!
کہ جس ساعت دوچار اس سے ہوا تھا

مَیں کاش! اس وقت آنکھیں موند لیتا
کہ میرا دیکھنا، مجھ پر بلا تھا

میں اپنے ہاتھ اپنے دل کو کھویا
خداوندا! مَیں کیوں عاشق ہُوا تھا

ولے کیا آن تھی، اللہ اللہ!
کہ جس عمزے سے چھاتی پر چڑھا تھا

وہ مجھ کو ذبح کرتا تھا چھُری سے
میں اس کی تیز دستی تک رہا تھا

نہ تھا اس وقت جُز اللہ، کوئی
ولے یہ سوز پہلو میں کھڑا تھا

○

مری جان جاتی ہے، یارو! سنبھالو!
کلیجے میں کانٹا چُبھا ہے، نکالو

نہ بھائی مجھے زندگانی نہ بھائی
مجھے مار ڈالو، مجھے مار ڈالو

خدا کے لئے! اے مرے ہم نشینو!
یہ بانکا جو جاتا ہے اس کو بُلالو

اگر وہ نہ آوے تمہارے کہے سے
تو منت کرو، گھیرے گھیرے بُلالو!

اگرچہ خفا ہو کے وُہ گالیاں دے
تو دم لے رہو، کچھ نہ بولو نہ چالو

کہو: ایک بندہ تمہارا مرے ہے
اسے جاں کنی سے تو جا کر بچالو!

جلوں کی بُری آہ ہوتی ہے پیارے
تم اس سوز کی اپنے حق میں دُعا لو

قائم چاندپوری

○

ہو گر ایسے ہی مری شکل سے بیزار بہت
تم سلامت رہو! بندہ کے خریدار بہت

بعد مرنے کے جو غصّہ آئی، تو جھگڑا کیا ہے
تم کو خواہندہ بہت ہم کو طرحدار بہت

سچ کہو، قتل پہ کس کے یہ کمر باندھی ہے
ان دنوں ہاتھ میں تم رکھتے ہو تلوار بہت

قائم آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری
مر چکے ہیں اسی آزار کے بیمار بہت

○

رکھتا ہے جو تو صفائے عارض
موتی نے کہاں یہ پائے عارض

اک صافیٔ تن ہے گل میں بھی لیک
ایسا وہ کہاں سے لائے عارض

اس سینے سے منہ رگڑ نہ اے داغ
اس کی تھی کبھو یہ جائے عارض

بیانے میں مہر و ماہ دِتے بھے
تیرا ہو جہاں بہائے عارض

کس سے کہوں اس کے منہ کا نقشہ
اے وائے جبیں وہائے عارض

کیا دور، جو حشر ہووے قائم
کہہ ماٹ جو وُہ دکھائے عارض

انعام اللہ خاں یقینؔ

○

سرِ پیسلطنت سے آستانِ یار بہتر تھا
ہمیں ظلِ ہُما سے سایۂ دیوار بہتر تھا

مجھے زنجیر کرنا کیا مناسب تھا بہاراں میں
کہ گُل ہاتھوں میں اور پاؤں میں میرے خار بہتر تھا

ہموں نے ہجر سے کچھ دیں ہیں دھوکے بہت دیکھے
ہائے حق میں اس لعنت سے وہ آزار بہتر تھا

مرا دل مر گیا جس دن سے نظارہ سے باز آیا
یقیںؔ پرہیز اگر کرتا، تو وہ بیمار بہتر تھا

○

اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے
بُرا بُرا نہیں یہ شغل، کچھ بھلا بھی ہے

اس اشک و آہ سے سودا بگڑ نہ جائے کہیں
یہ دل کچھ آب رسیدہ ہے کچھ جلا بھی ہے

یہ آرزو ہے کہ اس بے وفا سے یہ پُوچھوں
کہ میرے بے مزہ رکھنے میں کچھ مزا بھی ہے

یہ کون ڈھب ہے بجز خاک میں ملانے کا
کسو کا دل کبھو پاؤں تلے ملا بھی ہے

یقیںؔ کا شور جنوں سُن کے یار نے پوچھا
کوئی قبیلہ مجنوں میں کیا رہا بھی ہے

خواجہ احسن اللہ بیانؔ

○

مَیں ترے ڈر سے رو نہیں سکتا
گردِ غم دل سے دھو نہیں سکتا

شب مرا شورِ گریہ سُن کے کہا
اس کے ہاتھوں میں سو نہیں سکتا

مصلحت ترکِ عشق ہے ناصح
لیک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا

جوں مسلسل بیانؔ کہے ہے سخن
کوئی موتی پرو نہیں سکتا!

○

جو ہوتا ہے ریحان و سُنبل کے صدقے
نہ ہوں کیونکہ اس زلف و کاکل کے صدقے

خزاں میں بھی چھوڑا نہ طوفِ چمن کو
غرض ہو جئے عشقِ بلبل کے صدقے

جلو میں پھرے ہیں پری زاد لڑکے
دوانے ترے اس تجمّل کے صدقے

ابھی وعدہ کر کر، لگا سوچنے تُو
نہیں یاد گویا، تامّل کے صدقے

بیانؔ کون ہے؟ اب تلک پُوچھتے ہو
تغافل کے قرباں، تجاہل کے صدقے

ہدایت خاں ہدایت

○

پہنچے ہے فصلِ گل کوئی حسن نگار کو
کھڑے ہے پہ اس کے صدقے کیا نوبہار کو

کس دل جلے کی آگ لے گزری چمن میں آج
دیکھا عرق فشاں میں نسیم بہار کو

لازم ہے دستگیری افتادگاں نسیم!
لے پہنچ اس گلی کے تئیں مجھ غبار کو

نالے سے میرے اور تو اب چاہتا ہے کیا
پانی تو کر دیا ہے دل کوہسار کو

اللہ رے کارخانۂ تقدیر ذوالجلال
یہ اعتبار، ہستیٔ بے اعتبار کو

○

رہا مرتے مرتے مجھے غم اسی کا
نہیں بعد میرے کوئی بے کسی کا

کیا تیغ قاتل نے جب کام اپنا
میں منہ دیکھتا رہ گیا بے بسی کا

عبث ہے غرض ان بتاں سے بھی ملنا
نہیں آج دنیا میں کوئی کسی کا

کیا حسن سے اس نے آگاہ اس کو
الٰہی! ہو خانہ خراب آرسی کا

ہدایت کہا ریختہ جب سے ہم نے
رواج اٹھ گیا ہند سے فارسی کا

میر محمّدی بیدار

○

ہم پہ سو ظلم و ستم کیجئے گا
ایک ملنے کو نہ کم کیجئے گا

گر یہی زلف و یہی مکھڑا ہے
غارتِ دیر و حرم کیجئے گا

جی میں ہے آج بجائے مکتوب
یہی بیت اس کو رقم کیجئے گا

مہربانی سے پھر اے بندہ نواز!
کہئے! کس روز کرم کیجئے گا

○

تیری ہم خاطرِ نازک سے خطر کرتے ہیں
ورنہ یہ نالے تو پتھر میں اثر کرتے ہیں

دل دو دیں تھا سو لیا، اور بھی کچھ مطلب ہے
بار بار آپ جو ادھر کو نظر کرتے ہیں

کیا ہو گر ایک گھڑی یاں بھی کرم فرما ہو
آپ اس راہ سے آخر تو گزر کرتے ہیں

تیرے ایامِ فراق اے صنم مہر گسل
آہ! مت پوچھ کہ کس طرح بسر کرتے ہیں

دن کو پھرتے ہیں تجھے ڈھونڈتے اور رات تمام
شمع کی طرح سے رو رو کے سحر کرتے ہیں

یہ وہی فتنہ و آشوب جہاں ہے بیدار
دیکھ کر پیر و جواں جس کو حذر کرتے ہیں

بس نہیں خوب کہ ایسے کو دل اپنا دیجے
آگے تو جان میاں! ہم تو خبر کرتے ہیں

میر عبدالحیّ تاباںؔ

○

رہتا ہے خاک و خوں میں سدا لوٹتا ہُوا
میرے غریب دل کو الٰہی! یہ کیا ہُوا

مَیں اپنے دل کو غنچۂ تصویر کی طرح
یارب! کبھی خوشی سے نہ دیکھا کھلا ہُوا

تو دیکھ مجھ کو نزع میں مت کر ستم کہ تیرے یار
مُجھ سے بہت ہیں ایک نہ ہوگا، تو کیا ہُوا

ہر دم کروں نہ کیونکہ گریباں کو اپنے چاک
آتا ہے یاد یار کا جامہ چسا ہُوا

تاباںؔ کے دیکھنے سے بُرا مانتے تھے ہم
کھو دی بہار خط نے تمہاری، بھلا ہُوا

○

آئی بہار شورشِ طفلاں کو کیا ہُوا
اہلِ جنوں کدھر گئے، یاراں کو کیا ہُوا

غنچے لہو میں تر نظر آتے ہیں تہ بہ تہ
اس رشکِ گُل کو دیکھ، گلستاں کو کیا ہُوا

اس جامہ زیب غنچہ دہن کو چمن میں دیکھ
حیراں ہوں مَیں کہ گل کے گریباں کو کیا ہُوا

آنے سے تیرے خط کے یہ کیوں ہے گرفتہ دل
بتلا کہ تیری زلفِ پریشاں کو کیا ہُوا

روتے ہی تیرے غم میں گزرتی ہے اس کی عُمر
پُوچھا کبھی نہ تو نے کہ تاباںؔ کو کیا ہُوا

میر اثرؔ

○

ہم ہیں بے دل، دل اپنے پاس نہیں
آہ! اس کا بھی تجھ کو پاس نہیں

بے وفا کچھ نہیں تری تقصیر
مجھ کو میری وفا ہی راس نہیں

قتل میرا ہے، تیری بدنامی
جان کا ورنہ کچھ ہراس نہیں

تُو ہی بہتر ہے ہم سے آئینے
ہم تو اتنے بھی رُوشناس نہیں

یُوں خدا کی خُدائی برحق ہے
پر اثرؔ کی ہمیں تو آس نہیں

○

دل میں ہے جَور تجھ سے از سرِ نو یاد کریں
تُو سُنے یا نہ سُنے، نالہ و فریاد کریں

ان بُتوں کی ہے بڑی دوڑ یہی دل شکنی
یہ کہاں، جو یہ کسی دل کے تئیں شاد کریں

ہم اسیروں کی اسے چاہئے خاطر داری
اور الٹی نہ کہ ہم خاطرِ صیاد کریں

آپ کے دل سے بھلا ٹک تو نکل جائے غبار
اور بھی جی میں جو کچھ ہووے سو ارشاد کریں

جعفر علی حسرت

○

خدا حافظ ہے کیوں محفل میں اس کا نام آیا تھا
تڑپنے سے ابھی دل کو مرے آرام آیا تھا

فلک اک دم بھی تو نے وصل کی شب کو نہ ٹھہرایا
یہ ساری عمر میں تجھ تک ہمارا کام آیا تھا

بہاریں بھول گئیں، پر یاد ہے اتنا کہ گلشن میں
گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا

نہیں معلوم کیا تھا، جو سحر تک شمع رویا کی
کچھ اپنا حال پروانہ سنانے شام آیا تھا

ہوا البرز جام زندگی جس وقت اے حسرت
دریغ! اس وقت میں ساقی پلانے جام آیا تھا

○

کس کا ہے جگر، جس پہ یہ بیداد کرو گے
لو! دل تمہیں ہم دیتے ہیں، کیا یاد کرو گے

دل لینے کو اوروں سے بھی کہہ دیکھو بھلا کچھ
لاویں گے بجا ہم تو، جو ارشاد کرو گے

بے خوابی و حیرانی و طغیانیٔ گریہ
سب آنکھوں پہ ہم لیں گے جو امداد کرو گے

تاراج کیا صبر و دل و جان، پھر آگے
کیا خاک ہے مجھ میں جسے برباد کرو گے

کہہ دیجو صبا تک تو جوانانِ چمن سے
فرصت ہے کسی دل کو اگر شاد کرو گے

پانی کریں پتھر کو بھی حسرت کی یہ آہیں
دل اپنا بتاں تم تئیں فولاد کرو گے

سعادت یار خاں رنگین

○

دل تھا جو بساط اپنی، سو گذران چکے ہیں
ہاں سیر کریں، جی میں یہ اب ٹھان چکے ہیں

ست پوک! ادھر دیکھ! یہ ہے مفت کا سودا
ک بوسہ پہ دین و دل و ایمان چکے ہیں

سو بار کہا آؤں گا، اور آئے نہ پھر گز
د عہد ہو تم، ہم تمہیں پہچان چکے ہیں

پھر جل نہیں کچھ فائدہ، بس سونے دے رنگین
دو سنہ پہ دوپٹے کے تئیں تان چکے ہیں

○

تجھ سے جس وقت کہ خالی یہ مکاں رہتا ہے
مجھ کو تنہائی میں پہروں خفقاں رہتا ہے

شکوہ ہم کرتے ہیں کیوں رسم ہے دُنیا کی یہی
دل جو لگتا ہے، تو پھر پاس کہاں رہتا ہے

جو ترے پاس سے آتا ہے، میں پُوچھوں ہوں یہی
کیوں جی! کچھ ذکر ہمارا بھی وہاں رہتا ہے

پنکھڑی گُل کی جو کروٹ تلے اس کے آئے
نازک اتنا ہے بدن اس کا، نشاں رہتا ہے

ق

اس ستمگر سے ہمارے جو کسی نے پوچھا
کوئی رنگین بھی ترے کوچہ میں یاں رہتا ہے

تو کچھ اک تاؤ سا کھا، چین بجبیں ہو کے وہیں
گالی دے کر یہ کہا اس نے کہاں رہتا ہے

شاد نصیر

○

کب دل نہیں بھولوں سے ہمارا ہمہ تن چشم
نظارۂ ساقی کو ہے مینا ہمہ تن چشم

تو غنچہ چمن آرا ہے کہ ہر دستۂ نرگس
دیکھے ہے ترا بن کے تماشا ہمہ تن چشم

بُت کو اُلٹ منہ سے جو کرتا ہے تو باتیں
اب میں ہمہ تن گوش بنوں یا ہمہ تن چشم

کیا خاک ہو صیاد مجھے چشم رہائی
حلقوں سے بنا دام ہے تیرا ہمہ تن چشم

آنکھوں کے تصور میں نصیر اس کی شب و روز
دل صورتِ آئینہ ہے اپنا ہمہ تن چشم

○

قدم نہ رکھ مرے چشمِ پُر آب کے گھر میں
بھرا ہے موج کا طوفاں حباب کے گھر میں

کہے ہے دیکھ کے وہ عکسِ رُخ بہ ساغرِ مے
نزولِ ماہ ہوا آفتاب کے گھر میں

مدام رند کریں کیوں نہ آستاں بوسی
حرم ہے شیخِ مشیخت مآب کے گھر میں

ہمارے دل میں کہاں آبلے ہیں اے ساقی
چُنے ہوئے ہیں یہ شیشے شراب کے گھر میں

دلا نہ کیونکہ کروں اختلاط کی باتیں!
حجاب کیا ہے اب اس بے حجاب کے گھر میں

نصیر دیکھ! تو کیا جلوۂ خدائی ہے
ہمارے اس بُتِ خانہ خراب کے گھر میں

میر نظام الدّین ممنونؔ

○

بندہ ہوں حسن صورت و عشقِ مجاز کا
ہر آئینہ میں جلوہ ہے اُس جلوہ ساز کا

سے آہ بے ادب نہ اسے پھونکیو کہ ہے
واں جلوہ گاہ، پردہ نشینانِ راز کا

ہے آستانِ دیر پہ اپنی نشست و خاست
کب ہو حرم میں ہم کو ارادہ نماز کا

واں جان تک بھی دے چکے پروا ہی واں نہیں
جھگڑا چکے گا کیوں کہ یہ ناز و نیاز کا

ممنونؔ دل ستم زدہ ہے عشق کا حریف
یاں ہے دو چار صعوۂ بے بال، باز کا

○

ہم سے کتنے بے دلوں کی کب ہے منزل تک پہنچ
یار گو دل میں ہے، پر ہم کو کہاں دل تک پہنچ

کشتیٔ طاقت شکستہ اور بحرِ غم کا جوش
مژدہ نومیدی نہیں اب اپنی ساحل تک پہنچ

دشتِ تنہائی میں صحرا گرد ہے، جُوں گرد باد
مشت خاکِ قیس کی مشکل ہے محمل تک پہنچ

صید گاہِ شوق میں کیا بے ادب وُہ صید ہے
جو کہ جاتا ہے تڑپ کر پائے قاتل تک پہنچ

کرامت علی شہیدی

ہزار مرتبہ دیکھا ستم جدائی کا
ہنوز حوصلہ باقی ہے آشنائی کا

پری اٹھی مرے پہلو سے بارہا ناکام
فریفتہ ہوں تری طرزِ دل رُبائی کا

مجھے عذابِ جہنم کہ بُت پرست ہُوں میں
وہ بت بہشت میں دعویٰ جسے خدائی کا

فضائے باغ سے ہے گوشۂ قفس بہتر
کہ اپنے دل میں نہ ہو دغدغہ رہائی کا

ادب نہ وادیٔ وحشت کے مجھ سے ترک ہوئے
جنوں میں ہوش رہا ہے برہنہ پائی کا

نگاہ، خندہ، تغافل عتاب کمنہ ہوئے
نکال طرز نیا کوئی دل رُبائی کا

بُتوں کا سجدہ مری سرنوشت میں کب تھا
کہ عزم کعبہ کے در پہ ہو جبہ سائی کا

اچک رہا ہے کھڑا بامِ عرش پر کم بخت
قلق ہے مجھ کو شہیدی کی نارسائی کا

جی چاہے گا جس کو، اُسے چاہا نہ کریں گے
ہم عشق و ہوس کو کبھی یک جا نہ کریں گے

اے کاش! چھٹیں عہد شکن بن کے جہاں میں
باز آئے؛ وفاداری کا دعویٰ نہ کریں گے

گو حُسن پرستی نہ ہو خاطر سے فراموش
خوش قامتوں کا یاد سراپا نہ کریں گے

نرگس کی شبِ تیرہ میں لوٹیں گے بہاریں
پر سُرمگیں آنکھوں کی تمنا نہ کریں گے

بہلائیں گے سیرِ گُل و شبنم سے دل اپنا
اس عارضِ گُل رنگ کی پروا نہ کریں گے

انگاروں پہ لوٹیں گے، پر ان شعلہ رُخوں کے
نظارہ سے ہم آنکھ بھی سینکا نہ کریں گے

عصمت کا انہیں خوف ہے، تقویٰ کا ہمیں پاس
نے کی ہے کبھی خواہشِ بے جا، نہ کریں گے

بکنے کے شہیدی کے بُرا مانیو مت جان!
ہیں عاشقِ صادق کبھی ایسا نہ کریں گے

وزیر لکھنوی

○

چلے دو دل راحت طلب! کیا شادماں ہو کر
زمیں تو سے جاناں بیٹھ دے گی آسماں ہو کر

کبھی یاد تو قتل عاشقاں کو منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو، یوسفِ بے کارواں ہو کر

کیا قتل اُس نے غیروں کو مُوئے ہم رشک کے مارے
اجل بھی در ستو! آئی نصیبِ دشمناں ہو کر!

بناوٹ نے بگاڑا، باتیں سُنوائیں خموشی نے
نہ پوچھو ہم نے کیا ہی منہ کی کھائی بے زباں ہو کر

دو پیاسا ہوں، لگا کر تیغ پُر آب اُس نے جب کھینچی
نکل آئی دہان زخم سے سُوکھی زباں ہو کر

ادا سے جُھک کے ملتے ہو، نگہ سے قتل کرتے ہو
تم ایجاد ہو، ناوک لگاتے ہو، کماں ہو کر

○

سر مرا کاٹ کے پچھتائیے گا
جُھوٹی پھر کس کی قسم کھائیے گا

کیا گریباں نے گلا گھونٹا ہے
ادھر اے دستِ جنوں آئیے گا

آپ کہتے ہیں کہ جا، جاتا ہوں
پر اکیلے بھی تو گھبرائیے گا

تھام لوں دل کو ذرا ہاتھوں سے
ابھی پہلو سے نہ اُٹھ جائیے گا

کہئے! یارانِ عدم، کیا گذری
کچھ لبِ گور سے فرمائیے گا

مردم چشم سے گر آئے حجاب
آنکھ کے پردے میں چھپ جائیے گا

ہم بھی آنکلیں گے مسجد میں وزیر
نشۂ خم لے کے جو بنوائیے گا

صبا لکھنوی

○

واعظ کے میں ضرور ڈرانے سے ڈر گیا
جامِ شراب لائے بھی ساقی کدھر گیا

بلبل کہاں، بہار کہاں، باغباں کہاں
وہ دن گزر گئے۔ وہ زمانہ گذر گیا

ایسی ہوا چلی مری آہوں کی رات کو
سب آسماں پہ نقشِ نجم بکھر گیا

اچھا ہوا جو ہو گئے وحدت پرست ہم
فتنہ گیا، فساد گیا، شور و شر گیا

کیسے کہ سمت سجدہ کیا دل کو چھوڑ کر
تو کس طرف تھا دھیان ہمارا کدھر گیا

پھر سیرِ لالہ زار کو ہم اے صبا چلے
آئی بہار، داغِ جنوں پھر ابھر گیا

○

تری طرف سے دلِ اے جانِ جاں اُٹھا نہ سکے
بہت ضعیف تھے بارِ گراں اُٹھا نہ سکے

ہزار بار بہار آئی، لیکن اے صیاد
نگاہ ہم طرفِ بوستاں اُٹھا نہ سکے

اسیرِ زلف جو مرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں
ذرا بھی صدمۂ قیدِ گراں اُٹھا نہ سکے

سنیں جو یار کی باتیں غش آگیا ہم کو
یہ ناتواں تھے کہ لطفِ بیاں اُٹھا نہ سکے

دیا شنکر نسیم

○

جب ہو چکی شراب، تو میں مست مر گیا
شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا

نے قاصدِ خیال نہ پیکِ نظر گیا
اُن تک میں اپنی آپ ہی لے کر خبر گیا

سمجھا ہے حق کو اپنے ہی جانب ہر ایک شخص
یہ چار سُو کے ساتھ چلا، جو جدھر گیا!

طوفانِ نوح اس میں ہو یا شورِ حشر ہو
ہونا جو کچھ ہے ہوگا، جو گزرا، گزر گیا

میں نے بھی آنکھیں دیکھی ہیں یوں کی جاؤ بھی
تم نے دکھائی آنکھ مجھے اور میں ڈر گیا!

گزرا جہاں سے میں تو کہا سُن کے یار نے
فتنہ گیا، فساد گیا، دردِ سر گیا!

کاغذ سیاہ کرتے ہو کس کے لئے نسیمؔ
آیا جواب خط تمہیں اور نامہ بر گیا

○

خم نہ بن کر خود عرض ہو جائیے
مثلِ ساغر اور کے کام آئیے

ابرِ رحمت سُنتے ہیں نام آپ کا
خاکساروں پر کرم فرمائیے!

آپ آہُو چشم ہیں، آہُو نہیں!
ہم سے وحشت کی نہ لیجے، آئیے!

صبر رخصت ہو تو جانے دیجئے
بے قراری آئے، تو ٹھہرائیے

جوہرِ تیغِ نگہ کھل جائے گا!
منہ نہ میرے زخم کا کھلوائیے

دل میں ہے دکھلائیے تاثیرِ عشق
ٹھنڈی سانسوں سے انہیں گرمائیے

سرد آہیں بھرتے ہیں جب ہم نسیمؔ
کہتے ہیں وہ! ٹھنڈے ٹھنڈے جائیے

رندؔ لکھنوی

○

رکھو خدمت میں مجھ سے کام تو لو
بات کرتے نہیں سلام تو لو

بات تم نے نہیں کی غیر سے کل
سر پہ اللہ کا کلام تو لو!

ناز و انداز و حسن و خوبی میں
کون ہے تم سا، اس کا نام تو لو

رندؔ حاضر ہیں شیشہ و ساغر
مے نہ سمجھو اگر حرام، تو لو!

○

مجھے دے کے دل، جان کھونا پڑا ہے
غرض ہاتھ دونوں سے دھونا پڑا ہے

جو رونا یہی ہے، تو پھوٹیں گی آنکھیں
مجھے اب تو آنکھوں کا رونا پڑا ہے

کئے سینکڑوں گھر محبت نے غارت
نئو جس محلے میں، رونا پڑا ہے

میں پاتا نہیں دل کو سینے میں اپنے
کئی دن سے خالی یہ کونا پڑا ہے

کرو چل کے آباد اب گور اے رندؔ!
بہت دن سے سونا وہ کونا پڑا ہے

نسیم دہلوی

(نواب اصغر علی خان)

○

نصل گل آئی ہے کل اور ہی ساماں ہوں گے
میرے داغ میں تیرے دست و گریباں ہوں گے

ب بکا فر ہیں، حسینوں کی نہ سُن تُو اے دل!
ہار دن جمع یہی دشمنِ ایماں ہوں گے

ں ہوں جانیں گے مانع ہے ہمیں خوفِ مزاج
لف پر ہم ہے، تو کچھ وہ بھی پریشاں ہوں گے

ر یہ انجام تبسم ہے، نہ ہنس اے غافل!
خون روئیں گے وُہی زخم جو خنداں ہوں گے

یاد آئے گا پسِ مرگ ہمارا یہ کمال
حال کھل جائے گا جب خاک میں پنہاں ہوں گے

خانہ زادوں کو کہاں قیدِ محبت سے فراغ
ہم وہ بلبل ہیں یہیں خاکِ گلستاں ہوں گے

دور ہر نخل کریں گے صفتِ گردِ نسیم
ہم پسِ مرگ بھی فتنہ ابنِ گلستاں ہوں گے

○

دیکھ اوقاتل! بسر کرتے ہیں کس مشکل سے ہم
چارہ گر سے دردِ ناداں درد سے دل، دل سے ہم

لنے کیا بے خود کیا ہے غمزۂ امید نے
ال دل کہتے ہیں اپنا پھر اسی قاتل سے ہم

رشکِ اعدا نے کیے روشن بدن میں استخواں
شمع محفل ہو کے اُٹھے آپ کی محفل سے ہم

اس کو کہتے ہیں وفاداری کہ بعد از قتل بھی
داغِ خوں ہو کر نہ چھوٹے دامنِ قاتل سے ہم

پشمِ روشن سے نظر آتے ہیں جلوے رُوح کے
حسن لیلےٰ دیکھتے ہیں پردۂ محمل سے ہم

خالی از احساں نہیں یہ بھی کہ وقتِ اضطراب
خوش تو ہو جاتے ہیں تیرے وعدۂ باطل سے ہم

آؤ آپس میں سمجھ لیں غیر کا ہے کو سُنے
تم کہو دل سے ہمارے کچھ تمہارے دل سے ہم

سُن کے رو دیتے ہیں اکثر صورتِ زخمِ جگر
آپ شرماتے ہیں اپنے خندۂ باطل سے ہم

شک ہے حسرت پہ اس کی دل میں آتا ہے یہی
اپنے قالب کو بدل لیں قالبِ بسمل سے ہم

سینہ و دل میں ہجومِ داغِ حسرت ہے نسیم
پھول چن لیتے ہیں اپنے گلشنِ حاصل سے ہم

ظہیر دہلوی

○

ساقیا! مر کے اٹھیں گے ترے مے خانے سے
عہد و پیماں ہیں یہی زیست میں پیمانے سے!

تو کہاں آئی مرا درد بٹانے کے لئے
اے شبِ ہجر! نکل جا مرے غم خانے سے

کون ہوتا ہے مصیبت میں کسی کا دل سوز
اٹھ گئی شمع بھی جل کر مرے کاشانے سے

کچھ یہی کوہ کن و قیس پہ گذری ہو گی!
ملتی جلتی ہے کہانی مرے افسانے سے

جبہ فرسائے در کعبہ تھے کل تک تو ظہیر
گرتے پڑتے ہوئے آج آتے ہیں میخانے سے

○

وہ نیرنگِ الفت کو کیا جانتا ہے
کہ اپنے سے مجھ کو جدا جانتا ہے

کچھ ایسی تو دشمن میں خوبی نہیں ہے
مگر تو خدا جانے کیا جانتا ہے

یہ منہ سے تو کہتا ہوں چھوڑی محبت
مگر حال دل کا خدا جانتا ہے

تمہاری شرارت کو کیا جانے کوئی
یہ میں جانوں یا دل مرا جانتا ہے

ظہیر اپنے عیبوں کو میں جانتا ہوں
زمانہ مجھے پارسا جانتا ہے

سالکؔ دہلوی

○

بھولا تو اُن پہ حشر میں وہمِ فغاں غلط
میں گفتگو کی تاب رکھوں، یہ گماں غلط

ہم بھی وہی کہو، تو کہیں سب بجا۔ درست
میں بھی وہی کہوں تو کہے اک جہاں غلط

گرمی سے اُس کے حسن کی، جس کا جگر جلا
تشبیہ مہر و روئے نکوئے بتاں غلط

کہئے! اسیرِ خواہشِ سنبل کوئی ہوا
دیتی مثال کاکلِ عنبر فشاں غلط

سچ ہے کہ آدمی کو غرض آدمی سے ہے
واعظ! بیانِ دلکشیِ حورِ جناں غلط

کہہ کر تمام سالکِ غمگیں کا ماجرا
میں نے کہا غلط ہے، تو بولے کہ ہاں غلط

○

کچھ تغیر مرے احوالِ پریشاں میں نہیں
ایسے عالم میں ہوں جو عالمِ امکاں میں نہیں

صبحِ محشر بھی دکھائی نہیں دیتی یارب
روزِ بد بھی تو نصیب شبِ ہجراں میں نہیں

وحشتِ عشق کو ثابت قدمی بھی ہے سند
قیس کا نقشِ قدم تک تو بیاباں میں نہیں!

ہو گیا ذوقِ فنا ئے خلشِ یاد مٹا!
کون کہتا ہے کہ لذت ترے پیکاں میں نہیں

دشت و وحشت میں اُڑے پھرتے ہیں ہم اہلِ ہم ہے
جو صفت ضعف میں ہے تختِ سلیماں میں نہیں

میر مہدی مجروح

○

غیروں کو بھلا سمجھے اور مجھ کو بُرا جانا
سمجھے بھی تو کیا سمجھے، جانا بھی تو کیا جانا

اک عُمر کے دُکھ پائے سوتے ہیں فراغت سے
اے خفتگانِ محشر! ہم کو نہ جگا جانا

کیا یار کی بدخوئی کیا غیر کی بدخواہی
سرمایۂ صد آفت ہے دل ہی کا آ جانا

کچھ عرض تمنا میں شکوہ نہ ستم کا تھا
میں نے تو کہا کیا تھا اور آپ نے کیا جانا

چلمن کا اُلٹ جانا، ظاہر کا بہانہ ہے
ان کو تو بہر صورت اک جلوہ دکھا جانا

ہے حق یہ طرف اس کے چاہے سو ستم کر لے
اُس نے دلِ عاشق کو مجبورِ وفا جانا

انجام ہُوا اپنا آغازِ محبت میں
اس شغل کو جاں فرسا ایسا تو نہ تھا جانا

مجروح ہوئے مائل کس آفتِ دوراں پر
اے حضرتِ من تم نے دل بھی نہ لگا جانا

○

گریباں چاک ہیں گُل بوستاں میں
اثر کتنا ہے بلبل کی فغاں میں

قفس صیاد کا خالی پڑا ہے
نہ ہوں بے چین کیونکر آشیاں میں

دُعائے وصل جا اب تو اثر تک
کئے نالوں نے روزن آسماں میں

سُنے گر طالعِ خفتہ کا قصہ
تو نیند آ جائے چشمِ پاسباں میں

زلیخا کی مچی جاتی ہیں آنکھیں
کہیں یوسف نہ ہو اس کارواں میں

تمام اسبابِ دُنیاوی کے بدلے
ہے اک بے رونقی اپنی دُکاں میں

سُنا حالِ دلِ مجروح شب کو
کوئی حسرت سی حسرت تھی بیاں میں

جلالؔ لکھنوی

○

وہ دل نصیب ہوا جس کو داغ بھی نہ ملا
ملا وہ غم کدہ، جس میں چراغ بھی نہ ملا

کئی تھی کہکے میں لاتی ہوں زلفِ یار کی بُو
چری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا

اسیر کرکے ہمیں، کیوں رہا کیا صیاد
وہ ہم صفیر بھی چھوٹے، وہ باغ بھی نہ ملا

بتوں کے عشق میں کیا ہوتی ہم سے یادِ خدا
تو دل بھی تھا نہ ٹھکانے، دماغ بھی نہ ملا

دکھائیں یار کو کیا جسمِ داغدار کی سیر
نظر فریب ہمیں ایک داغ بھی نہ ملا

بھرا ہے محفلِ ساقی میں کیوں نہ آنکھ اپنی
وہ بے نصیب ہیں خالی ایاغ بھی نہ ملا

چراغ لے کے ارادہ تھا بخت کو ڈھونڈیں
شبِ فراق تھی، کوئی چراغ بھی نہ ملا

خبر کو یار کی بھیجا تھا، گم ہوئے ایسے
حواسِ رفتہ کا اب تک سُراغ بھی نہ ملا

جلالؔ باغِ جہاں میں وہ عندلیب ہیں ہم
چمن کو پھول ملے، ہم کو داغ بھی نہ ملا

○

نہ ٹھہری جب کوئی تسکین دل کی شکل یاروں میں
تو آنکھیں تڑپ کر ہم تمہارے بے قراروں میں

کسی کے عشق میں دردِ جگر سے دل یہ کہتا ہے
ادھر بھی آنکلنا ہم بھی ہیں امیدواروں میں

وہ ماتم بزمِ شادی ہے، تمہاری جس میں شرکت ہو
وہ مزا، زندگی ہے، تم جہاں ہو سوگواروں میں

تعلق سے یہ نفرت ہے کہ بعدِ مرگ خاک اپنی
اگر اُٹھتی بھی ہے جا بیٹھتی ہے خاکساروں میں

ہمارے دل نے ہم سے بے وفائی کرکے کیا پایا؟
وہاں بھی جاکے ٹھہرایا گیا بے اعتباروں میں

وہ کھینچوں گا جلالؔ آہیں کہ اس کی خاک اُڑادیں گی
فلک نے پیس ڈالا ہے سمجھ کر خاکساروں میں

تسلیم لکھنوی

وصل کی شب بھی ادائے رسم حرماں میں رہا
صبح تک میں التماسِ شوق پنہاں میں رہا

مر گئے لاکھوں شہیدِ ناز کچھ پروا نہیں
وہ تماشائے ہلالِ عیدِ قرباں میں رہا

کام اپنا کر چکی بیماریٔ عشقِ بتاں
میں فریبِ نسخہ و تاثیرِ درماں میں رہا

واہ رے پاسِ وفا! اللہ ری شرمِ آرزو
ہر نفس ہمراہیٔ عمرِ گریزاں میں رہا

کیا پڑھے اشعار تسلیم جگر افگار نے
شورِ تحسیں ہر طرف بزمِ سخنداں میں رہا

کل مرا تھا، آج وہ بُت غیر کا ہونے لگا
وائے قسمت دو ہی دن میں کیا سے کیا ہونے لگا

یاد میری آ گئی، منہ پھیر کر رونے لگے
انجمن میں اُن کی جب ذکرِ وفا ہونے لگا

ہائے کب اُس نے نکالے اپنے پیکاں کھینچ کر
درد کی لذت سے جب دل آشنا ہونے لگا

آہ نے اتنی تو کی تاثیر پیدا شکر ہے
بام پر آنے لگے وہ، سامنا ہونے لگا

بام پر جب تک وہ مہرِ حُسن ہے سرگرمِ سیر
بھیڑ کیوں چھٹنے لگی، کیوں راستا ہونے لگا

خوب رویا بیٹھ کر دامانگی کی جان کو
جب مری نظروں سے پنہاں نافلا ہونے لگا

یہ بھی اے تسلیم ہے برگشتہ بختی کا اثر
جب دوا کی ہم نے درد دل سوا ہونے لگا

مرزا قادر بخش صابر

○

وہ دل کو محبت کے مزے آئے ہوئے ہیں
وہ بے خبی طبیعت پہ ابھی چھائے ہوئے ہیں!

مرنے پہ اظہار نزاکت ہے، حیا ہے!
قسمت ہے کہ تکلیف بھی کچھ پائے ہوئے ہیں

کچھ تم نے ہمیں دل میں سمجھ رکھا ہے سمجھو!
کچھ ہم بھی تمہیں ذہن میں ٹھہرائے ہوئے ہیں

پھر ملنے کو جی چاہتا ہے یار کا ہم سے
نا یار نہیں غصے میں قسم کھائے ہوئے ہیں!

للہ ہی ضد کو ٹھے کے پڑھنے کو کیا ترک!
جس روز سے ہم یار کے ہمسائے ہوئے ہیں

اب دل کو لگاتے ہیں ذرا سوچ سمجھ کر
دو چار جگہ پہلے جو زک پائے ہوئے ہیں

کچھ در پہ جھکائے ہوئے سر بیٹھے ہیں صابر
اس بزم سے شاید کہ نکلوائے ہوئے ہیں!

○

پہلے نہ اڑایا کسی بے کس کے جگر کو
پر ہم نے لگائے ہیں ترے تیرِ نظر کو

ہے تیرِ نگہ بزمِ عدو میں مری جانب
غصے میں چھپایا ہے محبت کی نظر کو

کیوں آتشِ گل باغ میں ہے تیز کہ ہم آپ
اٹھ جائیں گے اے شبنمِ شاداب! سحر کو

دن رات کا فرق ان کی محبت میں ہے اب تو
وعدہ تو کیا شام کا اور آئے سحر کو

دل چیز ہے کیا جان بھی دوں عشق میں صابر
میں نفع سمجھتا ہوں مدام ایسے ضرر کو

نظام رامپوری

○

کیوں کہتے ہو اعتبار میرا
معلوم ہے تم کو پیار میرا

یہ خیر ہے آج کچھ تو کہیئے!
کیوں ذکر ہے بار بار میرا

اک بات میں فیصلہ ہے تم سے
رنجیدہ ہے دل ہزار میرا

تیرا نہیں اعتبار مجھ کو!
تو بھی نہ کرا عتبار میرا

شاید کہ نہ ہو تم اپنے بس میں
دل پر تو ہے اختیار میرا

مجھ کو نہ ہو رشک غیر ممکن
تو اور ہو دوستدار میرا

کچھ سمجھے ہوئے ہیں اپنے دل میں
سنتے نہیں حال زار میرا

وہ ہائے بگڑ کے اس کا جانا
رونا وہیں زار زار میرا

کل تک تو نظام یہ نہ تھا حال
دل آج ہے بے قرار میرا

○

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ

بے ساختہ نگاہیں جو آپس میں مل گئیں
کیا منہ پہ اس نے رکھ لئے آنکھیں چرا کے ہاتھ

یہ بھی نیا ستم ہے حنا تو لگائیں غیر
اور اس کی داد چاہیں وہ مجھ کو دکھا کے ہاتھ

بے اختیار ہو کے جو میں پاؤں پر گرا
ٹھوڑی کے نیچے اس نے دھرا مسکرا کے ہاتھ

قاصد! ترے بیاں سے دل ایسا ٹھہر گیا
گویا کسی نے رکھ دیا سینے پہ آ کے ہاتھ

دیکھا جو کچھ رکا مجھے، تو کس تپاک سے
گردن میں میری ڈال دئے آپ آ کے ہاتھ

کوچے سے تیرے اٹھیں تو پھر جائیں ہم کہاں
بیٹھے ہیں یاں تو دونوں جہاں سے اٹھا کے ہاتھ

دینا وہ اس کا ساغر مے یاد ہے نظام!
منہ پھیر کر اُدھر کو، اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ!

بیانِ یزدانی

○

جھونکے آتے ہیں بوئے اُلفت کے
پھول یارب ہیں کس کی تربت کے

شور ہے دل میں غم کے نالوں کا
علم اٹھتے ہیں آج حسرت کے

تیری باتوں میں کیا حلاوت تھی
کہ نہ لب کھل سکے شکایت کے!

ہم پہ اور تیغِ ناز اُٹھ نہ سکے
جو چلے ہیں تری نزاکت کے

اے بیانؔ! قیس و وامق و فرہاد
ہیں یہ سارے مُرید حضرت کے

○

ترا کشتہ اُٹھایا اقربا نے
چلے محشر کو مٹی میں دبانے

نفس گم اور سخن باقی رہے گا
نہ ہوگا تار اور ہونگے ترانے

خدا ٹھنڈا رکھے اے شمع تجھ کو
کھڑی روتی ہے بیکس کے سرہانے

ترے چھنے سے سینے میں نہیں کے
اُٹھا اک درد محشر کے بہانے

ہیں نے پنجۂ دست جنوں سے
کئے ہیں کوہ کی چوٹی میں شانے

حفیظ جونپوری

○

دل اس لئے ہے دوست کہ دل میں رہے جائے دوست
جب یہ نہ ہو بغل میں ہے دشمن بجائے دوست

مٹنے کی آرزو ہے اسی راہگذار میں
اتنے مٹے کہ لوگ کہیں خاک پائے دوست

تقریر کا ہے خاص ادائے بیاں میں لطف
سنئے مری زبان سے کچھ ماجرائے دوست

سب کچھ ہے اور کچھ نہیں عالم کی کائنات
دنیا برائے دوست ہے عقبیٰ برائے دوست

○

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

نہیں مرتے ہیں تو ایذا نہیں جھیلی جاتی
اور مرتے ہیں تو پیماں شکنی ہوتی ہے

دن کو اک نور برستا ہے مری تربت پر
رات کو چادر مہتاب تنی ہوتی ہے

لٹ گیا وہ ترے کوچے میں رکھا جس نے قدم
اس طرح کی بھی کہیں راہزنی ہوتی ہے

ہجر میں زہر ہے ساغر کا لگانا منہ سے
مے کی جو بوند ہے ہیرے کی کنی ہوتی ہے

میکشوں کو نہ کبھی فکر کم و بیش ہوئی
ایسے لوگوں کی طبیعت بھی غنی ہوتی ہے

ہوک اٹھتی ہے اگر ضبط فغاں کرتا ہوں
سانس رکتی ہے تو برچھی کی انی ہوتی ہے

پی لو دو گھونٹ کہ ساقی کی رہے بات حفیظ
صاف انکار میں خاطر شکنی ہوتی ہے

بیخود بدایونی

○

دردِ دل میں کمی نہ ہو جائے
دوستی، دشمنی نہ ہو جائے

ہم مری دوستی کا دم نہ بھرو
تم کہیں مدعی نہ ہو جائے

بیٹھتا ہے ہمیشہ رندوں میں
کہیں زاہد ولی نہ ہو جائے

طالعِ بد وہاں بھی ساتھ نہ دے
موت بھی زندگی نہ ہو جائے

اپنی خوئے وفا سے ڈرتا ہوں
عاشقی بندگی نہ ہو جائے

کہیں بیخود تمہاری خودداری
دشمنِ بے خودی نہ ہو جائے

○

ساتھ ساتھ اہلِ تمنا کا وہ مضطر جانا
اللہ اللہ ترا بزم سے اٹھ کر جانا

رہبری کرکے مری خضر بھی چکر میں پڑے
اب انہیں جلوہ گہِ یار میں اکثر جانا

داغِ کم حوصلگی دل کو گوارا نہ ہوا
ورنہ کچھ ہجر میں دشوار نہ تھا مر جانا

سادگی سے یہ گماں ہے کہ بس اب رحم کیا
مطمئن ہوں کہ مجھے آپ نے مضطر جانا

نشہ میں بھی ترے بیخود کی تعلی نہ گئی
بادۂ ہوش ربا کو مئے کوثر جانا

وحید الدین سلیم

○

گریباں سے ترے کس نے نکالا صبحِ خنداں کو
کیا کس نے نہاں دامن کی کلیوں سے گلستاں کو

اڑایا چٹکیوں میں میرے ذرّے نے بیاباں کو
مرے قطرے نے پانی کر دیا ہر موجِ طوفاں کو

مری کشتی بھنور سے کھیلنے کا شوق رکھتی ہے
یہ کس نے کر دیا خاموش یارب موجِ طوفاں کو

یہ کیا نغمہ تھا چھیڑا جو کہ یک قلبِ مضطر نے
کہ میری نے نے رقصاں کر دیا سارے گلستاں کو

میں وہ ہوں قطرۂ شبنم کہ چمکا تیرے پرتو سے
لگی ہیں کھینچنے کرنیں مری مہرِ درخشاں کو

مرے ذوقِ فنا پر زندگی ہے خضر کی قرباں
مرتے تخیلِ غم میں ڈبو دو آبِ حیواں کو

کلیمِ طورِ معنی ہوں یدِ بیضا ہے میرا دل
منوّر کر دیا جس نے مرے چاکِ گریباں کو

○

مدت ہوئی ہے مدحِ حسیناں کئے ہوئے
نورِ سخن سے دل کو چراغاں کئے ہوئے

عرصہ ہوا ہے وصفِ بہارِ جمال سے
روئے ورق کو رشکِ گلستاں کئے ہوئے

برسوں ہوئے ہیں تذکرۂ سوزِ عشق سے
بزمِ سخنوری کو درخشاں کئے ہوئے

آتا ہے کس شکوہ سے وہ رشکِ آفتاب
ظلمتکدے دلوں کے چراغاں کئے ہوئے

جاتا ہوں کوئے یار کو دیکھ اے گھٹا مجھے
برپا ہجومِ اشک سے طوفاں کئے ہوئے

بیٹھے ہیں ہم تصورِ گیسوئے یار میں
اس زندگی کو خواب پریشاں کئے ہوئے

خوں کر کے لے چلا ہوں دل و جاں کو اپنے ساتھ
دیدارِ روئے یار کا ساماں کئے ہوئے

مر مٹنے اس ادا پہ کہ کچھ لوگ جل بجھے
سینے میں سوزِ عشق کو پنہاں کئے ہوئے

وہ نوبہارِ حسن ابھی اس راہ سے گیا
ہر نقشِ پا کو روضۂ رضواں کئے ہوئے

شوکت

سید کاظم علی شوکت بلگرامی

جب میں رویا ہوں وہ روئے ہیں یا الفت میرے ساتھ
بدلوں برسا کیا ہے ابرِ رحمت میرے ساتھ

جان جائے، یار ہے دل کو رہے گا پاسِ عشق
قبر میں جائیں گے تیرے رازِ الفت میرے ساتھ

دیتی ہے ترغیب نالے کی کہ ہو آزردہ دوست
دشمنی کرتی ہے اب میری محبت میرے ساتھ

میں تو ہوں دلدادۂ الفت کہو میں کیا کروں
دلربا ہو کر کرو تم جب یہ الفت میرے ساتھ

شکل تیری سامنے آنکھوں کے ہے آٹھوں پہر
یاد تیری ہے شریکِ رنج و راحت میرے ساتھ

بن گیا ہے تاب دل اک محشرستانِ خیال
خواب میں جب وہ ہوئے سرگرمِ الفت میرے ساتھ

یاد اب بھولے سے بھی صبح وطن آتی نہیں
ہو گئی مانوس ایسی شامِ غربت میرے ساتھ

دل میں دھڑکن، لب پہ نالے، چشم تر میں اشکِ خوں
کیا کہوں، کیا کر گئی تیری محبت میرے ساتھ

یاد آتا ہے یہ رفتارِ قمر کو دیکھ کر
سیر کرتا تھا وہ یوں ہی ماہ طلعت میرے ساتھ

تو ہے اور تیری نظر میں اک قیامت کا غرور
میں ہوں اور اک محشرِ ارمان و حسرت میرے ساتھ

وہ تو رخصت کر کے مجھ کو گھر میں جا بیٹھے مگر
یاد ان کی دور تک آئی تھی شوکت میرے ساتھ

لکھا ہے گو تری قسمت میں شوکت چشمِ تر رکھنا
مگر ظالم! کسی کی آبرو پر بھی نظر رکھنا

نہ بھولے گا نہ بھولے گا، قیامت تک نہ بھولے گا
کسی کا وہ محبت سے مرے سینہ پہ سر رکھنا

نہ اٹھے گا دلِ نازک سے صدمہ رنجِ فرقت کا
الٰہی میرے دردِ دل سے ان کو بے خبر رکھنا

وہ کیا جانے بھلا ہوتی ہیں کیسی عیش کی راتیں
میسر ہو نہ جس کو تا سحر تکیہ پہ سر رکھنا

دلِ بے آرزو کافی ہے ہم حسرت نصیبوں کو
مبارک موصدف کو اپنی مٹھی میں گہر رکھنا

نہ ہو کس طرح شرطِ دلبری دنیا میں دلداری
جہاں میں گھر بنانا سہل ہے مشکل ہے گھر رکھنا

محشر

مرزا کاظم حسین لکھنوی

مدتیں ہوگئی ہیں چپ رہتے
کوئی سُنتا تو ہم بھی کچھ کہتے

جل گیا خشک ہوکے دامنِ دل
اشک آنکھوں سے اور کیا بہتے

بات کی اور مُنہ کو آیا جگر
اس سے بہتر یہی تھا چپ رہتے

ہم کو جلدی نے موت کی مارا
اور جیتے، تو اور غم سہتے

سب ہی سنتے تمہاری اے محشر
کوئی کہنے کی بات اگر کہتے

دیر تک اُٹھ نہ سکا داں سے وہ دیوانۂ دوست
چھڑ گیا جب کہ کہیں بیٹھ کے افسانۂ دوست

آج اُٹھے جاتے ہیں درباں کی جفا سے لیکن
زندگی بھر کہیں چھٹتا ہے درِ خانۂ دوست

ہجر میں حالتِ دل کی ہیں وہ آنکھیں نگراں
دیکھی تھی جن سے کبھی رونقِ کاشانۂ دوست

راہ بر شوقِ دلی، سر پہ اجل، دل بے تاب
بے خبر یوں میں چلا ہوں طرفِ خانۂ دوست

آج کیوں حد سے سوا دل کو خوشی ہے محشر
کیا بلائے ہوئے جاتے ہو سوئے خانۂ دوست

مضطر خیرآبادی

دمِ خواب راحت بلایا انہوں نے تو دردِ نہاں کی کہانی کہوں گا
مرا حال سننے کے قابل نہیں ہے اگر ہل گئے تو زبانی کہوں گا

لبِ جوئے الفت سمائی ہے دھونی، یہاں قصۂ سخت جانی کہوں گا
ادھر آ ادھر روحِ شیریں ادھر آ، ترے کوہ کن کی کہانی کہوں گا

خضر! تیرے چشمہ کا پانی ہے اچھا، مگر میں اسے موجِ فانی کہوں گا
محبت کا مارا ہوا دل جلا دے میں تب تیرے پانی کو پانی کہوں گا

تری ذاتِ واحد ہے پیدا مطلق، تجھے کب کبھی نیند آتی نہیں ہے
تری آنکھ لگنے کی حسرت میں یارب! کہاں تک میں قصے کہانی کہوں گا

وہ اک آئنہ جس میں منہ دیکھتے ہیں کسی ایک کا وقفِ صورت نہیں ہے
یہیں سے تیجا اٹھا کر دوئی کا، میں وحدت کو کثرت کا بانی کہوں گا

یہ ہستی کا شیشہ جو تو نے دیا ہے ذرا اس پہ چابت کی صیقل تو کر لوں
یہ ہو جائے پھر اپنی ہستی کو میں بھی، تری ذات کا نقشِ ثانی کہوں گا

ازل ہی میں تجھ پر نظر پڑ چکی ہے نہ کر مجھ سے انکارِ جلوہ نمائی!
تجلی تری لو نئی روشنی ہے مگر میں تو اس کو پرانی کہوں گا

محبت میں انکارِ جلوہ نمائی ذرا اس حریفے کو تو یاد رکھنا
اگر میں کبھی تیرے خطبے پہ پہنچا، تو میں بھی یونہی لن ترانی کہوں گا

میں کیا بے وفا ہوں جو محشر میں مضطر خدا سے کروں شکوۂ قتلِ اپنا
زمانہ کہے خونِ ناحق بہایا، اگر مجھ سے پوچھا تو پانی کہوں گا!

غرورِ الفت کی طرزِ نازش عجب کرشمے دکھا رہی ہے
ہماری روٹھی ہوئی نظر کو تری تجلی منا رہی ہے

وہ طور والی تری تجلی، غضب کی گرمی دکھا رہی ہے
وہاں تو پتھر جلا دئے تھے یہاں کلیجہ جلا رہی ہے

ترے نشیمن میں شانِ قدرت کے سارے اسباب ہیں مہیا
ہوا صفائی پہ ہے مقرر، چراغ بجلی جلا رہی ہے

نہ اس کے دامن سے میں بجھا، نہ تیرے دامن سے یہ ہی اٹکی
ہوا سے میرا بگاڑ کیا ہے جو شمعِ تربت بجھا رہی ہے

فرشتے آئے اگر لحد میں، تو صاف کہہ دوں گا راستہ لو!
جب اس کی چاہت میں جان دے دی تو بات کہنے کو کیا رہی ہے

جمالِ قدرت تجھی کو دے دے کہ میں کلیجے کی چوٹ سیکوں
علیم کے گھر میں رکھے رکھے وہ آگ اب کیا بنا رہی ہے

شبلی نعمانی

تیس دن کیلئے ترک مے و ساقی کر لوں
واعظ سادہ کو روزوں میں تو راضی کر لوں

پھینک دینے کی کوئی چیز نہیں فضل و کمال
ورنہ حاسد! تری خاطر سے میں یہ بھی کر لوں

اے نگیریں! قیامت ہی پہ رکھو پرسش
میں ذرا عمر گذشتہ کی تلافی کر لوں

کچھ تو ہو چارۂ غم، بات تو یک سو ہو جائے
تم خفا ہو تو اجل ہی کو میں راضی کر لوں

اور پھر کس کو پسند آئے گا ویرانۂ دل
غم سے مانا بھی کہ اس گھر کو میں خالی کر لوں

دل ہی ملتا نہیں سفلی سے، وگرنہ شبلی
خوب گذرے فلک دوں سے جو یاری کر لوں

یار کو رغبتِ اغیار نہ ہونے پائے
گل تر کو ہوسِ خار نہ ہونے پائے

اس میں در پردہ سمجھتے ہیں وہ اپنا ہی گلہ
شکوۂ چرخ بھی زنہار نہ ہونے پائے

فتنۂ حشر جو آنا، تو دبے پاؤں ذرا
بختِ خفتہ مرا بیدار نہ ہونے پائے

ہائے دل کھول کے کچھ کہہ نہ سکے سوز دروں
آبلے ہم سخنِ خار نہ ہونے پائے

باغ کی سیر کو جاتے تو ہو، پر یاد رہے
سبزہ بیگانہ ہے، دو چار نہ ہونے پائے

جمع کر لیجئے غمزوں کو مگر خوبیٔ بزم
بس وہیں تک ہے کہ بازار نہ ہونے پائے

آپ جاتے تو ہیں اس بزم میں لیکن شبلی
حال دل دیکھئے اظہار نہ ہونے پائے!

حسن بریلوی

○

حُسن جب مقتل کی جانب تیغ بُراں لے چلا
عشق اپنے مُجرموں کو پا بجولاں لے چلا

خونِ ناحق کی حیا بولی، ذرا منہ ڈھانک لو
ناز جب ان کو سرِ خاکِ شہیداں لے چلا

خاک عاشق روکنے کو دُور تک لپٹی گئی
جب سمندِ ناز کو وہ گرم جولاں لے چلا

جب چلی مقتل سے قاتل کی سواری رات کو
آگے آگے مشعلیں خونِ شہیداں لے چلا

آرزوئے دیدِ جاناں بزم میں لائی مجھے
بزم سے میں آرزوئے دیدِ جاناں لے چلا

ڈھونڈتی تھی ہر طرف کس کو نگاہِ واپسیں
آس کس کے دید کی بیمارِ ہجراں لے چلا

نازِ آزادی حسنؔ وجہِ اسیری ہو گیا!
موکشاں دل کو خیالِ زلفِ پیچاں لے چلا

○

جلوے ترے جو رونقِ بازار ہو گئے
خوبانِ خود فروش خریدار ہو گئے

تلووں سے راستہ چمن و لکشا بنا!
جلووں سے آئینہ در و دیوار ہو گئے

دل جاں لب، جگر میں تپک، جان بیقرار
ہم تیرا نام لے کے گنہگار ہو گئے!

گلزار ہے بہار یونہی حُسنِ یار سے
جیسے چمن، بہار سے گلزار ہو گئے

یہ حُسنِ خود فروش عجب جنس ہے حسنؔ
وہ بک گئے جو اس کے خریدار ہو گئے

نسیم

مرتضیٰ حسین بھرتپوری

○

غیر کے گھر ہیں وہ مہمان بڑی مشکل ہے
جان جانے کے ہیں سامان بڑی مشکل ہے

کہتے ہیں آپ ہیں جس بات کے طالب ہم سے
ہے وہی غیر کو ارمان بڑی مشکل ہے

اُس نے لی جان ہزاروں کو یہ دم دے دے کر
مجھ پہ مرنا نہیں آسان، بڑی مشکل ہے

روز کہتے ہو کہ تو کس کے لئے ہے بیتاب
جان کر بنتے ہو انجان، بڑی مشکل ہے

دوستی سہل نہیں اس بُتِ بدخُو سے نسیمؔ
ضد نہ کر، دیکھ مری جان، بڑی مشکل ہے

○

اُن کے پیکان پہ پیکان چلے آتے ہیں
دل میں گھر کرنے کو مہمان چلے آتے ہیں

دیکھ کر آتے ہیں کیا عارضِ گیسو اُن کے
لوگ حیران پریشان چلے آتے ہیں

چارۂ غم کا وہ پرچہ نہیں لکھتے مجھ کو
پاس اغیار کے فرمان چلے آتے ہیں

بزمِ اغیار میں کس شخص نے گستاخی کی
کہ وہ خاموش پشیمان چلے آتے ہیں!

بیخود دہلوی

○

شمع مزار تھی نہ کوئی سوگوار تھا
تم جس پہ رو رہے تھے کس کا مزار تھا

تڑپوں گا عمر بھر دلِ مرحوم کیلئے
کم بخت نامراد لڑکپن کا یار تھا

سودائے عشق اور ہے وحشت کچھ اور شے
مجنوں کا کوئی دوست فسانہ نگار تھا

جادو ہے یا طلسم تمہاری زبان میں
تم جھوٹ کہہ رہے تھے مجھے اعتبار تھا

کیا کیا ہمارے سجدہ کی رسوائیاں ہوئیں
نقشِ قدم کسی کا سرِ رہگذار تھا

اس وقت تک تو وضع میں آیا نہیں فرق
تیرا کرم شریک جو پروردگار تھا

○

وہ سن کر حور کی تعریف پردے سے نکل آئے
کہا پھر مسکرا کر حسنِ زیبا اس کو کہتے ہیں

اجل کا نام دشمن دوسرے معنی میں لیتا ہے
تمہارے چاہنے والے تمنا اس کو کہتے ہیں

مرے مدفن پہ کیوں روتے ہو عاشق مر نہیں سکتا
یہ مرجانا نہیں ہے صبر آنا اس کو کہتے ہیں

نمک بھر کر مرے زخموں میں تم کیا مسکراتے ہو
مرے زخموں کو دیکھو مسکرانا اس کو کہتے ہیں

زمانے سے عداوت کا سبب تھی دوستی جن کی
اب اُن کو دشمنی ہے ہم سے دنیا اسکو کہتے ہیں

دکھاتے ہم نہ آئینہ تو یہ کیونکر نظر آتا
بشر حوروں سے اچھا تم نے دیکھا اسکو کہتے ہیں

پنڈت امرناتھ ساحر

○

جلا ہے کس قدر دل ذوق کاوش ہائے مژگاں پر
کہ سو سو نشتروں کی نوک ہے اک اک رگِ جاں پر

پڑا ہوگا مگر عکسِ عذارِ لالہ گوں ورنہ
یہ گستاخی! ہمارا خون اور قاتل کے داماں پر

طریقِ عشق میں ہے رنج پہلے اور خوشی پیچھے
مدارِ صبح روزِ وصل ہے اک شامِ ہجراں پر

مری دیوانگی روزِ قیامت میرے کام آئی
قلم رحمت کا کھینچا اُس نے آخر میرے عصیاں پر

اگر اُن کے تغافل کو ہے دعویٰ اپنی تمکیں کا
ہماری خود فراموشی کو ہے ناز اپنے نسیاں پر

○

رسوائے عشق ہے ترا شیدا کہیں جسے
عشاق میں مثال ہے رسوا کہیں جسے

سینہ چمن ہے، غنچۂ دل ہے شگفتہ دل
تیری نگاہ ہے چمن آرا کہیں جسے

غم پُر دریدہ ہے دلِ شوریدگانِ عشق!
فرقت کی ایک رات ہے دنیا کہیں جسے

منسوب کفر دیر سے، ایماں حرم سے ہے
اک رہ گیا ہوں میں کہ تمہارا کہیں جسے

ہم غیر معتبر سہی اور غیر معتبر
کہنا بجا ہے آپ کا، جیسا کہیں جسے

ساحرؔ نفس وہ دام ہے، جس میں کہ ہے اسیر
موجِ رمِ خیال کہ عنقا کہیں جسے

سائلؔ دہلوی

○

سنا بھی کبھی ہجر! درد و غم کا کسی دل جلے کی زبانی، کہو تو
نکل آئیں آنسو کلیجہ پکڑ لو، کروں عرض اپنی کہانی، کہو تو

تمہیں رنگ مے شیخ مرغوب کیا ہے گلابی ہو یا زعفرانی؟ کہو تو
پلانے کو ساقی تو ہے پیکر، مصفا، کشیدہ، پرانی، کہو تو

تمنائے دیدار ہے حسرت دل کہ تم جلوہ فرما ہو میں آنکھیں سیکوں
نہ کہہ دینا موسیٰ سے جیسے کہا تھا، مری عرض پر لن ترانی، کہو تو

وفا پیشہ عاشق نہیں دیکھا تم نے، مجھے دیکھ لو، جانچ لو، آزما لو
تمہارے اشارے پہ قربان کر دوں ابھی مایۂ زندگانی، کہو تو

کہاں میں کہاں داستاں کا تقاضا مرے ضبط در دہاں کا ہے کہنا
پھر اس پہ یہ تاکید بھی ہے برابر، نہ کہنا پڑی کہانی، کہو تو

مرے نامۂ شوق کی سطر میں ہے جگہ اک جو سادہ وہ مہمل نہیں ہے
میں ہو جاؤں خدمت میں حاضر ابھی خود بتانے کو اسکے معانی کہو تو

○

سنا غیروں سے مجھ سے رنج، غم یوں بھی ہے اور یوں بھی
وفا دشمن جفا جو کا ستم یوں بھی ہے اور یوں بھی

شب وعدہ وہ آجائیں، نہ آئیں، مجھ کو بلوائیں
عنایت یوں بھی اور یوں بھی، کرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

مجھے لکھا تھا، ہم ہر عیادت آنے والے ہیں
عدو ہمرہ ہے اب سمجھے کہ ہم یوں بھی ہے اور یوں بھی

نہ خود آئیں، نہ بلوائیں، شکایت کیوں نہ لکھ بھیجوں
عنایت کی نظر مجھ پر تو کم یوں بھی ہے اور یوں بھی

تم آؤ مرگ شادی ہے، نہ آؤ مرگ ناکامی
نظر میں اب رہ ملک عدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

مرے سر پہ بھی ٹوٹا ہے تمہارے پاؤں بھی چومے
غرض پیر فلک کی پشت خم یوں بھی ہے اور یوں بھی

مجھے باور ہے تم جھوٹے نہیں، وعدے کے سچے ہو
قسم کیوں کھاؤ، ناجائز قسم یوں بھی ہے اور یوں بھی

یہ مسجد ہے، یہ مے خانہ، تعجب اس پہ آتا ہے
جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

یہ تیری سادگی آرائش زیور سے بڑھ کر ہے
خدا کے فضل سے تو تو رقم یوں بھی ہے اور یوں بھی

تجھے نواب بھی کہتے ہیں، شاعر بھی سمجھتے ہیں
زمانے میں ترا سائلؔ بھرم یوں بھی اور یوں بھی!

آغا شاعر

○

چلے گا نہیں مجھ پہ فتنہ تمہارا
ہٹا لو! کہ خنجر ہے جھوٹا تمہارا

منائیں تو اب جان دے کر منائیں
قیامت ہے یہ روٹھ جانا تمہارا

بڑے سیدھے سادے بڑے بھولے بھالے
کوئی دیکھے اس وقت چہرہ تمہارا

بچا ہے جو ساغر میں کیوں پھینکتے ہو
ہمیں دے دو ہم پی لیں جھوٹا تمہارا

یہ کیا ہے سبب آج چپ چپ سے پیارے
بتاؤ تو کیوں جی ہے کیسا تمہارا!

اٹھانے پڑے خاک سے دل کے ٹکڑے
بڑا پیار تھا، پیار دیکھا تمہارا

خدا کے لئے ہاں، نہیں کچھ تو کہہ دو
کہ منہ تک رہی ہے تمنا تمہارا!

علاج اس کے بیمار کا تم کرو گے؟
کہیں دل چلا ہے مسیحا، تمہارا

چلا شاعرِ زار تسلیم لیجے!
بھلا ہو بھلا میرے داتا تمہارا

○

یہ کیسے بال کھولے آئے، کیوں صورت بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

شکایت کس سے کیجے، ہائے! کیا الٹا زمانہ ہے
بڑھایا پیار جب ہم نے، محبت یار نے کم کی

جگر میں درد ہے، دل مضطرب ہے، جان بے کل ہے
مجھے اس بیخودی میں بھی خبر ہے اپنے عالم کی

نہیں ملتے نہ ملئے، خیر! کوئی مر نہ جائے گا
خدا کا شکر ہے پہلے محبت آپ نے کم کی

عدو جس طرح تم کو دیکھتا ہے ہم سمجھتے ہیں
چھپاؤ لاکھ تم چھپتی نہیں ہے آنکھ محرم کی

مزا اس میں ہی ملتا ہے، نمک چھڑکو، نمک چھڑکو
قسم لے لو نہیں عادت مرے زخموں کو مرہم کی

کہاں جانا ہے؟ تھم تھم کر چلو، ایسی بھی کیا جلدی
تم ہی تم ہو، خمار کہنے، نظر پڑتی ہے عالم کی

کوئی ایسا ہو آئینہ کہ جس میں تو نظر آئے
زمانے بھر کا جھوٹا، کیا حقیقت ساغر جم کی

گھٹائیں دیکھ کر بے تاب ہے بے چین ہے شاعر
ترے قربان، او مطرب! سنا دے کوئی موسم کی

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی

○

حُسن عشق میں ہے یا عشق، حسن میں مُضمر
جوہر آئنہ میں یا آئنہ ہے جوہر میں

عشق محشر آرا کی طُور پہ گری بجلی
حُسن لن ترانی کی رہ سکا نہ چادر میں

فرطِ سوزِ الفت میں دیکھ کر سکوں دل کا
بجلیاں مچلتی ہیں بادلوں کے محشر میں

چارہ گر کو حیرت ہے از نقائے وحشت سے
پاؤں میں جو چکر تھا آرہا ہے وُہ سر میں

ہوں وہ رند یا صوفی، مست اُنکی دھن میں ہیں
جانے کتنے مے خانے بھر دئے ہیں کوثر میں

○

عشق ہی عشق ہو، عاشق ہو نہ معشوق جہاں
ایسی اک درگہ توحید مآب اَور بھی ہے

ہوش سے کاٹ یہ دن، زندہ دلی سے رکھ کام
شیب کے بعد مری جان شباب اَور بھی ہے

یارے خانے اگر کر گئے خالی، غم کیا؟
اب بھی ابر آتا ہے اور خُم میں شراب اَور بھی ہے

گھر کیا غالبؔ و مومنؔ نے جہاں آنکھوں میں
اسی بستی میں کوئی خانہ خراب اَور بھی ہے

محمد علی جوہر

○

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر آن تسلی ہے ہر لحظہ تشفی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مدارا تیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کرامتیں

بیٹھا ہوا توبہ کی تو خیر منایا کر
ملتی نہیں یوں جوہر اس دیس کی برساتیں

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

جینا وہ کیا کہ دل میں نہ ہو تیری آرزو
باقی ہے موت ہی دلِ بے مدعا کے بعد

تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں
آتا ہے لطفِ جرم تمنا سزا کے بعد

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

دِل شاہجہانپوری

○

پھر اعتبارِ عشق کے قابل نہیں رہا
جو دل تری نظر سے گرا دل نہیں رہا

نشترِ چبھوئے اب نہ پشیمانیٔ نگاہ
مجھ کو تو شکوۂ خلشِ دل نہیں رہا

موجیں اُبھار کر مجھے جس سمت لے چلیں
حدِ نگاہ تک کہیں ساحل نہیں رہا

کیا کہئے اب مآلِ محبت کی سرگذشت
یاد اس کی رہ گئی ہے مگر دل نہیں رہا

○

کوچہ گردی میں جوانی جائے گی
خاک ہو کر زندگانی جائے گی

مٹ نہیں سکتا ہمارے دِل کا داغ
قبر میں بھی یہ نشانی جائے گی

سچ ہے میری بات کا کیا اعتبار
سچ کہوں گا، جھوٹ جانی جائے گی

حضرتِ دِل جب بڑھاپا آئے گا
غیرِ مقدم کو جوانی جائے گی

شاہ بیدم وارثی

○

اپنی ہستی کا اگر حسن نمایاں ہو جائے
آدمی کثرتِ انوار سے حیراں ہو جائے

تم جو چاہو، تو مرے درد کا درماں ہو جائے
ورنہ مشکل ہے کہ مشکل مری آساں ہو جائے

اونک پاش تجھے اپنی ملاحت کی قسم!
بات تو جب ہے کہ ہر زخم نمکداں ہو جائے

دینے والے مجھے دینا ہے تو اتنا دے دے
کہ مجھے شکوۂ کوتاہیٔ داماں ہو جائے

اس سیہ بخت کی راتیں بھی کوئی راتیں ہیں
خوابِ راحت بھی جسے خواب پریشاں ہو جائے

سینۂ شبلی و منصور تو پھونکا تُو نے
اس طرف بھی کرم اے جنبشِ داماں ہو جائے

آخری سانس بنے زمزمۂ ہُو اپنا
سازِ مضرابِ فنا تارِ رگِ جاں ہو جائے

تو جو اسرارِ حقیقت کہیں ظاہر کر دے
ابھی بیدم رسن و دار کا ساماں ہو جائے

○

مجھے شکوہ نہیں! برباد رکھ! برباد رہنے دے
مگر للہ میرے دل میں اپنی یاد رہنے دے

مرے ناشاد رہنے سے اگر تجھ کو مسرت ہے
تو میں ناشاد ہی اچھا، مجھے ناشاد رہنے دے

تری شانِ تغافل پر مری بربادیاں صدقے
جو بربادِ تمنا ہو، اُسے برباد رہنے دے

نہ صحرا میں بہلتا ہے نہ کوئے یار میں ٹھہرے
کہیں تو چین سے مجھ کو دلِ ناشاد رہنے دے

کچھ اپنی گذری ہی بیدم بھلی معلوم ہوتی ہے
مری بیتی سنا دے قصۂ فرہاد رہنے دے!

آغا حشر

○

یاد میں تیری جہاں کو بھولتا جاتا ہوں میں
بھولنے والے! کبھی تجھ کو بھی یاد آتا ہوں میں

ایک دھندلا سا تصور رہ گیا ہے کہ دل بھی تھا یہاں
اب تو سینے میں فقط اک ٹیس ہی پاتا ہوں میں

او وفا نا آشنا کب تک سنوں تیرا گلہ
بے وفا کہتے ہیں تجھ کو اور شرماتا ہوں میں

آرزوؤں کا شباب، اور مرگِ حسرت ہائے ہائے
جب بہار آئے گلستاں میں تو مرجھاتا ہوں میں

حشر میری شعر گوئی ہے فقط فریادِ شوق!
اپنا غم دل کی زباں میں دل کو سمجھاتا ہوں میں

○

چوری کہیں کھلے نہ نسیمِ بہار کی
دزدِ شبو اڑا کے لائی ہے گیسوئے یار کی

اللہ رکھے اس کا سلامت غرورِ حسن
آنکھوں کو جس نے دی ہے سزا انتظار کی

گلشن میں دیکھ کر مرے مستِ شباب کو
شرمائی جا رہی ہے جوانی بہار کی

اے میرے دل کے چین مرے دل کی روشنی
آ، اور صبح کر دے شبِ انتظار کی

اے حشر دیکھنا تو، یہ ہے چودھویں کا چاند
یا آسماں کے ہاتھ میں تصویر یار کی

وحشتؔ کلکتوی

ہوئے ہیں گم جس کی جستجو میں اسی کی ہم جستجو کرینگے
رکھا ہے محروم جس نے ہم کو اسی کی ہم آرزو کرینگے

گئے وہ دن جبکہ اس چمن میں ہوئے نشو و نما تھی ہم کو
خزاں کو دیکھا نہیں ہے ہم نے کہ خواہش رنگ و بو کرینگے

حکایت آرزو ہے نازک زبان کیا خاک کہہ سکیگی
لب خموش و نگاہ حسرت سے دل کی ہم گفتگو کریں گے

جگر جو آنکھوں میں میں نے دی تھی تو ان سے تھی چشم راز داری
یہ کیا خبر تھی کہ اشک میرے بھی کو بے آبرو کرینگے

ابھی تو گم کردہ راہ خود ہیں مئے محبت کی بیخودی میں
اگر کبھی آپ میں ہم آئے تو اسکی بھی جستجو کریں گے

اس انجمن میں کہ چشم ساقی کفیل ہو عیش زندگی کی
وہ بادہ خواری میں خام ہونگے جو فکر جام و سبو کرینگے

طہارت ظاہری سے حاصل نہ ہوسکے گی صفائے باطن
بہا کے ہم خون توبہ وحشتؔ سے اس کدورت کو دھو کرینگے

درد کا میرے یقیں آپ کریں یا نہ کریں
غرض اتنی ہے کہ اس راز کا چرچا نہ کریں

لاکھ غافل سہی پر ایسے بھی ہم کو نہیں
کہ چمن دیکھ کے ذکر چمن آرا نہ کریں

عقل و دانش سے تو کچھ کام نہ نکلا اپنا
کب تک آخر دل دیوانہ کا کہنا نہ کریں

وہ نگاہیں عجب انداز سے ہیں عشوہ فروش
غم پنہاں کو ہمارے کہیں رسوا نہ کریں

تیرے آشفتہ سر ایسے بھی نہیں سودائی
کہ دل و دیں کیلئے زلف کا سودا نہ کریں

میں نے بیہودہ توقع کی سزا پائی ہے
کچھ خیال آپ مری حسرت دل کا نہ کریں

میرے ارمانوں کو کاش اتنی سمجھ ہو وحشتؔ
کہ ان آنکھوں سے مروت کا تقاضا نہ کریں

آسی الدنی

○

قید سے پہلے بھی آزادی مری خطرہ میں تھی
آشیانہ ہی مرا صورت نمائے دام تھا

واہمہ خلاق اور آزادی کا حسن افزا سرور
ہر فریبِ رنگ کا پہلے گلستاں نام تھا

ضعف آہوں پر بھی غالب ہو چلا تھا اے اجل!
تو نہ آتی تو یہ میرا آخری پیغام تھا

دیدۂ خوں نابہ افشاں میرا اُن کے سامنے
بے خودی کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا اک جام تھا

○

ہزاروں طرح اپنا درد ہم اُس کو سُناتے ہیں
مگر تصویر کو ہر حال میں تصویر پاتے ہیں

بُجھا دے اے ہوائے تُند! مدفن کے چراغوں کو
سیہ بختی میں یہ اک بدنما دھبہ لگاتے ہیں

مرتب کر گیا اک عشق کا قانون دُنیا میں
وہ دیوانے ہیں جو محبوں کو دیوانہ بناتے ہیں

اسی محفل سے میں روتا ہوا آیا ہوں اے آسیؔ
اشارے میں جہاں لاکھوں متدرّبے جلاتے ہیں

تاجور نجیب آبادی

○

حُسن شیخ چشم میں نام کو وفا نہیں
درد آفریں نظر درد آشنا نہیں

ننگِ عاشقی ہے وہ ننگِ بندگی ہے وہ
جس کے دل کا آئینہ تیرا آشنا نہیں

آہ اس کی بیکسی تُو نہ جس کیساتھ ہو
ہائے اسکی بندگی جس کا تُو خدا نہیں

حیف وہ الم نصیب جس کا درد تُو نہ ہو
اف وہ دردِ زندگی جس کی تو دوا نہیں

دوست یا عزیز ہیں خود فریبیوں کے نام
آج آپکے سوا کوئی آپکا نہیں

جانتا ہوں میں کہ تو اہلِ دل کیساتھ ہے
دل پہ ہو خدا کی مار دل بھی تو نہیں

اپنے حُسن کو ذرا تو مری نظر سے دیکھ
دورِ شش جہات میں کچھ ترے سوا نہیں

بے وفا خدا سے ڈر طعنۂ وفا نہ دے
تاجور میں اور عیب کچھ ہوں بے وفا نہیں

○

محبت میں زیاں کاری مُرادِ دل نہ بن جائے
یہ لاحاصل ہی عمرِ عشق کا حاصل نہ بن جائے

بھی پر پڑ رہی ہے ساری محفل میں نظر اُن کی
یہ دلداری حسابِ دوستاں "دل" نہ بن جائے

کروں گا عمر بھر طے راہِ بے منزل محبت کی
اگر وہ آستاں اس راہ کی منزل نہ بن جائے

یہ متوالی نظر یہ بادۂ بے جام ارے توبہ
کسی پر بے بنی اے ساقیٔ محفل نہ بن جائے

ترے انوار سے ہے نبضِ ہستی میں تڑپ پیدا
کہیں سارا نظامِ کائنات اک دل نہ بن جائے

کہیں رُسوا نہ ہو اب شانِ استغنا محبت کی
مری حالت تمہارے رحم کے قابل نہ بن جائے

صفی لکھنوی

○

جانا جانا جلدی کیا ہے، ان باتوں کو جانے دو
ٹھہرو ٹھہرو، دل تو ٹھہرے مجھ کو ہوش میں آنے دو

پاؤں نکالو خلوت سے اے آئے جو قیامت آنے دو
سارے سر آپس میں ٹکرائیں اگر، ٹکرانے دو

مہ منور جام طلائی، ماہ کٹورا چاندی کا
چرخ کے خمخانے میں یہی ہیں، گردش میں پیمانے دو

دورِ بہارِ حسن تو ہو، پھر جوشِ جنوں کا قحط نہیں
کوئے گی باغوں میں کوئل بور آموں میں آنے دو

بادل گرجا، بجلی چمکی، روئی شبنم، پھول ہنسے
مرغِ سحر کو ہجر کی شب کے افسانے دہرانے دو

ہاتھ میں ہے آئینہ و شانہ پھر بھی شکن پیشانی پہ
موجِ صبا سے تم تو نہ بگڑو زلفوں کو بل کھانے دو

کثرت ہے جنابِ وحشاں ہے کیا ہونگے گنام صفی
نقشِ دلوں پر نام ہے اپنا، نقشِ لحد مٹ جانے دو

○

وہ عالم ہے کہ منہ پھیرے ہوئے عالم نکلتا ہے
شبِ فرقت کے غم جھیلے ہوؤں کا دم نکلتا ہے

الٰہی خیر ہو اُلجھن پہ اُلجھن بڑھتی جاتی ہے
نہ میرا دم نہ اُن کے گیسوؤں کا خم نکلتا ہے

قیامت ہی نہ ہو جائے، جو پردے سے نکل آؤ
تمہارے منہ چھپانے میں تو یہ عالم نکلتا ہے

شکستِ رنگِ رُخ آئینۂ بے تابیٔ دل ہے
ذرا دیکھو تو کیونکر غم زدوں کا دم نکلتا ہے

نگاہِ التفاتِ مہر اور اندازِ دل ہوئی
مگر اک پہلوئے بے تابیٔ شبنم نکلتا ہے

صفی کشتہ ہوں ناپرسانیوں کا اہلِ عالم کی
یہ دیکھوں کون میرا صاحبِ ماتم نکلتا ہے

ثاقبؔ لکھنوی

○

کہاں تک جفا حسن والوں کی سہتے
جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے

وفا بھی نہ ہوتا تو اچھا تھا دعویٰ
گھڑی دو گھڑی تو کبھی شاد رہتے

نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی
ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے

بتاتے ہیں آنسو کہ اب دل نہیں ہے
جو پانی نہ ہوتا تو دریا نہ بہتے

بڑے شوق سے سُن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

کوئی نقش اور کوئی دیوار سمجھا
زمانہ ہوا مجھ کو چُپ رہتے رہتے

مری ناؤ اس غم کے دریا میں ثاقبؔ
کنارے پہ آ ہی لگی بہتے بہتے

○

ہجر کی شب نالۂ دل وہ صدا دینے لگے
سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے

کس نظر سے آپ نے دیکھا دلِ مجروح کو
زخم جو کچھ بھر چلے تھے پھر ہوا دینے لگے

جُز زمینِ کوئے جاناں کچھ نہیں پیشِ نگاہ
جس کا دروازہ نظر آیا صدا دینے لگے

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

مٹھیوں میں خاک لیکر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلا دینے لگے

آئنہ ہو جائے میرا عشق اُن کے حُسن کا
کیا مزا ہو درد اگر خود ہی دوا دینے لگے

سینۂ سوزاں میں ثاقبؔ گھُٹ رہا ہے، وہ دھُواں
اُف کروں تو آگ دنیا کی ہوا دینے لگے

حکیم سعید احمد ناطق لکھنوی

○

کبھی دامانِ دل پر داغِ مایوسی نہیں آیا
اِدھر وعدہ کیا اُس نے اُدھر دل کو یقیں آیا

محبت آشنا دل مذہب و ملت کو کیا جانے
ہوئی روشن جہاں بھی شمع پروانہ وہیں آیا

دو عالم سے گذر کے بھی دلِ عاشق ہے آوارہ
ابھی تک یہ مسافر اپنی منزل پر نہیں آیا

مری جانب سے اُنکے دل میں کس شکوے پہ کینہ ہے
وہ شکوہ جو زباں پر کیا ابھی دِل میں نہیں آیا

حیاتِ بیخودی کچھ ایسی نامحسوس تھی ناطق
اجل آئی تو مجھ کو اپنی ہستی کا یقیں آیا

○

کیا بتاؤں دل کہاں ہے اور کس جا درد ہے
میں سراپا دل ہُوں، دل میرا سراپا درد ہے

یہ سمجھ لیں پہلے آپ اے حضرتِ عیسیٰ! ذرا
کس کے دل میں درد ہے یہ اور کس کا درد ہے

جو چلا دُنیا سے، وُہ رکھے ہوئے سینے پہ ہاتھ
میں سمجھتا ہوں کہ سب کے دل میں تیرا درد ہے

میرے چپ رہنے سے تو غافل ہے او ظاہر پرست
طرف بھی اتنا ہی میں رکھتا ہُوں جتنا درد ہے

ہر تڑپ پر قالبِ مُردہ میں آجاتی ہے رُوح
مجھ مریضِ ناتواں کی جان گویا درد ہے

بچ گئے تو انتہائے عشق میں لُطف آئے گا
اور ابھی تو ابتدا میں انتہا کا درد ہے

اپنا اپنا حال کہہ لینے دو ناطق سب کو تم
جانتا ہے وُہ کہ کس کے دل میں کتنا درد ہے

ناطق گلاؤٹھوی

○

ڈھونڈتی ہے اضطراب شوق کی دنیا مجھے
آپ نے محفل سے اُٹھوا کر کہاں رکھا مجھے

اے نگاہِ مست! اس کا نام ہے کیفِ سرور
آج تو نے دیکھ کر میری طرف دیکھا مجھے!

یاس سے ہو کر جدا، جورِ فلک کا غم نہیں
ہو چکی وہ بات تھی جس بات کی پروا مجھے

ساتھ بھی چھوڑا تو کب جب سب برے دن کٹ گئے
زندگی تو نے کہاں آ کر دیا دھوکا مجھے!

○

کیا ارادے ہیں وحشتِ دل کے
کس سے ملنا ہے خاک میں مل کے

اے دلِ شکوہ سنج! کیا گزری
کس لئے ہونٹ رہ گئے سل کے؟

مٹتے جاتے ہیں راہِ عمر میں دوست
مل رہے ہیں نشانِ منزل کے

چھوڑ ناطق فضائے بزمِ شکست
اٹھ کے ٹکڑے سنبھال لے دل کے

عزیز لکھنوی

○

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخل زنداں ہونا

اُف مرے اُجڑے ہوئے گھر کی تباہی دیکھو
جس کے ہر ذرہ پہ چھایا ہے بیاباں ہونا

حادثے دونوں یہ عالم میں اہم گذرے ہیں
میرا مرنا، تیری زلفوں کا پریشاں ہونا

کچھ نہ پوچھو شبِ غم میرے گھر کی رونق
اللہ اللہ وہ سامان سے ساماں ہونا

جوش میں لے کے اک انگڑائی کسی کا کہنا
تم کو آتا ہی نہیں چاک گریباں ہونا

نوچ ڈالے تری آنکھوں کے الٰہی توبہ!
چاہیئے تھا انہیں پیوستِ رگِ جاں ہونا

ہو چلیں آپ کے بیمار کی آنکھیں بے نور
قہر تھا صبح کے تارے کا نمایاں ہونا

میں کروں ضبط ادھر ان کو پسینہ آئے
چاہیئے یوں غمِ پنہاں کو نمایاں ہونا

اللہ اللہ یہ سلیقہ نرالے شکلِ طور
کس طرح تو نے چھپایا ہے نمایاں ہونا

ان سے کرتا ہے دمِ نزع وصیت عزیزؔ
خلق روئے گی مگر تم نہ پریشاں ہونا

○

یہ مشورہ بہم اُٹھے ہیں چارہ جُو کرتے
اب اس مریض کو اچھا تھا قبلہ رُو کرتے

زبان رُک گئی آخر سحر کے ہوتے ہی!
تمام رات کٹی دل سے گفتگو کرتے

کفن کو باندھے ہوئے سر سے آئے ہیں، ورنہ
ہم اور آپ سے اس طرح گفتگو کرتے

سوادِ شہرِ خموشاں کا دیکھیے منظر!
سُنا نہ ہو جو خموشی کو گفتگو کرتے!

اگر کہیں وُہ دمِ واپسیں چلے آتے
ہم ایک سانس میں تفصیلِ آرزو کرتے

تمام رُوح کی لذت اِسی پہ تھی موقوف
کہ زندگی میں کبھی تم سے گفتگو کرتے

جواب حضرتِ ناصح کو ہم بھی کچھ دیتے
جو گفتگو کے طریقے سے گفتگو کرتے

پہنچ کے حشر کے میداں میں بول کیوں ہی عزیزؔ
ابھی تو پہلی ہی منزل ہے جستجو کرتے!

جلیلؔ مانک پوری

○

کھو کے دل میرا تمہیں ناحق پشیمانی ہوئی؛
تم سے نادانی ہوئی یا مجھ سے نادانی ہوئی؛

اللہ اللہ پھوٹ نکلا رنگ چاہت کا مری
زہر کھایا میں نے پوشاک آپ کی دھانی ہوئی

ہم کو ہو سکتا نہیں دھوکا ہجومِ حشر میں
تیری صورت ہے ازل سے جانی پہچانی ہوئی

اے صبا! میں اور کیا دوں قبرِ مجنوں کیلئے
خاک تھوڑی سی چڑھا دینا مری چھانی ہوئی

یار کے ہاتھوں ہوا جو کچھ ہوا اے تیغِ ناز!
تیری عُریانی ہوئی یا میری قربانی ہوئی!

کر گئی دیوانگی ہم کو بری ہر جُرم سے
چاک دامانی سے اپنی چاک دامانی ہوئی

باڑھ دی بانکی اداؤں نے جو خنجر کو جلیلؔ!
ذبح کرنے میں مرے قاتل کو آسانی ہوئی

○

اِس شان سے وہ آج پئے امتحاں چلے
فتنوں نے پاؤں چُوم کے پوچھا کہاں چلے

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے
جب تم چلو، زمین چلے، آسماں چلے

آنکھوں میں کون آ کے الٰہی نکل گیا؛
کس کی تلاش میں مرے اشکِ رواں چلے

اُٹھتا ہوں میں جو دشت سے جانے کو اے جنوں
کہتے ہیں خار تھام کے دامن کہاں چلے

احسن مارہروی

○

او! میں بانکپن، انداز میں اک آن پیدا کر
تجھے مشوق بننا ہے، تو پوری شان پیدا کر

کہاں کا وصل کیسی آرزو، اے دل! وہ کہتے ہیں
نہ میں حسرت کروں پوری، نہ تو ارمان پیدا کر

ہمارا انتخاب اچھا نہیں اے دل تو پھر تو ہی
خیالِ یار سے بہتر کوئی مہمان پیدا کر

مجھے ہے رشک اسکو بھی رقیب اپنا سمجھتا ہوں
نہ دیکھے جو تجھے ایسا کوئی دربان پیدا کر

خیالِ ضبطِ الفت ہے تو احسن خوف پھر کیسا
نہ دھڑکے دل بھی سینے میں، وہ اطمینان پیدا کر

○

ساقی و داغ میں بند ہے، بادہ کش چکر میں ہے
توبہ لب پر اور لب ڈوبا ہوا ساغر میں ہے

روک لے اے ضبط! جو آنسو کہ چشمِ تر میں ہے
کچھ نہیں بگڑا ہے اب تک گھر کی دولت گھر میں ہے

دب گیا تھا میرے مرنے سے جو اے محشر خرام!
کیا وہی خوابیدہ فتنہ صورتِ محشر میں ہے

جس کو تو چاہے جلادے جس کو چاہے مار دے
وہ بھی تیری بات میں، یہ بھی تری ٹھوکر میں ہے

دل کے مٹ جانے سے، جوشِ عشق گھٹ سکتا ہے کیا
دل سے کیا مطلب کہ یہ سودا تو میرے سر میں ہے

مانتا ہے آستاں کو تیرے کعبہ اور کون؟
یہ ہمارا ہی نشانِ سجدہ، سنگِ در میں ہے

احسنِ آوارہ قسمت کی نہ پوچھو گردشیں
اپنے گھر بیٹھا ہوا تقدیر کے چکر میں ہے

نوحؔ ناروی

○

کسی بے درد کو ظلم و ستم کا شوق جب ہوگا
یہ میرا ایک دل لاکھوں دلوں میں منتخب ہوگا

ہمارا اور ان کا سامنا محشر میں جب ہوگا
وہ جلسہ وہ سماں وہ معرکہ بھی کچھ عجب ہوگا

کوئی زندہ رہے دنیا میں کیا اگلی اُمیدوں پر
ابھی تو ہجر کا رونا ہے، ہوگا وصل جب ہوگا

لڑکپن جا چکا اُن کا جوانی آنے والی ہے
کبھی مجھ پر جفا ہوتی تھی، لیکن قہر اب ہوگا

تمہارے وصل کی ساعت ہمیشہ ٹلتی رہتی ہے
خدا جانے کہاں ہوگا، کسے معلوم کب ہوگا؟

ابھی لذت نہیں اس کو ملی آزارِ پنہاں کی
جو ہوگا بھی تو ہوتے ہوتے دل ایذا طلب ہوگا

وہ اپنے وعدۂ دیدار سے پھرنے کو پھر جائیں
مگر یہ تو سمجھ لیں بے وفا کس کا لقب ہوگا

مجھے اظہارِ اُلفت پر یہ ان سے داد ملتی ہے
تمہارا عشق اک دن میری ذلت کا سبب ہوگا

بھری محفل میں اُن کو چھیڑنے کی کیا ضرورت تھی
جنابِ نوحؔ تم سا بھی نہ کوئی بے ادب ہوگا

○

آپ جن کے قریب ہوتے ہیں
وہ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں

جب طبیعت کسی پہ آتی ہے
موت کے دن قریب ہوتے ہیں

مجھ سے ملنا، پھر آپ کا ملنا
آپ کس کو نصیب ہوتے ہیں

ظلم سہہ کر جو اُف نہیں کرتے
ان کے دل بھی عجیب ہوتے ہیں

عشق میں اور کچھ نہیں ملتا
سینکڑوں غم نصیب ہوتے ہیں

نوحؔ کی قدر کوئی کیا جانے
کہیں ایسے ادیب ہوتے ہیں

عبداللطیف تپش

○

جان آنکھوں میں رہی جی سے گذرنے نہ دیا
اتنی دیدار کی حسرت تھی کہ مرنے نہ دیا

کیا قیامت ہے ستمگار! بھری محفل میں
دل چُرا کر تری دزدیدہ نظر نے نہ دیا

تو توں کشمکشِ یاس و تمنا میں رہے
غم نے جینے نہ دیا شوق نے مرنے نہ دیا

ناخدا نے مجھے دلدل میں پھنسائے رکھا
ڈوب مرنے نہ دیا، پار اُترنے نہ دیا

کوئی تو بات ہے جو غیر کے آگے اُس نے
شکوہ کیسا کہ مجھے شکر بھی کرنے نہ دیا

خاک آرام کی خواہش ہو وطن سے باہر
جب ہمیں چین تپش اپنے ہی گھر نے نہ دیا

○

موت آتی نہیں قرینے کی
یہ سزا مل رہی ہے جینے کی

مے سے پرہیز؟ شیخ توبہ کرو!
اک یہی چیز تو ہے پینے کی

تم کو کہتا ہے آئنہ خود بیں
باتیں سنتے ہو اس کمینے کی

ہو گیا جب سے بے نقاب کوئی
شمع روشن نہ پھر کسی نے کی

چشمِ تر آبرو تو پیدا کر
یوں نہیں بجھتی آگ سینے کی

اہلِ دُنیا سے کیا بدی کا گلہ
اے تپش تو نے کس سے نیکی کی

ظفر تاباں

عمرِ ابد کا ماحصل، عشق کا دورِ ناتمام
ہائے وہ مستیٔ سحر، ہائے وہ بیخودیٔ شام

پہلے تأمل سوچ لیں، ہمسفرانِ سست گام!
میری سرشت میں نہیں خواہشِ منزل و مقام

طائرِ خستہ بال کو دام بھی کنجِ آشیاں!
مرغِ چمن نورد کو، گوشۂ آشیاں بھی دام

اب بھی خدا پرست ہے دیر و حرم کی قید میں
ہائے نگاہِ نارسا، ہائے مذاقِ ناتمام

کیفِ نظر کی مستیاں اہلِ نظر سے پوچھئے
جیسے کوئی پلا گیا بادۂ مشک بُو کے جام

خوبی و شانِ دلبری، غمزہ و ناز ہی نہیں
حُسن میں وہ ادا بھی ہے جس کا نہیں ہے کوئی نام

○

یاد میں تیری دو عالم کو بھلانا ہے ہمیں
عمر بھر اب کہیں آنا ہے، نہ جانا ہے ہمیں

کہتے ہیں: عشق کا انجام بُرا ہوتا ہے
اب تو کچھ بھی ہو محبت کو نبھانا ہے ہمیں

خلشِ عشق سے بیچین ہے دل ایک طرف
اس پہ یارب! غمِ ہستی بھی اُٹھانا ہے ہمیں

ہائے وہ آگ! جو مشکل سے جلی تھی دل میں
آج اس آگ کے شعلوں کو بجھانا ہے ہمیں

رخصتِ عرضِ تمنا نہیں ملتی، نہ ملے
قصۂ شوقِ نگاہوں سے سنانا ہے ہمیں!

آپ کانٹوں سے بچتے ہوئے چلتے ہیں، چلیں
دامنِ شوق کو پھولوں سے بچانا ہے ہمیں

ہائے! اس شرمِ محبت کا بُرا ہو تاباں
عشق کا راز خود ان سے بھی چھپانا ہے ہمیں

عندلیب شادانی

○

کوئی ادا شناسِ محبت ہمیں بتائے
جو ہم کو بھول جائے وہ کیوں ہم کو یاد آئے

کس کی مجال تھی کہ حجابِ نظر اٹھائے
وہ مسکرا کے آپ ہی دل کے قریب آئے

اک دلنشیں نگاہ میں اللہ یہ خلش
نشتر کی نوک جیسے کلیجے میں ٹوٹ جائے

کچھ ہم سے بیخودی میں ہوئیں بے محابا یاں
چشمک زنی ستاروں نے کی پھول مسکرائے

ناداں سہی پر اتنے بھی ناداں نہیں ہیں ہم
خود ہم نے جان جان کے کتنے فریب کھائے

وہ جانِ آرزو کہ ہے سرمایۂ نشاط
کیوں اس کی یاد غم کی گھٹا بن کے دل پہ چھائے

کہتے تھے تم سے چھوٹ کے کیونکر جئیں گے ہم!
جیتے ہیں تم سے چھوٹ کے تقدیر جو دکھائے

ہر سو سوگوار دل میں وہ عالم، وداع و داع
بجھتے ہوئے چراغ کی لو جیسے تھرتھرائے

تم تو یہیں کو کہتے تھے، یہ تم کو کیا ہوا
دیکھو! کنول کے پھولوں سے شبنم چھلک نہ جائے

اک ناتمام خواب، مکمل نہ ہو سکا
آئے کو زندگی میں بہت انقلاب آئے

○

جہاں عہدِ تمنا ختم ہو جائے
عذابِ جاودانی زندگی ہے

رلاتی ہے مجھے کیوں چاندنی رات
یہی اک رازِ میری زندگی ہے

خلش ہو، درد ہو، کاہش ہو، کچھ ہو
فقط بینا بھی کوئی زندگی ہے

ہلاکِ انجامِ تکمیلِ تمنا!
بقائے آرزو ہی زندگی ہے

جگر میں ٹیس، لب ہنسنے پہ مجبور
کچھ ایسی ہی ہماری زندگی ہے

وہ چاہے جس قدر بھی مختصر ہو
محبت کی جوانی زندگی ہے

امیدیں مر چکیں، میں جی رہا ہوں
عجب بے اختیاری زندگی ہے

جوانی اور ہنگاموں سے خالی
یہ جینا ہے، یہ کوئی زندگی ہے

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انہیں کی یاد میری زندگی ہے

محبت دونوں جانب سے محبت
نہ پوچھو آہ! کیسی زندگی ہے

علی اختر

○

زندگی کیا ہے جو دل ہو تشنۂ ذوقِ وفا
یعنی یہ پردہ تو اٹھ سکتا ہے آ اے کیا تجھ

گفتگوئے صورت و معنی ہے عنوانِ حیات
کہتے ہیں وہ مری فطرت کی حیرانی کیساتھ

تم نے ہر ذرّے میں برپا کر دیا طوفانِ شوق
اک تبسم اس قدر جلووں کی طغیانی کیساتھ

دل کی آبادی ہے آختر دل کی بربادی کا نام
اک تعلق ہے مری ہستی کو ویرانی کے ساتھ

○

حریمِ کعبہ بنا دی وہ سرزمیں میں نے
ترے خیال میں رکھدی جہاں جبیں میں نے

مجھی کو پردۂ ہستی میں دے رہا ہے فریب
وہ حسن جس کو کیا جلوہ آفریں میں نے

چٹک میں غنچے کی وہ صوتِ جاں فزا تو نہیں
سنی ہے پہلے بھی آواز یہ کہیں میں نے

رہینِ منزلِ وہم و گماں رہا اختر
اسی میں ڈھونڈ لیا جادۂ یقیں میں نے

تلوک چند محرومؔ

○

بس کا بُلا نہیں کہ دُعا بے اثر گئی
اِک آہ کی تھی، وُہ بھی کہیں جا کے مر گئی

اے ہم نفس، نہ پُوچھ جوانی کا ماجرا
موجِ نسیم تھی، اِدھر آئی، اُدھر گئی

دامِ غمِ حیات میں اُلجھا گئی اُمید
ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ احسان کر گئی

اِس زندگی سے ہم کو نہ دُنیا ملی، نہ دِین
تقدیر کا مشاہدہ کرتے گزر گئی

انجامِ حسنِ گل پہ نظر تھی، وگرنہ کیوں
گلشن سے آہ بھر کے نسیمِ سحر گئی

بس اتنا ہوش تھا مجھے روزِ وداعِ دوست
ویرانہ تھا نظر میں جہاں تک نظر گئی

ہر موج آبِ سدھ ہوئی وقفِ پیچ و تاب
محرومؔ جب وطن میں ہماری خبر گئی

○

کاوشوں سے اماں ملے نہ ملے
پھر ترا آستاں ملے نہ ملے

اب قفس ہی کو آشیاں کہئے
راحتِ آشیاں ملے نہ ملے

دل سے رہتے ہیں محوِ ذکرِ دن رات
ہم سخن، ہم زباں ملے نہ ملے

محوِ فریاد ہم ہیں آج کہ پھر
فرصتِ یک فغاں ملے نہ ملے

عَلَمِ آہ سربلند ہے آج
کل ہمارا نشاں ملے نہ ملے

تُو تو بیتاب ہے مگر اے دل
ہو کے وہ مہرباں ملے نہ ملے

یہ غزل جوشؔ[1] کو سُنا محرومؔ
پھر کوئی نکتہ داں ملے نہ ملے

[1] جناب جوشؔ ملیح آبادی

غزل قدیم

آرزو

سراج الدین علی خان

○

اٹھا ہے بیٹھ کر تیری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

دل لانے کا نسخہ پہنچا ہے عاشقوں تک
کیا کوئی جانتا ہے اس کیمیا گری کو

اس شوخ خوبرو سے ملنے لگا ہوں جب سے
ہر کوئی جانتا ہے میری دلاوری کو

اپنی نفس گری سے اب ہم تو ہار بیٹھے
اے صبا یہ کہنا اس دلربا پری کو

اب خواب میں ہم اس کی صورت کو ہیں ترستے
اے آرزو ہوا کیا بختوں کی یاوری کو

آزردہ

مفتی صدر الدین

○

یہ کہہ کے رخنہ ڈالئے ان کے جواب میں
اچھے بُرے کا حال کھلے کیا نقاب میں

یارب وہ خواب حق میں مرے خوابِ مرگ ہو
آئے وہ مست خواب اگر میرے خواب میں

تحقیق ہو تو جانوں کہ میں کیا ہوں، تیس کیا
لکھا ہوا ہے یوں تو سبھی کچھ کتاب میں

میں اور ذوقِ بادہ کشی؟ لے گئیں مجھے!
یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں

ہیں دونوں مثلِ شیشہ، پہ سامانِ صد شکست
جیسا ہے میرے دل میں نہیں ہے حباب میں

یہ عمر اور عشق، ہے آزردہ جائے شرم!
حضرت یہ باتیں پھبتی تھیں عہدِ شباب میں

آشفتہ

بھوپندر سنگھ

○

جام گدائی ہاتھ میں لے سنت سانچ سویرے پھرتے ہیں
شمس و قمر یہ دونوں بھکاری حسن کے تیرے پھرتے ہیں!

مدت سے ہے اختر طالع ماہ جبیں بن گردش میں
کھول تو ہاتھ من موہنی اپنی لیکھ دن میرے پھرتے ہیں

پنڈت پوچھ، ہاتھ دکھاؤ، فال کھلاؤ کوئی، پر
دن جو ہوں برگشتہ اپنے کس کے پھیرے پھرتے ہیں

عقل و فراست سلب ہوئے سب پائے جنوں نے لٹائے جنوں
گلیوں گلیوں لڑکے ہم کو گھیرے گھیرے پھرتے ہیں

یوں کانتے پر زلفیں اس کی بل کھاتی ہیں وقت خرام
مار سیہ کو ڈالے گلے میں جیسے سپیرے پھرتے ہیں

جوگ لیا آشفتہ ہم نے دیکھ لٹک ان زلفوں کی
گلیوں گلیوں حال پریشاں، بال بکھیرے پھرتے ہیں

آشفتہ

مرزا رضا قلی

○

یہ جوش غم سے ہے کہ سینہ میں خون ابتا ہے
نہ رکھیو ہاتھ کلیجہ پہ میرے، جلتا ہے

نہ پوچھو دل کی کیفیت تمہارے عشق میں آہ
اسے وہ غم جو لگا ہے اسی میں گلتا ہے

یہ ہم کو اس کی جوانی نے اور ایذا دی
کہ رات دن کوئی سینے میں دل کو ملتا ہے

کسی کے کال کا درد دیکھا تو نے آشفتہ
جو اشک آنکھوں سے موتی سا نیچے ڈھلتا ہے

آصف

آصف الدولہ بہادر

○

بس گھڑی تیرے آستاں سے گئے
ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے

تیرے کوچہ میں نقشِ پا کی طرح
ایسے بیٹھے کہ پھر نہ واں سے گئے

شمع کی طرح رفتہ رفتہ ہم
ایسے گذرے کہ جسم و جاں سے گئے

ق

ایک دن میں نے یار سے یہ کہا
اب تو ہم طاقت و تواں سے گئے

ہنس کے بولا کہ سن لے اے آصف
یہی کہہ کہہ کے لاکھوں جاں سے گئے

آفتاب

شاہ عالم بادشاہ دہلی

○

بعد مجنوں کیوں نہ ہوں میں کارفرمائے جنوں
عشق کی سرکار سے ہم کو رسوائی ملا

خوب سا بید جھومنے کا دیکھ اے سروِ چمن
اس کی رعنائی سے مت تو اپنی زیبائی ملا

جل گیا پروانہ جس دم محفل آرائی کے ساتھ
خاک میں سب شمع نے دی محفل آرائی ملا

طالعِ بیدار کی منت اٹھانے بھی نہ دی
اس سے شب ہم کو تمنا خواب میں لائی ملا

اپنی قسمت میں ازل سے تھی لکھی سرگشتگی
گرد و باد آسا جو کارِ دشت پیمائی ملا

واہ وا! رحمت ہے اس کو اور مجھ کو آفریں
راہ میں بن کر عصا جو خارِ صحرائی ملا

دستگیری بھی نہ کی تو نے کہ جو نقشِ قدم
خاک میں میں تیری خاطر اے توانائی ملا

سرکشی اے چرخ مت کر دیکھ پیشِ آفتاب
خاک میں دے گا یہ ساری تیری خودرائی ملا!

احسان

منشی احسان علی شاہجہانپوری

○

اس کو نہ سوچیے کہ ستم یا کرم ہوا
خنجر اُٹھائیے! سرِ تسلیم خم ہوا

توڑا ہمارے دل کو بتوں نے تو ہم ہوا
وہ بھی انہیں کا قول انہیں کی قسم ہوا

اپنی گلی میں دیکھ کے ہم رو رہے ہیں خوش
نقشِ امید یار کا نقشِ قدم ہوا

کیسا مری وفا نے پشیمان کر دیا
آنکھیں بھی اُن کی جھک گئیں غصہ بھی کم ہوا

دونوں طرف سے جب وہی دل ایک جان ایک
مجھ پر ستم ہوا، تو تمہیں پر ستم ہوا

محرومِ عیش میری طرح دوسرا کہاں
دل میں سرورِ وصل بھی آیا، تو غم ہوا

احسان ضبط کرنے سے اظہارِ رازِ عشق
دل سے بہت ہوا مگر آنکھوں سے کم ہوا

احسن

میرزا احسن

○

نہ نالہ ہے دل میں نہ آہِ حزیں ہے
کوئی دم ہے یاں، سو دمِ واپسیں ہے

گئے دن جو آنکھوں سے بہتے تھے دریا
ادھر دیکھ لو، خشک اب آستیں ہے

گیا دل جو کوچہ میں چین جبیں کے
نہ پھر واں سے نکلا عجب سرزمیں ہے

قدم رکھ نہ اپنا مرے دل سے باہر
کہا مان میرا، یہ گھر دل نشیں ہے

نہ کھینچ آسماں پر تو سر اپنا احسن
سبھی آخرش سب کا مدفن زمیں ہے

اختر

نواب واجد علی شاہ

○

چاک چاک اپنا گریباں نہ ہوا تھا، سو ہوا
بخیۂ دل کا جو ساماں نہ ہوا تھا، سو ہوا

خانۂ دیر میں ساماں نہ ہوا تھا، سو ہوا
کافرِ عشق مسلماں نہ ہوا تھا، سو ہوا

رخِ انور سے مَیں حیراں نہ ہوا تھا سو ہوا
کبھی اے زلف! پریشاں نہ ہوا تھا، سو ہوا

ظلم و جور اے شبِ ہجراں! نہ ہوا تھا، سو ہوا
خانۂ گور میں مہماں نہ ہوا تھا، سو ہوا

چشمِ انصاف سے طوفاں نہ ہوا تھا سو ہوا
دلِ اختر چپتاں نہ ہوا تھا، سو ہوا

اثر

نواب سید امداد امام

○

سنا حالِ دل، پر کہا کچھ نہیں
مگر کان دھر کر سنا کچھ نہیں

نہ گُل پر ہے جوبن، نہ بلبل کو جوش
چمن کی وہ اگلی ہوا کچھ نہیں

عبادت خدا کی بہ امیدِ حور
مگر تجھ کو خوفِ خدا کچھ نہیں

خدا ان سے بندوں کو اپنے بچائے
کہ نزدیک جن کے خدا کچھ نہیں

حسینوں کے انداز مت پوچھئے
جنا ہی جلے ہے، وفا کچھ نہیں

بتوں کی پرستش کہاں تک اثر
مگر تجھ کو خوفِ خدا کچھ نہیں

ارشد

سید احمد الغنی گورگانی

○

الٰہی جان دی ہے میں نے کس کے روئے روشن پر
ہزاروں شمعیں پروانہ ہیں میرے مدفن پر

تعجب کیا خمیدہ ہو اگر تلوار قاتل کی!
چڑھا ہے خون کس کس بے گنہ کا اس کی گردن پر

وہ بے انصاف، اور اپنی وفا کی داد یا قسمت!
گمانِ دوستی ہے سادگی سے ہم کو دشمن پر

عجب اس جلوۂ یکتا میں نیرنگِ تماشا ہے
نئی صورت سے چمکا خاطرِ شیخ و برہمن پر

میں ہوں مرہونِ منت صبح کل کا جب سے اے ارشد
یقین دوستی ہونے لگا ہے مجھ کو دشمن پر

اسد

میر امانی

○

پی کر شراب، دورِ تہ جام دے گیا
وہ شوخ ہم کو بوسہ بہ پیغام دے گیا

آیا جو مے کشی کو چمن میں وہ بادہ نوش
ہر ایک گل کے ہاتھ میں اک جام دے گیا

کھانے کو غم ہے پینے کو خوں، دیکھنے کو داغ
سب عشق کا وہ ہم کو سرانجام دے گیا

کل لڑ گیا کہ اور یہ عاشق ہے تو اسد
آیا ہے جب وہ یاں تو اک الزام دے گیا

اسمٰعیل

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی

○

جو بھلے بُرے کی اُنکل نہ مرا شعار ہوتا
نہ جزائے خیر پاتا نہ گُناہ گار ہوتا

مئے بے خودی کا ساقی مجھے ایک جُرعہ بس تھا
نہ کبھی نشہ اُترتا نہ کبھی خمار ہوتا

میں کبھی نہ مرتا رہتا، نہ غمِ فراق سہتا
اگر اپنی زندگی پر مجھے اختیار ہوتا

یہ جو عشق جانستاں ہے یہ جو بحرِ بیکراں ہے
نہ سُنا کوئی سفینہ کبھی اس سے پار ہوتا

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا
کہ جو کوئی تم سے کرتا، تمہیں ناگوار ہوتا

ہے اس انجمن میں یکساں عدم و وجود میرا
کہ جو میں یہاں نہ ہوتا یہی کاروبار ہوتا

اسیر

مظفر علی

○

آہ کب لب پر نہیں ہے داغ کب دل میں نہیں
کون سی شب ہے کہ گرمی اپنی محفل میں نہیں

بزم کی کثرت سے اندیشہ مرے دل میں نہیں
دل میں اس کی ہے جگہ میرے جو محفل میں نہیں

پنجۂ مژگانِ تر نے یہ اُڑائیں دھجیاں!
تار باقی ایک بھی دامانِ ساحل میں نہیں!

خونِ ناحق کا ہمارے داغ مٹنے کا نہیں
تیغ میں ہوگا، اگر دامانِ قاتل میں نہیں

پردہ دارِ چہرۂ یوسف نہیں ہے ہر نقاب
حُسن لیلےٰ جلوہ گر ہر ایک محمل میں نہیں!

نجد کا صحرا عجب صحرائے وحشت خیز ہے
قیس کیا لیلےٰ کو بھی آرامِ منزل میں نہیں!

جس طرف جی چاہے گا میرا نکل جاؤں گا میں
سینکڑوں دروازے ہیں حلقے سلاسل میں نہیں

حد سے باہر پاؤں جو رکھتا ہے ہوتا ہے خراب
گھر میں جو راحت مسافر کو ہے منزل میں نہیں

ڈوبتے جاتے ہیں کیونکر لوگ حیرت ہے مجھے
قدِ آدم آب بحرِ تیغِ قاتل میں نہیں

ہم غریبوں کا خدا ہے ناخدا درکار کیا
طالبِ ملاح کشتی دستِ ساحل میں نہیں

ہوگیا دہشت سے ایسا بسملوں کا خونِ خشک
ایک بھی دعبا لہو کا تیغِ قاتل میں نہیں

افسوس

میر شیر علی

○

سمندِ گرم جولاں اس سوار کا پہنچا
غبار تا فلکِ اس خاکسار کا پہنچا

تو سچ بتا کہ تجھے اتنی کیوں ہے بےچینی
مگر پیام کسی بےقرار کا پہنچا

مَلے ہے پاؤں سے اپنے وہ لالہ رُو مرہم
یہ مرتبہ تو دلِ داغ دار کا پہنچا

ہے یاں تلک تو نزاکت گلوں کے گجرے سے
لچکنے لگتا ہے اس گلعذار کا پہنچا

قفس سے چھٹنے کی اُمید ہی نہیں افسوس
حصول کیا ہے جو مژدہ بہار کا پہنچا

اشتیاق

ولی اللہ سرہندی

○

خیال دل کو ہے اس گل سے آشنائی کا
نہیں صبا کو ہے دعویٰ جہاں رسائی کا

کہیں وہ کثرتِ عشاق سے گھمنڈ میں آ
ڈروں ہوں میں کہ نہ دعویٰ کرے خدائی کا

مجھے تو روکے تھا زاہد پر اک نگاہ سے آج
غرور کیا ہوا وہ تیری پارسائی کا

جہاں میں دل نہ لگانے کا یوں سے پھر کوئی نام
بیاں کروں میں اگر تیری بےوفائی کا

نہ چھوڑا مار بھی کھا کر گزر گلی کا تری
رقیب کو مرے دعویٰ ہے بےحیائی کا

نہیں خیال میں لاتے وہ سلطنت جم کی
غرور ہے جنہیں در کی ترے گدائی کا

خیالِ یار سے مت اشتیاق پھیر کے مُنہ
خیال کیجو کہیں اور جبہ سائی کا

الم

صاحب میر

○

دھمکاتے ہیں بس مجھ کو فقط آپ اکڑ کر
بانکے ہو تو مونڈھا چلو مونڈھے سے رگڑ کر

ہنگام فغاں تھا خس و پنبہ قفس و دام
تا رگِ گل نے ہے رکھا ہم کو جکڑ کر

جب نام خدا دور سے وہ جلوہ نما ہو
مر جائیں صنوں کی صنمیں حیرت سے پھر کر!

مندیل کا تو پیچ اٹھا بیٹھے گا اے شیخ
چھٹ اسکے نہ کچھ پاوے گا مندوں سے بگڑ کر

آجاتا ہے دکھ درد بھلانے کو الم یاں
کیا اس سے مزا تم ہو اٹھاتے بھلا لڑ کر

امانت لکھنوی

○

شبِ فرقت میں نالوں نے جہاں سر پہ اٹھایا ہے
زمیں کو زلزلہ ہے آسماں چکر میں آیا ہے

حساب آبِ دانہ حشر میں ہوگا، تو کہہ دوں گا
پیا ہے عمر بھر خونِ جگر، غم میں نے کھایا ہے

شفق پھولی ہے دیکھو شام کو شہرِ بدخشاں میں
لبِ رنگیں پہ مسی مل کے اس نے پان کھایا ہے

مری تربت پہ تا نا چاندنی میں کیوں ہے نگہبر
یہ کس نے چادرِ مہتاب میں دھبہ لگایا ہے!

نہیں بے وجہ پیہم ہچکیاں آتی ہیں فرقت میں
کسی محبوب کو تو اے امانت یاد آیا ہے!

آمانی

میر امانی

○

اس کے کوچہ سستی غبار اُٹھا
کون سا دان سے خاکسار اُٹھا

عندلیبو! بسا لو اب صحرا
باغ سے موسمِ بہار اُٹھا

ہچکیاں لے گلا بیاں روئیں
بزم سے جب یہ مے گسار اُٹھا

عزمِ رخصت ہوا جب ہی اس کا
میرے دل سے وہیں قرار اُٹھا

نہیں جو قدرِ اشکِ عالم سے
موتیوں کا مگر وقار اُٹھا

شمع سے سوز آمانی پوچھا ترا
اک دھواں اس کے دل سے یار اُٹھا

امید

قزلباش خان

○

یار بن گھر میں عجب صحبت ہے
در و دیوار سے اب صحبت ہے

دل ہمارا اسے کرتا ہے رات
غیر سے جو سرِ شب صحبت ہے

دردِ دل اس سے جو ہم نے نہ کہا
ایسی حالت ہوئی کب صحبت ہے

دہر میں پاسِ نفس لازم ہے
شیشہ و سنگ یہ سب صحبت ہے

دستِ اغیار ہے زیرِ سرِ یار!
آج امید کڈھب صحبت ہے

امیر

نواب محمد یار خان

○

نرخِ چشم اتنی کہیں ہوتی ہے بیداری سے
لہو اُترا ہے تری آنکھوں میں نوخواری سے

وقتِ رخصت کہے تیرے اے مرے جی کے دشمن
تمام تمام آج دکھا دل کو میں کس خواری سے

بس میں آیا ہو تمہارے اسے چاہو سو کرو
کیا ستم آدمی سہتا نہیں لاچاری سے

کس نے نظروں میں خدا جانے اسے مار ڈالا
نرگس آج آنکھ اُٹھاتی نہیں بیماری سے

کیا کہوں ولولۂ شوق کو تیرے میں امیر
گھر میں جاتے ہیں پرائے تو خبرداری سے

امین

خواجہ امین الدین

○

جس کا دل آپ نے لیا ہوگا
خاک میں لے ملا دیا ہوگا!

ہم کو کیا گر بہار آتی ہے
دل وُہ غنچہ نہیں کہ وا ہوگا

گالیاں غیر سے سُناتے ہو!
ہاں میاں! تم سے اور کیا ہوگا

مل گیا ہوگا خاک میں جُوں اشک
تیری آنکھوں سے جو گرا ہوگا

انجام

عمدۃ الملک امیر خان

○

ملک تو دے فرصت کہ ہو لیں رخصتِ ایام ہم
مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آرام ہم

منہ ترا تکتے ہیں سب اقلیم حسن و عشق کے
تو ہی بتلا دے کریں کس سے تری فریاد ہم

دل تو ہے داغِ غلامی سے تری طاؤس وار
سامنے قمری کے ہیں گو سروِ ساں آزاد ہم

اب کسی نے دل جلایا مہربانی سے تو کیا
عمر، مانندِ شرر، جب کر چلے برباد ہم

ساتھ اپنے سر کے تھا انجام پاسِ تمکنت
شکر ہے! تڑپے نہ زیرِ خنجرِ فولاد ہم

انیس لکھنوی

○

سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے
بنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

بھلا تردّدِ بیجا سے اس میں کیا حاصل
اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

خیال خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

بحر

شیخ امداد علی

○

آنکھ کھلتے ہی میسر ہوا دیدارِ قفس
موئے مژگاں مری قسمت سے ہوئے تارِ قفس

ہم اسیروں کے اگر تیرِ نظر کاری ہیں
ہو گی دیوارِ چمن صورتِ دیوارِ قفس

کہے دیتی ہے بنائے قفسِ تابوتی
مر گئے پر بھی نہ چھوٹیں گے گرفتارِ قفس

ہم صفیرو! کوئی کیا جانے اسیری کا مزا
میں چمن بیچ کے ہوتا ہوں خریدارِ قفس

رو بصحت ہوئے زنداں سے جو مر کر نکلے
گور میں نقل مکاں کرتے ہیں بیمارِ قفس

برق لکھنوی

○

کیا کیا ہوا نہ دامنِ دولت سے چھوٹ کر
مر گیا فراق میں حضرت سے چھوٹ کر

آنکھیں ترس رہی ہیں زیارت کے واسطے
دم بند ہے حضور کی خدمت سے چھوٹ کر

آتا نہیں قرار دلِ بے قرار کو
غم میں پھنسا ہوں دامِ محبت سے چھوٹ کر

آخر تڑپ تڑپ کے گئی جانِ مضطرب
ہرگز نہ ہم بچے کسی صورت سے چھوٹ کر

کیا برق منہ دکھاؤں کہ آتی ہے مجھ کو شرم
زندہ میں ہوں فراق میں حضرت سے چھوٹ کر

بسمل

سید امین الحسن مرحانی

○

پہلے سے دیکھنا کہیں بہتر بنائیں گے
اب اپنا ایک اور ستمگر بنائیں گے

بگڑے ہوئے ہیں ضد پہ ہیں کون ان سے کیا کہے
اس وقت بات بات کے دفتر بنائیں گے

دیکھیں گے اپنے دل کے تحمل کی کیفیت
ہم ان کو آذر چھیڑ کے خود سر بنائیں گے

آنے تو دو بہار کا موسم، جنوں کے دن
اپنے لئے ہم آپ ہی نشتر بنائیں گے

بسمل چلیں گے آج درِ یار تک ضرور
پژمردہ دل کو تیرے گلِ تر بنائیں گے

بقاء

شیخ بقاء اللہ

○

رہرواں کہتے ہیں جس کو، جو سبھی منزل ہے
محنتِ راہ سے نالاں وہ ہمارا دل ہے

موج سے بیش نہیں ہستیٔ دہری کی نمود
صفحۂ دہر پہ گویا یہ خطِ باطل ہے

کچھ تعین نہیں اس راہ میں جوں ریگِ رواں
جس جگہ بیٹھ گئے اپنی وہی منزل ہے

آستیں حشر کے دن خون سے تر ہو جس کی
یہ یقیں جانیو اس کو کہ مراقاتل ہے

کھول دو عقدۂ کونین بقا کے پل میں
یا علیؑ تم کو یہ آساں ہے اسے مشکل ہے

بہار

گلشن الدولہ

○

انھ کھے سے لپٹ جاؤ، پھر نکھر لینا
تمام رات پڑی ہے بناؤ کر لینا

یہ ٹوٹنا، یہ مرا درد، یاد کر لینا
کبھی کبھی تو کلیجہ پہ ہاتھ دھر لینا

ہمارے ساتھ ہے تیرا بھی امتحاں اے تیرا
ترے کے دل جو اگل جائے، تو جگر لینا

ڈرے تو کٹ نہ سکے گا کبھی گلا میرا
یہی خوشی ہو تو آنکھوں پہ ہاتھ دھر لینا

گناہگار پہ یارب نزولِ رحمت کر
خزانہ جو خالی ہو مجھ سے بھر لینا

بہار روز یہ کم بخت منہ کو آتا ہے
گدھ ملا ہے مرا دل، ذرا خبر لینا

بیباک

سید حسین احمد شاہجہانپوری

○

ہر ایک سانس ہے تیغ نگاہ یار مجھے
دیا ہے شوق نے وہ لطف انتظار مجھے

ڈرا ہوا ہوں یہ میں زیست سے محبت میں
ہوا نہ مر کے بھی مرنے کا اعتبار مجھے

یہ مدعا ہے کہ ہو ہر بلا کا اس میں گذر
اسی لئے تو دیا ہے دلِ نگار مجھے

کمی وفا میں اگر ہو، تو وہ جفا نہ کرے
صلاح دیتے ہیں کیا کیا صلاح کار مجھے

سکونِ دل کی تمنا، یہ عشق کا دعویٰ
اسی لئے وہ ستاتے ہیں بار بار مجھے

نگاہِ غیر سے دیکھا اسے تو کیا دیکھا
کہے ابھی مرے مرنے کا اعتبار مجھے

یہ امتحان ہے پیرایۂ تغافل میں
ملا دے خاک میں اے آہ شعلہ بار مجھے

اسی ادا سے کہ او! میرے ڈھونڈنے والے
کہاں ہے تو؟ یونہی اک بار پھر پکار مجھے

وفائے عہد، دمِ نزع، اے بزاک اللہ
اب آپ جائیے! آجائے گا قرار مجھے!

سزا ملے نہ ملے جرمِ عشق پر لیکن
وہ جانتے تو ہیں اپنا گناہگار مجھے

عجیب لطف ہے باتوں کا دل سے اے بیباک
ملا ہے خوب محبت میں رازدار مجھے

بیتاب عظیم آبادی

○

عقل دوڑائی بہت کچھ تو گماں تک پہنچے
کچھ حقیقت بھی ہے انساں کی کہاں تک پہنچے

عشق کے شعلے بھڑک کر رگِ جاں تک پہنچے
آگ سی آگ ہے یہ آگ جہاں تک پہنچے

لڑ گئی ان سے نظر کچھ گئے ابرو اُن کے
سر کے عشق کے اب تیر و کماں تک پہنچے

دل سے باہر ہو ترا راز گوارا ہے کسے
یہ کوئی بات نہیں ہے کہ زباں تک پہنچے

ملے خاکِ درِ ناز تو رتبہ ہو بلند
سر ہو اُونچا مرا گر نوکِ سناں تک پہنچے

کوئی دیوانگیٔ عشق کا قصہ چھیڑے
سلسلہ اس کا خدا جانے کہاں تک پہنچے

سرخیٔ خارِ بیاباں یہ پتہ دیتی ہے
کہ ادھر سے تھے دیوانے یہاں تک پہنچے

رندِ پُرکیف بہ یک گردشِ چشمِ ساقی
غایتِ دائرۂ کون و مکاں تک پہنچے

رُخ سے پردہ کو ہٹا حسنِ یقیں تک پہنچا
آخر انساں ہوں یوں عقل کہاں تک پہنچے

راہ میں اور بھی دیوانوں سے ملتے جلتے
پوچھتے پوچھتے ہم اُن کے مکاں تک پہنچے

شربتِ دیدہ ہو تیغ کا پانی ہی سہی
کوئی ٹھنڈک تو مرے قلبِ تپاں تک پہنچے

لے گئے عشق کی بازی بہ صفائی بیتاب
جان پر کھیل گئے جانِ جہاں تک پہنچے

تجلّی

میاں حاجی

○

طرب کا رنگ، رُخِ گل پہ آشکار آیا
کلی سی کھل گئی جوں ہی وہ گلعذار آیا

تڑپ کے جان نکل جائے گی ابھی صیاد
نہ کہیو باغ میں پھر موسمِ بہار آیا

ملائیں خاک میں مر مر کے، آہ! پر تو بھی
نہ بے قراریٔ دل کے تئیں قرار آیا

مری وفا پہ تجھے روز شک تھا اے ظالم
یہ سر یہ تیغ ہے، لے اب تو اعتبار آیا

یہ شوق دیکھو پسِ مرگ بھی تجلّی نے
کفن میں کھول دیں آنکھیں کہ جو یار آیا

تسکین

میر حسین

○

کر سکے دفن نہ اس کوچہ میں احباب مجھے
خاک میں دل کی کدورت نے دیا داب مجھے

ہجر میں پاس نہ ہے زہر نہ خنجر افسوس
نہ دئے موت کے بھی چرخ نے اسباب مجھے

قاصد آیا ہے وہاں سے تو ذرا تھم اے ہوش
بات تو کرنے دے اس سے دل بیتاب مجھے

نام تسکیں پہ یہ مضمونِ تپش نازیبا،
تھا تخلص جو سزاوار تو بیتاب مجھے

تسلّی

لالہ ٹیکا رام

○

عالم اس بت پہ مبتلا ہی رہا
ان میں فدوی بھی اک فدا ہی رہا

اُٹھ گئی دوستی زمانے سے
آشنائی، نہ آشنا ہی رہا

نہ سُنی تُو نے ایک بات کبھو
ہم کو اس بات کا گِلا ہی رہا

تم خفا ہی رہے تسلّی سے
اور وہ تم پہ نت فدا ہی رہا

تشنہ

محمد عجلی

○

آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے
سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں

شمع ہے، گل بھی ہے، بلبل بھی ہے، پروانہ بھی
رات کی رات یہ سب کچھ ہے سحر کچھ بھی نہیں

حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں

ہستی کی ہے مجھے کوچۂ ہستی میں تلاش
سیر کرتا ہوں اُدھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں

لامکاں میں بھی تو اک جلوہ نظر آتا ہے
بے کسی میں تو ادھر ہوں کہ جدھر کچھ بھی نہیں

ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے اے تشنہ
فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

تنہا

محمد عیسیٰ

○

ہم سے کرتے ہو بیاں غیروں کی یاری آن کر
رہ گئی ہے آپ کی یہ دوست داری آن کر

ہم کو آنے سے تمہاری بزم کے کیا تھا حصول
دیکھ لیتے تھے مگر صورت تمہاری آن کر

روٹھنے پر میرے کیا لازم تھا ہو جانا خفا
بلکہ کرنی تھی تمہیں خاطر ہماری آن کر

طعن بدخواہاں سے تو اک دم نہ پاوے گا قرار
کی جو تیرے در پہ ہم نے بے قراری آن کر

تھا اگرچہ غش میں مجنوں لیکن آنکھیں کھل گئیں
سر پہ اس کے جس گھڑی لیلیٰ پکاری آن کر

بس جگر کشتہ کا تیرے لاشہ تھا خوں میں پڑا
خوب سا رویا وہاں ابر بہاری آن کر

میں بھی کیا برگشتہ طالع ہوں کہ تنہا رات کو
پھر گئی در تک مرے اس کی سواری آن کر

ثاقب

راؤ شہاب الدین خان

○

ہم تو جذبِ دل دکھائیں
اور پھر وہ ہمارے گھر نہ آئیں

کیا پیر کے سینہ دل دکھائیں
کچھ حال سنو تو ہم سنائیں

اے بخت کہاں تلک برائی
اے چرخ! کہاں تلک جفائیں

ہم سینہ سپر کئے کھڑے ہیں
وہ شوق سے غیر آزمائیں

جو کام ہیں غیر کے وہ ہیں صرف
افسوس وہ دل ربا ادائیں

شاید کہ ہے گرمِ نالہ ثاقب
چلتی ہیں شرر فشاں ہوائیں

جوان

مرزا نعیم بیگ

○

یہ ان دنوں جو ہم سے اتنی رکھائیاں ہیں
شاید کسی نے باتیں کچھ کچھ بجھائیاں ہیں

اے عندلیب! سچ کہہ، کیا فصلِ گل پھر آئی
فوجیں جنوں کی ہم پر کیسی چڑھ آئیاں ہیں

کس بے ادب نے تم سے گل بازی آج کی ہے
منہ پر تمہارے چوٹیں کیا سخت آئیاں ہیں

دیوار و در کی چھاتی سوراخ ہو گئی ہے
کیا روزنوں سے اس نے آنکھیں لڑائیاں ہیں

پیوستہ ابرو اس کی میں دیکھ کر یہ سمجھا
دو شاخیں ہیں کہ جھک کر ملنے کو آئیاں ہیں

جوشش

شیخ محمد روشن

○

یاں مدعی اپنا کسے اے یار نہ دیکھا
ہے کوئی جسے تیرا طلب گار نہ دیکھا

سوتوں کو جگایا مرے نالے نے عدم کے
پر طالع خوابیدہ کو بیدار نہ دیکھا

کل بزم میں سب پر نگہ لطف و کرم تھی
اک میری طرف تو نے ستمگار نہ دیکھا

جز چشم بتاں میکدۂ دہر میں جوشش
ہم نے تو کسی مست کو ہشیار نہ دیکھا

حزیں

میر محمد باقر

○

مری رنگیں کلامی کا ہے وہ گل پیرہن باعث
کہ ہووے بلبلوں کی خوش صفیری کا چمن باعث

کوئی ہوتا ہے سنگ سینہ خسرو سے رقیبوں کا
ہوا ناحق ہلاک اپنے کا آپی کوہ کن باعث

جو ہوتا ہے کسی سے انس سب سے وحشت آتی ہے
مری صحرا نشینی کا ہے میرا من ہرن باعث

حزیں ان شعلہ رخساروں سے جی کو مت لگا ہرگز
ہوئی آخر کو پروانے کے جلنے کی لگن باعث

حسامیؔ

مرزا حسام الدین حیدر

○

کئی یک بیک جو ہوا پٹ نہیں دل کو اپنے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے

اے شہر دلی یہ تھا چمن کہ تھا سب طرح کا یہاں امن (؟)
وہ خطاب اس کا تو مٹ گیا، فقط اب تو اُجڑا دیار ہے

یہ عالم بندہ ہوئی کہوں کیا جو ان پہ تعجب ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے، کہا یہ تو قابل دار ہے

شب و روز پھولوں میں جو تُلیں، وہ یُوں نار غم سے فگار ہوں
ملے طوق قید میں جب انہیں کہیں بٹے گُل کے یہ ہار ہے

جو سلوک اور دوست کرتے تھے وہی اب ہیں کتنے ذلیل و خوار
وہ ہیں تنگ چرخ کے جور سے، رہا تن پہ ان کے نہ تار ہے

یہ زمانہ ہے وہ بُرا فلک، ہیولیٰ کے سب سے الگ الگ
نہ رفیق کوئی کسی کا یاں، نہ کسی کا کوئی بھی یار ہے

کیا حسامیؔ ڈر تجھے حشر کا، جو خدا رکھے تجھے برملا
تجھے ہے وسیلہ رسولؐ کا وہی تیرا حامیٔ کار ہے

حسینؔ

سید صادق علی

○

ایسا بھی نہیں درد کے مارے نہیں دیکھے
ہم نے گل و بلبل کے اشارے نہیں دیکھے

جب میں نے کہا مرتا ہوں، منہ پھیر کے بولے
سنتے تو ہیں پر عشق کے مارے نہیں دیکھے

ہر سمت پھرے خاک اُڑاتا کئے برسوں
پر نقش قدم ہم نے تمہارے نہیں دیکھے

پوشیدہ ہیں کس حد میں مری خاک کے ذرے
پتھر میں بھی اس طرح اشارے نہیں دیکھے

تربت میں مرے بند کفن کھول کے بولے
ہم نے دہن زخم تمہارے نہیں دیکھے

اب قبر پہ آئے ہو تو اس سمت بھی دیکھو
ہاں نیچی نگاہوں کے اشارے نہیں دیکھے

بے چین ہے دل فصل بہاری میں حسینؔ کا
اب تک کسی گُل رو کے اشارے نہیں دیکھے

لہ ۔ اردو کے ان پہ شاعر: اردو، اورنگ آباد دکن، جنوری ۱۹۳۷ء

حیاؔ

مرزا رحیم الدین

○

موت ہی چارہ سازِ فرقت ہے
رنج مرنے کا، مجھ کو راحت ہے

ہو چکا وصل، وقتِ رخصت ہے
اے اجل! جلد آ، کہ فرصت ہے

روز کی داد کون دیوے گا
ظلم کرنا تمہاری عادت ہے

کارواں عمر کا ہے رخت بدوش
ہر نفس بانگِ کوسِ رحلت ہے

سانس اک پھانس سی کھٹکتی ہے
دم نکلتا نہیں مصیبت ہے

تم بھی اپنے حیاؔ کو دیکھ آؤ
آج اس کی کچھ اور حالت ہے

حیرانؔ

میر حیدر علی

○

گر یہی وضع ہے اور ہیں یہی ہیہات نصیب
تو نہیں ہو چکی ہیں اس سے ملاقات نصیب

ہم لبِ گور ہوئے خوں بہ جگر اس غم سے
کرتی اس غنچہ دہن سے نہ ہوئی بات نصیب

صبح ہر روز اسی غم میں ہمیں ہوتی ہے شام
آہ! جانے گے مرے کون سی اب رات نصیب

کچھ نہیں شکوہ نہیں جور سے تیرے ہرگز
ہم ہمیشہ سے ہیں اے جان! کچھ آفات نصیب

مسجدوں میں پھرے نت سبحہ پھراتے حیراں
شیخ جی پر نہ ہوئی تم کو کرامات نصیب

خاکسار

محمد یامین

○

تمازلیخا کو جو جاں سے یہ کنعاں عزیز
ہم نے بھی تجھ سے تو بے مہر نہ کی جاں عزیز

مل مجھے قتل کر اس دشمنِ دیں کافر نے
بولا لوگوں سے یہ تھا مردِ مسلماں عزیز

کیوں نہ وہ مصحفِ رُو جاں سے مجھے ہووے زیاد
کس مسلماں کو نہیں دین اور ایماں عزیز

خاکسار اک نگہِ کش سے بھی دیکھا پے تیرا مزاج
آپ میں آ، ذرا اپنے تئیں پہچان عزیز

خلیق

میر مستحسن

○

اشک جو چشمِ خوں فشاں سے گرا
تھا ستارا کہ آسماں سے گرا

آتشِ گل پہ جل کباب ہوا
رات بلبل جو آشیاں سے گرا

شیشۂ دل تو چور ہو جاتا
کوئی پتھر نہ آسماں سے گرا

مَیں نے آنکھوں سے لے لیا اُس کو
پھول جو دستِ باغباں سے گرا

ہنس دیا یار نے جو رات خلیق
کھا کے ٹھوکر اس آستاں سے گرا

دلیر

سید امیر حسن مارہروی

○

عزت اسی کی اہلِ نظر کی نظر میں ہے
سب کچھ بشر میں ہے جو محبت بشر میں ہے

کیا پوچھتے ہو، جوہرِ تیغ نگاہِ ناز
یہ اس سے تیز ہے جو تمہاری کمر میں ہے

قاصد! سوالِ وصل سُنیں اور وہ چپ رہیں
کیا کیا نہ شانِ بے خبری اس خبر میں ہے

کیا جانے کس سوال کا بھیجا ہے یہ جواب
اک تیر، اک چھری، کفِ پیغامبر میں ہے

اور ایک بار قلب کو تڑپائے وہ نگاہ
اتنی سکت ابھی تو ہمارے جگر میں ہے

اے دل! کسی کی یاد بھی اور اضطراب بھی
اتنا نہیں خیال کہ مہمان گھر میں ہے

گھبرائے کیوں نہ کشمکشِ نزع سے دلیر
پہلا یہ اتفاق اسے عمر بھر میں ہے

دیوانہ

دائے سرب سکھ

○

جب نہ تب سنئے تو کرتا ہے وہ اقرار بغیر
گفتگو ہم سے اسے، پر نہیں انکار بغیر

بزم میں رات بہت سادہ و پُرفن تھے، ولے
گرمیٔ بزم کہاں اس بتِ عیار بغیر

دیکھ بیمار کو تیرے، یہ طبیبوں نے کہا
ہو چکی اس کو شفا شربتِ دیدار بغیر

جان پر آ بنی ہمدم، میری، خاموشی سے
بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر

جس کی خاطر کے لئے یار سب اغیار ہوئے
کیونکہ دیوانہ بھلا رہئے اب اس یار بغیر

راسخ

حافظ عبدالرحمٰن

○

کہاں تھے شب! ادھر دیکھو! بھیا کیوں ہے نگاہوں میں
اگر منظور ہے رکھ لو مجھے جھوٹے گواہوں میں

وحدہ وہ ہوں کہ میں سترِ وحدت کان میں کہہ دوں
مؤذن بت کدہ میں ہوں، برہمن خانقاہوں میں

نظر مجھ سے چرا کر، منہ چھپا کر کہتے جاتے ہیں
کہ یہ چوری بھی لکھی جائے گی تیرے گناہوں میں

سیہ کاری مری بن جائے رشکِ گیسوئے خوباں
قیامت کو چھپا بیٹھا رہوں یارب گناہوں میں

وہی راسخ تو ہیں کل تک جو مے خانے کے درباں تھے
بنے بیٹھے ہیں حضرت چار دن سے دیں پناہوں میں

راقم

خواجہ قمر الدین

○

بات کیونکر بنے امید بر آئے کیوں کر
نالہ پر شور نہیں، آہ شرر بار نہیں

آج آتے ہیں مرے شکووں کا لینے وہ جواب
خیر ہے، ہاتھ میں ان کے کوئی تلوار نہیں

مجھ سے نفرت سہی، لذت کشِ آزار تو ہوں
غیر پھر غیر ہے، وہ خوگرِ آزار نہیں

جوشِ مستی میں چلے آئے کہاں تم راقم
یہ تو مسجد ہے چلو، خانۂ خمار نہیں

دلیر

سید امیر حسن مارہروی

○

عزت اسی کی اہلِ نظر کی نظر میں ہے
سب کچھ بسا شہ میں ہے جو محبت بشر میں ہے

کیا پوچھتے ہو، جوہرِ تیغ نگاہِ ناز
یہ اس سے تیز ہے جو تمہاری کمر میں ہے

قاصد! سوالِ وصل نہیں اور وہ چپ رہیں
کیا کیا نہ شانِ بے خبری اس خبر میں ہے

کیا جانے کس سوال کا بھیجا ہے یہ جواب
اک تیر، اک چھری، کفِ پیغامبر میں ہے

اور ایک بار قلب کو تڑپائے وہ نگاہ
اتنی سکت ابھی تو ہمارے جگر میں ہے

اے دل! کسی کی یاد بھی اور اضطراب بھی
اتنا نہیں خیال کہ مہمان گھر میں ہے

گھبرائے کیوں نہ کشمکشِ نزع سے دلیر
پہلا یہ اتفاق اسے عمر بھر میں ہے

دیوانہ

دائے سرب سکھ

○

جب نہ تب سنئے تو کرتا ہے وہ اقرار بغیر
گفتگو ہم سے اسے، پر نہیں انکار بغیر

بزم میں رات بہت سادہ و پُرفن تھے، ولے
گرمیٔ بزم کہاں اس بتِ عیار بغیر

دیکھ بیمار کو تیرے، یہ طبیبوں نے کہا
ہو چکی اس کو شفا شربتِ دیدار بغیر

جان پر آئی ہمدم، میری، خاموشی سے
بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر

جس کی خاطر کے لئے یار سب اغیار ہوئے
کیونکہ دیوانہ بھلا رہئے اب اس یار بغیر

راسخ

حافظ عبدالرحمٰن

○

کہاں تھے شب ؟ ادھر دیکھو ! حیا کیوں ہے نگاہوں میں
اگر نظروں سے رکھ لو مجھے جھوٹے گواہوں میں

وحدہ وہ ہوں اگر میں سرِ وحدت کان میں کہہ دوں
خود اپنے بت کدہ میں ہوں، برہمن خانقاہوں میں

نظر مجھ سے چُرا کر، منہ چھپا کر کہتے جاتے ہیں
کہ یہ چوری بھی لکھی جائے گی تیرے گناہوں میں

سیہ کاری مری بن جائے رشکِ گیسوئے خوباں
قیامت کو چھپا بیٹھا رہوں یارب گناہوں میں

وہی راسخ تو ہیں کل تک جو مے خانے کے دربان تھے
بنے بیٹھے ہیں حضرت چار دن سے دیں پناہوں میں

راقم

خواجہ قمرالدین

○

بات کیونکر بنے امید بر آئے کیوں کر
نالہ پر شور نہیں، آہ شرر بار نہیں

آج آتے ہیں مرے شکووں کا لینے وہ حساب
خیر ہے، ہاتھ میں ان کے کوئی تلوار نہیں

مجھ سے نفرت سہی، الفت کش آزار تو ہوں
غیر پھر غیر ہے، وہ خوگرِ آزار نہیں

جوشِ مستی میں چلے آئے کہاں تم راقم
یہ تو مسجد ہے چلو، خانۂ خمار نہیں

رخشاں

نواب ضیاء الدین حسان

○

پی کے گرنے کا ہے خیال ہمیں
ساقیا! لیجئے سنبھال ہمیں

شب نہ آئے جو اپنے وعدے پر
گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں

تیرے غصہ نے ایک دم میں کیا
مردۂ صد ہزار سال ہمیں

دل میں مضمر ہے معنیٔ باقی
کسی صورت نہیں زوال ہمیں

طالعِ بد سے نیّرِ رخشاں
اپنے ہی گھر میں ہے وصال ہمیں

رسا رامپوری

○

ساقی جو دے جائے یہ کہہ کر کہ پیئے جا
تو میں بھی پیئے جاؤں یہ کہہ کر کہ دیئے جا

جانے کی جو ضد ہے تو مجھے زہر دیئے جا
اتنا تو کہا مان لے اتنا تو کیئے جا

کچھ اور نہ کر مجھ پہ جفائیں تو کیئے جا
کچھ اور نہ لے میری دعائیں تو لیئے جا

کیا لذتِ تعزیر نے مجبور کیا ہے
آتا ہے یہی جی میں کہ تقصیر کیئے جا

کم بخت رسا تیری رسائی نہیں ان تک
تو خوب سا اسلام کو بدنام کیئے جا

رشک

میر علی اوسط

○

جو رنج نوشتہ میں ہے کبونکر نہ ملے گا
لکھوائیں گے نامہ، تو کبوتر نہ ملے گا

جس رات نقاب اس مہ کامل نے اُلٹ دی
تاروں کو نشانِ مہ انور نہ ملے گا

اے شب فرقت ہے بندھے آنسوؤں کا تار
اس طرح کا وقت اے ثمرۂ تر نہ ملے گا

کاہیدگیٔ جسم اگر یوں ہی رہے گی
ہم کو بھی ہمارا تن لاغر نہ ملے گا

انساف کو سمجھو خضرِ راہِ ہدایت
اے اشک اب ایسا کوئی رہبر نہ ملے گا

رشکی

نواب محمد علی خان

○

غصہ آتا ہے پیار آتا ہے
غیر کے گھر سے یار آتا ہے

مے پلانی اگر نہیں منظور
ابر کیوں بار بار آتا ہے

تیرے رونے سے اب مجھے بھی ہے خوف
دیدۂ اشک بار آتا ہے

دردِ دل کیا بیاں کروں رشکی
اس کو کب اعتبار آتا ہے

زکی

نواب محمد ذکریا خان

○

اسیری میں تباہی رونقِ کاشانہ ہو جائے
قفس ہی نالوں سے جل کر چراغِ خانہ ہو جائے

تغافل، سازگارِ شوقِ اہلِ درد کیسا ہوگا
ادا سے دو فریب ایسا کہ دل دیوانہ ہو جائے

نہ کہنا غیر سے قاصد کہ میں مطلب نہیں سمجھا
پیامِ یار ہے بے معنیٔ بیگانہ ہو جائے

نہیں کیوں حضرتِ موسیٰ کی بیتابی کے ہم پیرو
کہ رازِ دل زباں پر آئے اور افسانہ ہو جائے

کہاں تک ضبطِ بیتابیٔ دلِ مسکیں مجھے ڈر ہے
تری خوئے تحمل سے وہ بے پروا نہ ہو جائے

فغاں کرتے ہوئے جا پہنچوں اس کی بزمِ عشرت میں
کبھی تو اے زکی یہ شوخیٔ رندانہ ہو جائے

سجّاد

• میر سجّاد اکبر آبادی

○

دل ہو گیا پھولا پیارے تام جل کے
کیا تجھ نہال سے ہوں امیدوار پھل کے

تنہا نہ دل مرے نے زلفوں سے تاب کھایا
گلشن کے بیچ سنبل کھاتا ہے تاب بل کے

ایسے ترے بھکنے دانتوں کو دیکھ پیارے
پانی ہو جائے موتی مارے نہ کیوں کہ جھلکے

کیا جانتا تھا مجھ کو رسوا کریں گے سب میں
یہ طفلِ اشک میرے آنکھوں کے بیچ پل کے

سحر بھوپالی

○

سینہ میں دل ہے دل میں داغ، داغ میں سوزِ سازِ عشق
پردہ بہ پردہ ہے نہاں پردہ نشیں کا رازِ عشق

بندہ کے صف ہوں سب کھڑے تیغ کے ساتھ سر جھکے
آج تو قتل گاہ میں دھوم سے ہو نمازِ عشق

کوہ پہ جانِ کوہکن، دشت میں جانِ قیس لی
بل بے تری چڑھائیاں اُف رے یہ ترکتازِ عشق

نام و نشاں مٹا چکے شوقِ جفا و ذوقِ جور
جان و جگر جلا چکے سوزِ دل و گدازِ عشق

پردہ میں رہ کے الحذر گوشہ میں چھپ کے الاماں
ہم کو خبر ہے ہو گیا حُسن سے سازباز عشق

سر کو کٹا کے لوٹ لی دولتِ وصلِ سرمدی
تیغ کے گھاٹ قطع کی ہم نے رہِ درازِ عشق

خاص خدا کا وہ مقام دل میں خدا کے اُس کا گھر
عرش سے کچھ بلند ہے درگہِ بے نیازِ عشق

فرشِ زمیں پہ مصطفےٰ عرشِ بریں پہ کبریا
پہنچا ہے دیکھنا کہاں سلسلۂ درازِ عشق

سلیمان

نواب سلیمان شکوہ

○

ساقیا! ہے یہ جام کا عالم
جیسے ماہِ تمام کا عالم

کبک رفتار اپنی بھول گئے
دیکھ اس کے خرام کا عالم

اب خدا پھر ہمیں نہ دکھلائے
شبِ ہجراں کی شام کا عالم

تجھ پہ ہے ان دنوں میں نامِ خدا
کچھ عجب دھوم دھام کا عالم

شادؔ

مہاراجہ سر کشن پرشاد

○

بادۂ خم خانۂ توحید کا مے نوش ہوں
چور ہوں مستی میں ایسا بیخود و مدہوش ہوں

گرد پھرنے سے مجھے ساقی یہ میرا فرض ہے
مثلِ ساغر دور میں ہوں، بادۂ سرجوش ہوں

طرزِ خاموشی مری بتلاتی ہے اس راز کو
ہوں تو اسرارِ حقیقت لاکھ میں خاموش ہوں

دردمندِ عشق ہو کر ضبط کا خوگر ہوں میں
صورتِ سیماب ہو کر، پیکرِ خاموش ہوں

کس کی وقت، جہل کس کا اور ہے معشوق کون
شادؔ میں اس نامہ نگیں کا ہم آغوش ہوں

شادؔ

حکیم سید محمد غازی پوری

○

بلبل کو پھر چمن میں لگا لائی بوئے گل
اے کاش ہوتی گلبدنوں میں بھی خوئے گل

دل داغ داغ اس میں خیالِ خرامِ ناز
جس طرح اڑتی پھرتی ہو گلشن میں بوئے گل

عاشق ہی جب نہیں تو خزاں ہے بہارِ حسن
بلبل کے ساتھ ساتھ گئی آبروئے گل

رازِ محبت اور دلِ غنچہ، تا بہ کے
نکلے گی بوکے پردے میں ہر آرزوئے گل

لو شادؔ سیرِ گل سے بھی نفرت ہوئی انہیں
سمجھے مگر کہ بوئے محبت ہے بوئے گل

شرر

مولوی عبدالحلیم لکھنوی

○

کیا سہل سمجھے ہو، کہیں دھبا چٹانہ ہو
قائم یہ میرا خون ہے رنگ حنا نہ ہو

یارب! مجھے ہے داغ تمنا بہت عزیز
پہلو سے دل جدا ہو، مگر یہ جدا نہ ہو

راہیں نکالتا ہے یہی سوز و ساز کی
پہلو میں دل نہ ہو تو کوئی حوصلا نہ ہو

تم اور وفا کرو، یہ نہ مانوں گا میں کبھی
اس کو فریب دو، جو تمہیں جانتا نہ ہو

کیا کیا شرر ذلیل ہوئے، آبرو گئی!
ایسا بھی عاشقی کا کسی کو مزا نہ ہو

شفق عماد پوری

○

دل تڑپ جائے نہ کیوں سن کر فغانِ اہلِ درد
ان سے پوچھو، جو سمجھتے ہیں زبانِ اہلِ درد

ایک سے اک بڑھ کے ہے دلچسپ، دلکش داستاں
حالِ دل، افسانۂ غم، داستانِ اہلِ درد

یہ تو کہیئے منہ سے اک اُف تک کسی نے کی کبھی؟
لے چکے ہیں آپ اکثر امتحانِ اہلِ درد

ہاتھ دھو لے جان سے کوئی، تو جی بھر کر سنے
جاں ستانِ اہلِ دل ہے، داستانِ اہلِ درد

کس کے آگے درد دل اپنا کہو گے تم شفق
کوئی دنیا میں نہیں اب قدر دانِ اہلِ درد

شوقؔ

شیخ احمد علی مذاقیؔ

○

رُوح کو آج ناز ہے اپنا وقار دیکھکر
اُس نے چڑھائیں تیوریاں میرا قرار دیکھ کر

قصد گلہ نہ تھا مگر حشر میں جوشِ شوق سے
ہاتھ مرا نہ رک سکا ، دامنِ یار دیکھ کر

دیکھ کے ایک بار انہیں دل سے تو ہاتھ دھو چکے
دیکھئے کیا گزرتی ہے دوسری بار دیکھکر

آتے ہیں وُہ تو چلے ہی بنج سے صاف ہو رہوں
آکے کہیں پلٹ نہ جائیں دل میں غبار دیکھکر

کہے کو جانہ شوقؔ ابھی ، نیت زندگی بخیر!
ہم بھی چلیں گے تیرے ساتھ اب کی بہار دیکھکر

وصل سے گذرے اے خُدا! ہاں یہ شگون چاہئے
صُبح کو ہم اُٹھا کریں روئے نگار دیکھ کر

شیدؔا

مسیح الملک حکیم اجمل خان

○

کچھ بات ہی تھی ایسی کہ تقاضے جگر گئے
ہم اور جاتے بزمِ عدو میں مگر گئے

یہ تو خبر نہیں کہ کہاں اور کدھر گئے
لیکن یہاں سے دُور کچھ اہلِ سفر گئے

ارماں جو ہم نے جمع کئے تھے شباب میں
پیری میں وہ خدا کو خبر ہے کدھر گئے

رتبہ بلند ہے مرے داغوں کا اس قدر
میں ہوں نہیں کہ داغ مرے تا قمر گئے

رخسار پر ہے رنگ حیا کا فروغ آج
بوسے کا نام میں نے لیا وُہ نکھر گئے

دنیا بس اس سے اور زیادہ نہیں ہے کچھ
کچھ روز ہیں گزارنے اور کچھ گزر گئے

جانے لگا ہے دل کی طرف ان کا ہاتھ اب
نالے شبِ فراق کے کچھ کام کر گئے

حسرت کا یہ مزا ہے کہ نکلے نہیں کبھی
ارماں نہیں ہیں وُہ کہ شبِ آئے ، سحر گئے

بس ایک ذات حضرتِ شیدا کی ہے یہاں
دہلی سے رفتہ رفتہ سب اہلِ ہُنر گئے

صبا

لالہ کانجی مل

○

سحر جب بستر راحت سے وہ رشکِ قمر اُٹھا
ہوئی اس کی میں خورشید نے تیغ و سپر اُٹھا

ابھی سنبھلیں ہوئی تھی اک ذرا فریاد و زاری سے
کہ دل مضطرب ہونے کہ پھر دردِ جگر اُٹھا

گلے پہ میرے خنجر پھیرتا وہ اور بھی لیکن
ہوئی مجھ سے خطا اتنی کہ میں فریاد کر اُٹھا

نہیں معلوم اے یار و صبا کے دل میں کیا آیا
ابھی جو بیٹھے بیٹھے وہ یکایک آہ کر اُٹھا!

صفیر

سید فرزند احمد، بلگرامی

○

شگفتہ ہو کے بیٹھے تھے وہ اپنے بے قراروں میں
تڑپ بجلی کی پیدا ہو گئی پھولوں کے ہاروں میں

کیا نذر اپنے رنج نے ان کی کدورت نے
بجھی شمع محبت ہائے وہ دل کے غبارو میں

شبِ فرقت کو زاہد سے سوا مرمر کے کاٹا ہے
کرے مشہور ہم کو بھی خدا شب زندہ داروں میں

یہ کس نے کشتۂ تیغ تبسم کر دیا مجھ کو
مبارک باد کا غل ہو رہا ہے سوگواروں میں

وہ عشرت جس کا سب ارماں ہے دل میں، ہو نہیں سکتی
مری مجبوریوں کو دیکھئے ان اختیاروں میں

ہمیں وہ ڈھب جو آجاتا، نہیں پر آزماتے ہم
دلِ عشاق تم کیا کہہ کے لیتے ہو اشاروں میں

صفیر اب بس کرو! کب تک سرِ شوریدہ زانو پر
غزل کی فکر کیونکر ہو سکے گی انتشاروں میں؟

ضیاؔ

میر ضیاء الدین

○

دل رُبا ہے مرا بڑا گستاخ
میں نے اتنا نہ سمجھا تھا گستاخ

اب تو وہ شوخیاں لگا کرنے
یک بیک ایسا ہو گیا گستاخ

ناز بے جا کبھی نہ کرتا تھا
یک بیک ایسا ہو گیا گستاخ

جاں فشانی ہم اس پہ کرتے ہیں
رام ہرگز نہ وہ ہوا گستاخ

اے ضیاؔ کیجو سب سمجھ کے کلام
وہ صنم تو ہے بے وفا گستاخ

صنعت

شیخ کریم الدین مراد آبادی

○

وصل کی شب میں بھی ہم با ہمدگر رویا کیے
میں جدائی سے وہ میرے حال پر رویا کیے

اُس نے زانو غیر کا اپنے رکھا جب زیرِ سر
اپنے زانو پر ہم اپنا رکھ کے سر رویا کیے

اُس نے آنسو غیر کے پونچھے جب اپنے ہاتھ سے
ہنستیں! یہ ماجرا ہم دیکھ کر رویا کیے

ہو گیا مشکل مری مژگاں سے مژگاں کا ملاپ
حائل اک دریا ہوا، ہم اس قدر رویا کیے

رُخ زرد بے آبروئی میں بھی ہم صنعت رہے
خشک جب آنسو ہوئے، لختِ جگر رویا کیے

طاہر

شوخ آبادی

○

ل لیا ہیں حسینوں سے ہم گوشہ گیر ہیں
رت گروں نے لوٹ لیا ہے فقیر ہیں

ل بچائے زہرہ جبینوں کی چاہ سے
نسے ہیں دو فرشتے ابھی تک اسیر ہیں

ر آنکھیں ہم نے کی ہیں تو غصہ نہ کیجئے
ل نہیں، فقیر نہیں، راہ گیر ہیں

ر پر تمہارے بیٹھے ہیں، سر پر ہے آفتاب
ہم خاکسار مالکِ تاج و سریر ہیں

وہ بھی تو روئیں اے اثرِ گریہ ایک دن
جن کی نگاہ میں مرے آنسو حقیر ہیں

کھا دیں گے، اف صاف وہ دیکھیں تو آئنہ
یہ مانگ ہے لکیر ہم اس پر فقیر ہیں

نظروں سے کیا گرائیں گے طاہر عدو مجھے
فضلِ خدا سے دستِ خدا دستگیر ہیں

عاجز

عارف الدین خان

○

عرق جب اس پری کے چہرۂ پُر نور سے ٹپکے
عجل ہو گل سے شبنم، جوں لہو ناسور سے ٹپکے

مری آنکھوں سے خونیں اشک یوں گرتے ہیں پلکوں پر
لہو سولی کے اوپر جوں سرِ منصور سے ٹپکے

اگر کیفِ سخن میرا نہاں تاک کر پہنچے
صراحی شاخ بن جائے، شراب انگور سے ٹپکے

اگر اس زلفِ مشک آمیز سے چینی میں بال آوے
عجب میں عطر و عنبر کاسۂ فغفور سے ٹپکے

کروں فریاد رو رو یار کو جب یاد کر عاجزؔ
دمِ اسرافیل کا لوہو ہو بانگِ صور سے ٹپکے

عارفؔ

حکیم نواب جہان خان

○

لفظ کب نگاہ ناز نہیں
دل ہی خود نیشتر نواز نہیں

جانتا ہوں تری نگاہ کو میں
اور پھر آشنائے راز نہیں

ہائے وہ دل کہ بے قرار خلش
وائے وہ سر کہ سرفراز نہیں

آ، بتاؤں تجھے میں راز کی بات
راز یہ ہے کہ کوئی راز نہیں

اب یہ عالم ہے تیرے حسن کی خیر!
ہوش و مستی میں امتیاز نہیں

واقفِ راز ہر دو عالم ہوں
کیا کروں محرمِ شرحِ راز نہیں

آؤ! مسجد میں پڑ رہیں عارفؔ
درِ مے خانہ آج باز نہیں

عبرتؔ

اکبر حسین موہانی

○

دل ہے، نہ نشانِ بے دلی کا
کیا وقت پڑا ہے بے کسی کا

دیکھا کیے راستہ کسی کا
تھا شغل یہ اپنی زندگی کا

پروائے کرم، نہ شکوۂ غم
اللہ رے داغ! بے دلی کا

ہیں اور یہ بے نیازیٔ شوق
احسان ہے جوشِ بے خودی کا

مرنا، مرنے کی آرزو میں
حاصل ہے یہ اپنی زندگی کا

آنسو بھر آئے، دل بھر آیا
گر نام بھی سن لیا خوشی کا

آخر عبرتؔ نے جان دے دی
کچھ پاس کیا نہ بے کسی کا

قدرت

شاہ قدرت اللہ

○

ل کی نیرنگی یہ برقِ خاطرِ مایوس ہے — جو شررِ دل سے اُٹھا سو جلوۂ طاؤس ہے
و طاقت تو کبھی کے کوچ یاں سے کر گئے — اب دو داغ ننگ ہے اور رخصتِ ناموس ہے
ی کو چنے ہوا دو وہی ہے کاوشِ مدام — ہر تلاشِ یاں شمع کی برقِ دلِ فانوس ہے

ق

س اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے — کیا ہے ملکِ روم کیا ہی سرزمینِ طوس ہے
ر ہو، تو کیا عبرت سے کیجے زندگی — اس طرف آ، از طلی اور جرصدائے کوس ہے
ے تا شام ہوتا ہوئے گلگوں کا ذور — شب ہجو کی تو ماہ رویوں کا بوسہ ہے
ی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے — چل دکھاؤں تو کہ قید آز کا محبوس ہے
ی یکبارگی گورِ غریباں کی طرف — جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے
ی دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے — یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
ان سے کہ جاہ و ملک دنیا سے آج — کچھ بھی ان کے پاس غیر از حسرتِ افسوس ہے
ی پردہ کے یہ سب سمجھے تو ہیں الاپ — گر صدائے بانگ ہے در نغمۂ ناقوس ہے

کل تو قدرت پائے خم رکھے تھی تسبیح ریا
آج رہن جامہ ہے، یہ خرقۂ سالوس ہے

قلق

آفتاب الدولہ لکھنوی

○

ادا سے دیکھ لو، جاتا رہے گلہ دل کا
بس اک نگاہ پہ ٹھیرا ہے فیصلہ دل کا

وہ ظلم کرتے ہیں مجھ پر، تو لوگ کہتے ہیں
خدا بُرے سے نہ ڈالے معاملہ دل کا

پھرا جو کوچۂ قاتل سے کوئی پوچھیں گے
سنا ہے لٹ گیا رستے میں قافلہ دل کا

ہزار فصلِ گل آئے جنوں! وہ جوشِ گماں
گیا شباب کے ہمراہ ولولہ دل کا

بہار آتے ہی کنجِ قفس نصیب ہوا
ہزار حیف کہ نکلا نہ حوصلہ دل کا

الٰہی خیر ہو! کچھ آج رنگ بے ڈھب ہے
ٹپک رہا ہے کئی دن سے آبدِ دل کا

خدا کے ہاتھ ہے اب اپنا اے قلق انصاف
بتوں سے حشر میں ہوگا معاملہ دل کا

فدوی لاہوری

○

ٹلتے ہیں کوئی ہاتھ چلے یا زباں چلے
ہم داد خواہ ساتھ ہیں اس کے، جہاں چلے

کیا ہمسری ہو تیر کی اس تیرہ آہ سے
یہ، یہ ہی تیر ہے کہ صدا بے کماں چلے

سر پہ تو دھر کے نعش ہماری کو تا مزار
ہر اک قدم پہ روتے ہوئے نوفشاں چلے

لائے تھے سر پہ دھر کے کس اخلاص سے ہمیں
بس آنکھ اوجھل ہوتے ہی اے دوستاں چلے

یاروں نے اپنی راہ لی فدوی یہیں رہے
وہ چیز اب کہاں ہے کہ پوچھے کہاں چلے

فراق

شکیل اللہ

○

غیر کے دل میں نہ جا کیجئے گا
میری آنکھوں میں رہا کیجئے گا

کاسۂ چشم کو لے در پہ ترے
بے نوایانہ صدا کیجئے گا

زائرانِ حرم و دیر کبھو
میرے حق میں بھی دعا کیجئے گا

وائے اس اپنی سیہ بختی پر
خواہشِ زلفِ رسا کیجئے گا

فقیر

میر شمس الدین

○

دردمندوں سے نہ پوچھو کہ کدھر بیٹھ گئے
تیری مجلس میں غنیمت ہے جدھر بیٹھ گئے

ہے فراغ دیدہ، یاں کام تکلف سے نہیں
خواہ اِدھر بیٹھ گئے، خواہ اُدھر بیٹھ گئے

دیکھا ہووے گا مرے اشک کا طوفاں تم نے
لاکھ دیوار گرے، سینکڑوں گھر بیٹھ گئے

کس نظر باز نے اس باز کو بخشی پرواز
سینکڑوں مرغ ہوا پھاند کے پر بیٹھ گئے

کم ہے آواز ترے کوچہ کے باشندوں کی
نالہ کرنے سے نکلے ان کے مگر بیٹھ گئے

منت اُٹھنے کے نہیں یار کے کوچہ سے فقیر
جب کہ بستر کو جما، کھول کمر بیٹھ گئے

قدر

سید غلام حسین بلگرامی

○

ہونے کارواں سے جُدا جو ہم، رہِ عاشقی میں فنا ہوئے
جو گرے تو نقشِ قدم بنے جو اُٹھے تو بانگِ درا ہوئے

جو ہوا سے زلف بکھر گئی، نظر ان کی صاف بدل گئی
جو اسیرِ حلقۂ ناز تھے وہ قتیلِ تیغ ادا ہوئے

ہُوا بعد وصل عجب مزا کہ خوش بیٹھے جسد اجُدا
ہمہ تن میں صبر و سکوں ہُوا، ہمہ تن وہ شرم و حیا ہوئے

اُٹھے ہم جو خواب و خیال سے لگے تکنے دیدۂ حال سے
کہ وہ کب اُٹھے، وہ کدھر گئے، ابھی پاس تھے ابھی کیا ہوئے

جو نگہ ہے چشمِ سیاہ میں وہی برق طور ہے راہ میں
تری آنکھ پر جو فدا ہوئے، وہ شہید راہِ خدا ہوئے

بنے قدر ایسے غبار ہم، ہوئے گردشوں میں وہ خوار ہم
کہ مثالِ دائرۂ فلک، جو اُٹھے تو بے سر و پا ہوئے

عشق عظیم آبادی

○

ہم نے تو خاک بھی دیکھا نہ اثر رونے میں
عمر کیوں کھوتے ہو، اے دیدۂ تر رونے میں

رات کب آئے تم اور کب گئے، معلوم نہیں
جان! اتنی نہ رہی ہم کو خبر رونے میں

جب تلک اشک تھیں، بیٹھ! اگر آیا ہے
تیری صورت نہیں آتی ہے نظر رونے میں

تجھ کو اے دیدۂ تر شغل ہے رونا لیکن
ڈوبا جاتا ہے یہاں دل کا نگر رونے میں

عالم عشق میں مجنوں بھی بڑا گاڑھا تھا
یار مجنوں سے بھی ہم گاڑھے ہیں پر رونے میں

عظیم

مرزا عظیم بیگ

○

کل چشم خوں فشاں سے گلزار پیرہن تھا
دامن کا تھا جو تختہ، یک تختۂ چمن تھا

کیجے عظیم کو بھی یارب غریق رحمت
آوارۂ جنوں سا اک صاحب سخن تھا

اور معنی بند ایسا، ہندی زباں کا صاحب
ہندوستان سے لے کر مشہور تا دکن تھا

اک دن جو گھر سے نکلا خطِ شعاع آسا
بکھرا ہوا بدن پر ہر تار پیرہن تھا

دیکھا جو دفن کرتے جوں شمع پر ہو فانوس
تربت میں دور تن سے بالشت بھر کفن تھا

کمال

شاہ کمال الدین

○

جوں قدم یار نے گھر سے مرے در پر رکھا
سر رکھا زانو پہ میں، ہاتھ جگر پر رکھا

ہم کو صیاد نے رکھا جو قفس میں تو آہ
دستِ شفقت کبھی ظالم نے نہ سر پر رکھا

سنگِ رہ اس کی گلی کا جو کوئی ہاتھ آیا!
مثلِ گل میں نے اُٹھا کر اسے سر پر رکھا

بیٹھے بیٹھے تجھے کون آگیا یاد آج کمال!
تو نے رومال جو لے دیدۂ تر پر رکھا

گستاخ

کرامت اللہ خاں رامپوری

○

ساغر میں شکلِ دخترِ رز کچھ بدل گئی
نم سے نکل کے نور کے سانچے میں ڈھل گئی

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو سے کدے سے تو دنیا بدل گئی

کہتی ہے نیم وا یہ چمن کی کلی کلی
فریادِ عندلیب کلیجہ مسل گئی

ساقی ادھر اٹھا تھا ادھر ہاتھ اُٹھ گئے
بوتل سے کاگ اُڑا تھا کہ رندوں میں چل گئی

انگڑائی لے کے اَور بھی وہ سوئے چین سے
پھولوں کی پنکھیا جو نسیم آکے جھل گئی

دامن میں دخترِ رز نے لگایا ضرور داغ
جس پارسا کی گود میں جا کر مچل گئی

گھبرا کے بولے نامۂ گستاخ تو نہیں
جب ان کے پاس کوئی ہماری غزل گئی

گویا

قلب فقیر محمد خان

○

اس کو غفلت پیشہ کہہ آتے ہیں ہم
بھول جانا یاد دلواتے ہیں ہم

ضعف سے رہتا ہے اب پاؤں پہ سر
آپ اپنی ٹھوکریں کھاتے ہیں ہم

دل نہیں اس بت کی اُلفت چھوڑتا
ناسمجھ کو لاکھ سمجھاتے ہیں ہم

ہے جنازہ اس لئے بھاری مرا
حسرتیں دل کی لئے جاتے ہیں ہم

بارِ عصیاں سر پہ ہے گویا بہت
کیا اُٹھائیں سر، جھکے جاتے ہیں ہم

مائل

مرزا محمد یار بیگ

○

اختر سے تھے گر موتی اس کان کے بالے کے
اک چاند بھی جھلکے تھا جھرمٹ میں دو شالے کے

فانوس میں کب دیکھا یوں شمع کے شعلے کو
جھلکے ہے بدن اس کا جوں کرتے میں والے کے

جوں کان میں ہے تیرے یہ موتیوں کا بالا!
کب گرد ستارے ہیں یوں چاند کے ہالے کے

وہ زلف جو ڈس جاوے تو خاک جیئے کوئی
بچتے ہیں کہیں مائل کاٹے ہوئے کالے کے

محب

شیخ ولی اللہ

○

اس بت نے گلابی جو اٹھا منہ سے لگائی
شیشے میں عجب آن سے جھکے تھی حنائی

عالم میں نشے کے شب مہتاب نے تیرے!
خورشید سے ٹکڑے نے طلسمات دکھائی

کیا غیر سے ملنے کی قسم کھاتے ہو پیارے
چھپتی نہیں وہ بات جو ہو دل سے بنائی

واللہ! ہیں عشق کی سب بھولی ہوئی چال
کافر تری رفتار نے پھر یاد دلائی!

ہر دم تو بھرا شیشہ جھکاتا ہے نشہ میں
ڈرتا ہوں کہ تیری نہ مڑک جائے کلائی

آئینہ مدد پوش ہوا عشق میں تیرے
چار ابروؤں کی لے کے فقیرانہ صفائی

ہم جھوٹ کہیں تو نہ ہو دیدار خدا کا
ہے روز قیامت، تری اک شب کی جدائی

عاشق کو محب سلطنت ہر دو جہاں ہے
گر یار کے کوچہ کی میسر ہو گدائی!

محنت

مرزا حسین علی

○

ناصح! نصیحت نہ سنا، میں نہیں سنتا
بک بک کے مرا مغز نہ کھا میں نہیں سنتا

احوال مرا دھیان سے سنتا تھا، و لیکن
کچھ بات جو سمجھا، تو کہا، میں نہیں سنتا

اس بت نے جو غیروں پہ کیا لطف تو یارو!
مجھ سے نہ کہو بہر خدا، میں نہیں سنتا

کچھ ذکر میں ذکرا پنا میں لایا تو وہ بولا
بس بات کو اتنا نہ بڑھا میں نہیں سنتا

شکوہ سے ہی کرتا ہے جو کوئی اس سے مرا ذکر
تو کہتا ہے ہر اک کا گلہ میں نہیں سنتا

محنت کہے یہ ضعف کہ کچھ اپنی حقیقت
کہتا ہے وہ مجھ سے، تو ذرا میں نہیں سنتا

محوی

مولوی محمد حسین لکھنوی

○

صلائے عام ساقی ہے کہ آؤ! اصفا کر دوں
فنا کی مے پلا کر مست و مدہوش بقا کر دوں

تمنائے وصال یار ہے تفریح روحانی!
جو قابو ہو تو اپنی جان و دل تم پر فدا کر دوں

مری رنگیں بیانی منحصر ہے ذکر جاناں پر
مضامیں معرفت کے جس طرح چاہوں ادا کر دوں

ستم ہے، سر جھکا کر، مسکرا کر یار کا کہنا!
لے خون دل عاشق تو میں ترک حنا کر دوں

خیال غیر سے نفرت دل عاشق کو لازم ہے
محبت ان کی کہتی ہے کہ ترک ماسوا کر دوں

صدائے نالۂ پیہم، نوائے صور ہے گویا
کہو تو میں ابھی ہنگامۂ محشر بپا کر دوں

تمہیں آئینۂ وحدت میں دیکھو شان محبوبی
میں اے محوی یہ عقدہ راز کا کس طرح وا کر دوں

مروت

صغیر علی

○

کیوں تو نے وا کیا تھا بند قبا چمن میں
اڑتی پھرے ہے بلبل گل سے خفا چمن میں

ہر سمت اب صبا جو پھرتی ہے خاک اڑاتی
بلبل کے پر پڑے ہیں کیا جا بجا چمن میں

نرگس کی آنکھ تجھ پر پڑتی ہے بے طرح سی
مت وقت شام جانا بہر خدا چمن میں

جوں لالہ داغ دل یاں پھر جل اٹھا ہے شاید
جاتا ہے سیر کرنے وہ بے وفا چمن میں

بیباکیا گل نے پھاڑا بلبل ہوئی مروت
کیوں اپنے غم کا قصہ تو نے کہا چمن میں

مضطر

حکیم اسد علی خان

○

تیری نگاہِ ناز جو ناوک اثر نہ ہو
تکلیفِ چارہ سازیٔ زخمِ جگر نہ ہو

مجھ سے بھی کچھ سوا ہے انہیں میری آرزو
یہ شوق وہ نہیں جو اِدھر ہو، اُدھر نہ ہو

مَیں اور مجھ کو وعدۂ دیدار کی امید
وہ چاہتا ہُوں آج کہ جو عُمر بھر نہ ہو

اے برقِ حُسنِ یار ذرا چشم التفات
یُوں جل بجھُوں کہ مجھ کو بھی میری خبر نہ ہو

کعبہ میں ہے نشان نہ کہیں دیر میں پتہ
تیری گلی میں مضطرِ آشفتہ سر نہ ہو

معروف

مرزا الٰہی بخش

○

آہ! وہ کون تھا خدا مارا
جس نے اس سے مجھے لگا مارا

ایک ہے تُو بھی بدبلا اے چشم!
دل کو پھر زلف میں پھنسا مارا

کیا غضب تھی وُہ جُنبشِ ابرو
صاف جس نے کہ نیچا مارا

بعدِ مدت ملے تھے کل ان سے
آج لوگوں نے پھر لڑا مارا!

وصل کی شب بھی مَیں نہ سویا آہ
شبِ ہجراں کے خوف کا مارا

مقتولؔ

مرزا ابراہیم بیگ

○

بتاں جب کہ زلفِ دوتا باندھتے ہیں
گرہ میں دلِ مبتلا باندھتے ہیں

نہیں بنتی بلبل سے اپنی چمن میں
ہم اب آشیانہ جدا باندھتے ہیں

جفا کھینچیں گے پر نہ ہاریں گے جی کو
یہ ہم تم سے شرطِ وفا باندھتے ہیں

ق

گرہ دے کے سر پر جو بالوں کا جوڑا
یہ نازک بدن نوخوش ادا باندھتے ہیں

ہر اک تار میں اس کے دل ہائے عشاق
بہم جمع کر کے ملا باندھتے ہیں!

میاں حالِ مقتولؔ دیکھا نہیں کیا
کمر آپ کس پر بھلا باندھتے ہیں!

منتؔ

میر قمر الدین

○

مدعی اس سے سخن ساز بہ سازوسی ہے
پھر منتاؔ کو یہاں مژدۂ مایوسی ہے

میری ہی طرح جگر خوں ہے ترا مدت سے
اے حنا! کس کی تجھے خواہشِ پابوسی ہے

آہ اے کثرتِ داغِ غمِ خوباں! کہ مدام
صفحۂ سینہ پُر از جلوہ طاؤسی ہے

تہمتِ عشق عبث کرتے ہیں مجھ کو منتؔ
ہاں یہ سچ ملنے کی خوباں سے تو اک خوسی ہے

منتظر

میاں نور الاسلام

○

امید ہے کہ مجھ کو خدا آدمی کرے
پر آدمی کرے تو بھلا آدمی کرے

اس طرح وہ فریب سے دل لے گئے مرا
جس طرح آدمی سے دغا آدمی کرے

بھاویں نہیں کچھ اس کے نکلتی ہے اپنی جان
کیا ایسے بے وفا سے وفا آدمی کرے

مارا ہے کوہ کن نے سر اپنے پہ تیشۂ آہ
دل کو لگی ہو چوٹ تو کیا آدمی کرے

گر کچھ کہا بگڑ کے میں بس اس نے ہنس دیا
کیا ایسے آدمی کا گلا آدمی کرے!

گزرا میں ایسی چاہ سے ماچند ہم نشیں!
بیٹھا کسی کے سر کو لگا آدمی کرے

ہے عشق بد مرض کوئی جاتا ہے منتظر
کیا خاک اس مرض کی دوا آدمی کرے

منیر

سید اسمٰعیل حسین شکوہ آبادی

○

آمد تصور بت بیداد گر کی ہے
دل کی بھی لوٹ خانہ خرابی جگر کی ہے

تقدیر کی کجی ہو کہ ٹیڑھا ہو آسماں
یہ سب عنایت آپ کی ترچھی نظر کی ہے

اک بار تیر مار کے اب تک خبر نہ لی
یارب نگاہ مست یہ کس بے خبر کی ہے

یہ رنگ و بو کہاں گل تر کو نصیب تھا
اتری ہوئی قبا کسی رشک قمر کی ہے

پھر بھی کبھی نگاہ کرم ہوگی اس طرف
امید آج تک اسی پہلی نظر کی ہے

مہر

مرزا حامد علی

○

گریباں ہاتھ میں ہے پاؤں میں صحرا کا دامن ہے
بس اب پاؤں ہیں اپنے اور سرِ خارِ مغیلاں ہے

ہوائے دشتِ وحشت ہم کو لے اڑتی ہے بستی سے
ہمارا عنصرِ خاکی مگر ریگِ بیاباں ہے

سبق کو دیکھتا ہوں رات بھر اور پھر الٹتا ہوں
ملول، مختصر، وہ شرحِ شعرِ زلف پیچاں ہے

جلا آتے ہے یہ پروانوں کو وصفِ شعلہ رویاں سے
زبانِ خامہ بھی اب تو زبانِ شمعِ سوزاں ہے

نہ کیوں ہر طرز میں پڑتا غزل اس ماہ کے آگے
مرا استادِ کامل مہر نا سخ سا سخن داں ہے

ناظم

نواب محمد یوسف علی خان والیٔ رامپور

○

میں نے کہا کہ دعویٔ الفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

تاثیرِ آہ و زاریٔ شبہائے تار جھوٹ
آوازۂ قبولِ دعائے سحر غلط

سوزِ جگر سے ہونٹ پہ تھالہ افتد اگر
شورِ فغاں سے جنبشِ دیوار و در غلط

ہاں سینے سے نمائشِ داغِ درونِ دروغ
ہاں آنکھ سے تراوشِ خونِ جگر غلط

آجائے کوئی دم میں تو کیا کچھ نہ کیجئے
عشقِ مجاز و چشمِ حقیقت نگر غلط

بس و کنار کیلئے یہ سب فریب ہیں
اظہارِ پاکبازی و ذوقِ نظر غلط

کہنا ادا کو تیغ، خوشامد کی بات ہے
سینے کو اپنے اس کی سمجھنا سپر غلط

مٹھی میں کیا دھری تھی کہ چپکے سے سو رہی
جانِ عزیز پیشکشِ نامہ بر غلط

پوچھو تو کوئی مر کے بھی کرتا ہے کچھ کلام
کہتے ہو جان دی ہے سرِ رہگذر غلط!

ہم پوچھتے پھریں کہ جنازہ کدھر گیا
مرنے کی اپنے روز اڑاتی خبر غلط

آیت نہیں، حدیث نہیں جس کو مانئے
ہے نظم و نثرِ اہلِ سخن سر بسر غلط

یہ کچھ سنا جواب میں ناظم ستم کیا
یہ کیوں کہا کہ دعویٔ الفت مگر غلط

نثار

محمد امان

○

کیا جانۂ پھلکاری اس گل کی پہن کا تھا
جو تختۂ دامن تھا، تختہ وہ چمن کا تھا

ہم آگہی ہی سمجھے تھے تم گھر کو سدھارو گے
جوں صبح گجر بجا، تھا وہیں بھٹکا تھا

مینا میں نہ ہو جلوہ وہ بادۂ گلگوں کا
جامہ میں جو کچھ یارو! رنگ اسکے بدن کا تھا

نرگس کو کیا ایسا بیمار ان آنکھوں نے
ڈھلکا ہی نظر آیا گردن کا جو منکا تھا

نُدرت

شعیب احمد میرٹھی

○

نالۂ دل کی صدا، دیوار میں ہے در میں ہے
صور یا محشر میں ہوگا، یا ہمارے گھر میں ہے

یوں تو مرنے کو مروں گا میں، مگر مٹی مری
یا فلک کے ہاتھ میں، یا آپ کی ٹھوکر میں ہے

میں پریشاں ہو کے نکلوں گا، تو اُن کی بزم سے
میری بربادی کا ساماں ہے تو اُنکے گھر میں ہے

وہ اگر دیکھیں تو اب حالت سنبھلتی ہے مری
وہ اگر پوچھیں تو، اب مجھ کو شفا دم بھر میں ہے

یہ نہیں موقع ہنسی کا، تم نظر بدلے رہو
اب قضا میری، اسی بگڑے ہوئے تیور میں ہے

دے دے چلو میں اکٹھی کر کے اے ساقی مجھے
کچھ ابھی تو خم میں ہے شیشے میں ہے ساغر میں ہے

نقد جاں لینے کو مقتل میں قضا ندرت مری
بن کے دُلہن رُونما آئینۂ خنجر میں ہے

نظر

نوبت رائے لکھنؤی

○

کاروبارِ عشق کی کثرت کبھی ایسی نہ تھی
دل نہ تھا تو تنگیٔ فرصت کبھی ایسی نہ تھی

یاس سے ویرانیٔ حسرت کبھی ایسی نہ تھی
دل میں سناٹا نہ تھا، وحشت کبھی ایسی نہ تھی

ان کے وعدہ پر ہمیں جینا پڑا ہے حشر تک
ورنہ طولانی شبِ فرقت کبھی ایسی نہ تھی

دیکھ ڈالے زندگی میں وصل و فرقت کے طلسم
غم کبھی ایسا نہ تھا راحت کبھی ایسی نہ تھی

آپ نے بیمار پرسی کی تو جینا ہے وبال
ورنہ مرنے کی مجھے حسرت کبھی ایسی نہ تھی

بامزہ ہے کس قدر انکار اُن کا وصل میں
تجھ میں اے خونِ جگر لذت کبھی ایسی نہ تھی

دل کو کیا سمجھا دیا نومیدیٔ جاوید نے
پردہ دارِ غمِ شبِ فرقت کبھی ایسی نہ تھی

زندگی کی کش مکش سے مر کے پائی کچھ نجات
اس سے پہلے اے نظرؔ فرصت کبھی ایسی نہ تھی

نوا

ظہور اللہ بدایونی

○

اب اشک تو کہاں ہے جو چاہوں ٹپک پڑے
آنکھوں سے وقت گریہ مگر خوں ٹپک پڑے

پہنچی جو کُلک جھلک ترے دانوں کی گوش تک
نخلت سے آب ہو دُرِ مکنوں ٹپک پڑے

طغیاں سرشک کا تو یہاں تک ہے چشم سے
اک قطرہ آب کا ہو، تو جیحوں ٹپک پڑے

ڈوبا ہے بحرِ شعر میں ایسا نوا کہ اب
دے طبع کو فشار تو مضموں ٹپک پڑے

نیازؔ

شاہ نیاز احمد بریلوی

○

عشق میں تیرے کوہِ غم سر پہ لیا، جو ہو سو ہو
عیش و نشاطِ زندگی چھوڑ دیا، جو ہو سو ہو

عشق کے مدرسے ہو، عشق کے مے کدہ میں آ
جامِ فنا و بے خودی اب تو پیا، جو ہو سو ہو

لاگ کی آگ لگ اٹھی، پنبہ طرح سا جل گیا
ہستیِ وجودِ جان و تن کچھ نہ بچا، جو ہو سو ہو

ہجر کی سب مصیبتیں عرض کیں اس کے رُوبرو
ناز و ادا سے مسکرا کہنے لگا، جو ہو سو ہو

دنیا کے نیک و بد سے کام ہم کو نیازؔ کچھ نہیں
آپ سے جو گذر گیا، پھر اسے کیا، جو ہو سو ہو

واقفؔ

شاہ واقف

○

روزِ خزاں چمن میں جو دیکھا ہزار کے
اک مشت پر پڑے تھے تلے شاخسار کے

یاران ہم نشین و رفیقان دوست دار
سب آشنا ہیں زندگیٔ مستعار کے

جب مُند گئی یہ آنکھ تو اے دوست! بعدِ مرگ
پھٹکے ہے پاس کون کسی کے مزار کے

جو نقشِ پا رہے سو رہے پھر نہ اُٹھ سکے
واقفؔ کی طرح ہائے گرے کوئے یار کے

وحید الہ آبادی

○

آئینے جلوۂ دیدار کے دکھلانے کو
پھونک دے برقِ تجلی مرے کاشانے کو

دیکھئے! کون سی جا، یار کا ملتا ہے پتہ
کوئی کعبے کو چلا ہے، کوئی بت خانے کو

تیری فرقت میں تصور ہے یہ بے دردی کا
خواب ہم جانتے ہیں نیند کے آجانے کو

بعد میرے جو ہوا دشت میں مجنوں کا گزر
رو دیا دیکھ کے خالی مرے ویرانے کو

کام آجاتی ہے ہم بزمی بھی روشن دل کی
شمع ہم رنگ بنا لیتی ہے پروانے کو

آج پھر شہر کے کوچے نظر آتے ہیں اُداس
کس طرف لے گئی وحشت ترے دیوانے کو

اے جنوں تنگ ہوئی وسعتِ صحرا تجھ سے
اب کہاں جائے طبیعت کوئی بہلانے کو

گل پہ بلبل تھا کہیں شمع پہ پروانہ تھا
ہم نے ہر رنگ میں دیکھا ترے پروانے کو

داغِ دل نہ ہوئی، غنچۂ خاطر نہ کھلا
کون سے باغ میں آئے تھے ہوا کھانے کو

میں نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دُور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

وفا

حکیم عبدالہادی خان رامپوری

○

پھر رگِ شعلۂ جاں سوز میں نشتر گزرا
نالہ کیوں آبلۂ دل سے اُلجھ کر گزرا

میں ہوں دلداریٔ افسونِ وفا پر نازاں
جو رقیبوں پہ نہ گزرا تھا، وہ مجھ پہ گزرا

کیا محیطِ مے بے رنگ میں طوفاں آیا
جوشِ رنگِ انجمنِ ناز سے باہر گزرا

تشنۂ حسرتِ جاوید ہوں میں کیا جانوں
کیوں گلے سے مرے تلخابۂ کوثر گزرا

آؤ! میرے دلِ افسردہ کی تسکیں دیکھو
جاؤ! اس کشمکشِ ناز سے میں در گزرا

لٹ گئی جان تو امید کے پہلو ڈھونڈے
مٹ گئی راہ تو اندیشۂ رہبر گزرا

اس تکلف سے کٹی عمرِ گراں مایہ وفا
ایک دم سینکڑوں برسوں کے برابر گزرا

ولا

مظہر علی خان

○

ہرگز نہ گریں اس سے اشکِ اثر آلودہ
ہووے نہ کبھی خوں سے جو چشم تر آلودہ

از بسکہ کلیجے کے ٹکڑے ہوئے کرتے ہیں
آنکھوں سے مرے آنسو لختِ جگر آلودہ

واں رشکِ چمن اس نے گھر اپنا کیا ہے یاں
رشکِ بجگی سے ہے دیوار و در آلودہ

اک پل میں گذر جاوے نہ چرخِ بریں سے بھی
ہوتی ہے بڑی ظالم، آہِ اثر آلودہ

بخش اپنے ولا کو بھی از راہِ کرم یارب
ہر چند گنہ سے ہے وہ سر بسر آلودہ

ہادی

میر محمد جواد

○

رہ رہ کے سخن کہنا ہر بار بہت تحفہ
ہیں لب تو میاں لب ہی گفتار بہت تحفہ

ہر پاؤں کی ٹھوکر میں ہو دل پڑے تڑپے ہیں
کچھ ان دنوں سیکھے ہو رفتار بہت تحفہ

خورشید کا یوں چہرہ زرتار تو ہے لیکن
ہے سر پہ تری سادی دستار بہت تحفہ

اک بوسہ پہ دل ٹھہرا اتنے پہ وہ نہیں لیتا
اک سہل سی قیمت پر تکرار بہت تحفہ

ہم مر چکے، پر اس نے دل کی نہ خبر پوچھی
ہم کو بھی ملا ہے یاں دلدار بہت تحفہ

ہاشمی

میرٹھ

○

مزا تو بار اُس تک نامۂ پر آرزو پہنچا
پہ اودھر سے جواب صاف پہنچا جب کبھو پہنچا

کیا افشا تمہیں نے رازِ عشق اے دیدۂ گریاں
یہ گوشِ خلق ورنہ کس طرح بے گفتگو پہنچا!

دماغ آشفتہ ہوتا ہے صبا! نکہت سے سنبل کی!
مشامِ آرزو میں تو کسی کاکل کی بُو پہنچا

ابھی چھوٹا ہے موجِ اشک کی زنجیر سے قدری
نہ پھر گوشِ دلِ دیوانہ تک آوازِ ہُو پہنچا

یہ دعوے سب کے باطل محکمے میں ہاشمی ہونگے
اگر حاکم تلک وہ شوخ بارِ مُوئے نکو پہنچا

ہجر

نواب ناظم علی خان شاہجہانپوری

○

دیکھا انہیں تو اپنی طبیعت سنبھل گئی
آنکھوں میں ہو کے دل کی تمنا نکل گئی

میں اور تم سے وصل کی خواہش خفا نہ ہو
اک بات بیخودی میں زباں سے نکل گئی

تم نے کرم کیا، یہ تمہارا کرم ہوا
تم نے نکال دی، مری حسرت نکل گئی

انصافِ جورِ یار یہیں ہو، تو خوب ہے
پھر لطف کیا، جو بات قیامت پہ ٹل گئی

یا کوئی جان بوجھ کے انجان بن گیا
یا پھر یہی ہوا، مری صورت بدل گئی

اگلا سا میں نہیں ہوں کہ تم؟ لو تمہیں کہو
کس کا مزاج، کس کی طبیعت بدل گئی

شرما کے پوچھنا وہ کسی کا شبِ وصال
اے ہجر! اب تو دل کی تمنا نکل گئی؟

ہوس

نواب مرزا محمد تقی

○

یہی کہتی تھی لیلیٰ پردہ نشیں، نہیں کھاتی ادب سے خدا کی قسم
غم قیس سوا مجھے کچھ نہیں غم، اسی کشتۂ ناز و ادا کی قسم

رکا پایا جو لیلےٰ نے مجنوں کا جی، کہا کیوں ہو خفا مرے سرو سہی
کہ نہیں نے کسی سے ہے بات بھی کی، مجھے تیری ہی شرم و حیا کی قسم

مرے گریہ سے جاوے ہے صبر و سکوں مرے اشکوں سے ٹپکے ہے قطرۂ خوں
ارے چین نہیں مجھے پیارے کبھو، مجھے اس تری مہر و وفا کی قسم

شبِ ہجر میں اشکوں کا خون بہا، اسے دیکھ کے رنگ شفق کا اُڑا
نہیں اس میں مبالغہ ایک ذرا مجھے تیرے ہی رنگِ حنا کی قسم

ترے کشتۂ غم کا ہے حال بتر، یہی کہیو جو جانا ہو تیرا اُدھر
تجھے قاصدِ موجِ نسیمِ سحر، شبِ ہجر کی میری بکا کی قسم

کبھی کہتا تھا قیس غزالوں سے جا، کہو ناقہ ادھر سے کدھر کو گیا
کبھی کہتا تھا تو ہی بتا دے صبا! تجھے لیلےٰ کی زلفِ دوتا کی قسم

کبھی ساغرِ وصل نہ مَیں نے پیا، کبھی چاک جگر کو نہ مَیں نے سیا
غم و رنج و تعب کو عزیز کیا، مجھے عشق کے جور و جفا کی قسم

نہ تو پائی ہوس کبھی پھولوں کی بُو نہ تو بیٹھا ہوں میں کبھی بر لبِ جُو
نہ تو بے کلی دل کی گئی ہے کبھو، مجھے پیارے کی اپنے وفا کی قسم

مُتغزلین جدید

فیض احمد فیض

○

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

دوستو اُس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ میخانے کا نام

پھر نظر میں پھول مہکے دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام

دلبری ٹھہرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رُو زلف بکھرانے کا نام

اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں
ان دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام

محتسب کی خیر اُونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا ساقی کا تیرے کا خم کا پیمانے کا نام

ہم سے کہتے ہیں چمن والے غریبانِ چمن
تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام

فیض ان کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنھیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

○

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم

گراں ہے دل پہ غمِ روزگار کا موسم
کٹے گا کیسے شبِ ہجرِ یار کا موسم

خوشا نظارۂ رخسارِ یار کی ساعت
خوشا قرارِ دلِ بے قرار کا موسم

حدیثِ بادۂ ساقی نہیں تو کس مصرف
خرامِ ابر و سرِ کوہسار کا موسم

نصیبِ صحبتِ یاراں نہیں تو کیا کیجے
یہ رقصِ سایۂ سرو و چنار کا موسم

یہ دل کے داغ تو دکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم

یہی جنوں کا یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر یہی اختیار کا موسم

قفس ہے بس میں تمہارے تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

صبا کی مست خرامی تہ کمند نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

○

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

حدیثِ یار کے عنواں نکھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں

ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے
جو اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں

صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکرِ وطن
تو چشمِ صبح میں آنسو ابھرنے لگتے ہیں

وہ جب بھی کرتے ہیں نطق و لب کی نخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیضؔ دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

○

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

کئی بار اس کی خاطر ذرّے ذرّے کا جگر چیرا
مگر یہ چشمِ حیراں جس کی حیرانی نہیں جاتی

نہیں جاتی متاعِ لعل و گوہر کی گراں یابی
متاعِ عزت و ایماں کی ارزانی نہیں جاتی

مری چشمِ تن آساں کو بصیرت مل گئی جب سے
بہت جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

ہر خسرو سے نازِ کجکلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

بجز دیوانگی واں اور چارہ ہی کہو کیا ہے؟
جہاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی

○

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

بھولے سے مسکرا تو دیے تھے وہ آج فیض
مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

○

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

نہ گل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

اختر شیرانی

○

آرزوئے وصل کی رکھتی ہے پریشاں کیا کیا
کیا بتاؤں کہ مرے دل میں ہیں ارماں کیا کیا

غم غریبوں کا حسینوں کی جدائی بیکسی
دیکھیں دکھلائے ابھی گردشِ دوراں کیا کیا

ان کی خوشبو سے فضاؤں میں پریشاں ہر سُو
ناز کرتی ہے ہوائے چمنستاں کیا کیا

دشتِ غربت میں رُلاتے ہیں ہمیں یاد آکر
اے وطن تیرے گل و سنبل و ریحاں کیا کیا

اب وہ باتیں نہ وہ راتیں نہ ملاقاتیں ہیں
محفلیں خواب کی صورت ہوئیں ویراں کیا کیا

ہے بہارِ گل و لالہ مرے اشکوں کی نمود
میری آنکھوں نے کھلائے ہیں گلستاں کیا کیا

ہے کرم اُن کے ستم کا کہ کرم بھی ہے ستم
شکوے سُن سُن کے وہ ہنستے ہیں پشیماں کیا کیا

گیسو بکھرے ہیں مرے دوش پہ کیسے کیسے
میری آنکھوں میں ہیں آباد شبستاں کیا کیا

وقتِ امداد ہے اے ہمتِ گستاخیِ شوق
شوق انگیز ہیں اُن کے لبِ خنداں کیا کیا

سیرِ گل بھی ہے ہمیں باعثِ وحشت اختر
ان کی الفت میں ہوئے چاک گریباں کیا کیا

○

تمناؤں کو زندہ آرزوؤں کو جواں کر لوں
یہ شرمیلی نظر کہہ دے تو کچھ گستاخیاں کر لوں

بہار آئی ہے بلبل دردِ دل کہتی ہے پھولوں سے
کہو تو میں بھی اپنا دردِ دل تم سے بیاں کر لوں

ہزاروں شوخ ارماں لے رہے ہیں چٹکیاں دل میں
حیا ان کی اجازت دے تو کچھ بیباکیاں کر لوں

کوئی صورت تو ہو دنیائے فانی میں بہلنے کی
ٹھہر جا اے جوانی تا تمامِ عمر رواں کر لوں

چمن میں ہیں بہم پروانہ و شمع و گل و بلبل
اجازت ہو تو میں بھی حالِ دل اپنا بیاں کر لوں

کسے معلوم کب کس وقت کس پر گر پڑے بجلی
ابھی سے میں چمن میں چل کر آباد آشیاں کر لوں

برآئیں حسرتیں کیا کیا اگر موت اتنی فرصت دے
کہ اک بار اور زندہ شیوۂ عشق جواں کر لوں

مجھے دونوں جہاں میں ایک وہ مل جائیں گر اختر
تو اپنی حسرتوں کو بے نیازِ دو جہاں کر لوں

○

وہ کہتے ہیں رنجش کی باتیں بھلا دیں
محبت کریں خوش رہیں مسکرا دیں

غرور اور ہمارا غرورِ محبت
مہ و مہر کو ان کے در پر جھکا دیں

جوانی ہو گر جاودانی تو یارب
تری سادہ دنیا کو جنت بنا دیں

شبِ وصل کی بے خودی چھا رہی ہے
کہو تو ستاروں کی شمعیں بجھا دیں

ہوائیں سمٹ آئیں کھل جائیں کلیاں
جو ہم تم چمن میں کبھی مسکرا دیں

عبادت ہے اک بیخودی سے عبارت
حرم کو مئے مشکبو سے بسا دیں

وہ آئیں گے آج اے بہارِ محبت
ستاروں کے بستر پہ کلیاں بچھا دیں

بناتا ہے منہ تلخیٔ مے سے زاہد
تجھے باغِ رضواں سے کوثر منگا دیں

تمہارا فسانۂ قیس کیا پوچھتے ہو
اِدھر آؤ ہم تم کو لیلیٰ بنا دیں

وہ سرمستیاں بخش اے رشکِ شیریں
کہ خسرو کو خوابِ عدم سے جگا دیں

انھیں اپنی صورت پہ یوں ناز کب تھا
مرے عشق رسوا کو اختر دعا دیں

○

کون آیا ہے مرے پہلو میں یہ خواب آلودہ؟
زلف برہم زدہ و چشم حجاب آلودہ

آہ یہ زلف ہے یا ابر سرِ مے خانہ
آہ یہ آنکھ ہے یا جامِ شراب آلودہ

کس نے پہلو میں بٹھایا یہ مجھے شرما کر
کس کے ہاتھوں میں ہے لرزش یہ حجاب آلودہ

کس کے ملبوس سے آتی ہے حنا کی خوشبو
کس کے ہر سانس کی جنبش ہے گلاب آلودہ

کس کو شکوہ ہے مرے عشق سے رسوائی کا
کس کا لہجہ ہے یہاں لطف عتاب آلودہ

پھر رہم آغوشی کے موسم نے بکھیرے گیسو
پھر فضائیں نظر آتی ہیں سحاب آلودہ

حسرتِ بوسہ پہ اختر یہ خیال آتا ہے
کیوں مرے لب سے ہوں وہ برگِ گلاب آلودہ

○

نہ ساز و مطرب نہ جام و ساقی نہ وہ بہار چمن ہے باقی
نگاہ و شمع سحر کے پڑے پہ نقشۂ انجمن ہے باقی

زمانہ گزرا وہ یاسمن رو جدا ہوئی ہم کنار ہو کر
مگر ابھی تک ہمارے پہلو میں نکہت یاسمن ہے باقی

بھلا چکی دل سے شام غربت ہر ایک نقشہ ہر ایک صورت
ہماری آنکھوں میں لیکن اب تک فروغ صبح وطن ہے باقی

زمانہ بدلا مٹی جوانی نہ وہ محبت نہ زندگانی
بس ایک بھولی سی یاد ہے جو برنگ داغ کہن ہے باقی

مٹا دیئے بے ستون چرخ کہن نے شیریں لعل ہزاروں
مگر محبت کے لب پہ اب بھی ترانۂ کوہکن ہے باقی

حباب آسا محیط ہستی میں جو ہے مٹنے کو بن رہا ہے
ہے انقلاب اک نمود ایسی جو زیر چرخ کہن ہے باقی

غم زمانہ کی سختیوں سے ہوئی ہے پامال طبع اختر
نہ وہ نشاط کہن ہے باقی نہ وہ مذاق سخن ہے باقی

○

جھوم کر بدلی اٹھی اور چھا گئی
ساری دنیا پر جوانی آ گئی

آہ وہ اس کی نگاہ مے فروش
جب بھی اٹھی مستیاں برسا گئی

گیسوئے مشکیں میں وہ روئے حسیں
ابر میں بجلی سی اک لہرا گئی

عالم مستی کی توبہ الاماں!
پارسائی نشہ بن کر چھا گئی

آہ اس کی بے نیازی کی نظر
آرزو کیا پھول سی کملا گئی

ساز دل کو گدگدایا عشق نے
موت کو لے کر جوانی آ گئی

پارسائی کی جوانمردی نہ پوچھ
توبہ کرنی تھی کہ بدلی چھا گئی

اختر اس جان تمنا کی ادا
جب کبھی یاد آ گئی تڑپا گئی

تاثیر

○

حضورِ یار بھی آنسو نکل ہی آتے ہیں
کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں

مزاج ایک نظر ایک، دل بھی ایک سہی
معاملاتِ من و تو نکل ہی آتے ہیں

ہزار ہم سخنی ہو، ہزار ہم نظری
مقامِ عبرتِ ادرو نکل ہی آتے ہیں

حنائے ناخنِ پا ہو کہ حلقۂ سرِ زلف
چھپاؤ بھی تو یہ جادو نکل ہی آتے ہیں

جنابِ شیخ وضو کے لیے سہی لیکن
کسی بہانے لبِ جو نکل ہی آتے ہیں

متاعِ عشق وہ آنسو جو دل میں ڈوب گئے
زمیں کا رزق جو آنسو نکل ہی آتے ہیں

○

لطفِ وفا نہیں کہ وہ بیداد گر نہیں
خاموش ہوں کہ میری فغاں بے اثر نہیں

تیرے بغیر تلخیٔ کام و دہن حرام
دردِ جگر ہے لذتِ دردِ جگر نہیں

سجدوں سے نامراد ہے جلووں سے ناامید
وہ رہگزر کہ اب جو تری رہگزر نہیں

تم کیا گئے کہ سارا زمانہ چلا گیا
وہ رات دن نہیں ہیں وہ شام و سحر نہیں

ہر ہر روش معاملۂ حسن و عاشقی
ہر ہر قدم فروغِ جمالِ نظر نہیں

بے باک چال، چال سے بیباک تر نظر
اب حسن تو بہت ہے مگر فتنہ گر نہیں

زخموں سے چور قافلے، پُرخار راستے
اس میں ترا قصور تو اے راہبر نہیں

دنیائے چشم و گوش تو برباد ہو گئی
اب کچھ بغیر معرکۂ خیر و شر نہیں

تاثیر

○

وہ ملے تو بے تکلف نہ ملے تو بے ارادہ
نہ طریقِ آشنائی، نہ رسومِ جام و بادہ

تری نیم کش نگاہیں ترا نیم لب تبسم
یونہی اک ادائے مستی یونہی اک فریبِ سادہ

وہ کچھ اس طرح سے آئے مجھے اس طرح سے دیکھا
مری آرزو سے کم تر، مری تاب سے زیادہ

یہ دلیلِ خوش دلی ہے، مرے واسطے نہیں ہے
وہ دہن دہے شگفتہ، وہ جبیں کہے کشادہ

وہ قدم قدم پہ لغزش وہ نگاہ مست بادہ
یہ طرازِ زلفِ سرکش یہ کلاہِ کج نہادہ

○

جن کے رازِ نہاں شرحِ بیاں تک پہنچے
آنکھ سے دل میں گئے، دل سے زباں تک پہنچے

دل نے آنکھوں سے کہی آنکھوں نے دل سے کہدی
بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

عشق پہلے ہی قدم پر ہے یقیں سے واصل
انتہا عقل کی یہ ہے کہ گماں تک پہنچے

کعبہ و دیر میں تو لوگ ہیں آتے جاتے
وہ نہ لوٹے جو درِ پیرِ مغاں تک پہنچے

آنکھ سے آنکھ کہے، دل سے ہوں دل کی باتیں
وائے وہ عرضِ تمنا جو زباں تک پہنچے

○

لیا سب جام پھر ساقی نے واپس لے لیا مجھ سے
نہ جانے کیا کہا میں نے، نہ جانے کیا ہوا مجھ سے

مری توبہ مجھے یاد آ وہ کافر ہے وہ کافر ہے
خدا توبہ بھی ہو جاتا ہے اے میرے خدا مجھ سے

چھپا پھرتا ہوں اب تک تیری آنکھوں سے مگر کب تک
یہ کہہ ڈالیں گی اک دن میرے دل کا مدعا مجھ سے

مجھے معلوم ہے تاثیر سب کچھ جانتا ہوں میں
ارے اب پی بھی جا، کیوں بن رہا ہے پارسا مجھ سے

○

میری وفائیں یاد کرو گے
روؤ گے فریاد کرو گے

مجھ کو تو برباد کیا ہے
اور کسے برباد کرو گے؟

ہم بھی ہنسیں گے تم پر اک دن
تم بھی کبھی فریاد کرو گے

محفل کی محفل ہے غمگیں
کس کس کا دل شاد کرو گے

دشمن تک کو بھول گئے ہو
مجھ کو تم کیا یاد کرو گے

ختم ہوئی دشنام طرازی
یا کچھ اور ارشاد کرو گے

جا کر بھی ناشاد کیا تھا
آ کر بھی ناشاد کرو گے

چھیڑو بھی تاثیر کی باتیں
کب تک اس کو یاد کرو گے

عبدالمجید سالک

○

ہمنفسو۔ اجڑ گئیں مہر و وفا کی بستیاں
پوچھ رہے ہیں اہلِ دل مہر و وفا کو کیا ہوا

عشق ہے بے گداز کیوں حسن ہے بے نیاز کیوں
میری وفا کہاں گئی ان کی جفا کو کیا ہوا

یہ تو بجا کہ اب وہ کیف جامِ شراب میں نہیں
ساقیِ مست کے مگر ہوشِ ربا کو کیا ہوا

اب نہیں جنتِ مشام کوچۂ یار کی شمیم
نکہتِ زلف کیا ہوئی بادِ صبا کو کیا ہوا

تھم گیا دورۂ حیات رک گئی نبضِ کائنات
عشق و جنوں کی گرمیِ ہمہمۂ زا کو کیا ہوا

نالۂ شب سے نارسا آہِ سحر سے بے اثر
میرا خدا کہاں گیا۔ میرے خدا کو کیا ہوا

○

نہ تھی امید نہ وعدے پہ اعتبار کیا
غضب ہے پھر بھی تراہم نے انتظار کیا

اٹھا دے اب تو نقاب اے عروسِ آزادی
ہزار سال تراہم نے انتظار کیا

شفق نے پھول کھلیرے خزاں کی وادی میں
سحر نے دامنِ مشرق کو لالہ زار کیا

وداعِ عشق ہے اب رخصت اے غزالاں
کہ پھر تجھے غمِ دوراں نے بے قرار کیا

خرد نے سایۂ جس کے پناہ لی صدیوں
جنوں نے آج اسی دامن کو تار تار کیا

چھپا رکھا تھا جسے مخنث نے پردوں میں
وہ رازِ بزم میں رندوں نے آشکار کیا

دماغ تو کسی قیمت پہ دے نہ سکتے تھے
متاعِ دل ہی کو نذرِ جمالِ یار کیا

نظر میں پھر گئی سالک جہانِ نو کی نمود
غمِ زمانہ نے جب مجھ کو آشکار کیا

○

شب کی زلف و رخِ جاناں کی بات کرو — مئے کہن کی نگارِ جواں کی بات کرو
کسی کی تابشِ رخسار کا کہو قصہ — کسی کے گیسوئے عنبر فشاں کی بات کرو
ہیا ہے شاہد و شمع و شراب سے اس کی — فروغِ محفلِ روحانیاں کی بات کرو
مدعا کو کسی قبلۂ مراد کا ذکر — تو آستانۂ پیرِ مغاں کی بات کرو
ہیں ہوا جو طلوعِ آفتابِ تو فی الحال — قمر کی بات کرو کہکشاں کی بات کرو
ہے گا مشغلۂ یاد رفتگاں کب تک — گزر رہا ہے جو اس کارواں کی بات کرو
قید و صید کے اندیشہ ہائے بے جا کیا — چمن کی فکر کرو آشیاں کی بات کرو
ہی جہان ہے ہنگامہ زارِ سود و زیاں — اسی کے سود اسی کے زیاں کی بات کرو
اب اس چمن میں نہ صیاد ہے نہ گلچیں ہے — کرو۔ تو اب ستم باغباں کی بات کرو

خدا کے ذکر کا موقع نہیں یہاں سالکؔ
دیارِ ہند میں حسنِ بتاں کی بات کرو[1]

○

خرد میں مبتلا ہے سالکِ دیوانہ برسوں سے
نہیں آیا ہوسِ خانے میں بیباکانہ برسوں سے

میسر جس سے آجاتی تھی ساقی کی قدم بوسی
مقدر میں نہیں وہ لغزشِ مستانہ برسوں سے

بیا و چشمِ یار اک نعرۂ مستانہ اے ساقی
کہ ہا و ہو سے خالی ہے ترا میخانہ برسوں سے

تجھے کچھ عشق و الفت کے سوا بھی یاد ہے اے دل
سنائے جا رہا ہے ایک ہی افسانہ برسوں سے

کسی کو تو مشرف کر دے اے ذوقِ جبیں سائی
تقاضا کر رہے ہیں کعبہ و بت خانہ برسوں سے

نئی شمعیں جلاؤ عاشقی کی انجمن والو!
کہ سونا ہے شبستانِ دلِ پروانہ برسوں سے

کوئی جوہر شناس آئے تو جانے قدر سالکؔ کی
پڑا ہے خاک پر یہ گوہرِ یکدانہ برسوں سے

[1] مشاعرۂ دہلی میں پڑھی گئی

○

یہ کیا طلسم ہے دنیا پہ بار گزری ہے
وہ زندگی جو سرِ رہگزار گزری ہے

کہیں سحر کا اُجالا ہوا ہے ہم نفسو!
کہ موجِ برق سرِ شاخسار گزری ہے

رہا ہے یہ سرِ شوریدہ مثلِ شعلہ بلند
اگرچہ مجھ پہ قیامت ہزار گزری ہے

یہ حادثہ بھی ہوا ہے کہ عشقِ یار کی یاد
دیارِ قلب سے بیگانہ وار گزری ہے

گلوں کی خوں شدگی سے سراغ ملتا ہے
کہیں چمن سے نسیمِ بہار گزری ہے

مقیمِ کوچۂ دلدار کو پتہ بھی نہیں
کدھر سے زندگی مستعار گزری ہے

انھیں کو عرضِ وفا کا تھا اشتیاق بہت
انھیں کو عرضِ وفا ناگوار گزری ہے

کبھی ہجومِ غمِ روزگار دیکھا ہے
کبھی مصیبتِ ہجرانِ یار گزری ہے

حریمِ شوق مہکتا ہے آج تک عابدؔ
یہاں سے نکہتِ گیسوئے یار گزری ہے

○

دل ہے آئینہ حیرت سے دوچار آج کی رات
غمِ دوراں میں ہے عکسِ غمِ یار آج کی رات

کوئی منصور سے جاکر یہ کہو ہم نفسو!
ہوں بہ تعزیرِ خموشی سرِ دار آج کی رات

غم کے محور پہ ہیں ٹھہرے ہوئے افلاک و نجوم
میری محفل میں نہیں وقت کو بار آج کی رات

نہ مکاں آج ہے ثابت نہ زماں ہے سیار
نہ خزاں شعبدہ آرا، نہ بہار آج کی رات

کبھی فردوسِ گل و لالہ تھی جو کشتِ خیال
اس سے بے ساختہ اُگتے ہیں شرار آج کی رات

بوئے خوں آتی ہے صحرائے تمنا سے مجھے
کھیلتا ہوں دلِ وحشی کا شکار آج کی رات

تجھے معلوم ہے عابدؔ کہ بیاضِ دل پر
ناخنِ غم نے لکھے نقشِ نگار آج کی رات

○

کارواں گل و بلبل گزرے — صورتِ برق و شرر ہم گزرے
کیا بتاؤں کہ مری آنکھوں سے — کس قدر خواب پریشاں گزرے
بیٹھے بنتا رہا میں شکلِ حباب — وائیں بائیں سے طوفاں گزرے
گردشِ جام نہیں رُک سکتی — جو بھی اے گردشِ دوراں گزرے
صبحِ محشر ہے بلائے ظاہر — کسی صورت شبِ ہجراں گزرے
کوئی پرسانِ سرِ کشتِ وفا — کتنے بادل گہر افشاں گزرے
زیرِ آدم کو نہ آیا کوئی راس — کتنی آذر کئی نمرود یاں گزرے
غمِ ہستی کے بیابانوں سے — کچھ نہیں تھے کہ غزلخواں گزرے
اے غمِ یار تری راہوں سے — عمر بھر سوختہ ساماں گزرے
وہ جو پروانے جلے رات کی رات — منزلِ عشق سے آساں گزرے

غم کے تاریک افق پر عابد
کچھ ستارے سرِ مژگاں گزرے

○

خمِ دوراں خمِ جاناں کا نشاں ہے کہ جو تھا
وصفِ خوباں بہ حدیثِ دگراں ہے کہ جو تھا
لذتِ عرضِ وفا راحتِ جاں ہے کہ جو تھی
دلِ نالاں اشکِ واں شوقِ جواں ہے کہ جو تھا
شرع و آئین کی تعزیر کے باوصفِ شباب
لب و رخسار کی جانب نگراں ہے کہ جو تھا
میرے پاؤں سے ہیں الجھے ہوئے ریشم کے تتار
ہمدمو! یہ تو وہی بندِ گراں ہے کہ جو تھا
عشق کی طرزِ تکلم وہی چپ ہے کہ جو تھی
لبِ خوش گوئے ہوس محوِ بیاں ہے کہ جو تھا
راہرو دشت میں فرہاد کناں ہیں کہ جو تھے
خندہ زن قافلۂ راہ رواں ہے کہ جو تھا
مغبچے خوش ہیں کہ بزم ان کی ہے ساقی ہے لگا
برسرِ کار وہی پیرِ مغاں ہے کہ جو تھا
جلوۂ یار سے کیا شکوۂ بے جا کیجے!
شوقِ دیدار کا عالم وہ کہاں ہے کہ جو تھا
حلقۂ وعظ سے اب تک ہے گریزاں دنیا!
حلقۂ زلفِ مدارِ دو جہاں ہے کہ جو تھا
میرے ہنسنے پہ خفا تھے مرے رونے پہ ہنسے
وہی رنگِ ستمِ عشوہ گراں ہے کہ جو تھا
سنگِ طفلاں سے ذرا بچ کے رہے قصرِ بلند
یہ وہی کارگہِ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا
دوستو ہم نفسو! سنتے ہو عابد کی غزل!
یہ وہی شعلہ نوا سوختہ جاں ہے کہ جو تھا

حفیظ ہوشیارپوری

ایسی بھی کیا جلدی پیارے جانے ملیں پھر یا نہ ملیں ہم
کون کہے گا پھر یہ فسانہ، بیٹھ بھی جاؤ سن لو کوئی دم

وصل کی شیرینی میں نہاں ہجر کی تلخی بھی ہے کم کم
تم سے ملنے کی بھی خوشی ہے تم سے جدا ہونے کا بھی غم

حسن و عشق جدا ہوتے ہیں جانے کیا طوفان اُٹھے گا
حسن کی آنکھیں بھی ہیں پُرنم عشق کی آنکھیں بھی ہیں پُرنم

میری وفا تو نادانی تھی تم نے مگر یہ کیا ٹھانی تھی
کاش نہ کرتے مجھ سے محبت کاش نہ ہوتا دل کا یہ عالم

پروانے کی خاک پریشاں، شمع کی لَو بھی لرزاں لرزاں
محفل کی محفل ہے ویراں، کون کرے اب کس کا ماتم

کچھ بھی ہو پر ان آنکھوں نے اکثر یہ عالم بھی دیکھا
عشق کی دنیا نا پرسایا، حسن کی دنیا عجز مجسم

شہد شکن ہونٹوں کی لرزش، عشرتِ باقی کا گہوارہ
دائرۂ امکانِ تمنا، زم لچکتی باہنوں کے خم

اپنے اپنے دل کے ہاتھوں دونوں ہی برباد ہوئے ہیں
میں ہوں اور وفا کا رونا، وہ ہیں اور جفا کا ماتم

ناکامی سی ناکامی ہے، محرومی سی محرومی ہے
دل کا منانا سہی مسلسل ان کو بھلانا کوشش پیہم

عہدِ وفا ہے اور بھی محکم تیری جُدائی کے میں قرباں
تیری جدائی کے میں قرباں عہدِ وفا ہے اور بھی محکم

○

کچھ اس طرح سے نظر سے گزر گیا کوئی
کہ دل کو غم کا سزاوار کر گیا کوئی

دل ستم زدہ کو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں
خود اپنے حسن سے یوں بے خبر گیا کوئی

وہ ایک جلوۂ صد رنگ، اک ہجوم بہار
نجانے کون تھا جانے کدھر گیا کوئی

نظر کہ تشنۂ دیدار ہی رہی محروم
نظر اُٹھائی تو دل میں اُتر گیا کوئی

نگاہِ شوق کی محرومیوں سے ناواقف
نگاہِ شوق پہ الزام دھر گیا کوئی

اب اُن کے حسن میں حسنِ نظر بھی شامل ہے
کچھ اور میری نظر سے سنور گیا کوئی

کسی کے پاؤں کی آہٹ کہ دل کی دھڑکن تھی
ہزار بار اُٹھا سوئے در گیا کوئی

نصیب اہلِ وفا یہ سکونِ دل تو نہ تھا
ضرور نالۂ دل بے اثر گیا کوئی

اٹھا پھر آج مرے دل میں شک کا طوفان
پھر اُن کی راہ سے باچشمِ تر گیا کوئی

یہ کہہ کے یاد کریں گے حفیظ دوست تجھے
وفا کی رسم کو پائندہ کر گیا کوئی

○

از برلبِ محبت کے زباں تک پہنچے
بات بڑھ کر یہ خدا جانے کہاں تک پہنچے

کیا تصرف ہے ترے حسن کا اللہ اللہ
جلوے آنکھوں سے اُتر کر دل و جاں تک پہنچے

تری منزل پہ پہنچنا کوئی آسان نہ تھا
سرحدِ عقل سے گزرے تو یہاں تک پہنچے

حیرتِ عشق مری حسن کا آئینہ ہے
دیکھنے والے کہاں سے ہیں کہاں تک پہنچے

کھل گیا آج نگاہیں ہیں نگاہیں اپنی
جلوے ہی جلوے نظر آئے جہاں تک پہنچے

وہی اُس گوشۂ داماں کی حقیقت جانے
جو مرے دیدۂ خونابہ فشاں تک پہنچے

ابتدا میں جنھیں ہم ننگِ وفا سمجھے تھے
ہوتے ہوتے وہ گلے حسن بیاں تک پہنچے

آہ وہ حرفِ تمنا کہ نہ لب تک آئے
ہائے وہ بات کہ اک اک کی زباں تک پہنچے

کس کا دل ہے کہ سُنے قصۂ فرقت میرا
کون ہے جو مرے اندوہِ نہاں تک پہنچے

خلش اک تھی مگر کیا تری مژگاں کا خیال
ٹوٹ کر دل میں نہ پیوستہ رگِ جاں تک پہنچے

نہ تو منکب نشاں کا نہ خبر رہبر کی
جستجو میں ترے دیوانے یہاں تک پہنچے

نہ غبارِ رہِ منزل ہے نہ آوازِ جرس
کون مجھ رہرو گم کردہ نشاں تک پہنچے

صاف توہین ہے یہ دردِ محبت کی حفیظ
حسن کا راز ہو اور میری زباں تک پہنچے

○

پھر سے آرائشِ ہستی کے جو ساماں ہوں گے
تیرے جلووں ہی سے آباد شبستاں ہوں گے

عشق کی منزلِ اوّل پہ ٹھہرنے والو!
اس سے آگے بھی کئی دشت و بیاباں ہوں گے

تو جہاں جائے گی غارت گرِ ہستی بن کر
ہم بھی اب ساتھ ترے گردشِ دوراں ہوں گے

کس قدر سخت ہے یہ ترک و طلب کی منزل
اب کبھی ان سے ملے بھی تو پشیماں ہوں گے

تیرے جلووں سے جو محروم رہے ہیں اب تک
وہی آخر ترے جلووں کے نگہباں ہوں گے

اب تو مجبور ہیں پر حشر کا دن آنے دے
تجھ سے انصاف طلب روئے گریزاں ہوں گے

جب کبھی ہم نے کیا عشق پشیماں ہوئے
زندگی ہے تو ابھی اور پشیماں ہوں گے

کوئی بھی غم ہو غمِ دل کہ غمِ دہر حفیظ
ہم بہر حال بہر رنگ غزلخواں ہوں گے

○

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

میں اکثر سوچتا ہوں پھول کب تک
شریکِ گریۂ شبنم نہ ہوں گے

ذرا دیدہ آشنا چشمِ کرم ہے
غمِ ہجر و جفا پیہم نہ ہوں گے

دلوں کی انجمن آباد رہتی ہے گی
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے

زمانے بھر کے غم یا اک ترا غم
یہ غم ہوگا تو کتنے غم نہ ہوں گے

کہوں بیدرد کیوں اہلِ جہاں کو
وہ میرے حال سے محرم نہ ہوں گے

ہمارے دل میں سیل گریہ ہوگا
اگر با دیدۂ پُرنم نہ ہوں گے

اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے
تری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے

حفیظ اُن سے میں جتنا بدگماں ہوں
وہ مجھ سے اس قدر برہم نہ ہوں گے

○

کہاں کہاں نہ تصور نے دام پھیلائے
مگر وہ شام و سحر سے نکل کے دیکھ آئے

نہیں پیامِ رہِ نامہ و پیام تو ہے
ابھی عبث سے کہو اُن کے دل کو بہلائے

غرورِ بادہ شناسی بجا سہی لیکن
سراغِ منزلِ مقصود بھی کوئی پائے

خدا وہ دن نہ دکھائے کہ راہبر نہ کہے
چلے تھے جانے کہاں سے کہاں نکل آئے

گذر گیا کوئی درماندہ راہ یہ کہتا
اب اس فضا میں کوئی قافلے نہ ٹھہرائے

نجانے ان کے مقدر میں کیوں ہے تیرہ شبی
وہ ہم نوا جو سحر کو قریب تر لائے

کوئی فریبِ نظر ہے کہ تابناک فضا
کسے خبر کہ یہاں کتنے چاند گہنائے

غمِ زمانہ تری خلقتیں ہی کیا کم تھیں
کہ بڑھ چلے ہیں اُن گیسوؤں کے بھی سائے

بہت بلند ہے اس سے مرا مقامِ غزل
اگرچہ میں نے محبت کے گیت بھی گائے

حفیظ اپنا مقدر حفیظ اپنا نصیب
گرے تھے پھول مگر ہم نے زخم ہی کھائے

صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم

○

شبِ تیرہ نگراں ہے کلی کلی بیدار — نہ جانے کس کی نگاہوں کو ڈھونڈتی ہے بہار

کسی نقار ہی انشاط و طرب کا افسانہ — کبھی ہنسی بھی تڑپتے ہوئے دلوں کی پکار

نہ جانے کس کے نشانِ قدم سے میں محروم — کہ ایک عمر سے سُونے پڑے ہیں رہگزار

ہزار بار کسی چشمِ آشنا کے طفیل — اُجڑ اُجڑ کے بسے ہیں محبتوں کے دیار

عجب مثال ہے یہ تابِ نجوت کا — شبِ وصال کی راحت پہ ڈھونڈتی ہے قرار

یہ برقِ حسن اور اس پر یہ تیرہ خوئے حجاب — یہ سیلِ عشق اور اس پر نظر نظر کا شمار

ابھی چمن کو میسّر نہیں ہے رنگ و چمن — بہار ڈھونڈ رہی ہے ابھی سراغِ بہار

ہے ان کی پرسشِ درد و الم میں بھی پنہاں
وہ اک کسک کہ بجھتے نہیں جسے غمخوار

○

ہزار گردشِ شام و سحر سے گزرے ہیں
وہ قافلے جو تری راہگزر سے گزرے ہیں

ابھی ہر سس کو میسّر نہیں دلوں کا گداز
ابھی یہ لوگ مقامِ نظر سے گزرے ہیں

ہر ایک نقش پہ تھا تیرے نقشِ پا کا گماں
قدم قدم پہ تری رہگزر سے گزرے ہیں

نہ جانے کون سی منزل پہ جا کے رُک جائیں
نظر کے قافلے دیوار و در سے گزرے ہیں

رحیلِ شوق سے لرزاں تھا زندگی کا شعور
نہ جانے کس لیے ہم بے خبر سے گزرے ہیں

کچھ اور پھیل گئیں درد کی گھٹائیں یہاں
غمِ فراق کے مارے جدھر سے گزرے ہیں

جہاں سرور میسّر تھا جامِ مے کے بغیر
وہ میکدے بھی ہماری نظر سے گزرے ہیں

○

یہ کیا کہ اک جہاں کو کرو وقف اضطراب
یہ کیا کہ ایک دل کو شکیبا نہ کر سکو

ایسا نہ ہو یہ درد بنے درد لازوال
ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کر سکو

شاید تمھیں بھی پیں نہ آئے مرے بعد
شاید یہ بات تم بھی گوارا نہ کر سکو

کیا جانے پھر ستم بھی میسر ہو یا نہ ہو
کیا جانے یہ کرم بھی کرو یا نہ کر سکو

اللہ کرے جہاں کو مری یاد بھول جائے
اللہ کرے کہ تم بھی ایسا نہ کر سکو

میرے سوا کسی کی نہ ہو تم کو جستجو
میرے سوا کسی کی تمنا نہ کر سکو

○

وہ حسن کو جلوہ گر کریں گے
آرائشِ بام و در کریں گے

ہنس ہنس کے کریں گے چارہ سازی
سامانِ دل و نظر کریں گے

ہم بھی سرِ راہ منتظر ہیں
دیکھیں کب اِدھر نظر کریں گے

افسانۂ غم طویل ہے دوست
اس بات کو مختصر کریں گے

ہے شامِ فراق سخت تاریک
اس شام کی اب سحر کریں گے

افسردہ ہیں زندگی کے تیور
کب تک یونہی ہم بسر کریں گے

آئے گا تبسم ان لبوں پر
آنسو بھی کبھی اثر کریں گے

○

نظریں ڈھل کے اُبھرتے ہیں دل کے افسانے
یہ اور بات ہے دنیا نظر نہ پہچانے

وہ بزم دیکھی ہے میری نگاہ نے کہ جہاں
بغیر شمع بھی جلتے رہے ہیں پروانے

یہ کیا بہار کا جوبن یہ کیا نشاط کا رنگ
فسردہ میکدے والے اُداس میخانے

مرے ندیم! ترے چشمِ التفات کی خیر
بگڑ بگڑ کے سنورتے لگے ہیں افسانے

یہ کس کی چشمِ فسوں ساز کا کرشمہ ہے
کہ ٹوٹ کر بھی سلامت ہیں دل کے پیمانے

نگاہِ ناز میں دل سوزیِ نیاز کہاں
یہ آشنائے نظر ہیں دلوں کے بیگانے

○

یہ آج آئے ہیں کس اجنبی سے دیس میں ہم
تڑپ گئی ہے نظر چشمِ آشنا کے لیے

وہ ہاتھ جن سے تھا کل چاک دامنِ افلاک
وہ ہاتھ آج اٹھانے پڑے دعا کے لیے

یہ میں نے مانا جدائی مرا مقدر ہے
مگر یہ بات نہ منہ سے کہو خدا کے لیے

یہ راہرو تھے کبھی راہِ زندگی کا سراغ
یہ راہرو کہ بھٹکتے ہیں رہنما کے لیے

چراغ حسن حسرت

○

یارب غمِ ہجراں میں اتنا تو کیا ہوتا
جو ہاتھ جگر پر ہے وہ دستِ دعا ہوتا

اک عشق کا غم آفت اور اس پہ یہ دل آفت
یا غم نہ دیا ہوتا یا دل نہ دیا ہوتا

ناکام تمنا دل اس سوچ میں رہتا ہے
یوں ہوتا تو کیا ہوتا یوں ہوتا تو کیا ہوتا

امید تو بندھ جاتی تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے وعدہ تو کیا ہوتا

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

○

جب سے تیرا کرم ہے بندہ نواز
سوز ہے سوز اور نہ ساز ہے ساز

میں ہوں اور میری بے پر و بالی
دل ہے اور دل کی جرأتِ پرواز

حسن کی برہمی معاذ اللہ
گیسوؤں کے بکھرنے کا انداز

زلف بر شم جھکی ہوئی نظریں
گردنِ ناز میں کمندِ نیاز

قدِ بالا و دامنِ کوتاہ
منزلِ عشق کے نشیب و فراز

اللہ اللہ فسونِ نغمۂ عشق
سارا عالم ہے گوش بر آواز

قطع ہونے لگا ہے رشتۂ زیست
اے غم یار تیری عمر دراز!

○

اس طرح کر گیا دل کو مرے ویراں کوئی
نہ تمنا کوئی باقی ہے نہ ارماں کوئی

ہر کلی میں ہے ترے حسن دل آرا کی نمود
اب کسے دامن ہی بچے گا نہ گریباں کوئی

مے چکاں لب، نظر آوارہ، رنگیں مستانے
یوں نرے پہلو سے اٹھا ہے غزلخواں کوئی

زلف برہم ہے دل آشفتہ صبا آوارہ
خواب ہستی کا نہیں خواب پریشاں کوئی

نغمۂ درد سے ہو جاتا ہے عالم معمور
اس طرح چھیڑتا ہے تار رگ جاں کوئی

○

محبت کس قدر یاس آفریں معلوم ہوتی ہے
ترے ہونٹوں کی ہر جنبش نہیں معلوم ہوتی ہے

یہ کس کے آستاں پر مجھ کو ذوق سجدہ لے آیا
کہ آج اپنی جبیں اپنی جبیں معلوم ہوتی ہے

محبت تیرے جلوے سے کتنے رنگا رنگ جلوے ہیں
کہیں محسوس ہوتی ہے کہیں معلوم ہوتی ہے

جوانی مٹ گئی لیکن خلش درد محبت کی
جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے

امید وصل نے دھوکے دیئے ہیں اس قدر حسرتؔ
کہ اس کافر کی ہاں بھی اب نہیں معلوم ہوتی ہے

○

آؤ عنبر بار کی باتیں کریں
زلف کی، رخسار کی باتیں کریں

زلفِ عنبر بار کے قصے سنائیں
طرۂ مشکبار کی باتیں کریں

پھول برسائیں بساطِ عیش پر
روزِ وصلِ یار کی باتیں کریں

نقدِ جاں لے کر چلیں اس بزم میں
مصر کے بازار کی باتیں کریں

اُن کے کوچے میں جو گزری ہے کبھی
سایۂ دیوار کی باتیں کریں

آخری ساعت شبِ رخصت کی ہے
آؤ اب تو پیار کی باتیں کریں

○

دل بلا سے نثار ہو جائے
آپ کو اعتبار ہو جائے

تھم تو بارِ بار کہتا ہے
لطف بھی ایک بار ہو جائے

زندگی چارہ ساز غم نہ سہی
موت ہی غم گسار ہو جائے

یا خزاں جائے اور بہار آئے
یا خزاں ہی بہار ہو جائے

دل یہ مانا کہ اختیار نہیں
اور اگر اختیار ہو جائے

احسان دانش

○

عشق نے حسن کو تن ہی نہیں من بیچ دیا
مصلحت کرتی رہی لاکھ جتن بیچ دیا

عشق نے حسن کی اک نیم نگاہی کے عوض
تاج و اورنگِ سلاطینِ زمن بیچ دیا

آج کل بارِ گرانِ حسن ہے اور اہلِ ہوس
عشق نے سلسلۂ دار و رسن بیچ دیا

ان تک آتی نہیں خورشید کے رشتوں کی کمند
جن ضدکوں نے ستاروں کا کفن بیچ دیا

جورِ صیاد کی کس منہ سے شکایت کیجئے
اس چمن نے بھی تو ہر وصفِ چمن بیچ دیا

کوئی دیوانوں سے پوچھے یہ خموشی کیسی
کیا کہیں فقرۂ بت خانہ شکن بیچ دیا

صرف نغمے ہی نہیں لے بھی بدلنی ہوگی
باغبانوں نے سنا ہے کہ چمن بیچ دیا

دل اُمڈ آیا ہے احسانؔ بھر آئے آنسو
جب سنا ہے کسی فنکار نے فن بیچ دیا

○

اب کہو کارواں کدھر کو چلے
راستے کھو گئے چراغ جلے

آنسوؤں میں نہا گئیں خوشیاں
روٹھ کر جب وہ آنکھ سے ہیں گلے

کاروانوں میں شورِ منزل تھا
آئی منزل تو سب نے ہاتھ ملے

عشق عزم کو عبور کر نہ سکا
راستے کارواں کے ساتھ چلے

ہم پہ گزری ہیں جو شبِ غم کی راتیں
ہم جہنم میں رہتے مگر نہ جلے

تھے محبت کی ابتدا کے قصور
وہ تبسم جو آنسوؤں میں ڈھلے

آشیانوں پہ ظلمتیں برسیں
برق کے جس قدر چراغ جلے

وقت کی قدر میکدے والو
رات ڈھلنے کو ہے شراب ڈھلے

نغمہ ہائے حیات گائے کون
ساز اُترے ہوئے ہیں خشک گلے

خاک سے سینکڑوں اُگے خورشید
ہے اندھیرا مگر چراغ تلے

چاند ساکت ہے رُک گئے تارے
اب وہ آئیں تو غم کی رات ڈھلے

میکدے کا تو ذکر بھی ہے گناہ
اب حیاتِ حرم بڑی ہے گلے

پرسشِ حال کا جواب تھا کیا
ہنس پڑے ہم کہ جلد بات ٹلے

صبح نو کے بھنور کو کیا معلوم
کھِل کے گلشن کتنے زمانوں کے گلے

○

جو ترے آستاں سے لوٹ آئے
جنتِ دو جہاں سے لوٹ آئے
بندگی کے مقام سے آگاہ
سرحدِ لامکاں سے لوٹ آئے
ماہ و انجم کے ساتھ تھے ہم بھی
ہم مگر درمیاں سے لوٹ آئے
لگ گیا جی قفس میں جن جن کا
بارہا آشیاں سے لوٹ آئے
اب تو کچھ میں روشنی کر دو
اب تو کوئے بتاں سے لوٹ آئے
جن گلوں کو جہاں سے نسبت تھی
حلقۂ گلستاں سے لوٹ آئے
آ رہی ہے اک آشنا آواز
بے خودی ہم کہاں سے لوٹ آئے
ہائے جو گرد راہ ہیں اب تک
وائے جو کارواں سے لوٹ آئے
دیر و کعبہ سے ان کے دیوانے
ناخوش و سرگراں سے لوٹ آئے
کاش احساں وہ خلدِ رعنائی
ارضِ ہندوستاں سے لوٹ آئے

○

جب جوانی کی دھوپ ڈھلتی ہے
خودسری سر جھکا کے چلتی ہے
یاس میں ان کے لطف کی ہمسر
خلتوں میں کہاں مچلتی ہے
اُف وہ معذور سی نگاہ کہ جب
زندگی بے بسی میں ڈھلتی ہے
دل سلگتا نہ ہو بہاروں کا
اشک شبنم سے کو نکلتی ہے
لامکاں کے لیے عروسِ حیات
موت کے بھیس میں نکلتی ہے
تجربہ ہے کہ دشمنی اکثر
دوستی کے لہو سے پلتی ہے
ہوشیار اے وفا کے دیوانے
یہ وفا آنسوؤں میں ڈھلتی ہے
تھک گیا چاند سو چلے تارے
اب تو آؤ کہ رات ڈھلتی ہے
تمام عمر میں خیال ہے اُن کا
اور جنگل میں آگ جلتی ہے
یاس لے بیٹھتی ہے کشتی کو
آس ساحل پہ ہاتھ ملتی ہے
بعض اوقات دل کی دنیا بھی
آنکھ کے فیصلوں پہ چلتی ہے
مسجدوں میں سکوت کیا معنی
مے کدوں ہی شراب ڈھلتی ہے
عشرتِ بے ثبات کی خو میں
جسم ہنستا ہے روح جلتی ہے

دورِ خاصہ کی دوستی احساں
کس قدر جلد رُخ بدلتی ہے

○

نظر فریبِ قضا کھا گئی تو کیا ہوگا
حیاتِ موت سے ٹکرا گئی تو کیا ہوگا

بزعمِ ہوش تجلی کی جستجو بے سود
جنوں کی زد پہ خزاں آ گئی تو کیا ہوگا

نئی سحر کے بہت لوگ منتظر ہیں مگر
نئی سحر بھی جو کجلا گئی تو کیا ہوگا

نہ بنھاؤں کی مجلس میں لے چلو مجھ کو
میں بے ادب ہوں سنبھل آ گئی تو کیا ہوگا

غمِ حیات سے بیشک ہے خودکشی آساں
مگر جو موت بھی شرما گئی تو کیا ہوگا

خبابِ لالہ و گل کو یکا رنے والو
خزاں سرشت بہار آ گئی تو کیا ہوگا

خوشی چھنی ہے تو غم کا بھی اعتماد نہ کر
جو روحِ غم سے بھی اُکتا گئی تو کیا ہوگا

یہ فکر کر کہ ان آسودگی کے دھوکوں میں
تری خودی کو بھی موت آ گئی تو کیا ہوگا

وہ داستاں جو مصائب میں دفن ہے اب تک
زبانِ خلق پہ گر آ گئی تو کیا ہوگا

لرز رہے ہیں جگر جس سے کوہساروں کے
اگر وہ لہر یہاں آ گئی تو کیا ہوگا

وہ موت جس کی ہم احسانؔ سن رہے ہیں خبر
رموزِ زیست بھی سمجھا گئی تو کیا ہوگا

○

پرسشِ غم کا شکریہ! کیا تجھے آگہی نہیں
تیرے بغیر زندگی درد ہے زندگی نہیں

دور تھا اک گزر گیا، نشہ تھا اک اُتر گیا
اب وہ مقام ہے جہاں شکوۂ بے رخی نہیں

تیرے سوا کروں پسند کیا تری کائنات میں
دونوں جہاں کی نعمتیں قیمتِ بندگی نہیں

عشرتِ خلد کے لیے زاہدِ کج نظر جھکے
مشربِ عشق میں تو یہ جرم ہے بندگی نہیں

لاکھ زمانہ ظلم ڈھائے، وقت شوہ خدا دکھائے
جب مجھے ہو یقیں کہ تو حاصلِ زندگی نہیں

دل کی شگفتگی کے ساتھ راحتِ مے کدہ گئی
فرصتِ تشنگی تو ہے، حسرتِ تشنگی نہیں

ایک وہ رات تھی کہ جب تھا مرے گھر وہ مہتاب
ایک یہ رات ہے کہ اب چاند ہے چاندنی نہیں

زخم پہ زخم کھا کے جی، اپنے لہو کے گھونٹ پی
آہ نہ کر لبوں کو سی، عشق ہے دل لگی نہیں

دیکھ کے خشک و زرد پھول دل ہے کچھ اس طرح ملول
جیسے تری خزاں کے بعد دورِ بہار ہی نہیں

ساغر نظامی

○

دشت میں قیس نہیں، کوہ پہ فرہاد نہیں
ہے وہی عشق کی دنیا، مگر آباد نہیں

ڈھونڈنے کو تجھے او میرے نہ ملنے والے
وہ چلا ہے جسے اپنا بھی پتہ یاد نہیں

روحِ بلبل نے خزاں بن کے اُجاڑا گلشن
پھول کھلتے رہے ہم پھول ہیں صیاد نہیں

حُسن سے چوک ہوئی، اس کی ہے تائید گواہ
عشق سے بھول ہوئی ہو، یہ مجھے یاد نہیں

بربطِ ماہ پہ مضراب فغاں رکھ دی تھی
میں نے اک نغمہ سنایا تھا، تمھیں یاد نہیں

لاؤ اک سجدہ کروں عالمِ بدمستی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں

○

نغمے ہوا نے چھیڑے فطرت کی بانسری میں
پیدا ہوئیں زبانیں جنگل کی خامشی میں

اس وقت کی اداسی ہے دیکھنے کے قابل
جب کوئی رو رہا ہو افسردہ چاندنی میں

کچھ تو لطیف ہوتیں گھڑیاں مصیبتوں کی
تم ایک دن تو ملتے دو دن کی زندگی میں

ہنگامۂ تبسم ہے میری ہر خموشی
تم مسکرا رہے ہو دل کی شگفتگی میں

خالی پڑے ہوئے ہیں پھولوں کے سب صحیفے
رازِ چمن نہاں ہے کلیوں کی خامشی میں

○

نگاہیں روح میں دل میں سمائے جاتے ہیں ہر ایک عالمِ امکاں پہ چھائے جاتے ہیں
جو اُٹھ سکے تھے نہ خود حسن کے اُٹھانے سے وہ پردہ ہائے دوئی اب اٹھائے جاتے ہیں
جو گر سکے تھے نہ خود عشق کے گرانے سے وہ سب حجابِ محبت گرائے جاتے ہیں
چھپا چھپا کے جنہیں مصلحت نے رکھا تھا وہ جلوے اب سرِ محفل دکھائے جاتے ہیں
سنبھل کر اے نگہِ شوق! بزمِ دوست ہے یہ یہاں خراب نظر آزمائے جاتے ہیں
نہ پوچھ کارگہِ عشق کا طلسم نہ پوچھ قدم قدم پہ تماشے دکھائے جاتے ہیں
پتہ نہیں کہیں ان کا اور ان کے دیوانے تصورات کی محفل سجائے جاتے ہیں
کہاں کی لغزشِ پا اب یہ حال ہے ساقی کہ سر سے تا بہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں
یہ کیدہ سے نہ امدرسہ نہیں واعظ! یہاں شراب سے انساں بنائے جاتے ہیں
یہ نقطہ حسن ہے نقشِ کدہ محبت کا بجائے شمع یہاں دل جلائے جاتے ہیں
تمام عالمِ محسوس کانپ اُٹھتا ہے جب آنکھ سے کہیں آنسو بہائے جاتے ہیں
ہمارا حال تو دیکھا، ہمارا ظرف بھی دیکھ نگاہ اٹھتی نہیں غم اُٹھائے جاتے ہیں

تلاشِ لازمۂ عاشقی نہیں ساغر
نہ ڈھونڈنے پہ بھی وہ ہم میں پائے جاتے ہیں

○

کافر گیسو والوں کی رات بسر یوں ہوتی ہے
حسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے

مجھ میں تجھ میں فرق نہیں، مجھ میں تجھ میں فرق ہے یہ
تو دنیا پر ہنستا ہے، دنیا مجھ پر روتی ہے

اس معمورۂ غم خانے سے ضبط ذرا ہشیار رہے
دل کی ہر گہرائی میں ایک اچھوتا موتی ہے

صبر و سکوں دو دریا ہیں، بھرتے بھرتے بھرتے ہیں
تسکیں دل کی بارش ہے، ہوتے ہوتے ہوتی ہے

جینے میں کیا راحت تھی، مرنے میں تکلیف ہے کیا
جب دنیا کیوں ہنستی تھی؟ اب دنیا کیوں روتی ہے

دل کی تو تشخیص ہوئی بیچارہ گروں سے پوچھوں گا
دل جب دھک دھک کرتا ہے وہ حالت کیا ہوتی ہے

ساون آئے پھول کھلے، اک افسردہ یہ بول اُٹھا
جس میں دل کھل جاتے ہیں وہ برکھا کب ہوتی ہے

ذرّے اور تارے مل کر جادو روز جگاتے ہیں
فطرت کی بیداری میں ساری دنیا سوتی ہے

رات کے آنسو اے ساغر پھولوں میں بھر جاتے ہیں
صبح چمن اس پانی سے کلیوں کا منہ دھوتی ہے

○

ساون کی رُت آپہنچی، کالے بادل چھائیں گے
کلیاں رنگ میں بھیگیں گی، پھولوں میں رس آئیں گے

ہاں! وہ ملنے آئیں گے، رحم بھی کچھ فرمائیں گے
حسن اگر چنگی لے گا، پھر قاتل بن جائیں گے

نامے کھوئے صندلکے میں شام ہوئی راستہ آپہنچی
پریم کے سونے مندر میں آخر وہ کب آئیں گے

ہستی کی بدمستی کیا، ہستی خود اک مستی ہے
موت اسی دن آئے گی، ہوش میں جس دن آئیں گے

میری آنکھیں کچھ بھی نہیں تیرے جلوے جلوے ہیں
تو جب سامنے آئے گا، پردے سے پڑ جائیں گے

تارے کتنے ہی چھٹکیں، جگنو کتنے ہی چمکیں
شمع کی زردی کہتی ہے، رات گئے وہ آئیں گے

○

راتوں کو تصوّر ہے اُن کا اور چپکے چپکے رونا ہے
اے صبح کے تارے تو ہی بتا! انجام مرا کیا ہونا ہے

ان نورس آنکھوں والوں کا کیا ہنسنا ہے کیا رونا ہے
بے سمجھے سچے موتی ہیں، بہتا ہوا خالص سونا ہے

دل کو کھویا، خود بھی کھوئے، دنیا کھوئی، دین بھی کھویا
یہ گم شدگی ہے تو اک دن لے دوست! تجھے بھی کھونا ہے

تمیزِ کمال و نقص اٹھا یہ تو روشن ہے دنیا پر
میں چندن ہوں تو کندن ہے، میں مٹی ہوں تو سونا ہے

تو یہ نہ سمجھ اللہ! کہ ہے تسکین ترے دیوانوں کو
وحشت میں ہمارا ہنس پڑنا، دراصل ہمارا رونا ہے

ماتم ہے مری آوازِ شکستِ سازِ دلِ صد پارہ کا
ساغر میرا نغمہ بھی دیپک کے سُروں میں رونا ہے

اختر انصاری

○

کسی سے لڑائیں نظر اور جھیلیں محبت کے غم اتنی فرصت کہاں
اٹھائیں کسی ماہ پیکر حسینہ کے جور و ستم اتنی فرصت کہاں

زمانے کی بے رحمیوں کے تصدق دماغ نشاط و الم ہی نہیں
دل اپنا کرے آرزوئے جفا یا امید کرم اتنی فرصت کہاں

ڈبو دیں مئے ناب کی مستیوں میں فلاکت کے نکبت کے احساس کو
بنائیں کسی عاشیانہ سے کوزے ہی کو جام جم اتنی فرصت کہاں

ہیں آزاد افکار لیکن تفکر میں ڈوبے ہوئے سے رہیں رات دن
طبیعت کی بے وجہ افسردگی کے مزے لوٹیں ہم اتنی فرصت کہاں

نہ ماضی ہمارا نہ مستقبل اپنا کچھ اس طور سے صرف امروز ہیں
غم و کوشش یا فکر فردا میں اختر کریں سر کو خم اتنی فرصت کہاں

○

کوئی مآل محبت مجھے بتاؤ نہیں
میں خواب دیکھ رہا ہوں مجھے جگاؤ نہیں

کسی کی یاد ہے ان کی مہک سے وابستہ
مجھے یہ پھول خدا کے لیے سنگھاؤ نہیں

محبت اور جوانی کے تذکرے نہ کرو
کسی ستائے ہوئے کو بہت ستاؤ نہیں

یہ کہہ رہا ہے محبت کی کاوشوں سے دل
یہ میرے ہنسنے کے دن ہیں مجھے رلاؤ نہیں

اجڑ کے پھر نہیں بستا جہان دل اختر
بہار باغ کو اس پر دلیل لاؤ نہیں

○

بہار آئی زمانہ ہو اخترؔ باقی
ہمارے دل میں بھی اک لہر کاش آجاتی

ہوا بھی سرد ہے بھیگی ہے رات بھی لیکن
سلگ رہی ہے کسی آگ سے مری چھاتی

مرے پڑوس میں یہ ذکر ہے کئی دن سے
صدا جو آتی تھی رونے کی اب نہیں آتی

لگا کے سینے سے شادابیوں کو سو جاتا
مجھے بہار جوانی میں موت آجاتی

بجا رہا ہے کوئی رات میں ستار اخترؔ
دھڑک رہی ہے مری آرزوؤں کی چھاتی

○

حلاوتیں نہ ہمیں مل سکیں تکلم کی
سمیٹ لائے فقط بجلیاں تبسم کی

متاعِ صبر کو اشکوں کی نذر کر بیٹھے
ہمارے پاس جو دولت تھی ہم نے یوں گم کی

اُڑا لی رونقِ گلزارِ دل کے زخموں نے
بہار چھین لی داغوں نے بزمِ انجم کی

مغنیہ! یہ تری وجد بار موسیقی
ہے بازگشت مری روح کے ترنم کی

خمارِ چشم سے پھوٹی لبوں تک آپہنچی
لبوں سے چہرے پہ پھیلی ضیا تبسم کی

پلا رہی ہیں نظر کو شرابِ دل افروز
یہ رُخ پہ بکھری ہوئی مستیاں تکلم کی

ہم اس اُداس خموشی پہ مرتے ہیں اخترؔ
نثار جس پہ ہیں رعنائیاں تکلم کی

○

خزاں میں آگ لگاؤ بہار کے دن ہیں — نئے شگوفے کھلاؤ بہار کے دن ہیں

دراز دستیٔ خزاں کی تباہ کاری کا — بساطِ عیش بچھاؤ بہار کے دن ہیں

عذارِ گل کی ضیا سے جلا کے کانٹوں کو — گلی دلوں کی سجاؤ بہار کے دن ہیں

ملا کے قطرۂ شبنم میں تارِ نکہتِ گل — کوئی شراب بناؤ بہار کے دن ہیں

بھرے کٹورے چمن کے یہ درس دیتے ہیں — چھلکتے جام لنڈھاؤ بہار کے دن ہیں

اب انضباط پسندی ہے بھی نامشکور — متاعِ ضبط لٹاؤ بہار کے دن ہیں

شرارِ گل سے زمانے میں شعلے بھڑکاؤ — حسین فتنے جگاؤ بہار کے دن ہیں

جنونِ شوق کی بے اعتدالیوں کے خلاف — کوئی دلیل نہ لاؤ بہار کے دن ہیں

پرانی شمعیں بجھا دیں سبا کے جھونکوں نے — نئے چراغ جلاؤ بہار کے دن ہیں

لچک بھی ہے وفورِ ثمر سے شاخِ حیات — یہ بار ہنس کے اٹھاؤ بہار کے دن ہیں

جنابِ اخترؔ جاں دادۂ رخِ گل کو
امامِ وقت بناؤ بہار کے دن ہیں

○

صاف ظاہر ہے نگاہوں سے کہ ہم مرتے ہیں
منہ سے کہتے ہوئے یہ بات مگر ڈرتے ہیں

ایک تصویرِ محبت ہے جوانی — گویا
جس میں رنگوں کے عوض خونِ جگر بھرتے ہیں

عشرتِ رفتہ نے جا کر نہ کیا یاد ہمیں
عشرتِ رفتہ کو ہم یاد کیا کرتے ہیں

آسماں سے کبھی دیکھی نہ گئی اپنی خوشی
اب یہ حالت ہے کہ ہم ہنستے ہوئے ڈرتے ہیں

شعر کہتے ہو بہت خوب تم اخترؔ لیکن
اچھے شاعر پہ سنا ہے کہ جواں مرتے ہیں

شاد عارفی

○ ○

یہ قولِ غالب ہوا کیا ہے "جو شرد ہتقان کے لہو کا"
نتیجوں سے وہی تعلق ہے آج کل مظلم شعلہ خو کا

ہجومِ حرماں میں کوئی موقع نہیں منتی خوشہ گلو کا
تمھیں مبارک۔ مگر مرے ہاں نہیں ہے مصرف جم و سبو کا

وہاں بہاروں سے باغباناں کی سازشیں بار و نہ ہوں گی
جہاں خزاں نے اٹھا دیا ہو سوال کانٹوں کی آبرو کا

یہ اگلے وقتوں کے رہنما۔ ان کی مصلحت پر نگاہ رکھیے
پٹے ہوئے راستوں پہ چل کر فریب دیتے ہیں جستجو کا

ہم اُن کے عدوں پہ ٹوپیاں کیوں اچھالیں جو پے سیاست
ہوا کے جھونکے قدم کی آہٹ پہ رخ بدلتے ہیں گفتگو کا

کسی کے ظاہر سے اس کے باطن پہ جائزہ سہل بھی نہیں ہے
شراب کی تلخیوں سے پہلے سوال آتا ہے رنگ و بو کا

چمن میں پودوں کے سوکھ جانے کی شکوہ سنجی کو طنز کہہ کر
کہاں لکھا ہے گلا دبا دے بجے عندلیبانِ خوش گلو کا

جو بن بلائے تمھاری محفل میں آئے ہیں اُن کو کیا کہوں میں
وہ اس میں عزت سمجھ رہے ہیں تو ایسی عزت پہ میں نے تھوکا

جوان شاعر تو شاد ان وحشتوں سے دامن بچا چلے ہیں
مگر ضعیفوں میں اب بھی چرچا ہے چاک دامانی و رفو کا

بنا پائی نہ ذرّے کو نگینا
تو پھر مصرف ترا اے چشمِ بینا

سرہانے کوئی رکھ جاتا ہے مینا
خدا کا نام لینا اور پینا

نظر ہے اور تماشائے بد و نیک
بُری اچھی بھی پڑتی ہے پہ بینا

پسیجا ہے بتوں کا دل ہمیں پر
یہیں پتھر کو آیا ہے پسینا

نگینہ ہے دلِ برباد الفت
مگر جو ٹوٹ جائے وہ نگینا

حجاب آلودہ رخسارِ جوانی
دیا پھولوں کو شبنم نے پسینا

جہاں اندھے ادب کے پاسباں ہوں
وہاں کیا "عرضِ جوہر" کا قرینا

کہاں ہیں تجربہ کارانِ خلوت
دھڑکتا ہے مرا دل اس کا سینا

مرا مسلک ہے صلح و آشتی شاد
کمینہ ہے جو رکھے مجھ سے کینا

○

چمن کو آگ لگانے کی بات کرتا ہوں
سمجھ سکو تو ٹھکانے کی بات کرتا ہوں
سحر کو شمع بجھانے کی بات کرتا ہوں
یہ غافلوں کو جگانے کی بات کرتا ہوں
روش روش پہ بچھا دو ببول کے کانٹے
چمن سے لطف اٹھانے کی بات کرتا ہوں
"وہ باغبان جو پودوں سے پیار رکھتا ہے"
یہ آپ ہی کے زمانے کی بات کرتا ہوں
سراب بیچ کی موجوں سے مانگا ہوگا
اگر میں خون بہانے کی بات کرتا ہوں
وہ صرف اپنے لیے جام کر رہے ہیں طلب
میں ہر کسی کو پلانے کی بات کرتا ہوں
یہاں چراغ تلے ٹوٹ ہے اندھیرا ہے
کہاں چراغ جلانے کی بات کرتا ہوں
اس انجمن سے اٹھا ہوں کھری کھری کہہ کر
پھر انجمن میں نہ آنے کی بات کرتا ہوں
بڑی زباں سے گزارش ہے ناگوار اگر
تو کیا سوال اٹھانے کی بات کرتا ہوں
نقاب پڑے زمانہ نہ اٹھ سکے گی کہیں
گلوں سے اوس اٹھانے کی بات کرتا ہوں
گھسے ہوؤں کو نئی فکر دے رہا ہوں شاد
بجھے ہوؤں کو سلگانے کی بات کرتا ہوں

○

موج کو آپ کنارا سمجھیں　　ہم کو اس باب میں ہارا سمجھیں
آئیے خون کو پارا سمجھیں　　وہ سمجھتے ہیں اشارا سمجھیں
بے اصولی کو وہ پیارا سمجھیں　　بزم سے مجھ کو سدھارا سمجھیں
یہ سمجھنا کوئی توہین نہیں　　غلطی کر کے دوبارا سمجھیں
غالباً یہ تو نہ ممکن ہوگا　　ہم تباہی کو نظارا سمجھیں
ہو کے آزاد ہوا اندازہ　　جیتنے والے کو ہارا سمجھیں
فرصتِ عشق میسر ہی کہاں　　اب کسے عشق کا مارا سمجھیں
اس سے پہلے کہ اُجڑ جائے چمن　　باغبانوں کو خدارا سمجھیں
حکم یہ ہے ستم آرا نہ کہیں　　اور دل میں ستم آرا سمجھیں
آگیا وقت کہ وہ گھبرا کر　　پھول کو سرخ ستارا سمجھیں

واسطہ اُن سے پڑا ہے اے شاد

○

اپنی تقدیر کو پیٹے جو پریشاں ہے کوئی
آپ کے بس میں علاجِ غمِ دوراں ہے کوئی

ٹوکئے اس کو جو اس وقت غزلخواں ہے کوئی
جیل میں عشق لڑانے کا بھی امکاں ہے کوئی

اپنی مرضی سے تو اُگتے نہیں خود رَو پودے
ہم غریبوں کا بہرجاں نگہباں ہے کوئی

زرد چہروں نے تبسم کو کیا ہے رُسوا
ورنہ ظاہر بھی نہ ہوتا کہ پریشاں ہے کوئی

گُل رخسار فسردہ ہے نہ جبیں عرق آلود
آپ کس طرح یہ کہتے ہیں پشیماں ہے کوئی

چاپ سُن کر جو بٹھا دی تھی اُٹھا لا ساقی
شیخ صاحب ہیں یہاں سمجھا تھا مسلماں ہے کوئی

حرص دربان کو آقا کا مصاحب مانی
نبضِ آقا کو سمجھتا ہے کہ درباں ہے کوئی

ضبطِ اظہارِ وفا کوئی بُری بات نہیں
ضبط بہتان خطا سہل ہے آساں ہے کوئی

مجھ سے کافر کے یہاں شادؔ مکمل سرقہ
عکسِ شہ پڑا صاحبِ ایماں ہے کوئی

○

یہ سجدہ ہے کہ تجدیدِ وفا ہے
اسے اللہ بہتر جانتا ہے

تمہیں رہبر سمجھنا پڑ گیا ہے
ہماری بیکسی کی انتہا ہے

ہماری جرأتوں پر وہ ہنسا ہے
ہنسا۔ لیکن پسینہ آگیا ہے

میں اپنے لفظ واپس لے رہا ہوں
یہ رہزن تھا۔ میں سمجھا رہنما ہے

برابر ہیں نعیمانِ درد و نغمہ
یہ آزادی نہیں تو اور کیا ہے

یہ ہر حالت بتوں کو پوجتے ہیں
یہ ہر صورت۔ ہمارا بھی خدا ہے

یہی ہے شادؔ میں سب سے بڑا عیب
وہی لکھتا ہے جو کچھ دیکھتا ہے

نہال سیوہاروی

○

کبھی تھیں جواں خاک بسر یاد تو ہوگا
وہ اپنی نگاہوں کا اثر یاد تو ہوگا

وہ ہم تھے کہ تھے جوش جنوں کی
وہ غلغلۂ شام و سحر یاد تو ہوگا

جلنے نہ دیئے وہ تجلی کی حکایت
وہ تذکرۂ داغ جگر یاد تو ہوگا

ہر گام پہ وہ حسن کی پُرہوش نگاہیں
وہ عشق کا بدمست سفر یاد تو ہوگا

ہر لحظہ وہ دیوانۂ محبت میں تغیر
ہر سانس میں وہ رنگِ دگر یاد تو ہوگا

وہ دل کو تھے جن خو و ادا سے تعلق
وہ خاک سے پیمانِ نظر یاد تو ہوگا

وہ کاکلِ دہر سے اک بے خبری سی
وہ طعنۂ ہر اہلِ خبر یاد تو ہوگا

وہ دیدۂ کہتا و کشِ آرائشِ گیتی
پہروں طرب راہگزر یاد تو ہوگا

وہ جوش کے جذبات کا بھرپور تلاطم
طوفان کی موجوں میں گذر یاد تو ہوگا

گم کردہ سکوں پا کے مجھے اپنی گلی میں
کہنا وہ تجاہل سے کدھر یاد تو ہوگا

بھولی تو نہ ہوگی مری الفت کی حقیقت
مدت کا فسانہ ہے مگر یاد تو ہوگا

○

ہے کدھر وہ سلسلۂ کرم سے کہاں وہ ساقیٔ نیک خو
کہ جہاں میکدۂ تشنگی سے پکارتا ہے سبو سبو

ہوں نزل سے راہرو طلب یہ ندائے غیب ہے روز و شب
ابھی اور چل ابھی اور چل یہی جستجو یہی جستجو

تری محکمتوں کی خبر کہاں جو ہو پردہ در وہ نظر کہاں
ہیں ہزار ناظرِ گلستاں نہیں ایک محرمِ رنگ و بو

ہوں حدیں تمام خیال کی نہ ہو شرح تیرے جمال کی
جو ازل سے تا بہ ابد ہے یہی تنہ کردہ یہی گفتگو

مری چار دن کی یہ زندگی اسی ذوق و شوق میں کٹ گئی
کبھی یہ حکایتِ آرزو کبھی وہ حکایتِ آرزو

ترا جلوہ روحِ نجوم ہے تو ہر ایک خوب سے خوب تر
کبھی اپنی ہمت نگاہ کر کہ فروغِ بزمِ جہاں ہے تو

ترے ولولے ہیں اگر جواں ہو بہ رنگِ سیلِ رواں دواں
کہ ہے رنگِ ہمت آدمی روشِ فنا صفتِ آب جو

ستمِ زمانہ سے تجھ کو رم ہیں خدائے نزہت ہر الم
تجھے آشیاں کی تلاش ہے مجھے بجلیوں کی ہے جستجو

○

وہم کہتا ہے یہ عالم جسے طوفانوں کی
ایک ہلکی سی تڑپ ہے مرے ارمانوں کی

یہی بے لوث محبت یہی غمخواریٔ خلق
اور معراج کسے کہتے ہیں انسانوں کی

اے مری ہمتِ مردانہ تری عمر دراز
تو نے ڈالی ہے کلائی کئی طوفانوں کی

آج کچھ لوگ وہاں جمع تھے باچشمِ پُرآب
کل جو دنیا تھی چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

کس قدر عام ہے اس دہر میں احساسِ حیات
رگِ ہر سنگ میں اک لہر ہے طوفانوں کی

نام ہے کیا اسی ہنگامے کا آغازِ شباب
ایک آندھی سی چلی آتی ہے ارمانوں کی

بات کب سنتے ہیں دنیا کی ترے دیوانے
نہ سنے بات یہ دنیا ترے دیوانوں کی

جس قدر عشق سے ہوتی ہے فزوں وسعتِ فکر
عقل رکھتی ہے بنائیں نئے زندانوں کی

اپنی موت اپنی تباہی کی طرف کیا دیکھیں
کہ نگاہیں ہیں طرفِ شمع ہیں پروانوں کی

ہو گئی عمر بہاروں کے تصور میں تمام
سیر کرتے رہے نادیدہ گلستانوں کی

ماسوا اس کے نہیں اور کچھ افسانۂ ہند
ایک تاریخ ہے اُجڑے ہوئے کاشانوں کی

○

عبث ہے گرمِ تلاشِ اثر فغاں کے لیے
فغاں ہے سینۂ سوزاں کے امتحاں کے لیے

اُڑا لیے ہیں کچھ ارباب گلستاں نے تو کیا
ہزار شیوۂ نو ہیں مری فغاں کے لیے

زمین کو چہ جاناں سے آ رہی ہے صدا
بلندیاں نہیں مخصوص آسماں کے لیے

ہے ختم حوصلہ مندیٔ وجودِ آدم پر
ستیزہ کار ہے رزمِ جہاں کے لیے

چمن کی سرد ہواؤں نے دی مجھے تسکین
میں دل گرفتہ ہوا جب سکونِ جاں کے لیے

الٰہی محفلِ انجم میں جلوہ گر ہے کون
یہ چاندنی نے کیا کھیت کس جواں کے لیے

ہے سخت بے ادبی گر کہے فسانۂ عشق
ہر ایک بات مناسب نہیں بیاں کے لیے

اندھیری رات تھکی ہمتیں، کڑی منزل
سلامتی کی دعا مانگ کارواں کے لیے

سجائی فکرِ درخشاں نے میری بزمِ نجوم
تھی منتظر یہ زمیں نازِ آسماں کے لیے

○

بہار کا روپ بھی نگاہوں میں اک فریب بہار سا ہے
حیات ہی نقشِ نیں ہے حیات میں انتشار سا ہے

زمانہ کیا دیکھنے دکھانے نہ جانے کیا انقلاب آئے
فلک کے تیور میں خفگیں سے زمیں کے دل میں غبار سا ہے

کہانی ہو انکی تو جب سے رہے نہ احساسِ جیب و دامن
اگر ہے احساسِ جیب و دامن تو پھر جنوں ہوشیار سا ہے

کچھ آج ایسی بجی ہے گذری دبی ہوئی تھی جو چوٹ ابھری
جسے بجھانے بجھا تھا دل میں وہ نالہ لے اختیار سا ہے

ابھی امید و خانہ توڑو ریاستِ دلبری نہ چھوڑو
کبھی جو فردوس رنگ و بو تھا وہ ایک اجڑا دیار سا ہے

نہال رہے ہے مستی ہے مفت الزام سے پرستی
ہے عام اس شہر میں روایت یہ شخص کچھ بادہ خوار سا ہے

○

زندگی زہر کا اک جام ہوئی جاتی ہے — کیا سے کیا یہ مے گلفام ہوئی جاتی ہے

کچھ گذاری ہے غمِ عشق و محبت میں حیات — کچھ سپردِ غمِ ایام ہوئی جاتی ہے

ہوتا جاتا ہے یہ عالم ہمہ تن عالمِ درد — خلشِ غم خلشِ عام ہوئی جاتی ہے

آچلا پیرِ مغاں وقتِ چراغانِ حیات — زرد ہے مہر مبیں، شام ہوئی جاتی ہے

ہوسِ سیر و تماشا ہے کہ ہوتی نہیں ختم — زندگی ہے کہ سبک گام ہوئی جاتی ہے

کن حقائق پہ نقاب ہے کہ یہ بزمِ وجود — اک غم خانۂ اوہام ہوئی جاتی ہے

صحبتِ پیرِ مغاں میں یہ کھلی عظمتِ عشق — عقل بھی دُردِ تہِ جام ہوئی جاتی ہے

المدد! المدد اے تیرِ اقبال و عروج — تیرہ بختوں کی سحر شام ہوئی جاتی ہے

العجب العجب اے ہمتِ مردانہ کہ تو — شاکیٔ گردشِ ایام ہوئی جاتی ہے

تم جو آئے ہو تو شکلِ در و دیوار ہے اور — کتنی رنگین مری شام ہوئی جاتی ہے

کیوں نہ وجد آئے تری نکتہ طرازی پہ نہال
غزل اک نغمۂ الہام ہوئی جاتی ہے

اسرار الحق مجاز

○

شوق کے ہاتھوں اے دل مضطر کیا ہونا ہے کیا ہوگا
عشق تو رسوا ہو ہی چکا ہے حسن بھی کیا رسوا ہوگا

حسن کی بزم خاص میں جا کر اس سے زیادہ کیا ہوگا
کوئی نیا پیماں باندھیں گے کوئی نیا وعدہ ہوگا

چارہ گری سے آنکھوں پر اس چارہ گری سے کیا حاصل
درد کہ اپنی آپ دوا ہے تم سے اچھا کیا ہوگا

واعظ سادہ لوح سے کہہ دو چھوڑے عقبیٰ کی باتیں
اس دنیا میں کیا رکھا ہے اس دنیا میں کیا ہوگا

○

مری وفا کا ترا لطف بھی جواب نہیں
مرے شباب کی قیمت ترا شباب نہیں
یہ ماہتاب نہیں ہے کہ آفتاب نہیں
بھی ہے حسن مگر عشق کا جواب نہیں
مری نگاہ میں جلوے ہیں جلوے ہی جلوے
یہاں حجاب نہیں ہے یہاں نقاب نہیں
جنوں بھی حد سے سوا شوق بھی ہے حد سے سوا
یہ بات کیا ہے کہ میں مورد عتاب نہیں
یہاں تو حسن کا دل بھی ہے غم سے صد پارہ
میں کامیاب نہیں وہ بھی کامیاب نہیں
یہاں تو رات کی بیداریاں مسلّم ہیں
مگر وہاں بھی حسیں انکھڑیوں میں خواب نہیں
نہ پوچھیے مری دنیا کو میری دنیا میں
خود آفتاب بھی ذرہ ہے آفتاب نہیں
سبھی ہیں میکدۂ دہر میں خرد والے
کوئی خراب نہیں ہے کوئی خراب نہیں
مجاز کس کو میں سمجھاؤں کوئی کیا سمجھے
کہ کامیاب محبت بھی کامیاب نہیں

○

یہ بادِ تمنا پہ عتاب اور زیادہ
ہاں میری محبت کا جواب اور زیادہ

رہ میں نہ ابھی اہلِ نظر حال پہ میرے
ہونا ہے ابھی مجھ کو خراب اور زیادہ

آوارہ و مجنوں ہی پہ موقوف نہیں کچھ
بننے ہیں ابھی مجھ کو خطاب اور زیادہ

اٹھیں گے ابھی اور بھی طوفاں مرے دل سے
دیکھوں گا ابھی عشق کے خواب اور زیادہ

ٹپکے گا لہو اور مرے دیدۂ تر سے
دھڑکے گا دلِ خانہ خراب اور زیادہ

ہوگی مری باتوں سے انھیں اور بھی حیرت
ہونے گا انھیں مجھ سے حجاب اور زیادہ

اے مطربِ مہ ناک کوئی اور بھی نغمہ
اے ساقیٔ فیاض شراب اور زیادہ

○

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے شوقِ نظارہ کیا کہیے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصور کیا کیجے ہم صورتِ جاناں بھول گئے

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

یہ اپنی وفا کا عالم ہے اب ان کی جفا کو کیا کہیے
اک نشترِ زہر آگیں رکھ کر نزدیکِ رگِ جاں بھول گئے

○

تسکین دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیِ کرم فرما بھی گئے
اس سعیِ کرم کو کیا کہیئے بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے کچھ کہہ نہ سکے کچھ سُن نہ سکے
یاں ہم سے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

آشفتگی وحشت کی قسم حیرت کی قسم حسرت کی قسم
اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں ہم رازِ تبسم پا بھی گئے

روداد غمِ الفت ان سے ہم کیا کہتے کیوں کر کہتے
ایک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے

اربابِ جنوں پر فرقت میں اب کیا کہیئے کیسا کیا گزری
آئے تھے سوادِ الفت میں کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

اس محفلِ کیف و مستی میں اس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

○

جنونِ شوق اب بھی کم نہیں ہے
مگر وہ آج بھی برہم نہیں ہے

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

بہت کچھ اور بھی ہے اس جہاں میں
یہ دنیا محض غم ہی غم نہیں ہے

تقاضے کیوں کروں پیہم نہ ساقی
کسے یاں فکرِ بیش و کم نہیں ہے

مری بربادیوں کا ہم نشینو!
تمہیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے

ابھی بزمِ طرب سے کیا اٹھوں میں
ابھی تو آنکھ بھی پُرنم نہیں ہے

بایں سیلِ غم و سیلِ حوادث
مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

مُعین احسن جذبی

○

شریکِ محفلِ یارو رسن کچھ اور بھی ہیں
ستم گرو ابھی اہلِ کفن کچھ اور بھی ہیں

رہو اس دھیان یوں ہی اے گھنی بوندیوں کے ابر
کہ اس دیار میں اُجڑے چمن کچھ اور بھی ہیں

خدا کرے نہ تھکیں حشر تک جنوں کے پاؤں
ابھی مناظرِ دشت و دمن کچھ اور بھی ہیں

خدا کرے مری وارفتگی کو غیرت آئے
ابھی منازلِ رنج و محن کچھ اور بھی ہیں

ابھی سموم نے مانی کہاں نسیم سے ہار
ابھی تو معرکہ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں

ابھی تو ہیں دلِ شاعر میں سینکڑوں ناسور
ابھی تو معجزہ ہائے سخن کچھ اور بھی ہیں

دلِ گداز نے آنکھوں کو دے دیئے آنسو
یہ جانتے ہوئے غم کے چلن کچھ اور بھی ہیں

○

ہم دہر کے اس ویرانے میں جو کچھ بھی نظارا کرتے ہیں
اشکوں کی زباں میں کہتے ہیں آہوں میں اشارا کرتے ہیں

کیا تجھ کو پتہ کیا تجھ کو خبر دن رات خیالوں میں اپنے
اے کاکلِ گیتی ہم تجھ کو جس طرح سنوارا کرتے ہیں

اے موجِ بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارا کرتے ہیں

کیا جانئے کب یہ پاپ کٹے کیا جانئے وہ دن کب آئے
جس دن کے لیے ہم اے جذبی! کیا کچھ نہ گوارا کرتے ہیں

○

بیتے ہوئے دنوں کی حلاوت کہاں سے لائیں
اک میٹھے میٹھے درد کی راحت کہاں سے لائیں

ڈھونڈھیں کہاں وہ نالۂ شب تاب کا جمال
آہِ سحر گہی کی صباحت کہاں سے لائیں

سمجھائیں کیسے دل کی نزاکت کا ماجرا
خاموشیٔ نظر کی خطابت کہاں سے لائیں

ترکِ تعلقات کا ہو جس سے احتمال
بے باکیوں میں اتنی صداقت کہاں سے لائیں

افسردگیٔ ضبطِ الم آج بھی سہی —
لیکن نشاطِ ضبطِ مسرت کہاں سے لائیں

آسودگیٔ لطف و عنایت کے ساتھ ساتھ
دل میں دبی دبی سی قیامت کہاں سے لائیں

وہ جوشِ اضطراب یہ کچھ سوچنے کے بعد
حیرت کہاں سے لائیں ندامت کہاں سے لائیں

ہر لحظہ تازہ تازہ بلاؤں کا سامنا
نا آزمودہ کار کی جرأت کہاں سے لائیں

ہے آج بھی نگاہِ محبت کی آرزو
پر ایسی اک نگاہ کی قیمت کہاں سے لائیں

سب کچھ نصیب ہو بھی تو اے شورشِ حیات
تجھ سے نظر چرانے کی عادت کہاں سے لائیں

○

ملے مجھ کو غم سے فرصت تو سناؤں وہ فسانہ
کہ ٹپک پڑے نظر سے مئے عشرتِ شبانہ

یہی زندگی مصیبت، یہی زندگی مسرت
یہی زندگی حقیقت، یہی زندگی فسانہ

کبھی درد کی تمنا کبھی کوششِ مداوا
کبھی بیکسوں کی خواہش کبھی فکرِ آشیانہ

مرے نغمتوں کی زد پر کبھی گردشیں جہاں کی
مرے آنسوؤں کی رو میں کبھی تلخیٔ زمانہ

مری رفعتوں سے لرزاں کبھی مہر و ماہ و انجم
مری پستیوں سے خائف کبھی اوجِ خسروانہ

کبھی میں ہوں تجھ سے نالاں کبھی مجھ سے تو پریشاں
کبھی میں ترا ہدف ہوں کبھی تو مرا نشانہ

جسے پا سکا نہ زاہد جسے چھو سکا نہ صوفی
وہی تار چھیڑتا ہے مرا سوزِ شاعرانہ

○

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا اب خواہش دنیا کون کرے

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

دنیا نے ہمیں چھوڑا جذبی ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دنیا کو
دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں اب دنیا دنیا کون کرے

○

جسے آج نغمہ سمجھتی ہے دنیا
وہی نغمہ کل تک فغاں ہو نہ جائے

جسے ساز دوراں پہ گانا نہ آیا
وہ مطرب کہیں نوحہ خواں ہو نہ جائے

بچا کر جسے رکھ لیا ہے جبیں میں
وہ سجدہ بھی نذر بتاں ہو نہ جائے

نہ کلیاں ہی چٹکیں نہ تارے ہی چمکیں
مرا غم غم دو جہاں ہو نہ جائے

احمد ندیم قاسمی

○

افق تمام ہے توحدِ فطرت کا ذکر کریں
ستارے ڈوب رہے ہیں سحر کا ذکر کریں

فضا کا ذکر کریں بحر و بر کا ذکر کریں
بہت بلند ہے فردوسِ گھر کا ذکر کریں

صدف کو سامنے پا کر گہر کا ذکر کریں
نظر کے ساتھ ہی حسنِ نظر کا ذکر کریں

خزاں کو بوئے گل و نسترن سے چھلکا دیں
اگر بہار نہیں برگ و بر کا ذکر کریں

ہمیں تو عظمتِ انساں کو آزمانا ہے
حضورِ نار نہ خیر و شر کا ذکر کریں

فرار کا یہ نیا روپ ہے اگر ہم لوگ
چراغ توڑ کے نورِ قمر کا ذکر کریں

ستارے کون چنے گا بدستِ زخم آلود
چلو غبارِ سرِ رہگزر کا ذکر کریں

اگر نہایتِ بیچارگی ہے چارہ گری
تو کس امید پہ زخمِ جگر کا ذکر کریں

تمام عمر کٹے، چاک دامنی کے سلے
بعد غمِ بخیہ گری بخیہ گر کا ذکر کریں

مرے ندیم مری ذات کو سمجھ کر آپ
مرے کلام کے نقص و اثر کا ذکر کریں

○

مرے لہو میں مری زیست کا لہو تو نہیں
کہیں مزاجِ زمانہ بہانہ جو تو نہیں

ندی کی رَو میں رواں ہے جو ایک برگِ گلاب
کہیں شباب کا ایوانِ رنگ و بو تو نہیں

پگھل پگھل کے اُبھرتی ہے جب چراغ کی لَو
میں سوچتا ہوں کہ ان لرزشوں میں تو تو نہیں

یہ سب درست شبِ ہجر کی سحر تو ہوئی
مگر شفق میں مرا خونِ آرزو تو نہیں

افق کی سمت تو قرنوں سے چل رہا تھا ندیم
کہیں یہ راہنما مجھ سا راہ جو تو نہیں

○

میں کب سے گوش برآواز ہوں پکارو بھی
زمین پر یہ ستارے کبھی اُتارو بھی

مری غیور اُمنگو شباب فانی ہے
غرورِ عشق کا دیرینہ کھیل ہارو بھی

سفینہ محوِ سفر ہے تو نارسیدہ نہیں
خدم قدم پہ کنارے ہیں تم سدھارو بھی

مرے خطوط پہ جمنے لگی ہے گردِ حیات
اداس نقش گرو! اب مجھے نکھارو بھی

بھٹک رہا ہے دھندلکوں میں کاروانِ خیال
بس اب خدا کے لیے کاکلیں سنوارو بھی

مری تلاش کی معراج ہو تمھیں لیکن
نقاب اُٹھاؤ نشانِ سفر ابھارو بھی

یہ کائنات ازل سے سپردِ انساں ہے
مگر ندیم تم اُس بوجھ کو سہارو بھی

○

بگاڑ ہو کہ بناؤ عجیب تے سبھاؤ
نگاہوں میں ہیں بلاسے تو ابروؤں میں تناؤ

گجر بجا ہے سہانا مگر کرو نہ بہانہ
جھکا قمر نہ دکھاؤ بجھا چراغ جلاؤ

اگر گھنا ہو اندھیرا اگر ہو دور سویرا
تو یہ اصول ہے میرا کہ دل کے دیپ جلاؤ

اُجڑ رہے ہیں گھرانے بدل رہے ہیں زمانے
لپک رہے ہیں دوانے اُتار ہو کہ چڑھاؤ

خدا کے لب پہ ہنسی ہے خدائی جھوم رہی ہے
تمھاری بات چلی ہے مری حسین خطاؤ

اِدھر شباب کا مس ہے اُدھر شباب کا رس ہے
قدم قدم پہ قفس ہے ندیم دیکھتے جاؤ

○

پھر بھیانک تیرگی میں آ گئے
ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے

ہائے خوابوں کی خیاباں سازیاں
آنکھ لیں کھولی چمن مرجھا گئے

کون تھے آخر جو منزل کے قریب
آئے کی چادریں پھیلا گئے

کس تجلی کا دیا ہم کو فریب
کس دھندلکے میں ہمیں پہنچا گئے

اُن کا آنا حشر سے کچھ کم نہ تھا
اور جب پلٹے قیامت ڈھا گئے

اک پہیلی کا ہمیں دے کر جواب
اک پہیلی بن کے ہر سو چھا گئے

پھر وہی اختر شماری کا نظام
ہم تو اس تکرار سے اُکتا گئے

رہنما ڈوبا ابھی باقی سہی
آج سیارے اگر ٹکرا گئے

جن کو ہم سمجھا کئے ابرِ بہار
وہ بگولے کتنے گلشن کھا گئے

کیا رسا نکلی دعائے اجتہاد
لیجئے! اگلے زمانے آ گئے

آدمی کے ارتقا کا مدعا
وہ چھپاتے ہی رہے ہم پا گئے

اب کوئی طوفاں ہی لائے گا سحر
آفتاب اُبھرا تو بادل چھا گئے

○

بہار جب بھی چمن میں دیئے جلاتی ہے
ہجومِ گل سے مجھے تیری آنچ آتی ہے

بفیضِ اُلفتِ تخلیق خون ہو کے کلی
خود اپنے زخم کے پردے میں مسکراتی ہے

دو فرد رنگ میں گھلنے لگی ہے کیوں شبنم
عروسِ گل کو اگر آئنہ دکھاتی ہے

یہ شب ہے یا شفق افشانیوں سے گھبرا کر
نگارِ شام حیا سے لٹیں گراتی ہے

یہ کائنات کا آہنگ ہے کہ سحر حیات
چٹک کلی کی ستاروں کو گدگداتی ہے

یہ رودِ آبِ ستارے یہ شہرِ لالہ و گل
ابھی وہ آنہ چلے اور رات جاتی ہے

عبدالحمید عدم

○

میکدہ تھا چاندنی تھی میں نہ تھا
اک مجسم بے خودی تھی میں نہ تھا

عشق جب دم توڑتا تھا تم نہ تھے
موت جب سر دھن رہی تھی میں نہ تھا

طور پر چھیڑا تھا جس نے آپ کو
وہ مری دیوانگی تھی میں نہ تھا

وہ جہاں بیٹھا تھا جب میرے قریب
لذتِ ہمسائگی تھی میں نہ تھا

میکدے کے موڑ پر رکتی ہوئی
مدتوں کی تشنگی تھی میں نہ تھا

ہیں اور اس غنچہ دہن کی آرزو
آرزو کی سادگی تھی میں نہ تھا

گیسوؤں کے سلسلے میں آرام کش
سر برہنہ زندگی تھی میں نہ تھا

دیر و کعبہ میں عدمؔ حیرت فروش
دو جہاں کی بدظنی تھی میں نہ تھا

○

عدمؔ مستی ہے لوگ کہتے ہیں
نے پرستی ہے لوگ کہتے ہیں

غم ہستی خریدنے والو!
موت سستی ہے لوگ کہتے ہیں

ہم جہاں جی رہے ہیں مر مر کر
بزم ہستی ہے لوگ کہتے ہیں

ضبط توبہ پہ آ ہی سے ہنسی
تنگ دستی ہے لوگ کہتے ہیں

شاید اک بار اُجڑ کے پھر نہ بسے
دل کی بستی ہے لوگ کہتے ہیں

کیا کریں مہ وشوں سے پیار عدمؔ
بت پرستی ہے لوگ کہتے ہیں

○

اُن مست انکھڑیوں کو غزل کہہ گیا ہوں میں
محسوس ہو رہا ہے غزل کہہ گیا ہوں میں

ساقی! تری نگاہ کو کتنے غرور سے
ہر حادثے کا ردِ عمل کہہ گیا ہوں میں

کہتے ہیں زندگی جسے اس حرفِ تلخ کو
سمجھا نہیں تو زہرِ اجل کہہ گیا ہوں میں

کہتے ہیں زندگی جسے اے مرگِ ناگہاں
اُس اتفاق کو بھی اٹل کہہ گیا ہوں میں

قسمت کی الجھنوں کو عدمؔ کس گریز سے
اُس گیسوئے دراز کا بل کہہ گیا ہوں میں

○

غمِ محبت سنا رہا ہے، غمِ زمانہ مسل رہا ہے
مگر مرے دن گزر رہے ہیں مگر مرا وقت ٹل رہا ہے

وہ بار آیا وہ رنگ برسے وہ کیف جاگا وہ جام کھنکے
چمن میں یہ کون آ گیا ہے تمام موسم بدل رہا ہے

مری جوانی کے گرم لمحوں میں ڈال دے گیسوؤں کا سایہ
یہ دوپہر کچھ تو معتدل ہو تمام ماحول جل رہا ہے

یہ بھینی بھینی سی مست خوشبو یہ ہلکی ہلکی سی دلفشیں بُو
یہیں کہیں تیری زلف کے پاس ایک پروانہ جل رہا ہے

نہ دیکھ او مہ جبیں مری سمت اتنی مستی بھری نظر سے
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے شراب کا دور چل رہا ہے

عدمؔ خرابات کی سحر ہے کہ بارگاہِ رموزِ مستی
اِدھر بھی سورج نکل رہا ہے اُدھر بھی سورج نکل رہا ہے

○

یہ کیسی سرگوشیٔ ازل ساز دل کے پردے ہلا رہی ہے
وہی سماعت کھنک سی ہے کہ تیری آواز آ رہی ہے

حوادثِ روزگار میری خوشی سے کیا انتقام لیں گے
کہ زندگی وہ حسین ضد ہے کہ بے سبب مسکرا رہی ہے

ترا تبسم فروغِ ہستی تری نظر اعتبارِ مستی
بہار اقرار کر رہی ہے شرابِ ایماں لا رہی ہے

فسانہ خواں دیکھنا شبِ زندگی کا انجام تو نہیں ہے
کہ شمع کے ساتھ رفتہ رفتہ مجھے بھی کچھ نیند آ رہی ہے

اگر کوئی خاص چیز ہوتی تو خیر دامن بھگو بھی لیتے
شراب سے تو بہت پرانے مذاق کی بات آ رہی ہے

خرد کے ٹوٹے ہوئے ستارے عدم کہاں تک چراغ بنتے
جنوں کی روشن روش ہی آخر دلوں کو رستے دکھا رہی ہے

○

پھولوں کی ٹہنیوں پہ نشیمن بنائیے
بجلی گرے تو جشنِ چراغاں منائیے

کلیوں کے انگ انگ میں میٹھا سا درد ہے
بیمار نکہتوں کو ذرا گدگدائیے

کب سے سلگ رہی ہے جوانی کی گرم رات
زلفیں بکھیر کر مرے پہلو میں آئیے

بہکی ہوئی سیاہ گھٹاؤں کے ساتھ ساتھ
جی چاہتا ہے شام ابد تک تو جائیے

ناسازیٔ حیات بھی ہے اک نشاطِ تلخ
حالات کی روش پہ ذرا مسکرائیے

سُن کر جسے حواس میں ٹھنڈک سی آ سکے
ایسی کوئی اداس کہانی سنائیے

رستے میں ہر قدم پہ خرابات ہے عدمؔ
یہ حال ہو تو کس طرح دامن بچائیے

سیف الدین سیف

○

دلوں کو توڑنے والو تمھیں کسی سے کیا
ملو تو آنکھ چرا لو تمھیں کسی سے کیا

ہماری لغزشِ پا کا خیال کیوں ہے تمھیں؟
قدم اپنی چال سنبھالو تمھیں کسی سے کیا

چمک کے اور بڑھاؤ مری سیہ بختی
کسی کے گھر کے اُجالو تمھیں کسی سے کیا

نظر بچا کے گذر جاؤ میری تربت سے
کسی پہ خاک نہ ڈالو تمھیں کسی سے کیا

مجھے خود اپنی نظر میں بنا کے بیگانہ
جہاں کو اپنا بنا لو تمھیں کسی سے کیا

قریبِ نزع بھی کیوں چین لے سکے کوئی
نقاب رُخ سے اُٹھا لو تمھیں کسی سے کیا

○

غمِ خزاں کی تلافی بہار میں بھی نہیں
کہ اب نگاہ ترے انتظار میں بھی نہیں

تری نگاہ سے بدلی ہے کس طرح دُنیا
جو دل کشی تھی خزاں میں بہار میں بھی نہیں

بھڑک اُٹھی ہے کچھ اس طرح آتشِ ہستی
قرار سایۂ دامانِ یار میں بھی نہیں

عجب سکون کا عالم ہے یاس کا عالم
یہ دل کشی تو غمِ انتظار میں بھی نہیں

ہلاکِ جبرِ مسلسل یہی سمجھتے ہیں
نظامِ دہر ترے اختیار میں بھی نہیں

○

قریب موت کھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ
قضا سے آنکھ لڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

تھکی تھکی سی ضیائیں بجھے بجھے تارے
بڑی اُداس گھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

نہیں امید کہ ہم آج کی سحر دیکھیں
یہ رات ہم پہ کڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

ابھی نہ جاؤ کہ تاروں کا دل دھڑکتا ہے
تمام رات پڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

عروسِ شام ابھی گیسوؤں کے سائے میں
کنیز بن کے کھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

پھر اس کے بعد کبھی ہم نہ تم کو روکیں گے
لبوں پہ سانس لڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

دمِ فراق میں جی بھر کے تم کو دیکھ تو لوں
یہ فیصلے کی گھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

○

راہ آسان ہو گئی ہو گی
جان پہچان ہو گئی ہو گی

موت سے تیرے دردمندوں کی
مشکل آسان ہو گئی ہو گی

پھر پلٹ کر نگہ نہیں آئی
تجھ پہ قربان ہو گئی ہو گی

تیری زلفوں کو چھیڑتی تھی صبا
خود پریشان ہو گئی ہو گی

ان سے بھی چھین لو گے یاد اپنی
جن کا ایمان ہو گئی ہو گی

دل کی تسکین پوچھتے ہیں آپ
ہاں مری جان! ہو گئی ہو گی

مرنے والوں پہ سیفؔ حیرت کیوں
موت آسان ہو گئی ہو گی

○

بڑے خطرے میں ہے چمن گلستاں ہم نہ کہتے تھے
چمن تک آ گئی دیوارِ زنداں ہم نہ کہتے تھے

بھرے بازار میں جنسِ وفا بے آبرو ہو گی
اٹھے گا اعتبارِ کوئے جاناں ہم نہ کہتے تھے

اسی محفل اسی بزمِ وفا کے گوشے گوشے میں
لٹے گی مستیِ چشمِ غزالاں ہم نہ کہتے تھے

اسی رستے میں آخر وہ کڑی منزل بھی آئے گی
جہاں دم توڑ دے گی یادِ یاراں ہم نہ کہتے تھے

خزاں کی آہٹوں پر کانپتی ہیں پتیاں گل کی
بکھرنے کو ہے اب زلفِ بہاراں ہم نہ کہتے تھے

دلِ فطرت شناس آخر کہیں یونہی دھڑکتا ہے
فریبِ حسن ہے جشنِ چراغاں ہم نہ کہتے تھے

○

ہر اک چلن میں اسی مہرباں سے ملتی ہے
زمیں ضرور کہیں آسماں سے ملتی ہے

سرودِ عشق میں نغماتِ حسن شامل ہیں
تری خبر بھی مری داستاں سے ملتی ہے

ہمیں تو شعلۂ خرمن فروز بھی نہ ملا
تری نظر کو تجلی کہاں سے ملتی ہے

خیالِ منزلِ مقصد سے منزلوں آگے
نگاہ گردِ پسِ کارواں سے ملتی ہے

تری نگاہ سے آخر عطا ہوئی دل کو
وہ کاوش کہ غمِ دو جہاں سے ملتی ہے

چلے ہیں سیفؔ وہاں ہم علاجِ غم کے لیے
دلوں کو درد کی دولت جہاں سے ملتی ہے

ظہیر کاشمیری

○

اب صاحب دوراں آتے ہیں اب فاتح میداں آتے ہیں
وہ شہر تو شہر قلعے تھے، اب شہر نشیناں آتے ہیں

آہنگ تفنگ و تیر میں ہم، گاتے ہیں سرود آزادی
بیگانہ و آوارہ گیر ہیں ہم، سرمست و غزلخواں آتے ہیں

ہونٹوں کو گلوں سے الجھنے دو، وہ عزم سفر کی بات کرے
اس منزل نو کے رستے میں کتنے ہی بیاباں آتے ہیں

تسلیم کہ ساحل والوں نے اک سیل خراماں روک دیا
ساحل کا فشاں تک مٹ جائے کچھ ایسے بھی طوفاں آتے ہیں

ہم ایسے امن پسندوں کو الحاد کا طعنہ دیتے ہیں
اس بزم میں خنجر دامن بھتنے بھی مسلماں آتے ہیں

پھولوں پہ مسرت ناچے گی، کلیوں پہ اجالا برسے گا
ہم لوگ بہ رنگ نور سحر اے صبح گلستاں آتے ہیں

قاتل بھی ظہیر اب دامن کے دھبوں کو چھپاتا پھرتا ہے
اس وضع سے مل کے چہروں پر ہم خون شہیداں آتے ہیں

○

وہ حکایت جو بایں ہوش تجھے یاد نہیں
تیرے اپنے ہی تغافل کی تو روداد نہیں

آج بھی کاہش بے نام وہی ہے کہ جو تھی
دل کی دنیا تیرے آنے سے بھی آباد نہیں

جن تنہائی سے گھبرائے تو اتنا کہہ دو
عشق پابستۂ زنجیر ہے آزاد نہیں

وہ ملاقات کہ جو وجہ شکست دل تھی
اب نگاہ غلط انداز کو بھی یاد نہیں

کون سا دل تیرے پہلو سے نہیں صاحب بار
کون سی بزم تیری یاد سے آباد نہیں

ہم نہ سوچیں گے کبھی کوہ کنی کی تدبیر
قسمت عشق اگر تیشۂ فرہاد نہیں

تیری ہر بات میں ہے عذر جفا کا پہلو
تیری محفل میں کوئی مصورت فرہاد نہیں

○

شبِ مہتاب بھی اپنی، بھری برسات بھی اپنی
تمھارے دم قدم سے زندگی تھی زندگی اپنی

یہاں پابندیٔ نازِ وجنوں کی بات ہے ورنہ
جمالِ یار سے کچھ کم نہیں تابندگی اپنی

مجھے شادابیٔ صحنِ چمن سے خوف آتا ہے
یہی انداز تھے جب لُٹ گئی تھی زندگی اپنی

تمھارا غم اِسے آشوبِ صرصر سے بچائے گا
ہواؤں سے بھڑک اُٹھی ہے شمعِ زندگی اپنی

مگر تم بھی تو اک بوئے گریزاں کی طرح نکلے
گزرنے کو گزر جاتی بہارِ دوستی اپنی

ظہیرؔ اس چشمکِ اوّل پہ یوں محسوس ہوتا ہے
بڑی مدت سے ہے جیسے کسی سے دوستی اپنی

○

جب کبھی تذکرۂ شعلہ رُخاں ہوتا ہے
دامنِ دل پہ سلگنے کا گماں ہوتا ہے

ہم چمن پوشوں میں اس طرح رہے آشفتہ
جس طرح شام کو باغوں میں دھواں ہوتا ہے

دل بیاباں میں الاؤ کی طرح جلتے ہیں
خیمہ زن قافلۂ گشتہ سراں ہوتا ہے

اس کی ہر تان سے ملتا ہے ستاروں کو گداز
عشق کہتے ہیں جسے نغمۂ جاں ہوتا ہے

دلِ مرحومِ تمنا پہ دمکتے ہوئے داغ
جیسے تربت پہ چراغوں کا سماں ہوتا ہے

دعوتِ جلوۂ شب تاب پہ مسرور نہ ہو
یہ بھی اک وعدۂ زرّیں کماں ہوتا ہے

حسن کا عکس بھی تسکینِ دل و جاں ہے ظہیرؔ
حسن پرسایۂ صاحب نظراں ہوتا ہے

○

ابھی تو کاہشِ بوئے بہار باقی ہے
ابھی تجسسِ دامانِ یار باقی ہے

تڑپ تڑپ کے شبِ ہجر کاٹنے والے
ستارہ ہائے سحر کا شمار باقی ہے

تمہارے ساتھ غمِ دوستی گزر ہی گیا
تمہارے بعد غمِ روزگار باقی ہے

ابھی سے تذکرۂ دل پہ وہ بگڑ بیٹھے
ابھی تو قصۂ منصور و دار باقی ہے

ظہیرؔ اب بھی امیرانِ شہر کے سر میں
شرابِ نیم شبی کا خمار باقی ہے

○

شورشِ نالہ و فریاد ابھی باقی ہے
طمطراقِ دلِ برباد ابھی باقی ہے

غنچے غنچے میں ابھی تک ہیں قفس پوشیدہ
برگِ گل میں کفِ صیاد ابھی باقی ہے

زخم سر آج بھی ہے درد پرستوں کا علاج
عظمتِ تیشۂ فرہاد ابھی باقی ہے

دل پرخوں سے کہو حیلۂ مرہم نہ کرے
شہر میں اک ستم ایجاد ابھی باقی ہے

ابھی خونابۂ محشر سے گزرنا ہوگا
چشمِ تر! اک نئی افتاد ابھی باقی ہے

بزم میں شعلۂ لب سوز جلانے والو!
شہرتِ نغمۂ آزاد ابھی باقی ہے

دلِ مرحوم کی خاموش فضاؤں میں ظہیرؔ
اک سلگتی ہوئی فریاد ابھی باقی ہے

قتیلؔ شفائی

○

انگڑائی پر انگڑائی لیتی ہے رات جدائی کی
تم کیا سمجھو تم کیا جانو بات مری تنہائی کی

کون سیاہی گھول رہا تھا وقت کے بہتے دریا میں
دیکھی ہے میں نے آنکھ جھکی پھر آج کسی ہرجائی کی

ٹوٹ گئے سیال نگینے پھوٹ بہے خاروں پر
دیکھو میرا ساتھ نہ دینا بات ہے یہ رسوائی کی

وصل کی رات نہ جانے کیوں اصرار تھا ان کو جانے پر
وقت سے پہلے ڈوب گئے تاروں نے بڑی دانائی کی

آپ کے ہوتے دنیا والے میرے دل پر راج کریں؟
آپ سے مجھ کو شکوہ ہے خود آپ نے بے پروائی کی

اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

○

پہلے تو اپنے دل کی رضا جان جائیے
پھر جو نگاہِ یار کہے مان جائیے

پا بوسیٔ جمال بھی حسنِ طلب سہی
جوشِ طلب میں تا بہ کہاں جائیے

شاید حضور سے کوئی نسبت ہمیں بھی ہو
آنکھوں میں جھانک کر ہمیں پہچان جائیے

اک دھوپ سی جمی ہے نگاہوں کے آس پاس
یہ آپ ہیں تو آپ پہ قربان جائیے

بابے رُخی سے دیجئے داد سپردگی!
یا سادگی سے ہو کے پشیمان جائیے

کچھ کہہ رہی ہیں آپ کے سینے کی دھڑکنیں
میرا نہیں تو دل کا کہا مان جائیے

اپنی غزل قتیلؔ وہ کوئل کی کوک ہے
جس کی تڑپ کو دور سے پہچان جائیے

○

دل کو غم حیات گوارا ہے ان دنوں
جیسے جو وہ نظارہ یہی چاہتا ہے ان دنوں

ہر جھیل اشک ساحل تسکیں ہے آجکل
دریا کی موج موج کنارا ہے ان دنوں

یہ دل ذرا سا دل تری یادوں میں کھو گیا
تنکے کو آندھیوں کا سہارا ہے ان دنوں

شعروں میں اب نہیں ہے وہ پہلی سی روشنی
کیا واقعی وہ انجمن آرا ہے ان دنوں

تم آ سکو تو شب کو بڑھا دوں کچھ اور بھی
اپنے کہے میں صبح کا تارا ہے ان دنوں

○

صدمے جھیلوں جان پہ کھیلوں اس سے مجھے انکار نہیں ہے
لیکن تیرے پاس وفا کا کوئی بھی معیار نہیں ہے

یہ بھی کوئی بات ہے آخر دور ہی دور رہیں منوالے؟
ہر جائی ہے چاند کا جوبن یا پنچھی کو پیار نہیں ہے

ایک ذرا سا دل ہے جس کو توڑ کے بھی تم جا سکتے ہو
یہ سونے کا طوق نہیں، یہ چاندی کی دیوار نہیں ہے

ملاحوں نے ساحل ساحل موجوں کی توہین تو کر دی
لیکن پھر بھی کوئی بھنور تک جانے کو تیار نہیں ہے

پھر سے وہی سیلاب حوادث آجائے وہ اے ساحل والو
یا اس بار سفینہ ڈوبا یا اب کے منجدھار نہیں ہے

قید قفس کے بعد کرے گا قید گلستاں کون گوارا؟
اب بھی وہی زنجیریں ہیں گو پہلی سی جھنکار نہیں ہے

○

چمن کی آبرو بن کر صبا کے ساتھ چلتے ہیں
سبک رفتار ہیں لیکن ادا کے ساتھ چلتے ہیں

عجب کیا ہے جو منزل کا تصور ہی بدل جائے
مسافر بے رخی سے رہنما کے ساتھ چلتے ہیں

خدا جانے کہاں ٹھہریں گے جا کر دولے ان کے
یہ دیوانے تو ہر ہر دفا کے ساتھ چلتے ہیں

ستارے ڈوب جائیں یا افق سے آفتاب ابھرے
اندھیرے تو ہر صورت ضیا کے ساتھ چلتے ہیں

دمِ رخصت ہم اپنے آنسوؤں کو روک بھی لیتے
مگر یہ کارواں تیری رضا کے ساتھ چلتے ہیں

قتیلؔ اس بے مروت کے نہ چھیڑو تذکرے ہم سے
یہ وہ نشتر ہیں جو ذکرِ وفا کے ساتھ چلتے ہیں

○

اندیشۂ ارباب جہاں ساتھ رہے گا
جنت بھی ملے گی تو یہ غم ساتھ رہے گا

پیاسے ہی گذر جائیں گے ہم راہِ طلب سے
حیرت کے لیے ساغرِ جم ساتھ رہے گا

تو اور نہ آئے در زندانِ وفا تک
مرکز بھی یہ غم تیری قسم ساتھ رہے گا

افلاک سے پلکوں پہ اتر آئیں گے تارے
کھل کر بھی شبِ غم کا بھرم ساتھ رہے گا

منزل سے پلٹ آئے گی ایک ایک تجلی
ہاں شعلۂ رخسارِ صنم ساتھ رہے گا

میخانہ بہت دور نہیں دیدۂ نم سے
آگر دشِ دوراں کوئی دم ساتھ رہے گا

راہوں میں قتیلؔ آئیں گے سو آئنہ خانے
لیکن مرا اگلا پوش قلم ساتھ رہے گا

ساحر لدھیانوی

○

ہر نصیب نظر کو کہیں قرار نہیں
میں منتظر ہوں مگر تیرا انتظار نہیں

ہمیں سے رنگِ گلستاں ہمیں سے رنگِ بہار
ہمیں کو نظمِ گلستاں پہ اختیار نہیں

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

تمہارے عہدِ وفا کو میں عہد کیا سمجھوں
مجھے خود اپنی محبت کا اعتبار نہیں

نہ جانے کتنے گلے اس میں مضطرب ہیں ندیم
وہ ایک دل جو کسی کا گلہ گذار نہیں

گریز کا نہیں قائل حیات سے لیکن
جو سچ کہوں تو مجھے موت ناگوار نہیں

یہ کس مقام پہ پہنچا دیا زمانے نے
کہ اب حیات پہ تیرا بھی اختیار نہیں

○

ہر چند میری قوتِ گفتار ہے محبوس
خاموشی مگر طبع خود آرا نہیں ہوتی

معمورۂ احساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارا نہیں ہوتی

نالاں ہوں میں بیداریٔ احساس کے ہاتھوں
دنیا مرے افکار کی دنیا نہیں ہوتی

بیگانہ صفت جادۂ منزل سے گزر جا
ہر چیز سزاوارِ نظارا نہیں ہوتی

فطرت کی مشیت بھی بڑی چیز ہے لیکن
فطرت کسی بے بس کا سہارا نہیں ہوتی

○

طرب زاروں پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گذری
دلِ مرحوم تیرے مرحوم ارمانوں پہ کیا گذری

زمیں نے خون اُگلا آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دن بدلے تو انسانوں پہ کیا گذری

ہمیں یہ فکر کہ اُن کی انجمن کس حال میں ہوگی
اُنھیں یہ غم کہ اُن سے چھٹ کے دیوانوں پہ کیا گذری

مرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو ہے اب تک
مگر اس عالمِ وحشت میں ایمانوں پہ کیا گذری

یہ منظر کون سا منظر ہے پہچانا نہیں جاتا
سیہ خانوں سے کچھ پوچھو شبستانوں پہ کیا گذری

چلو وہ گھر کے گھر سے سلامت آ گئے، لیکن
خدا کی مملکت میں سوختہ جانوں پہ کیا گذری

○

عقاید وہم ہیں، مذہب خیالِ خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی

حقیقت آشنائی اصل میں گم کردہ راہی ہے
عروسِ آگہی پروردۂ الہام ہے ساقی

مبارک ہو ضعیفی کو خرد کی فلسفہ رانی
جوانی بے نیازِ عبرتِ انجام ہے ساقی

ہوس ہو گی اسیرِ حلقۂ نیک و بدِ عالم
محبت ماورائے فکرِ ننگ و نام ہے ساقی

ابھی تک راستے کے پیچ و خم سے دل دھڑکتا ہے
مرا ذوقِ طلب شاید ابھی تک خام ہے ساقی

وہاں بھیجا گیا ہوں چاک کرنے پردۂ شب کو
جہاں ہر صبح کے دامن پہ عکسِ شام ہے ساقی

مرے ساغر میں مے ہے اور ترے ہاتھوں میں بربط ہے
وطن کی سرزمیں میں بھوک سے کہرام ہے ساقی

زمانہ برسرِ پیکار ہے پُر ہول شعلوں سے
ترے لب پر ابھی تک نغمۂ خیام ہے ساقی

○

محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو زہر یہ بھی پی لیا میں نے

بجی زندہ ہوں لیکن سوچتا رہتا ہوں خلوت میں
کہ اب تک کس تمنا کے سہارے جی لیا میں نے

انہیں اپنا نہیں سکتا مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مدت حسیں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے

بس اب تو دامن دل چھوڑ دو بے کار امیدو!
بہت دکھ سہ لیے میں نے بہت دن جی لیا میں نے

○

نفس کے لوچ میں غم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے
حیات ساغر سم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

تری نگاہ مرے غم کی پاسدار سہی
مری نگاہ میں غم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

مری ندیم! محبت کی رفعتوں سے نہ گر
بلند بام حرم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

یہ اجتناب ہے عکس شعور محبوبی
یہ احتیاط، ستم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

ادھر بھی ایک اچٹتی نظر کہ دنیا میں
فروغ محفل جم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

نئے جہان بسائے ہیں فکر آدم نے
اب اس زمیں پہ ارم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

مرے شعور کو آوارہ کر دیا جس نے
وہ مرگ شادی و غم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

مجروح سلطان پوری

○

جب ہوا عرفاں تو غم آرامِ جاں بنتا گیا
سوزِ جاناں دل میں سوزِ دیگراں بنتا گیا

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسمِ چمن
دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

میں تو جب مانوں کہ بھر دے ساغرِ ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیرِ مغاں بنتا گیا

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایانِ شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

شرحِ غم تو مختصر ہوتی گئی اس کے حضور
لفظ جو منہ سے نہ نکلا داستاں بنتا گیا

دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں معنوں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

○

اب اہلِ درد یہ جینے کا اہتمام کریں
اسے بھلا کے غمِ زندگی کا نام کریں

فریب کھا کے ان آنکھوں کا کب تلک اے دل
شرابِ خام پئیں رقصِ ناتمام کریں

غمِ حیات نے آوارہ کر دیا ورنہ
تھی آرزو کہ ترے در پہ صبح و شام کریں

نہ دیکھیں دیر و حرم سوئے رہروانِ حیات
یہ قافلے تو نہ جانے کہاں قیام کریں

غمِ جہاں کو غمِ دل بنا کے کچھ نہ ملا
کہ جس سے زیست کو راحت ملے وہ کام کریں

سکھائیں دستِ طلب کو ادائے بیباکی
پیامِ زیرِ لبی کو صلائے عام کریں

غلام رہ چکے، توڑیں یہ بندِ رسوائی
خود اپنے بازوئے محنت کا احترام کریں

زمیں کو کر کے سنواریں مثالِ روئے نگار
رخِ نگار کی ضو سے فروغِ بام کریں

پھر اٹھ کے گرم کریں کاروبارِ زلف و جنوں
پھر اپنے ساتھ اسے بھی اسیرِ دام کریں

○

یہ رُکے رُکے سے آنسو یہ گھٹی گھٹی سی آہیں
یونہی کب تلک خدایا غمِ زندگی نباہیں

کہیں ظلمتوں میں گھر کر سے تلاشِ دستِ رہبر
کہیں جگمگا اٹھی ہیں مرے نقشِ پا سے راہیں

ترے خانماں خرابوں کا چمن کوئی نہ صحرا
یہ جہاں بھی بیٹھ جائیں وہیں ان کی بارگاہیں

کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ
تری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈال دی ہیں باہیں

○

ختمِ شورِ طوفاں تھا دور رہی سیاہی بھی
دم کے دم میں افسانہ تھی مری تباہی بھی

التفات سمجھوں یا بے رُخی کہوں اس کو
رہ گئی خامش بن کر اس کی کم نگاہی بھی

اس نظر کے اُٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں
نغمۂ سحر بھی ہے آہِ صبحگاہی بھی

یاد کر وہ دن جس دن تیری سخت گیری پر
اشک بھر کے اُٹھی تھی میری بے گناہی بھی

پستیٔ زمیں سے ہے رفعتِ فلک قائم
میری خستہ حالی سے تیری کجکلاہی بھی

شمع بھی اُجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا
میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی

گنبدوں سے پلٹی ہے اپنی ہی صدا مجروحؔ
مسجدوں میں کی میں نے جا کے داد خواہی بھی

مجروح

○

جنونِ دل نہ صرف افسانہ اک گلِ پیرہن تک ہے
قدح کیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

مگر اے ہم قفس کہتی ہے شدید سرسری اپنی
یہ رسمِ قید و زنداں ایک دیوارِ کہن تک ہے

دعا دیتی ہیں راہیں آج تک بھر آبلہ پا کو
مرے قدموں کی گلکاری بیاباں سے چمن تک ہے

میں کیا کیا جرعۂ خوں پی گیا پیمانۂ دل میں
بلا نوشی مری کیا اک مئے ساغر شکن تک ہے

نہ آخر کہہ سکا اس سے مرا حالِ دل سوزاں
مہِ تاباں کہ جو اس کی شریکِ انجمن تک ہے

فنا ہے جاوداں مجروح جس میں روحِ ساعت ہو
کہا کس نے مرا نغمہ زمانے کے چلن تک ہے

○

لیے بیٹھا ہے دل اک عزمِ بے باکانہ برسوں سے
کہ اس کی راہ میں ہیں کعبہ و بتخانہ برسوں سے

دلِ سادہ نہ سمجھا سوائے پاک دامانی
نگاہِ یار کہتی ہے کوئی افسانہ برسوں سے

مجھے یہ فکر سب کی پیاس اپنی پیاس ہے ساقی
تجھے یہ ضد کہ خالی ہے مرا پیمانہ برسوں سے

گریزاں تو نہیں تجھ سے مگر تیرے سوا دل کو
کئی غم اور بھی ہیں اے غمِ جانانہ برسوں سے

ہزاروں ماہتاب آئے ہزاروں آفتاب آئے
مگر ہمدم وہی ہے ظلمتِ غم خانہ برسوں سے

شکیلؔ بدایونی

○

مری زندگی ہے فقط ترے غم سے آشکارا
ترا غم ہے درحقیقت مجھے زندگی سے پیارا

وہ اگر بُرا نہ مانیں تو جہانِ رنگ و بُو میں
میں بسلونِ دل کی خاطر کوئی ڈھونڈ لوں سہارا

تجھے تجھ سے خاص نسبت ہیں رہینِ موجِ طوفاں
سفینہ زندگی تھی پیاری اُنھیں مل گیا کنارا

مجھے آگیا یقیں سا کہ یہی ہے میری منزل
سرِ راہ جب کسی نے مجھے دفعتاً پکارا

میں بتاؤں فرقِ ناصح جو ہے مجھ میں اور تجھ میں
مری زندگی تلاطم تری زندگی کنارا

مجھے گفتگو سے بڑھ کر غمِ اذنِ گفتگو ہے
وہی بات پوچھتے ہیں جو نہ کہہ سکوں دوبارا

کوئی اے شکیلؔ دیکھے یہ جنوں نہیں تو کیا ہے
کہ اسی کے ہو گئے ہم جو نہ ہو سکا ہمارا

○

ہم ہیں اور ان کی خوشی ہے آج کل
زندگی ہی زندگی ہے آج کل

ان کا ذکر ان کی تمنا ان کی یاد
وقت کتنا قیمتی ہے آج کل

جل رہی ہے دل میں شمعِ آرزو
غمکدے میں روشنی ہے آج کل

تُو ہے اور دریا دلی ہے ساقیا
میں ہوں اور تشنہ لبی ہے آج کل

عرضِ غم پر مسکراتے بھی نہیں
برہمی سی برہمی ہے آج کل

حاصلِ ترکِ محبت دیکھنا،
انجمن سُونی پڑی ہے آج کل

دل میں اور مایوسیوں میں اے شکیلؔ
اتحادِ باہمی ہے آج کل

○

پھر اٹھی دل میں اک موجِ شباب آہستہ آہستہ
پھر آیا زندگی میں انقلاب آہستہ آہستہ

سما کر مجھ میں وہ جانِ شباب آہستہ آہستہ
بنا دے گا مجھے اپنا جواب آہستہ آہستہ

یہ محفل زاہدانِ خشک کی محفل ہے اے رندو!
ذرا اس بزم میں ذکرِ شراب آہستہ آہستہ

مری نظریں بھی کو رفتہ رفتہ بھولے جاتی ہیں
ہوئے جاتے ہیں جلوے کامیاب آہستہ آہستہ

شکیلؔ اس درجہ مایوسی شہ دریغ عشق میں کیسی
ابھی تو اور ہونا ہے خراب آہستہ آہستہ

○

مری زندگی پہ نہ مسکرا مجھے زندگی کا الم نہیں
جسے تیرے غم سے ہو واسطہ وہ خزاں بہار سے کم نہیں

مرا کفر حاصلِ زہد ہے مرا زہد حاصلِ کفر ہے
مری بندگی ہے وہ بندگی جو رہینِ دیر و حرم نہیں

مجھے راس آئیں خدا کرے یہی اشتباہ کی راحتیں
انھیں اعتبارِ وفا تو ہے مجھے اعتبارِ ستم نہیں

وہی کارواں وہی راستے وہی زندگی وہی مرحلے
مگر اپنے اپنے مقام پر کبھی تم نہیں کبھی ہم نہیں

نہ وہ شانِ جبر شباب ہے نہ وہ رنگِ قہر عتاب ہے
دلِ بے قرار پہ ان دنوں ہے تمہی کہ تم بھی نہیں

نہ فنا مری نہ بقا مری مجھے اے شکیلؔ نہ ڈھونڈیے
میں کسی کا حسنِ خیال ہوں مرا کچھ وجود و عدم نہیں

○

تکمیلِ آرزو سے تھے نمایاں مگر کئے جلوے مکاں سے پہلے
تھی آئینہ ہو چکی تھی وجودِ بزمِ جہاں سے پہلے

ہر اک عنوانِ دردِ فرقت ہے ابتدا شرحِ مدعا کی
کوئی بتائے کہ یہ فسانہ سنائیں اُن کو کہاں سے پہلے

مسرتیں رازدارِ غم تھیں مسرتوں میں الم تھا پنہاں
ہمی تو سمجھے چمن میں شاید بہار آئی خزاں سے پہلے

سمجھ رہا تھا کہ نا امیدی نہ پردہ دارِ امید ہوگی
نظر اٹھا کر جو میں نے دیکھا غبار تھا کارواں سے پہلے

اٹھا جو مینا بدستِ ساقی رہی نہ کچھ تابِ ضبط باقی
تمام میکش پکار اُٹھے یہاں سے پہلے یہاں سے پہلے

قسم دریبِ نگاہ و دل کی ہمیں جو اس جستجو نے کھویا
وہیں تھی دراصل اپنی منزل قدم اٹھے تھے جہاں سے پہلے

ازل سے شاید لکھے ہوئے تھے شکیلؔ قسمت میں جور پیہم
کھلیں جو آنکھیں اس انجمن میں نظر ملی آسماں سے پہلے

○

نہ اب وہ آنکھوں میں برہمی ہے نہ اب وہ ماتھے پہ بل رہا ہے
وہ ہم سے خوش ہیں ہم ان سے خوش ہیں زمانہ کروٹ بدل رہا ہے

خوشی نہ غم کی نہ غم خوشی کا عجیب عالم ہے زندگی کا
چراغِ افسردۂ محبت نہ بجھ رہا ہے نہ جل رہا ہے

عبادت چشمِ مست ہے یہ کہ ہوش چھا جائے بے خودی پر
نظر اٹھا کر تو دیکھ ساقی یہ کون گر کر سنبھل رہا ہے

ہزار ترکِ وفا کروں میں تری محبت کو کیا کروں میں
دلِ حزیں تجھ سے روٹھ کر بھی ترے اشاروں پہ چل رہا ہے

کہاں یہ مستی کی وارداتیں کہاں یہ عیش و طرب کی باتیں
اب اور ہی نغمہ چھیڑ مطرب کہ رنگِ محفل بدل رہا ہے

شکیلؔ اتنا نہ شعر اپنی جو پوچھتے ہو تو ہے بس اتنی
جو نالہ سینے میں گھٹ رہا تھا وہ نغمہ بن کر نکل رہا ہے

فضل احمد کریم فضلی

○

تمہیں اک نہیں جانستاں اور بھی ہیں
بہت حادثاتِ جہاں اور بھی ہیں
حسیں اور بھی ہیں جواں اور بھی ہیں
غزالانِ ابرو کماں اور بھی ہیں
سبھی کو محبت میں ہوتے ہیں صدمے
ابھی کیا ابھی امتحاں اور بھی ہیں
چلو دھوم سے جشنِ ماتم منائیں
ہمیں اک نہیں نوحہ خواں اور بھی ہیں
نہیں ختم کچھ آسماں پر خدائی
مرے حال پر مہرباں اور بھی ہیں
نقاب اس نے رخ سے اٹھائی تو لیکن
حجابات کچھ درمیاں اور بھی ہیں
فریبِ کرم اک تو ان کا ہے اس پر
ستم میری خوش فہمیاں اور بھی ہیں
وفا ان سے اپنی جتانے گئے تھے
مگر اب تو وہ بدگماں اور بھی ہیں
نہیں صبر ہی کی کمی مجھ میں فضلی
میری جان کچھ خامیاں اور بھی ہیں

○

بہار آئی گل افشانی کے دن ہیں
ہماری تنگ دامانی کے دن ہیں
غزل کی غزل خوانی کے دن ہیں
گلوں کی چاک دامانی کے دن ہیں
جدھر دیکھو کھلے ہیں لالہ و گل
یہ خونِ دل کی ارزانی کے دن ہیں
ہوا دامانِ گل دامانِ یوسفؑ
نظر کی پاک دامانی کے دن ہیں
سبک رو ہے نسیمِ روح پرور
مگر پھر بھی گراں جانی کے دن ہیں
دلِ پُر درد اُمڈا آ رہا ہے
یہ بحرِ غم میں طغیانی کے دن ہیں
یہی دن ماحصل ہیں زندگی کے
یہی، جو دل کی نادانی کے دن ہیں
جمالِ زندگی کی خیر یارب
کمالِ عقلِ انسانی کے دن ہیں
غزل پاکیزہ ہے فضلی ابھی تک
یہ دن ہر چند عریانی کے دن ہیں

○

پھر ایسے خیالات آنے لگے
کہ ہم خود بخود گنگنانے لگے

ہمارا تمہارا عجب حال ہے
نظر مل گئی مسکرانے لگے

عوانی کی اللہ رے سرشاریاں
قدم خود بخود ڈگمگانے لگے

اندھیرا اندھیرا سا چھانے لگا
مرے پاس سے جب وہ جانے لگے

یونہی عمر گزرے گی امید میں
وہ کاہے کو تشریف لانے لگے

اکیلے میں گاتے تھے میری غزل
مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے

ترا روٹھنا ہے یہ بے فائدہ
تجھے کیوں وہ فضلی منانے لگے

○

آغازِ شبابِ شب ہے پیارے
جانے کا یہ وقت کب ہے پیارے

آنکھوں کا تو کام ہی ہے رونا
یہ گریۂ بے سبب ہے پیارے

اپنے ہاتھوں سے تو پلائے
پینے کا مزہ تو جب ہے پیارے

اک آگ جلائے دے رہی ہے
دل جیسے ابولہب ہے پیارے

پھر بعد میں آکے کیا کرے گا
آنے کا تو وقت اب ہے پیارے

کیا حال کہوں، کرم ہے تیرا
آگے حدِ ادب ہے پیارے

کوئی نہ کوئی تو بات ہوگی
کیوں خندۂ زیرِ لب ہے پیارے

بے بات کی بات پر بگڑنا
غصہ تیرا غضب ہے پیارے

یہ پھول سے کہہ رہی ہے شبنم
کیوں ہنستا ہے کیا سبب ہے پیارے

اے فضلی سے جو خفا ہو
اس کا کوئی سبب ہے پیارے

فضلی

○

اب وہ ملکی ہوئی سی بات نہیں
بات کیا ہے کہ اب وہ بات نہیں

پھر وہی جاگنا ہے دن کی طرح
رات ہے اور جیسے رات نہیں

بات اپنی تمہیں نہ یاد رہی
خیر جانے دو، کوئی بات نہیں

کچھ نہیں ہے تو یاد ہے اُن کی
ان سے ترکِ تعلقات نہیں

پھر بھی دل کو بڑی اُمیدیں ہیں
گو بظاہر قرائن ایسات نہیں

عشق ہوتا ہے خود بخود پیدا
عشق کے کچھ لوازمات نہیں

ایسے فضلی کے شعر کم ہوں گے
جن میں کچھ دل کی واردات نہیں

○

آتے رہتے ہیں قدسیوں کے پیام
شعر بھی اک طرح کا ہے الہام

عشق ہے کس قدر بلند مقام
اس کے آگے ہے بس خدا کا نام

کام ان کا ہے دیں نہ دیں انعام
چاہیے ہم کو اپنے کام سے کام

زندگی ہے ازل سے تا بہ ابد
زندگی کی نہ کوئی صبح نہ شام

راہرو تھک کے رہ گئے آخر
زندگی تھی کچھ ایسی تیز خرام

زلفِ دوراں سنوارنے والے
ہیں بڑی چیز دل شکستانِ کرام

گر تمنا نہیں تو حسرت ہے
کیا ہوا کاروبارِ شوق تمام

میں نے مانا کہ ہوں تہی ساغر
شکر صد شکر ہے تو ہاتھ میں جام

لو مبارک ہو تم کو اے فضلی
اب وہ لیتے نہیں تمہارا نام

ناصر کاظمی

○

عشق جب زمزمہ پیرا ہوگا
حسن خود محوِ تماشا ہوگا

ہوئے آوارہ زنجیرِ صبا
قفسِ غنچہ کا در وا ہوگا

ہیں شوق اگر ساتھ رہی
ہر نفس شہرِ غریباں کا ہوگا

دنیا آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

کوں دیکھے گا طلوعِ خورشید
ذرہ جب دیدۂ بینا ہوگا

ہم بھی بھولے کے خوش بیٹھے ہیں
ہم سا بیدرد کوئی کیا ہوگا

پھر اٹھے نگاہِ سحر اے خیال
ابر گھر کر کہیں برسا ہوگا

پھر کسی دھیان کے صحرا سے پرے
دلِ حیرت زدہ تنہا ہوگا

پھر وہی رنگ برستے ہونگے
عالمِ خاک شفق زا ہوگا

پھر کسی صبح طرب کا جادو
پردۂ شب سے ہویدا ہوگا

گل زمستاں کے خنک دامنوں میں
جشنِ آتش گری برپا ہوگا

پھر کسی رُت کا اشارا پاکر
وہ سمن بر چمن آرا ہوگا

گل شب تاب کی خوشبو لے کر
ابلقِ صبح روانہ ہوگا

پھر سرِ شاخِ شہابِ خورشید
نکہتِ گل کا بسیرا ہوگا

اک صدا سنگ میں تڑپی ہوگی
اک شرر پھول میں لرزا ہوگا

تجھ کو سرِ بھی ہے ہمراں سوتے
چاندنی رات نے دیکھا ہوگا

دیکھ کر آئینۂ آبِ رواں
پتہ پتہ لبِ گویا ہوگا

شام سے سوچ رہا ہوں ناصر
چاند کس شہر میں اترا ہوگا

○

ا ہوا پھر دلِ میخانۂ گل
پھر صبا لائی ہے پیمانۂ گل

زمزمہ ریز ہوئے اہلِ چمن
پھر چمن فاں ہوا کاشانۂ گل

رقص کرتی ہوئی شبنم کی پری
لے کے پھر آئی ہے نذرانۂ گل

پھول برسائے یہ کہہ کر اس نے
میرا دیوانہ ہے دیوانۂ گل

پھر کسی گل کا اشارا پاکر
چاند نکلا سرِ میخانۂ گل

پھر سرِ شام کوئی شعلہ نوا
سو گیا چھیڑ کے افسانۂ گل

آج غربت میں بہت یاد آیا
اے وطن تیرا صنم خانۂ گل

آج ہم خاک بسر پھرتے ہیں
ہم سے تھی رونقِ کاشانۂ گل

ہم پہ گزرے ہیں خزاں کے صدمے
ہم سے پوچھے کوئی افسانۂ گل

کل ترا دور تھا اے بادِ صبا
ہم ہیں اب سرخیٔ افسانۂ گل

ہم ہی گلشن کے امیں ہیں ناصر
ہم سا کوئی نہیں بیگانۂ گل

ناصر کاظمی

○

سفرِ منزلِ شب یاد نہیں
لوگ رخصت ہوئے کب یاد نہیں

اوّلیں قرب کی سرشاری میں
کتنے ارماں تھے جواب یاد نہیں

دل میں ہر وقت چبھن رہتی تھی
تھی مجھے کس کی طلب یاد نہیں

وہ ستارہ تھی کہ شبنم تھی کہ پھول
ایک صورت تھی عجب یاد نہیں

کیسی ویراں ہے گزرگاہِ خیال
جس سے وہ عارضِ لب یاد نہیں

بھولتے جاتے ہیں ماضی کے دیار
یاد آئیں بھی تو سب یاد نہیں

ایسا الجھا ہوں غمِ دنیا میں
ایک بھی خوابِ طرب یاد نہیں

یہ حقیقت ہے کہ احباب کو ہم
یاد ہی کب تھے جو اب یاد نہیں

رشتۂ جاں تھا کبھی جس کا خیال
اُس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں

یاد ہے سیرِ چراغاں ناصرؔ
دل کے بجھنے کا سبب یاد نہیں

○

سازِ ہستی کی صدا غور سے سُن
کیوں ہے یہ شور بپا غور سے سُن

دن کے ہنگاموں کو بیکار نہ جان
شب کے پردوں میں ہے کیا غور سے سُن

چڑھتے سورج کی ادا کو پہچان
ڈوبتے دن کی نوا غور سے سُن

کیوں ٹھہر جاتے ہیں دریا سرِ شام
روح کے تار ہلا غور سے سُن

یاس کی چھاؤں میں سونے والے
جاگ اور شورِ درا غور سے سُن

ہر نفس دامِ گرفتاری ہے
نوگرفتارِ بلا غور سے سُن

دل تڑپ اُٹھتا ہے کیوں آخرِ شب
دو گھڑی کان لگا غور سے سُن

اجنبی منزلوں میں ہیں سب بحر و بر
رہروِ آبلہ پا غور سے سُن

اسی گوشے میں ہیں سب دیر و حرم
دل صنم ہے کہ خدا غور سے سُن

کھیر سنسان ہے کیوں اے واعظ
ہاتھ کانوں سے اٹھا غور سے سُن

موت اور زیست کے اسرار و رموز
آمری بزم میں آ غور سے سُن

کیا گزرتی ہے کسی کے دل پر
تو بھی اے جانِ وفا غور سے سُن

کبھی فرصت ہو تو اے صبحِ جمال
شب گزیدوں کی دعا غور سے سُن

ہے یہی ساعتِ ایجاب و قبول
صبح کی لے کو ذرا غور سے سُن

کچھ تو کہتی ہیں چٹک کر کلیاں
کیا سناتی ہے صبا غور سے سُن

برگِ آوارہ بھی اک مطرب ہے
طائرِ نغمہ سرا غور سے سُن

رنگ منت کشِ آواز نہیں
گل بھی ہے ایک نوا غور سے سُن

خامشی حاصلِ موسیقی ہے
نغمہ ہے نغمہ نما غور سے سُن

آئینہ دیکھ کے حیران نہ ہو
نغمۂ آبِ صفا غور سے سُن

عشق کو حسن سے خالی نہ سمجھ
نالۂ اہلِ وفا غور سے سُن

دل سے ہر وقت کوئی کہتا ہے
میں نہیں تجھ سے جدا غور سے سُن

ہر قدم راہِ طلب میں ناصرؔ
جرسِ دل کی صدا غور سے سُن

○

کوئی لے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے
گزر گئی جرسِ گل اداس کر کے مجھے

میں سو رہا تھا کسی یاد کے شبستاں میں
جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے

میں سو رہا تھا مقدر کی سخت راہوں میں
اڑا کے لے گئے جادو تری نظر کے مجھے

میں تیرے درد کی طغیانیوں میں ڈوب گیا
پکارتے رہے تارے اُبھر اُبھر کے مجھے

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی
مزے ملے انھیں راتوں میں عمر بھر کے مجھے

ذرا سی دیر ٹھہر اے غمِ دنیا
بلا رہا ہے کوئی بام سے اُتر کے مجھے

پھر آج آئی تھی اک موجۂ ہوائے طرب
سنا گئی ہے فسانے اِدھر اُدھر کے مجھے

○

کچھ تو احساسِ زیاں تھا پہلے
دل کا یہ حال کہاں تھا پہلے

اب تو ٹھوکر سے زمیں اٹھتا ہوں
نشۂ خواب گراں تھا پہلے

اب تو منزل بھی ہے خود گرمِ سفر
ہر قدم سنگِ نشاں تھا پہلے

سعیِ شوق کے فرسنگ نہ پوچھ
وقت بے قید مکاں تھا پہلے

یہ الگ بات کہ غم راس ہے اب
اس میں اندیشۂ جاں تھا پہلے

یوں نہ گھبرائے ہوئے پھرتے تھے
دل عجب کنجِ اماں تھا پہلے

ڈیرے ڈالے ہیں بگولوں نے جہاں
اس طرف چشمہ رواں تھا پہلے

اب وہ دریا نہ وہ بستی نہ وہ لوگ
کیا خبر کون کہاں تھا پہلے

اُڑ گئے شاخ سے یہ کہہ کے طیور
سرو اک شوخ جواں تھا پہلے

ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے
میں بھی آباد مکاں تھا پہلے

اب بھی تو پاس نہیں ہے لیکن
اس قدر دور کہاں تھا پہلے

کیا سے کیا ہو گئی دنیا پیارے
تو وہیں پر ہے جہاں تھا پہلے

ہم نے آباد کیا ملکِ سخن
کیسا سنسان سماں تھا پہلے

ہم نے بخشی ہے خموشی کو زباں
درد مجبورِ فغاں تھا پہلے

ہم نے ایجاد کیا نقشۂ عشق
شعلہ پتھر میں نہاں تھا پہلے

ہم نے روشن کیا معمورۂ غم
ورنہ ہر سمت دھواں تھا پہلے

ہم نے محفوظ کیا حسنِ بہار
عطرِ گل صرفِ خزاں تھا پہلے

غم نے پھر دل کو جگایا ناصر
خانہ برباد کہاں تھا پہلے

ابنِ انشا

○

اور تو کوئی بس نہ چلے گا ہجر کے روگ کے ماروں کا
صبح کا ہونا دوبھر کر دیں رستہ روک ستاروں کا

جھوٹے سکوں میں بھی اٹھا دیتے ہیں یا اکثر بھتہ
شکلیں دیکھ کے سودے کرنا، کام ہے اہل بچاروں کا

اپنی زباں سے کچھ نہ کہیں گے چپ ہی رہیں گے عاشق لوگ
تم سے تو اتنا ہو سکتا ہے پوچھو حال بچاروں کا

جس سے کسی کا دکھ ہے تو سے دل کو اداسی کی کھوج رہی
یوں تو ہمارے شہر میں اکثر میلا لگا ہے نگاروں کا

ایک ذرا سی بات تھی جس کا چرچا پہنچا گلی گلی
ہم گمناموں نے پھر بھی احسان نہ مانا یاروں کا

درد کا کملا صحیح ہی اٹھو، دل کی نصیحت وضع نبھاؤ
سب کچھ سہنا چپ چپ رہنا کام ہے عزت داروں کا

انشا اب انہی جنبیوں میں جن سے باقی عمر کٹے
جن کی خاطر بستی چھوڑی نام نہ لو ان پیاروں کا

○

سانحہ ہم پہ یہ پہلا ہے مری جاں کوئی
ایسے دامن سے ملاتا ہے گریباں کوئی

قیس صاحب کا تو اس غم میں عجب حال ہوا
اپنے رستے میں نہ پڑتا ہو بیاباں کوئی

ہم نے اپنے کو کوئی دیر سنبھالا ہوتا
آن نکلے اگر آنسو سرِ مژگاں کوئی

یارو اس مردِ محبت کی دوا بتلاؤ
ڈھونڈ لیں گے غمِ دوراں کا تو درماں کوئی

یک نظر دیکھنا، رم کرنا، ہوا ہو جانا
ان سے چھوٹی ہے بھلا خوئے غزالاں کوئی

ہم کسی سمت بھی نکلیں وہیں جا کر نکلیں
ہم سے بھولی ہے رہِ کوچۂ جاناں کوئی

اب تری یاد میں روئیں گے نہ حیراں ہوں گے
ان سے یماں ہے کوئی دل سے ہے یماں کوئی

سونی راتوں میں سرِ بسترِ خوابِ راحت
بیٹھا رہتا ہے کسی بات پہ گریاں کوئی

بھیگی شاموں میں کھلے صحن میں تنہا تنہا
کھویا کھویا نظر آتا ہے خراماں کوئی

دوستو! دوستو! اس شخص کو جا کر سمجھاؤ
اپنے انشا کے سنبھلنے کا بھی ساماں کوئی

یہ بھی ہم لوگوں کی وحشت پہ ہنسا کرتا تھا
آیا اس خانۂ ویراں میں بھی مہماں کوئی

○

دل سی چیز کے گاہک ہوں گے دو یا ایک ہزار کے بیچ
انشا جی کیا مال لیے بیٹھے ہو تم بازار کے بیچ

مہنا پلانا عین گنہ ہے، جی کا لگانا عین ہوس
آپ کی باتیں سب سچی ہیں، لیکن بھری بہار کے بیچ؟

اے ساقیو! اے خوش نظرو! ایک گوشۂ کرم خیرات کرو
نعرہ زناں کچھ لوگ پھریں ہیں صبح سے شہرِ نگار کے بیچ

خار و خس و خاشاک تو جانیں ایک تجھی کو خبر نہ ملے
اے گلِ خوبی ہم تو عبث بدنام ہوئے گلزار کے بیچ

منتِ قاصد کون اٹھائے، شکوۂ دربان کون کرے
نامۂ شوق غزل کی صورت چھپنے کو دو اخبار کے بیچ

○

ساون بھادوں ساٹھ ہی دن ہیں پھر وہ رُت کی بات کہاں
اپنے اشک مسلسل برسیں اپنی سی برسات کہاں

چاند نے کتنی باتیں کریں — نکلا، چمکا، ڈوب گیا
ہم بھی آنکھ جھپک لیں سو لیں۔ اے دل ہم کو رات کہاں

قیس کا نام سُنا ہے تو نے ہم سے اب ملاقات کرو
عشق و جنوں کی منزلِ مشکل سب کی یہ اوقات کہاں

پیت کا کاروبار بہت ہے اب تو اور بھی پھیل چلا
اور جو کام جہاں کے دیکھیں، فرصت دیں حالات کہاں

انشا جی ہم نظم کے شاعر، پھر بھی — خیر جو ہیں سو ہیں
کام کی بات غزل میں کہنا سب کے بس کی بات نہیں

○

کبھی اُن کے ملن کی آشا نے اک جوت جگا دی من میں
اب دُکھ کا اُجالا سنولایا، پھر شام ہے اپنے آنگن میں

جی گھلتا ہے آنسو ڈھلتے ہیں، ہر پیڑ میں دیپ سے جلتے ہیں
اس بھکا سے جی کی آگ نہ بجھے؟ تو اور ہی بھڑکے ساون میں

کبھی جل مدھر کبھی نین سجل، کن گیلیں میں تم ہیں لے آئے
اس من کو نہ لوگو بھٹکاؤ، یہ من ہے کسی کے بندھن میں

ہر شکل کا روپ نہیں ہوتا، ہر روپ کو نام نہیں دیتے
کچھ شکلیں ہیں اپنی آنکھوں میں کچھ روپ ہیں اپنے درپن میں

کبھی من کے اکانتا میں آؤ، وہ مورتیں تم کو دکھلائیں
وہ صورتیں تم کو دکھلائیں ہم کھو گئے جن کے درشن میں

یہ چھیل چھبیلا کون پھرے اس متھرا کی نگری میں کنھیا!
سبھی بانکیں کملے شیام میں تھیں، اب کچھ لوا اس موہن میں

ہر ایک پرنظریں اُٹھی تھیں ہر ایک پہ جی کو مچلنا تھا
اس شہر میں روپ کا کال نہیں کچھ اور ہے اپنے ساجن میں

یا بن میں چکارے ملتے ہیں یا پیت کے مارے ملتے ہیں
کچھ پوچھ نہیں کچھ کہہ میں کچھ اتریں، کچھ دکھن میں

شہروں میں پھرے نیناس لیے جنتا کے تیئں بھگوان کہے
انشا سا کوئی نادیکھا، کہنے کو یوں جگ ہر بن میں

اُس من کے نام پہ یاد آئے سب منظر فیض کی نظموں کے
وہی رنگ حنا، وہی بند قبا، وہی پگڑی کھلے پیراہن میں

ہم لوگوں کے آنے سے پہلے بھی تم لوگ اُدھر سے گزرتے تھے
کبھی پھول بھی دیکھے غرفوں میں کبھی توس قرمز کسی چلمن میں

ہم اُن سے جو مل کر دور ہوئے، مجبور ہوئے، رنجور ہوئے
اب دُکھ کا کٹھن کا مشکل ہے، ہاں جان ہے گی اِس جیون میں

تم لوگوں نے چاند بجھا ڈالا، شب ماہ کا لطف گنوا ڈالا
اب لاکھ چراغ جلاتے پھرو، سُرا سے نہ ہر روزن میں

کبھی میر فقیر کی بیتوں سے کبھی غزلوں سے انشا صاحب کی
ان برہ کی بے کل راتوں میں ہم جوت جگاتے ہیں من میں

○

ہم رات بہت روئے بہت آہ و فغاں کی
دل درد سے بوجھل ہو تو پھر نیند کہاں کی

سر زانو پر رکھے ہوئے کیا سوچ رہی ہو
کچھ بات سمجھتی ہو محبت زدگاں کی

تم میری طرف دیکھ کے چپ ہو سی گئی تھیں
وہ ساعت خوش وقت نشاط گراں کی

اک دن یہ سمجھتے تھے کہ پایان تمنا
اک رات ہے مہتاب کے ایام جواں کی

اب اور ہی حالت ہے مگر جان تمنا
ہم نالہ کشاں، بے کنہاں غم زدگاں کی

اس گھر کی کھلی چھت پہ چمکتے ہوئے تارو
کہتے ہو کبھی بات وہاں جا کے یہاں کی؟

برگشتہ ہوا ہم سے یہ مہتاب تو پیارو
بس بات سنی، راہ چلا کاہکشاں کی

انشا سے ملو اس سے نہ روکیں گے۔ لیکن
اس سے یہ ملاقات نکالی ہے کہاں کی

مشہور ہے ہر بزم میں اس شخص کا سودا
باتیں ہیں بہت شہر میں بدنام میاں کی

اے دوستو اے دوستو اے درد نصیبو
گلیوں میں چلو سیر کریں شہر بتاں کی

ہم جائیں کسی سمت کسی چوک پھٹے میں
کہنا نہ کوئی بات کسی سود و زیاں کی

انشا کی غزل سن لو پہ رنجور نہ ہونا
دیوانے نے دیوانے سے اک بات بیاں کی

ہو تلہے یہی عشق میں، ہے سنجار سبھی کا
باتیں یہی دیکھی ہیں محبت زدگاں کی

مُتغزلين جدید

(۲)

آنند نرائن مُلّا

○

چھپ کے دنیا سے سوادِ دلِ خاموش میں آ
آ یہاں تو مری ترسی ہوئی آغوش میں آ

اور دنیا میں کہیں تیرا ٹھکانا ہی نہیں
اے مرے دل کی تمنا لبِ خاموش میں آ

مے رنگیں لبِ مینا سے اشارے کب تک
ایک دن ساغرِ رندانِ بلانوش میں آ

عشق کرتا ہے تو پھر عشق کی توہین نہ کر
یا تو بیہوش نہ ہو، ہو تو نہ پھر ہوش میں آ

تو بدل دے نہ کہیں جوہرِ انساں کا بھی رنگ
اے زمانے کے لہو دیکھ نہ یوں جوش میں آ

دیکھ کیا دام لگاتی ہے نگاہِ مُلّا
غنچۂ تر! تو کبھی دستِ گل افروش میں آ

○

نگاہ و دل کا افسانہ قریبِ اختتام آیا
ہمیں اب اس سے کیا، آئی سحر یا وقتِ شام آیا

زبانِ عشق پر اک چیخ بن کر تیرا نام آیا
خرد کی منزلیں طے ہو چکیں دل کا مقام آیا

اٹھانا ہے جو پتھر رکھ کے سینہ پر وہ گام آیا
محبت میں نری ترکِ محبت کا مقام آیا

اِسے آنسو نہ کہہ اک یادِ ایامِ گذشتہ ہے
مری عمرِ رواں کو عمرِ رفتہ کا سلام آیا

ذرا لَو اور دل کی تیز کر سیلا سا یہ شعلہ
نہ روشن کر سکا گھر کو نہ محفل ہی کے کام آیا

مکمل تبصرہ کرتا ہوا ایامِ رفتہ پر
نگاہِ بے سخن میں ایک اشکِ بے کلام آیا

توانا کو بہانہ چاہیے شاید تشدد کا
پھر اک مجبور پر شوریدگی کا اتہام آیا

نہ جانے کتنی شمعیں گُل ہوئیں کتنے بجھے تارے
تب اک خورشید اترا تا ہوا بالائے بام آیا

برہمن آبِ گنگا، شیخ کوثر لے اڑا اس سے
ترے ہونٹوں کو جب چھوتا ہوا مُلّا کا جام آیا

رَوِشؔ صدیقی

اس سے بڑھکر تو کوئی بے سر و سامان نہ ملا
دل ملا جس کو مگر دردِ غریباں نہ ملا

اک ذرا ذوقِ تجسس میں بڑھایا تھا قدم
نکہتِ گل کو پھر آغوشِ گلستاں نہ ملا

تلخیٔ بادۂ اندوہ و فنا کیا کم ہے
اس میں اے دوست یہ زہرِ غمِ دوراں نہ ملا

کر لیا ہم نے گوارا غمِ آشفتہ سری
جب کسی طرح مزاجِ دلِ خوباں نہ ملا

اب کہاں جائیں بتاؤ تو کچھ اے اہلِ حرم
بُت کدے میں بھی وہ غارت گرِ ایماں نہ ملا

نسبتِ پائے نگاریں ہے یہ اے موجِ نسیم
خاک سے سلسلۂ لالہ و ریحاں نہ ملا

بات اتنی سی ہے اے واعظِ افلاک نشیں
کیا ملے گا اسے یزداں جسے انساں نہ ملا

ان سے اب تذکرۂ دولتِ کونین ہے کیوں
جن غریبوں کو ترا گوشۂ داماں نہ ملا

زندگی نام ہے طوفانِ حوادث کا رَوِشؔ
ننگِ ساحل ہے وہ جس کو کوئی طوفان نہ ملا

○

عمرِ ابد سے خضر کو بیزار دیکھکر
خوش ہوں فسونِ نرگسِ بیمار دیکھکر

کیا جلوہ گاہ حسرتِ نظارہ ہے بہشت؟
حیراں ہوں صورتِ در و دیوار دیکھکر

بادہ بقدرِ ظرف سہی رسمِ میکدہ
ساقی! نزاکتِ دلِ مے خوار دیکھکر

اب جستجوئے دوست کی منزل کہیں بھی ہو
ہم چل پڑے ہیں راہ کو دشوار دیکھکر

شایانِ جرمِ عشق نہ تھی قیدِ زندگی
جی شاد ہو گیا رسن و دار دیکھ کر

اب اس سے کیا غرض یہ حرم ہے کہ دیر ہے
بیٹھے ہیں ہم تو سایۂ دیوار دیکھ کر

اب حشر تک حجاب نشیں ہے نگاہِ شوق
پھٹتا تھا رنگِ حسرتِ دیدار دیکھ کر

رازِ فروغِ آخرِ شب کچھ نہ کھل سکا
کیوں خوش ہے شمع صبح کے آثار دیکھکر

سازِ غزل اٹھا ہی لیا ہم نے اے رَوِشؔ
اُس چشمِ نیم باز کا اصرار دیکھکر

میراجی

○

ہنسو تو ساتھ ہنسے گی دُنیا، بیٹھ اکیلے رونا ہوگا
چپکے چپکے بہا کر آنسو، دل کے دکھ کو دھونا ہوگا

یہ ریت بڑی دُنیا کی، آنکھ سے ٹپکا جو بھی موتی
پلکوں ہی سے اُٹھانا ہوگا، پلکوں ہی سے پرونا ہوگا

پیار دل سے مل جائیں پیارے، اَن ہونی کب ہونی ہوگی
کانٹے پھول نہیں گے کیسے، کب کُہ بیج بھونا ہوگا

جتنے بتنے کام نہ آئے لاکھوں بھنور طوفانی ساگر
اب منجدھار میں اپنے ہاتھوں جیون ناؤ ڈبونا ہوگا

میراجی کیوں سوچ ستائے، پل پل ڈوری لہرائے
قسمت جو بھی رنگ دکھائے اپنے دل میں سمونا ہوگا

○

غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا، کیا اب تم سے بیان کریں
غم بھی راس نہ آیا دل کو اور ہی کچھ سامان کریں

کرنے اور کہنے کی باتیں کس نے کہیں اور کس نے کیں!
کرتے کہتے دیکھیں کسی کو ہم بھی کوئی پیمان کریں

بھلی بُری جیسے بھی گذری اُن کے سہارے گذری ہے
حضرتِ دل جب ہاتھ بڑھائیں، ہر مشکل آسان کریں!

ایک ٹھکانا آگے آگے، پیچھے پیچھے مسافر ہے!
چلتے چلتے سانس جو ٹوٹے منزل کا عنوان کریں

مجبوروں کی مختاروں سے دُوری اچھی ہوتی ہے
مل بیٹھیں تو مبادا دونوں، باہم کچھ احسان کریں

دستِ مزد میں خشتِ رنگیں اس کا اشارہ کرتی ہے
ایک ہی نعرہ کافی ہے بربادیٔ ہر ایوان کریں

میر ملے تھے میراجی سے باتوں سے ہم جان گئے
فیض کا چشمہ جاری ہے حفظ اُن کا بھی دیوان کریں

جوشؔ ملسیانی

○

تری یاد میں کب قیامت نہ ٹوٹی تجھے غم میں کب حشر برپا نہ دیکھا
بجز اک نگاہِ میسا فنس کے محبت کے ماروں نے کیا کیا نہ دیکھا

بہت سیر کی باغِ جنت کی ہم نے مگر کچھ مزا زندگی کا نہ دیکھا
کسی دل میں دردِ محبت نہ پایا کسی دل میں داغِ تمنا نہ دیکھا

جنونِ محبت میں دیوانگی میں تری بے رخی کا بھی ہیں قدرداں ہم
بڑا تو نے احسان مجھ پر کیا یہ تماشا بنا کر تماشا نہ دیکھا!

ترے آستاں کا پتہ کس سے پائیں کرے رہبری کون بھٹکے ہوؤں کی
یہ راہ طلب ہے کہ راہِ عدم ہے کسی کا بھی نقشِ کفِ پا نہ دیکھا

محبت کہاں یہ تو بیچارگی ہے تم بھی یہیں پھر کرم اس کو سمجھیں
یہ جبر اس لئے کر لیا ہے گوارا کہ اسکے سوا کوئی چارا نہ دیکھا!

نیازِ محبت سے یہ بے نیازی خلوصِ محبت سے اتنا تغافل
مرا درد تم نے، مرا حال تم نے، نہ جانا، نہ سمجھا، نہ پوچھا، نہ دیکھا

تمہیں جوشؔ ہم خوب پہچانتے ہیں تمہاری بلانوشیاں جانتے ہیں
کہاں تم کہاں پارسائی کا جامہ کبھی ہم نے ایسا دکھاوا نہ دیکھا

○

بلا سے کوئی ہاتھ ملتا رہے
ترا حسن سانچے میں ڈھلتا رہے

ہر اک دل میں پہلے محبت کا داغ
یہ سکہ زمانے میں چلتا رہے

وہ ہمدرد کیا جس کی ہر بات میں
شکایت کا پہلو نکلتا رہے!

بدل جائے خود بھی تو حیرت ہے کیا
جو ہر روز وعدے بدلتا رہے

مری بے قراری پہ کہتے ہیں وہ
نکلتا ہے دم تو نکلتا رہے!

پلائی ہے ساقی جو آنکھوں سے آج
اسی کا بس اب دور چلتا رہے

تمہیں ہم سحابِ کرم بھی کہیں
امیدوں کا خرمن بھی جلتا رہے

یہ طولِ سفر یہ نشیب و فراز
مسافر کہاں تک سنبھلتا رہے

کوئی جوہری جوشؔ ہو یا نہ ہو
سخن ور جہاں میں تو پلتا رہے

جلال الدّین اکبر

○

خاموش ہیں لب اور آنکھوں سے آنسو ہیں کہ پیہم بہتے ہیں
ہم سامنے اُن کے بیٹھے ہیں اور قصۂ فُرقت کہتے ہیں

اب حُسن و عشق میں فرق نہیں اب دونوں کی اک حالت ہے
میں اُن کو دیکھتا رہتا ہوں، وہ مجھ کو دیکھتے رہتے ہیں

ان کی وہ حیا، وہ خاموشی، اپنی وہ محبت کی نظریں
وہ سُننے کو سب کچھ سنتے ہیں، ہم کہنے کو سب کچھ کہتے ہیں

اس شوقِ فراواں کی یارب آخر کوئی حد بھی ہے کہ نہیں
انکار کریں وہ یا وعدہ ہم راستہ دیکھتے رہتے ہیں

ہمدرد نہیں ہمراز نہیں کس سے کہئے، کیوں کر کہئے
جو دل پہ گذرتی رہتی ہے جو جان پہ صدمے سہتے ہیں

آ دیکھ کے ظالم وقت میں کیا حال مرا بے حال ہوا
آہوں سے شرارے جھڑتے ہیں آنکھوں سے دریا بہتے ہیں

اکبر شاید دل کھو بیٹھے وہ جلسے وہ احباب نہیں
تنہا خاموش سے پھرتے ہیں ہر وقت اداس سے رہتے ہیں

○

ہر آن ایک تازہ شکایت ہے آپ سے
اللہ مجھ کو کتنی محبت ہے آپ سے!

کیا آپ جانتے ہیں، مجھے تو خبر نہیں
کہتے ہیں لوگ مجھ کو محبت ہے آپ سے

اس دل کی آرزوئے محبت کو کیا کہوں
جس دل کو آرزوئے محبت ہے آپ سے

رونا تو ہے یہی کہ نہیں آہ میں اثر
شکوہ ہے آپ سے نہ شکایت ہے آپ سے

آلِ احمد سرورؔ

غیرتِ عشق کا یہ ایک سہارا نہ گیا
لاکھ مجبور ہوئے ان کو پکارا نہ گیا

کیا بہاروں نے تو آیا ہے بہاروں کا سلام
صرف خوابوں سے حقائق کو سنوارا نہ گیا

معرکہ عشق کا سر دے کے بھی سر ہو نہ سکا
کون راہی تھا جو اس راہ میں مارا نہ گیا

وہ بھی وقت آتا ہے ساقی بھی بدل جاتے ہیں
مے کدے پر کبھی مستوں کا اجارا نہ گیا

شوق کی بات کب الفاظ میں ڈھل سکتی تھی
اس پری کو کبھی شیشے میں اتارا نہ گیا

گاہ ٹکرا دئے شیشے، کبھی چھلکا دئے جام
رائیگاں ایک بھی ساقی کا اشارا نہ گیا

آئینے جتنے بھی دیکھے وہ مقدر تھے سرورؔ
جوہرِ صدق و صفا پھر بھی ہمارا نہ گیا

ہم برق و شرر کو کبھی خاطر میں نہ لائے
اس فتنۂ دوراں کو مگر دیکھ نہ پائے

گو قطرے میں دریاؤں کا طوفان سمائے
پر شوق کی روداد کب الفاظ میں آئے

زلفوں کو دیا ہے رخِ زیبا نے عجب رنگ
بلبوں سے ترے اور بھی روشن ہوئے سائے

یہ عشق کے شعلے بھی عجب چیز ہیں یعنی
جو آگ لگائے وہی خود آگ بجھائے

ڈھلتی ہے وہ مے اک ترے پیمانے میں ساقی
مستی کو بھی جو ہوش کے آداب سکھائے

تیری ہی نگاہوں کا تصرف تھا کہ ہم نے
رعنائیٔ افکار کے اعجاز دکھائے

جس دل پہ کسی کی نگہِ لطف پڑی تھی
بیٹھے ہیں سرورؔ اس کو کلیجے سے لگائے

ماہر القادری

○

اس خوشی مٹ جاتا ہے، افسردہ طبیعت ہوتی ہے
دل پہ وہ گھڑی بھی آتی ہے جب غم کی ضرورت ہوتی ہے

دو حرف بھی میرے سن نہ سکے تم اتنے کیوں بیزار ہوئے
میں نے تمہیں اپنا سمجھا تھا، اپنوں سے شکایت ہوتی ہے

بے سود و زیاں کے پیمانے، یہ جھوٹے سچے افسانے
ان اہلِ ہوس کی باتوں سے بدنام محبت ہوتی ہے

اک دوسری بوتل آنے تک، یہ دردِ تہِ ساغر ہی سہی
اے تشنہ لبو! بیتاب نہ ہو، ساقی کو ندامت ہوتی ہے

ماہر کی سادہ باتوں سے اللہ بچاتا ہی رکھے!
خود تو یہ بڑے ہی حضرت ہیں اوروں کو نصیحت ہوتی ہے

○

دل میں اب آواز کہاں ہے
ٹوٹ گیا تو ساز کہاں ہے

آنکھ میں آنسو لب پہ خموشی
دل کی بات اب راز کہاں ہے

سرو و صنوبر سب کو دیکھا!
ان کا سا انداز کہاں ہے

دل خوابیدہ، روح فسردہ
وہ جوشِ آغاز کہاں ہے

پردہ بھی جلوہ بن جاتا
آنکھ تجلی ساز کہاں ہے

بت خانے کا عزم ہے ماہر
کعبے کا در باز کہاں ہے

سراج الدّین ظفر

اٹھو زمانے کے آشوب کا ازالہ کریں
بنامِ گُل بدناں رخ سوئے پیالہ کریں

بیادِ دیدۂ مخمور پھر پیالہ کریں
اٹھو کہ زہر کا پھر زہر سے ازالہ کریں

وہ رِند ہیں نہ اٹھائیں بہار کا احساں
درودِ ہم تری خلوت میں بے حوالہ کریں

کہاں کے دیر و حرم آؤ ایک سجدۂ شوق
بپائے ہوشربایانِ بیت سالہ کریں

برس پڑے جو گلستاں میں اس نظر سے شراب
بہک بہک کے ہم آگے سبوئے لالہ کریں

سبو اٹھا کہ گدایانِ کوئے مے خانہ
ترے حوالے مہ و مہر کا قبالہ کریں

حدیثِ زہد ہو یا واردات رہزناں
کسی کے نام کو ہم زیبِ ہر مقالہ کریں

دکھا صحیفۂ رخ اس طرح کہ اہلِ بہار!
ورق ورق نجالت بیاضِ لالہ کریں

اٹھو جلا کے مے رُخ سے چراغِ ابد
نشاطِ صحبتِ شب کو ہزار سالہ کریں

ادا وہ نیچی نگاہوں کی ہے کہ جیسے ظفر
تلاشِ کنجِ غزالانِ خورد سالہ کریں

○

درِ مے خانہ سے دیوارِ چمن تک پہنچے
ہم غزالوں کے تعاقب میں ختن تک پہنچے

ہاتھ میخواروں کے بے قصد اٹھے تھے لیکن
اتفاقاً ترے گیسو کی شکن تک پہنچے

مدعے میں کہاں اس زلف کا موضوعِ جدید
لوگ پہنچے تو روایاتِ کہن تک پہنچے

راستہ ایک تھا ہم عشق کے دیوانوں کا
قیدِ گیسو سے چلے دارورسن تک پہنچے

آئیں ہم دست درازی پہ تو میخانے سے
سلسلہ انجمنِ سرو و سمن تک پہنچے

اک قبائے سبک و تنگ میں سو سو ہیں طلسم
کیا کوئی حُسن کے اسرار کہن تک پہنچے

آپ ہی آپ ہو کھل جائے تری زلف دراز
ناگہاں بے ہنری نقطۂ فن تک پہنچے

اے سخن فہم ہم اُس بزم سے آئے ہیں جہاں
حیرتِ آئینہ اسلوبِ سخن تک پہنچے

اس طرح شوقِ غزالاں میں غزلخواں ہو ظفر
شہرتِ مشکِ غزل شہرِ ختن تک پہنچے

مختار صدیقی

○

موت کو زیست ترستی ہے یہاں
موت ہی کون سستی ہے یہاں

دم کی مشکل نہیں آساں کرتے
کس قدر عقدہ پرستی ہے یہاں

سب خرابے ہیں تمناؤں کے
کون بستی ہے جو بستی ہے یہاں

چھوڑ دے صرف ہیں ساون بھادوں
دیکھ ہر آنکھ برستی ہے یہاں

اب تو ہمراہ اوج کا تارا ڈوبا
اوج کا نام ہی پستی ہے یہاں

○

تھی تو سہی پر آج سے پہلے ایسی حقیر و فقیر نہ تھی
دل کی شرافت ذہن کی جودت اتنی بڑی تقصیر نہ تھی

سچ کہتے ہو ہم ایسے کہاں اور سوز و گداز عشق کہاں
سچ ہے مرے آئینۂ دل میں کوئی بھی تصویر نہ تھی

اب جو اچاٹ ہوئی ہے طبیعت شاید اب ہم رخصت ہیں
بن کارن، بے بات وگرنہ ایسی کبھی دلگیر نہ تھی

اہل جنوں کو فصل خزاں سے اب کے بھی کوئی ربط نہ تھا
اب کے بہار وہ آئی کہ جس کی بوئے گل بھی سفیر نہ تھی

آخر غیرت نے سمجھایا، نومیدانہ زیست کریں
باقی ہر تدبیر تو کی جو اپنے خلاف ضمیر نہ تھی

یوسف ظفر

تعمیرِ زندگی کو نمایاں کیا گیا
تخریبِ کائنات کا ساماں کیا گیا

گلشن کی شاخِ شاخ کو ویراں کیا گیا
یوں بھی علاجِ تنگیٔ داماں کیا گیا

کھوئے ہوؤں پہ تیری نظر کی نوازشیں
آئینہ دے کے اور بھی حیراں کیا گیا

آوارگیٔ زلف سے آسودگی ملی!
آسودگی ملی کہ پریشاں کیا گیا

وہ خوش نصیب ہوں کہ غمِ التفات سے
میرے غمِ حیات کا درماں کیا گیا

تنہائیاں بچھا کے جہانِ خراب میں
میرے لئے نگاہ کا ساماں کیا گیا

پھیلا کے بے ثباتیٔ عالم کی داستاں
مجھ پر حرام کیفِ بہاراں کیا گیا

بھڑکا کے آتشِ رخِ جاناں کی آرزو
مجھ کو رہینِ آتشِ دوراں کیا گیا

نومیدیٔ طلب پہ بڑھا کے طلب کا رنگ
امیدِ دیدِ دوست کو ارزاں کیا گیا

یہ بھی کرم کہ مجھ کو شبانِ سیاہ میں
ماہورِ دلنوازیٔ ہجراں کیا گیا

جمعیتِ جمال کا حسنِ کمال دیکھ
آخر یہی ہوا کہ پریشاں کیا گیا

دیکر چمن چمن کو بہار و خزاں کا رنگ
میرے خیال و خواب پہ احساں کیا گیا

آ، اور کائنات کے پھولوں کی داد دے
جن سے ترا جمال نمایاں کیا گیا

یارب! ہر غم غمِ یاراں ہے قریب آجاؤ
پیارو پھر فصلِ بہاراں ہے قریب آجاؤ

دور ہو کر بھی نہیں تم نے حکایاتِ وفا
قرب میں بھی وہی عنواں ہے قریب آجاؤ

ہم محبت کے مسافر ہیں کہیں دیکھ نہ لے
گھات میں گردشِ دوراں ہے قریب آجاؤ

جان پیاری ہے کہ تم بھی ہو مری جان کیا
غمِ جاں ہی غمِ جاناں ہے قریب آجاؤ

آج دنیا کو نہیں اپنے غموں سے فرصت
آج مل بیٹھنا آساں ہے قریب آجاؤ

کس مروت پہ زمانے سے ڈریں، دور رہیں
آؤ اللہ نگہباں ہے قریب آجاؤ

میرے ہی پہلو سے ہو زاں میں سکوں ممکن ہے
چار سو گردشِ دوراں ہے قریب آجاؤ

جاؤ اب جاؤ، کہ وہ عہدِ وفا ختم ہوا
جب بھی دیکھو کہ بہار امکاں ہے قریب آجاؤ

میں زمانے کی کڑی دھوپ کا مارا ہوں ظفر
تم جہاں ہو گھنا سایہ ہے قریب آجاؤ

انجم رومانی

ہر چند انہیں عہد فراموش نہ ہوگا
لیکن ہمیں اس وقت کوئی ہوش نہ ہوگا

دیکھو گے تو آئے گی تمہیں اپنی بھی یاد
خاموش جسے پاؤ گے خاموش نہ ہوگا

گذرے ہیں وہ لمحے کہ سدا یاد رہیں گے
دیکھا ہے وہ عالم کہ فراموش نہ ہوگا

ہم اپنی شکستوں سے ہیں اس طرح بغل گیر
یوں قبر سے بھی کوئی ہم آغوش نہ ہوگا

پی جاتے ہیں زہرِ غمِ ہستی ہو کہ مے ہو
ہم سا بھی زمانے میں بلانوش نہ ہوگا

ہوئے کو تو دنیا میں کئی پردہ نشیں ہیں
لیکن تری صورت کوئی روپوش نہ ہوگا

پاؤ گے نہ آزادِ غمِ انجم کسی دل کو
ہوگا غمِ فردا جو غمِ دوش نہ ہوگا

جہاں تک گیا کاروانِ خیال
نہ تھا کچھ بجز حسرتِ پائمال

مجھے تیرا، تجھ کو ہے میرا خیال
مگر زندگی پھر بھی ہے خستہ حال

جہاں تک ہے دیر و حرم کا سوال
رہیں چپ تو مشکل، کہیں تو وبال

تری کائنات ایک حیرت کدہ
شناسا مگر اجنبی خد و خال

مری کائنات ایک زخمِ کہن
مقدر میں جس کے نہیں اندمال

نئی زندگی کے نئے مکر و فن
نئے آدمی کی نئی چال ڈھال

ہوئے رخصت انجم سحر کے نقیب
نہ دیکھا گیا شاید اپنا زوال

قیوم نظر

○

کیوں بیٹھ گئے غبار سے ہم
کچھ کہہ نہ سکے پہار سے ہم

یہ زندگی عمر بھر کا رونا
گھبرا گئے انتظار سے ہم

وہ جبر کی لذتوں کا عالم
باز آئے اس اختیار سے ہم

ہنستے ہیں کہ ہنس سکے زمانہ
خوش ہیں تو اس اعتبار سے ہم

یوں بھی تو سکوں ملا ہے برسوں
پھرتے رہے بے قرار سے ہم

وہ لمحہ ہے آج تک گریزاں
جب تم سے تھے ہمکنار سے ہم

اب آخرِ شب نظر ہے شاید
پھر جیسے ہیں ہوشیار سے ہم

○

ماتھے پر ٹیکا صندل کا اب دل کے کارن رہتا ہے
مندر میں مسجد بنتی ہے مسجد میں برہمن رہتا ہے

ذرّے میں سورج اور سورج میں ذرّہ روشن رہتا ہے
اب من میں ساجن رہتے ہیں اور ساجن میں من رہتا ہے

رُت بیت چکی ہے برکھا کی اور پیت کے مارے بیٹھے ہیں
رونے ہیں رونے والوں کی آنکھوں میں ساون رہتا ہے

اک آہ نشانی جینے کی رہتی تھی مگر جب وہ بھی نہیں
کیوں دُکھ کی مالا جپنے کو یہ تنکا سا تن رہتا ہے

اے مجھ پہ ہنسنے اور کسی کو دیکھنے والو یہ تو کہو!
یوں کب تک جان پہ بنتی ہے یوں کب تک جوبن رہتا ہے

دل توڑ کے جانے والے سُن دو اور بھی رشتے باقی ہیں
اک سانس کی ڈوری اُنکی ہے اک پریم کا بندھن رہتا ہے

عبدالمجید حیرت

○

ایماں نواز گردشِ پیمانہ ہو گئی
ہم سے بھی ایک لغزشِ مستانہ ہو گئی

کوئی تو بات شمع کے جلنے میں تھی ضرور
جس پہ نثار ہستیٔ پروانہ ہو گئی

صد شکر آج ہو تو گئی اُن سے گفتگو
یہ اور بات ہے کہ حریفانہ ہو گئی

اللہ رے اشکباریٔ شمعِ شبِ فراق
جو صبح ہوتے ہوتے اک افسانہ ہو گئی

حیرت کے غمکدے میں خوشی کا گذر کہاں
تم آ گئے تو رونقِ کاشانہ ہو گئی

○

مرہم نہ زخمِ جگر ہو جائے
ایک ایسی بھی نظر ہو جائے

اِک اشارہ بھی اگر ہو جائے
اِس شبِ غم کی سحر ہو جائے

صبح یہ فکر کہ ہو جائے شام
شام کو، یہ کہ سحر ہو جائے

ہو نہ اتنا بھی پریشاں کوئی
کہ زمانے کو خبر ہو جائے

یُوں تو جو کچھ بھی کسی پر گذرے
دل نہ افسردہ مگر ہو جائے

فکرِ فردا بھی کریں گے حیرت
پہلے یہ شب تو بسر ہو جائے

سکندر علی وجدؔ

○

شمیمِ زلفِ یار آئے نہ آئے
مرے دل کو قرار آئے نہ آئے

ابھی آیا ہے ہوش اے یادِ جاناں
نہ تڑپا، بار بار آئے نہ آئے

چراغِ زندگانی بجھ رہا ہے
وہ جانِ انتظار آئے نہ آئے

کیا جو تم نے اپنے دل سے پوچھو
ہمارا اعتبار آئے نہ آئے

نگاہِ اہلِ گلشن کہہ رہی ہے
خزاں جائے، بہار آئے نہ آئے

بڑھے گا کارواں منزل بمنزل
غبارِ رہگذار آئے نہ آئے

○

جب وہ مسرور نظر آتا ہے
ہر طرف نور نظر آتا ہے

مَیں تو مے خوار ہوں تو کیوں ساقی!
نشّے میں چُور نظر آتا ہے

قرب سے ہاتھ اُٹھایا میں نے
تو بڑی دُور نظر آتا ہے

مَیں ہی تنہا نہیں، دل کے ہاتھوں
تو بھی مجبور نظر آتا ہے

خاکساری کو چُھپانے کے لئے
وجدؔ مغرور نظر آتا ہے

ادیب سہارنپوری

○

اک خلش کو حاصلِ عمرِ رواں رہنے دیا
جان کر ہم نے انہیں نامہرباں رہنے دیا

آرزوئے قرب بھی بخشی دلوں کو عشق نے
فاصلہ بھی میرے اُنکے درمیاں رہنے دیا

کتنی دیواروں کے سائے ہاتھ پھیلاتے رہے
عشق نے لیکن ہمیں بے خانماں رہنے دیا

اپنے اپنے حوصلے اپنی طلب کی بات ہے
چن لیا ہم نے تمہیں سارا جہاں رہنے دیا

کون اس طرزِ جفائے آسماں کی داد دے
باغ سارا پھونک ڈالا آشیاں رہنے دیا

یہ بھی کیا جینے میں جینا ہے بغیر اُنکے ادیبؔ
شمع گل کر دی گئی باقی دھواں رہنے دیا

○

وہ پو پھٹی وہ کرن سے کرن میں آگ لگی
وہ شب کی زلفِ شکن در شکن میں آگ لگی

سلگ اٹھی وہ ردائے نجوم و کاہکشاں!
وہ دیکھ دامنِ چرخِ کہن میں آگ لگی

نشاطِ گریۂ محفل تھی جس کی تابانی
اسی چراغ سے کیوں انجمن میں آگ لگی

ہزار شمس و قمر بجھ گئے پہ یہ نہ بجھی!
یہ کس نئے سے تپنگو کے من میں آگ لگی

تمام عمر کے آنسو اسے بجھا نہ سکے
جو دل سے تا جگرِ دم زدن میں آگ لگی

بھلا سکے گی نہ دنیا یہ حادثہ کہ ادیبؔ
چراغِ لالہ و گل نے چمن میں آگ لگی

ذوالفقار علی بخاری

○

بسائی میں نے جو قلبِ حزیں میں
وہ دُنیا کام آئی کار دیں میں

وہی ہے اصل میں جانِ تمنّا
جو حسرت ہے نگاہِ واپسیں میں

ترے شوقِ سراپا کی کشش سے
سمٹ آیا ہوں میں اپنی جبیں میں

ہے پیچ و تاب میں ہر موج ساحل
وہ بیتابی ہے موجِ تہ نشیں میں

حقیقت ہے کہ تم ہو جانِ خوبی
کہ خوبی ہے وطن کی سرزمیں میں

محبت ہے کہ وہ عکسِ مسرت
اتر آیا مرے قلبِ حزیں میں

جنوں کے راج میں انصاف ہوگا
نہ ہوگا فرق جیب و آستیں میں

بہت کچھ پاؤ گے دنیا میں پیارے
محبت پاؤ گے لیکن نہیں میں

بخاری کی تڑپ، حافظ کی مستی
تمہارے نغمۂ وجد آفریں میں

○

زندگی آزار تھی آزار ہے تیرے بغیر
کارِ سہل مرگ بھی دشوار ہے تیرے بغیر

کام یوں آکر رُکے جیسے کبھی چلتے نہ تھے
عمرِ فانی وقتِ بے رفتار ہے تیرے بغیر

کیا بتاؤں کس طرح اب کٹ رہی ہے زندگی
میری ہر ہر سانس اک تلوار ہے تیرے بغیر

تیرا غم تھا اور تجھ ہی سے بیاں کرتا تھا میں
کون سا غم قابلِ اظہار ہے تیرے بغیر

میرے غم کی تلخیوں کا اس سے کچھ اندازہ کر
مجھ کو مے نوشی سے بھی انکار ہے تیرے بغیر

غلام ربّانی تاباں

○

جنوں خود نما خود نگر بھی نہیں
خرد کی مدح کم نظر بھی نہیں

کوئی راہزن کا خطر بھی نہیں
کہ دامن میں گردِ سفر بھی نہیں

یہاں ہوش و ایماں سبھی لُٹ گئے
مزا یہ ہے ان کی خبر بھی نہیں

غمِ زندگی اک مسلسل عذاب
غمِ زندگی سے مفر بھی نہیں!

نظر معتبر ہے خبر معتبر
مگر اس قدر معتبر بھی نہیں

تری انجمن مرکزِ آرزو!
تری انجمن میں گزر بھی نہیں

کہاں جائیں تاباںؔ گنہگارِ شوق
سزا بھی نہیں درگزر بھی نہیں!

○

چھٹے غبارِ نظر بامِ طور آ جائے
پیو شراب کہ چہرہ پہ نور آ جائے

اُٹھاؤ جام بنامِ حیات بادہ کشو
نظارے جھومیں، نظر کو سرور آ جائے

شراب خانہ میں کوثر کا ذکر! کیا کہئے
کسی کی عقل میں جیسے فتور آ جائے

تمام زہد و ریاضت ہو غرقِ موجِ شراب
جو میکدے میں وہ شیدائے حور آ جائے

مقامِ دار سے گذرو تو زندگی پاؤ!
پیو جو زہرِ ہلاہل سرور آ جائے

نگاہ تیز، نفس گرم، آرزو بیباک!
جسے ہو ناز ہمارے حضور آ جائے!

یہ کاروبارِ مشیت بھی خوب ہے تاباںؔ!
کسی پہ برق گرے نہ پہ طور آ جائے

رازؔ مرادآبادی

○

ہر اک شکستِ تمنا پہ مسکراتے ہیں
وہ کیا کریں جو مسلسل فریب کھاتے ہیں

کبھی کبھی تو وہ اس طرح یاد آتے ہیں
ہم اسکے بعد ہر اک شے کو بھول جاتے ہیں

یقینِ عشق نہیں، اعتبارِ حسن نہیں
یہ وہم کیا مرے دل میں سمائے جاتے ہیں

نگاہِ ناز بھی کیا چیز ہے، خدا جانے
نظر کے ساتھ زمانے بدلتے جاتے ہیں

کسی کے وعدۂ صبر آزما کی خیر کہ ہم
اب اعتبار کی حد سے گذرتے جاتے ہیں

○

غم کہ تھا حریفِ جاں اب حریفِ جاناں ہے
اب وہ زلف برہم ہے اب وہ چشمِ گریاں ہے

دستوں میں دامن کی ان دنوں گریباں ہے
ہم قفس کہیں شاید موسمِ بہاراں ہے

رنگ و بو کے پردے میں کون یہ خراماں ہے
ہر نفس معطر ہے ہر نظر غزل خواں ہے

بندگی یہ کیا جانے، دیر کیا، حرم کیا ہے
ہم جہاں پہ ہیں واعظ، کفر ہے نہ ایماں ہے

شکریہ مگر ناصح تو یہ رازؔ کیا سمجھے
جورِ برملا ان کا التفاتِ پنہاں ہے

مجید امجد

○

کیا روپ دوستی کا کیا رنگ دشمنی کا
کوئی نہیں جہاں میں کوئی نہیں کسی کا

اک تنکا آشیانہ، اک راگنی اثاثہ
اک موسمِ بہاراں مہمان دو گھڑی کا

آخر کوئی کنارا اس سیلِ بے کراں کا
آخر کوئی مداوا اس دردِ زندگی کا

میری سیہ شبی نے اک عمر آرزو کی
لرزے کبھی اُفق پہ تارا سا روشنی کا

اب میری زندگی میں آنسو ہیں اور نہ آہیں
لیکن - یہ ایک میٹھا میٹھا سا روگ جی کا

او مسکراتے تارو! او کھلکھلاتے پھولو!
کوئی علاج میری افسردہ خاطری کا!

○

جنونِ عشق کی ہم عجیب کیا کہنا
میں اُن سے دُور وہ مجھ سے قریب کیا کہنا

یہ تیرگی مسلسل میں ایک وقفۂ نور
یہ زندگی کا طلسمِ عجیب کیا کہنا

جو تم ہو برقِ نشیمن، تو میں نشیمنِ برق
اُلجھ پڑے ہیں ہمارے نصیب کیا کہنا

ہجومِ رنگ فراواں سہی - مگر، پھر بھی
بہار - نوحۂ صد عندلیب، کیا کہنا

ہزار قافلۂ زندگی کی تیرہ شبی
یہ روشنی سی اُفق کے قریب کیا کہنا

لرز گئی تری لَو میرے ڈگمگانے سے
چراغ گوشۂ کوئے حبیب کیا کہنا

شان الحق حقی

○

اثر نہ ہو تو اسی نطق بے اثر سے کہہ
جو نا نہ درد محبت جہان بھر سے کہہ

جو کہہ چکا ہے تو انداز تازہ تر سے کہہ
خبر کی بات ہے اک گوش بے خبر سے کہہ

چمن چمن سے اُلجھ کر رہے گا پائے خزاں
روش روش کو بتا دے شجر شجر سے کہہ

بیان شوق نہیں قیل و قال کا محتاج
کبھی فغاں میں ادا کر کبھی نظر سے کہہ

فریب میر کے کیا گوش بے اثر سے خطاب
مزاج دل کی گدایانہ رہ گزر سے کہہ

شباب تشنہ کی خوں بار نوشیوں کو نہ بھول
مرے فسانۂ رنگیں کو پیشتر سے کہہ

سفر ہے شرط حیات اور بہت ہے شرط سفر
پکار کر یہ رفیقان ہمسفر سے کہہ

○

اے دل ترے خیال کی دنیا کہاں سے لائیں
ان وحشتوں کے واسطے صحرا کہاں سے لائیں

حیرت تو ہے یہی کہ ہو دنیا سے دل کو میل
ہو جس سے دل کو میل وہ دنیا کہاں سے لائیں

دیکھا تھا جو خیال تمنا کے سائے میں
اے بے دلی وہ خواب دل افزا کہاں سے لائیں

روشن تھے جو کبھی وہ نظارے کدھر گئے
برپا تھا جو کبھی وہ تماشا کہاں سے لائیں

کیا اس نگاہ حوصلہ افزا کو دیں جواب؟
گم کر دیا ہے وہ تمنا کہاں سے لائیں

ہے لطف دست حرف تقاضا کا منتظر
اے بے بسی مجال تقاضا کہاں سے لائیں

حقی بہت ہے کار جنوں وحشت و نیست میں

باقیؔ صدیقی

○

ہم ذرّے ہیں خاکِ رہگذر کے
دیکھو ہمیں بام سے اُتر کے

چُپ ہو گئے یوں اسیر جیسے
ہنگامے تھے تمام بال و پر کے

وعدہ نہ دِلاؤ یاد اُن کا
نادم ہوں خود اعتبار کر کے

اے بادِ سحر نہ چھیڑ ہم کو
ہم جاگے ہوئے ہیں رات بھر کے

شبنم کی طرح حیات کے خواب
کچھ اَور نکھر گئے بکھر کے

جب اُن کو خیالِ وضع آیا
انداز بدل گئے نظر کے

یوں موت کے منتظر ہیں باقیؔ
جیسے وہ گلے لگائیں ہنس کر

○

ہم سجدہ بھی اُٹھا دی ہم نے
عظمتِ عشق بڑھا دی ہم نے

جب کوئی تازہ شگوفہ پھوٹا
کی گلستاں میں منادی ہم نے

جب چمن میں نہ کہیں چین ملا
بابِ زنداں پہ صدا دی ہم نے

آخ صیاد کے گھر تک پہنچی
اتنی شعلوں کو ہوا دی ہم نے

خونِ دل سے در و خانہ پر
تیری تصویر بنا دی ہم نے

دل کو آنے لگا بسنے کا خیال
آگ جب گھر کو لگا دی ہم نے

جگن ناتھ آزاد

جو دل کا راز لبِ آہ و فغاں کہنا ہی پڑتا ہے
تو پھر اپنے قفس کو آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے

تجھے اے طائرِ شاخِ نشیمن کیا خبر اس کی
کبھی صیاد کو بھی باغباں کہنا ہی پڑتا ہے

یہ دنیا ہے یہاں ہر کام چلتا ہے سلیقے سے
یہاں پتھر کو بھی لعلِ گراں کہنا ہی پڑتا ہے

بہ فیضِ مصلحت ایسا بھی ہوتا ہے زمانے میں
کہ رہزن کو امیرِ کارواں کہنا ہی پڑتا ہے

زبانوں پر دلوں کی بات جب ہم لا نہیں سکتے
جفا کو پھر وفا کی داستاں کہنا ہی پڑتا ہے

نہ پوچھو کیا گذرتی ہے دلِ خوددار پر اکثر
کسی بے مہر کو جب مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

ممکن نہیں کہ بزمِ طرب پھر سجا سکوں
اب یہ بھی ہے بہت کہ تمہیں یاد آسکوں

یہ کیا طلسم ہے کہ تری جلوہ گاہ سے
نزدیک آسکوں نہ کہیں دور جاسکوں

ذوقِ نگاہ اور بہاروں کے درمیاں
پردے گرے ہیں وہ کہ نہ جن کو اٹھا سکوں

کس طرح کر سکو گے بہاروں کو مطمئن
اہلِ چمن جو میں بھی چمن میں نہ آسکوں

تیری حسیں فضا میں مرے آشنائے وطن
ایسا بھی ہے کوئی جسے اپنا بنا سکوں؟

آزاد سازِ دل پہ ہیں رقصاں وہ زمزمے
خود سن سکوں مگر نہ کسی کو سنا سکوں

عرش ملسیانی

○

یہ دورِ خرد ہے دورِ جنوں اس دور میں جینا مشکل ہے
اگور کی مے کے دھوکے میں زہراب کا پینا مشکل ہے

جب اہلِ جنوں چلتے تھے تو رکے سے کسی کے رُک نہ سکے
اب کیا کہیں اہلِ انسانیت جیتے ہیں تو سینا مشکل ہے

اس عہد کے گھونٹ سے مٹ جاتی تشنہ لبوں کی تشنہ لبی
گر طرفِ دنیا کے معدے یہ گھونٹ بھی پینا مشکل ہے

وہ شمع نہیں جو بجھ جائے آندھی کے ایک ہی جھونکے سے
بجھنے کا سلیقہ آساں ہے، جلنے کا قرینا مشکل ہے

کہنے کو رو کر ہی لیں گے دنیا والے سب زخم اپنے
جو زخم دلِ انساں پہ لگا، اس زخم کا سینا مشکل ہے

وہ مرد نہیں جو ڈر جائے ماحول کے خونیں منظر سے
اس حال میں جینا لازم ہے جس حال میں جینا مشکل ہے

ملنے کو ملے گا بالآخر اے عرشؔ سکونِ ساحل بھی
طوفانِ حوادث ہے لیکن بچ جائے سفینا، مشکل ہے

○

دلِ تنہا پہ سو بار تازگی آئی
مگر وہ یاد کہ جا کر نہ پھر کبھی آئی

چمن میں کون ہے پرسانِ حالِ شبنم کا
غریب روئی تو غنچوں کو بھی ہنسی آئی

نویدِ عیش سے بھی لطفِ عیش مل نہ سکا
اداسِ غم ہی میں آئی اگر خوشی آئی

کسی طرح بھی زمانے کو بس میں کر نہ سکے
نہ دوستی نہ ہمیں راس دشمنی آئی!

عجب تھا کہ غمِ دل شکست کھا جاتا
ہزار شکر ترے لطف میں کمی آئی!

زمانہ ہنستا ہے مجھ پہ ہزار بار ہنسے
تمہاری آنکھ میں لیکن یہ کیوں نمی آئی

دیئے جلائے امیدوں نے دل کے گرد بہت
کسی طرف سے نہ اس گھر میں روشنی آئی

ہزار دید پہ پابندیاں تھیں پردے تھے
نگاہِ شوق مگر ان کو دیکھ ہی آئی

ظہورِ نظر

○

حیات وقفِ غمِ روزگار کیوں کرتے
میں سوچتا ہوں کہ وہ مجھ سے پیار کیوں کرتے

نہ میری راہ میں تارے نہ میرے پاس چراغ
وہ میرے ساتھ سفر اختیار کیوں کرتے

نگاہ صرف بُلاوا نہیں کچھ اَور بھی ہے
یہ جانتے تو ترا اعتبار کیوں کرتے!

غمِ حیات میں ہوتا اگر نہ ہاتھ ترا!
تو ہم خرد میں جنوں کو شمار کیوں کرتے

کوئی تو بات ہے ورنہ جفاؤں کے بدلے
تجھے بُھلا کے ترا انتظار کیوں کرتے!

نظرؔ چمن میں اگر واقعی بہار آتی!
تو پھول خواہشِ ابرِ بہار کیوں کرتے

○

رو لیتے تھے ہنس لیتے تھے بس میں نہ تھا جب اپنا جی
تم نے ہمیں دیوانہ کہا ہے ایسی تو کوئی بات نہ تھی

اب یہ تمہارا کام کہ جانو ہم پروانے تھے یا دیپ
دن بیتا تو جلتے جلتے، جلتے جلتے رات کٹی

گلشن گلشن محفل محفل ایک ہی قصہ ایک ہی بات
ظالم دنیا، جابر دُنیا، جانے یہ کب بدلے گی

پلکے کتنے ہاتھ نہ جانے اُن کے میلے دامن پر
کل تک تھے ہم چاک گریباں اُنسے پُوچھے آج کوئی

ہم ہیں مشعل والے پہلے ہم سے دو دو ہاتھ کرو
پھر بکھرا لینا اندھیارا نگر نگر بستی بستی!

تم ہو آگ تو ہم پانی ہیں تم ہو دھوپ تو ہم چھاؤں
اپنا تمہارا ساتھ ہی کیا ہے ہم پر جاتم راجہ جی

گلی گلی میں غم کے دیئے ڈگر ڈگر پہ راکھ کے ڈھیر
جشن منانے والے یارو ایک نظر اس جانب بھی!

ضیاؔ جالندھری

○

چھیڑی بھی جو رسم و راہ کی بات
وہ سُن نہ سکے نگاہ کی بات

ہر لمحہ بدل رہے ہیں حالات
مجھ سے نہ کرو نباہ کی بات

کہتے ہیں تری مژہ کے تارے
خود میری شبِ سیاہ کی بات

اب ہے وُہ نگہ نہ وُہ تبسم
کچھ اور تھی گاہ گاہ کی بات

کیا یاد نہ آئے گا یہ انجام!
کس دل سے کریں گے چاہ کی بات

○

کیا سروکار اب کسی سے مجھے
واسطہ تھا تو تھا تجھی سے مجھے

بے حسی کا بھی اب نہیں احساس
کیا ہُوا تیری بے رُخی سے مجھے

موت کی آرزُو بھی کر دیکھوں
کیا امیدیں تھیں زندگی سے مجھے

پھر کسی پر نہ اعتبار آئے
یوں اُتارو نہ اپنے جی سے مجھے

تیرا غم بھی نہ ہو تو کیا جینا
کچھ تسلّی ہے درد ہی سے مجھے

کتنا پُرکار ہو گیا ہُوں کہ تھا
واسطہ تیری سادگی سے مجھے

کر گئے کس قدر تباہ ضیاؔ
دشمن، انداز دوستی سے مجھے

احمد ریاضؔ

○

بہ وصفِ شوق بھی دل کا کہا نہیں کرتے
فروغِ قامت و رُخ کی ثنا نہیں کرتے

شکستِ عہدِ ستم پر یقین رکھتے ہیں
ہم انتہائے ستم کا گِلا نہیں کرتے

کچھ اس طرح سے لُٹی ہے متاعِ دیدہ و دل
کہ اب کسی سے بھی ذکرِ وفا نہیں کرتے

اسی لئے ہیں سزاوارِ جورِ برقِ ستم
کہ حقِ خدمتِ گلچیں ادا نہیں کرتے

مذاقِ کوہ کنی ہو کہ دشت پیمائی
جنہیں تمہاری طلب ہو وہ کیا نہیں کرتے

وہ آشنائے غمِ کائنات کیا ہوں گے
جو خود کو آپ کا دردآشنا نہیں کرتے

غمِ حبیب، غمِ زندگی، غمِ دوراں
کسی مقام پہ ہم جی بُرا نہیں کرتے

○

کیا کیا محبتوں کے زمانے بدل گئے
اب تم کبھی ملے ہو تو آنسو نکل گئے

فرطِ غمِ حوادثِ دوراں کے باوجود
جب بھی ترے دیار سے گذرے مچل گئے

مَیں نکتہ چیں نہیں ہُوں مگر یہ بتلیئے
وہ کون تھے جو ہنس کے گلوں کو مسل گئے

کچھ دستِ گلفروش میں سنولا کے رہ گئے
کچھ باغباں کی برق نوازی سے جل گئے

تم نے ہمیں فریبِ قیادت دیا تو ہے؟
لیکن کبھی ہُوا ہے کہ طوفان ٹل گئے

اِک وُہ بھی تھے جو بہ گئے موجوں کے ساتھ ساتھ
اِک ہم بھی ہیں جو کھا کے تھپیڑے سنبھل گئے

احمد راہی

○

غمِ حیات میں کوئی کمی نہیں آئی
نظر فریب تھی تیری جمال آرائی

وہ داستاں جو تری دلکشی نے چھیڑی تھی
ہزار بار مری سادگی نے دُہرائی

فسانۂ غمِ ہستی مری چشمِ حیراں کے
تماشا بنتے رہے ہیں یہاں تماشائی

تری وفا، تری مجبوریاں بجا، لیکن
یہ موسمِ غمِ ہجراں، یہ سردیٔ تنہائی

کسی کے حسنِ تمنا کا پاس ہے ورنہ
مجھے خیالِ جہاں ہے نہ خوفِ رسوائی

میں سوچتا ہوں زمانے کا حال کیا ہوگا
اگر یہ اُلجھی ہوئی زلف تُو نے سُلجھائی

کہیں یہ اپنی محبت کی انتہا تو نہیں
بہت دنوں سے تری یاد بھی نہیں آئی

○

کبھی تری کبھی اپنی حیات کا غم ہے
ہر ایک رنگ میں ناکامیوں کا ماتم ہے

خیال تھا ترے پہلو میں کچھ سکوں ہوگا
مگر یہاں بھی وہی اضطرابِ پیہم ہے

مرے مذاقِ الم آشنا کا کیا ہوگا ؟
تری نگاہ میں شعلے ہیں اب نہ شبنم ہے

سحر سے رشتۂ امید باندھنے والے
چراغِ زیست کی لَو شام ہی سے مدھم ہے

یہ کس مقام پہ لے آئی زندگی راہی
کہ ہر قدم پہ عجب بے بسی کا عالم ہے

عارف عبد المتین

○

میری سوچ لرز اٹھی ہے دیکھ کے پیار کا یہ عالم
تیری آنکھوں سے ٹپکا ہے آنسو بن کر میرا غم

دل کو ناز ہے سلجھاؤ پر لیکن میں نے یہ دیکھا ہے
سلجھانے سے اور الجھا ہے تیری زلف کا ایک ایک خم

دن کے بولتے ہنگامے میں اکثر سویا رہتا ہے
کروٹ لیکر جاگ اٹھتا ہے رات کی چپ میں تیرا غم

ہجر کے سنولائے لمحوں میں اس بھی تنہا چھوڑ گئی
کس سے پوچھوں کون بتائے رات ہوئی ہے کتنی کم

تیری دھن میں تجھ سے بھی شاید آگے جا نکلا ہوں
تیرے پہلو میں بیٹھا ہوں پھر بھی آنکھیں ہیں پرنم

تیرا غم ہم دیوانوں کو کس عالم میں چھوڑ گیا
ایک زمانہ ہم سے خفا ہے ایک جہاں سے ہم برہم

○

ترے بازوؤں کا سہارا تو لے لوں مگر ان میں بھی بچ گئی ہے تھکن
میں صحرا سے بچ کر چمن میں تو آؤں پہ صحرا سے کچھ کم نہیں یہ چمن

میری زیست کی راہ تاریک تھی، چاند بن کر تم آئے تو روشن ہوئی
یہ راہ آج پھر تیرہ و تار ہے، غالباً چاند کو لگ گیا ہے گہن

ہر اک سمت ناگن کی صورت لپکتی ہوئی تیرگی سے ہراساں نہ ہو
عجب کیا کہ لو دے اٹھے میرے لمسِ فروزاں سے تیرا سلگتا بدن

ہے اشکوں سے بھیگی ہوئی مسکراہٹ مروت کا اعجاز ہے
غموں کی ہواؤں میں اڑتا ہوا دیکھ کر آ رہے ہیں کوئی پیرہن

فراقِ لب و زلف پر منحصر کم ہی پائی ہے اہلِ وفا کی تڑپ
تم آغوش کے تنگ حلقہ میں ہو، پھر بھی ہر لمحہ افزوں ہے دل کی جلن

شہرت بخاری

○

وہ پاس آئے، آس بنے اور پلٹ گئے
کہتے ہی پردے آنکھوں کے آگے سے ہٹ گئے

ہر باغ میں بہار ہوئی خیمہ زن، مگر
دامن کے ساتھ ساتھ یہاں دل بھی پھٹ گئے

ٹکرا ہوں کا لپکا کچھ ایسا پڑا کہ ہم
منزل قریب آئی تو رہبر سے کٹ گئے

دل دے کے اس طرح سے طبیعت سنبھل گئی
گویا تمام عمر کے جھگڑے نپٹ گئے

برسوں کے پیاسے دشت نوردوں سے پوچھئے
ان بادلوں کا پیار جو گھرتے ہی چھٹ گئے

بس میں رہیں نہ جب غم دوراں کی وسعتیں
ہم لوگ اپنے گوشۂ دل میں سمٹ گئے

شہرتؔ انہیں بھلانے کی کوشش جو کی کبھی
دامان دل سے سینکڑوں نقشے لپٹ گئے

○

ہم پی گئے سب، ہلے نہ لب تک
جی ہار گئے، نجوم شب تک

ہر چند گھٹائیں چھٹ گئی ہیں
پر دل پہ غبار سا ہے اب تک

خوش ہو نہ زمانہ میرے غم پر
آئے گا یہ دور جام سب تک

اشکوں نے فسانہ کر دیا ہے
وہ لفظ کہ آ سکا نہ لب تک

ہر غم کو اڑا دیا ہنسی میں
تم پیش نظر رہے ہو جب تک

مے خانے میں سر چھپائیں آؤ
وا ہو در کعبہ جانے کب تک

شہرتؔ کوئی اور بات چھیڑو
الٹیں وہ نقاب لطف جب تک

شہزاد احمد شہزاد

○

میری خاطر دیر نہ کرنا اور سفر کرتے جانا
لیکن پھوڑ کے جانے والو ایک نظر کرتے جانا

اتنا کہوں تنہی خاموشی کیسے رات گزر سکتی ہے
جاتے جاتے محفلِ دل کو زیر و زبر کرتے جانا

ہجر کی شب کے تارو! تم کو ڈوب تو جانا ہے لیکن
میرے دل پر کیا گزری ان کو تو خبر کرتے جانا

روتی آنکھیں یا ہنستے لب آپ ہی اک رسوائی ہیں
چپ چپ رہنا اور طوافِ راہگذر کرتے جانا

اور ذرا چمکا دینا یادوں کے بجھتے شعلوں کو
اے غمِ جاناں اے غمِ دوراں دل پہ اثر کرتے جانا

ہم سے درد کے ماروں کی مجبوری کیا مختاری کیا
جینا اور نہ مرنا لیکن عمر بسر کرتے جانا

کس کو خبر شہزاد کہ آنی آنکھوں میں کیسا جادو ہے
کہنا اور نہ سننا لیکن دل میں گھر کرتے جانا

○

کھلے جو پھول تو منہ چھپ گیا ستاروں کا
مثالِ ابر چلا کارواں بہاروں کا

نہ مجھ سے پوچھ شبِ ہجر دل پہ کیا گزری
یہ دیکھ حال ہے کیا میرے غمگساروں کا

نئی بہار ہنسے اک نیا چمن کھل جائے
سمجھ سکے کوئی مطلب اگر اشاروں کا

شبِ سیاہ کے لمحے گزار لینے دو
گھڑی گھڑی نہ کرو ذکر ماہ پاروں کا

دکھائی دیتی ہے اس طرح روپ رنگ کی بات
فضا میں رقص ہو جس طرح ابر پاروں کا

ہوا نہ راہ میں حائل کوئی شگوفہ بھی
رواں دواں ہی رہا قافلہ بہاروں کا

مجھے بھی اہلِ جہاں بھول جائینگے شہزاد
کسے خیال ہے ڈوبے ہوئے ستاروں کا

سلام مچھلی شہری

○

یہ ابر و باد یہ طوفاں، یہ اندھیری رات
اب ایک موڑ پہ آجا رفیقِ راہِ حیات

ہوا کے دوش پہ موجِ اجل خراماں ہے
مریضِ دہر پہ طاری ہیں نزع کے لمحات

حیات ایک تخیل نہیں حقیقت ہے
مجھے بتائی ہے آدم کے غم نے یہ بات

مرے رفیق، محبت کے دن بھی آئیں گے
وہی حسین سویرا وہی کنواری رات

وہی گلاب کے موسم وہی شراب کے دور
وہی شریر گھٹائیں، وہی بھری برسات

سنائی جائے گی کوئل کو ہم نوا کر کے
حسین پھولوں کو بھنوروں کی ایک راز کی بات

غزل کی ڈال سجا کر چمن کی دلہن کو ——
سلام نذر کرے گا سہاگ کی سوغات

○

ہوا زمانے کی ساقی بدل تو سکتی ہے
حیات ساغرِ رنگیں میں ڈھل تو سکتی ہے

بس اک لطیف تبسم بس اک حسین نظر
مریضِ دل کی یہ حالت سنبھل تو سکتی ہے

جہاں سے چھوڑ رہے ہو مجھے اندھیرے میں
وہیں سے راہِ محبت نکل تو سکتی ہے

پھر اپنے غنچۂ زخمِ جگر کا کیا ہوگا
نسیمِ صبح مری سمت چل تو سکتی ہے

تری نگاہِ کرم کی قسم، ہے اب بھی مجھے
یہی یقین کہ دنیا بدل تو سکتی ہے

سلام! جام و سبو کی یہ شاعری معلوم
وگرنہ اپنی طبیعت بہل تو سکتی ہے!

شاعر لکھنوی

○

آنسو شعلوں میں ڈھل رہے ہیں
غم دل کی فضا بدل رہے ہیں

گلشن ہے انہیں کا گل انہیں کے
کانٹوں پہ جو ہنس کے چل رہے ہیں

ایک ایک نفس میں روشنی ہے
یادوں کے چراغ جل رہے ہیں

چپ چپ سی ہے تلخیٔ زمانہ
غم جام و سبو میں ڈھل رہے ہیں

مٹ مٹ کے اُبھر رہی ہے دنیا
بجھ بجھ کے چراغ جل رہے ہیں

اللہ رے اعتبارِ ہستی
ہم خواب میں جیسے چل رہے ہیں

اس سمت بھی گردشِ زمانہ!
کچھ لوگ ابھی سنبھل رہے ہیں

ساحل پہ انہیں کا حق ہے شاعرؔ
طوفاں کا جو رُخ بدل رہے ہیں

○

جو غمِ حبیب سے دُور تھے وہ خود اپنی آگ میں جل گئے
جو غمِ حبیب کو پا گئے وہ غموں سے ہنس کے نکل گئے

جو تھکے تھکے سے تھے حوصلے وہ شباب بن کے مچل گئے
جو نظر نظر سے گلے ملی تو بجھے چراغ بھی جل گئے

نہ خزاں میں ہے کوئی تیرگی نہ بہار میں کوئی روشنی
یہ نظر نظر کے چراغ ہیں کہیں بجھ گئے کہیں جل گئے

غمِ عیش یاس و امید کا نہ اثر حیات پہ ہو سکا
مری رُوحِ عشق وہی رہی یہ لباس تھے جو بدل گئے

نہ ہے شاعرا غمِ نو بہ نو نہ وہ داغِ دل نہ وہ تازگی!
جنہیں اعتمادِ بہار تھا وہی پھول رنگ بدل گئے

جعفر طاہر

○

کوئے حرم سے نکلی ہے کوئے بتاں کی راہ
ہائے کہاں پہ آکے ملی ہے کہاں کی راہ

صد آسمان امن و صد کہکشاں بدوش
بام بلند یار ترے آستاں کی راہ

ملک عدم میں قافلۂ عمر جا بسا
ہم دیکھتے ہی رہ گئے اس بے نشاں کی راہ

لٹتا رہا ہے ذوقِ نظر گام گام پر
اب کیا رہا ہے پاس جو ہم لیں وہاں کی راہ

اے زلفِ خم بخم تجھے اپنا ہی واسطہ
ہموار ہونے پائے نہ عمرِ رواں کی راہ

گلہائے رنگ رنگ ہیں افکارِ نو بہ نو
یہ رہگزارِ شعر ہے کس گلستاں کی راہ

ظاہر یہ منزلیں، یہ مقامات، یہ حرم
اللہ رے یہ راہ، یہ کوئے بتاں کی راہ

○

عرصۂ ظلمتِ حیات کٹے
ہم نفس مسکرا کہ رات کٹے

ثمرِ آرزو کا ذکر نہ چھیڑ
چھونے پائے نہ تھے کہ ہات کٹے

کاش ہر زلف تیغ بن جائے
کاش زنجیرِ حادثات کٹے

اے بقائے دوام کے مالک
کس طرح عمرِ بے ثبات کٹے

آدمی جستجوئے راہ میں ہے
تجھ کو ضد ہے رہِ نجات کٹے

شبِ خلوت سخن سخن کی داد
اور سرِ بزم بات بات کٹے

شاعر لکھنوی

○

آنسو شعلوں میں ڈھل رہے ہیں
غم دل کی فضا بدل رہے ہیں

گلشن ہے انہیں کا گل انہیں کے
کانٹوں پہ جو ہنس کے جا رہے ہیں

ایک ایک نفس میں روشنی ہے
یادوں کے چراغ جل رہے ہیں

چپ چپ سی ہے [illegible]

[illegible]

[illegible] رہے ہیں

اور تو کیا تھا انہیں اپنا سمجھنے کے سوا
وہ بھی اب عشق کی غیرت کو گوارا نہ رہا

چھن گئی آخری امید بھی دل سے شاعرؔ
یہ سہارا ہے کہ اب کوئی سہارا نہ رہا

ساغرِ بادۂ گل رنگ تو کچھ دُور نہیں
نگہِ پیرِ خرابات سے ڈر لگتا ہے

دل پہ کھائی ہوئی اک چوٹ اُبھر آتی ہے
تیرے دیوانے کو برسات سے ڈر لگتا ہے

اے دل! افسانۂ آغازِ وفا رہنے دے
مجھ کو بیتے ہوئے لمحات سے ڈر لگتا ہے

ہاتھ سے ضبط کا دامن نہ کہیں چھُٹ جائے
آپ کی پرسشِ حالات سے ڈر لگتا ہے

میں جو اُس بزم میں جاتا نہیں شاعرؔ مجھ کو
اپنے سہمے ہوئے جذبات سے ڈر لگتا ہے

...ہ تو یہ زندگی پھر بھی
...ہی
...ہے کوئی بات کہ جیتا ہے آدمی پھر بھی
...ں تک گردشِ زمیں تک ہے
...یہ رات جو ہم سے نہ کٹ سکی پھر بھی
...ں سازش ہے
...کلی ہے مگر محوِ خواب سی پھر بھی
...گماں یہ ہوتا ہے
...جیسے رہ گئی باقی کوئی کمی پھر بھی
...ہیں کشتۂ شب
...ہیں پیشروِ صبحِ روشنی پھر بھی
...ہمہ بہار تو ہے
...یہ اور بات کہ آنکھیں ہیں شبنمی پھر بھی

○

بہت تلخ ہیں زندگی کے فسانے
مرے خواب ہیں پھر بھی کتنے سہانے

سہارا نہ دیتی اگر موجِ طوفاں
ڈبو ہی دیا تھا ہمیں ناخدا نے

سحر کو تو آنا ہے آکر رہے گی
کٹے کیسے لیکن یہ شب کون جانے

گری اور گرتی رہی برقِ سوزاں
بنے اور بنتے رہے آشیانے

ستاروں سے آگے بہت کچھ ہے مانا
زمیں پہ بھی جینے کے ہوں کچھ بہانے

کلیم آج کیا سوچ کر ہو گئے چپ
ارے آ گئے یاد کب کے زمانے

حبیب اشعر

○

دل کے ہاتھوں کہیں دُنیا میں گذارا نہ رہا
ہم کسی کے نہ رہے، کوئی ہمارا نہ رہا

صبر اے دل! کہ یہ حالت نہیں دیکھی جاتی
ٹھہر، اے درد! کہ اب ضبط کا یارا نہ رہا

یوں تو اب بھی ہے وہی رنج وہی محرومی
وہ جو اک تیری طرف سے تھا اشارا نہ رہا

اور تو کیا تھا انہیں اپنا سمجھنے کے سوا
وہ بھی اب عشق کی غیرت کو گوارا نہ رہا

چھن گئی آخری امید بھی دل سے اشعر
یہ سہارا ہے کہ اب کوئی سہارا نہ رہا

○

بے نیازی سے، مدارات سے ڈر لگتا ہے
جانے کیا بات ہے ہر بات سے ڈر لگتا ہے

ساغر بادۂ گل رنگ تو کچھ دُور نہیں
نگہِ پیرِ خرابات سے ڈر لگتا ہے

دل پہ کھائی ہوئی اک چوٹ اُبھر آتی ہے
تیرے دیوانے کو برسات سے ڈر لگتا ہے

اے دل! افسانۂ آغازِ وفا رہنے دے
مجھ کو بیتے ہوئے لمحات سے ڈر لگتا ہے

ہاتھ سے ضبط کا دامن نہ کہیں چھُٹ جائے
آپ کی پرسشِ حالات سے ڈر لگتا ہے

میں جو اُس بزم میں جاتا نہیں اشعر مجھ کو
اپنے سہمے ہوئے جذبات سے ڈر لگتا ہے

مکین احسن کلیم

○

حیات مجھ پہ اک الزام ہی سہی پھر بھی
بہت عزیز ہے مجھ کو یہ زندگی پھر بھی

نہیں کچھ اور تو ممکن تھی خودکشی پھر بھی
ہے کوئی بات کہ جیتا ہے آدمی پھر بھی

یہ تیرگی تو بس اک گردشِ زمیں تک ہے
مگر یہ رات جو ہم سے نہ کٹ سکی پھر بھی

چمن اُٹھا ہے خود اہلِ چمن کی سازش سے
کلی کلی ہے مگر محوِ خواب سی پھر بھی

کسی کو پا کے بھی اکثر گماں یہ ہوتا ہے
کہ جیسے رہ گئی باقی کوئی کمی پھر بھی

ہمیں پہ یورشِ ظلمت ہمیں ہیں کشتۂ شب
ہمیں ہیں پیشروِ صبحِ روشنی پھر بھی

کلیمؔ پہ اب نغمۂ بہار تو ہے
یہ اور بات کہ آنکھیں ہیں شبنمی پھر بھی

○

بہت تلخ ہیں زندگی کے فسانے
مرے خواب ہیں پھر بھی کتنے سہانے

سہارا نہ دیتی اگر موجِ طوفاں
ڈبو ہی دیا تھا ہمیں ناخدا نے

سحر کو تو آنا ہے آکر رہے گی
کٹے کیسے لیکن یہ شب کون جانے

گری اور گرتی رہی برقِ سوزاں
بنے اور بنتے رہے آشیانے

ستاروں سے آگے بہت کچھ ہے مانا
زمیں پہ بھی جینے کے ہوں کچھ بہانے

کلیمؔ آج کیا سوچ کر ہو گئے چپ
ارے آ گئے یاد کب کے زمانے

سلیم احمد

ترکِ ان سے رسم و راہِ ملاقات ہوگئی
یوں مل گئے کہیں تو کوئی بات ہوگئی

دل تھا اُداس عالمِ غربت کی شام تھی
کیا وقت تھا کہ تم سے ملاقات ہوگئی

یہ دشتِ بے دلیل یہ منزل کی دُھن یہ شوق
یہ بھی خبر نہیں کہ کہاں رات ہوگئی

رسم جہاں نہ چھوٹ سکی ترکِ عشق سے
جب مل گئے تو پرسشِ حالات ہوگئی

خوبو رہی سہی تھی، جو مجھ میں خلوص کی
اب وہ بھی نذرِ رسمِ عنایات ہوگئی

دلچسپ ہے سلیم، حکایت تری مگر
اب سو بھی جا کہ یار! بہت رات ہوگئی

○

ملنے تو کس کی دیوانہ مانے
جتنی زبانیں اُتنے فسانے

انداز اس کا، احوال میرا
کچھ میں نہ سمجھوں کچھ وہ نہ جانے

اللہ رے یہ خود اعتمادی
میں اب چلا ہوں اُن کو بُلانے

گم کردہ رہ کیا سوچتا ہے
چھوڑ آیا پیچھے کتنے ٹھکانے

میری وفا کا وہ معترف ہے
اپنی خطا کو مانے نہ مانے

چاہو تو آؤ چاہو نہ آؤ
دونوں کے یکساں حیلے بہانے

کچھ میرے غم سے نسبت ہے اُن کو
یاد آرہے ہیں کتنے فسانے

کیا ہے سلیم ان باتوں کا حاصل
کس کو چلا ہے تو آزمانے

نور بجنوری

○

ان گھٹاؤں میں اُجالے کا بسیرا ہی سہی
خیر اگر آپ بضد ہیں تو سویرا ہی سہی

اے غمِ زیست بلاتی ہیں مہکتی زُلفیں
آج کی رات یہ پُرنور اندھیرا ہی سہی

دل میں جو آگ لگی ہے وہ کہاں بجھتی ہے
راہ شاداب سہی ابر گھنیرا ہی سہی

ہوشیار اہلِ خرد خاک نشیں آ پہنچے
آپ کے زعم کا افلاک پہ ڈیرا ہی سہی

تو پریشان نہ ہو خالقِ فردوسِ بریں
یہ جہنم یہ جہاں آج سے میرا ہی سہی

کتنی یادیں ہیں کہ ناگن کی طرح ڈستی ہیں
نورؔ ان گیسوں کا اک آخری پھیرا ہی سہی

○

میری دُنیا سنگ و آہن ان کی دُنیا چاند ستارے
عقل کہاں تک دامن کھینچے عشق کہاں تک ہاتھ پسارے

اپنی اپنی دھن میں مگن ہیں شاموں صبحوں کے متوالے
صبح کے آنسو کون سکھائے رات کے گیسو کون سنوارے

آبلہ پا رہگیروں کو جھرنوں سے دل بہلانے بھی دے
عزم جواں کو اور جواں کر اپنی منزل دُور ہے پیارے

چھم چھم چھم چھم ناچتی موجیں یہ سرگوشی کرتی جائیں
طوفانوں کی راہ تکیں گے کب تک یہ مجبور کنارے

نورؔ عقیدوں کے شعلوں میں رُوحیں جلتی دیکھ چکی ہیں
تم ہی بتاؤ ان آنکھوں سے آنسو ٹپکیں یا انگارے

اصغر سلیم

○

غبار سا ہے سرِ شاخسار کہتے ہیں
چلا ہے قافلۂ نوبہار کہتے ہیں

بدل گئی ہیں جہانِ وفا کی سب رسمیں
اُجڑ گئے ہیں دلوں کے دیار کہتے ہیں

اِس ایک بات سے گلیوں کا دل دھڑکتا ہے
کہ ہم صبا سے حدیثِ بہار کہتے ہیں

یہ ہجر ہے تو کسی مصلحت سے ہے ورنہ
فقیہہ شہر بھی ہے بادہ خوار، کہتے ہیں

جسے کبھی سرِ منبر نہ کہہ سکا واعظ
وہ بات اہلِ جنوں زیرِ دار کہتے ہیں

سلیم سایۂ گُل ہو کہ سختیٔ زنداں
جنوں ہے شیوۂ مردانِ کار، کہتے ہیں

○

گلشن گلشن شعلۂ گُل کی، زلفِ صبا کی بات چلی
حرفِ جنوں کی، بندِ گراں کی، جرم و سزا کی بات چلی

زنداں زنداں شورِ جنوں ہے موسمِ گُل کے آنے سے
محفل محفل اب کے برس، اربابِ وفا کی بات چلی

عہدِ ستم ہے دیکھیں ہم آشفتہ سروں پر کیا گزرے
شہر میں اس کے بند قبا کی رنگِ حنا کی بات چلی

ایک ہُوا دیوانہ اِک نے سر تیشے سے پھوڑ لیا
کیسے کیسے لوگ تھے جن سے رسمِ وفا کی بات چلی

"ٹوٹ گئیں نغموں کی طنابیں شعر کے خیمے راکھ ہوئے"
بزمِ سخن میں جب بھی سلیم اس شعلہ نوا کی بات چلی

ساغر صدیقی

○

جھوم کر گاؤ! میں شرابی ہوں
رقص فرماؤ! میں شرابی ہوں

ایک سجدہ بنام مے خانہ
دوستو آؤ! میں شرابی ہوں

لوگ کہتے ہیں رات بیت چکی
مجھ کو سمجھاؤ! میں شرابی ہوں

آج ان ریشمی گھٹاؤں کو
یوں نہ بکھراؤ! میں شرابی ہوں

حادثے روز ہوتے رہتے ہیں
بھول بھی جاؤ! میں شرابی ہوں

مجھ پہ ظاہر ہے آپ کا باطن
منہ نہ کھلواؤ! میں شرابی ہوں

○

چراغِ طور جلاؤ! بڑا اندھیرا ہے
ذرا نقاب اٹھاؤ! بڑا اندھیرا ہے

وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں
اُنہیں کہیں سے بلاؤ! بڑا اندھیرا ہے

مجھے خود اپنی نگاہوں پہ اعتماد نہیں
مرے قریب نہ آؤ! بڑا اندھیرا ہے

فرازِ عرش سے ٹوٹا ہوا کوئی تارا
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ! بڑا اندھیرا ہے

ابھی تو صبح کے ماتھے کا رنگ کالا ہے
ابھی فریب نہ کھاؤ! بڑا اندھیرا ہے

بصیرتوں پہ اُجالوں کا خوف طاری ہے
مجھے یقین دلاؤ! بڑا اندھیرا ہے

جسے زبانِ خرد میں شراب کہتے ہیں
وہ روشنی سی پلاؤ! بڑا اندھیرا ہے

بنامِ زہرہ جبینانِ خطۂ فردوس
کسی کرن کو جگاؤ! بڑا اندھیرا ہے

عظیم مرتضیٰ

○

کچھ بھی ہو مرا حال نمایاں تو نہیں ہے
دل چاک سہی خیر، گریباں تو نہیں ہے

حسنِ طلب برق ہے تعمیرِ نشیمن
ورنہ ہوسِ سیرِ گلستاں تو نہیں ہے

کچھ نقش تری یاد کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سر و ساماں سہی ویراں تو نہیں ہے

ہم درد کے مارے ہی گراں جاں ہیں وگرنہ
جینا تری فرقت میں کچھ آساں تو نہیں ہے

ٹوٹا تو عزیز اور ہوا اہلِ وفا کو
دل بھی کہیں اُس شوخ کا پیماں تو نہیں ہے

○

ترا خیال بھی ہے وضعِ غم کا پاس بھی ہے
مگر یہ بات کہ دنیا نظر شناس بھی ہے

بہارِ صبحِ ازل پھر گئی نگاہوں میں
وہی فضا ترے کوچہ کے آس پاس بھی ہے

جو ہو سکے تو چلے آؤ آج میری طرف
ملے بھی دیر ہوئی اور جی اُداس بھی ہے

خلوصِ نیت، رہ و رہرو پہ منحصر ہے عظیم
مقامِ عشق بہت دُور بھی ہے پاس بھی ہے

جمیل ملک

کون ہمارا درد بٹائے، کون ہمارا تھامے ہات
دن کے گھر میں جگ جگ اپنے دیس میں رات ہی رات

نیلے نیلے امبر پر وہ چاند ——— وہ کرنوں کی برسات
دونوں کھوئے کھوئے سے ہائے وہ مست منوہر گھات

زلفیں کھلیں ڈھلائے میں صحرا صحرا بھٹکوں!
دل کا یہ سودا ہے ورنہ تیرا اور میرا کیا سات

سب دنیا داری کی باتیں، دل میں اور زباں پہ اور
تجھ سے پیار بڑھا آخر جان گئے تیری اوقات

چاہے اب اس کو اپناؤ چاہے ناز سے ٹھکراؤ!
آج سے اپنا دخل نہیں ہے دل کی ڈور تمہارے ہات

دنیا کا منشا ہے پیارے ہم گھٹ گھٹ کر مر جائیں!
دل کی دھڑکن یہ کہتی ہے اک دن بدلیں گے حالات

ایک نظر کی بھیک لے سے میں نے سب کے دل بہلائے ہیں
دنیا کو یہ وہم کہ میرے ہونٹوں پر ہے اپنی بات

یہ منظر یہ روپ انوکھے سب شہکار تمہارے ہیں
ہم نے اپنے خونِ جگر سے کیا کیا نقش ابھارے ہیں

صدیوں کے دل کی دھڑکن ہے انکی جاگتی آنکھوں میں
یہ جو فلک پر ہنس مکھ چنچل جگ جگ تارے ہیں!

ایک ذرا سی بھول پہ ہم کو اتنا تو بدنام نہ کر
ہم نے اپنے گھاؤ چھپا کر تیرے کاج سنوارے ہیں

کچھ باتیں، کچھ راتیں، کچھ برساتیں اپنا سرمایہ
ماضی کے اندیارے ہیں جگ بیتے دیپ ہمارے ہیں

ایک جہاں کی کھوج میں اپنے پیار کی نگری چھوڑ آئے
اور زمانہ یہ سمجھا، ہم پیار کی بازی ہارے ہیں

سب سے ہنس کر ملنے والے ہم کو کسی سے بیر نہیں
دنیا ہے محبوب ہمیں اور ہم دنیا کو پیارے ہیں

غزلِ جدید

ہری چند اختر

○

شباب آیا کسی بُت پر فدا ہونے کا وقت آیا
مری دنیا میں بندے کے خدا ہونے کا وقت آیا

اُسے دیکھا تو زاہد نے کہا ایمان کی یہ ہے
کہ اب انسان کو سجدہ روا ہونے کا وقت آیا

تکلم کی خموشی کہہ رہی ہے صرفِ مطلب سے
کہ اشک آمیز نظروں سے ادا ہونے کا وقت آیا

ہمیں بھی آپڑا ہے دوستوں سے کام کچھ یعنی
ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آیا

نوید سربلندی دی منجم نے تو میں سمجھا
کہ اب دہر کے آگے دوتا ہونے کا وقت آیا

شعری بھوپالی

○

غضب ہے جستجوئے دل کا یہ انجام ہو جائے
کہ منزل دور ہو اور راستے میں شام ہو جائے

وہی نالہ، وہی نغمہ، بس اک تفسیرِ لفظی ہے
قفس کو منتشر کر دو نشیمن نام ہو جائے

تصدق عصمتِ کونین اس مجذوبِ اُلفت پر
جو اُن کا غم چھپائے اور خود بدنام ہو جائے

یہ عالم ہو تو اُن کو بے حجابی کی ضرورت کیا
نقاب اُٹھنے نہ پائے اور جلوہ عام ہو جائے

یہ میرا فیصلہ ہے آپ میرے ہو نہیں سکتے
میں جب جانوں کہ یہ جذبہ مرا ناکام ہو جائے

ابھی تو دل میں ہلکی سی خلش محسوس ہوتی ہے
بہت ممکن ہے کل اس کا محبت نام ہو جائے

اسد ملتانی

○

رہیں نہ رند یہ واعظ کے بس کی بات نہیں
تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں

ہیں کچھ طیور فضائے چمن کے زندانی
فقط اسیرئ دام و قفس کی بات نہیں

نگاہ بھی نہیں اٹھتی بلندیوں کی طرف
طلب کا ذکر نہیں دسترس کی بات نہیں

نگاہِ دوست سے ہوتی ہے دل کی نشو و نما
یہاں مقابلۂ برق و خس کی بات نہیں

عجب نہیں جو محبت ہو زیبِ جاوید
کہ عرضِ شوق نفس دو نفس کی بات نہیں

پسندِ خاطرِ اہلِ صفا ہے میری غزل
کہ اس میں کوئی ہوا و ہوس کی بات نہیں

اسدؔ یہ کام ہے صد گونہ سینہ کاوی کا
حیات صرف شمارِ نفس کی بات نہیں

کشفی ملتانی

○

دل دل ہی رہیگا، گل تر ہو نہیں سکتا
خوں ہو کے بھی منظورِ نظر ہو نہیں سکتا

ہو ظلم کیا تو نے، کیا بے جگری سے
ایسا تو کسی کا بھی جگر ہو نہیں سکتا

تھک تھک کے تری راہ میں یوں بیٹھ گیا ہوں
گویا کہ بس اب مجھ سے سفر ہو نہیں سکتا

اظہارِ محبت مرے آنسو ہی کریں گے
اظہار بہ اندازِ دگر ہو نہیں سکتا

ہر بوند لہو کی کبھی بنتی نہیں آنسو
جیسے کہ ہر اک قطرہ گہر ہو نہیں سکتا

یہ عہدِ جوانی بھی ہے کچھ ایسا زمانہ
بے بادہ سرِ جوش بسر ہو نہیں سکتا

لے جائے گا یہ دل مجھے اس بزم میں آخر
جس میں کہ صبا کا بھی گذر ہو نہیں سکتا

جب تک تری رحمت کا ہے کشفی کو سہارا
سچ یہ ہے گناہوں سے حذر ہو نہیں سکتا

عشرت رحمانی

○

دل ہی نہیں تو دل کے سہاروں کو کیا کروں
جب پاس تم نہیں تو بہاروں کو کیا کروں

جلووں سے جن کے چاند ستاروں میں تھی ضیا
اب وہ ہنسی نہیں تو ستاروں کو کیا کروں

تصویر اور تصورِ جاناں یہ سب فریب،
میں اُن سے دُور اُنکے نظاروں کو کیا کروں

وہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ رنگ و بُو
گذری ہوئی حسین بہاروں کو کیا کروں

خوابوں کے نُور چھین لیا اے خیالِ یار
تیرے بغیر ایسے اشاروں کو کیا کروں

دل ہے خزاں نصیب گلستاں ہے پُر بہار
عشرت بھلا میں ایسے نظاروں کو کیا کروں

شوکت تھانوی

○

ہو راہزن کی ہدایت کہ راہبر کے فریب
مری نگاہ نے کھائے نظر نظر کے فریب

یہ بتکدے، یہ کلیسا، یہ سجدیں یہ حرم
یہ سب فریب ہیں او ایک سنگِ در کے فریب

سمجھ رہے تھے کہ اشکوں سے ہوگا دل ہلکا
نہ جانتے تھے کہ ہیں یہ بھی چشمِ تر کے فریب

پتہ چلا کہ ہر اک گام میں تھی اک منزل
کھلے ہیں منزلِ مقصود پہ سفر کے فریب

ان ہی کا نام محبت ان ہی کا نام جنوں
مری نگاہ کے دھوکے تری نظر کے فریب

وحید قریشی

○

غم کے ہاتھوں (شکرِ خدا ہے) عشق کا چرچا عام نہیں
گلی گلی پتھر پڑتے ہوں ہم ایسے بدنام نہیں

وہ بھی کیا دن تھے جن روزوں بیکاری میں سوتے تھے
اب کیسی اُفتاد پڑی ہے چین نہیں آرام نہیں

دل کے اُبٹتے ہی آنکھوں نے حیف یہ عالم دیکھ لیا
جلوہ سر رہ کوئی نہیں ہے کوئی روئے بام نہیں

جس کے اثر سے بیخود ہو کر اپنے تئیں ہم رسوا ہوں
موجِ مئے گل کے ہاتھوں میں ایسا کوئی جام نہیں

دل کا رونا، دل کا کھونا، لاکھ عذابِ الیم سہی
ہمت ہار کے بیٹھ ہی جائیں ہم ایسے ناکام نہیں

خلیل الرحمٰن اعظمی

○

گلی گلی کی ٹھوکر کھائی کس سے خوار و پریشاں ہیں
یاں اپنا ہی ہوش نہیں ہے کس کو چاہے کس سے

فرصت ہو تو آ کر دیکھو ہم آوارہ گردوں کو
کتنے غبار ہیں اس دامن میں کتنے دل میں طوفاں

سر جھکا اس شوخ کے آگے اور کہیں پھر جھک نہ سکا
مسلک مہر و وفا میں واعظ ہم کافر ہی مسلماں

کچھ تو مداوا کرنا ہوگا اس آشفتہ مزاجی کا
اے غمِ جاناں اپنے پائے سب ہی تجھ سے نالاں

وادی و محرا پھوٹ کے جب سے تیرے شہر میں آن بسے
جنگل جنگل ڈھونڈتے پھرتے ہم کو سارے عزیز

ہم نے اپنی طرف سے خوباں کب تم کو بدنام کیا
تم نے جو داغ دئے ہیں وہ چھپاتی پہ نمایاں

اہلِ زمانہ کو بس میری اک رسوائی یاد رہی
ورنہ میری وفا کے بجانے کتنے اور بھی عنواں

ورنہ رہا کچھ موجِ بلا کا رخ بھی پھر اونچا کی ہوا کا
روٹا کیا ہے دکھ ساگر کا، اس کے ہم پر احساں

خیر سے اب کے اہلِ چمن کو دیوانوں سے کام پڑا ہے
دیکھی کتنی زنجیریں ہیں دیکھیں کتنے زندان

جو پامال خزاں ہیں اک دن نکلیں گے پھر انکھیں گے
اُن کا شہر نہ جانے کیا ہو جو مقتول بہاراں

اک اک بوند جلی ہے لہو کی تب جا کر یہ رات کٹی
تیرے لئے اے صبحِ طرب ہم کب سے چاک گریباں

میر کا طرز اپنایا سب نے لیکن یہ انداز کہاں
اعظمی صاحب آپ کی غزلیں سن سن کر سب حیراں ہیں

شاد

بریشہ کمار

○

شام وعدہ کا ڈھل گیا سایا
آنے والا ابھی نہیں آیا

زندگی کے غموں کو اپنا کر
ہم نے دراصل تجھ کو اپنایا

جستجو ہی دلوں کی منزل تھی
ہم نے کھو کر تجھے، تجھے پایا

زندگی نام ہے جدائی کا
تب تو نے تو مجھ کو یاد آیا

ہم نے تیری جفا کے پردے میں
خود بھی دل پہ بہت ستم ڈھایا

زندگی سے تو خیر شکوہ تھا،
ہاتھوں موت نے بھی ترسایا

شاد اہلِ طرب کو بھی اکثر
میری افسردگی پہ پیار آیا

حزیں

شعیب احمد

○

یوں غرق تھا ان جلووں میں حزیں نظریں بھی اٹھانا بھول گیا
خود بینِ فسانہ بن تو گیا، عنوانِ فسانہ بھول گیا

مانا وہ نگاہیں بجلی تھیں، مانا وہ تبسم شعلہ تھا
دل برق کی زد پہ خود آیا، یہ بات زمانہ بھول گیا

وہ برق گرانے والا بھی خود اس کی تلافی کر نہ سکا
دامن کی ہوائیں کیا کہتیں دل ہوش میں آنا بھول گیا

ہونٹوں پہ تبسم کی بجلی، آنکھوں میں تجلی کے طوفاں
اس طرح وہ آئے محفل میں نظریں جھکانا بھول گیا

نخشب جارچوی

کوئی کس طرح رازِ اُلفت چھپائے
نگاہیں ملیں اور قدم ڈگمگائے

وہ مجبوریوں پر مری مُسکرائے
یہاں تک تو پہنچے یہاں تک تو آئے

محبت میں کچھ اتفاقات بھی تھے
کہ جو میری تقدیر بننے نہ پائے

ترا غم بھلا کیا چھپائے سے چھپتا
بہت اشک روکے بہت مُسکرائے

وہ اس طرح میرے برابر سے گذرے
ادائیں سنبھالے نگاہیں جھکائے

زمانے کے جور و ستم توبہ توبہ
کہ اکثر تو مجھ کو نہ تم یاد آئے

ترے رُوبرو گر نظر مُطمئن ہو
تو سینے میں دل بھی دھڑکنے نہ پائے

مَیں اِس احتیاطِ نظر کے تصدق
نہ بیگانہ سمجھے نہ اپنا بنائے

یہی تو جوابِ شکایت تھا نخشب
مرے شعر اُس نے بھی کچھ گنگنائے

کیفؔ

حکیم ہاشم جان

○

منزل ہے سفر میں مری یا مَیں ہُوں سفر میں
اتنا بھی نہیں ہوش تری راہ گذر میں

حسرت ہے اب اتنی دلِ شوریدہ اثر میں
مَیں اُن کی نظر میں رہوں وُہ میری نظر میں

کیا کیا نہ دکھائی تری رفتار نے شوخی
پس پس گئے فتنے بھی تری راہ گذر میں

تم چھُپ نہیں سکتے، کہیں تم جا نہیں سکتے
تم میرے تخیل میں ہو تم میری نظر میں

ہر قافلے والے سے نہ تھی رسم بڑھانی
ملتا تھا مسافر کی طرح کیفؔ سفر میں

حمید نسیم

بہت بادہ ہے منزل نہیں ہے
یہ شکل آسمانی مشکل نہیں ہے

دلِ رہرو میں ہیں کچھ اور خطرے
خیالِ کوہ و دریا منزل نہیں ہے

غرورِ باطل خود پہ ناز باطل
مگر میرا جنوں باطل نہیں ہے

یہ دل بے مہر بھی ہے بے وفا بھی
نہیں یہ دل تو میرا دل نہیں ہے

ڈراتا ہے مجھے یوں خندۂ برق
مجھے اندیشۂ حاصل نہیں ہے

میں سب کچھ جانتا ہوں اپنا انجام
مرا ماضی کے قابل نہیں ہے

یہاں قعرِ دریا ہے سفینہ
نہیں اے ناخدا! ساحل نہیں ہے

یہاں مہر و وفا نادانیاں ہیں
یہ دنیا عشق کے قابل نہیں ہے

ہے مرحوم امیدوں کا مدفن
کبھی دل تھا مگر اب دل نہیں ہے

تابش دہلوی

ہو گا سکوں بھی ہوتے ہوتے
سو جاؤں گا روتے روتے

آخر دل ہے، ٹھہر جائے گا
شام و سحر کے ہوتے ہوتے

وحشت ناک ہے خوابِ ہستی
چونک پڑا ہوں سوتے سوتے

داغِ دلِ اشکوں سے مٹے گا
دھلتے دھلتے دھوتے دھوتے

آپ سے آپ ترے دیوانے
ہنس بھی دیئے ہیں روتے روتے

اختر ہوشیار پوری

پھر ابر برس کے کھل گیا ہے
مے خانے کا چہرہ دھل گیا ہے

ان گالوں میں عکس ہے شفق کا
یا رنگ نظر میں گھل گیا ہے

ہشیار غمِ جہاں! ادھر سے
اک پیکرِ کیف و مل گیا ہے

یہ تیرے بدن کی کسمساہٹ
پھولوں میں زمانہ تل گیا ہے

اُف تیری نظر کی بے نقابی
دامانِ حیات دھل گیا ہے

امسال تو دور دور اختر
افسانۂ بوئے گل گیا ہے!

اقبال صفی پوری

گزر گئی جو چمن پر وہ کوئی کیا جانے
چھڑے ہوئے ہیں بہار و خزاں کے افسانے

جہاں پہ چاک گریباں بھی چاکِ دل بن جائے
گزر رہے ہیں اب ان منزلوں سے دیوانے

مرے لبوں کا تبسم تو سب نے دیکھ لیا
جو دل پہ بیت رہی ہے وہ کوئی کیا جانے

ترے حضور جنہیں کہہ سکی نہ گویائی!!
مرے سکوت نے دہرا دئے وہ افسانے

نگاہِ عشق میں دیر و حرم کی قید نہیں
کہیں بھی شمع جلے، اڑ چلیں گے پروانے

تمام وسعتِ کونین کو ڈبو دیں گے!
چھلک گئے ہو کہیں اس نظر کے پیمانے

نہ اشتیاقِ نظارہ، نہ اعتبارِ جمال!
ٹھہر گئی ہے کہاں زندگی خدا جانے

نہ شمعِ بزم پہ کچھ آنچ آئے گی اقبال
خود اپنی آگ میں جلتے رہیں گے پروانے

خاطر غزنوی

جب اس زلف کی بات چلی
ڈھلتے ڈھلتے رات ڈھلی

پہلے بھی چلتی پھر بھی ہنسی
دیکھ کے سب حالات کلی

شمع کا بھی انجام نہ پوچھ
پروانوں کے ساتھ جلی

پہلے بھی تم دور رہے
اب کے بھی برسات چلی

ان آنکھوں نے لوٹ کے بھی
اپنے اوپر بات نہ لی

خاطر یہ ہے بازیٔ دل
اس میں جیت سے مات بھلی

احمد فراز

ہم بھی خود دشمنِ جاں تھے پہلے
تم مگر دوست کہاں تھے پہلے

اب وہاں خاک اڑاتی ہے خزاں
پھول ہی پھول جہاں تھے پہلے

اب جو دیوار بنے بیٹھے ہیں
صورتِ موجِ رواں تھے پہلے

کچھ شرابی کہ ہیں اب راہ نشیں
رونقِ بزمِ جہاں تھے پہلے

ہم کہ ہیں آج غبار پس کارواں
منزلِ ہم سفراں تھے پہلے

بن گیا قافلہ چلتے چلتے
ورنہ تنہا ہی رواں تھے پہلے

اب کسے وضعِ محبت کا خیال
اور ہی لوگ یہاں تھے پہلے

اب تو خود پر بھی نہیں زعمِ وفا
تم سے ہم شکوہ کناں تھے پہلے

دولتِ غم تو میسر تھی فراز
اتنے مفلس بھی کہاں تھے پہلے

فارغ بخاری

یہی ہے دورِ غمِ عاشقی تو کیا ہوگا
اسی طرح سے کٹی زندگی تو کیا ہوگا

ابھی تو ہم نفسوں کو ہے وہم چارہ گری
ہوئی نہ دور میں پھر بھی کمی تو کیا ہوگا

یہ تیرگی تو بہر حال چھٹ ہی جائے گی
نہ راس آئی ہمیں روشنی تو کیا ہوگا

امید ہے کہ کبھی تو لبوں پہ آئے گی
کبھی نہ آئی لبوں پر ہنسی تو کیا ہوگا

نفس نفس میں فغاں ہے، نظر نظر میں ہرس
کچھ اور دن یہی حالت رہی تو کیا ہوگا

رضا ہمدانی

یہ دورِ مسرت یہ تیور تمہارے
ابھرنے سے پہلے نہ ڈوبیں ستارے

بھنور سے لڑو تند لہروں سے الجھو
کہاں تک چلو گے کنارے کنارے

عجب چیز ہے یہ محبت کی بازی
جو ہارے وہ جیتے جو جیتے وہ ہارے

سیہ ناگنیں بن کے ڈستی ہیں کرنیں
کہاں کوئی یہ روز و شب گذارے

سفینے وہاں ڈوب کر ہی رہے ہیں
جہاں حوصلے ناخداؤں نے ہارے

کئی انقلابات آئے جہاں میں
مگر آج تک دن نہ بدلے ہمارے

رضا سیل نو کی خبر دے رہے ہیں
افق کو یہ چھوتے ہوئے تیز دھارے

سلیم واحد سلیم

صبح کی خندہ مزاجی کا مداوا کچھ تو ہو
دشت وحشت ہو کہ زندانِ تمنا کچھ تو ہو

کب تک یونہی رہیں گے اہلِ دل محرومِ دید
جرأتِ بے باک یا حسنِ تقاضا کچھ تو ہو

ایک ویرانے میں گم ہیں زندگی کی شورشیں
شورِ محشر یا سکوتِ حشر بپا کچھ تو ہو

اک کرن ہی تو نہیں غم کی اندھیری رات میں
کوئی جگنو، کوئی آنسو، کوئی تارا کچھ تو ہو

ہم تو دیوانے تھے بربادی مقدر میں ہی
ہوش والوں نے مگر اس در سے پایا کچھ تو ہو

صبح کے لمحوں سے گونج اٹھے بیابانِ امید
بول اٹھے یا سکوتِ شامِ صحرا کچھ تو ہو

ہم دلِ بیتاب کو بھی راہ پر لاتے سلیم
دل مگر راہِ وفا میں بھولا بھٹکا کچھ تو ہو

احمد ظفر

آپ کہیں تو گلشن ہے
ورنہ دل اک مدفن ہے

کیسے یہ دن رات کٹیں
ایک مسلسل الجھن ہے

آگ لگی ہے سانسوں میں
ہائے یہ کیسا ساون ہے

اُن سے میری بات نہ پوچھ
اُن سے میری اَن بن ہے

پنچھی پنچھی سہم گیا
دوست یہ اچھا گلشن ہے

تاریکی مٹ جائے گی
شمع مشعل روشن ہے

وقت کی ہر آواز ظفرؔ
میرے دل کی دھڑکن ہے

مینائے غزل

ماہ لقا

چندا بی بی

○

ر گانے غیروں کو سنو مت کرو
ت چلنا ایسے دیسوں سے دستور مت کرو

سوے ہمارے ہر گھڑی زاری نہیں ہے خوب
نہ یار عشق ہے اسے مشہور مت کرو

ر چند دل دکھانا کسی کا بُرا ہے پر
رنجیدہ خاطروں کو تو رنجور مت کرو

اے ہمدمو جو مجھ سے ہے منظور اختلاط
ہر ذکر یار تم کوئی مذکور مت کرو

روشن رکھو جہان میں مولا مثال مہر
چندا کے منہ سے نور کو تم دور مت کرو

○

شیشۂ دل کو دیا ہوں تیرے ہات
چور یا ثابت ہو رکھ تو اپنے سات

کعبۂ دل ہی سمجھ کر اپنا گھر
اے بتِ نامہرباں رہ ایک رات

انتظار آخر ہوا اے گلعذار
غنچۂ لب سے نہ کی پر تو نے بات

دو ہی دن ملنے میں تم گھبرا گئے
پھر خدا ہی جانے کب ہو ایسی گھات

روبرو چندا کے ہووے کیا عجب
مشتری و زہرہ و پروین کو مات

ادا جعفری (بدایونی)

○

فریب کاری تخئیل پہ جو اترائے
اب ایسے سرکش دناداں کو کون سمجھائے

ہزار غنچوں نے چاہا الگ تھلگ رہنا
جو کوئی شوخ کرن آپ ہی اُلجھ جائے

گرہ کشائی شبنم کی داد کیا دیں دل
ہنسی کے ساتھ ہی آنکھوں میں اشک بھر آئے

نگاہِ قہر کی گرمی کی تاب کیا لاتے
نگاہِ مہر کی شوخی سے بھی جو کمھلائے

تری نگاہ کی حیرانیوں کے افسانے
مری نگاہ کی نادانیوں نے سلجھائے

○

ڈھلکے ڈھلکے آنسو ڈھلکے — چھلکے چھلکے ساغر چھلکے
دل کے تقاضے اُن کے اشارے — بوجھل بوجھل ہلکے ہلکے
دیکھو دیکھو دامن اُلجھا — ٹھہرو ٹھہرو ساغر چھلکے
ان کا تغافل اُن کی توجہ — اک دل اس پر لاکھ تہلکے
اُن کی تمنا اُن کی محبت — دیکھو سنبھل کے دیکھو سنبھل کے
غم نے اُٹھائے سینکڑوں طوفاں — دل نے بسائے لاکھ محلے
پل میں ہنساؤ پل میں رُلاؤ — پل میں اُجالے پل میں دھندلکے
ہم نے نہ سمجھا تم نے نہ جانا — دل نے مچائے لاکھ تہلکے
لاکھ منایا لاکھ بھلایا — نین کٹورے بھر بھر چھلکے
کتنے اُلجھے کتنے سیدھے — رستے اُن کے رنگ محل کے

کڑیاں جھیلیں پاپڑ بیلے
جھلکے اب تو نگھڑا اجھل کے

زہرہ نگاہ

○

صبر و ضبط کے لے کے بیشمار نذرانے
تیری یاد آئی تھی، آج تجھ کو سمجھانے

پا گئے ہیں منزل کو خود بخود ہی دیوانے
عقل کے دوراہے پر رکھ گئے ہیں فرزانے

تم نے بات کہہ ڈالی کوئی بھی نہ چپانا
ہم نے بات سوچی تھی بن گئے ہیں افسانے

ان نئی بہاروں پر ان نئے نظاروں پر
ایک زندگی کیا ہیں، رو رہے ہیں بیگانے

ہائے کیا مصیبت ہے، ہائے کیا قیامت ہے
ہم ہی کھا گئے دھوکا، ہم چلے تھے سمجھانے

○

خوش ہو آئے تھے پشیمان گئے
اے تغافل تجھے پہچان گئے

خوب ہے صاحبِ محفل کی ادا
کوئی بولا تو برا مان گئے

کوئی دھڑکن ہے نہ آنسو نہ اُمنگ
وقت کے ساتھ یہ طوفان گئے

اُس کو سمجھے کہ نہ سمجھے لیکن
گردشِ دہر تجھے جان گئے

تیری ایک ایک ادا پہچانی
اپنی ایک ایک خطا مان گئے

اس جگہ عقل نے دھوکا کھایا
جس جگہ دل ترے فرمان گئے

اختر

نواب اختر محل

○

اِک آہِ شعلہ بار سے دل کو جلا دیا
لو آج ہم نے اس کا بھی جھگڑا مٹا دیا

لکھ کر جو میرا نام زمیں پر مٹا دیا
ان کا تھا کھیل، خاک میں ہم کو ملا دیا

خط لے کے نامہ بر سے جو ٹکڑے اُڑا دیا
غیروں نے آج اُن کے تئیں کچھ پڑھا دیا

تقصیرِ یار کی، نہ تصورِ عدو ہے کچھ
اختر ہمارے دل ہی نے ہم کو جلا دیا

شیریں

نواب شاہجہان بیگم والیۂ بھوپال

○

خالق ہے خدائے سحر و شام ہمارا
مشہور اسی نے یہ کیا نام ہمارا

پیدا ہوئے ہم اُمّتِ محبوبِ خدا میں
برتر نہ ہو کیوں رُتبۂ اسلام ہمارا

ہم کرتے ہیں حج کو چہ دلدار کا اپنے
ہے چادر تن جامۂ احرام ہمارا

فرقت میں تری ساتھ دیا اپنا اسی نے
کام آیا بہت یہ دلِ ناکام ہمارا

پہلی سی روکاوٹ نہیں اب ہر نظر لُطف
آغاز سے بہتر ہُوا انجام ہمارا

کافر کیا مُجھ کو، تری اس زلف نے کافر
اس لام نے کھویا ترے اسلام ہمارا

دنیا میں بڑا شور ہے شکر شکنی کا
شیریں جو تخلص میں ہُوا نام ہمارا

نزاکت

○

بسکہ رہتا ہے یار آنکھوں میں
ہے نظر بے قرار آنکھوں میں

محفلِ گل رُخاں میں وہ گل رُو
لے گیا دل ہزار آنکھوں میں

مرحمت خاکِ پا عنایت ہو
آ گیا ہے غبار آنکھوں میں

یاد آئے کمر جو گلشن میں
ہر رگِ گل بھی خار آنکھوں میں

عالم

نواب واجد شاہ اختر

○

مجھ سے آزردہ میرا یار ہے آج
صبر کیسا، کسے قرار ہے آج

کل تو ہنس ہنس کے کر رہے تھے کلام
باتیں کرنے میں مجھ سے عار ہے آج

ساقیا! کس کا جامِ عشق پیا
چشمِ بدور، کیا خمار ہے آج

نہیں ثابت کہ کیا ہوا دل کو
مثلِ سیماب بے قرار ہے آج

جلد آ، اے عزیزِ مصرِ جمال!
تیرا عالم کو انتظار ہے آج

مشتری

قمرن جان لکھنوی

○

مے ہے، گلزار ہے، ساقی ہے، گھٹا چھائی ہے
کہہ دو توبہ شکنوں سے کہ بہار آئی ہے

کیا بلا عشق ہے جیتی ہوں تو بدنام ہوں میں
جان دیتی ہوں تو اس شوخ کی رسوائی ہے

کیا جنوں خیز ہے اُس کے گلِ عارض کی بہار
کہ جسے دیکھئے خود رفتہ ہے، سودائی ہے

لی خبر اپنے مریضِ شبِ غم کی نہ کبھی
بس انہی باتوں پہ دعوائے مسیحائی ہے

شبِ فرقت کے جوائے مشتری جاگے تھے ہم
کیا تہِ خنجرِ قاتل ہمیں نیند آئی ہے

زہرہ

امراؤ جان لکھنوی

○

حوصلہ آپ کو جفا کا ہے
یہ نتیجہ مری وفا کا ہے

زلف کھولے ہوئے وہ آتا ہے
سامنا آج کس بلا کا ہے

اپنے مطلب کے آشنا سب ہیں
آشنا کون آشنا کا ہے

شیخ نے کعبہ، برہمن نے دیر
درِ مے خانہ ہم نے تاکا ہے

کیا کرے رہ کے ہند میں زہرہ
عزم بالجزم کربلا کا ہے

نازک

زینت بیگم

○

کوچہ میں کوئی سسکے، کوئی در پہ مرے ہے
انصاف بھی کچھ ہے، تو یہ کیا ظلم کرے ہے

موجود ہے ہر آن جو نزدیک ہمارے
وہ وہم و گماں سے بھی حقیقت میں پرے ہے

ہے نالہ و زاری کا مرے شور فلک تک
پر وہ بتِ مغرور کوئی کان دھرے ہے

یاد آتی ہے اِن آنکھوں میں آمد وہ نشہ کی
ساقی نے گلرنگ سے جب جام بھرے ہے

غش میں مجھے کل دیکھ کے، وہ ڈر کے یہ بولا
بس ہوش میں آ، کیوں مجھے بدنام کرے ہے

پیغام اجل چاہ ہے اُس بُت کی، و لیکن
کب عاشقِ جاں باختہ مرنے سے ڈرے ہے

جاتے تہیں تک دیکھا، تو آنکھیں نہ نکالو
منظور ہمیں تو نظرے خوش گذرے ہے

نازک سفرِ دُور کو گویا وہ سدھارا
گرمِ طلبِ شوق کے نزدیک ورے ہے

موتی

موتی جہان

○

گلابی رُو برو ہے اور ہم ہیں
بس اب جام و سبو ہے اور ہم ہیں

سیا گر تو نے چاکِ جیب ناصح!
تو پھر تارِ رفو ہے اور ہم ہیں

بلا سے گو نہ ہووے دل کو وا شد
ہجومِ یاس تو ہے اور ہم ہیں

شبِ مہتاب میں تا صبح ساقی
خیالِ ماہ رُو ہے اور ہم ہیں

یہ جی میں لہر کیا آئی کہ موتی
کنارِ آبِ جُو ہے اور ہم ہیں

شیریں

○

سُنتا ہے کون کس سے کہوں ماجرائے دل
بہتر یہ ہے کسی سے نہ کوئی لگائے دل

کیونکر رہیں حواس جو قابو سے جائے دل
اے کاش! موت آئے، کسی پر نہ آئے دل

باتیں وُہ دل فریب، ادائیں وُہ دل رُبا
ایسے پری جمال پہ کیونکر نہ آئے دل

بے مہر و بے مروّت و ناآشنا ہو تُم
تُم سے خدا کرے نہ کوئی بھی لگائے دل

شیریں کا یہ کلام ہے، ہر وقت ہر گھڑی
جس کو خدا خراب کرے وُہ لگائے دل

لطیف

محمدی جان صاحبہ

○

آیا جمالِ یار کا جلوہ نظر کہاں
نخلِ مُراد نے ابھی پایا ثمر کہاں

کرتے ہیں سیرِ عالمِ لاہوت کی بشر
ہوتا ہے مشتِ خاک کا دیکھو گزر کہاں

عاشق نے تیرے چھان لی دیر و حرم کی خاک
اب اور تجھ کو ڈھونڈے وُہ اے سیم بر کہاں

پوچھوں میں کس سے آہ کدھر جاؤں میں لطیف
ملتی ہے رفتگانِ عدم کی خبر کہاں

شباب

مین باذی بنارسی

○

مے کشی کا لطف تنہائی میں کیا، کچھ بھی نہیں
یار پہلو میں نہ ہو جب تک مزا کچھ بھی نہیں

تم رہو پہلو میں میرے، میں تمہیں دیکھا کروں
حسرتِ دل اے صنم! اس کے سوا کچھ بھی نہیں

حضرتِ دل کی بدولت میری رسوائی ہوئی
اس کا شکوہ آپ سے اے دل! رہا کچھ بھی نہیں

قسمتِ بد دیکھئے، پوچھا جو اس نے حالِ دل
بندہ کے ہاتھوں کو میں نے کہہ دیا کچھ بھی نہیں

آپ ہی تو چھیڑ کر پوچھا ہمارا حالِ دل
بولے پھر منہ پھیر کے، ہم نے سنا کچھ بھی نہیں

کوچۂ الفت میں انساں دیکھ کر رکھے قدم
ابتدا اچھی ہے اس کی، انتہا کچھ بھی نہیں

دلبر

امراؤ جان

○

سوجھی ہے کتنی دور کی مجھ کو خمار میں
بنت العنب کو پھر میں بٹھاؤں کنار میں

ہر لاکھ چاہتے ہیں نہ اس شوخ سے ملیں
پر کیا کریں کہ دل ہی نہیں اختیار میں

اللہ رے شوقِ کوچۂ قاتل کہ بعدِ مرگ
اڑ کر مرا غبار گیا کوئے یار میں

تم آ گئے تو از سرِ نو زندگی ہوئی
باقی نہیں تھی جان مرے جسمِ زار میں

دلبر کو کربلا میں بلا لیجئے حسینؑ
گھیرا ہے آفتوں نے بہت اس دیار میں

نُورجہاں نازؔ

○

طے نیم جاں کا آج بھی جھگڑا نہ ہو سکا
تجھ سے ستم بھی اے ستم آرا نہ ہو سکا

جب دردِ دل کا تم سے مداوا نہ ہو سکا
پھر کچھ بھی تم سے حضرتِ عیسیٰ نہ ہو سکا

اللہ رے روانیٔ چشمِ شبِ فراق
یوں تیز رو کبھی کوئی دریا نہ ہو سکا

اندھیر ہے کہ موت بھی معشوق بن گئی
ہر چند چاہا رات کو مرنا نہ ہو سکا

کس وقت بہرِ پرسشِ بیمار آئے وہ
جب آنکھ سے بھی اپنی اشارا نہ ہو سکا

شوخؔ

شہزادی جہاں آکبرآبادی

○

تمہارے گیسو و رُخ پر نثار ہم بھی ہیں
اسی خیال میں لیل و نہار ہم بھی ہیں

جو دیکھا جانبِ غیر اُس نے دِل پکار اُٹھا
نگاہِ لُطف کے اُمیدوار ہم بھی ہیں

مٹے ہیں آپ تو حُورانِ خُلد پر واعظ
بتانِ ہند پہ دِل سے نثار ہم بھی ہیں

خود اپنے ہاتھ سے تعزیر آپ دیں ہم کو
خطا معاف ہو! تقصیروار ہم بھی ہیں

تمہارے ساتھ ہمیں بھی ہے ایک نسبتِ خاص
جو آپ شوخؔ ہیں تو بے قرار ہم بھی ہیں

اختتامیہ

محمد حسین آزاد

○

[illegible] گی جو ہوں یاد میں خوں بار آنکھیں
[illegible] دامن کو کریں دامنِ گلزار آنکھیں

[illegible] ہیں تری اے ترکِ جفا کار آنکھیں
[illegible] دیتی ہیں ہو جاتی ہیں جب چار آنکھیں

چشمِ کافر میں نشہ کے ہیں جو ڈورے ساقی
کیا بھلی لگتی ہیں چھٹے ہوئے زنار آنکھیں

سچ ہے اک جا پہ جم کیونکہ رہیں دو بیمار
تیرا بیمار ہے دل اُن کی ہیں بیمار آنکھیں

ہائے حسرت نہ بر آئی کبھی دل کی آزادؔ
ساتھ ہی لے کے چلیں حسرتِ دیدار آنکھیں

آغا غازی پوری

○

تابِ دیدار جو لائے مجھے وہ دل دینا
منہ قیامت میں دکھا سکنے کے قابل دینا

ناتوانوں کے سہارے کو ہے یہ بھی کافی
دامنِ لطفِ غبارِ پسِ محمل دینا

ذوق میں صورتِ موج آ کے فنا ہو جاؤں
کوئی بوسہ تو بھلا اے لبِ ساحل دینا

ہائے رے ہائے تری عقدہ کشائی کے مزے
تو ہی کھولے جسے وہ عقدۂ مشکل دینا

ایک فتنہ ہے قیامت میں بہارِ فردوس
جز ترے کچھ بھی نہ چاہے مجھے وہ دل دینا

درد کا کوئی محل ہی نہیں جب دل کے سوا
مجھ کو ہر عضو کے بدلے ہمہ تن دل دینا

مرزا ہادی رسوا

○

نالہ رُکتا ہے تو سرگرمِ جفا ہوتا ہے
درد تھمتا ہے تو بے درد خفا ہوتا ہے

پھر نظر جھینپتی ہے، آنکھ جھکی جاتی ہے
دیکھئے دیکھئے پھر تیر خطا ہوتا ہے

عشق میں حسرتِ دل کا تو نکلنا کیسا؟
دم نکلنے میں بھی کم بخت مزا ہوتا ہے

حالِ دل اُن سے نہ کہنا تھا ہمیں چوک گئے
اب کوئی بات بنائیں بھی تو کیا ہوتا ہے

آہ میں کچھ بھی اثر ہو تو شرر بار کہیں
ورنہ شعلہ بھی حقیقت میں ہوا ہوتا ہے

حجرہ میں نالہ و فریاد سے باز آ رسوا
ایسی باتوں سے وہ بے درد خفا ہوتا ہے

راسخ عظیم آبادی

○

مرا سینہ اے محبت جو بنے تو باغ کرنا
یہ اسی لئے بنا ہے اسے داغ داغ کرنا

وہ کہاں ملیں جنہوں کو تری جستجو نے کھویا
کبھی گم شدوں کا اپنے نہ سراغ کرنا

مجھے فرشگی سی کچھ ہے تری چشم دیکھ ساقی
نہ شراب سے لبالب تو مرا ایاغ کرنا

غمِ دہر سے رہائی نہیں جیتے جی میسر
نہ خیال دار ہی اے دلِ بے فراغ کرنا

دو جہاں میں تم کو بس ہے یہی داغِ یار راسخ
شبِ گور کا بھی اپنی تم اسے چراغ کرنا

بے نظیر شاہ

○

ذرا جناب نیاز بھی جو نگاہِ اہلِ نیاز میں
تو نہ تیرے سوا کوئی پسِ پردۂ حسنِ مجاز میں

ہو اپنی نگہ جو حسن میں تو جہاں میں کوئی حسیں نہیں
جو وہ غزنوی کی نگاہ ہو وہی خم ہیں لفظِ ایاز میں

ہر سمت دید ہوں طرب آشنائے نوید ہوں
کہ ترانۂ دلِ ساز ہیں خموشیاں سحرِ دل کے پردۂ راز میں

تو چراغِ دیر و حرم ہے تجھے کیا پڑی ہے جو تو نے
کہ تمام رات سحر ہوئی ہے کسی کی سوز و گداز میں

ہیں ہزار داد و فا ملی، یہ ارادتِ دعا ملی
ترے وفا نے اٹھا لیے مرے پھول دامنِ ناز میں

جو بنا یہاں وہی لٹ گیا جو مٹا یہاں وہی بن گیا
یہی بے نظیر رواج ہے، رہِ عشق تشنہ و باز میں

قاضی صادق اختر

○

جب پردۂ رخ سے دور کرے وہ نقاب کا
جلوہ ہر ایک ذرہ میں ہو آفتاب کا

کل بن کے شیخ مجتہدِ عصر ساقیا
دکھلا کے باغِ سبز مذاقِ ثواب کا

کہنے لگا زراہِ تبختر مجھے بہ طنز
معلوم ہوگا حشر میں پینا شراب کا

ہم نے کہا کہ یہ تو ہیں ہم خوب جانتے
پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا

گستاخی ہو معاف تو ایک عرض ہیں کروں
کیجے جو آپ مجھ کو نہ مورد عتاب کا

تقویٰ ہمارے آگے ہو جب آپ کا درست
اور ہو یقین آپ کے اس اجتناب کا

مے ہوئے کنجِ باغ ہو ساقی ہو ماہ وش
اور واں خلل نہ ہو کوئی باعث حجاب کا

گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شیخ نے کہا
دے دے اٹھا زباں کو دہن کے لعاب کا

سینے سے لپٹا سینہ ملا کر وہ منہ سے منہ
یہ ریش جس پہ جلوہ ہے رنگِ خضاب کا

منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیے
گر پی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا

اس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو
گر کچھ بھی خوف کیجیے روزِ حساب کا

اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

مائل دہلوی

محمد تقی بیگ

○

بیخودی میں قدمِ غیر پہ سر رکھتے ہیں
شوق سا شوق ترے خستہ جگر رکھتے ہیں

آج کہتی ہے شبِ غم کی سیاہی کچھ اور
آج مرواہیں جو ارمان سحر رکھتے ہیں

تم نے دیکھے ہی نہیں درد محبت والے
لاکھوں ایسے ہیں کہ باتوں میں اثر رکھتے ہیں

ہم کو مرنے کا نہیں رنج خوشی ہے اس کی
آج ہم اپنی خوشی میں اثر رکھتے ہیں

کیا ہوا حضرتِ مائل نے جو دیکھا اس کو
اہلِ دل جتنے ہیں سب ذوقِ نظر رکھتے ہیں

بزم اکبر آبادی

○

مرے اب ان کی الفت میں وہ حاصل ہوتے جاتے ہیں
کہ اعضا جس قدر اپنے ہیں سب دل ہوتے جاتے ہیں

کبھی رہتے ہیں آنکھوں میں کبھی رہتے ہیں وہ دل میں
یہ دونوں گھر ہمارے عیش منزل ہوتے جاتے ہیں

مراد آئی تری اے دل کہ جویا تھا شہادت کا
سنا ہے وہ ستم کرنے کے قابل ہوتے جاتے ہیں

مرے غم خوار ہمدم ہو کے دم بھرنے لگے ان کا
بڑے عیار اب تو حضرتِ دل ہوتے جاتے ہیں

عجب کچھ بزم اب تو صاحبانِ فن کی حالت ہے
کہ مٹنے کی کمالتے جاتے ہیں مقابل ہوتے جاتے ہیں

سورج نرائن مہر

○

بہانے حال کی جا کر انہیں خبر تو کریں
وہ کیوں نہ آئیں گے تدبیر چارہ گر تو کریں

کہیں گے عرض بھی کچھ چین لے ذرا اے دل
وہ انجمن میں ہماری طرف نظر تو کریں

بہت سے تشنۂ دیدار روز جا بیٹھیں
مگر کبھی وہ سرِ رہگذر گذر تو کریں

بلا دے شمع کی مانند تو مجھے اے عشق
کہ اور لوگ ذرا تجھ سے احتراز تو کریں

ہم ان سے ذکر نہیں کرتے بزمِ اعدا کا
کہ ذکر وہ ہے یہ منظور ہو جو شر تو کریں

نہ تجھ سے جذبۂ دل یہ بھی ہو سکا افسوس
کہ قبرِ مہر پہ وہ ایک دن گذر تو کریں

ثاقب کانپوری

○

اس عشق کا انجام میں کچھ سوچ رہا ہوں
ہاں اے ہوسِ خام! میں کچھ سوچ رہا ہوں

خالی ہوئے سب جام، نہیں کوئی بھی میکش
اے دُردِ تہِ جام! میں کچھ سوچ رہا ہوں

جی بھر کے تجھے آج میں دیکھوں کہ نہ دیکھوں
اے حُسنِ لبِ بام! میں کچھ سوچ رہا ہوں

اپنے دلِ بیتاب سے میں خود ہوں پریشاں
کیا دوں انہیں الزام، میں کچھ سوچ رہا ہوں

تارے سے چمکنے لگے تاریک فضا میں
ہاتھوں میں لئے جام، میں کچھ سوچ رہا ہوں

امجد حیدر آبادی

○

کام کب حسبِ تمنا نہ ہوا
اس کے فضل و کرم سے کیا نہ ہوا

ڈھونڈتا ہوں میں ہر نفس اس کو
مجھ سے جو اک نفس جدا نہ ہوا

کیا ملا وحدتِ وجودی سے
بندہ بندہ رہا، خدا نہ ہوا

بندگی میں یہ کبریائی ہے
غیر گذری کہ میں خدا نہ ہوا

پاک ہستی سے میری نسبت ہے
میں بُرا ہو کے بھی بُرا نہ ہوا

غیر کی کیا شکایت اے امجد
آہ! جب میرا دل، مرا نہ ہوا

جگر بریلوی

○

دل اکیلا رہ کے اُبھوگیا مجھے میہماں کی تلاش ہے
گُل و لالہ کی نہیں ہے ہوس نہیں باغباں کی تلاش ہے

کوئی اور ہونگے جو بھولے ہوں نہیں عہدِ رفتہ ہے یاد بھی
نہیں ہے بہار کی آرزو نہیں گلستاں کی تلاش ہے

سرِ راہ چھوڑ کے چل دیا نہ پھر اس طرف کبھی رُخ کیا
نہیں غیر جس نے سمجھ لیا اسی کارواں کی تلاش ہے

پرِ و بال پہلے درست کر تو تپش بھی دل کی مدد کرے
تجھے عندلیبِ شکستہ پر، عبث آشیاں کی تلاش ہے

ہے عجب جگر کا غمِ نہاں، ہے عجیب دھن میں رواں دواں
کبھی دلستاں سے ہے بے غرض کبھی دلستاں کی تلاش ہے

قمر بدایونی

○

وہ جو کچھ کہے بجا کہے کہہ چکا
یہ قول اس کا قائم رہے رہ چکا

محبت سی شے اور ظاہر نہ ہو
یہ راز اور مخفی رہے رہ چکا

جو کہنا ہے تجھ سے یہاں نامہ بر
یہی ان سے جا کر کہے کہہ چکا

اب اس چشم حیراں میں آنسو کہاں
یہ دریا کہاں تک بہے بہہ چکا

سنے گا وہ کیا حال دل غور سے
جو تمہید ہی پر کہے کہہ چکا

حسینوں کی بے باکیاں دیکھ کر
یہ دل میرے بس میں رہے رہ چکا

قمر میں نقاہت سے دم ہی نہیں
یہ چاند اب کہاں تک گہے گہہ چکا

اُمید میٹھوی

○

آئینہ ہے اگرچہ سکندر لئے ہوئے
میں اس سے کوئی چیز ہوں بہتر لئے ہوئے

کہتا ہے ان سے درد محبت کی داستاں
دل کے عوض جو بیٹھے ہیں پتھر لئے ہوئے

وہ چیز ہے کچھ اور جو ہوتی ہے جانستاں
قاتل وہی نہیں کہ ہو خنجر لئے ہوئے

واعظ یہ خوبیاں ترے جام طہور کی
محراب جھک پڑے نہ کہیں ور لئے ہوئے

بس جانئے کہ غم سے زمانہ خراب ہے
جب دیکھئے مجھے مے و ساغر لئے ہوئے

اک وہ کہ بذ و جہد سے قسمت بدل گئی
اک ہم کہ رو رہے ہیں مقدر لئے ہوئے

افسانے میں بھی رحمت حق کے سنا کیا
اک گوشہ میں الگ مے و ساغر لئے ہوئے

ملنا تھا اس نظر سے نظر کا کہ کوئی چبھنے
دل تک اتر گئی مرے نشتر لئے ہوئے

امید پھر بھی مجھ سے زمانہ خلاف ہے
تیغ و علم لئے ہوں نہ لشکر لئے ہوئے

بنواری لال شعلہ

○

ہے عشق میں ابرو کے جو کاہیدہ تن اپنا
سایہ تری تلوار کا ہوگا کفن اپنا

اس منہ کی کریں بات ذرا منہ کو تو بنوائیں
غنچوں سے کہو صاف تو کر لیں دہن اپنا

پرکھولے ہوئے کرتی ہیں پریاں مرا ماتم
اندر کا اکھاڑا ہے یہ بیت الحزن اپنا

کیا کہتے ہیں سُن سُن کے مرے شعر کو شعلہ
اعدا کے لئے تیغ ہے گویا سخن اپنا

وحشی شاہجہانپوری

○

اس وعدہ کا مطلب کیا سمجھوں آسان بھی ہے دشوار بھی ہے
ابرو پہ ہے بل ہونٹوں پہ ہنسی انکار بھی ہے اقرار بھی ہے

ہے دُور تو ہے پرواز وہی، نزدیک ہے تو انداز وہی
ظالم تری چتون ناز بھری کیا تیر بھی ہے تلوار بھی ہے

دینار و درم کچھ پاس نہیں، ہاں! مہر و وفا کی دولت ہے
بازارِ جہاں میں دل میرا نادار بھی ہے زردار بھی ہے

جس طرح ہو اک زندانی غم آزاد حدود زنداں میں
اس دام گہ ہستی میں بشر مجبور بھی ہے مختار بھی ہے

دُنیا کو ہے جانا ایک نے گھر اور ایک نے مانا راہ گذر
کہتے ہیں جسے مرنا وحشی آسان بھی ہے دشوار بھی ہے

برق دہلوی

○

تارِ نظر حجابِ رخِ پُر نور نہیں
رشتہ گر ہو نگہ شوق تو کچھ دُور نہیں

شبِ فرقت نظر آتے نہیں آثارِ سحر
آسمی ظلمت ہے رُخِ شمع پہ بھی نُور نہیں

رازِ سربستۂ فطرت نہ کھلا ہے نہ کھلے
میں ہوں اس سعی میں مصروف جو مشکور نہیں

سرِ نیرنگیٔ نظارہ ہے خود اپنی نظر
مینِ وحدت ہے کوئی ناظر و منظور نہیں

نظر آتا نہیں گو منزلِ مقصد کا نشاں
ذوقِ صادق یہی کہتا ہے کہ کچھ دُور نہیں

کیفی چڑیا کوٹی

○

ہوئی تھیں پست جس دم ہمتیں جوشِ اسیراں کی
ستم دیکھو کہ اُونچی ہوگئی دیوارِ زنداں کی

خدارا مطربِ لذت نوا تو اس کو چھیڑے جا
ترے نغمے سے اب ملنے لگی جنبش رگِ جاں کی

مزا آیا ہے ان کو چھیڑنے کا صحنِ گلشن میں
اُڑا جب رنگِ رُخ رنگت نکھر آئی گلستاں کی

عدم کہتے ہیں جس کو صورتِ خوابِ پریشاں ہے
یہ ہستی کچھ نہیں تعبیر ہے خوابِ پریشاں کی

بہارِ دل کشا کھولے گی بلبل نغمہ خواں ہوگی
کلی کے ہر ورق میں داستانیں ہیں گلستاں کی

میں بیٹھا ہوں جہاں تھک کر سمجھ میں آگیا کیفی
مری درماندگی سے اصل وسعت ہے بیاباں کی

اقبال احمد سہیل

○

عرشِ بریں بھی اس کے مقابل نہیں رہا
جس دل کو تو نے دیکھ لیا دل نہیں رہا

درسِ جنونِ عشق کو کچھ ظرف چاہئے
دیوانہ کیا بنے گا جو عاقل نہیں رہا

چشمِ کرم کی شوخیٔ طرزِ ستم نہ پوچھ
غم بھی بقدرِ حوصلۂ دل نہیں رہا

گم تھی فضائے حُسن میں کل کائناتِ حُسن
اٹھا غبارِ قیس تو محمل نہیں رہا

اب بھی دلِ حزیں سے تغافل شعاریاں
اب یہ تری نظر ہے مرا دل نہیں رہا

جب سے جمالِ عشق ہے پیشِ نظر سہیلؔ
میں آبِ رنگِ حُسن کا قائل نہیں رہا

اکبر حیدری

○

جہانِ حُسن میں محوِ ترنّم ہے وفا میری
میں نغمہ ہوں محبت کا محبت ہے وفا میری

دلِ مضطر کو جس پر اعتبارِ حکمرانی تھا
مرے احساسِ خودداری میں ہے وہ انتجا میری

امینِ دورِ مستقبل ہیں میری خاک کے ذرّے
حقیقت میں بقا کا پیش خیمہ ہے فنا میری

مشیت کی نگاہوں میں جو معیارِ پرستش تھی
ہوئی ہے جذبِ اشکِ خونفشاں میں وہ دعا میری

جہانِ قدس تک روحِ تخیل سیر کر آئی
مری پرواز کتنی ہے کہاں تک ہے فضا میری

اک آنسو اور وہ بھی دل کی رنگینی سے بیگانہ
نہ دیکھی جائیگی دنیا سے تصویرِ وفا میری

نیاز و ناز کا افسانہ لکھنے کے لئے اکبرؔ
سُنی ہے کاتبِ قسمت نے برسوں التجا میری

آنی جائی

زد ہی وہ کشش تیغ ادا میرے بعد
جذب کھو بیٹھا ہے قاتل کا صلا میرے بعد

کیوں نہ بے رنگ ہو صحرائے بلا میرے بعد
کون کانٹوں پہ چلا برہنہ پا میرے بعد

کشتی میں تھا سو متصل میں تہ تیغ ہوا
اب ہو منظر اہل وفا میرے بعد

صبح آخر ہوئی صبح شب ہجراں تھی مگر
شمع و پروانہ میں بھی ربط نہ تھا میرے بعد

خوش پہ پرسش محشر تھی مری بے گنہی
نظر آیا مرے قاتل کو خدا میرے بعد

رواں

(جگت موہن لال)

گل ویرانہ ہوں کوئی نہیں ہے قدرداں میرا
تو ہی دیکھ لے مرے خلاق حسن رائیگاں میرا

ہوا اس کو اڑا لے جائے یا اب پھونک دے بجلی
حفاظت کر نہیں سکتا مری جب آشیاں میرا

یہ کہہ کر روح نکلی ہے تن عاشق سے فرقت میں
مجھے عجلت ہے بڑھ جائے نہ آگے کارواں میرا

عناصر ہنستے ہیں دنیا کی وسعت مسکراتی ہے
کسی سے پوچھتے ہیں اہل بینش جب نشاں میرا

مرے بعد اور پھر کوئی نظر مجھ سا نہیں آتا
بہت دن تک کریگے سوگ اہل خاندان میرا

رواں سچ ہے محبت کا اثر ضائع نہیں ہوتا
وہ رو دیتے ہیں اب بھی ذکر آتا ہے جہاں میرا

اطہر ہاپوڑی

وہ حُسنِ حیرت افزا اک نظر دیکھا نہیں جاتا
جدھر وہ جلوہ فرما ہیں اُدھر دیکھا نہیں جاتا

نظر سوزی غضب ہے اُس کے حُسنِ روز افزوں میں
بہت دیکھا ہے اس کو اب مگر دیکھا نہیں جاتا

نگاہیں جذب ہو جاتی ہیں اُس کے حُسنِ دلکش میں
کسی جانب پھر اس کو دیکھ کر دیکھا نہیں جاتا

کلیم اللہ سچ کہتے ہیں اُس کے حُسن کا جلوہ
وہ خود دکھلائے تو بھی اک نظر دیکھا نہیں جاتا

مرے ذوقِ نظر کی داد یوں دیتے ہیں وہ مجھکو
کہ اب دنیا میں یہ ذوقِ نظر دیکھا نہیں جاتا

یہ سب سوز و گدازِ شمع سے ہے گرمیٔ محفل
کوئی پروانہ ہنگامِ سحر دیکھا نہیں جاتا

مرے غمخوار اطہر اٹھ گئے یہ کہہ کے بالیں سے
یہ بیتابی کا عالم رات بھر دیکھا نہیں جاتا

بیتاب عظیم آبادی

نہ میرے دل نے نہ ادراکِ نکتہ جُو نے کیا
خدا گواہ ہے جو کچھ کیا وہ تُو نے کیا

فریفتہ مجھے عالم کے رنگ و بُو نے کیا
بڑا ستم ترے ملنے کی آرزو نے کیا

کہیں کے رہتے نہ آوارگانِ دشتِ جفا
بڑا کرم کششِ زُلفِ مُشکبو نے کیا

بہار آئی تو کیا ناشگفتہ خاطر کو
فسردہ اور بھی اس موسمِ نمو نے کیا

تمہاری چارہ گری کو سلام ہے میرا
کہ ایک زخم کو سو زخم اک رفو نے کیا

وہ کیونکر آکے ملے خود یہ حال مجھ سے پوچھ
برآر مقصدِ دل ترکِ آرزو نے کیا

جز اپنے دل کے نہ پایا کسی نے اس کا نشاں
ہزار عقل کو آوارۂ جستجو نے کیا

بڑی امید بندھی بے بسوں کو محشر کی
عجب کرشمہ ترے طرزِ گفتگو نے کیا

کہوں گا یار سے میں صاف حشر کے دن
کہ مجھ سے ہجر میں جو کچھ ہوا وہ تُو نے کیا

بجا رہے نہ مرے عقل و ہوش اے بیتاب
غضب کا مست مجھے پہلے ہی سبو نے کیا

سید اختر علی تہری

○

نجوم و مہ میں گلہائے گلستاں میں نہیں
ترے مذاق کے جلوے کہیں جہاں میں نہیں

تھکے تھکے سے قدم اٹھ رہے ہیں جادے پر
وہ ذوقِ منزلِ محبوب کارواں میں نہیں

حدیثِ گردشِ دوراں ہے دل گداز مگر
فغاں کا ذکر کہیں میری داستاں میں نہیں

یہ مانا تو ہے شریعت پناہ اے واعظ
مگر حلاوتِ ایماں ترے بیاں میں نہیں

کہاں ہے سودۂ لب و رخ سے چھیڑ کے قصے
ہوس کا باب محبت کی داستاں میں نہیں

اگر پرستشِ رسم و رواج ہے ایماں
تو پھر گناہ کوئی سجدۂ بتاں میں نہیں

بنا زمین کو اپنا، زمین کی مخلوق
تری نجات مہ و مہر و کہکشاں میں نہیں

حیرت بدایونی

○

رکھتے ہو خیال اور ہی دیتے ہو بیاں اور
کیا بات ہے واللہ کہ دل اور زباں اور

طوفاں سے اگر جان چرائی دل و جاں نے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

ہم ماضیٔ بے روح کا ماتم نہیں کرتے
بھولا ئیے باہر سے کوئی مرثیہ خواں اور

ہے پیرِ خرابات کا ہونا ہی اگر فرض
ہم خود ہی بنا لیں گے کوئی پیرِ مغاں اور

ہم پیر ہیں اور پختگیٔ عمر میں حیرت
ہو جاتے ہیں انسان کے افکار جواں اور

نشتر جالندھری

○

فضا ہے رقصاں کھلے ہیں تارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو
ابھی چلے آؤ گھر ہمارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو

اِدھر تو آؤ کہ ساز دل پر ترانہ مہر و وفا کا چھیڑیں
اسی تمنا میں دن گزارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو

کسی نے میلی نظر سے دیکھا نہیں تو غیرت سے کٹ مرے ہم
لگے اُبلنے لہو کے دھارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو

تمہاری خاطر لپکتے شعلوں کو ہم نے بڑھ کر گلے لگایا
گل ان کو جانا جو تھے شرارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو

تمہارے کہنے پہ زلف و قامت سمجھ کے دار و رسن کو چوما
محیطِ خوں میں بھرے طرارے، کبھی ہمارا کہا بھی مانو

یہ کس کی تربت ہے آہ نشتر کہ اب تک آواز آ رہی ہے
ہمیں تو ہیں بے رُخی کے مارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو

نجم آفندی

○

ہستی کوئی ایسی بھی ہے انساں کے سوا اور
مذہب کا خدا اور ہے مطلب کا خدا اور
پھر ٹھہر گیا قافلۂ درد سنا ہے
شاید کوئی رستے میں مری طرح گرا اور
اک جرعۂ آخر کی کمی رہ گئی آخر
جتنی وہ پلاتے گئے آنکھوں نے کہا اور
منبر سے بہت فصل ہے میدانِ عمل کا
تقریر کے مرد اور ہیں مردانِ وغا اور
للہ گلہ کر کے میں پچتایا ہوں کیا کیا
جب ختم ہوئی بات کہیں اُس نے کہا اور
کیا زیرِ لب اے دوست ہے اظہارِ حیا بھی
حق ہو کہ وہ ناحق ہو ذرا لے تو بڑھا اور
دولت کا تو پہلے ہی گنہگار تھا منعم
دولت کی محبت نے گنہگار کیا اور
یہ وہم سا ہوتا ہے مجھے دیکھ کے ان کو
سیرت کا خدا اور ہے صورت کا خدا اور

مجنوں گورکھپوری

○

رہ جائیں فلک والے شورش سے نہ بیگانہ
ناہید کو تڑپا دے اے نعرۂ مستانہ

کچھ اور بھی بڑھتے ہیں کچھ اور بہکتے ہیں
لے تیرا خدا حافظ اے جلوۂ جانانہ

بہکانے کی حسرت کا کچھ پاس بھی ہے لازم
لغزش میں قرینے سے اے لغزشِ مستانہ

آزادی کی دھومیں ہیں شہرے ہیں ترقی کے
ہر گام ہے پسپائی ہر موضع غلامانہ

اے عقل و خرد والو مجنوں کا گلہ کیسا
دیوانے کو کیا کہئے دیوانہ ہے دیوانہ

میکش اکبر آبادی

○

رات اس محفل کا عالم کیا کہوں
بات افسانہ تھی خاموشی فسوں
تجھ سے اپنی زندگی کے ماجرے
ٹھہر ہمدم سانس لے لوں تو کہوں
ہم نے لالے کی طرح اس دور میں
آنکھ کھولی تھی کہ دیکھا دل کا خوں
آپ کی میری کہانی ایک ہے
کہنے اب میں کیا سناؤں کیا سنوں
آپ کا انجان پن بھی ایک فن
اور میری عقل و دانش بھی جنوں
دیکھنا ہے تیرا یہ عالم مجھے
چاہے بہ نکلے مری آنکھوں سے خوں
ہے زمانہ اپنے غم میں مبتلا
کس سے میکش جا کے اپنا غم کہوں

بہزاد لکھنوی

○

عشق تیری راہ میں کیا وجود کیا عدم
دل جھکا نفس نفس سر جھکا قدم قدم

مقصدِ حیات ہے، مرکزِ ممات ہے
روئے یار رخ بہ رخ زلفِ یار خم بہ خم

آہ دل بلند ہو، اے خلش دو چند ہو
پھر سکون دے چلا اضطراب دم بہ دم

کچھ خرد سے کام لے کچھ جنوں سے کام لے
آ رہی ہیں منزلیں راہ میں قدم قدم

میں عجب رند تھا ہوش سے نہ بچ سکا
بے خودی میں بھی رہا امتیاز بیش و کم

جلیل قدوائی

○

مرا جنونِ محبت تو کوئی راز نہیں
ترے ہی پاس نگہ چشمِ امتیاز نہیں

کچھ اور دن اسے رکھ آتشِ محبت پر
کہ تیرے شیشۂ دل میں ابھی گداز نہیں

سمجھ سکے تو سمجھ میری وجہِ خاموشی
بیانِ رازِ حقیقت میں سے یہ راز نہیں

کرم کہوں اسے قدرت کا یا ستم سمجھوں
کہ دل دیا ہے مگر کوئی دل نواز نہیں

عطائے خاص ہے تیری مرا فریبِ جنوں
عطا یہ تو نہ ہے مجھ کو جو بے نیاز نہیں

کوئی کسی سے یہ کہدے کہ میرا شیشۂ دل
جلا سا ہے لیکن زمانہ ساز نہیں

اثر صہبائی

○

لوسکوں کی تمنا عمر بھر ہوتی رہی
دل کی دنیا منتشر ہی منتشر ہوتی رہی

ہر نفس کی بندگی ذکرِ خدا کے ساتھ ساتھ
ہر زمانے میں یہ انداز دگر ہوتی رہی

بادِ اُلفت میں نگاہوں کی آنچیاں
آتشِ شوق و محبت تیز تر ہوتی رہی

تجھ سے مل کر پھر بہم ہو سکا دل کا سکوں
محفلِ کونین مکاں زیر و زبر ہوتی رہی

کچھ عجب عالم رہا ہے دورِ الفت میں اثرؔ
صبح پر اک بارشِ کیفِ اثر ہوتی رہی

امین حزیںؔ

○

درد سینے میں نہاں رہ کے اثر رکھتا ہے
ہونٹ سی لے کہ بیاں حسن کی بیداد نہ کر

پھونک دے نغمۂ جاں سوز سے سامانِ قفس
بلبلِ تفتہ جگر! شکوۂ صیاد نہ کر

لطف جینے کا ہے جب ہی کہ ہو "دل مست خوشی"
آسماں تک سے یہ کہدے "مری امداد نہ کر"

یاس میں پھوڑ کے سر مرتے ہیں کم ظرف امیںؔ
ظرفِ عالی ہے ترا جبہ فرسا دنہ کر

عبدالمجید بھٹی

○

اٹھے گرے جلیں، وہ نہاں ہوں کہ عیاں اور
آنکھوں میں نہ آئے گا نیا کوئی سماں اور

محشر میں ہم رہ کے بھی ہیں اجنبی دونوں
پھولوں کی زباں اور ہے کانٹوں کی زباں اور

یہ ترش نگاہی بھی ہے اقرارِ محبت
کیوں اپنی جفا پر انہیں ہوتا ہے گماں اور

مغرور خداوندو! ڈرو صدق و وفا سے
وہ وقت بھی آتا ہے کہ جھکتی ہے کماں اور

یارب ہے وفا داد طلب اُن کی جفا سے
دے اور نہ دل ان کو نہ دے ہم کو زباں اور

واثق جونپوری

○

زباں تک جو نہ آئے وہ محبت اور ہوتی ہے
فسانہ اور ہوتا ہے، حقیقت اور ہوتی ہے

نہیں ملتے تو اک ادنیٰ شکایت ہے نہ ملنے کی
مگر مل کر نہ ملنے کی شکایت اور ہوتی ہے

یہ مانا شیشۂ دل رشکِ بازارِ الفت ہے
مگر جب ٹوٹ جاتا ہے تو قیمت اور ہوتی ہے

نگاہیں تاڑ لیتی ہیں محبت کی اداؤں کو
چھپانے سے زمانے بھر میں شہرت اور ہوتی ہے

یہ مانا حسن کی فطرت بہت نازک ہے اے واثق
مزاجِ عشق کی لیکن نزاکت اور ہوتی ہے

ن۔م راشد

بلا سنا ہے جاں بلا کہ میں لاؤں پھر جنوں
یہ خرد کی رات چھٹے کہیں نظر آئے پھر سحر جنوں

تو عاشقی میں گرہ کشا نہ خرد ہوئی نہ جنوں ہوا
وہ ستم سے کر نہیں سہا نہ پئے خرد نہ سر جنوں

وہی تیرگی وہی وحشت و ترے دل زدوں کے ہیں راہبر
وہی ارزدی جستجو وہی راہِ پرخطر جنوں

نہیں ہم عناں مرے مہر و مہ شب و روز میرے غبار راہ
کہ تمام دوڑ کے کارواں ہے محیط بال و پر جنوں

نہ نظارے کا ہوش تھا کوئی جوش تھا نہ خروش تھا
مگر آپ ان کی نگاہ تھی سر راہ پردہ در جنوں

اسی ایک راہ سے کارواں ہیں نکل کے آج رواں دواں
کھلا رہ گیا تھا الست میں کہیں ایک طاق در جنوں

نہ تو اُس کے ہاتھ میں ہو قلم نہ تو واسطہ اسے سنگ سے
فقط ایک پارۂ سنگ ہے کمالِ نقش گر جنوں

ہے وہ مبتلائے تو جب سے مصر لئے وہ دُعا بہ لب
کہ طلسمِ نار میں ہو شب سے نگارِ خود نگر جنوں

تھا عجیب شہد بے نوا و سرور و دولتِ بے بہا
ہوا ہم پہ جب کرمِ خود نمائی ہم سے جب نظر جنوں

جمیل مظہری

جب خاک ہی ہونا تھا مجھ کو تو خاکِ رہگزر ہوتا
اک کوشش پیہم تو ہوتی اُٹھتا ہوا گرتا ہوتا

موتی بننے سے کیا حاصل سب اپنی حیثیت ہی کھو دی
قطرے کیلئے بہتر تھا ہی قلزم بنتا دریا ہوتا

ہستی ہے جدائی سے قائم جب وصل ہوا تو کچھ بھی نہیں
دریا سے گر ہوتا نہ جدا قطرہ کیونکر قطرہ ہوتا

اے کاش کہ تو نے فطرت کی پنہائی زنجیریں
جو زنجیریں خود پہنی ہیں اے کاش انہیں تو توڑا ہوتا

تخئیل خلا آزادی کی جب فطرت خود آزاد نہیں
آزاد اگر ہوتی فطرت تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟

پابند نہ ہوتی گر یہ زمیں سورج سے ٹکرا جاتی
پابند نہ گر ہوتیں موجیں ساحل کی جگہ دریا ہوتا

پابند نہ ہوتے گر تارے تو آپس میں ٹکرا جاتے
سارا یہ طلسمِ ارض و سما اک پل میں ٹوٹ گیا ہوتا

پابند نہ ہوتی گر یہ ہوا چلتی اک ایسی تیز آندھی
ذرات میں اک ہلچل ہوتی شیرازۂ کل بکھرا ہوتا

گر مئی عمل محدود ہے ہے فلسفۂ اخلاق یہی
اے کاش حقیقت کو تو نے زنجیروں کی سمجھا ہوتا

آزادیٔ مطلق لعنت ہے ہوتا جو سکوں آزادی میں
زنجیروں کا خلعت انساں نے خود شوق سے کیوں پہنا ہوتا

ہر بات جمیل ناری کی ہے تدبیر بقا تعلیم عمل!
خاموش سہی خوددار سہی تم نے تو کبھی چھیڑا ہوتا

جاں نثار اختر

○

ہر سمت اُفق پہ ہیں دُھندلکے
پیمانۂ صبح جلد چھلکے

آغازِ نوائے شوق جیسے
چھیڑے کوئی ساز ہلکے ہلکے

کچھ بھید کھُلے مری نظر سے
کچھ راز تری ہنسی سے جھلکے

موتی تو نہ بن سکیں گے آنسو
دامن پہ تو سے اگر نہ ڈھلکے

وہ رنگ رہا نہ روشنی میں
اس سے تو حسین تھے دھندلکے

یہ منتِ مہر و ماہ کب تک
گیتی سے کہو کہ آپ چھلکے

اِس شیشۂ آرزو سے اختر
کیا جانئے کتنے رنگ چھلکے

علی سردار جعفری

○

سکوں میسر ہو تو کیونکر، ہجومِ رنج و محن وہی ہے
بدل گئے ہیں اگرچہ قاتل، نظامِ دار و رسن وہی ہے

لبوں پہ مُہریں لگی ہوئی ہیں زباں پہ تالے پڑے ہوئے ہیں
وہی ہیں آدابِ محفل اب بھی طریقۂ انجمن وہی ہے

ابھی تو خاشاک کیلئے ہے ہزار طوفان کی ضرورت
اٹھی تھی جو پیچ و تاب کھاتی یہ موجِ گنگ و جمن وہی ہے

بلند محلوں کے بام و گنبد پہ جھُومتی کرنوں کو ناچنے دو
جو کالی کُٹیاؤں کو اُجالا عطا کرے گی کرن وہی ہے

کوئی یہ ایوانِ حکمرانی میں جا کے میری طرف سے کہہ دے
زبان چھینی ہے تم نے جس کی یہ شاعرِ نغمہ زن وہی ہے

مخمور جالندھری

○

یہی ہیں ان کے نگارخانے، یہی ہیں ان کے محل رفیقو
جو کتنی صدیوں سے اپنے دل کی جلن رہے ہیں کسک رہے ہیں

نہیں گماں ہو چلا ہے ہم ابتدا سے پہچانتے ہیں ان کو
نگاہ کی اب ذرا سی اک چھیڑ ہی سے پردے سرک رہے ہیں

زمیں اگر ان کے بند کھولے پکارتی ہے یہیں ہے سب کچھ
ادھر نہ جانا کہ خلد و کوثر بھی طلسمِ فلک رہے ہیں

اٹھو وہ مشرق سے ساغرِ آفتاب مخمور تم تک آیا
کرو نہ غم کیسے کیسے حالات شام سے صبح تک رہے ہیں

ڈاکٹر مسعود حسن

○

ابھی چمن میں کوئی فتنہ کار باقی ہے
بہار باقی ہے زخمِ بہار باقی ہے

یہ انتظار کی گھڑیاں کنارِ جوئے چشم
امید ڈوب چکی، اعتبار باقی ہے

عجب نہیں ہے کہ شبنم سے موت ہو جائے
گلوں کی تشنہ لبی بے شمار باقی ہے

رفو کی بات پہ وہ شوخ ہنس کے یوں بولا
ابھی تو جیب و گریباں میں تار باقی ہے

مری بہار کی آسودگی میں اے مسعود!
سنا ہے تو ہی نقطۂ بے قرار باقی ہے

عظیم قریشی

○

رنگ کہاں ہے سایا سا ہے
نقش کہاں ہے دھوئیں سا ہے

موج کی رنگت زردی مائل!
شام نہیں ہے دھڑکا سا ہے

سیلِ عشق تھما کب ہوگا
دریا ہے اور چڑھتا سا ہے

حُسن و عشق بڑے دو کافر
دونوں میں اک جھگڑا سا ہے

دل نے بدلا روپ ہو شاید
دُور پرے جو کُہرا سا ہے

آؤ پیار سے دھولیں اس کو
نقش جہاں کچھ میلا سا ہے

آج عظیم کو شاداں دیکھا
شاعر ہے پر کانٹا سا ہے

حامد عزیز مدنی

○

ہزار وقت کے پرتو نظر میں ہوتے ہیں
ہم ایک حلقۂ وحشت اثر میں ہوتے ہیں

کھلا یہ دل پہ کہ تعمیرِ بام و در ہے فریب
بگولے قالبِ دیوار و در میں ہوتے ہیں

وہی ہیں آج بھی اس جسمِ نازنیں میں فسوں
جو شاخِ گل میں جو موجِ گہر میں ہوتے ہیں

طلسمِ خوابِ زلیخا و دامِ بردہ فروش
ہزار طرح کے قصّے سفر میں ہوتے ہیں

گذر رہا ہے تو آنکھیں چُرا کے یوں نہ گذر
غلط بیاں بھی بہت رہگذر میں ہوتے ہیں

سرشتِ گِل ہی میں پنہاں ہیں سارے نقش و نگار
ہنر یہی تو کفِ کوزہ گر میں ہوتے ہیں

شورؔ علیگ

مرے دل کی دھڑکن اس کے تبسم پہ گراں کیوں ہو
میں افسانہ ہوں اُس کا وہ مرا افسانہ خواں کیوں ہو

مرے کام آگئی آخر مری کاشانہ بردوشی
بجلیوں کی زد پہ میرا آشیاں کیوں ہو

کناروں سے گذر جانا ہی طوفانوں کی فطرت ہے
جہاں دُنیا ٹھہر جائے قدم میرا وہاں کیوں ہو

ترا جلوہ بھی جب تیرا ہی پردہ ہوتا جاتا ہے
تو پھر میری نگاہوں پر نگاہوں کا گماں کیوں ہو

نہ میں دارنتۂ مطرب، نہ میں جاماذۂ ساقی
اگر محفل سے اُٹھ جاؤں تو محفل بدگماں کیوں ہو

میں جس عالم میں ہوں اپنی جگہ اے شورؔ تنہا ہوں
جُدا ہو جس کی منزل وہ رہینِ کارواں کیوں ہو

صدقؔ جائسی

کیا کرے چشم غلط انداز بے تقصیر ہے
اے شہِ خوباں کماں بھاری ہے ہلکا تیر ہے

میرا منہ چھوٹا، بڑی باتوں میں کیونکر دخل دوں
سامنے تصویرِ یوسف کے تری تصویر ہے

میں بھی دل رکھتا ہوں کیا مجھ کو نہیں شوقِ حرم
خاکِ بُت خانے کی لیکن پاؤں کی زنجیر ہے

آنکھ کے اندر نگاہِ ناز ہے کتنی غریب
آنکھ سے باہر یہی چلتی ہوئی شمشیر ہے

صدقؔ سچ پُوچھو تو پُوجا حسن ہی کی ہے بجا
لب کشائی میں خدا کا خوف دامن گیر ہے

خمار بارہ بنکوی

○

ہجر کی رت غمگین فضائیں اُف ری محبت ہائے جوانی
جینے کے دن مرنے کی دعائیں اُف ری محبت ہائے جوانی

وعدہ کی شب خامشی فضائیں دل میں خلش وہ آئیں نہ آئیں
در پہ نگاہیں لب پہ دعائیں اُف ری محبت ہائے جوانی

مہکی ہوئی گلشن کی فضائیں بہکی ہوئی ساون کی گھٹائیں
ہاتھ میں ساغر سر پہ گھٹائیں اُف ری محبت ہائے جوانی

رخصتِ جاناں ایک قیامت مجھ سے اجازت آنکھ میں آنسو لب پہ دعائیں اُف ری محبت ہائے جوانی

ہم تھے خمار اور پہلوئے جاناں بس میں تھی جیسے گردشِ دوراں
کاش وہ دن اب یاد نہ آئیں اُف ری محبت ہائے جوانی

نشور واحدی

○

نظر نظر کو ساقیِ حیات کہتے آئے ہیں
ان انکھڑیوں کو میکدہ کی رات کہتے آئے ہیں

فریبِ شوق کو تخیلات کہتے آئے ہیں
بکھر گئے تو گیسوؤں کو رات کہتے آئے ہیں

اسی کو زندگی کا ساز دے کے مطمئن ہوں میں
وہ حسن جس کو حسنِ بے ثبات کہتے آئے ہیں

یہ خلصانِ عشق بھی عجب ادا پرست ہیں
وہ مسکرا دئے تو التفات کہتے آئے ہیں

ہنسی بجا نہیں تری یہ وعظِ ترکِ عشق پر
یہ بیخبر بھی حوصلے کی بات کہتے آئے ہیں

حیات تا ممات ایک سلسلہ ہے عشق کا
کہاں ہیں وہ جو مرگ کو نجات کہتے آئے ہیں

یہ نوجواں تو زندگی کو زندگی نہ کہہ سکے
جوانیوں میں موت کو حیات کہتے آئے ہیں

وہ ظرفِ مے جسے نہ زہر کی نظر سمجھ سکی
ہم اس کو شیشۂ تجلیات کہتے آئے ہیں

غزل ہے نام حسن کے معاملاتِ خام کا
خطا ہوئی کہ دلبروں کی بات کہتے آئے ہیں

یگانہ

(مصطفےٰ قلی خاں)

○

تب شیریں سے تلخ کاموں کو
بوسہ تلخ کام ہے تیرا

ہاتھ اٹھا ہو اور جھکا سے تُو
یہی گویا سلام ہے تیرا

اگر آوے مرے گھر وُہ پیارا
کروں اس ماہ کو پُتلی کا تارا

مرا دشمن ہُوا یگانہ وُہ شوخ
کیا کیوں عشق مَیں نے آشکارا

کہو یہ کہ یار جاتا ہے
میرا صبر و قرار جاتا ہے

گر خبر لینی ہو تو لے صیاد
ہاتھ سے یہ شکار جاتا ہے

کلیم

محمد حسین

○

ہر تار پیچ زُلف کا، عالم کی جان ہے
گویا یہ اژدھا تھا کہ سب کو نگل گیا

نقاب اپنے رُخ کا جو تو باز کرتا
تو گُل اپنی خوبی پہ کیا ناز کرتا

لگتی ہے اب تو قلقلِ مینا سے دل کو ٹھیس
وے دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا

قبر میں بھی لے ہمراہ گیا اپنے کلیم
آہ کیوں دردِ دل اپنا نہ کسی کو سونپا

پیری کی بھی سیر کر گئے ہم
اس پل سے بھی بس گذر گئے ہم

واں غصہ ہوے رقیب پر تُم
یاں مارے ادب کے مر گئے ہم

محسنؔ

محمد محسن

○

دل مرا وابستۂ ہر تار زلفِ یار ہے
ہے تو دیوانہ پر اپنے کام میں ہشیار ہے

او، یہ عاجز تمہارا کچھ نہیں رکھتا، مگر
جان برلب آمدہ، حاضر ہے گر درکار ہے

کیا جانئے وہ شوخ کدھر ہے کدھر نہیں
مجھ کو تو تن بدن کی بھی اپنے خبر نہیں

جس دن تری گلی سے مَیں عزمِ سفر کیا
ہر یک قدم پہ راہ میں پتھر جگر کیا

محسنؔ مروں نہ مَیں تو بھلا جی کے کیا کروں
اک دِل بساط میں تھا سو مَیں وہ بھی کھو چکا

ممتازؔ

حافظ فضلو

○

ہزار مرتبہ دیکھا ستم جدائی کا
ہنوز حوصلہ باقی ہے آشنائی کا

ڈروں مَیں کس لئے رنجش سے، پیار میں کیا تھا
مَیں اب خزاں کو جو روؤں، بہار میں کیا تھا

جفائے یار نے کس طرح کر دیا مایوس
اور ان کی خاطرِ امیدوار میں کیا تھا

ترے ہی واسطے آئے عدم سے ہم یاں تک
وگرنہ ہستیٔ ناپائیدار میں کیا تھا

کیونکہ سرسبز ہو شاہی و گدائی کی ہوس
رہ گئی آہ مرے دِل میں خدائی کی ہوس

بال و پر توڑ کے جب تُو نے قفس کو سونپا
وہیں آخر ہوئی صیاد رہائی کی ہوس

گذرا کبھی شاید کہ وہ بے باک چمن میں
آتا ہے نظر جامۂ گُل چاک چمن میں

مجذوب

مرزا غلام حیدر

○

عداوت سے تمہاری کچھ اگر ہووے تو مَیں جانوں
بلا تم زہر دے دیکھو اثر ہووے تو مَیں جانوں

تمہارا ہم سے جو عہدِ وفا ہے اس کو تم جانو
ولیکن کچھ نوع دگر ہووے تو مَیں جانوں

نہ اندیشہ کرو پیارے کہ شب ہے وصل کی تھوڑی
تمہاری زلف کو کھولو سحر ہووے تو مَیں جانوں

آوے بھی مسیحا مری بالیں پہ تو کیا ہو
بیمار یہ ایسا تو نہیں جس کو شفا ہو

مجذوب ترے عجز و تکبر سے ہوں نالاں
بندہ کبھی ہو بیٹھتے ہو، گاہ خدا ہو

ماہر

فخر الدین خان

○

چشم اس سے ترحم کی نہ رکھ رو در و کے ماہر
کب پہنچے ہے وہ دیدۂ خوں بار کسو کا

جو اسکے در پہ بیٹھے ہیں، سمجھتے ہیں وہ در کس کا
ہوئے جو اس کے آوارہ وہ کہتے ہیں کہ گھر کس کا

مَیں تو مانوں ترا سخن ناصح
پر نہیں دل پہ اختیار اپنا

مدت ہوئی کہ دل کی مجھ تک خبر نہ پہنچی
ملتا نہیں نشاں کچھ اس بے نشاں سے مجھکو

تُو تو کب اعتبار مانے ہے
جس پہ گذرے ہے سو ہی جانے ہے

کوئی نہ بھلا کام ہوا عمر میں ہم سے
امید ہے بخشش کی مگر تیرے کرم سے

غضنفر

غضنفر علی خاں

○

جاتے ہیں وہاں سے گر کہیں ہم
ہر پھر کے پھر آئے ہیں وہیں ہم

صد حیف کہ کنج لے کسی میں
کوئی نہیں اور ہیں ہمیں ہم

خاموشی کی مُہر ہے دہن پر
ہیں حلقۂ غم میں جُوں نگیں ہم

آیا نہ وُہ شوخ اور گئے آہ!
حسرت ہی بھرے تہ زمیں ہم

تکتے رہے جانبِ در اے وائے
مُڑ مُڑ کے بوقتِ واپسیں ہم

قسمت میں تو ہجر ہے غضنفر
اب وُہ ہے تو آپ میں نہیں ہم

نصرت

○

بن ترے آئے پریشاں ہیں سبھی سامانِ عیش
ہے کہیں، مطرب کہیں، ساقی نہیں، ساغر کہیں

کاروانِ عشق سے بچھڑا ہیں اب جاؤں کدھر
گم صدائے زنگ ہے اور چل بسے رہبر کہیں

جس کو غمِ عشقِ گُل رخاں ہو
کب اس کو ہوائے بوستاں ہو

وہ دوست جو مہرباں ہو کیا غم
گو دشمنِ جاں مرا جہاں ہو

طبیبوں نے جو دیکھا نبض کو میری تو یہ بولے
یہ جاوے گا تمہارے جی کے ساتھ آزار دیکھو گے

نہ دوگے شربتِ دیدار گر بیمار کو اپنے
تو جی دے گا تمہارا طالبِ دیدار دیکھو گے

سحرؔ

شیخ امان علی

○

آسماں کو غبار ہے ہم سے
ایک دن خاک میں ملا دے گا

اس کے دینے کے ہیں ہزاروں ہاتھ
وہی دیتا ہے کوئی کیا دے گا

مے کدے سے اُٹھا ہے ابرِ بہار
میرے دل کی لگی بجھا دے گا

اپنے مٹنے کا غم نہیں ہم کو
جو بگاڑے گا وہ بنا دے گا

اس کوچے میں بیٹھے تھے کہ بس مر کے اُٹھیں گے
اب لاش پڑی ہے وہیں، مُردا نہیں اُٹھتا

چشمِ مے گوں نے اُنہیں نادم کیا
محتسب دوڑے شرابی جان کر

تعشقؔ

سید مرزا

○

باغ میں پھولوں کو روند آئی سواری آپ کی
کس قدر ممنون ہے بادِ بہاری آپ کی

بے وفائی آپ کی غفلت شعاری آپ کی
میرے دل نے عادتیں سیکھی ہیں ساری آپ کی

میکدے میں ٹوٹے جاتے ہیں ہم لڑ لڑ کے جام
نشہ پرداز ہے چشم خماری آپ کی

آج کس پر رحم آیا کس پہ روتے ہیں حضور
ہے نصیبِ دشمناں آواز بھاری آپ کی

عدم سے دہر میں آنا کسے گوارا تھا
کشاں کشاں مجھے لائی ہے آرزو تیری

مرا پیام صبا میرے گل سے کہہ دینا
چلی گئی مجھے بے ہوش کر کے بو تیری

تمام رات رہا دل سے ذکرِ غیر ترا
گلہ کیا ہو تو شاہد ہے آرزو تیری

ذکی

مہ [illegible]

( )

قاصد کے ہوش [illegible] جُدا سا
کہتا تھا کچھ زبانی اور خط میں کچھ لکھا تھا

شکلِ حباب کیا کیا آنکھوں سے رنگ دیکھے
کیا چشمِ تر کا ساغر جامِ جہاں نما تھا

اِک بات پر تمہارے سو جی سے ہم تھے قرباں
کچھ بات اب نہ پوچھو کیا جانے وہ کیا تھا

آئی صبیح رنگ پہ سُرخی شراب کی
مہتاب پر شبیہ کھنچی آفتاب کی

جوہر تو مجھ میں تھے ملکوتی صفات کے
انساں بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی

کس زندگی پہ کیجئے سامانِ بزمِ عیش
مہمان چار دن ہیں بہاریں شباب کی

قبول

مرزا مہدی علی خاں

○

یہ عشق ایسا نہیں جس کی حرارت دُور ہو دل سے
رہیں گے زندہ جب تک ہم نہ اُترے گا بخار اپنا

غرورِ حُسن سے پھر کر نظر کرتا نہیں ظالم
پریشاں توسنِ جاناں کے پیچھے ہے غبار اپنا

ملے سب دوست دشمن اپنے ہُوئے اُنس سے خالی
نہ گُل اپنا ہُوا گلزارِ عالم میں نہ خار اپنا

خزاں ہمیشہ ہے جامہ سے گُل نہ باہر ہوں
اگر بہار کی دو دن ہَوا ہُوئی تو کیا

نہ کچھ جواب ملے گا، نہ تُو پھرے گی ادھر
جو تجھ سے نامہ بری اے صبا ہوئی تو کیا

لحد میں جان سے ملنے کو جسم تڑپے گا
جو رُوح قیدِ بدن سے رہا ہُوئی تو کیا

جسم ہلکا ہُوا رُوح نے قُوت پائی
عشق میں ترکِ غذا سے مری طاقت بڑھی

سحر

(راجہ) نواب علی خاں

○

دل تھے زلفِ مسلسل کا گرفتار ہُوا
سلسلہ مل گیا زنجیر سے سودائی کا

شانہ و آئنہ اب ہاتھ سے چھٹتا ہی نہیں
خود نمائی سے بڑھا شوق خود آرائی کا

عشر کرتا ہے یہ کہنا آپ کا بالائے بام
لو سوا نیزے پہ سورج آشکارا ہو گیا

وائے ناکامی تب آیا ساقیِ پیماں شکن
جب ہماری عمر کا لبریز ساغر ہو گیا

قفس میں ناوں سے مطلب ہے یہ اسیروں کا
بہار میں نہ چھٹے ساتھ ہم صفیروں کا

بہار ہے ترے کوچے کی اس قدر دلکش
کہ پاؤں اٹھ نہیں سکتا ہے راہ گیروں کا

آباد

مرزا مہدی حسن خاں

○

زمیں کو آسماں تیرے تصور نے بنایا ہے
ملا ہے مرتبہ دل کو ہمارے عرشِ اعظم کا

اسی حسرت میں آنکھوں سے انہیں ہر دم بہاتا ہوں
کوئی تو لختِ دل میرا نگیں ہو تیرے خاتم کا

جا کے ہو آتا ہے ہر دم یار تک پیک خیال
میں نہیں محتاج اب بہرِ خبر جاسوس کا

اب چھپانے سے ہمارے عیب چھپنے کے نہیں
سو جگہ سے چاک پردہ ہو گیا ناموس کا

تیس دن میں ایک دن دیکھا نہ روئے رشکِ ماہ
میں نے منہ اس چاند میں دیکھا تھا کس منحوس کا

آتا ہے جی میں چیر کے پہلو کو ایک دن
دکھلا دوں اس کو حالِ دلِ بے قرار کا

دل میں کبھی نہ گردِ کدورت کو راہ دے
اس آئنہ میں کام نہیں ہے غبار کا

ماہ

مرزا عنایت علی بیگ

○

برباد میری خاک نہ کر کوئے یار سے
اِس سرزمیں سے مجھ کو نہ اے آسماں اُٹھا

کس روز رو برو مرے آئے وُہ بے نقاب
آنکھوں کے سامنے سے یہ پردہ کہاں اُٹھا

کیا سُوجھی ہم کو مشقِ تصور سے دُور کی
آنکھوں کے آگے پھر گئی صورت حضور کی

تم سے پری کی شکل ہے اچھی نہ حُور کی
دل دے رہا ہے مجھ کو خبر دُور دُور کی

اچھا ہُوا حرم سے نکالے گئے صنم
صورت یہی تھی شانِ خُدا کے ظہور کی

تم ساحبیں زمانہ میں اب دُوسرا نہیں
اعضاء ہیں سب بشر کے تو صُورت ہے حُور کی

حاصل ہُوا ہے خواب میں مجھ کو وصالِ یار
یُوسف کو ڈھونڈتا ہُوں میں تعبیر کے لئے

خلیل

دوست علی

○

تھی کس کو صنم آپ کے آنے کی توقع
آنا مرے گھر میں ہے خدا ساز تمہارا

یاں داغ ہے واں آپ کا آئینہ مصاحب
دل سوز یہ میرا ہے وہ دمساز تمہارا

مرتا ہوں خبر لو مری اے رشکِ مسیحا
کیا حشر کو کام آئے گا اعجاز تمہارا

دیکھیں نہ تجھے صبح و مسا ہم سے نہ ہوگا
یہ اے بُتِ کافر بہ خدا ہم سے نہ ہوگا

ترجیح عبث دیتے ہو فرہاد کو ہم پر
سر پھوڑ کے مرجائیں یہ کیا ہم سے نہ ہوگا

مُجرم ہیں گنہگار ہیں شرمندہ ہیں دل میں
مُنہ اس کی طرف وقتِ دُعا ہم سے نہ ہوگا

تعریفِ بُتاں کیجئے کیا حد سے زیادہ
کہہ دیجئے بندے کو خُدا ہم سے نہ ہوگا!

منتہی

مرزا مہتاب بیگ

○

اشک کو تاثیر دی اچھا کیا
قطرۂ ناچیز کو دریا کیا

شربتِ وصلت پلایا یار نے
ہجر کے بیمار کو اچھا کیا

دھجّیاں دکھلاؤں گا فردِ جبیں
حشر میں پوچھا جو مجھ سے کیا کیا

تاثیرِ عشق گبر و مسلماں پہ کر گیا
ساقی شرابِ ناب سے دو جام بھر گیا

اچھا ہوا شباب کا عالم گذر گیا
اک جن چڑھا ہوا تھا جو سر سے اتر گیا

اس کا بندِ نقاب وا تو نہیں
درِ باغِ ارم کھلا تو نہیں

سروِ حاضر ہے جانِ عاشق بھی
اور صاحب کا اذعا تو نہیں

اعظم

مرزا اعظم علی

○

ساقی نے دیا جام مئے بے خبری کا
اب ہوش ہے شیشے کا نہ شیشے کی پری کا

ہر ظلم رسیدہ ہے ترے جور سے راضی
شکوہ نہیں کرتا کوئی بیدادگری کا

لیلیٰ کو کھولنے دو ذرا گیسوئے دراز
مجنوں کے بند بند میں زنجیر دیکھنا

آنکھوں کی آرزو پہ ذرا کھینچئے نگاہ
یہ چاہتی ہیں آپ کی تصویر دیکھنا

کوئی محل میں نہیں ہے، پسِ پردہ ہم ہیں
برملا تیس کو دعویٰ ہے کہ لیلےٰ ہم ہیں

اس لئے چپ ہیں کہ کوئی نہیں سننے والا
ورنہ کہنے کو سراپا لبِ گویا ہم ہیں

سو انگ لاتے ہیں نئے رنگ بدلتے ہیں نئے
یہ طلسمی ہے جہاں اس میں تماشا ہم ہیں

شرف

سید سادات حسین

ٹپک ٹپک کے کہیں گل بنا ، کہیں لالہ
چمن میں رنگ نہ لایا مرا لہو کیا کیا

زباں جو اُن کی شرف نشّے میں بہکتی ہے
مزے مزے کی وہ کرتے ہیں گفتگو کیا کیا

قریبِ مرگ ہوں للّٰلہ آج رہ رکھدو
گلے سے میرے لپٹ جاؤ پھر بچھڑ لینا

دُعا کو ہاتھ میں اِس شرط سے اُٹھاتا ہوں
کروں جو عرض تو اُس کو قبول کر لینا

مجھوں نے میرا داغِ جگر سر پہ رکھ لیا
یہ گل وہ ہے جو طرّۂ دستار ہی رہا

تو رہ گیا فقط ترے سودائی رہ گئے
یوسف رہے نہ مصر کا بازار ہی رہا

زلف اُلجھے گی تو شانہ سے سُلجھ جائے گی
دِل جب اُلجھے گا تو کوئی نہیں سُلجھانے کا

اسد

نواب سلیمان خاں

کچھ بھی نہ تھے ، سب کچھ ہوئے پھر کچھ بھی نہ ہونگے
آغاز وُہ ہے ، اور یہ انجام ہمارا

مجھ کو وقتہ تہ شمشیر اجل نے نہ دیا
دو گھڑی دِل مرے قاتل کا بہلنے نہ دیا

ہم کو سمجھاتے ہیں یہ ہمدم کیا
دِل ہی بس میں نہیں کریں ہم کیا

دِل اپنا تم کو دے کے مفت ہم بھی بن گئے بندے
کہو ، جو کچھ بُتو آئے تمہارے دین و ایماں میں

دِل گبر و مومن میں تیری جگہ ہے
صنم ہے کسی کا ، خُدا ہے کسی کا

یہ معشوقانِ بے پروا جہاں میں کس کے ہوتے ہیں
انہیں دِل دے کے عاشق آپ اپنی جان کھوتے ہیں

برسوں سجدے کئے کعبہ میں تمہاری خاطر
مدتوں دیر میں جا جا کے جبیں سائی کی

واسطی

سید فضل رسول خاں سندیلوی

○

مائل سے زیست وصل ہوا جانِ جاں سے کیا
زندہ بعیرِ مرگ اُٹھے درمیاں سے کیا

آزاد مثلِ سرو ہیں باغِ جہاں میں ہم
فصلِ خزاں سے ہم کو بہار و خزاں سے کیا

پھرتا رہا ہوں کرکے کبوتر کو نامہ بر
نامہ تو لے چلا ہے کہیگا زباں سے کیا

ایسا خیالِ یار نے بے ہوش کر دیا
کچھ اپنی یاد ہے نہ مجھے اب کسی کی یاد

کاٹی تمام عمر غمِ ہجرِ یار میں
مرنے کے بعد خاک کروں زندگی کی یاد

رسوا کیا، خراب کیا، دربدر کیا
یادش بخیر، کیا کروں دل کی بدی کی یاد

اوجِ بلندگی کا بھی کسی سے ہو نہیں سکتا
بڑے نافہم ہیں کرتے ہیں جو دعویٰ خدائی کا

جوشؔ

نواب احمد حسن خان

○

سچ کہتے ہیں کہ نام محبت کا ہے بُرا
اُلفت جتا کے دوست کو دشمن بنا لیا

دامن حضرتِ یوسف کے اُڑائے پرزے
پاسِ عصمت تجھے اس وقت زلیخا نہ ہوا

سرتیں مُردہ دلوں کی کبھی زندہ ہوئیں
نام رکھا ہے عبث تم نے مسیحا اپنا

خضر گم گردہ راہ ہیں اے جوشؔ
چاہیے راستہ بتا دینا

مجھ جاں بلب کے پاس سے جاتے ہو گھر کہاں
پھر تم کہاں، یہ عاشقِ خستہ جگر کہاں

کہتے ہو کیا حضور کہ آئیں گے وقتِ صبح
اس شب کو خاتمہ ہے ہمارا، سحر کہاں

ان آنکھوں کی بدولت دل پہ آفت آ ہی جاتی ہے
نظر کوئی نہ کوئی اچھی صورت آ ہی جاتی ہے

جنوںؔ

نواب سراج الدولہ سراجِ جنگ علی محمد خاں

○

دوا تھا مرضِ عشق دوا کیا کرتا
التجا کر کے طبیبوں سے بھلا کیا کرتا

زندگی ہجر میں تھی موت سے بدتر میری
اپنے جینے کی خدا سے میں دُعا کیا کرتا

چند دن جی کے فقط فرض ادا کرنا تھا
تیرا بیمار جو کرتا نہ قضا کیا کرتا

نہیں زیبا، شکایت کیا کریں ہم خوش جمالوں کی
جُدا ہوتی ہیں جب سے خصلتیں ان بے مثالوں کی

گرا یا دیدۂ مردم سے ہم کو چشمِ گریاں نے
دِکھائی زردیٔ رخسار نے صورت ملالوں کی

دو جہاں تلک موقع نہیں ملتا رسائی کا
ہمارا قصد ہے مدت سے قسمت آزمائی کا

جہاں میں چار سو شہرہ ہے جس کی بیوفائی کا
اسے دل دے کے کیوں الزام لوں ساری خدائی کا

ہوشؔ

نواب نیاز احمد خاں

○

باغباں تو دشمنِ بُلبل ہے اے خارِ چمن
تو بڑھا کر ہاتھ چھیں کا گریباں گیر ہو

تب ہو لطفِ قید جب ڈالو گلے میں ہاتھ تم
طوقِ گردن میں پڑا ہو ہاتھ میں زنجیر ہو

زیست میں کیا پوچھتے ہو ہم سے حالِ بعدِ مرگ
خواب سے پہلے بیاں کیا خواب کی تعبیر ہو

ابھی تو عالمِ وحشت میں چاک کر دیتا
جو میرے ہاتھ میں دامانِ آرزو ہوتا

سمجھتے شیخ کو ہم رازدار تب تیرا
کہ لب پہ ذکرِ بتاں اور دل میں تو ہوتا

قطرۂ اشک ہوں دکھلایئے مجھ کو جلوہ
شجرِ طور نہیں ہوں جو میں جل جاؤں گا

گرم کیوں ہوتے ہو محفل میں مجھے دیکھ کے تم
شمع ساں خود ہی سحر تک میں پگھل جاؤں گا

ریحاںؔ

دیا کرشن

○

سُنت ہے تیغِ تیز پہ خنجر پہ اتہام
قاتل میں کشتہ ہوں تری ترچھی نگاہ کا

عقدہ کھلتا ہی نہیں تقدیر کا
گھس گیا ناخن مری تدبیر کا

نوکِ مژگاں کی خطا اس میں نہیں
خود بنا عاشق نشانہ تیر کا

تیرے لب کو نبات کہتے ہیں
ہم بھی کیا میٹھی بات کہتے ہیں

خواہ ثابت ہوں خواہ سیارے
سب کو ہم بے ثبات کہتے ہیں

دل خمیدہ کہتا ہے نہ بولوں یار سے لیکن
جب آنکھیں چار ہوتی ہیں مروّت آ ہی جاتی ہے
چھپائے سے نہیں چھپتا ہے ریحاںؔ نشۂ الفت
ضرور آنکھوں میں کچھ اس مے کی رنگت آ ہی جاتی ہے

مخمورؔ

محمد جعفر لکھنوی

○

ترے چمن کی روش باغباں نہیں معلوم
اسیرِ تازہ ہوں طرزِ فغاں نہیں معلوم

کیا ہے شرمِ محبت نے ایسا پوشیدہ
کہ مجھ کو بھی سرِ رازِ نہاں نہیں معلوم

یاروں سے میں گو جدا رہا ہوں
پر دل سے تو آشنا رہا ہوں

گلشن اک مدرسہ ہے میرا
بلبل کو سبق پڑھا رہا ہوں میں

غم ہو تو اُمید رکھ خوشی کی
رونا بھی دلیل ہے ہنسی کی

ہر ایک نفس کی آمد و شد
دیتی ہے خبر روا روی کی

عیشیؔ

طالب علی خاں لکھنوی

○

جلا دے طور او سوزِ نہانی
اُٹھائے کون نازِ لن ترانی

کہاں ہم اور کہاں یہ نکہتِ گل
نسیمِ صبح تیری مہربانی

شرابِ صاف کا دے جام ساقی
مکدر ہے زلالِ زندگانی

نہ پیری میں ستا اے عشقِ عشق
اُٹھاتی تھی ترے صدمے جوانی

کیا خاکِ درِ میخانہ مجھ کو
جزاک اللہ دورِ آسمانی

شبِ غم میں مُوا جل جل کے عیشیؔ
سُنا سے شمعِ محفل کی زبانی

غافلؔ

منوّر خاں

○

آ کے سجّادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد

دوستی کا بھی تجھے پاس نہ آیا ہے ہے
تو نے دشمن سے کیا میرا گلا میرے بعد

گرمِ بازارئ اُلفت ہے مجھی سے ورنہ
کوئی لیتے کا نہیں نامِ وفا میرے بعد

مُنہ پہ لے دامنِ گُل روئیں گے مرغانِ چمن
باغ میں خاک اُڑائے گی صبا میرے بعد

تیز رکھنا سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

مسرور کاکوروی

شیخ میر بخش

○

دن وصل کے، رنج شبِ غم بھول گئے ہیں
یہ خوش ہیں کہ اپنے تئیں ہم بھول گئے ہیں

ں دن سے گئے اپنی خبر تک نہیں بھیجی
شاید ہمیں یاران عدم بھول گئے ہیں

یارست و نیخ اب ہے مرادات ہمیں کو
یا آپ ہی کچھ طرزِ ستم بھول گئے ہیں

کچھ ہوش ٹھکانے ہوں تو لیں نام کسی کا
ہم دے کے کہیں دل کی رقم بھول گئے ہیں

تو مجھ سے دشمنی بھی فلک اس قدر نہ کر
کس نے کہا ہے ہجر کی شب کو سحر نہ کر

مرنے کو زندگی تو سمجھ دردِ عشق میں
مسرور اپنی جان کا ہرگز خطر نہ کر

اختر

محمد صادق خان

○

عجب ڈھب کی یہ تعمیرِ خراب آباد بستی ہے
کہ پستی یاں بلندی ہے، بلندی یاں کی پستی ہے

تردد کیوں نہیں اے ساکنانِ مُلکِ ہستی ہے
عدم کی راہ سیدھی ہے، بلندی ہے نہ پستی ہے

وصال اس کا عوض مرنے کے گر ٹھہرے غنیمت ہے
متاعِ وصلِ جاناں، جان دینے پر بھی سستی ہے

حصولِ جاہ کی تدبیر جو ہم لوگ کرتے ہیں
ہماری سعیِ باطل دیکھ کر تقدیر ہنستی ہے

سمجھ ہر ایک کو ہشیار ہم آئے تھے یاں اخترؔ
بچشمِ غور جو دیکھا تو متوالوں کی بستی ہے

صاحب و شفیق

لچھمی نرائن

○

شمع پر پروانہ جل کر راکھ ہو
عاشقی کا نام روشن کر گیا

بہار آئی جنوں نے سر اٹھایا ہے خدا حافظ
نسیم صبح نے دل کو ستایا ہے خدا حافظ

مرا دل لینے ہی تک آشنا تھا
تری آنکھیں پھرانے کے تصدق

میں اپنے دردِ دل کہنے کے صدقے
ترے سُن سُن کے چُپ رہنے کے صدقے

مت کوئی روشن کرو تربت پہ مجنوں کی چراغ
رُوح جل جاوے گی دیوانے کی پروانے کے ساتھ

کیا ہوا ہے کس طرح کا ابر ہے
جس کو دل چاہے نہ ہو کیا جبر ہے

جوشش

شیخ محمد روشن

○

نہ بھولتے ہیں شگوفے نہ غنچے کھلتے ہیں
چمن میں شور پڑا کس کے مسکرانے کا

قیس بھرا جو رہا دشت میں دیوانہ تھا
اس کو لیلےٰ ہی کے دروازے پہ مرجانا تھا

کل بزم میں سب پہ نگہِ لطف و کرم تھی
اک میری طرف تُو نے ستمگار نہ دیکھا

جز چشمِ بتاں میکدۂ دھر میں جوشش
ہم نے تو کسی مست کو ہشیار نہ دیکھا

نگاہِ لطف سے دیکھا یہی غنیمت ہے
سلام اُس نے ہمارا لیا لیا نہ لیا

بیتاب

سنتو کمم رائے

○

رہے باغِ جہاں میں کچھ آرام سے ہم
پھنس گئے قیدِ قفس میں جو چھٹے دام سے ہم

اپنے مذہب میں ہے اک شرط طریقِ اخلاص
کچھ غرض کچھ سے رکھتے ہیں نہ اسلام سے ہم

محبت کی بھی کچھ ہوتی نہیں کیا ہم نشیں اہیں
کہ خوباں یوں ہمیں دکھ دیں ہم ان کو اہ اس طرح چاہیں

مدت سے انتظار میں اپنی کٹی ہے یاں
اب تک جو ہم نہ آئے الٰہی کہاں رہے

عشق میں گاہے عسل گہ نیش ہے
بت نیایاں ماجرا درپیش ہے

خدا کسی کو گرفتار زلف کا نہ کرے
نصیب میں کسی کافر کے یہ بلا نہ کرے

گرفتار

سنگی بیگ

○

ساقی یہ غنیمت ہے جو دم جام سے گذرے
اس عالمِ فانی میں بھروسا نہیں دم کا

جستجو دنیا میں مت کر اے گرفتار اس قدر
کیا بھروسا ہے جہاں میں عمرِ بے بنیاد کا

خانہ خراب عشق کا ہو اور کیا کہوں
خوابِ عدم سے سوتوں کو ناحق جگا دیا

لطف سے تیرے تو کچھ اور نہیں پر ہم کو
ناتوانی سے ہے ہر ایک قدم پر منزل

شکایت ترے جور کی کیا کریں ہم
خدا جو دکھاتا ہے ہم دیکھتے ہیں

جگر جل گیا آتشِ غم سے اپنا
تعجب ہے آنکھوں کو نم دیکھتے ہیں

حسنؔ

خواجہ حسن

○

یہی سوزشِ عشق ہے تو الٰہی
اس آغاز کا کیونکہ انجام ہوگا

رہی بے قراری اسیروں کی یوں ہی
تو صیاد! ٹکڑے ترا دام ہوگا

موئے ہم تو پر بے قراری وہی ہے
خدا جانے کب دل کو آرام ہوگا!

اگر نزع سے جان بخشی کو آئے
تو اس میں تمہارا بڑا نام ہوگا

کیا قتل اور جان بخشی بھی کی
حسنؔ اس نے احساں دوبارہ کیا

امنڈ کے آنکھ سے اک بار بہ چلے آنسو
ہنسی ہنسی میں جو ذکرِ وداعِ یار ہوا

وہ جب تک کہ زلفیں سنوارا کیا
کھڑا اُس پہ میں جان وارا کیا

خاموشؔ

شاہ معین الدین

○

شکلِ انساں میں خدا تھا مجھے معلوم نہ تھا
حق سے ناحق میں جدا تھا مجھے معلوم نہ تھا

ایک مدت حرم و دیر کو ڈھونڈا ناحق
سیم بر، بر میں چھپا تھا، مجھے معلوم نہ تھا

ہو کے خاموشؔ عجب سیر و تماشا دیکھا
رنگ بے رنگ ہوا تھا، مجھے معلوم نہ تھا

کفر کافر کو بھلا شیخ کو اسلام بھلا
عاشقاں آپ بھلے اپنا دل آرام بھلا

آشیاں اپنا گلستاں سے اٹھالے بلبل
باغ کو چھوڑ دے، جنگل کی ہوا لے بلبل

چھیڑے کرتی ہے کیا؟ اس سے نہیں کچھ حاصل
مثلِ پروانہ پہ و بال جلالے بلبل

چڑھا ہے سولی پہ خاموشؔ ہو کے جب منصور
سوائے حق نظر آئی نہ دار آنکھوں میں

فیضؔ

میر شمس الدین

○

حرم میں دیر میں جب کوئی روبرو آیا
مجھے یقین ہوا بس یہی کہ تُو آیا

اڑائیں جیب کی لاکھوں ہی دھجیاں میں نے
مگر نہ قبضے میں دامانِ آرزُو آیا

کسی کا کوئی بھی ممنون نہیں ہے کہ اعتساف
ادھر سے میں نکل آیا ادھر سے تُو آیا

خطِ جادو ہُوں یا میں نقشِ پا ہُوں
غرض افتادگاں کا رونما ہُوں

عبث رکھتے ہیں مجھ پر تہمتِ مرگ
بہت راتوں جگا تھا، سو رہا ہُوں

نہ کر! اس چشم کا پھر مجھ کو بیمار
ابھی اے فیضؔ مر مر کے جیا ہُوں

نہیں فرق کچھ دیر میں اور حرم میں
جو بُت چاہتے ہیں خُدا چاہتا ہے

رستمؔ

بندرابن

○

نامہ کا میرے اس سے لے کر جواب پھرنا
پردا سطے خُدا کے قاصد! شتاب پھرنا

اک وے بھی دن تھے یارب! جو تھا ہمیں میسّر
گلشن میں ساتھ اُس کے پیتے شراب پھرنا

کہے کیا دردِ دل بُلبل گلوں سے
اُڑا دیتے ہیں اُس کی بات ہنس کر

جو چاہے گوہرِ مقصود اے دل
صدف کی طرح تُو پاسِ نفس کر

مژگاں سے دل بچے تو، ٹکڑے کرے ہے ابرو
یہ کہہ کے میں نے اُس سے جب دل کی داد چاہی

کہنے لگا کہ "ترکش جس وقت ہووے خالی
تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی"

وفاؔ

نول رائے

○

عارض پہ تمہارے یہ پسینا
ہیرے کا ہے، لعل پہ نگینا

اس غم میں بھی گر رہا سلامت
پتھر سے بھی سخت ہے یہ سینا

اُس کو منظور یاں سے جانا تھا
گریہ میرا فقط بہانا تھا

دل نہ کرتا تھا اس طرح سے خراب
عاقبت وہ ترا ٹھکانا تھا

کل دل کو لیا، مکر گئے آج
بس! آپ کا اعتبار دیکھا

نیچے ہے اک نگاہ پہ دل کے تئیں وفاؔ
لینا ہو گر تمہیں تو کچھ اتنا گراں نہیں

لُطفؔ

مرزا علی

○

چمن کو کل جو تری مے کشی کا دھیان رہا
ہر ایک پات کے کھڑکے پہ گُل کا کان رہا

جو عُمرِ خضر ہو شاید، تو وصل ہووے نصیب
یہ زندگی جو تھی اس میں تو امتحان رہا

مَیں کیا ہُوں بانتہ رنگ اس شعلہ رُو کے آگے
مہتاب کے بھی مُنہ پہ چھٹتی ہوائیاں ہیں

طاقت حباب ساں، اک نظارہ کی ملی ہے
ان فرحتوں پہ ظالم یہ خود نمائیاں ہیں

اے لُطفؔ! اس غزل پر کہنا بقول سوداؔ
یہ عاشقی نہیں ہے زور آزمائیاں ہیں

وہ خود فروش آگیا ہا رے چمن میں کل
بوئے خودی نکل گئی گُل کے دماغ سے

ہووے فضائے ہستیٔ موہوم کا بُرا
کنجِ عدم میں کاٹتے تھے کس فراغ سے؟

مائل

میر محمدی

○

تا میں مرکے دل سے ترے دُور ہو گیا
اک دن بھی آکے تُو نہ سرِ گور ہو گیا

نالے کو ہم نے ضبط کیا ناصحا تو کیا
رُخ سے تو زرد رنگ چھپایا نہ جائے گا

اشک کی طرح گر اب تو پھر اُٹھنا معلوم
میں وُہ اُفتادہ نہیں ہُوں کہ سنبھل جاؤں گا

سب یار ہیں تمہارے اغیار ہیں تو ہم ہیں
آنکھوں میں یاں سبھوں کے اک خار ہیں تو ہم ہیں
اچھا بھلا ہے تُو تو، پیارے! تری بلا سے
آزار ہے تو ہم کو، بیمار ہیں تو ہم ہیں

کیا تعجب نہیں گر مر گیا مائل تیرا
یار کیا لگتا ہے انسان کے مر جانے کو

عشق

رکن الدین

○

اس کی لذت کو دِل سمجھتا ہے
اس کو میں کیا کہوں کہ کیا دیکھا

دشت! تجھ کو قسم ہے مجنوں کی
عشق سا کوئی برہنہ پا دیکھا

اپنی آنکھوں سے دیکھ اے خوش چشم
مُجھ سے کیا پُوچھتا ہے کیا دیکھا

اس کے دامن تلک نہ پہنچے ہم
خاک میں آپ کو مِلا دیکھا!

بات کہنے کی نہیں طاقت، شکایت کیا کروں
عشق رخصت دے تو شورِ حشر برپا کر دوں

باتیں نہ سُن تُو میری جل جائے گا دِوانے
میں برقِ آسماں ہُوں یا عشق کی زباں ہُوں

شاعر
میر کلّو

○

بھول کر بھی ادھر نگاہ نہ کی
کہہ! ترا اس میں کیا ضرر ہوتا

دیوانہ ہے جنوں سے کہیں مر نہ جائے دل
نامِ بہار رُو برو اس کے نہ لو عبث

رونے میں دم کے رُکنے کی گر ہے یہی طرح
تو جوشِ غم سے ہم نہیں بچتے کسی طرح

یاں تک تو عزیز تھا ترا غم
لے گور میں بھی اسے گئے ہم

کیوں نہ ہو دے بہار آنکھوں میں
ہے مرا گلعذار آنکھوں میں

کیا کیا اثر دیئے ہیں بتوں کی نگاہ کو
یارب عطا ہو کچھ تو ہماری بھی آہ کو

جوہر
مادھو رام

○

کیا یاد کر کے روؤں کہ کیسا شباب تھا
کچھ بھی نہ تھا، ہوا تھی، کہانی تھی، خواب تھا

اب عطر بھی ملو تو تکلّف کی بُو کہاں
وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا

محمل نشیں جب آپ تھے لیلےٰ کے رُوپ میں
مجنوں کے بھیس میں کوئی خانہ خراب تھا

پیری میں ایک ہی سے ہمیشہ رہیں گے دن
وہ اور تھا زمانہ جسے انقلاب تھا

تیرا قصور وار خدا کا گنہگار
جو کچھ کہ تھا یہی دلِ خانہ خراب تھا

ذرہ سمجھ کے یوں نہ ملا مجھ کو خاک میں
اے آسمان، میں بھی کبھی آفتاب تھا

جوہر

منشی جواہر سنگھ

○

صنم بھی اس کے مظہر ہیں کروں سجدہ نہ کیوں جوہرؔ
نظر آتا ہے جو کچھ ہے نمونہ اس کی قدرت کا

ٹھہرا وصال وعدۂ فردائے حشر پر
دل کو یہاں تحمل روز دگر نہ تھا

خار کی طرح ملی باغ جہاں میں تقدیر
جس سے پستوں وہ نچوڑا لیتا ہے دامن اپنا

ہم نے عشقبازی کو تم نے دلنوازی کو
کوئی اس عالم اسباب میں کب بے سبب آیا

سب کھینچتے ہیں نالۂ گرم اس کے واسطے
اک شمع نے لگائی ہے یہ انجمن میں آگ

وہ بادہ خوار ہوں پہنچوں گا جب لب کوثر
تو دیں گے ساقیٔ کوثر بھی بھر کے جام مجھے

ذاکر

ذاکر علی

○

اندوہ درد و یاس و الم حسرت و ملال
کیا کیا نہ ساتھ لے کے چلے اس جہاں سے ہم

ویرانیٔ چمن کا نہ صدمہ ہو یا نصیب!
مر جائیں کاش پہلے ہی فصل خزاں سے ہم

نظروں سے آج اُن کی گرا یک اُتر گئے
رہنے کا ہے محل کہ گرے آسماں سے ہم

صیاد کس کو اب ہے رہائی کی آرزو
کنج قفس میں خوش ہیں کہیں آشیاں سے ہم

اسیری نے کیا ہے تنگ جاں سے
گلا گھٹنے لگا طوق گراں سے

خدائی کا ہے دعویٰ کس زباں سے
کوئی پوچھے بتانِ بے دہاں سے

جیا تنہا مثالِ خضر تو کیا!
ہیں در گذرا حیاتِ جاوداں سے

سحر

اقبال بہادر ورما

○

کسی رنگ میں دلستانی نہیں ہے
کوئی شے یہاں جاودانی نہیں ہے

ہے ٹھہراؤ بھی حرفِ فانی نہیں ہے
حقیقت ہے دنیا کہانی نہیں ہے

خیالات کی شاد و آباد دنیا
کسی طرح بھی آنی جانی نہیں ہے

لہو ہے لہو سب یہ توبہ کا دل میں
سبو ہے مے ارغوانی نہیں ہے

عجب ہے یہ حالت مرے آنسوؤں کی
نری آگ ہے ان میں پانی نہیں ہے

ارے مجھ میں چھپ کر یہ کیا کہہ رہے ہو
مری بات میری زبانی نہیں ہے

بھرے ہیں دلوں میں گماں کیسے کیسے
یہ کیا ہے اگر بدگمانی نہیں ہے

نہ جینا خوشی کا نہ مرنا خوشی کا
خوشی تو ہے جب زندگانی نہیں ہے

زمیں پر ہے پورا اثر آسماں کا
محبت نہیں، مہربانی نہیں ہے

خدا خود میں ہے آپ اپنی نشانی
غلط ہے کہ اس کی نشانی نہیں ہے

جو اس صنف میں سحرؔ ہے مشق کم کم
غزل میں وہ جادو بیانی نہیں ہے

عزیزؔ صفی پوری

منشی ولایت علیخان

○

بلا کے بات بھی کی اور مسکرا بھی دیا
کیا شہید بھی قاتل نے خوں بہا بھی دیا

گیا جو نامہ بر، آیا بہت سراسیمہ
کہا کہ چاک کیا خط کو اور جلا بھی دیا

سنبھلتے حضرتِ موسیٰ مگر ستم یہ ہوا
دکھا کے جلوۂ دیدار کچھ سنا بھی دیا

میں وہ چراغ ہوں جس کو فروغ ہستی نے
قریبِ صبح کیا روشن اور بجھا بھی دیا

عزیزؔ اس کے کرم پر فدا نہ ہوں کیونکر
کہ عشق دے کے مجھے عشق کا مزا بھی دیا

احسن لکھنوی

مہدی حسن

○

دل کی وحشت نہ گئی خاک میں مل جانے سے
آندھیاں اٹھنے لگی ہیں مرے ویرانے سے

روز کرتا ہوں درستی شکست توبہ
ٹوٹ کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے ترے پیمانے سے

جام کے دور مسلسل سے ہے دنیا قائم
چرخ نے سیکھی ہے گردش مے پیمانے سے

مل نہ جائے کوئی رستے میں خدا کا بندہ
منہ لپیٹے ہوئے نکلا ہوں صنم خانے سے

ہوتی جاتی ہیں بہت وصل کی راتیں کوتاہ
کہاں دور بدل لے مرے پیمانے سے

پردۂ راز حقیقت جو اٹھا دوں احسن
شور تکبیر ہو پیدا ابھی بت خانے سے

سرور

منشی دُرگا سہائے جہاں آبادی

○

کسی مست ناز کا ہے عبث انتظار سوجا
کہ گذر گئی شب آدھی دل بے قرار سوجا

نہ تڑپ زمیں پہ ظالم تجھے گود میں اٹھالوں
تجھے سینے سے لگالوں تجھے کروں پیار سوجا

یہ تری صدائے نالہ تجھے مضطرب نہ کردے
مرے پردہ دار سوجا مرے راز دار سوجا

یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا کے سرد جھونکے
تجھے دے رہے ہیں لوری مرے غمگسار سوجا

تجھے پہلا سابقہ ہے شب غم بری بلا ہے
کہیں مرمٹے نہ ظالم دل بے قرار سوجا!

تشنہ

حافظ محمد یوسف خاں بلند شہری

○

ہر چند کہ ہے نشو و نما تیرے کرم سے
خالق ترے انعام بیاں ہو نگے نہ ہم سے

اس پر بھی تو تقدیر کا لکھا نہیں مٹتا
رگڑی ہے جبیں ہم نے ترے نقش قدم سے

وعدے پہ قسم سوچ کے کھاؤ میرے آگے
جھوٹے نہ ٹھہر جاؤ کہیں جھوٹی قسم سے

اے تشنہ کہاں ذوق کہاں مومن و غالب
اس فن کا فقط نام ہے اب داغ کے دم سے

دل میں ہے یہ پوچھو اس سے جاکر
کیا تجھ کو ملا مجھے ستا کر

اتنا نہ ستا کہ یہ دل زار
فریاد کرے کسی سے جاکر

شوق

پنڈت جگموہن ناتھ رینہ؛

○

عشق کا راز نہ کیوں دل سے نمایاں ہو جائے
کاش یہ بھی کسی ناکام کا ارماں ہو جائے

نہیں امید کہ وہ حشر بداماں ہو جائے
ایسا دیوانہ جو خود داخل زنداں ہو جائے

درد قابو کا نہیں کاش وہ اٹھ کر شب غم
سرگذشت دل ناشاد کا عنواں ہو جائے

نہ تسلی نہ دلاسا نہ کہیں نام کو صبر
حیف اس دل پہ کہ یوں بے سروساماں ہو جائے

غنچے چٹکیں کہ کھلیں پھول بڑھے جوش نمو
حسن پنہاں کسی عنواں سے نمایاں ہو جائے

ہو یہ وحشت کا اثر خندۂ گل سے ظاہر
پھول جب کھلنے لگیں چاک گریباں ہو جائے

چشم تر، نالۂ دل، سوز دروں، درد فراق
ایک مہجور کو کیا کیا سروساماں ہو جائے

شوق مے نوش کو اتنا بھی گوارا نہ ہوا
خم میں جو درد نہ بچے مذر حریفاں ہو جائے

طالب باغپتی

نور محمد لطافت علی خان

○

پہلے تو آفتاب بنایا شباب نے
پھر اس میں چار چاند لگائے حجاب نے

[illegible] کو ڈال دیا پیچ و تاب میں
[illegible] کیا غضب کیا دلِ بے اضطراب نے

[illegible] کیا کہوں؟ کہوں کہ کشمکش میں ہوں
[illegible] ہے دلفریبیٔ طرزِ خطاب نے

[illegible] سوز روئے تجلی نہیں رہا
خود دیکھنے کی چیز بنایا نقاب نے

[illegible] کچھ ازل میں حسن سے سورج نے روشنی
[illegible] سے کسبِ نور کیا ماہتاب نے

نقش و نگارِ عہدِ تمنا بھی مٹ گئے
ایسا مٹا دیا دلِ خانہ خراب نے

طالب کسی کے سامنے اٹھ ہی نہیں سکی
ناکام ہی رکھا نگہِ انتخاب نے

نُور

میر وزیر علی

○

نہ داد ملتی تو پھر داد خواہ کیا کرتا؟
خُدا کے سامنے عُذرِ گناہ کیا کرتا؟

مواخذہ نہ بُتوں سے تھا حشر میں منظور
خُدا کو ظُلم و ستم کا گواہ کیا کرتا؟

کسی میں نام کو بوئے وفا نہیں باقی
ہر ایک گُل چمنِ روزگار میں دیکھا

سفید بال ہوئے موسمِ جوانی میں
خزاں کا رنگ شروعِ بہار میں دیکھا

پاس جانا کہاں نصیب ہمیں
دُور سے دیکھنا غنیمت ہے

رات دن اس کا نام جپتے ہیں
عاشقوں کی یہی عبادت ہے

تیرے قدموں پہ دم نکل جائے
بس یہی دل میں ایک حسرت ہے

مدہوشؔ

سنت پرشاد

○

عشق کی رَو میں کچھ اس طرح سے بہ جاتے ہیں
جو کہ کہنا نہ ہمیں چاہیئے کہہ جاتے ہیں

اور جب کہنے کی ہو بات تو اُن کے آگے
دل کو ہم تھام کے خاموش سے رہ جاتے ہیں

ہاں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رُکتے رُکتے
حُسن توفیق جو دیتا ہے تو کہہ جاتے ہیں

حسن سے سب پہ گرانی تھی بقولِ شاعر
ناتواں عشق کے اِس بار کو سہہ جاتے ہیں

بات پردے کی ہے جو حضرتِ مدہوشؔ اسے
پردۂ شعر میں کس لُطف سے کہہ جاتے ہیں

کیفی حیدرآبادی

سید رضی الدین حسن

○

ترے انداز ظالم کیا ہیں کچھ بولا نہیں جاتا
سمجھ جاتا ہوں لیکن مجھ سے سمجھایا نہیں جاتا

ترا چہرہ برابر دُور سے دیکھا نہیں جاتا
جھکتا کیوں ہے ؟ آنزدیک آ ، مَیں کھا نہیں جاتا

ترے جور و ستم بھولے ، ہم اپنے درد و غم بھولے
مگر ظالم ترا یہ بھولنا بھولا نہیں جاتا

طبیعت اس کی ، مرضی اس کی ، دل اس کا ، خوشی اس کی
جہاں جی چاہے جاتا ہے ، نہیں چاہا نہیں جاتا

ذرا دل لینے والے بھی تو سوچیں اپنی گھاتوں کو
کسی پر اد بدا کر تو مرا دل آ نہیں جاتا

آسی

عبدالعلیم

○

تاب دیدار جو لائے مجھے وُہ دِل دینا
منہ قیامت میں دکھا سکنے کے قابل دینا

شک خورشید جہاں تاب دیا دل مجھ کو
کوئی دلبر بھی اسی دل کے مقابل دینا

درد کا کوئی حص ہی نہیں جز دل کے سوا
بھر کو ہر عضو کے بدلے ہمہ تن دِل دینا

سی کے جلوے تھے لیکن وصالِ یار نہ تھا
میں اس کے واسطے کس وقت بیقرار نہ تھا

رام جلوہ کے نقشِ قدم تھے لالہ و گُل
کچھ اور اس کے سوا موسمِ بہار نہ تھا

دفورِ بیخودیٔ بزم سے نہ پُوچھو، رات
کوئی بجز نگہِ یار ہوشیار نہ تھا

لحد کو کھول کے دیکھو کہ اب کفن بھی نہیں
کوئی لباس نہ تھا جو کہ مستعار نہ تھا

پیر مُرادشاہ

○

یہاں ہجر میں کوئی دم دیکھتے ہیں
نہیں پھر تو مُلکِ عدم دیکھتے ہیں

جو اخلاص آپس میں ہوتے تھے یارو
سو رسم اس زمانے میں کم دیکھتے ہیں

اجل نے جو دی ہم کو فرصت تو ہم بھی
شتاب آپ کے آقدم دیکھتے ہیں

ہم احوال پر اپنے اے بندہ پرور
تمہارا ہی لطف و کرم دیکھتے ہیں

لڑاتا ہے غیروں سے اے شوخ آنکھیں
چُراتا ہے جس وقت ہم دیکھتے ہیں

سیہ بختی سے اپنی اس زُلف میں دل
گرفتار پُر پیچ و خم دیکھتے ہیں

یہاں سیرِ دل جس کو مدِ نظر ہے
وُہ کب جا کے باغِ ارم دیکھتے ہیں

مُراد آج کیا ہو گیا ہے بجز تیرہ
بیں نشک اور چشم نم دیکھتے ہیں

وسیمؔ

سیّد محمد عسکری شیر آبادی

○

تیرا ئیں دل میں اِک دن کے لئے
حسرتیں بے تاب ہیں ان کے لئے

ہائے کیا آئی جوانی کیا گئی
کر گئی بدنام دو دِن کے لئے

وُہ گھٹا اُٹھی ہے پی لو واعظو
ورنہ پھر ترسو گے اس دن کیلئے

غش ہوئے موسیٰ تو آئی یہ صدا
پردہ ہم کرتے تھے اِس دن کیلئے

کاملؔ

علی میاں

○

مدار کار ہے نخوت پہ نکتہ دانوں کا
ہوا کے ہاتھ میں دامن ہے بادبانوں کا

عزیز زخم جگر اس سبب سے ہے مجھ کو
کہ یادگار ہے احباب کی زبانوں کا

مٹائے نقش قدم رہبروں نے خوب کیا
کہ بیٹھنا بھی تو مشکل تھا ناتوانوں کا

خزاں میں غم شب تیرہ کا بلبلیں نہ کریں
چراغ بن کے جلے گا قفس آشیانوں کا

ہمارے دل کو شکار افگنو، ملال نہ دو
کہ تیر خوردہ ہے افلاک کی کمانوں کا

جگر بسوانی

سید محمد افتخار علی خان

○

وار کرتے ہیں وہ شمشیر ادا سے پہلے
جان لے لیتے ہیں عاشق کی قضا سے پہلے

دل پہ کرتے ہیں ستم آپ وفا سے پہلے
دی ملتی ہے سزا ہم کو خطا سے پہلے

حق ہیں موت کا احسان اُٹھانا کیسا
جان دینے کا ارادہ ہے قضا سے پہلے

دل ناکام تمنا کا ہے یہ ہجر میں حال
ناامیدی ہوئی جاتی ہے دعا سے پہلے

ہم خطاوار سرِ حشر نہ رسوا ہوں گے
بخش دیتا ہے وہ اقرارِ خطا سے پہلے

کوئی انداز جفا کرتے ہیں ایجاد اگر
پوچھ لیتے ہیں وہ اربابِ وفا سے پہلے

خونِ دل تُو نے جگر کا نہ ملا ہوا ے شوخ
ہاتھ یوں سرخ نہ ہوتے تھے حنا سے پہلے

باسط بسوانی

○

اگر پردہ دوئی ڈالے نہ رہتی درمیاں اپنا
تو میرے امتحاں کو وہ سمجھتے امتحاں اپنا

کیا یوں رازِ دل ہم نے اشاروں میں بیاں اپنا
کہ جیسے حال کہتا ہے بہ شکلِ بے زباں اپنا

وہی اک داستانِ عشق ہم دُہراتے رہتے ہیں
بدلتا رہتا ہے کچھ کچھ مگر رنگِ بیاں اپنا

چھری گردن پہ رکھے رو رہے ہیں آج مقتل میں
وہی کل جو ہنسی سمجھے تھے باسطؔ امتحاں اپنا

فیروز طغرائی

حکیم فیروز الدین

○

آ رہا ہے تیر پیہم تیر پر
آفریں ہے جذبۂ نخچیر پر

ختم ہے ہم پر اسیری عشق کی
قفل ہے ہر حلقۂ زنجیر پر

دیکھ کر خط لال آنکھیں ہو گئیں
خوب سرخی ہے مری تحریر پر

مر مٹے ہم پر رقیبِ روسیہ
ظلمتیں صدقے ہوئیں تنویر پر

کاخ ہستی ہے طلسم بے ثبات
رنگ ویرانی ہے اس تعمیر پر

ساتھ پیری سے جوانی کا نہیں
منحصر کیا ہے کمان و تیر پر

کہہ دیا جس نے ان آنکھوں کو غزال
صاد ہے اس شخص کی تقریر پر

کہہ تو دیں تاخیر وعدے کو ترے
پر اُسے تقدیم ہے تاخیر پر

دیکھ کر فیروز خواب زندگی
کھل گئیں آنکھیں مری تعبیر پر

جالب دہلوی

سید بشارت علی

○

کسی عاشق پہ جب بیداد کرنا
ہمیں بھی او ستمگر یاد کرنا

تمہیں ظالم بنایا ظلم سہہ کر
نہ یہ محنت مری برباد کرنا

نیا عاشق ہو گر پیدا تو تم بھی
کوئی تازہ ستم ایجاد کرنا

مٹانا خاک پر لکھ کر مرا نام
بنوں جب میں تو یوں بیداد کرنا

فوقؔ

منشی محمد الدین

○

سزا وار کمال اس درجہ زمانے کی ہوا ہے
انجام کے احساس سے دل کانپ رہا ہے

دل لے کے وہ پتھر کا ہے ٹکڑا
جس میں نہ حمیت نہ حرارت نہ وفا ہے

وہ شکل جو آتے ہی نظر ہو گئی غائب
جادو ہے کہ بجلی کہ چھلاوہ کہ بلا ہے

میں دعا کرتے ظلم و ستم پر بھی دعا گو
تو وہ کہ مرے عجز و دعا پر بھی خفا ہے

کس مسند ناز پر ہم بے خبر و غافل یہ تکبر
اتنا تو سمجھ کوئی رہے گا نہ رہا ہے

کشمیر جسے کہتے ہیں سب غیرت فردوس
جب تو ہی نہیں پاس تو دوزخ سے سوا ہے

تجھ سا نہ برابر کے پھرتے ہوئے سائے
اک عالم شاداب تجھے ڈھونڈ رہا ہے

گر آئینہ سر پہ ہے تو مخمل ہے تہ پا
القصہ عجب منظر پر زیب و ضیا ہے

آ اور مری چشم تصور میں سما جا
آئینہ ترا دیدہ سے بے عکس پڑا ہے

ہونے کو وہ سب کچھ ہے بانداز متین
بندہ ہے تو بندہ ہے خدا ہے تو خدا ہے

اے فوقؔ میں بزدل سلئے محتاج رفاقت
تنہا رہ منزل میں کوئی چھوڑ گیا ہے

حامیؔ

پیر وزیر علی شاہ

○

ستم کر، ظلم کر، جور و جفا کر
میں محوں راضی، جو ہو تیری رضا کر

اگر کچھ ہے سچائی کا دعویٰ
تو میرے دردِ دل کی بھی دوا کر

خیالِ یار بھی پردہ نشیں ہے
کہ چھپ جاتا ہے اپنے دل میں آکر

دلِ عشاق پر گرتی ہے بجلی
وہ جب کرتے ہیں باتیں مسکرا کر

نیرنگ

سید غلام بھیک

○

اک ہجوم غم و کلفت ہے خدا خیر کرے
جان پر نت نئی آفت ہے خدا خیر کرے

جائے ماندن ہیں عمل ہے نہ پائے رفتن
کچھ مصیبت ہی مصیبت ہے خدا خیر کرے

اُجلا اُس بُتِ عیار کی باتوں کا یقیں
سادگی اپنی قیامت ہے خدا خیر کرے

دل گیا جانے دو کافر کی ہے ایماں پہ نظر
آنکھ میں اپنی مروت ہے خدا خیر کرے

ابھی تشخیصِ مرض میں ہے طبیبوں کو کلام
جان ادھر درپے رخصت ہے خدا خیر کرے

رہنماؤں کو نہیں خود بھی پتہ رستے کا
راہ رَو پیکرِ حیرت ہے خدا خیر کرے

ازلؔ

ابوالاعجاز منشی عبدالمجید

○

اس نے مژگاں کا تان کر بھالا
اپنے عاشق کو مار ہی ڈالا

عشق گیسو کو دی جگہ دل میں
سانپ کو آستین میں پالا

تیری زلفوں کا تیری آنکھوں کا
کوئی وحشی ہے کوئی متوالا

اک نیا ظلم روز کرتا ہے
کس ستمگر سے پڑ گیا پالا

بے نوائی میں خوش ہوں اپنی ازلؔ
نے غمِ دزد نے غمِ کالا

شوق نیموی

ظہیر حسن

○

نکلے ہیں اب یہاں سینے سے نکلنے کے لئے
ہیں راستے کوئی کہہ دے سنبھلنے کے لئے

جانے دل میں ہے تو تم جو یہاں جی گھبرائے
ہے آنا تیری آنکھوں میں ٹہلنے کے لئے

جو یہاں ان کی سرِ بزم حیا سے بولیں
کچھ تو عمل سے ہوا تھم نکلنے کے لئے

نظر کو ہو نہ کیوں کر اٹھے
ہیں یہ آنے کلیجہ کوئی ملنے کیلئے

ہیں یہ ابھی اُن کا جو ہے شکوہ دل کو
کوئی ہے کوئی پہلو یہ مچلنے کے لئے

کچھ سوا ہو مگر چاہ بُری ہوتی ہے
دل کو چرکہ ہے اسی کوچے میں چلنے کیلئے

محفلِ غیر میں کیوں شمع جلائی تم نے
کیا وہاں کوئی نہ تھا رنگ بدلنے کیلئے

مر ہی جاتے اے شوق یہاں تک دل میں
اور دُھومدھام ہے راہ نکلنے کے لئے

ناظم

میرزا ناظر حسین لکھنوی

○

نور کا تیرے ازل سے آفتاب آئینہ تھا
لاجواب آئینہ ہیں تھا لاجواب آئینہ تھا

طالع بیدار نے دیکھا کھلی آنکھوں تجھے
تھی تری تصویر تعبیر اور خواب آئینہ تھا

دیدۂ جوہر نہ تھے آنکھیں ہی آنکھیں تیں کھلی
دیکھنے والوں کی نظروں کا حساب آئینہ تھا

تو نے یوں دیکھا کہ منہ پانی میں دیکھیں سب طرح
آب و تابِ حسن سے کیا آب آب آئینہ تھا

عکسِ خال و خط تھے رنگے کے کتابی کے بیاں
ایک صفحہ تھا مگر پوری کتاب آئینہ تھا

اپنے گھر میں سبھی پر بھی دربدر پھرتا رہا
سخت حیرت ہے عجب خانہ خراب آئینہ تھا

بن کے حیرت خانہ میں آیا جو وہ غیرت سوال
سارے غائب تھے مگر حافظہ جواب آئینہ تھا

صبح ہونے کو ہے دیکھیں دیکھتا ہے وہ کسے
شام سے میں جاگتا تھا محوِ خواب آئینہ تھا

جس نے رکھا اُس کو آنکھوں ہی میں اے ناظم رکھا
مردمک تصویر تھی چشمِ پُرآب آئینہ تھا

احمد

خان احمد حسین خان

○

مجھے ڈھونڈے نہ کوئی اے مقدر انکساروں میں
کسی کو مجھ سے ملنا ہے تو آئے جاں نثاروں میں

دلِ پُر داغ و چشمِ خوں فشاں کے نام لیوا ہیں،
لگے ہیں ورنہ کیا سُرخاب کے پر لالہ زاروں میں

عجب معماں فوازی ہے سرائے ملکِ فانی کی
کہ مہمانوں کو لے جا کر سلاتے ہیں مزاروں میں

فلک سمجھائے اپنے ناز پروردہ ستاروں کو
چُرا لیتے ہیں میری نیند یہ شب کو اشاروں میں

ہمارے دامنِ ہستی کے ٹکڑے ہوں نہ اے ہمدم
جو دشتِ زندگی میں ہم کو اُلجھاتے ہیں خاروں میں

مَیں تجھ سے پُوچھتا ہُوں اے تپِ فرقت کی بیہوشی
یہی تھی یاس جو بیٹھی رہی تیمارداروں میں

ہمارے دل کو دیکھو دل میں آئے داغ کو دیکھو
نہ دیکھو ماہِ کامل کو نہ جاؤ لالہ زاروں میں

بہت خوش ہوگا سن کر بھولنے والا مرا احمدؔ
مری تربت بھی یاروں کو نہیں ملتی مزاروں میں

سجّاد

سجاد علی انصاری

○

آنکھ جب تک فریب کار نہ تھی
پھول میں شوخیٔ بہار نہ تھی

اس سے پہلے بھی تیری خاموشی
تھی مگر ایسی طرفہ کار نہ تھی

یاس پہ تُو نے کر دیا مجبُور
ورنہ امید مجھ پہ بار نہ تھی

مَیں نے دیکھا تری نگاہوں کو
ان میں وہ شانِ اعتبار نہ تھی

کس طرف لے کے چلا شوق کا انداز مجھے
آج کیوں روک رہی ہے تری آواز مجھے

خار رہ میں بھی نظر آتی ہے شادابیٔ گُل
لئے جاتا ہے کدھر حُسنِ فسوں ساز مجھے؟

مجھ کو افسونِ محبت نے مٹا کر چھوڑا
تو سمجھتا ہی رہا شعبدہ پرواز مجھے

جس کے ہر رنگ پہ یہ خوبیٔ انجام نثار
یاد آتی ہے وُہ نیرنگیٔ آغاز مجھے

شیدا

رام رچھپال سنگھ دہلوی

○

قیامت ڈھائیں گے رفتار سے اصلا نہ مانیں گے
وہ جب تک حشر ہی برپا نہ ہو لے گا نہ مانیں گے

نہ مانو گے تو روزِ حشر تم پچھتاؤ گے دیکھو
مناؤ گے مگر عشاقِ بے پروا نہ مانیں گے

وہ موسیٰ تھا کہ فقرہ چل گیا واں لن ترانی کا
تمہارے طالبِ دیدار یہ دعویٰ نہ مانیں گے

بجز عشقِ بتاں عشقِ خدا ہو، ہو نہیں سکتا
اگر ہم مان بھی لیں حضرتِ شیدا نہ مانیں گے

شمس مینائی

ابو المعانی شیخ عبد الرحمٰن امرتسری

○

سناؤں کیا کسی کو میں سنے گا کوئی کیا میری
نہ وہ عالم ہے اب میرا نہ وہ دلبستگی میری

گئے وہ دن کہ میں اور وہ شریکِ بزم ہوتے تھے
سنا کرتے تھے اہلِ دل کبھی جن کی کبھی میری

یہ منظر آخرِ شب کا ہے دیکھو چشمِ عبرت سے
کہ ہے مہمان کوئی دم کی شمعِ زندگی میری

نہ پوچھو کچھ یہ ظاہر داریاں رہنے بھی دو صاحب
کسی کو کیا کٹی جیسی کٹی ہاں کٹ گئی میری

تمہیں تو ایک ساعت کیلئے بھولا نہیں ہوں میں
مگر کہئے تمہیں بھی یاد کیا آئی کبھی میری

غضب ہوتے ہوئے آنکھیں دکھائی کچھ نہیں دیتا
سیاہی سے بدل کر رہ گئی ہے روشنی میری

یہ فیضِ صحبتِ اہلِ سخن ہے کچھ جو لکھتا ہوں
نہیں تو شمس کیا اردو مرا کیا فارسی میری

اشک

واجد علی خاں عرف اچھن صاحب رامپوری

○

اِک دن وہ مل گئے تھے سرِ رہ گزر کہیں
پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں

اندازِ اعترافِ محبت تو دیکھئے
میری نظر کہیں ہے تو اُن کی نظر کہیں

اِن ہمدموں کی کارگزاری نہ پوچھئے
دل سے بنا بنا کے اِدھر کی اُدھر کہیں

اے رازداں یہ سب ترے کہنے کی بات ہے
رکھتے ہیں ورنہ کان بھی دیوار و در کہیں

اس نکتہ چیں کو حال سنانے چلے تو اشکؔ
اپنی زباں جواب نہ دے وقت پر کہیں

اظہر امرتسری

خدا بخش

○

یہ روزِ قیامت ہے تکمیلِ تمنا کر
یا آج بھی دھوکا دے یا وعدۂ فردا کر

یا پردے سے باہر آ جلوے کو بھی رسوا کر
یا عشق کی رسوائی چھپ چھپ کے نہ دیکھا کر

یہ میرا سیہ خانہ یہ حجرہ کی تاریکی
آ تو بھی یہاں روشن شمعِ رخِ زیبا کر

اے ساقیٔ مے خانہ اک ساغرِ بادہ سے
مفلس کو سکندر کر نادار کو دارا کر

مفہومِ تمنا پر آتی ہے ہنسی مجھ کو
جس وقت وہ کہتے ہیں اظہارِ تمنا کر

امروز کی محفل میں پینے دے مجھے واعظ
تو بیٹھ کے مسجد میں اندیشۂ فردا کر

میں طالبِ جلوہ ہوں وہ کہتے ہیں اے اظہرؔ
سورج کی نگاہوں سے شبنم کو نہ دیکھا کر

عابد شاہجہانپوری

عابد حسین

○

زندگی سے آشنا تھی نظر — ہم اُٹھے میکدے سے جب پی کر
دور ہوں انقلاب عالم سے — میری دُنیا میں شام ہے نہ سحر
آپ اور پرسشِ دل غم گیں — یہ بھی شاید ہے اک فریب نظر
اب یہ عالم ہے وحشتِ دل کا — لوٹ آتا ہوں دو قدم چل کر
سرگزشتِ نگاہ کیسا کہئے — جیسے اک برق جیسے اک محشر
کوئی آیا میں سمجھا آپ آئے — اللہ اللہ یہ بے خودی نظر
عرق آلودہ ہے جبیں جیسے — جیسے شبنم گری ہو پھولوں پر

ذرّے لَو دے رہے ہیں اے عابد
رشکِ فردوس ہے فضائے سحر

عیش

جان محمد خان غوری فیروزپوری

○

ہم یوں تڑپ رہے ہیں ترے آستاں سے دُور
جیسے کوئی اسیرِ قفس آشیاں سے دُور

تُو ہر مقام پہ ہے نگاہوں کے سامنے
مَیں ہر مقام پر ہُوں ترے آستاں سے دُور

منزل جُدا، خیال جُدا، شوقِ دل جُدا
مَیں کارواں کے ساتھ ہُوں یا کارواں سے دُور

بزمِ جہاں کی سیر بہت کر چُکا ہُوں مَیں
اے عشق لے چل اور کہیں اس جہاں سے دُور

جنت کی جُستجو ہے جسے چل کے دیکھ لے
نزدیک ہے کہ پیرِ مغاں کی دُکاں سے دُور

ایک ایک سے زیادہ ہیں دُنیا میں کم نصیب
بلبلِ چمن سے ہم ہیں ترے آستاں سے دُور

اُن کا خیال عیشؔ پھر اُن کا خیال ہے
رہتے جہاں میں رہ کے ہوں رہتے جہاں سے دُور

نیّر واسطی

حکیم سیّد علی احمد

○

پھر ہجر و فراق کی گھڑی ہے
عُمرِ غم آرزُو بڑی ہے

پلکوں پہ مچل رہے ہیں انجم
کس چاند سے آنکھ جا لڑی ہے

آجاؤ کہ ایک بار ہنس لیں
"رونے کو تو زندگی پڑی ہے"

یہ ظلمتِ شب یہ جوشِ گریہ
برسات کی رات کی جھڑی ہے

جنگل پہ لپک رہے ہیں شُعلے
طاؤس کو رقص کی پڑی ہے

نیّر کو سلامِ غم مُبارک
منزل مگر عشق کی کڑی ہے

عبرت

محمد تبارک علی صدیقی

○

گو میسّر تھا پھُولوں کا سایا
پھر بھی کانٹوں کو ہنسنا نہ آیا

بے نیازانہ گذرے چمن سے
ہم نے پھُولوں سے دامن بچایا

ان کی آنکھیں اور اشکِ محبّت
یہ ستارہ کہاں جھلملایا

ان کی آواز پہ بڑھ رہا ہُوں
اب نہ منزل نہ منزل کا سایا

درد گہوارۂ زندگی ہے
غم نے دل کو تھپک کر سُلایا

یہ کہیں میرا دل تو نہیں ہے
ان کی مژگاں پہ کیا جگمگایا

اشک آنکھوں میں آئے اُمنڈ کر
پرسشِ غم نے طوفاں اُٹھایا

میرا کردار ہی مجھ کو عبرت
عرش سے فرش پر کھینچ لایا

ہادی مچھلی شہری

○

خوریدگی حرماں جائے گی نہ یوں سر سے
لگھٹ ہی عنایت ہو ساقی مجھے ساغر سے

نقاش غم پنہاں ہے کون سوا اس کے
تریہ ش داماں ہے نوک مژۂ تر سے

دنیائے محبت میں اک حشر سا برپا ہے
ہالیدگی غم سے شوریدگی سر سے

ہاں کہ نصیبوں کا ہوتا ہے لکھا پورا
کاراؤں میں سرکب تک بے درد ترے در سے

اے اپنے طلب لے چل اے جوش وفا کام آ
سودائے محبت کو کچھ کام ہے اس در سے

دنام نہ ہو جائے انداز ستم گاری
یوں آنکھ چراتے ہو میرے دل مضطر سے

لاتا ہے غم فرقت کچھ اور ارادوں سے
سر پھوڑ کے دیوانے جاتے ہیں ترے در سے

بیکار گئی کوشش تدبیر نہ کام آئی
کچھ بس نہ چلا ہادی آخر کو مقدر سے

رسا جالندھری

محمد کبیر خاں

○

لرزا ہے ایک برق سی جلوہ کہیں جسے
دھوکا نہیں نگاہ کا دھوکا کہیں جسے

پھیلی ہے ان لبوں پہ تبسم کی روشنی
ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا کہیں جسے

اللہ میرے عشق کا انجام ہو بخیر
دیکھوں وہ خواب، خواب زلیخا کہیں جسے

دل کی رگوں میں دوڑ کے بیتاب کر گئی
ہلکی سی ایک لہر تمنا کہیں جسے

نقاش کوئی ایسی بھی تصویر کھینچتا
بگڑے ہوئے نصیب کا نقشا کہیں جسے

آخر ٹپک کے آنکھ سے دامن پہ آ رہی
وہ اک لہو کی بوند کلیجا کہیں جسے

روتی ہے بے کسی کہ ہوا ہے وبال دوش
خوں گشتہ حسرتوں کا جنازا کہیں جسے

اپنے تجھے جو کہتے ہیں اچھا تو کیا رسا
اچھا وہی ہے غیر بھی اچھا کہیں جسے

وفا

پنڈت میلا رام

○

التفاتِ عام ہے وجہِ پریشانی مجھے
کس قدر مہنگی پڑی ہے ان کی ارزانی مجھے

میں ہوں اور آزار استقبالِ دشمن صبح و شام
یعنی اس نے دی ہے اپنے گھر کی دربانی مجھے

سعیِ لاحاصل ہے دل کی کوششِ اخفائے راز
کر گئی رسوا نگاہوں کی پریشانی مجھے

بحرِ ہستی ہے مری نظروں میں اک دشتِ سراب
ریت کا ہوتا ہے دھوکا دیکھ کر پانی مجھے

تیرے جلووں کا تو ہر اک ذرہ ہے آئینہ دار
مانعِ نظارہ ہے خود میری حیرانی مجھے

اس قدر ناپید ہیں اہلِ کمال اب اے وفاؔ
کوئی اپنا بھی نظر آتا نہیں ثانی مجھے

نظیر

اصغر حسین خاں

○

تاریخ میں جب تک مرا افسانہ رہے گا
فرزانہ جو ہوگا ترا دیوانہ رہے گا

شغل دف و چنگ و مے و پیمانہ رہے گا
ہم ہیں تو یہی جلسۂ رندانہ رہے گا

یہ شہرِ محبت بھی عجب شعبدہ گر ہے
آباد بھی ہو جائے تو ویرانہ رہے گا

تم آپ نہ آؤ گے تو میں پہنچوں گا اڑ کر
اک رات بھی بے شمع نہ پروانہ رہے گا

چلتے ہوئے دو جام ہیں ساقی تری آنکھیں
اب کس کو سرِ ساغر و پیمانہ رہے گا

کیا غم ہے جو اٹھوایا ہے مجھ کو دمِ آخر
اب اس کی گلی میں مرا افسانہ رہے گا

گر ہیں یہی افکار نظیرؔ اہلِ حرم کے
کعبہ میں بھی انداز صنم خانہ رہے گا

طالب بدایونی

○

دل سے ترا خیال بھلایا نہ جائے گا
پتھر کا نقش ہے یہ مٹایا نہ جائے گا

سینہ میں اب نہ خانۂ دل کو تباہ کر
اجڑا جو یہ نگر تو بسایا نہ جائے گا

ان کی تجلیاں ہیں مری آنکھ کا حجاب
پردہ وہ پڑا کہ اٹھایا نہ جائے گا

ہم سے نہ ہوگی بندگیٔ ماسوا کبھی
یہ سر کسی کے در پہ جھکایا نہ جائے گا

جاتے ہیں اُس سے کہنے کو ہم اپنا حالِ دل
پوچھا اگر اس نے حال بتایا نہ جائے گا

دل میں نہ چھپ سکے گا کبھی رازِ حسن و عشق
شعلوں کو خار و خس میں چھپایا نہ جائے گا

طالبؔ غنیمِ عشق و محبت کے دہر میں
ہستی کو لازوال بنایا نہ جائے گا

ثاقبؔ زیروی

محمد صدیق

○

دل و نظر پہ مسلط ہے اک سکوں دشمن
بدل رہی ہے محبت جنوں کا یہ امین

بنی ہے زمزمۂ شوق قلب کی دھڑکن
یہ کس کے پاؤں کی آہٹ ہوئی پسِ چلمن

نگاہِ شوق ہے اور ان کا عارضِ روشن
مچل رہی ہے دمِ صبح آئنہ پہ کرن

یہ کون حسنِ بہاراں ادھر سے گذرا ہے
مہک رہے ہیں ابھی تک گلوں کے پیرہن

نظر کو شوقِ نظارا ہے دل میں خودداری
دل و نگاہ کے رشتہ میں پڑ گئی اُلجھن

یہ اتفاق ہے یا معجزہ گناہوں کا
کہاں وہ رحمتِ کامل، کہاں میں تر دامن

رہِ طلب میں کوئی کس پہ اعتبار کرے
جنوں خرد کا مخالف۔ خرد جنوں دشمن

وہ آنسوؤں پہ مرے مسکرا دیئے ثاقبؔ
بکھر گئے مری حدِ نگاہ تک گلشن

حرماں خیرآبادی

فرید احمد

آہ اس گھڑی مجھ کو آپ یاد آتے ہیں
صبح و شام جب مل کر کچھ پیام لاتے ہیں

جذبۂ محبت میں کیا طلسم ہے یارب؟
ورنہ سحر تو اکثر بن کے ٹوٹ جاتے ہیں

کیا چمن میں پھر کوئی غیرتِ بہار آیا؟
پھول مسکراتے ہیں خار گنگناتے ہیں

کچھ تو لطف دیتی ہے آرزوئے دیرینہ
ہم جبھی تو آنکھوں سے اشکِ خوں بہاتے ہیں

آپ کی جفاؤں سے عذر کا کسے یارا
بس یہی قیامت ہے آپ بھول جاتے ہیں

اک غریق الفت کو خطرۂ تلاطم کیا
یعنی ڈوبنے والے آپ ڈوب جاتے ہیں

جس کو ایک اک ساعت زندگی کی بھاری ہے
اس تباہ انساں کو آپ آزماتے ہیں!

دل میں عشق رفتہ کی یاد تک نہیں باقی
اک شکستہ خاطر کو کیا یونہی ستاتے ہیں!

اپنے دل کی حالت پر رحم کیجئے حرماں
آپ کی کہانی ہے آپ ہی سناتے ہیں

عاصی کرنالی

میں بھی پابندِ وفا ہوں مجھ پہ بھی بیداد ہو
مجھ سے لوگوں نے کہا ہے تم ستم ایجاد ہو

آپ اس کی خوش مذاقی کا تصور کیجئے
بجلیاں گرنے سے جس کا آشیاں برباد ہو

آؤ لکھ دیں وقت کی تاریخ کا اک باب ہم
کچھ مرا افسانہ ہو کچھ آپ کی روداد ہو

وہ فضا وہ سرمئی شب، وہ تری پہلی نظر
او تغافل آشنا، شاید تجھے کچھ یاد ہو

دیکھتا ہوں حسن بھی کچھ زندہ دل ہے یا نہیں
وہ ستم فرمائیے جو آپ کی ایجاد ہو

یوں غم دوراں کو ہنستے کھیلتے دیجے شکست
مسکرا دیجے اگر دل مائل فریاد ہو

ایک تارا ٹوٹ کر سارے اُفق پر چھا گیا
ہو کوئی برباد تو اس شان سے برباد ہو

شعر کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے عاصی کا وجود
جب وہ کہتے ہیں کہ عاصی اک غزل ارشاد ہو

لطیف انور گورداسپوری

○

راہِ وفا میں خاک خود اپنی اُڑا کے دیکھ
کچھ دیکھنا ہے تجھ کو تو سب کچھ لُٹا کے دیکھ

کیا ہے قریب کہ ساحل قریب ہے
اے ناخدا، بچا کے خُدارا بچا کے دیکھ

اِس طور میں نہیں ہے حکایاتِ طُور سے
اک بار اور میری نظر آزما کے دیکھ

اے بادِ صبح غنچے ابھی تک ہیں محوِ خواب
اک بہار ان کو ذرا گدگدا کے دیکھ

دنیا نہیں ہے تو نے اگر ظرفِ بادہ نوش
اے پیرِ میکدہ کبھی مجھ کو پلا کے دیکھ

نشتر کا رُخ بدلتا رہا کیوں ہوا کے ساتھ
یہ خون شیشۂ نیز کو ساحل بنا کے دیکھ

منظور

چودھری منظور احمد

○

کل قیس کے لب پر تھی امیری زبانی ہے
روداد محبت بھی اک رام کہانی ہے

یہ مست نظر توبہ، یہ چال معاذاللہ
اٹھتے ہوئے شعلے میں بہتا ہوا پانی ہے

اک گوشۂ عزلت میں اک بامِ تماشا پر
یہ میری تمنا ہے وہ تیری جوانی ہے

اک دُودِ چراغِ دل اک بُوئے گلِ رعنا
یہ میرا فسانہ ہے وہ تیری کہانی ہے

کرنوں کا قلم لے کر خورشید کے پرتو میں
اے برق نظر تیری تصویر بنانی ہے

یہ کلبۂ غم جس کی تصویر سے ہے روشن
قندیلِ فلک! تجھ کو وہ شمع دکھانی ہے

آویزے پھولوں کی دامانِ نظر بھر لیں
خوش رنگ مناظر ہیں اور صبح سہانی ہے

گلزار میں اے موسم! کچھ دیر ٹھہر جانا
خوشبو ترے بالوں کی غنچوں میں سمانی ہے

کچھ روز کی مہلت دے منظور کو محفل میں
اے موت ابھی دل کی روداد سُنانی ہے

پیام شاہجہانپوری

محمد یمین خان

○

جو مصائب میں سے ہنس ہنس کے گذر جاتے ہیں
منزلیں ساتھ ہی رہتی ہیں جدھر جاتے ہیں

بات جب کہ خزاں میں بھی ہو گلشن پہ بہار
موسمِ گل میں تو کانٹے بھی نکھر جاتے ہیں

ہم بھلا تیری جفا سے کبھی منہ پھیریں گے
ہم تو وہ لوگ ہیں جو بات پہ مر جاتے ہیں

لوٹ کر میرا سکون اپنا بچا کر دامن
ٹھیریئے میرے حضور! آپ کدھر جاتے ہیں

کیا خبر کون ہیں آتے ہیں کہاں سے یہ لوگ
جب گذرتے ہیں تو رستے بھی سنور جاتے ہیں

کوثر نیازی

محمد حیات خاں

○

زہرِ اجل ہے چشمۂ حیواں ترے بغیر
صبحِ وطن ہے شامِ غریباں ترے بغیر

کٹتے نہیں کسی طرح لمحاتِ زندگی
رُک سی گئی ہے گردشِ دوراں ترے بغیر

"دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو"
ہے دشمنِ سکوں ہر دو ساماں ترے بغیر

کیا اب حیات و موت کی قدریں بدل گئیں
کچھ لوگ زندہ ہیں غمِ جاناں ترے بغیر

تُو بھی عجیب چیز ہے اے ابتلائے دہر!
بخت نہ ہو سکا کوئی انساں ترے بغیر

اک روز میرے طائرِ بیدار آ بھی جا!
جینا ہے ایک خواب پریشاں ترے بغیر

اے رحمتِ تمام! نگاہِ کرم ادھر
کیسے کٹے گا عرصۂ زنداں ترے بغیر

کسریٰ منہاس

غلام حسن

کہیں بھی خیر نہیں اپنے آشیانے کی
یہ کہہ رہی ہے پریشاں ہوا زمانے کی

جو رُو جھیں جھیل چکیں سختیاں زمانے کی
تلاش اُن کو بھی ہے اب مرے فسانے کی

شگوفے باغ میں پھولے نہیں سماتے ہیں
خبر بہار نے دی ہے یہ کس کے آنے کی

جو سمجھے جورِ حوادث کو زندگی کا نشاں
مٹا سکیں اُسے کیا گردشیں زمانے کی

یہ بے بسی کا ہے عالم کہ کچھ نہیں معلوم
کشش کہاں لئے جاتی ہے آب و دانے کی

ذرا میں عمرِ گذشتہ سے پوچھ لوں تو کہوں
مجھے تو یاد نہیں تلخیاں زمانے کی

ہمارے سامنے سب کچھ ہے مثلِ آئینہ
"قسم نہ کھاؤ ضرورت نہیں بتانے کی"

تبسّم

عبدالرشید

غمِ دل کو عطائے دلبراں کہنا ہی پڑتا ہے
بھجوری زمیں کو آسماں کہنا ہی پڑتا ہے

حقیقت میں ہم اپنے حال سے خود بھی نہیں واقف
مگر یاروں کو اپنے رازداں کہنا ہی پڑتا ہے

یہ مانا منتشر تنکے چمن میں بے حقیقت ہیں
انہیں ترتیب دے کر آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے

فنا کر دے حواس و ہوش کو جس حُسن کا جلوہ
تکلم ساتھ دے تو اس کو بیاں کہنا ہی پڑتا ہے

دروغِ مصلحت آمیز ہے مجبور کا مذہب
یہاں ظالم کو اکثر مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

پیا جاتا ہے خوں مزدور کا بزمِ امارت میں
مگر اس کو شرابِ ارغواں کہنا ہی پڑتا ہے

تبسّم! بادشاہی حرص و خواہش کی غلامی ہے
غلامِ نفس کو شاہِ زماں کہنا ہی پڑتا ہے!

ضیا جعفری

سید عنایت علی شاہ

○

فضا میں پھیلتے جاتے ہیں رات کے سائے
خدا کرے کوئی گاتی ہوئی سحر آئے

اک ایسا دور بھی آیا ہے درد مندوں پر
فقط خوشی کے تصور سے اشک بھر آئے

تبسمِ لبِ شیریں کہ جاگ اٹھیں کلیاں
پیامِ زیرِ لب ایسا کہ پھول مسکائے

ہم اپنی بیکسیٔ غم پہ شب بہت روئے
کھلی جو چاندنی تم بار بار یاد آئے

بہار نو کی حکایت ہے لالہ زاروں میں
شرارِ گل سے نہ دامن ترا بھڑک جائے

یہ شبنمی سا بدن پیرہن کے سائے میں
کہ جیسے چاند کسی جھیل میں اتر آئے

یہ کارواں بھی ہراساں ہے رات بھی تاریک
جو تیرگی ہو مسلسل کوئی کدھر جائے

ولی

سید شاہ ولی الرحمٰن کاکوی (بہاری)

○

حسن صبیح ہے غضب قہر ہے گیسوئے دراز
خالِ سیاہ ہے ستم فتنہ ہے چشمِ سحر ساز

نعمتِ لازوال ہے عشق نے کر دیا غنی!
جان ہے وقفِ بیخودی دل ہے رہینِ سوز و ساز

اشک فشاں ہے چشمِ زار در پہ ہوں تیرے سجدہ بار
مذہبِ عشق میں یہی اپنا وضو ہے اور نماز

برق بھی بے قرار ہے ہائے رے تیری شوخیاں
حشر بھی پائمال ہے اُف رے ترا خرامِ ناز

دیر میں وہ حرم میں ہیں وہ مسجد و مے کدہ میں وہ
عالمِ عشق میں نہیں فرقِ حقیقت و مجاز

میری جبینِ سجدہ ریز بن گئی جزوِ خاکِ در
تو بھی ہوئی نہ ملتفت تیری ادائے بے نیاز

شاہ و گدا کی کیا تمیز مسلکِ حسن و عشق میں
ہے دلِ غزنوی یہاں بستۂ گیسوئے ایاز

آخر شب ہے اے ولی اور وہ محوِ خواب ہیں
اپنا فسانۂ الم ختم کر اب زباں دراز

اختر اورینوی

پروفیسر اختر احمد

پہلے تو بہت نادان تھے وہ اب اُن کی شرارت کیا کہئے
اُس شوخ ادا کی باتوں میں جملوں کی لطافت کیا کہئے

تم تھم کے وہ رونا آنکھوں کا اور زخم جگر کا ہنس دینا
آغاز تصور میں اُن کا اور چپکے سے رخصت کیا کہئے

ہوتے وہ مرے کیا کہنا تھا حاصل نہ ہوا مجھ کو یہ شرف
کیا راز ہوا ش الفت کا اے حسن بتا کیا کہئے

اختر بھی تڑپتا ہے تیری چاہت کی کہانی کو سن کر
دکھ درد یہ سب کے تھا ہے شاعر کی بھی حالت کیا کہئے

جگر

سید ضمیر الدین (بہاری)

اس قدر ہیں سب کی نظروں میں جو بے توقیر ہوں
ہائے بے ہنگام ہوں یا آہ بے تاثیر ہوں

وہ ملا دل آہ جو کھلنے نہ پائے گا کبھی
گلشن ہستی میں گویا غنچۂ تصویر ہوں

زندگی بھر لاکھ دامن بچاتے ہی چلے
خاک ہو کر اب یہ قسمت سے رد امنگیر ہوں

کیوں مٹا ہے خاک کا دیکھتا نہیں
صانع قدرت کی میں اک بولتی تصویر ہوں

کوئی کتنا ہی جگائے ہوں گا اب بیدار تک
خفتہ بخت یعنی میں سوئی ہوئی تقدیر ہوں

تمنّا عمادی

مولانا محی الدین مجیبی (پھلواروی)

جس گلی سے لوگ نکلے تھے بہ مشکل مجھے
لو وہیں پھر لے چلا کم بخت میرا دل مجھے

رخ تو میرا پھیر دے اے موجِ دریا اس طرف
دور ہی سے کچھ کہے شاید لبِ ساحل مجھے

خاک تو میں ہوں مگر ناکستہ پر پروانہ ہوں
جانئے اک روز کر دے کرمیِ محفل مجھے

ناتواں ہوں کس طرح دوروں ذرا تھم جا رواں
کچھ اشارے کر رہا ہے پردۂ محمل مجھے

جاگتے ہیں کون آتا دل ہی کتنا چور کا
حشر پہنچا دیکھ کر سویا ہوا غافل مجھے

لوگ کرتے ہیں تمنّا کس لئے کسبِ ہنر
اتنی تحصیلِ ہنر سے کیا ہوا حاصل مجھے

محمود عالم وفا

ٹھہر جا اے دلِ مضطر ذرا آہ و فغاں کر لوں
نگہ جب ظلم پرور ہے خلش کو بھی جواں کر لوں

غلط ہے جستجوئے آستاں اے غیرتِ سجدہ
مزا جب ہے کہ پیدا ہر جگہ اک آستاں کر لوں

بہار آئی کھلے غنچے، ہنسائیں کونپلیں پھوٹیں
مگر اتنی کہاں فرصت کہ سیرِ بوستاں کر لوں

بڑے صنّاعِ عالم ہو بڑے مختارِ مطلق ہو
مٹا دو دستِ قدرت سے مرے دستِ پریشاں کو

زہے قسمت یہیں موجود ہر سامانِ وحشت ہے
جنوں میں کس لئے گھر چھوڑ کر جاؤں بیاباں کو

تمہاری بے بسی پر خود مجھے اب رحم آتا ہے
بڑے ناوک فگن نکلے نکالو نوکِ پیکاں کو

شمس منیری

پروفیسر حافظ شمس الدین

○

مرے غم کو نہ پوچھئے مجھے چین ہے نہ قرار ہے
ہے خزاں رسیدہ رایضِ دل مجھے کیا امید بہار ہے

اسے دیدۂ نمناک کا جان کے نہ مٹا کہ پھر نہ ملے گا
یہ نشانِ راہ ہے جنبہ کسی راہ رو کا مزار ہے

جو جلائے تجھ کو تو آگ ہے جو دکھائے راہ تو روشنی
فقط ایک فرقِ مجاز ہے وہی نور ہے وہی نار ہے

کہو غم نصیب اسے یا خوشی رہی شمس حالتِ دل وہی
یہی وہ ریاض ہے واقعی کہ خزاں بھی جس کی بہار ہے

غم نہیں حسرت نہیں وحشت نہیں
وہ بھی لیا دل جس میں کیفیت نہیں

دردِ دل کہنے کی طاقت تھی کبھی
اور اب سننے کی بھی طاقت نہیں

کیا کرے گا کوئی عزت آپ کی
آپ اپنے دل میں جب عزت نہیں

ہے غزل میں شمس اک لطفِ بیاں
اس میں مضموں کی اگر وسعت نہیں

بیدل

پروفیسر عبدالمنان

○

جھکی کس آستانے کی زمیں پر
نشاں ٹھوکر کا ہے اپنی جبیں پر

لبوں پر آگیا آخر تبسم
نہ زور ان کا چلا چینِ جبیں پر

وہ دل جو تھا حریفِ شوخیِ ناز
ہوا قربان چشمِ سرمگیں پر

یہ الزامِ مصیبت تیرا ناصح
فقط ہے عشق راحت آفریں پر

کہا کس نے میں مایوس لوٹا
غبارِ آستاں تو ہے جبیں پر

کیا جس وقت منظورِ الٰہ بیدل
قیامت ہوگئی قلبِ حزیں پر

منیر نیازی

○

یہ لڑکی جو اس وقت سر بام کھڑی ہے
اُڑتا ہوا بادل ہے کہ پھولوں کی لڑی ہے

شرماتے ہوئے بند قبا کھولے ہیں اس نے
یہ شب کے اندھیروں کے مہکنے کی گھڑی ہے

اک پیرہنِ سُرخ کا جلوہ ہے نظر میں
اک شکل نکلنے کی طرح دل میں جڑی ہے

کھلتا تھا کبھی جس میں تمنا کا شگوفہ
کھڑکی وہ بڑی دیر سے ویران پڑی ہے

طاؤس کی آواز سے روشن ہے شبِ تار
صد نغمۂ ناہید یہ ساون کی جھڑی ہے

بشیر منذر

○

آ کے بادیدۂ تر جائیں گے
تجھ پہ کچھ تہمتیں دھر جائینگے

موت نے جائیگی مرہاروں کو
ہائے یہ لوگ بھی مر جائینگے

کم ہوئیں وحشتیں ویرانوں کی
تیرے دیوانے کدھر جائیں گے

چشمِ لیلےٰ سے گرے ہیں تو کیا
دلِ مجنوں میں اُتر جائیں گے

درِ مے خانہ ذرا وا کر دو
صورتِ دور گذر جائیں گے

دلِ بیتاب! کوئی بات نہیں
یہ زمانے بھی گذر جائیں گے

اُردو غزل اور متغزلین

اس مضمون کے دو حصے ہیں :

پہلے حصے میں غزل پر جتنے ممتاز اہلِ قلم کی آرا مل سکی ہیں، انھیں یکجا کر دیا ہے۔ مولانا حالی اور کلیم الدین احمد کے مضامین اس لیے مفصل دے دیے ہیں کہ حالی نے پرانی غزل سے روگردانی کا نعرہ بلند کیا اور کلیم الدین احمد نے اسے نیم وحشی صنف سخن قرار دے دیا۔ بہرحال اس موضوع پر اتنی مختلف اور موافق آرا اکٹھی کر دی گئی ہیں کہ آپ بآسانی اردو غزل کے مستقبل کے بارے میں خود کوئی فیصلہ کر لیں گے۔

دوسرے حصے میں تذکرہ نویسوں نے ممتاز شعرا کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، اُسے یکجا کر دیا گیا ہے تاکہ شاعر کے بارے میں تمام ناقدین کی آرا کا ایک نظر میں علم ہو جائے۔

(ادارہ)

اُردو غزل اور متغزلین

مقالی

(۱)

غزل میں جیسا کہ معلوم ہے کوئی خاص مضمون مسلسل بیان نہیں کیا جاتا۔ اقلیم شاعری کے جملہ خیالات الگ الگ بیتوں میں ادا کیے جاتے ہیں۔ اس صنف کا زیادہ تر رواج بحیثیت صنف کے سابقہ آوارا ایران میں اور کوئی ڈیڑھ سو برس سے ہندوستان میں ہوا ہے۔ اگرچہ غزل کی اصل وضع جیسا کہ لفظ غزل سے پایا جاتا ہے عشق و عاشقی کے بیان میں تھی مگر اب وہ ایک مستقل صنف بن گئی ہے۔ ایران میں اکثر اور ہندوستان میں بیشتر شاعر ایسے بھی ہوئے ہیں جنہوں نے غزل میں عشقیہ مضامین کے ساتھ تصوف اور اخلاق و مواعظ کو بھی شامل کر دیا ہے۔

اگرچہ اس لحاظ سے کہ غزل کی حالت فی زمانہ نہایت ابتر ہے وہ مختصر ایک بے سود اور دور از مقصد صنف معلوم ہوتی ہے لیکن چونکہ شاعر کو ہمیشہ اور ہر حالت میں مسلسل مضمون لکھنے کا موقع نہیں مل سکتا اور اس کی فوت متخیلہ بے کار بھی نہیں رہ سکتی اس لیے ایسے خیالات جو فاصلہ وقت شاعر کے ذہن میں فی الواقع گزرے ہیں یا تازہ کیفیات جو اس سے اس کا دل روزمرہ کسی واقعہ کو سن کر یا کسی حالت کو دیکھ کر پیدا کرتا ہے ان کے اظہار کا کوئی آسان طریقہ غزل یا رباعی یا قطعہ سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ بعض خیالات جو دو مصرعوں میں بالکل یا زیادہ خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتے ان کو قطعہ یا رباعی کے لباس میں ظاہر کیا جا سکتا ہے اور چند بسیط خیالات جو ایک دوسرے سے کچھ تعلق نہیں رکھتے۔ وہ غزل کے مطلعوں کی طرح ردیف اور قافیہ کی ناقابل برداشت قید کی وجہ سے نظم نہیں ہو سکتے ہیں۔ ردیف اور قافیہ کی بابت اگر وقت نے مساعدت کی تو ہم پھر کسی موقع پر اپنی رائے ظاہر کریں گے۔ یہاں بعض غزل کے متعلق جنہا تیں بیان کرتے ہیں۔

غزل کی اصلاح عام اصناف سخن میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے قوم کے لکھے پڑھے اور ان پڑھ سب غزل سے مانوس ہیں۔ بچے، جوان اور بوڑھے سب لطف بہت اس کا پڑھتا اور رکھتے ہیں۔ وہ بیاہ شادی کی محفلوں میں، وعید و تماج کی مجلسوں میں، لہو و لعب کی صحبتوں میں، نیکیوں میں اور رزمیوں میں برابر گائی جاتی ہیں۔ اس کے اشعار ہر موقع اور ہر محل پر بطور مسدس یا تاثیر کلام کے پڑھے جاتے ہیں۔ جو لوگ کتاب کے مطالعہ سے گھبراتے ہیں اور نثر یا نظم میں لمبے چوڑے مضمون پڑھنے کا دماغ نہیں رکھتے وہ بھی غزلوں کے دیوان شوق سے پڑھتے ہیں جس آسانی سے غزل کے اشعار ہر شخص کو یاد ہو جاتے ہیں کوئی کلام یاد نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں ہر مضمون دو مصرعوں پر محدود اور سلسلۂ بیان منقطع ہو جاتا ہے ظاہر ہے کہ ہر صنف قوم میں اس قدر مؤثر و سائر اور مرغوب خاص و عام ہوا اس کا اثر قومی اخلاق اور قومی مذاق پر جس قدر ہو ممکن ہے۔ اسی لیے ہمارے نزدیک شعراء کو سب سے پہلے غزل کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہیے لیکن غزل کی اصلاح جس قدر ضروری ہے اسی قدر دشوار بھی ہے۔

غزل میں جو جسم و لذتی ہے اسلان کے بعد اس کا قائم رہنا نہایت مشکل ہے۔ جو کان ٹھیٹ گھٹری سے مانوس ہو جاتے ہیں وہ نہ عربی اور خیال سے لذت نہیں اٹھا سکتے۔ ایسا ان سننے والوں کی پیاس تاریخی واقعات سے ہرگز نہیں بجھ سکتی۔ بوالہوسی اور کامجوئی کی باتوں میں جو مزہ ہے وہ خالص عشق و محبت میں ہرگز کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اوباش و الواط کی بولی ٹھولیوں میں جو چٹخارہ ہے وہ سنجیدہ باتوں میں کسی بے حس ہی کو محسوس نہ ہو سکتا ہے جس نہ فاقوں پہنچ کر مطالعہ کا رنگ چڑھ جاتا ہے ان پر شکست اور اخلاق کا منتر کارگر نہیں ہوتا۔ جو لوگ سُرمہ کا جن انگلی چوٹی پر فریفتہ ہیں وہ عشق فانی کی حقیقت تک کیونکر پہنچ سکتے ہیں لیکن زمانہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ عمارت کی نرسیم ہو گی یا عمارت خود نہ ہو گی۔

غزل کو جن لوگوں نے چوپٹا اور تجویل خاص و عام بنایا ہے یہ وہ لوگ تھے جو آج کل اہل اللہ اور رسا صاحب باطن بلکہ سے کم عشق الٰہی کا راگ گانے والے سمجھے جاتے ہیں جیسے سعدی، رومی، خسرو، حافظ، سوائی، مقربی، امیر جام اور حالی وغیرہم۔ ان بزرگوں سے پہلے غزل کی طرف زیادہ التفات نہیں پایا جاتا۔ ہم نے سیاست سعدی میں کسی موقع پر بیان کیا ہے کہ ان کی غزلوں کا وضوع جیسا کہ ظاہر الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے عشق مجازی نہ تھا بلکہ وہ حقیقت کو جانے کے پردہ میں ظاہر کرتے یا یوں کہو کہ چھپاتے تھے۔ ان کے ایک ایک لفظ سے پایا جاتا ہے کہ وہ عشق و محبت کے رنگ میں شرابور تھے۔ ان کے کلام میں ضرور کوئی ایسی چیز ہے جس کو روحانیت کے ساتھ تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان کی غزل محض لہو و لعب کی بے ثباتی اور بے اعتباری کا سماں دل پر بٹھا جاتا ہے۔ وہ خال و خط کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جس سے ناپائیداری کی ترغیب نہیں بلکہ دنیا پرستی سے نفرت ہوتی ہے۔ وہ شراب کی بیخودی کو دنیا داری کے دکھاوں کی ہوشیاری سے بہتر بتاتے ہیں۔ وہ رندی و بدمستی و ترسائی کو صوفیوں کی دلی طمع اور زاہدوں کے زہد ریائی پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ کوئی گناہ ایسا نہیں بتاتے جو دریا سے کوئی مخالفت، دولت و جاہ سے کوئی شرک خود پرستی و فضل پرستی سے اور کوئی رہو دنیا سے بڑھ کر نہیں بتاتے۔ ان کا کوئی کلام اثر سے خالی نہیں اور اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے دل سے نکلا ہے۔

ان لوگوں کی غزل بعض حیثیتوں سے قوم کی موجودہ حالت کے مناسب نہ ہو لیکن وہ اس حالت کے بالکل مناسب تھی جبکہ قوم نے دنیا کو دنیا سے کھو دیا تھا۔ ان کے اشعار ان لوگوں کے حق میں تازیانہ کا کام کرتے تھے جو حسب دنیا اور حسب جاہ میں تہتک خلق سے غافل اور بادۂ غفلت میں مدہوش تھے ان سے عام طباع احسین اور تخیل عبرت حاصل کرتے تھے۔ وہ ریا کار زاہدوں و عقلوں اور صوفیوں کی قلعی کھولتے تھے۔ وہ سادہ لوح بیروں کو حیلہ فقیروں کے دام تزویر سے بچاتے تھے۔ وہ اہل اللہ اور ارباب صدق و صفا کو نفس امارہ کی چیرہ دستیوں اور خیانتوں سے آگاہ اور متنبہ کرتے تھے۔

اردو میں عام طور پر یہ رنگ تو ایک آدھ کے سوا کسی کی غزل میں کبھی پیدا نہیں ہوا لیکن عاشقانہ خیالات بھونڈے اور سادہ طور پر ادا کرنے والے غزل گویوں کے ہر طبقہ میں کم و بیش ہوتے رہے ہیں مگر افسوس ہے کہ اب یہ رنگ بھی روز بروز مٹتا جاتا ہے۔ الفاظ میں صنعت اور خیالات میں رکاکت و مخالفت یونہی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر بھلائے اس کے کہ غزل گوئی کے موجودہ طریقہ پر نکتہ چینی کریں یہ زیادہ مناسب سمجھتے ہیں کہ عام طور پر اس کی اصلاح کے متعلق اہل وطن کی خدمت میں چند مشورے پیش کریں۔

(۱) غزل کے لیے یہ ایک ضروری سی بات قرار پا گئی ہے کہ اس کی بنا عشقیہ مضامین پر رکھی جائے اور حق یہ ہے کہ اگر غزل میں عشق و محبت کی چاشنی نہ دی جائے تو حالت موجودہ میں اس کا سرسبز اور مقبول ہونا ایسا ہی مشکل ہے جیسا شراب میں سرکہ بن جانے کے بعد سرور قائم رہنا لیکن اصل اور نقل میں آسمان و زمین کا فرق ہے جو کیفیت عشق میں ہے وہ نقشی میں ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی۔ جو غزلیں محض تصنع اور عاشقانہ

کہی جاتی ہیں ان میں اتنا بڑی تر چوسٹ کا ہے جنہ ایک ہی ہاتھ کی تخلیق ہیں ہو بجنوں یا قوالوں کر محفل میں آئے۔ اثر قائل اور سامعین کی حالت کا تابع ہے۔ اگر قائل اور سامع میں باہمی سے کم از قائل کو واقعی کیفیت موجود ہے تو اس کیفیت کا بیان ضرور تو ہوگا۔ جو شخص فی الواقع مظلوم یا مصیبت زدہ ہے جب وہ اپنی سرگزشت بیان کرے گا تو اس کے بیان سے لوگوں کے دل پر چوٹ لگے گی لیکن اگر یہی بیان کسی ایسے شخص کی زبان سے سنا جائے جو اس کی حالت کو اس کی تجربہ کرتی ہے تو اس سے سوا ئے اس کے کہ لوگوں کو ہنسی آئے اور کوئی اثر مترتب نہیں ہو سکتا۔ میں ایک پاگل سا نوجوان جس کو جنون کی کبھی ہوا تک نہیں لگی یا ایک ستر برس کا پیر مرد جس میں ولولہ کی قابلیت نہیں ہی ان کو ہنسنا یا نہیں معلوم ہوتا کہ غزل میں شامل بازی اور ہجا پر کئے مضمون باندھ کر پھلا اپنے اور جہان کا ہنسنا اور بدنام کیسے

تہمت کچھ ہو وہس اور شاد بازی و کامرانی پر موقوف نہیں بندہ کو خدا کے ساتھ اولاد کو ماں باپ کے ساتھ، بھائی بہن کو بھائی بہن کے ساتھ، شاگرد کو استاد کے ساتھ، نوکر کو آقا کے ساتھ، رعیت کو بادشاہ کے ساتھ، دوستوں کو دوستوں کے ساتھ، ملی کو جلی کے ساتھ، محبوں کو محبوں کے ساتھ، مکالمہ کے ساتھ قوم کے ساتھ، خاندان کے ساتھ، خویش کو ہر چیز کے ساتھ تکلم اور دل بستگی ہو گئی ہے۔ پس جبکہ عشق و محبت میں اس قدر حالم اور جاذبیت ہے اور جبکہ عشق کا اعلان کرنا فی اور معشوق کا چھپانا سے نیرنگی ہے تو کیا ضرور ہے کہ عشق کو مخفی ہوائے نفسانی اور خواہش نفسانی میں محدود کر دیا جائے اور اپنے سرمایۂ عشق کو فاش کر کے اپنی تنگ ظرفی اور کوتہ حوصلگی ظاہر کی جائے۔

اسی لیے ہماری یہ رائے ہے کہ غزل میں جو عشقیہ مضامین باندھے جائیں وہ ایسے جامع الفاظ میں ادا کیے جائیں جو دوستی اور محبت کی تمام انواع و اقسام اور تمام جسمانی اور روحانی تعلقات پر حاوی ہوں اور جہاں تک ہو سکے کوئی ایسا لفظ نہ آنے پائے جس سے کسی خاص طور کا مرد یا عورت ہونا پایا جائے مثلاً کلاہ، پیرہن، دستار، عمامہ، قبا، میزہ و خط، مسیں بھیگنا، زنار، ابرو، مقراض، بیر، بنجوٹ، ترسا بچہ وغیرہ یا لفظ، گرتی، مہندی، چوڑیاں، چولی، اوڑھنی، آرسی، گھونگھرو وغیرہ۔

اگر چہ (جیسا کہ حیات معنوی کے خاتمہ میں ہم نے مفصل بیان کیا ہے) ہر دو کا طلوع سر کو قرار دینا جو ایران اور ہندوستان کی شاعری میں مروج ہے یہ محض ایک غلط فہمی اور خوش عقیدہ کے خیال پر مبنی ہے نہ کہ حقائق و واقعات پر لیکن پھر بھی یہ ایک ایسا قطعی اور نا قابل شکست ہے جو تمام اخلاق کو واجب لگاتا ہے لہذا اس کو جہاں تک جلد ممکن ہو ترک کرنا چاہیے اور اس بات کا خیال بالکل چھوڑ دینا چاہیے کہ ایران اور ہندوستان کے تمام شعرا نے تمام موا سی طریقہ پر عزل کہتے چلے آئے ہیں۔ ہر زمانہ کا اقتضا الگ ہوتا ہے۔ خوش اور بے جا باتیں ایران اور ہندوستان کے بڑے بڑے پایوں کے کلام میں موجود ہیں، اگر عہد آج ویسی باتوں کی ان کی تقلید ایسی قرار دینا جو ایران اور ہندوستان کی شاعری ٹھہرتے ہیں، پس جہاں تک ان کی عزت کی غرض سے ہو اندھا تقلید کے خود سے چھوڑ دینا چاہیے اور جو وقت نفس عقل و دانائی کے حکم سے کی چھوڑنا چاہیے

اسی طرح غزل میں بے تکلف الفاظ استعمال کرنے جو عورتوں کے بول چال اور مخصوصیات پر دلالت کریں اس قسم کی حالت کے بالکل مانع ہیں جو پردہ کے قاعدہ کی پابند ہو کیونکہ اگر کوئی شخص ایسا لفظ بولے جو عورتوں کے حسن و جمال کی تعریف کرنے اور اس کے لکھنے والے کی تصویر کھینچنے کو بتائے تنگ۔ دماغوں کو پریشان اور پراگندہ کرتا ہے اور اگر کوئی ناشائستہ بیوقوف اپنی ناقابلیت یا مذہبی کا ڈھنڈورہ پیٹتا ہے۔ اسی ناپرہیزی میں بیٹھ کر غزل پڑھ اور لکھ رہے ہیں ان کی غزل میں عورتوں کی مخصوصیات اس قدر کم پائی جاتی ہیں کہ گویا بالکل نہیں ہیں اور یہی بات اب تک ہندوستان میں بھی موجود ہے کہ غزل میں مطلوب کبھی مرد کو اور کبھی عورت کو قرار دیتے ہیں

ہو سکتی ہو مرد کی اور کبھی عورت کی مخصوص صفات کا بھی ذکر کرتے ہیں لیکن کبھی مطلب کے سمجھانے کے لیے افعال یا صفات مونث نہیں لاتے اور ہمیشہ مذکر لاتے ہیں۔ مشتاقوں کو یہ نہیں کہتے کہ وہ روزن دیوار سے جھانکتی تھی یا وہ پری ہمارا دل لے گئی یا وہ آستینیں کھینچتی تھی یا وہ بستر پر رہتی تھی یا وہ پری صورت کی متوالی ہے یا وہ عاشق کا دل جلانے والی ہے بلکہ ایسی حالتوں میں بھی افعال و صفات ہمیشہ مذکر ہی لاتے ہیں جو مرد اور عورت کا مقتضی ہوتا ہے مثلاً ذوق کہتے ہیں ؎

جھانکتے تھے وہ ہمیں جس روزنِ دیوار سے
وائے قسمت ہو گئی وہ روزن اک گھر نہیں

یا آتش لکھنوی کہتے ہیں ؎

شاعروں میں وہ بری رات کو آیا کرنا   نونہالوں کو گھر تک رلا کے ... کرنا

غرض کہ کسی اردو غزل گو نے معشوق کے لیے جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے فعل یا صفت مونث استعمال نہیں کی۔

اگر معشوق کو افعال کی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور کوئی خصوصیت رجال یا نسائی غزل میں نہ ظاہر کی جائے تو اس صورت میں افعال و صفات کا مذکر لانا بالکل قاعدہ کے موافق ہوگا۔ تمام دنیا کی زبانوں میں یہ قاعدہ عام معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی حکم مطلق انسان کی نسبت لگایا جاتا ہے اور مرد یا عورت کی تخصیص مقصود نہیں ہوتی تو گو نوع انسان میں مذکر و مونث دونوں داخل ہیں مگر اس حکم کا موضوع ہمیشہ بلفظ مذکر ادا کیا جاتا ہے نہ مونث۔ مذہب میں، فلسفہ میں، طب میں، اخلاق میں اور تمام علوم و فنون میں یہی قاعدہ عموماً جاری ہے لیکن معشوق کا کبھی چہرہ یا قبا یا سبزہ خط کے ساتھ اور کبھی چوٹی، مہاف، آرسی اور چوڑیوں کے ساتھ ذکر کرنا اور پھر اس کے افعال و صفات کو ہمیشہ مذکر لانا اس سے یہ معنی ہوں گے کہ معشوق نہ مرد ہے اور نہ عورت بلکہ نامرد ہے یا ہیجڑا۔

ایسے اشعار جن میں عشق کا بیان ایسے لفظوں میں کیا گیا ہو جو محبت کے عام مفہوم پر حاوی ہوں یا جو عشق حقیقی روحانی یا عشق الٰہی پر محمول ہو سکیں اور جن سے مطلوب کا مرد یا عورت ہونا مطلقاً نہ پایا جائے، کیا فارسی اور کیا اردو، دونوں زبانوں کی غزل میں بکثرت موجود ہیں۔ خصوصاً ایسے متصوفین کے کلام میں زیادہ تر اسی قبیل کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ پس غزل میں ہمیشہ کے لیے ایسا التزام کرنے کی خواہش کرنی کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کو تکلیف مالایطاق سمجھا جائے۔

(۲) جس طرح عشقیہ مضامین غزل کے خمیر میں داخل ہیں، اسی طرح خمریات یعنی شراب اور اس کے لوازمات کا ذکر اور زہد و تقویٰ پر ... تمام اہل ظاہر پر طعن و تعریض کرنی، اپنی مے خواری و توبہ شکنی و خرابات نشینی پر فخر کرنا اور اہل شرع اور اہل تقویٰ کے اعمال و اقوال میں [illegible] اور اسی قسم کی اور باتیں جو عقل و شرع کے خلاف ہوں یہ مضامین بھی غزل کے لوازم سے ہو گئے ہیں۔ سب سے پہلے غزل میں یہ طریقہ شعرائے متصوفین نے جو اہل اللہ اور صاحب باطن سمجھے جاتے ہیں اختیار کیا تھا جیسے سعدی، رومی، حافظ اور خسرو وغیرہم۔ چونکہ ان لوگوں کی غزل نے ایران اور ہندوستان میں زیادہ رواج اور حسن قبول پایا اور خاص کر خواجہ حافظ کی غزل جس میں ان مضامین کی ... سب سے بڑھ کر حد سے زیادہ مشہور و مقبول ہوئی، اس لیے متاخرین نے بھی ان کی تقلید سے یہی شیوہ اختیار کیا مگر ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ان بزرگوں نے جو ایسے مضامین باندھے ہیں اس قدر زور کیا ہے اس کا ... کیا تھا۔

فقہاء اور اہل ظاہر ہمیشہ دونوں فرقوں کے سخت مخالف رہے ہیں۔ ایک اہل باطن کے دوسرے [illegible] کے ... سے

ان دونوں گروہوں کو ہمیشہ سخت نقصان پہنچتا رہا ہے۔ قتل کیے گئے ہیں، دار پر چڑھائے گئے ہیں، مشکیں بندھی ہیں، کوڑے کھائے ہیں، قیدیں لگائی ہیں، جلاوطنی کیے گئے ہیں۔ کتابیں جلائی گئی ہیں۔ اور کیا کیا کچھ ہوا ہے جب کہ فقہا کی مخالفت کا ان لوگوں کے ساتھ یہ حال تھا تو خود بھی اپنی تصنیفات میں شعر یا نظم خوب دل کے بخارات نکالتے تھے۔ بقول شخصے "کسی کا بس چلے کسی کی زبان" فقہا و واعظین ان کے اقوال و افعال پر گرفت کرتے تھے انھوں نے ان کے اخلاق کی تلمی کھرچنی شروع کی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلاف شرع کام کرتے ہیں انھوں نے کہا شراب خوری، قمار بازی، حرام کاری کیا ہیں وہ تو بادہ فروشی و گندم نمائی سے بہتر ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلاف شرع باتیں کہتے ہیں انھوں نے کہا علانیہ کفر بکنا اس سے بہتر ہے کہ دل میں کفر ہو اور زبان پر اسلام۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے انھوں نے کہا کہ اوروں کو ہدایت کرنے اور آپ گمراہ رہنے سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ تم حقوق الٰہی ادا نہیں کرتے انھوں نے کہا کہ تم حقوق عباد میں خیانت کرتے ہو۔ الغرض شعرا سے متصوفین نے جو اہل ظاہر پر غرہ کی پائی ہے وہ بھی قسم کی تعریضات اور مطارحات ہیں۔

اس کے سوا ان لوگوں کی غزل میں اکثر شراب و ساقی و جام و صراحی اور ان کے مرادفات اور خلاف شرع الفاظ مجازاً و استعارۃً کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ریا کو اس خیال سے کہ دوست کا راز اغیار پر ظاہر نہ ہو یا اس نظر سے کہ لوگوں کا حسن ظن جو بہترین طریقت ہے اس سے محفوظ رہیں یا اس لیے کہ عشق و محبت کی بھڑاس آزادانہ اور رندانہ گفتگو میں بہ نسبت زاہدانہ اور مؤدب گفتگو کے خوب نکلتی ہے اور یا اس غرض سے کہ عاشقوں کو چھیڑ چھیڑ کر اور زیادہ بھڑکائیں اور بیان کی زیادہ سے زیادہ داد جو لے لیں۔ ملزموں کو تحسین و آفرین سے زیادہ خوشگوار ہوتی ہے مزے لے لے کر تحسین و آفرین کی یہ ساری کیفیات کو شراب و شاہد کے پیرایہ میں بیان کرتے تھے جس سے اخیر درجہ کا ثبوت مولانا روم کی اس رباعی سے ہوتا ہے ؎

می بر سر کوئے ترکہ غارت کردم — سر پاکاں را جذب زیارت کردم
نکرانہ آنکہ روزہ خوردم رمضان — در عید نماز بے طہارت کردم

شاہ ولی اللہ صاحب نے اس رباعی کی شرح لکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں رمضان میں روزے کھانے کے یہ معنے ہیں کہ جب مجاہدے سے شاہد تک نوبت پہنچ گئی تو ریاضت ترک کر دی گئی اور نماز بے طہارت سے پڑھا ہے کہ جب وصل کی عید میسر آگئی اور جدائی کا الم جاتا رہا۔ اب حضوری میں کیف جو کہ حقیقت صلوٰۃ ہے ہر وقت رہنے لگی۔ یہاں تک کہ ظاہری طہارت اور عدم طہارت اور جاگنے اور سونے کی غرض کہ ہر حالت میں دولت حضوری موجود ہے۔ خواجہ حافظ کا یہ شعر بھی اسی قبیل کا ہے ؎

پیر ما گفت خطا در قلم صنع نہ رفت
آفریں بر نظر پاک خطا پوشش باد

دوسرے مصرع میں خطا پوش کے لفظ سے قلم صنع کی خطا پوشی کا خیال ذہن میں گزرتا ہے مگر فی الحقیقت یہ مطلب نہیں ہے بلکہ انسان کی عیب پوشی مقصود ہے کیونکہ قلم صنع میں کبھی خطا نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ اس نے لکھ دیا ہے وہ اٹل ہے اور اس لیے کاتب کا مجبور ہونا اور اس لیے اس کا بے خطا ہونا ثابت ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا اشعار سے صاف پایا جاتا ہے کہ یہ بزرگ قصداً ایسے الفاظ برتتے تھے جن سے اہل ظاہر کو نکتہ گیری کرنے کا موقع ملے۔ اسی لیے مولانا روم فرماتے ہیں ؎

تو نشنیدہ ای باشد کہ سخن دانان ۔۔۔ گفتہ اند در حدیث دیگران

ان بزرگوں کے سوا بعض شعرا ایسے بھی گذرے ہیں جو فی الواقع شراب پینے کے عادی تھے اور رندانہ نغمہ کی حالت میں جو کیفیت ان کے دل پر گذرتی تھی یا جو اثر ان کی طبیعت پر ہوتا تھا اس کو شعر میں بیان کر دیتے تھے۔ چونکہ شاعری کا جزو اعظم جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے یہ ہے کہ اس میں جو خیال باندھا جائے اس کی بنیاد اصلیت پر ہونی چاہیے اس لیے اصولی شاعروں کے موافق ان کے کہنے مضمون باندھنا مناسب ان لوگوں کا حق ہونا چاہیے جو واقعی خود اس حیوان کے مالک ہوں اور یا اپنے اصلی خیالات و جذبات کے بیان میں بطور محاورہ استعارہ کے ادا کر سکتے ہوں ورنہ وہ قدما کے ایسے ہی مقلد سمجھے جائیں گے جیسے وہ انسان کہ جو ہمارے ہیرو مضمون زاہد و عابد کو شاعر اور ان پر کہنے والی انہی لوگوں کو ایسا سمجھے جن کو فی الواقع ان کے ساتھ کوئی وجہ مخالفت کی ہو۔ یہاں باوجود یہ سے کسی قسم کی مخالفت کے ہر ایک صورت سے واجبی حد پر ایسے مضامین باندھے جا سکتے ہیں جن کا تعین ایسے لفظ سے کیا جائے جس سے معلوم ہو کہ موصوف بادہ خوار سالوس کی برائی بیان کرنا مقصود ہے نہ کہ بادہ اور بادہ خلین کی ذات پر حملہ کرنا۔ اور ریا کاری اور فضائل کی جو بنیاد اس کے کہنے والے نہیں ہیں کی جا سکتی کہ کوئی شخص یا گروہ کو ان کا موضوع نہ فرض کر لیا جائے۔ اور فضائل کے مسلمات کے پیرایہ میں ظاہر کیا جائے جس سے علم اور عدل کو بیان واضح طور پر کسی طرح ہو سکتا ہے کہ قاضی یا مصنف بادشاہ کی تعریف یا تالیف کیا جائے اور زاہد ریا کار کی تصویر یا عرفی کھانی جا سکتی ہے کہ ان کو کسی نہ کسی پیرایہ میں بیان کیا جائے لیکن یہ صورت ہیں ضرور ہے کہ واعظ و زاہد وغیرہ کی کسی ایسی صفت کی طرف جو عقلاً یا شرعاً قابل اعتراض ہو اشارہ کیا جائے اور کہی جائے تاکہ لوگوں پر اس لیے کہ وہ قابل الزام ہیں نکتہ اس لیے کہ وہ غائب میں حمایت کیا جاتا ہے۔ یہاں بطور مثال کے بدیع ابراہیم ذوق کے دو شعر لکھتے ہیں ؎

زیر لب جاں کو زاہد نہ چھپا تو
تجھ کو پرائی کیا ہے اپنی نبیڑ تو

اس شعر میں کسی قدر اس خصلت کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے جو اکثر اہل علم اور عابدوں میں ہوتی ہے کہ اوروں کو اپنا سا نہ سمجھنا اور ان کے قصور معاف کرتے ہیں اور اپنے ظاہری احکام کی پابندی پر مغرور ہو کر باطن کی اصلاح سے غافل رہتے ہیں لیکن اس طرز بیان پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا مگر دوسری جگہ وہ اس طرح دبا تے ہیں ؎

ذوق نہ ایسا ہے جو ہو رستم زمانہ سے پہلوان
دیکھ آب تیغ سے ہندی نے گلا کاٹا ہے

اس شعر میں تیغ کا کوئی گناہ یا قصور سوا اس کے کہ تیغ ہے نہیں جتلایا گیا اور شعر میں اس کے سوا اور کوئی خوبی نہیں سمجھی گئی کہ ایک مقدس آدمی پر وہ بیہودہ بات کہہ کر بھنگڑ ہلی و شرابیوں کی ضیافت طبع کو جائے۔ ایسے اشعار ہمارے شعرا کے کلام میں کثرت پائے جاتے ہیں اور ایسے شعروں کی اگر ہم اپنے شعر کا حد سے زیادہ ادب کریں تو سعدی اور سوزنی کی ہزلیات سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتے۔

(۲) مذکورہ بالا مضامین کے سوا اور جس بات کا سچا جوش اور ولولہ دل میں اٹھے خواہ اس کا منشا خوشی ہو یا غم، یا حسرت یا ندامت یا شکر یا شکایت، یا صبر یا رضا یا قناعت یا توکل، یا رغبت یا نفرت، یا عدل یا انصاف، یا غصہ یا تعجب، یا امید یا امیدی، یا شوق یا انتظار، یا حب وطنی یا قومی ہمدردی، یا رجوع الی اللہ یا حمایت دین و مذہب، یا دنیا کی بے ثباتی اور موت کا خیال یا کوئی اور جذبہ جذبات انسانی میں سے، اس کو بھی

غزل میں بیان کر سکتے ہیں۔

اگرچہ اصل وضع کے لحاظ سے غزل کا موضوع عشق و محبت کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے لیکن ہمارے شعرا نے اس کو ہر مضمون کے لیے عام کر دیا ہے اور اب بھی اس صنف کو محض مجازی کہا جاتا ہے۔ پس ہر قسم کے خیالات جو شاعر کے دل میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوں وہ غزل یا رباعی یا قطعہ میں بیان ہو سکتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ جو خیالات اگلوں نے زمانہ کے تقاضا سے یا اپنے جذبات کے جوش میں ظاہر کیے ہیں ہم بھی وہی راگ گائے۔ ہیں اور انہی کے خیالات کا اعادہ کرتے جائیں۔ نہیں بلکہ ہم کو چاہیے کہ اپنی غزل کو خود اپنے خیالات اور اپنے جذبات کا آئینہ بنائیں۔ ممکن ہے کہ اگلوں نے کسی نئے مضمون کے لیے دماغ پر زور دیا ہو اور کوشش کرنے کو سعی اور فضول بتلایا ہو لیکن ہمارے دل میں اس خیال کی مخالفت ہو یا انھوں نے اس کے برعکس پاؤں توڑ کر بیٹھنے کو نامردی اور بے غیرتی کی بات سمجھا ہو تو کیوں کر ہم کسی کے دل پر اس کے برخلاف حالت طاری ہو۔ دونوں صورتوں میں ہمارے منہ سے وہی صدا نکلنی چاہیے جو ہمارے دل سے اٹھی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود ہمیں پر ایک وقت ایسا گزرے کہ مثلاً کوشش و تدبیر کو محض بے سود و لاحاصل معلوم ہو اور دوسرے وقت ہمارے ہی دل میں ایک ایسا جوش پیدا ہو کہ پہاڑ کو جگہ سے ہٹا دیں یا دریا کو پاٹ دیں۔ تو کیا دونوں حالتوں کی تصویر ہم اپنے اپنے موقع پر بے کم و کاست کھینچنی نہیں چاہیے۔ اس سے نہ صرف فطرت انسانی کے دقائق و خواص اور انقلاب کا اس کی عجیبت میں آنا ظاہر ہوتے ہیں وہی نکتہ شناس ہوں گے بلکہ قومی اخلاق بھی معلوم ہوں گے جب تک ہر چیز اچھی اور بری دونوں پہلو نہ دکھلائے جائیں تب تک اعتدال کی خوبی جلوہ گر نہیں ہوتی۔ مثلاً مآب ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

قناعت کن بہ نانِ خشک تا بے آرزو گردی
کہ خواہش پائے الوانست بستہ مثل الماں را

دوسری جگہ یہی صاحب کہتے ہیں ؎

صرف بیکاری مکن واں روزگار خویش را
پرورد روئے توکل سازگار خویش را

ظاہر ہے کہ جب تک دونوں متقابل خیال ملحوظ نہ رکھے جائیں تب تک قناعت کا وہ درجہ جو بن آسانی اور حرص کے بیچوں بیچ واقع ہے حاصل نہیں ہو سکتا۔

شاید کوئی کہے کہ یہ خیال ہو کہ اخلاقی مضامین سے غزل میں بے لطفی پیدا نہیں ہو سکتی جو عشقیہ مضامین میں ہوتی ہے۔ جو اثر شوق و آرزو اور درد جدائی اور کاہش انتظار اور رنگ اغیار کے بیان میں ہے وہ اطمینان پر و قناعت میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بے شک اخلاقی مضامین کو مؤثر پیرایہ میں بیان کرنا بہت مشکل کام ہے اور بلاشبہ غزل میں جس سوز و گداز کی ضرورت ہے وہ اس میں نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہمارے معاصر چچ کے لیے یہ سوز و گداز کا اس کی مصالحہ موجود ہے جو صدیوں تک ختم نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں ایک انقلاب عظیم ہو رہا ہے اور ہوتا چلا جاتا ہے۔ آج کل دنیا کا حال صاف اس درخت کا سا نظر آتا ہے جس میں برابر نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں اور پرانی ٹہنیاں جھڑ جھڑ کر پگل جاتی ہیں۔ تمام درخت میں کی تمام طاقت چوس رہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے تمام پودے جان کے گرد و پیش ہیں ہر لمحے چھپے جاتے ہیں پرانی قومیں جگہ خالی کرتی جاتی ہیں اور نئی قومیں ان کی جگہ لیتی جاتی ہیں اور یہ کوئی انوکھا جھگڑا طفلانہ نہیں ہے جو آس پاس کے دیہات کو دریا بُرد کرنے

وہ جائے گی بلکہ پسند کی خصوصیت ہے جس سے تمام کرۂ ارض پر پانی بھیرتا نظر آتا ہے۔ اگر کوئی دیکھے اور سمجھے تو صبح سے شام تک ایسے عجوبہ خیز نظر آتے ہیں کہ شاعر کی تمام عمر اس کی جزئیات کے بیان کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ کسی واعظ کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ یہ کیوں ہوا؟ کبھی تعجب معلوم ہوتا ہے کہ کیا ہوگا اور کبھی یاس دل پر چھا جاتی ہے کہ ہمیں اب کچھ نہیں۔ اس سے دلچسپ تر مثال غزل کے لیے اور کیا ہو سکتی ہے۔ ہر بات کا ایک محل اور ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ عشق و عاشقی کی نزاکتیں اقبال مندی کے زمانہ میں زیبا تھیں۔ اب وہ وقت گیا۔ جنس بضاعت کی رات گزر گئی اور صبح نمودار ہوئی۔ اب کانگڑے اور ہاگ کا وقت نہیں رہا۔ اب جو گیے کی الاپ کا وقت ہے۔

اس کے جو بڑے بڑے استادوں نے اکثر مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں جن میں ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر سے مانگ نہیں ہے بلکہ ساری غزل کا مضمون تمام سے آخر تک ایک ہے۔ ایسی غزلیں اگر کوئی لکھنی چاہے تو ان میں کسی تمدنی واقعاتی مضمون کو بھی باندھ سکتے ہیں۔ مثلاً ہر ایک کو موسم کی کیفیت، صبح اور شام کا سماں، چاندنی رات کا لطف، جنگل یا باغ کی بہار، پہلے تماشوں کی چہل پہل، قبرستان کا سناٹا، سفر کی روداد، وطن کی دلبستگی اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں مسلسل غزل میں بہت خوبی سے بیان ہو سکتی ہیں۔

غرض غزل کو بیکار نہ سمجھو اور خیالات کے جہاں تک ممکن ہو سعت دینی چاہیے۔ شعر کی لوگوں کو ایسی ضرورت نہیں ہے جیسی کہ بھوک میں کھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کو اگر ہمیشہ طرح بہ طرح کے کھانے میسر نہ آئیں تو وہ تمام عمر ایک ہی کھانے پر قناعت کر سکتا ہے لیکن شعر یا راگ میں جب تک تلون اور تنوع نہ ہو اس سے جی اکتا جاتا ہے۔ جو گویا سیح شام رات اور دن بھیرویں ہی الاپے جائے اس کا گانا اجیرن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح شعر میں ہمیشہ ایک ہی رنگ کے مضامین سنتے سنتے نفرت ہو جاتی ہے ؎

مکرر اگر چہ مے سرد آتش باشد
طبیعت را ملال انگیز باشد

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جس طرز سخن میں جدت، نیا اور اچھوتے مضامین ہوں پہلے زمانہ کی شاعری کا مقابلہ اسی طرح اب ایک مضمون کو مختلف پیرایوں اور متعدد اسلوبوں میں باندھ کر اعلیٰ کمال شاعری میں داخل ہے۔ پہلے جب ایک ہی مضمون ہیئت کی صورت میں باندھا جاتا تھا تو اس میں تازگی باقی نہیں رہتی تھی۔ مضمون کے چند حدود طے ہوتے ہیں جب وہ تمام پہلو نکل چکتے ہیں تو اس مضمون میں نوع کی گنجائش نہیں رہتی۔ پھر بھی اگر اسی کو تجنیس سے چلے جائیں گے تو بجائے نوع کے تکرار اور اعادہ پیدا ہونے لگے گا۔ پھر پیدا دور ہے اب کہ لوگوں کو غزل میں ڈال سکتا ہے مگر یہ اس کی قلعی کھل جاتی ہے۔ لوگ اس کو دور ہی سے دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ پھر وہی ہے۔ ہم لوگ جب کوئی غزل دیکھتے ہیں تو اپنے دل میں سمجھتے ہیں کہ ہم سب سے الگ اچھوتے مضمون بیان کریں گے۔ پہلے ہیں غزل کو دیکھیے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کی شکلیں مختلف ہیں لیکن ہر ایک کا ایک ہے۔ فرض کرو کہ مختلف شکلوں کے متعدد سانچے ہیں۔ ان میں کوئی مثلاً تکونی، کوئی مربع، کوئی مستدیر اور کوئی مخمس ہے۔ اب یہ سانچے ہیں موم پگھلا کر ڈالو۔ ظاہر ہے کہ ہر سانچے سے موم کی شکل تکونی، مربع، مستدیر اور مخمس ہو کر نکلے گی۔ اسی طرح ہر مضمون کو ہر غزل میں ڈھال کر دیکھ لو۔ یہ بعینہٖ ایسا ہی حال غزل کا ہے۔ مضمون وہی ہوتی ہیں مگر بحور و اوزان و قافیہ کے اختلاف سے نئے نئے سانچے بنا لیتے ہیں۔

ایک شاعر نے اپنا کہ دیوان غزلیات اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس میں چاک گریباں کا مضمون مختلف ذیل صورتوں میں باندھا ہوا ہے:

۱۔ اے جنوں گریباں تو چاک کر چکے اب کیا گریباں کوئی اور شغل تا۔

۲۔ لوگ پھر جامہ دری کرنے لگے اور جامہ دامن پھر گریبان تک بدلنے لگا۔
۳۔ بہار کے دن قریب آ گئے گریبان خود بخود پھٹا جاتا ہے۔
۴۔ اگر بہار میں میری پھٹک چھپوں کی باقی قبر ہوں پر نہ دامن نظر آتا نہ گریبان۔
۵۔ اگر آشفتگی کی پابندی نہ ہوتی تو ہم دامن اور گریبان سب پھاڑ ڈالتے۔
۶۔ وہ بادہ چھوڑ کر چلا گیا میں بھی اب گریبان کو پھاڑ کر چھوڑوں گا۔
۷۔ اے جنوں تو جہاں میں گریبان بھاتے ہیں تو ساری رات اس کے مارگھتا رہ
۸۔ اس کی تحریر سے ہیں ایسا پریشان ہوا کہ پیراہن جاک گریباں کو بھولا۔
۹۔ اس کی چھپ مہیا کا دامن ہو کر گریبان چھٹتے ہیں۔
۱۰۔ یہ بہار ہی دامن کی طرح گریبان کے بھی تنگ ہے۔
۱۱۔ دیکھیے تم کب کے کٹے چھاڑتے ہیں اور کب تک ہم کو جنوں سوزن کی طرح عریاں رکھتا ہے۔
۱۲۔ اے جنوں اب یہ دری نے کہ ہم دامن کو پھاڑ کر کب تک گریبان میں ڈالتے رہیں۔
۱۳۔ ساری دنیا کے تار کیسے بکار ہیں آؤ گریبان ہی چاک کر لیں۔
۱۴۔ اے جنوں گریبان تھوڑا کھلا تنگ کرتا ہے اس کی دھجیاں اڑا دے۔
۱۵۔ اے جنوں اب کے بہار میں گریبان کو اس جاک کو کہ کسی سے نہ ہو سکے۔
۱۶۔ کر لیا ہو سے دامن چھڑا کے گل سے ہم نے گریبان چاک کر کے گل کے۔
۱۷۔ جنوں جو حد سے بڑھا تو گریبان چاک ہو کے دامن سے مل گئے۔
۱۸۔ مجھے بھائے کریبانوں پر حسرت سے آتی ہے کہ گئے دامن تھرا کی تار سے دوڑے جاتے ہیں۔
۱۹۔ ہمارے ذوق جنوں کی بدولت زمانے پر ہیں کہ نئے نئے گریباں چاک ہوتے ہیں۔
۲۰۔ اے جنوں تیرے دامنوں سے کفن تنگ ہوں تو نئے گریبان کہاں سے لاؤں۔
۲۱۔ اس کے عاشق ہمیشہ گریبان چاک رکھتے ہیں گل کے گریباں ہیں کہ یوں بھی رفو ہے؟
۲۲۔ ہوا آئی اور ہنوز پھر پڑے اپھاڑنے لگا۔ کفنے ہی گریباں چھیڑے ہو ہو کر اڑ گئے۔
۲۳۔ اے جنوں کچھ تو دے اے چشم کہ جو گریبان کا ایک تار کبھی بیکار جانے دے۔

جن بزرگوں سے ہم نے یہ ایک مضمون سنا ہے ۳۰ اسلوب بیان نقل کیے ہیں ہر کچھ اور بڑھ سو کچھ کا دیوان ہے۔ جب ایک مختصر دیوان کا یہ حال ہے تو بڑے دیوانوں میں دیکھنا چاہیے کہ جی ایک مضمون کتنی شکلوں میں باندھا گیا ہوگا اور اگر کوئی صاحب وہ دیوان کبھی ان میں تامل کر لیا جائے تو میں جانتا ہوں کہ ایک ایک مضمون کے اشعار سے ایک ایک مجموعہ تیار ہو سکتا ہے اور یہ مضمون ایسے تنگ ہے کہ اس میں ایک دو اسلوب سے زیادہ گنجائش نہیں معلوم ہوتی۔ اسی سے قیاس ہو سکتا ہے کہ بڑے بڑے مضمون جن میں اس مضمون کی نسبت زیادہ پہلو نکل سکتے ہیں ان کی کہاں تک نوبت پہنچی ہوگی۔ جیسے [illegible]

پیشِ فغانِ بُت پرستی، تو پیشگی، زندی و بادہ خواری وغیرہ وغیرہ۔ اس میں بالکل مبالغہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ اگر تمام فارسی و اردو کی غزلیات کا تجزیہ کیا جائے اور مکررات کو چھوڑ کر محض اصل مضامین چھانے جائیں تو سو سوا سو صفحہ سے زیادہ کی مقدار نہ نکلے گی اور اگر یہ التزام کیا جائے کہ ہر ایک مضمون جتنے عمدہ پہلوؤں سے باندھا گیا ہو ان سب کو انتخاب کر لیا جائے تو بے شک اس سے کسی قدر مقدار بڑھ جائے گی مگر اکثر عمدہ پہلو قدما کے کلام میں نکلیں گے اور ان کے فضلات متاخرین کے کلام میں۔ یہی "چاک گریباں" کا مضمون جو متاخرین میں سے ایک نے ۲۳ طرح پر باندھا ہے، میر تقی کے ہاں اس طرح بندھا ہوا ہے ؎

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

مگر کہہ نہیں سکتے کہ متاخرین میں سے کسی نے اس سے بہتر "چاک گریباں" کا مضمون باندھا ہو۔

مذکورۂ بالا تقریر سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ متاخرین قدما کے کلام سے کوئی بات اخذ نہ کریں اور جو مضمون وہ باندھ گئے ہیں اب اس کو کسی پہلو سے باندھیں یا اپنے باندھے ہوئے مضامین کو پھر اعادہ نہ کریں۔ کیونکہ ایسا اس کے نہ عرفِ شعر میں بلکہ ہر فن اور ہر صناعت میں کسی طرح کام نہیں چل سکتا۔ کعب ابن زہیر جو ایک مخضرم شاعر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مادح ہے وہ کہتا ہے ؎

مَا اُرَانِیْ نَقُوْلُ اِلَّا مُعَارًا اَوْ مُعَادًا مِنْ قَوْلِ مَنْ قَدْ مَضٰی

(یعنی ہم جو کچھ کہتے ہیں یا تو اوروں کے کلام سے مستعار لے کر کہتے ہیں یا اپنے ہی کلام کو پھیر پھار کر دہراتے ہیں)

پس جب آج سے تیرہ سو برس پہلے شعرا کا یہ خیال تھا تو ہم کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ تو ہماری خوش نصیبی سے ہم کو مضمون حاصل ہے یا ہم کو یہ قدرت ہے کہ کوئی مضمون ایک دفعہ باندھ کر پھر اس کا اعادہ نہ کریں۔

عربی میں دو قضیے مشہور ہیں، ایک یہ ہے کہ :

كَمْ تَرَكَ الْاَوَّلُ لِلْاٰخِرِ — "یعنی اگلے بہت کچھ پچھلوں کے لیے چھوڑ گئے ہیں"

دوسرا قضیہ یہ ہے کہ

مَا تَرَكَ الْاَوَّلُ لِلْاٰخِرِ شَيْئًا — "یعنی اگلوں نے پچھلوں کے لیے کچھ نہیں چھوڑا"

ان دونوں مشہور قضیوں میں یہ ممکن ہے کہ کچھ بہت سی اور حوروں باتیں چھوڑ گئے ہیں کہ پچھلے ان کو نہ پا کر یں لیکن اتنا کچھ پچھلوں کے لیے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جس کا مانند نہ موجود نہ ہو۔

اس بات پر نظر کرنے سے یہ اتفاق ہے کہ پچھلا شاعر جو کسی پہلے شاعر کے کلام سے کوئی مضمون اخذ کرکے اس میں کوئی ایسا لطیف اضافہ یا تبدیلی کر دے جس سے اس کی خوبی یا متانت یا فصاحت زیادہ ہو جائے وہ درحقیقت اس مضمون کو اپنے شاعر سے بھی بہتر لکھتا ہے۔ حافظ شیرازی کہتے ہیں ؎

اندر ربطہ ما خبرِ ندارد — آسودہ کہ بیگانہ و یار است

اسی مضمون کو خواجہ حافظ نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

شبے تاریک و بیم موج و گردابے چنیں ہائل — کجا دانند حالِ ما سبکبارانِ ساحل ہا

ظاہر ہے کہ حافظ نے اس مضمون میں گویا اس کمی کو پورا کر دیا ہے جو شیخ کے بیان میں رہ گئی تھی۔ پس کہا جا سکتا ہے کہ حافظ نے شیخ سے یہ مضمون جو میں لیا اسی مطلب کو نظیری نے یوں تعبیر کیا ہے ؎

بہ زیر سایۂ گل آہی گزند طپیں را ۔۔۔ تو اگر ان نخورده گزند ما چہ خبر

اگرچہ نظیری نے اصل مضمون پر کوئی ادبی اضافہ نہیں کیا جس کے لحاظ سے کہا جائے کہ خواجہ حافظ سے مضمون چھین لیا لیکن اس نے مضمون کو اپنے بدیع اسلوب میں ادا کیا ہے کہ بالکل ایک نیا مضمون معلوم ہوتا ہے۔

ایک اور شعر جو حافظ کا یہی شعر ایک مدت پہلے پڑھا گیا۔ ایک صاحب جو شعر کا صحیح ذوق رکھتے تھے یہ شعر سن کر بولے کاش دوسرے مصرع میں بھی اسی قسم کی مشکلات اور نختیوں کا بیان ہوتا جیسی کہ پہلے مصرع میں بیان کی گئی ہیں اور اس بات کا کچھ اظہار نہ کیا جاتا کہ بیدردوں کو ہمارے حال کی خبر ہے تاکہ اپنے حال میں مبتلا ہونے اور غیر کے تصور سے ذہول (بھول) حاصل ہونے کا زیادہ ثبوت ہوتا۔ یہی غالب مرحوم کا یہ شعر پڑھا ؎

بوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز ۔۔۔ گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است

وہ یہ شعر سن کر اچھل گئے اور کہا کہ واہ بس ہیرا ہی مطلب تھا۔ ان مثالوں سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ شاعر کے کلام میں بعض اوقات کوئی کمی رہ جاتی ہے جس کو پچھلے پورا کر دیتے ہیں کبھی قدما ایک مضمون کو کسی خاص اسلوب میں محدود سمجھ لیتے ہیں۔ متاخرین اس کے لیے ایک نرالا اسلوب پیدا کر دیتے ہیں اور کبھی متاخرین قدما کے اسلوب میں سے ایک خوبی کم کر کے ایک دوسری خوبی بڑھا دیتے ہیں اور اس سے شاعری کو بے انتہا ترقی ہوتی ہے۔ پر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ شاعر اپنے محدود و فکر اور تخیل پر ٹھوکر کھا کر قدما کی مستقیمی سے دست بردار ہو جائے۔

شعرائے عجم یا متاخرین شعرائے ایران میں سے کوئی اور شخص غزل میں کہتا ہے ؎

مشاطہ یا بگو کہ مرا سیاب حسن دوست
چیزے ز فرد کند کہ تماشا بما رسید

قائل کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پسندیدہ معشوق کے محبوبی بنانے میں کمی نہیں ہیں۔ یہ مشاطہ کو چاہیے کہ ان میں کچھ اور اضافہ کرے کیونکہ اب اس کے دیکھنے کی نوبت ہم تک پہنچی ہے۔ شاعر نے مضمون میں جدت تو پیدا کی مگر بھیڑ کی۔ اول تو اس نے جس کو دوست قرار دیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس کی محبت کا نشہ اس کے دل میں نہیں بیٹھا پھر اس کو دوست کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ دوسرے اس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معشوق کے حسن ذاتی سے کچھ دل بستگی نہیں رکھتا بلکہ عارضی بناؤ سنگار پر فریفتہ ہے تیسرے عشق جو ہمیشہ بے تصنع و بے ارادہ پیدا ہوتا ہے اس کو قصد اور ارادہ سے پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مرزا غالب مدح میں کہتے ہیں ؎

زمانہ عہد میں ہے اس کے محو آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

ظاہر ہے یہاں اسی فارسی شعر سے قصداً یا بلا قصد پیدا ہوا ہے مگر مرزا نے اس مضمون کو اصل بیان کے بانکے والے سے بالکل چھین لیا ہے جو غزل الغزل کی حالت میں ہے اور موجودہ مدح کی حالت میں بالکل ضائع ہے۔ مرزا نے ممدوح کو ایک ایسے کمال

کے ساتھ موصوف کیا ہے جو تمام کمالات کی جڑ ہے یعنی وہ ہر چیز کو کامل تر اور افضل تر حالت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی لیے ہر شے اپنے تئیں کامل تر حالت میں اس کو دیکھنا چاہتی ہے کہ اگر یہی حال ہے تو شاید انسان کی جیب دنیا ہست کے لیے اور ستارہ پیدا کیے جائیں اس پر طرہ اس کے کہ کوئی منطقی اعتراض کیا جا سکے اور کسی طرح کی گرفت نہیں ہو سکتی۔ بھارت فارسی شعر کے کہ اس کی بنا خود اصول شاعری اور آداب کشش و محبت کے خلاف ہے۔ عرفی شیرازی کہتا ہے ؎

ہر کس نہ ست اسنۂ را ست و گر نہ
اینہا ہمہ راست کہ معلوم عوام ست

غالب مرحوم نے اسی مضمون کو رومر سے لباس میں اس طرح ملبوس کر لیا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی خوبان ناز کا
پاس وضع چاہیے ہے پردہ ہے راز کا

اگرچہ گمان غالب یہ ہے کہ عرفی کی رہبری اس خیال کی طرف قرآن مجید کی اس آیت سے ہوئی ہوگی "وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ" لیکن ہر حالت میں عرفی کا یہ شعر آب زر سے لکھنے کے قابل ہے اور جس اسلوب میں کہ یہ خیال اس سے ادا ہو گیا ہے اب اس سے بہتر اسلوب ہاتھ آنا دشوار ہے باایں ہمہ نزاکت اور تلاش بھی کچھ کم تحسین کے قابل نہیں ہے کہ جس مضمون میں معنی اضافہ کی گنجائش نہ تھی اس میں لفظ اضافہ کا ہے جو باوجود الفاظ کی دلفریبی کے لطف معنی سے بھی خالی نہیں ہے۔ عرفی کا یہ مطلب ہے کہ جو باتیں عوام کو معلوم ہیں یہی حقیقت اسرار ہیں۔ سرزنش کرتے ہیں کہ جو چیز پر مانع کشف راز معلوم ہوتی ہیں وہی درحقیقت کاشف راز ہیں۔

بہرحال اس قسم کے اقتباسات ہمیشہ مناجات فضا کے کلام سے کرتے رہے ہیں اور چراغ سے چراغ جلتا چلا آیا ہے۔ شعرائے عرب جب کوئی اچھوتا مضمون باندھتے تھے تو لوگ تعجب ہو کر ان سے پوچھتے تھے کہ کس قریب سے یہاں تک ذہن پہنچا تو وہ صاف صاف اپنے خیال کا ماخذ بتا دیتے تھے۔ ابوتمام نے فضل بن یحییٰ کی شان میں یہ شعر کہا تھا۔

وَلَیْسَ لِلّٰهِ بِمُسْتَنْكَرٍ اَنْ یَّجْمَعَ الْعَالَمَ فِیْ وَاحِدٍ

(یعنی خدا سے یہ بات بعید نہیں ہے کہ تمام عالم کو ایک شخص کی ذات میں جمع کر دے)

اس پر کسی نے اس سے پوچھا کہ یہ مضمون کیونکر سوجھا؟ ابوتمام نے صاف کہہ دیا کہ یہ خیال جریر کے اس شعر سے پیدا ہوا جو اس نے بنی تمیم کی تعریف میں کہا ہے ؎

اِذَا غَضِبَتْ عَلَیْكَ بَنُوْ تَمِیْمٍ حَسِبْتَ النَّاسَ كُلَّهُمْ غِضَابًا

(یعنی جب بنی تمیم تجھ سے ناراض ہو جائیں تو سمجھنا چاہیے کہ تمام بنی آدم تجھ سے ناراض ہیں)

شعر ہی پر کچھ موقوف نہیں بلکہ تمام علوم و فنون میں انسان نے اسی طرح ترقی کی ہے کہ اگلے جو ادھورے چھوڑتے گئے پچھلے اس میں کچھ نہ کچھ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہر ایک علم اور ہر ایک فن کمال کے درجہ کو پہنچ گیا۔ شعر کی ترقی بھی اسی طرح ہوتی رہی ہے کہ ذوالجلالات میں کچھ کچھ معقول تصرفات ہوتے ہیں لیکن اس قسم کے تصرفات کرنے کے لیے شاعری کی پوری لیاقت ہونی چاہیے ورنہ جیسے بچوں

ہمارے ملک کے اکثر شعرا کرتے ہیں ان سے بجائے ترقی کے روز بروز شاعری نہایت ذلیل و پست و حقیر ہوتی جاتی ہے۔

فارسی میں کہ اردو میں زیادہ اور انگریزی میں بہت زیادہ نہ صرف نظم میں بلکہ نثر میں نظم سے بھی زیادہ ہر قسم کے بلند، لطیف اور پاکیزہ خیالات کا ذخیرہ موجود ہے پس ہمارے ہم وطنوں میں جو لوگ ایسے دماغ رکھتے ہیں کہ غیر زبانوں سے نئے خیالات اخذ کر کے ان میں عمدہ تصرفات کر سکتے ہیں وہ اپنے مطلب کو کے موافق تصرف کر کے اور جن کی قوت تخیلیہ ان سے کم درجہ کی ہے وہ انہی خیالات کو جیسے اپنی زبان میں صفائی اور سادگی کے ساتھ نثر کر کے اردو شاعری کو سرمایہ دار بنائیں سنسکرت اور بھاشا میں خیالات کا ایک دوسرا مالہ ہے اور اردو زبان بہ نسبت اور زبانوں کے سنسکرت اور بھاشا کے خیالات سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ اس لیے ان زبانوں سے بھی خیالات کے اخذ کرنے میں کمی نہ کریں اور جہاں تک کہ اپنی زبان میں ان کے ادا کرنے کی طاقت ہو ان کو شعر کے لباس میں ظاہر کریں اور اس طریق اردو شاعری میں ترقی کی روح پھونکیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے شعرا نے جو کہیں کہیں فارسی اشعار کا ترجمہ اردو اشعار میں کر دیا ہے ان پر لوگوں نے اعتراض کیے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ کوئی اعتراض کا محل نہیں ہے۔ ایک زبان کے شعر کا عمدہ ترجمہ دوسری زبان کے شعر میں کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے ایک بزرگوار نے سارا سکندر نامہ بھری اردو میں ترجمہ کر ڈالا ہے اور ہم نے سنا ہے کہ وہ شاعر بھی تھے اور مولوی بھی۔ ان کے چند شعر یاد ہیں۔

کرے بیرہ زیبا جو ہر شاخ کو ۔۔۔ کہ یاد آئش کرے خاک کو

ہوا جب کہ آراستہ باغ خوش ۔۔۔ بہر میوۂ شیریں وہم ترش

بشاری لب پستہ خنداں ہوا ۔۔۔ طلب اس پہ بھی تیز دنداں ہوا

ہوا ہر نہالے نہ افسر و تخت ۔۔۔ کہ ہوں تاج پر لعل جوں در و لخت

پہ رغبت ہر شاخ انجیر دار ۔۔۔ لگے مرغ زنجیر خوار

اٹھایا لب غم نے جوش نفیر ۔۔۔ ہم از لب رسے شیرو ہم از لبے شیر

شاید اس ترجمہ کی نسبت تو یہ کہا جا سکے کہ وہ مشاق شاعر نہ تھا اس لیے عمدہ ترجمہ نہ کر سکا لیکن ہم مشاق شاعروں سے کہتے ہیں کہ از راہ عنایت زیادہ نہیں تو انہی چھ شعروں کو فصیح اردو نظم میں تو ذرا لکھ دیں۔ جو شخص دوسری زبان کے شعر کو اپنی زبان کے شعر میں عمدگی کے ساتھ ترجمہ کرتا ہے گو اس سے اس کی قوت تخلیق کا کمال ثابت نہیں ہوتا مگر وہ ایک دوسری لیاقت کا ثبوت دیتا ہے جو ہر ایک شاعر میں نہیں ہو سکتی۔

ہمارے بعض شعرا نے بعضے ایسے خیالات کو جو فارسی اشعار میں تھے اردو میں ایسی خوبی سے ادا کیا ہے کہ من و جہ اصل شعر سے بڑھ گئے ہیں۔ نظیری کا شعر ہے ؎

برتے یار من ازیں سست وفا می آید ۔۔۔ گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

سودا کہتے ہیں ؎

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا ۔۔۔ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

اس میں شک نہیں کہ سودا نے اپنے شعر کی بنیاد نظیری کے مضمون پر رکھی ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ تھوڑے سے تغیر کے ساتھ

اس کا ترجمہ کر دیا ہے لیکن بلاغت کے لحاظ سے سودا کا شعر نظیری سے بہت بڑھ گیا ہے۔ دوست کے یاد آنے سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ عاشق خود رفتہ ہو جائے لیکن ساغر شراب کو دیکھ کر معشوق کی مشابل آنکھ کے تصور سے بے خود ہو جانا تر بیت یافتہ ہے۔ اس کے "از کار رشدم" میں وہ تعمیم نہیں ہے جو اس میں ہے کہ چلا میں۔ نہیں معلوم کہ آپے سے چلا یا دین و دنیا سے چلا یا جگہ سے چلا یا کہاں سے چلا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ "چلا میں" ہمیشہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب کوئی وجہ ہو جس سے کوئی ہوش گم کر دے اور "از کار رشدن" میں یہ بات نہیں ہے معطل ہونے، معزول ہونے، پاگل اور نکمے ہونے کو بھی "از کار رشدن" سے تعبیر کرتے ہیں۔

دلِ غافل خود راہ مدہ بچو منے ۔
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے ۔ (بلا علم)
نہ کہیں عیش تمہارا ہی مخبل ہو جائے
دوستو درد کو محفل میں نہ رویا کرنا (خواجہ میر درد)

مخمس ہے کہ خواجہ میر درد نے فارسی شعر سے مضمون اخذ کیا ہو لیکن یقیناً ان کا شعر فارسی شعر سے بہت بڑھ گیا ہے۔ اوّل تو مانی مطلع کے مضمون کو اپنے مقطع میں لانا محض میر درد کا لفظ ہی شاعر کے دعوی پر دلیل کا حکم رکھتا ہے۔ پھر راہ مدہ کی جگہ یاد کردہ بولنا محض کے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہی کہ درد کا اپنی محفل میں ذکر نہ کرو۔ دوسرے یاد کرنے کے معنی ہیں اعلانیہ کا۔ اس کو اپنے پاس بلانا اور بڑی خوبی درد کے شعر میں یہ ہے کہ محفل میں نہ بلانے کی وجہ خود ہی میں یقینی طور پر بیان کی گئی ہے اس کو میر درد نے احتمال کی صورت میں اس طرح پیدا کیا ہے "نہ کہیں عیش تمہارا بھی منغص ہو جائے"۔ ان دونوں اسلوبوں میں ایسا ہی فرق ہے جیسے ایک شخص تو بیمار سے یوں کہے کہ "ہم پرہیزی سے آدمی ہلاک ہو جاتا ہے" اور دوسرا یہ کہے "دیکھو کہیں بدپرہیزی میں جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھو"۔ دوسرے اسلوب میں جیسا کہ ظاہر ہے نسبت پہلے اسلوب کے زیادہ تخویف و تحذیر ہے۔

دوستاں منع کنند مرکہ چرا دل بتو دادم
باید اوّل تو گفتنی کہ چنیں خوب چرائی؟ (سعدی شیرازی)
پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
ان سے بھی تو پوچھیے تم اتنے کیوں پیارے ہمنے! (میر تقی میر)

میر کا یہ شعر ظاہراً سعدی کے شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے مگر سعدی کے ہاں 'خوب' کا لفظ ہے اور میر کے ہاں 'پیارے' کا لفظ ہے۔ ظاہر ہے کہ خوب کا محبوب ہونا کوئی ضروری بات نہیں ہے لیکن پیارا ہونا ضرور ہے۔ پس سعدی کے سوال کا جواب ہو سکتا ہے مگر میر کے سوال کا جواب نہیں ہو سکتا۔

بہر حال ترجمہ کرنا بشرطیکہ ترجمہ کے نقائص پورے پورے ادا ہو جائیں کوئی عیب کی بات نہیں ہو سکتی۔ سعدی جو فارسی شاعری کا ہومر ہے خود اس کے کلام میں عربی اقوال و امثال کے ترجمے یا ان کا ماحصل موجود ہے مثلاً:

سعدی	اقوال عربی
۱۔ سگ بدریائے ہفتگانہ بشوے	اَلْکَلْبُ اَنْجَسُ مَا یَکُوْنُ اِذَا غَتَسَلَ
چو نکو تر شد پلیدتر باشد	

سعدی	اقوالِ عربی
۲ - تو اخاشی اے خداوند ہوش وقار است و اہل با پردہ پوش	اَلصَّمْتُ زِیْنَۃُ الْعَالِمِ وَ سَتْرُ الْجَاھِلِ
۳ - تو کجا ئے پدر چہ کردی چیر تا ہم چشم داری از پسرت	رَاعَ اَبَاکَ یُرَاعُ اِبْنُکَ
۴ - شیرہ گر تو برآفتاب نخواہد روئی بازار آفتاب نکاہد	سَمَاعُ ذُکَاءٍ لَا یَزَالُ مِنْ دُعَاءِ الْغُفَاشِ
۵ - نیک بخت آنکہ خورد و کشت و بد بخت آنکہ مرد و ہشت	اَسَعِیْدٌ مَنْ اَکَلَ وَ زَرَعَ وَالشَّقِیُّ مَنْ مَاتَ وَ وَدَعَ
۶ - پادشاہاں بخردمنداں محتاج ترانند کہ خردمنداں بہ پادشاہاں	اَلسُّلْطَانُ اَحْوَجُ اِلَی الْعُقَلَاءِ مِنَ الْعُقَلَاءِ اِلَی السُّلْطَانِ

اہل یورپ جو آج لٹریچر میں بھی مثل علوم و فنون و صنائع کے تمام دنیا سے فائق ہیں۔ اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ دنیا میں کوئی مشہور تو صالیسی نہیں جس کی شاعری اور انشاء کا لب لباب ان کی زبانوں میں موجود نہ ہو۔ پس ہم کو بھی چاہیے کہ جس قوم اور جس زبان کے خیالات ہم کو بہم پہنچیں ان سے جہاں تک ممکن ہو فائدہ اٹھائیں۔ اور صرف انہی چند غزر سودہ اور بوسیدہ خیالات پر جو صدیوں سے بمایہ بندتے چلے آتے ہیں قناعت کر کے نہ بیٹھ رہیں کیونکہ علم و ہنر میں قناعت ویسی ہی قابلِ ملامت ہے جیسی مال و دولت میں حرص۔

(۴) جس طرح ہماری غزل کے مضامین محدود ہیں اسی طرح اس کی زبان بھی ایک خاص دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتی۔ کیونکہ چند تعلیٰ مضمون جب صدیوں تک برابر رٹتے جاتے ہیں تو زبان کا ایک خاص حصہ ان کے ساتھ مخصوص ہو جاتا ہے جو کہ زبانوں پر بار بار آنے اور کانوں سے بار بار سُننے کے سبب زیادہ مانوس اور گوارا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ جو انہی کے ہم معنی ہوں استعمال کیے جائیں تو غریب اور اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔

مثنوی مضامین ہمارے ہاں کچھ غزل ہی کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتے بلکہ قصیدے اور مثنوی میں بھی بہ انہی کا عمل دخل رہا ہے۔ فارسی اور اردو زبانوں میں چند کے سوا کل مثنویاں مثنویہ مضامین پر لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح قصائد کی تمہیدوں میں بھی زیادہ تر یہی دکھڑا رویا گیا ہے۔ واسوخت تو عشق کی پیدائش ہی سے پیدا ہوا ہے لیکن چونکہ قصیدہ، مثنوی اور واسوخت کا میدان بسیط ہے لہٰذا ان میں غریب اور اجنبی الفاظ کی بہت کچھ کھپت ہو سکتی ہے۔ تجلاتِ غزل کے کہ یہاں ایک لفظ بھی غیر مانوس ہو تو اوٹو معلوم ہوتا ہے۔ گلاب کے تختہ میں کانٹے بھی پھولوں کے ساتھ نمودار ہو جاتے ہیں مگر گلدستہ میں ایک کانٹا بھی کھٹکتا ہے اسی واسطے جن بزرگوں نے غزل کی بنیاد رکھی اور اخلاق پر رکھی ہے ان کو بھی وہی زبان انتخاب کرنی پڑی ہے جو غزل میں عموماً برتی جاتی ہے۔ مثنویہ مضامین میں جو الفاظ حقیقی معنوں پر اطلاق کیے جاتے تھے انہی الفاظ کو ان بزرگوں نے مجاز و استعارہ کے طور پر استعمال کیا ہے اور رمز و کنایہ و تمثیل میں اپنے اصلی خیالات ظاہر کیے ہیں۔ پس غزل میں ضرور ہے کہ بہ نسبت اور اصناف کے سادگی اور صفائی کا زیادہ خیال رکھا جائے۔ آج تک فارسی یا اردو میں جن لوگوں کی

غزل مسلسل ہوتی ہے وہ یوں لوگ ہیں جنھوں نے اس اصل کو نصب العین رکھا ہے۔ اردو میں ولی سے لے کر اقبال اور یگانہ تک جو اساتذہ غزل گو ہوئے ہیں ان کے ہاں یہ روایت کسی نہ کسی حد تک ضرور پائی جاتی ہے۔ ان کے بعد ولی میں حسن، غالب، مومن اور شیفتہ وغیرہ کے ہاں فارسی کی طرح غزل میں بھی ایک شعر یا زیادہ سے زیادہ دو شعر میں کوئی مکمل خیال پیش کر دینے کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ ان لوگوں کے ہاں خیال خاتمہ غزل سے پہلے ختم ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد کا شعر ایک دوسرے خیال کا شعر ہوتا ہے۔ اگلے شعر میں پھر کوئی نیا خیال شروع ہو جاتا تھا۔ ان لوگوں کے ہاں بھی خاتمہ غزل سے پہلے کا شعر ایک دو سے زیادہ نہیں نکل سکتا باقی بھرتی ہوتی ہے۔ اگلے شعرا شعر گرگی کی کچھ پروا نہ کرتے تھے ایک دو شعر اچھا نکل آیا باقی کم و بیش اور بعض بعض شعرا تو سے غزل کا نصاب پورا کر دیتے۔ ہم لوگ یہ کہتے ہیں کہ اپنے بھلی کے استاد کو فارسی تتبع سے پست کر دیتے ہیں۔ اگر ہماری استغراق تجزیہ مصروں کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ بھی معمولی خیالات کو جودت سے مختلف شکلوں میں ادا کرتے چلے آتے تھے بہت کم یا رہتے تھے بلکہ ہر شعر میں جدت پیدا کرنی چاہتے تھے اس لیے اردو غزل کا شیرازہ اکثر اوقات سے ساقط رہتا تھا۔ بایں ہمہ غزلیت کی شان ان کے تمام کلام میں پائی جاتی ہے۔ اور صاف و شستہ محاورہ اور بندشوں کے ان بھی نمونے ان کے ہاں مل سکتے ہیں جتنے کہ فصاحت کے نمونے ہیں۔ زبان کی غزل میں عموماً زبان کا محاورہ اپنے معاصرین کے کلام سے زیادہ ہے مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں صنعتی سے جدت پیدا کرتے ہیں۔ لفظ کا تمام تر جہان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی تھوڑی سے اوپر تک کیساں ہے لیکن اس میں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے۔ رائج کلام غزل میں بندشوں کی صفائی، روزمرہ کی پابندی اور محاورہ کی بہتات کے طریقے اور ایک شرعی اور شیوہ ہے جو اس شعر کا حصہ ہے مگر نہایت عجب سے کہ گفتگو میں معاشرے نے سادگی اور صفائی کا خیال رکھا ہے باوجودیکہ زبان کے لحاظ سے دلی اور لکھنؤ میں کوئی قطعہ فرق نہیں معلوم ہوتا اس کے بعد اشرف الدولہ کے زمانہ سے سعادت علی خاں کے وقت تک اردو کے قلعہ معلی شعرا کا جمگھٹا لکھنؤ ہی میں رہا یہاں تک کہ میر، سودا، سوز، میر حسن، انشا وغیرہ نے دہلی میں رہ کر اور وہیں سے اور مگر متاخرین کی غزل میں ان کی طرز بیان کا اثر بہت کم پایا جاتا ہے۔ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب دلی بگڑ چکی اور لکھنؤ نے زمانہ حوالی کا اور دلی کے اکثر شریف خاندان اور ایک آدھ کے سوا تمام مشہور شعرا لکھنؤ ہی میں جا رہے اور دولت و ثروت کے ساتھ علم و ہنر نے بھی ایک خاص جھنگ تتلی کی۔ اس وقت بجز اہل لکھنؤ کو مشرب یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ جس طرح دولت اور منطق و فلسفہ وغیرہ میں ہم کو فوقیت حاصل ہے اسی طرح زبان اور لب و لہجہ میں بھی ہم دلی سے فائق ہیں۔ زبان میں فوقیت ثابت کرنے کے لیے ضرور تھا کہ اپنی اور دلی کی زبان میں کوئی امر یا۔ الامتیاز پیدا کیا جائے چونکہ منطق و فلسفہ و طب و علم کلام وغیرہ کی تمامیت زیادہ تر علمی تھی اور تعلیمیت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ سہل چال میں بھی الفاظ و نسبتہ ترک اور ان کی جگہ عربی الفاظ کثرت سے داخل ہونے لگے یہاں تک کہ سیدھی سادی اردو امرا اور اہل علم کی سوسائٹی میں متروک ہو گئی بلکہ جیسا اتفاقات سے سننا گیا ہے محبوب اور بازاریوں کی گفتگو سمجھی جانے لگی اور یہی تنگ رفتہ نظم و نثر پر غالب آ گیا۔ نظم میں جرأت اور صبا کے دیوان کا نثر میں واجد علی اور فسانہ عجائب کا مقابلہ کرنے سے اس کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ بایں ہمہ افسوس یہ ہے کہ مرثیہ اور مثنوی میں خاص خاص شخصوں پر جیسا کہ آگے بیان کیا جائے گا، زمانہ کے اقتضا نے کچھ اثر نہیں کیا۔ انھوں نے زبان کے اصلی جوہر کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ اس کو بزرگوں کا تبرک سمجھ کر اس انقلاب کے زمانہ میں نہایت احتیاط سے محفوظ رکھا۔

بہرحال غزل میں زبان اور بیان کی صفائی کی غرض سے چند باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ غزل کو محض عشقیات میں اور عشقیات کو محض ہوا و ہوس کے مضامین میں محدود رکھنا ٹھیک نہیں ہے بلکہ اس کو ہر قسم کے جذبات کا آرگن بنانا چاہیے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ غزل میں معمولی مضامین بندھتے بندھتے اس کی ایک خاص زبان قرار پا گئی ہے

اور وہ اس قدر کانوں میں رچ گئی ہے کہ اگر دفعتاً اس میں کثرت سے غیر مانوس اور اجنبی ترکیبیں اور اسلوب بیان داخل ہو جائیں تو غزل ایسی ہی مخبل ہو جائے جیسی کہ بعض شعراء کی غزل عربی اور فارسی کے غیر مانوس الفاظ اور ترکیبیں اختیار کرنے سے ہو گئی ہے حالانکہ غزل کو بااعتبار رنگ کے وسعت دینا بظاہر اس بات کا مقتضی ہے کہ بیان اور طریقۂ بیان کو بھی وسعت دی جائے۔ پس ضرور ہے کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ طریقۂ بیان میں دفعتاً کوئی بڑی تبدیلی واقع نہ ہو اور باوجود اس کے غزل میں ہر قسم کے خیالات عمدگی کے ساتھ ادا ہو سکیں۔

آج کل یہ کہا جاتا ہے کہ شعر کے لباس میں اکثر نئے خیالات جو ہمارے اگلے شعراء نے کبھی نہیں باندھے تھے ظاہر کیے جاتے ہیں مگر چونکہ وہ اس خاص زبان میں جو شعراء کی کثرت استعمال سے کانوں میں رچ گئی ہے ادا نہیں کیے جاتے بلکہ نئے خیالات جن الفاظ میں براہ راست ظاہر ہونا چاہتے ہیں انہی الفاظ میں ظاہر کر دیئے جاتے ہیں۔ اس لیے وہ مقبول خاص و عام نہیں ہوتے۔ لیکن نئی بات کی عام شاعری اگر سو دست مقبول نہ ہو تو کچھ ہرج نہیں۔ جب لوگوں کے مذاق رفتہ رفتہ اس سے آشنا ہو جائیں گے اور سچی باتوں کی لذت اور حلاوت سے واقف ہو لیں گے اس وقت وہ خود بخود مقبول ہو جائے گی۔ البتہ غزل کو ابتدا ہی سے جہاں تک ممکن ہو عام پسند اور مطبوع طبائع بنانا ضرور ہے کیونکہ یہی ایسی صنف ہے جو خاص و عام کی زبان پر جاری ہوتی ہے۔ اسی کے اشعار ہر شخص کو بآسانی یاد رہ سکتے ہیں اور یہی عام خوشی کے جلسوں اور سماج کی مجلسوں اور بازاروں کی صحبتوں میں گائی اور پڑھی جاتی ہے۔ پس ملک میں بیچارے شاعر پیدا کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ غزل میں ہر قسم کے لطیف و پاکیزہ خیالات بیان کیے جائیں۔ اس کو تمام انسانی جذبات کے ظاہر کرنے کا آلہ بنایا جائے اور باوجود اس کے اس کو ایسے لباس میں ظاہر کیا جائے جو بادی النظر میں اجنبی اور غیر مانوس نہ ہو۔

سب سے بڑی دلیل اس بات کی کہ نئے اور اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات بھی اگر اول اول اسی زبان اور روزمرہ میں ادا کیے جائیں جس میں پرانے اور پست خیالات ادا کیے جاتے تھے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کلام الٰہی میں تمام روحانی اور اخلاقی باتیں ویسے ہی محاورات و تشبیہات و استعارات و تمثیلات میں بیان کی گئی ہیں جن میں شعرائے جاہلیت عشقیات و غزلیات اور تفاخر و مدح و ذم وغیرہ کے قصائد بیان کرتے تھے۔

یہ ممکن ہے کہ کسی قوم کے خیالات میں دفعتاً ایک ناگہاں ترقی اور وسعت پیدا ہو جائے مگر زبان میں دفعتاً پیدا نہیں ہو سکتی بلکہ نامعلوم طور پر بیان کے اسلوب آہستہ آہستہ اضافہ کیے جاتے ہیں اور ان کو رفتہ رفتہ پھلک کے کانوں سے مانوس کیا جاتا ہے اور قدیم اسلوب جو کانوں میں رچ گئے ہیں ان کو بدستور قائم و برقرار رکھا جاتا ہے یہاں تک کہ اگر علم کی ترقی سے بہت سے قدیم شعراء کے خیالات محض غلط اور بے بنیاد ثابت ہو جائیں تو بھی ہمیں الفاظ کے ذریعہ سے وہ خیالات ظاہر کیے جاتے تھے وہ الفاظ ترک نہیں کیے جاتے۔ فرض کرو کہ آسمان کا وجود اور اس کا گردش کرنا، زمین کا ساکن ہونا، پانی اور ہوا کا بسیط ہونا، عناصر کا چار میں منحصر ہونا، اجرام کا جہاں تہاں ہونا، ظلمات میں چشمہ حیوان کا خفی ہونا، ہمیرغ اور دیو و پری کا موجود ہونا اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں علم انسانی کی ترقی سے قطعاً بعید ثابت ہو جائیں تو بھی شاعر کا یہ کام نہیں ہے کہ ان خیالات سے بالکل دستبردار ہو جائے بلکہ اس کا کمال یہ ہے کہ حقائق و واقعات اور سچے اور نیچرل خیالات کو اتنی غلط اور بے اصل باتوں کے پیرایہ میں بیان کرے اور اس طرح کر جو فرد باندھ گئے ہیں ہرگز ٹوٹنے نہ دے ورنہ وہ بہت جلد دیکھے گا کہ اس نے اپنے منتر میں سے وہی اثر پھر بسلامت دیے ہیں جو لوگوں کو تسخیر کرتے تھے۔

بہرحال جو لوگ اردو شاعری کو ترقی دینا یا یوں کہو کہ اس کو صفحۂ روزگار پر قائم رکھنا چاہتے ہیں ان کا فرض ہے کہ اضافہ بھی

میں عموماً اور غزل میں خصوصاً اس اصول کو ملحوظ رکھیں کہ سلسلۂ سخن میں نئے اسلوب جہاں تک ممکن ہو کم اختیار کیے جائیں اور زبان دانوں، الفاظ کم برتے جائیں مگر معلوم اور رفتہ رفتہ ان کو نکھارتے رہیں اور زیادہ تر کلام کی بنا قدیم اسلوبوں اور عمومی الفاظ و محاورات پر رکھیں مگر الفاظ کے حقیقی معنوں ہی پر قناعت نہ کریں بلکہ ان کو کبھی حقیقی معنوں میں کبھی مجازی معنوں میں کبھی استعارہ اور کنایہ کے طور پر اور کبھی تمثیل کے پیرایہ میں استعمال کریں وغرضیکہ ہر قسم کے کمالات۔ ایک پختہ گو، پختہ زبان میں کیونکر ادا کیے جا سکتے ہیں۔

استعارہ و کنایہ اور تمثیل کی تعریف اور ان کی قسمیں علم بیان کی کتابوں میں دیکھنی چاہئیں۔ یہاں ہم صرف اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ استعارہ بلاغت کا ایک رکن اعظم ہے اور شاعری کو اس کے ساتھ وہی نسبت ہے جو قالب کو روح کے ساتھ۔ کنایہ اور تمثیل کا حال بھی استعارہ ہی کے قریب قریب ہے۔ یہ سب چیزیں شعر میں جان ڈالنے والی ہیں۔ جہاں اصل زبان کا دامن تنگ ہو جاتا ہے وہاں شاعر انہی کی مدد سے اپنے دل کے جذبات اور خیالات کو ادا کر جاتا ہے اور جہاں اس کو پیرایۂ تعبیر نہ ملتا ہو وہاں یہی کنایہ اور تمثیل کے ذریعہ سے وہ لوگوں کے دلوں کو تسخیر کر لیتا ہے۔

بعض مضامین فی نفسہٖ ایسے دلچسپ اور دلکش ہوتے ہیں کہ ان کو محض سفارش اور سادگی سے بیان کر دینا کافی ہوتا ہے مگر بعض دفعہ خیالات ایسے ہوتے ہیں کہ معمولی زبان ان کو ادا کرتے وقت رہ جاتی ہے اور معمولی الفاظ میں ان کا پیش کرنا سننے والے کے دل پر کچھ اثر نہیں کرتا۔ ایسے مقام پر اگر استعارہ اور کنایہ یا تمثیل وغیرہ سے مدد لی جائے تو شعر شعر نہیں رہتا بلکہ معمولی بات سے بہت ہو جاتی ہے مثلاً آغا کہتے ہیں ؎

گیا تھا کہہ کے اب آتا ہوں تا صدقہ کو لو مر کے آئی
دلِ بیتاب واں جا کر کہیں تو بھی نہ سر ہوتا

اس شعر میں دیر لگنے کو موت آنے اور مر رہنے سے تعبیر کیا۔ اگر یہ دونوں لفظ نہ ہوتے بلکہ اس طرح بیان کیا جاتا کہ قاصد نے تو بہت دیر لگائی اے دل کہیں تو بھی واپس نہ لگا ہو تو شعر میں کچھ جان باقی نہیں رہتی یا مثلاً مرزا غالب کہتے ہیں ؎

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

دوسرے مصرع میں لفظ "پشیماں" اور استعارہ کے لفظ "پشیمانی" کی جگہ "زود پشیماں" کہا گیا ہے جس سے شعر میں جان پڑ گئی ہے۔ یہ ایسا ہی استعارہ ہے جیسا قرآن مجید میں "اَنْذِرْهُمْ" کی جگہ "بَشِّرْهُم بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ" فرمایا ہے۔ اسی طرح پر آتش کہتے ہیں ؎

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو

یہاں بھی "اعتماد نہیں ہے" کی جگہ طنزاً "اعتماد ہے" کہا گیا ہے۔ مرزا غالب کہتے ہیں ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

دوسرے مصرع کا اصل مدعا یہ تھا کہ وفاداری ایسی عمدہ صفت ہے کہ اگر برہمن وفاداری کے ساتھ ساری عمر بت خانہ میں بتوں کی پوجا کرتا رہا تو اس کے ساتھ وہ برتاؤ کرنا چاہیے جو اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے انسان کے ساتھ کرنا مناسب ہے۔ اس مطلب کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ اگر وہ بت خانہ میں مرے تو اس کو کعبہ میں دفن کرنا چاہیے۔ جو خوبی اس عنوان بیان میں ہے وہ ظاہر ہے۔ دوسری جگہ مرزا غالب کہتے ہیں ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

دوسرے مصرع میں بجائے "خوف معلوم ہوا" کی جگہ "گھر یاد آیا" کہا گیا ہے کیوں کہ جنگل میں خوف معلوم ہونے کو گھر یاد آنا لازم ہے اور چونکہ اس میں صنعت ایہام بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اس لیے شعر میں اور زیادہ لطف پیدا ہو گیا ہے یعنی اس میں یہ معنی بھی نکلتے ہیں کہ ہمارا گھر اس قدر ویران ہے کہ دشت کو دیکھ کر گھر یاد آتا ہے۔ مرزا غالب کا فارسی شعر ہے ؎

ہما مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتہ است

اس شعر میں اپنی مشکلات اور مختلف کو بطور تمثیل کے بیان کیا ہے۔ جس حالت کو شاعر نے اس عنوان سے بیان کیا ہے وہ کچھ بھی کھیل نہ ہوا اگر اس کو صاف اور سیدھے طور پر جیسی کہ وہ ہے بیان کیا جائے تو وہ ہرگز دو معرعوں میں نہیں سما سکتی اور باوجود اس کے جس خوبصورت ڈھنگ صورت میں اس کو بتمثیل کا پیرایہ ظاہر کرنا ہے یہ بات ہرگز نہیں پیدا ہو سکتی۔ مرزا غالب کا اردو شعر ہے ؎

پڑیں گاہ گاہ اگر سخت قریب آشیاں کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

اس شعر میں بھی اس بات کو کہ آدمی نے جہاں ہوس نے صنعہا لاطائل و تعلقات دنیوی میں پھنسا بطور تمثیل کے بیان کیا ہے اور اس عنوان سے بیان کی خوبی ظاہر ہے۔

بہرحال شاعر کا یہ مزہ دار فرض ہے کہ مجازہ استعارہ و کنایہ و تمثیل وغیرہ کے استعمال پر قدرت حاصل کرے تاکہ ہر رنگ کے پھیکے مضمون کو آب و تاب کے ساتھ بیان کر سکے لیکن استعارہ وغیرہ میں اس بات کا خیال ضرور ہے کہ مجازی معنی غلط سے بعید نہ ہوں ورنہ شعر چیستان اور معمہ بن جائے گا۔ مثلاً ناصر کہتے ہیں ؎

پگرانی چادر مہتاب شب میکش نے بھروں پر
کٹورا صبح دور ڈالنے لگا خورشید گردوں پر

چادر مہتاب چڑھنے سے چاندنی کا لطف اٹھانا اور اس سے متمتع ہونا مراد رکھا ہے جو نہایت بعید الفہم ہے۔ سبھی لوگوں نے استعارہ وغیرہ کے استعمال میں مذکورہ بالا اصول کو ملحوظ نہیں رکھا، ان کا کلام ہمیشہ نامقبول اور متروک رہا ہے جیسے بدر چاچی کے قصائد جن میں نہایت بعید الفہم استعارے استعمال کیے گئے ہیں۔ کہیں آہو سے ماہ سے آفتاب مراد لی ہے کہیں اشک ریزہ سے کواکب، کہیں اعلیٰ سے برج عقرب کہیں مرگ بیشہ سے حروف کہیں آب خنک سے پیالہ، کہیں موج دریا سے پانچ انگلیاں اور اسی طرح کہیں زمین سے آسمان اور کہیں آسمان سے زمین۔

اردو میں شعراء نے استعارہ کا استعمال زیادہ تر محاورات کے ضمن میں کیا ہے کیونکہ اکثر محاورات کی بنیاد اگر غور کر کے دیکھا جائے تو استعارہ پر ہوتی ہے۔ مثلاً جی اچٹنا۔ اس میں جی کو ان چیزوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو سخت چیز پر لگ کر اچٹ جاتی ہیں جیسے کنکر پتھر گھونسہ وغیرہ، یا مٹنا جی بتانا۔ اس میں جی کو ایسی چیز سے تشبیہ دی گئی ہے جو ختم اور غرق ہو سکے۔ آنکھ لگنا، دل کھلنا، غصہ بھڑکنا، کام چلنا، اور اسی طرح ہزاروں محاورے استعارہ پر مبنی ہیں اور یہ وہ استعارے ہیں جن میں شعرا کی کارسازی کو کچھ دخل نہیں ہے بلکہ نچلے طبقہ پر بغیر تکلف و تصنع کے اہل زبان

کے سہارے وقتاً فوقتاً نکل کر زبان کا جزو بن گئے ہیں۔ کنایہ بھی زیادہ تر محاورات ہی کے ضمن میں استعمال ہوا ہے مگر اردو شعرا نے تشبیہ کو بہت کم برتا ہے۔ البتہ نئی طرز کی شاعری میں اس کا کچھ کچھ رواج ہو چلا ہے اور ضرورت نے لوگوں کو اس کے برتنے پر مجبور کیا ہے چونکہ اس موقع پر استعارہ کی تقریب سے محاورہ کا ذکر آ گیا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ محاورہ کے متعلق چند ضروری باتیں بیان کر دی جائیں۔

(ب) محاورہ لغت میں مطلقاً استعمال کے لئے کہتے ہیں خواہ وہ بات جیسے اہل زبان کے روزمرہ یا بول چال یا اسلوب بیان کا نام محاورہ ہے۔ پس ضرور ہے کہ محاورہ کے ساتھ خواہ مخواہ الفاظ میں یا جملے کے کیونکہ مفرد الفاظ کو روزمرہ یا بول چال یا اسلوب بیان نہیں کہا جاتا۔ بخلاف لغت کے کہ اس کا اطلاق ہمیشہ مفرد الفاظ پر یا جیسے الفاظ چوراہا، مزرعہ، سنور کے ہی کیا جاتا ہے۔ مثلاً پانچ اور سات دو لفظ ہیں جو الگ الگ لغت کا اطلاق ہو سکتا ہے مگر ان دونوں سے ہر ایک کو محاورہ نہیں کہا جائے گا بلکہ وہ دونوں کو ملا کر جیسے پانچ سات بولیں گے تب محاورہ کہا جائے گا۔ یہی ضرور ہے کہ وہ ترکیب جس پر محاورہ کا اطلاق کیا جائے ایسا ہی نہ ہو بلکہ معلوم ہو کہ اہل زبان اس طرح استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اگر پانچ سات، سات آٹھ یا آٹھ سات پر قیاس کر کے کوئی آٹھ چھ یا سات نو بولا جائے گا تو اس کو محاورہ نہیں کہنے کے۔ کیونکہ اہل زبان کبھی اس طرح نہیں بولتے یا مثلاً بارہ تیرہ پر قیاس کر کے اس کی جگہ بے ماہ، ہر روز کی جگہ ہر دن، روز روز کی جگہ دن دن یا آئے روز بولنا، ان میں سے کسی کو محاورہ نہیں کہا جائے گا کیونکہ یہ الفاظ اہل زبان کی بول چال میں کبھی نہیں آتے۔

کبھی محاورہ کا اطلاق خاص کر ان افعال پر کیا جاتا ہے جو کسی اسم کے ساتھ مل کر اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے آنا، نا اس کے حقیقی معنے کسی چیز کو اوپر سے نیچے لانے کے ہیں مثلاً گھوڑے سے سوار کو آنا، کھونٹی سے کپڑا آنا، بکھٹے پر سے پتنگ آنا، لیکن ان میں سے کسی پر محاورہ کے یہ دوسرے معنی صادق نہیں آتے۔ کیوں کہ ان سب مثالوں میں آنا، نا اپنے حقیقی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ ہاں نقشہ اتارنا، نقل اتارنا، جل سے اتارنا، دل میں اتارنا، ہاتھ اتارنا، پہنچا اتارنا، یہ سب محاورے کہلائیں گے کیونکہ ان سب مثالوں میں اتارنے کا اطلاق مجازی معنوں پر کیا گیا ہے یا مثلاً کھانا، اس کے حقیقی معنے کسی چیز کو دانتوں سے چبا کر یا بغیر چبائے حلق سے اتارنے کے ہیں۔ مثلاً روٹی کھانا، دوا کھانا، افیم کھانا وغیرہ۔ لیکن ان میں سے کسی کو دوسرے معنی کے لحاظ سے محاورہ نہیں کہا جائے گا، کیونکہ ان سب مثالوں میں کھانا اپنے حقیقی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ ہاں قسم کھانا، دھوکا کھانا، پچھاڑیں کھانا، ٹھوکر کھانا یہ سب محاورے کہلائیں گے۔

محاورہ کے کہے جو معنے ہم نے اقل بیان کیے ہیں وہ عام یعنی دوسرے معنوں کو بھی شامل ہیں لیکن وہ دوسرے معنے پہلے معنے سے خاص ہیں۔ پس جس ترکیب کو پہلے (دوسرے ؟) معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے گا اس کو دوسرے (پہلے) معنوں کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جا سکتا ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ جس ترکیب کو پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے اس کو دوسرے معنوں کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جائے۔ مثلاً تیر پانی کرنا (یعنی جھگڑا اٹھا کرنا) اس کو دونوں معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ ترکیب اہل زبان کی بول چال کے بھی موافق ہے اور نیز اس میں تیر، پانی کا لفظ اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں بولا گیا ہے۔ لیکن روٹی کھانا یا یہ کھانا یا پانچ سات یا دس بارہ وغیرہ پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ قرار پا سکتے ہیں نہ دوسرے معنوں کے لحاظ سے، کیونکہ یہ تمام ترکیبیں اہل زبان کی بول چال کے مطابق تو ضرور ہیں مگر ان میں کوئی لفظ مجازی معنوں میں مستعمل نہیں ہوا آئندہ ہم دونوں معنوں میں تمیز کے لیے پہلی قسم کے محاورہ پر روزمرہ اور دوسری قسم پر محاورہ کا اطلاق کریں گے۔

محاورہ اور محاورہ میں جو بہت الاستعمال ایک اور بھی فرق ہے روزمرہ کی پابندی جہاں تک ممکن ہو تحریر اور نظم و نثر میں ضروری سمجھی گئی ہے۔ یہاں تک کہ کلام میں جس قدر روزمرہ کی پابندی کی ہوگی اسی قدر وہ فصاحت کے درجہ سے ساقط سمجھا جائے گا مثلاً کلکتہ سے پشاور تک سات آٹھ کوس پر ایک بگھنہ سرا اور ایک کوس پر مینار بنا ہوا تھا۔ یہ جملہ روزمرہ کے موافق نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ یوں ہونا چاہیے "کلکتہ سے پشاور تک سات سات آٹھ آٹھ کوس پر سات ایک بگھنہ سرا اور کوس کوس بھر پر ایک ایک مینار بنا ہوا تھا" یا مثلاً "آج تک اب سے ملنے کا موقع نہ ملا" یہاں "نہ ملا" کی جگہ "نہیں ملا" چاہیے یا "وہ خاندان کے مرنے سے رہ گیا ہوتی" یہاں "زندہ رہ گیا ہوتی" چاہیے یا ع

سو گئے جب بخت "تب بیدار آنکھیں ہو گئیں"

یہاں "ہو گئیں" کی جگہ "ہو گیں" چاہیے یا ع

"دیکھتے ہیں دیکھیے یہ کیا ہوا"

یہاں کیا "ہو گیا" چاہیے۔

الغرض نظم ہو یا نثر دونوں میں روزمرہ کی پابندی جہاں تک ممکن ہو نہایت ضروری ہے مگر محاورہ کا ایسا حال نہیں ہے۔ محاورہ اگر عمدہ طور سے باندھا جائے تو بلاشبہ کلام کو بلند اور بلند کو بلند تر کر دیتا ہے لیکن ہر شعر میں محاورہ باندھنا ضرور نہیں بلکہ ممکن ہے کہ شعر بغیر محاورہ کے بھی فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ درجہ پر واقع ہو اور ممکن ہے کہ ایک پست اور ادنیٰ درجہ کے شعر میں بے تکلفی سے کوئی لطیف و پاکیزہ محاورہ رکھ دیا گیا ہو۔ ایک مشہور شاعر کا شعر ہے ؎

گو ہر اشک سے بر پیتے ہیں دامن ہمارا آج کل دامن دولت ہے

اس شعر میں کوئی محاورہ نہیں باندھا گیا باوجود اس کے شعر تعریف کے قابل ہے۔ دوسری جگہ یہی شاعر کہتا ہے ؎

ان کا خط دیکھتے ہیں جب صبا و طوطے پانچوں کے اڑا کرتے ہیں

اس شعر میں نہ کوئی خوبی ہے نہ مضمون ہے صرف ایک محاورہ بندھا ہوا ہے اور وہ بھی روزمرہ کے خلاف یعنی "اڑ جانے ہیں" کی جگہ "اڑا کرتے ہیں" محاورہ کو شعر میں ایسا سمجھنا چاہیے جیسے کوئی خوبصورت عضو بدن انسان میں اور روزمرہ کو ایسا جاننا چاہیے جیسے تناسب اعضا بدن انسان میں۔ جس طرح بغیر تناسب اعضا کے کسی خاص عضو کی خوبصورتی سے حسن بشری کامل نہیں سمجھا جا سکتا اسی طرح بغیر روزمرہ کی پابندی کے محض محاورات کے جا و بے جا رکھ دینے سے شعر میں کچھ خوبی پیدا نہیں ہو سکتی۔

شعر کی معنوی خوبی کا اندازہ اہل زبان اور غیر اہل زبان دونوں کر سکتے ہیں لیکن لفظی خوبیوں کا اندازہ کرنا صرف اہل زبان کا حصہ ہے اہل زبان عموماً اس شعر کو زیادہ پسند کرتے ہیں جس میں روزمرہ کا لحاظ کیا گیا ہو اور اگر روزمرہ کے ساتھ محاورہ کی چاشنی بھی ہو تو وہ ان کو اور بھی زیادہ مزا دیتی ہے مگر عوام اور خواص کی پسند میں بہت بڑا فرق ہے۔ عوام محاورہ یا روزمرہ کے شعر کو سن کر سر دھننے لگتے ہیں اگرچہ شعر کا مضمون کیسا ہی تہ در تہ باریک اور سبک ہو اور اگرچہ محاورہ کیسا ہی بے تکلفی سے باندھا گیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن اسلوبوں میں وہ ایک شعر سے بات چیت کرتے ہیں جب انہی اسلوبوں میں وزن کی کھپاوٹ اور قافیوں کا تناسب دیکھتے ہیں اور معمولی بات چیت کو شعر کے سانچے میں ڈھلا ہوا پاتے ہیں تو ان کو ایک نوع کا تعجب اور تعجب کے ساتھ خوشی پیدا ہوتی ہے مگر خواص کی پسند اور تعجب کے لیے صرف محاورہ

کا دریا کے سامنے میں ڈھال دینا کافی نہیں ہے۔ ان کے نزدیک محض بندش اور معمولی بات چیت کو موزوں کر دینا کوئی خوب خوبی نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ دیکھتے ہیں کہ ایک سنجیدہ مضمون معمولی روزمرہ میں کمال خوبی اور صفائی اور بے تکلفی سے ادا کیا گیا ہے تو بلاشبہ انہیں بے انتہا تعجب اور حیرت ہوتی ہے کیونکہ فن شعر میں اور خاص کر اردو زبان میں کوئی بات اس سے زیادہ مشکل نہیں ہے کہ عمدہ مضمون معمولی بول چال اور روزمرہ میں پورا پورا ادا ہو جائے۔ جن لوگوں نے روزمرہ کی پابندی کو سب چیزوں سے عمدہ سمجھا ہے۔ ان کے کلام کو بھی جب نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو جا بجا فروگذاشتیں اور کسر یں نظر آتی ہیں پس جب ایسی صعب بات میں جو مضمون کی مناسبت اور سنجیدگی کے روزمرہ اور محاورہ میں بھی پورا اتر جائے تو لامحالہ اس سے ہر صاحب ذوق کو تعجب ہوتا ہے (مثلاً مومن خاں صاحب کہ اکثر جگہ کے عالم میں خوشحالی عیش و عشرت کی پھیچھا چھاڑ سخت ناگوار گزرتی ہے اس طرح بیان کرتے ہیں۔

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

یا مثلاً مرزا غالب اپنے جیسے صوفی کو کہ جس کو مستی کے خیال پر بھی ہوش کا غلبہ رہتا ہے۔ پاسبان سے سوال کھکر کہ کچھ نہ کہا جب معشوق کے دیکھنے کا حد سے زیادہ شوق ہوا اور صبر کی طاقت نہ رہی (یا یوں کہئے کہ بدرجہ کمال پر گرچکا۔ تب اس سے جواب اس کا طلب کچھ اور ہے۔ اس نے بھرے بھائے دو مارک کیا کہ ماگنا ہی ہے) دو بدو ہو کر میں ہی عرض کرتے ہیں۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

یا خطہ مرزا غالب لکھتے ہیں۔

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

قاعدہ ہے کہ جب تک انسان عشق و محبت کو چھپاتا ہے اس کو ہر ایک بات کا پاس و لحاظ رہتا ہے لیکن جب راز فاش ہو جاتا ہے تو پھر اس کو کسی سے شرم اور حجاب نہیں رہتا۔ اس شعر میں یہ مضمون ادا کیا گیا ہے۔ دھویا جانا ہے جانا اور دھویا جانا ہے لحاظ ہو جانے کو کہتے ہیں اور پاک آزاد اور شہدے کو کہتے ہیں۔ رونے کے بعد دھویا جانا اور دھوئے جانے کے بعد پاک ہونا بدرجہ اتم لطف زبان اور محاورہ کی نشست اور روزمرہ کی صفائی کے مضمون پورا پورا ادا ہو گیا ہے۔ اسی طرح بیان کرتے ہیں (مثلاً مومن خاں کہتے ہیں۔

کل تم جو بزم غیر میں آنکھیں پھیر گئے
کتنے ہی گھٹ گئے ہم ایسے کہ غیار بڑھ گئے

آنکھ میں چرانا، اغماض دینا تو جتنا کہ ہے دیکھ لیا جانا، شرمندہ اور رکھسیا ہو جانا، یا جانا، سمجھ جانا یا جانا، جانا بھی ظاہر ہیں اس شعر کا مضمون بھی بالکل نیچرل ہے اور محاورات کی نشست اور روزمرہ کی صفائی قابل تعریف ہے۔ اگرچہ اس کا بانداز مرزا غالب کا یہ شعر ہے۔

گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

مگر مومن کے ہاں زیادہ صفائی سے بندھا ہے۔ اسی قبیل کے یہ اشعار ہیں۔

نہ غرابِ حال کو تابِ جلوہ نہ چشمِ تر — تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

(ذوق)

چال ہے تجھ اتاں کی مرغِ بسمل کی تڑپ — ہر قدم یہ ہے یقیں یاں رہ گیا واں رہ گیا

(آتش)

جو بے اختیار ہی ہے تو خاصہ — ہمیں آ کے اس کے قدم دیکھتے ہیں

(میر)

شبِ ماہی کا تمام محبت ہے شبِ فتنہ — ہے آگ سی جو سینہ کے اندر لگی ہوئی

(شیفتہ)

یوں وفا اٹھ گئی زمانے سے — کبھی گویا جہاں میں تھی ہی نہیں

(داغ)

الغرض ردیف کی پابندی کا، اصناف سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً جہاں تک ہو سکے نہایت ضروری چیز ہے اور جہاں ردیف کی شرکت سلیقے سے باندھا جائے شعر کا زیور ہے۔

(ج) صناعتِ بدائع پر کلام کی بنیاد رکھنے سے اکثر معنی کا سرِ رشتہ ہاتھ سے جاتا رہتا ہے اور کلام میں بالکل اثر باقی نہیں رہتا کیونکہ مخاطب کے دل میں یہ خیال گذرتا کہ شاعر نے شعر کی ترتیب میں تصنع کیا ہے و مبالغہ نا میں اپنی کاریگری ظاہر کرنی چاہی ہے، بالکل شعر کی تاثیر کو زائل کر دیتا ہے پس صناعتِ لفظی کی پابندی اور التزام سے تمام اصناف سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً ہمیشہ بچنا چاہیے صنعتیں بیسیوں ہیں مفصل مذکور ہے، دو قسم کی قرار دی گئی ہیں ایک معنوی جیسے طباق، مشاکلہ، عکس، توریہ، حسنِ تعلیل، تجاہل عارفانہ، تعجب وغیرہ، دوسری لفظی جیسے تجنیس، رد العجز علی الصدر، مخطوط غیر منقوط، رقطا، خیفا، مقطع، موصل، ترصیع وغیرہ۔ پہلی قسم کی کل صنعتیں اور دوسری قسم کی خاص خاص صناعتیں ہر اردو اور فارسی کے تمام نامور شعرا نے برتی ہیں مگر کبھی ان کا التزام نہیں کیا اور کلام کی بنیاد ان پر نہیں رکھی۔ ہاں اگر حسنِ اتفاق سے کبھی کوئی ایسا مناسب لفظ شعر میں آ گیا جس سے معنی مقصود میں خلل واقع نہ ہوا اور بیان میں زیادہ حسن پیدا ہو جائے تو ایسے موقع کو بلا شبہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا، جیسے خواجہ حافظ کہتے ہیں ؎

بنفشہ طرہ مکش دستِ ما و دامنِ دوست — دراز دستی ایں کوتہ آستینان ہیں

اس شعر میں دراز، اور کوتہ کے لحاظ سے صنعت طباق اور دست و آستین کے اعتبار سے مراعاۃ النظیر ہے مگر دونوں صنعتیں ایسی بے تکلف اور مناسب طور پر واقع ہوئی ہیں کہ کسی مقصود میں بجائے اس کے کہ خلل ہوں اور زیادہ نوت پیدا کر دی ہے اور شعر کا حسن دوبالا کر دیا ہے جیسے میر تقی کہتے ہیں ؎

یہ جو چشمِ تر آب ہیں دو رویں — ایک خانہ خراب ہیں دونوں

اس میں ایک کا لفظ ایسا بے ساختہ اور بے تکلف واقع ہوا ہے کہ گویا شاعر نے اس کا قصد ہی نہیں کیا، یہاں ایک کے معنے ہیں نہایت بے شکل الاجزاب، بھدا سا جیسے کہتے ہیں وہ ایک بدھنا ہے یا وہ لوگ ایک شوہ پشت ہیں، دونوں کے مقابلہ میں

ایک لفظ نے آکر شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے ورنہ نفس مضمون کے لحاظ سے اس کی کچھ بھی حقیقت نہ تھی۔ یہاں فی الحقیقت محض مراعاۃ النظیر نے اس شعر میں اصلی دلچسپی کی بلاغت پیدا نہیں کی بلکہ اس بات سے پیدا کی ہے کہ دو چیزوں پر لفظ 'ایک' کا اطلاق ایسی حسن ادا سے کیا ہے کہ اس سے بہتر تصور میں نہیں آسکتا ورنہ ایک شعر پایا ایک مصرعہ میں ایک اور دو کا جمع کر دینا کہ اسی کا نام مراعاۃ النظیر ہے کوئی بڑی بات نہ تھی۔

حسن مطلع

ایک سب آگ ایک سب پانی
پیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

اس شعر میں بھی آگ اور پانی کا مقابلہ نہایت بے تکلفی سے واقع ہوا ہے پس اگر اس قسم کی مناسبت لفظی اتفاق سے مثلاً میسر آجائے تو یہ شاعری کا زیور ہے مگر قصداً ایسی رعایتوں کی جستجو کرنے سے آخر کار شاعری شاعری نہیں رہتی بلکہ مسخرہ پن ہو جاتا ہے۔ ایک مشہور شاعر فرماتے ہیں:۔

مرغ دل کو توڑے گی بلی ترے دروازہ کی — رشتہ تھا کو کر سرے کا جو ہاتھ ڈالا ناک کا

چونکہ بلی اس کے لیے چوہا لانا ما جات سے تھا اس لیے جب اصلی چوہا نہ ملا چار ناک ہی کے چوہے پر قناعت کی۔

کھانے کی اصلی خوبی یہ ہے کہ لذیذ ہو، مفید ہو، جو بدن بنانے کے لائق ہو، نباس اور رنگ و روپ بھی اچھا رکھتا ہو۔ اگر یہ سب باتیں کسی کھانے میں پائی جائیں تو اور بھی بہتر ہے۔ یہی حال شعر کا ہے۔ شعر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ پر اثر ہو، موثر ہو، الفاظ اور مضامین میں گھلا ہوا ہو۔ اگر اس کے ساتھ کوئی لفظی رعایت بھی اس میں پائی جائے تو اور بہتر ہے ورنہ اس کی کچھ ضرورت نہیں۔

ہر زبان میں صنعت الفاظ (اگر ہمارا قیاس غلط نہیں ہے) متقدمین کی نسبت متاخرین کے کلام میں زیادہ پاؤ گے کیونکہ اکثر متاخرین ابتدائی مضامین کو دہراتے ہیں جو ان سے پہلے قدما باندھ گئے ہیں پس ناچار تکیہ وہ صنعت الفاظ کو کام میں نہ لائیں تو اور کیا کریں (الٰہی!) معمولی باتوں میں کوئی کرشمہ نہیں دکھا سکتے۔

متاخرین میں صنائع کا خیال زیادہ تر اس سبب سے پیدا ہوا ہے کہ قدما کے کلام میں کچھ اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن میں اور تو کوئی خوبی نہیں ہے مگر اتفاق سے کوئی لفظی مناسبت بھی پیدا ہو گئی ہے چونکہ وہ اشعار عموماً پسند کیے جاتے ہیں بعض لوگ غلطی سے خیال کر لیتے ہیں کہ ان کی مقبولیت کا سبب یہی لفظی مناسبت ہے اور بس اب وہ بے تکلف انہی مضمونوں کو اپنے کلام میں جا بے جا استعمال کرنا شروع کرتے اور جو اس خوبی قدما کے کلام میں ہوتی ہے اس کا مطلق خیال نہیں کرتے۔ اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہے کہ ایک جامہ زیب اور حسین آدمی جس پر کوئی لباس خاص معلوم ہوتا اتفاق سے بنت کی ٹوپی اور کاچوبی انگرکھا پہن کر نکلے اور لوگ اس کی دیکھا دیکھی ویسے ہی کپڑے پہننے لگیں اور نہ سمجھیں کہ اس کی زیبائش کا اصلی سبب حسن و جمال ہے نہ بنت کی ٹوپی اور کاچوبی انگرکھا۔

صنعت الفاظ نے ہماری شاعری بلکہ ہمارے نام لٹریچر کو بے انتہا صدمہ پہنچایا ہے جس کی تفصیل کے لیے ایک جدا کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح عجائب قدرت کی تعلیم ہوتے ہوتے آخر کار ریا میں عجائب پرستی ہونے لگی اور خدا کا خیال جاتا رہا۔ اسی طرح ہمارے لٹریچر میں صنائع لفظی کی لے بڑھتے بڑھتے آخر کار محض الفاظ پرستی باقی رہ گئی اور معنی کو بالکل جانے دیا۔ یہ صنائع و بدائع کی پابندی

دلی کے شعراء میں عموماً بہت کم پائی جاتی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بالکل نہیں پائی جاتی۔ البتہ لکھنؤ کے بعض شعراء نے اس کا سخت پابندی کے ساتھ التزام کیا ہے اور مقابلہ اہل دہلی لکھنؤ کے عام شعراء بھی رعایتِ لفظی کا زیادہ خیال کرتے ہیں لیکن پھر بھی ناسخ کے مقابلہ میں اردو شاعری اس آفت سے بہت محفوظ ہے۔ جن کو معلوم ہے وہ بہبودہ لفظی صنعتیں جن میں معنی سے بالکل قطع نظر کر لی جاتی ہے، محض ایک لفظ کو گرکھ رعدا بنایا جاتا ہے جیسے مفقود، غیر مفقود، رقعا، خیفا، ذوقافتین ذوبحرین وغیرہ وغیرہ اردو شاعری میں کہاں ہیں مگر بجائے صنائع لفظی کے اردو غزل میں ایک اور روگ پیدا ہو گیا ہے جو صنائع سے بھی زیادہ معنی کا خون کرنے والا ہے۔

(۵) سنگلاخ زمینوں میں لکھنؤ اور دلی کے شعراء نے مناخرین نے ہزارہا غزل لکھی ہے۔ میر، سودا، جرأت، درد اور اثر کے ہاں ایسی زمینوں میں بہت کم غزلیں پائی جاتی ہیں۔ اس کی ابتدا مصحفی اور انشا کے وقت سے ہوئی ہے اور شاہ نصیر نے سب سے زیادہ اس میں طبع آزمائی کی ہے۔ زوق کو بھی ابتدائی شاعری میں اس کا بہت چسکا رہا ہے۔ ظفر کے کلام میں بھی ایسی زمینیں بہت ہیں۔ البتہ غالب، مومن، شیفتہ، آتش وغیرہ نے ایسی زمینیں بہت کم اختیار کی ہیں۔ لکھنؤ کے شعراء نے بھی سخت زمینوں میں بے انتہا غزلیں لکھی ہیں۔

جو لوگ شاعری کے دلفریب پہلوؤں پر پورے اطمینان سے غور کرنے چاہتے ہیں وہ اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ شعر کے سر انجام دینے میں کوئی چیز ایسی مشکل نہیں جیسا مصرعہ شعر کے لیے مناسبِ حال قافیہ کا پہنچانا۔ اسی لیے جب کسی کو سخت دقت پیش آتی ہے تو کہتے ہیں کہ اس کا قافیہ تنگ ہو گیا۔ اسی قافیہ کی مشکلات سے بچنے کے لیے یورپ کے شعراء نے آزاد کا رائج بلینک ورس یعنی نظمِ غیر مقفیٰ نکالی ہے اور اب یہ روش ہر طرح کی نظم پر شاعری کا دارومدار ہے۔ ہمارے ہاں اس پر تو یہ ہے کہ قافیہ کے پیچھے ایک ردیف کا دُم چھلا اور لگا لیا گیا ہے۔ اگر پورا ردیف ایسی ضروری نہیں سمجھی جاتی جیسا قافیہ سمجھا جاتا ہے لیکن غزل میں اور خاص کر اردو غزل میں تو اس کو وہی رتبہ دیا گیا ہے جو قافیہ کو۔ اگر تمام اردو دیوانوں میں غیر مردف غزلیں تلاش کی جائیں تو ایسی غزلیں شاید گنتی کی نکلیں۔ پس جب کہ ردیف اور قافیہ کی گاٹی خود شاعر گزار رہے تو اس کو اور زیادہ کٹھن اور ناقابلِ گزر بنانا انہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو معنی سے کچھ سروکار نہیں رکھتے اور شاعری کا مآل محض قافیہ پیمائی سمجھتے ہیں اور بس!

جہاں تک سنگلاخ زمینوں کا اعتراض کیا جاتا ہے ان میں یا تو ردیف اور قافیہ ایسا اختیار کیا جاتا ہے جن میں باہم دگر کچھ مناسبت نہ ہو، مثلاً نشتر پر پشت آئینہ، انجیر پشت آئینہ، تدبیر پشت آئینہ، دل پر جبل کی لکھی، محل کی لکھی، دولی اور عرس کی تیلیاں، عکس کی تیلیاں، نفس کی تیلیاں یا ردیف ایسی لمبی اختیار کرتے ہیں جو ایک آدھ سے زیادہ شعروں میں معقول طور پر نہیں آ سکتی جیسے فلک پہ کبھی، زمیں پہ یاں، سر پہ ہرہ، بار گلے میں، گاہ خندگ و گاہ کماں۔ غرض یہ کہ قصداً ایسی طرح تجویز کرتے ہیں جس میں عمدہ مضمون بندھنا تو یقیناً ناممکن ہو اور بامعنی شعر کا نکلنا بھی نہایت مشاق و ماہر استادوں کے سوا عام شعراء کے لیے قریب ناممکن کے ہو۔ ایسی زمینوں میں بڑا کمال شاعر کا یہ سمجھا جاتا ہے کہ قافیہ اور ردیف میں جو منافرت ہو وہ بظاہر جاتی رہے گویا تیل اور پانی کو ملایا جاتا ہے۔ ایسی غزلوں میں اور امیر خسرو کی اکثر میں کچھ لطف اور ہی شاعرانہ معلوم ہوتا ہے۔ امیر خسرو نے کھیر، چرخہ، ڈھول اور کتا ان چار چیزوں کا اس طرح پیوند ملایا ہے ؎

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا　　آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

ایک شاعر نظیر اور بشتر آئینہ کو اس طرح پیوند دیتا ہے ۔

آرسی چنے ہوئے وہ گل چولہوے شمع کا
ہم انگوٹھے کو کہیں نظیر پشمینوآئینہ نہ

ایک اور شاعر نے کل اور بلبل کو اس طرح گانٹھا ہے ۔

صنعت لعبت چین دیکھ ولا سب کر تو
دیکھنی گر تجھے منظور ہو کل کی بلبل

اسی پر قیاس کر لینا چاہیے کہ کل سنگلاخ زمینوں میں اس کے سوا اور کچھ مقصود نہیں ہوتا کہ وہ بے میل چیزوں میں میل ثابت کیا جائے ۔ پس شاعر کو چاہیے کہ ہمیشہ ردیف ایسی اختیار کرے جو قافیہ سے نیل کھاتی ہوئی ہو اور ردیف و قافیہ دونوں مل کر دو ٹکڑے معلوم ہوں ۔ اس سے زیادہ نہ ہوں بلکہ رفتہ رفتہ مرکب خوانی کھنی کہ کرنی چاہئیں اور سر دست محض قافیہ پر قناعت کر لی چاہیے ۔ قافیہ ایسا اختیار کرنا چاہیے جس کے لیے قدرت سے رس گنے بلکہ ہیں گنے زیادہ الفاظ موجود ہوں اور مضمون کو قوافی کا تابع کرنا پڑے گا ۔ قافیے مضمون کے تابع نہ ہوں گے ۔ جتنے نامور شعرا گذرے ہیں انھوں نے یہی اصول ملحوظ رکھا ہے اور ہمیشہ ایسی ردیفیں اختیار کی ہیں جن میں ہر قسم کے مضمون کی گنجائش ہو ۔

مولانا عبدالسلام ندوی

اردو غزل گوئی کے چار دور ہیں اور چاروں کی خصوصیات الگ الگ ہیں ۔

قدما کے پہلے اور دوسرے دور کی زبان نہایت نفیس اور مکروہ ہے اور ان میں غلطی غلطیاں بکثرت پائی جاتی ہیں ۔ چنانچہ تاریخ الشعرا نے اردو میں شاہ مبارک آبرو کے حال میں لکھا ہے :

"مگر استعمال الفاظ مکروہ کا اور نہ پروا کرنا بار یک باتوں کا یعنی جائز رکھنا قافیہ سین اور صاد کا اس کے کلام سے دریافت ہوتا ہے ۔ نہ صرف اسی کے کلام میں بلکہ اس کے ہم عہدوں کے کلام میں اس سے زیادہ ہے ۔" (تاریخ شعرائے اردو صفحہ ۱۰)

ایک نامعلوم الاسم قلمی تذکرے میں جو انجمن اردو کی نمائش میں پیش کیا گیا تھا شاہ حاتم کے حالات میں لکھا ہے ۔

"زبانش اینجا نوعی رکیکی مناسبت دارد"

سودا مصلح زبان ہیں لیکن متعلق اپنے تذکرے میں ان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :

"و بعضے بسبب دریافت اغلاط صحیح و تواردِ وصاف در بعض اشعارش بجمل و سقوط نیز نسبت مینماید"

تذکرۂ مہر جہاں تاب میں ہے :

"و بیشتر اشعارش الفاظ رکیکہ مندرج یافتہ و بسہل انگاری بعضے از کلمات را بجہتم صحت ملاحظہ نفرمودہ"

لیکن تیسرے دور میں جب مناظرہ کا عام رواج ہوا اور شعراء میں باہم رد و قدح ہونے لگی تو صحت الفاظ کی طرف کسی قدر توجہ دی گئی اور اس قسم کی غلطیوں پر اعتراضات کیے جانے لگے۔ چنانچہ میر حسن، منشی بندرابن راقم کے اس مصرعے پر کہ

"کام عاشقوں کا کچھ تجھے منظور ہی نہیں"

ان الفاظ میں نکتہ چینی کرتے ہیں:

"اغلب کہ ایں شعر بے اصلاح باشد، چرا کہ ازاد و قادیں معین نامور دلی شعرا دوریں جا ایں ہی
افتد، ہمیں خطاست، در دانست۔ فقیر چنیں بہتر مے شود ؎
میرا تو کام کچھ تجھے منظور ہی نہیں"

شیخ معین الدین معینی کے تذکرے میں فرماتے ہیں:

خوش ہم عریانی سے اتنے ہیں برنگ بید مجنوں گل
نکلے جاتے ہیں نظر تے نہیں پوشاک میں ہم

"خوش ہم عریانی" نامزدوں است۔ چرا کہ ہیم با ما جناں چسپیدہ است کہ مبین چوں چشم غزال از میاں ہم کردہ است ایں سخت عیب است"

بالخصوص معاصرین نکتہ چینی سے اس طرف زیادہ توجہ کی اور اپنے معاصرین کے کلام پر اس حیثیت سے سخت سخت نکتہ چینیاں کیں چنانچہ تذکرۂ مہر جہاں تاب میں ہے:

"ہر چند کلماتے ہم عہد ما از یاد و بعض الفاظ رکیکہ ہندی و تنگی نشست آں بعد رفع کلمات ثقیلہ قدماء جائز و ماشتند و در شعر خود ہا بکار بردند آں ہم از اشعار خود بر انداحت و ازیں جا است کہ کسے از قدماء دہم جا بیش نمودہ کہ در شعرش قبا ستے بر نیاورد و اعتراض نظم و نثر و لفظ آں بیاحث و دخلہا پیش پیاست کہ اعتراض بے جا نبود" (تذکرۂ مہر جہاں تاب: تذکرۂ رنگین)

اسی دور نے ترقی کر کے متوسطین کے زمانے میں پرفیسر شیخ سلیمان مصحفی زبان و محاورہ پیدا کیا جنھوں نے الفاظ کی تنقیح و تہذیب نہایت مکمل طور پر کر دی اور ان کے بعد کے شعراء امانت زبان کو پیروی کرتے ہیں اہتدو و جدید کے بعض شعراء ان قیود کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے۔ ان مکروہ، ثقیل اور غلط الفاظ کے ساتھ قدماء بعض مضامین بھی نہایت سبک اور رقیق باندھتے ہیں مثلاً ؎

چوپڑ کے کھیلنے کا سارا یہ ہے خلاصہ — شاید کبھی وہ سرکا بیٹھے ہمارے پاس آ (آبرو)
وی ہے دریا اوپر مجھے مچھی — لا اقرار ہے ہر اسے کس گھاٹ (آبرو)
یارو وہ صنم کہوں نہ کس سے کام خدا کا — رام اس کا خدا ہے وہ نہیں رام خدا کا (احسن)

ولی، میر درد اور میر سوز کے کلام میں بے شبہ اس قسم کے الفاظ اور مضامین نہیں پائے جاتے لیکن سودا، میر اور قائم کا کلام اس داغ سے پاک نہیں ہے۔

غالباً اس زمانے میں مجو گوئی کا جو عام رواج ہو گیا تھا اسی نے اس زمانے میں اس قسم کی فحش اور مبتذل زبان پیدا کر دی تھی جس

جہاں ہے کہ غزل میں بھی جہاں جہاں بھروسہ گوئی کا موقع آیا ہے وہیں اس قسم کی زبان استعمال کی گئی ہے۔ مثلاً واخط، مخاطب اور رقیب کو جہاں جہاں صلواتیں سنائی گئی ہیں اسی قسم کی زبان میں سنائی گئی ہیں۔ لیکن قلی قطب شاہ کے تھیرے دور میں زبان کسی قدر شستہ الفاظ سے پاک ہوئی اور متوسطین کے دور میں جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے ناسخ نے زبان کو نہایت مہذب اور شائستہ بنا دیا اور ناسخ کے تمام شاگرد اسی زبان کے مقلد ہیں بلکہ دوسرے کے شعراء بوسہ اور وصل وغیرہ کا نام بھی لینا پسند نہیں کرتے۔

غالباً انتخاب خصوصیات کا اثر ہے کہ قدماء کے کلام میں ہمارے انتخاب کی ہوئی جاتی ہے۔ مثلاً ایک غزل میں ایک شعر نہایت بلند اور دوسرا نہایت پست ہوتا ہے۔ ایک شعر کی زبان نہایت شیریں لطیف اور نرم ہوتی ہے اور دوسرے میں خشک اور بیگانی پائی جاتی ہے۔ ایک شعر نہایت مہذب اور با وقار ہوتا ہے لیکن دوسرے شعر میں اخلاق سے گری ہوئی ہوتی ہے۔ صرف خواجہ میر درد ایسے بزرگ ہیں جن کا کلام اول سے آخر تک اس قدر ہموار ہے کہ اس میں انتخاب کی گنجائش نہیں۔ چنانچہ میر حسن ان کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

"دیوانش اگرچہ مختصر است لیکن ہموں کلام حافظ سراپا انتخاب"

ایک نامعلوم الاسم تذکرے کی عبارت جو انجمن اردو لکھنؤ کی فائل میں پیش کیا گیا تھا اس سے زیادہ صاف ہے:

"دیوان ریختہ اش اگرچہ از ہزار بیت متجاوز نیست لیکن ہمہ یکدست و احتیاج بہ انتخاب ندارد"

ان کے علاوہ اور جتنے قدیم شعراء ہیں سب کے کلام میں نشیب و فراز موجود ہے چنانچہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سودا کے حال میں لکھتے ہیں:

"قصائد را مانند قصائد متاخرین پر از مضامین خارجہ و جا گزین دل سرا بن بودہ کہ ہر مشغول پسند بر آید و ہر بیت خالی از تکلف بلند اور کلام ایشاں رقص الجمل واقع شدہ، چہ در قصیدہ و چہ در غزل"

میر کی نسبت بعض مذکروں میں لکھا ہے کہ:

"پستش ابنا بہ پست و بلندش بسیار بلند"

اگرچہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے چنانچہ گلشن بے خار میں لکھتے ہیں:

"پستش اگرچہ اندک بہ پست است اما بلندش بسیار بلند"

تاہم جیسا کہ اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے ان کو بھی اس سے انکار نہیں کہ ان کے کلام میں جا بجا پستی پائی جاتی ہے لیکن قدماء کے تھیرے دور میں سب سے پہلے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے مصحفی نے اس طرف توجہ کی اور متوسطین میں ناسخ و آتش نے اس شعر کو بالکل عبور کر دیا اور شعرائے دلی کی فارسی پسندیوں نے اس ہواری میں اور اضافہ کیا۔ چنانچہ مولانا حالی اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"ان کے بعد دلی میں مومن، غالب، مومن اور شیفتہ وغیرہ کے یہاں فارسی ترکیبوں نے روغزل میں زیادہ دخل پایا۔ ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ غزل میں اعلےٰ درجہ کا شعر ایک یا دو سے زیادہ نہیں نکل سکتا۔ باقی بھرتی ہوتی ہے۔ اگلے شعراء شستہ گرمی کی کچھ پروا نہ کرتے تھے

ایک آدھ شعر اچھا نکل آیا باقی کا وزن اور بقیہ شعروں سے غزل کا نصاب پورا کر دیا۔ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اپنے بھرتی کے اشعار کو نازک ترکیبوں سے چست کر دیتے ہیں تاکہ باری نظر میں حقیر نہ معلوم ہوں۔ (مقدمہ حالی مطبوعہ نامی پریس صفحہ ۱۴۸)

لیکن غلطی سے دور جدید کے بعض شعراء بھی فارسی ترکیبوں کو اعلیٰ زیور سمجھتے ہیں۔

قدماء کے دور اقول کی ایک امتیازی خصوصیت ایہام گوئی یعنی عائبت لفظی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مرزا جان جاناں نے اردو شاعری کو فارسی قالب میں ڈھالنا چاہا تو سب سے پہلے راستے سے اسی سنگ راہ کو دور کیا اور ان کے بعد تمام تعلیمی شاعری نے بھی روش اختیار کی لیکن بایں ہمہ یہ خصوصیت کچھ نہ کچھ ہر دور میں قائم رہی۔ تعلیمی شاعری کے زمرے میں شامل ہیں لیکن یہ صنعت ان کو نہایت مرغوب ہے چنانچہ فرماتے ہیں:۔

یاں پلیتھن نکل گیا واں غیر — اپنی گنتی چلائے جاتا ہے
یہ ہمدمی کہ دوڑی اس کے سب خنداں سے — بس کچھ نہ چلا وہ نہ پستے کو چبا جاتا

انھوں نے خود کلات الشعراء میں لکھا ہے:

"اکنوں طبعہا مصروف ایں صنعت کم است مگر بسیار شستگی بستہ شود"

مصحفی اگرچہ بجائے خود اس صنعت کو پسند نہیں کرتے چنانچہ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں:

"تا فقیر اشعار ایہام را دوست ندارد"

❖

اس کے بعد آتش کا زمانہ آیا تو انھوں نے نہایت وسعت کے ساتھ اس سرمایہ محفوظ سے کام لیا۔ ان کے بعد ایک مدت تک اہل لکھنؤ اس صنعت میں کمالات دکھاتے رہے بالخصوص امانت لکھنوی اس شرارت کے خاتمہ کا سہرا اپنے سر قرار دیتے ہیں۔

❖

اس زمانے میں فارسی شاعری کا سب سے بڑا عیب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں مرد کو معشوق بنایا گیا جس سے متعدد غیر فطری مضامین پیدا ہو گئے لیکن یہ عیب اردو کے شعرائے قدیم میں فارسی شاعری سے بھی زیادہ نمایاں ہو گیا ہے۔

❖

شعرائے لکھنؤ نے زنانہ خصوصیات کو زیادہ نمایاں کیا یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کے یہاں انگیا، کرتی، دوپٹہ، ہتی، پازیب اور چھاگل وغیرہ کے مضامین بکثرت پائے جاتے ہیں۔ البتہ شعرائے دہلی کا کلام ان دونوں قسم کی بے اعتدالیوں سے محفوظ رہا بالخصوص مولانا حالی کی اصلاح کے بعد دور جدید کے شعراء نے ایک وجود مطلق کو اپنا معشوق قرار دیا جو مرد اور عورت دونوں پر یکساں صادق آسکتا ہے۔

لیکن اگر ان معائب سے قطع نظر کر لی جائے تو قدما کا کلام متعدد حیثیتوں سے موجودہ مذاق کے بالکل مطابق ہے مثلاً اردو شاعری کی اصلاح کے متعلق جدید تعلیم یافتہ گروہ کا ایک مطالبہ یہ ہے کہ اردو اور فارسی زبان میں ردیف کا التزام گویا ایک لازمی چیز

ہے جس سے شاعری کی پابندیاں بڑھ جاتی ہیں اور اظہار خیال کے لیے بہت تنگ ہو جاتا ہے۔

ہے ردیف کو مالا سے تشبیہ دی ہے کہ صرف قافیہ کا التزام کرنا چاہیے اور قدما نے ان کے اس مطالبے کو بہت کچھ پورا کیا ہے۔

☆

جس طرح صوفیہ کے نزدیک شریعت کے ظاہری اور باطنی دو رُخ ہیں اسی طرح محققین کے نزدیک شاعری بھی خارجی اور داخلی دو حصوں میں منقسم ہے۔ خارجی شاعری میں اشیاء کے ظاہری خال و خط بیان کیے جاتے ہیں اس لیے اس سے صرف مناظر قدرت کی مصوری، نقاشی اور واقعہ نگاری میں کام لیا جا سکتا ہے کیونکہ ان تمام اضافات میں شاعر صرف انہی چیزوں کی تصویر کھینچتا ہے جو حواس پر منکشف ہوتی ہیں۔ خود اس کو اپنے اندرونی جذبات کی آمیزش سے ان تمام چیزوں کو ملوث کرنا پڑتا ہے لیکن غزل تمام تر شاعر کے اندرونی جذبات و کیفیات کی تشریح ہوتی ہے اس لیے اس میں صرف شاعری کے داخلی پہلو سے کام لیا جا سکتا ہے اور یہی غزل کے کلام کا اصلی امتیازی وصف بھی ہے کہ انھوں نے شاعری کے ان دونوں حصوں کو بالکل الگ الگ رکھا یعنی خارجی مضامین کے لیے مثنوی سے کام لیا ہے اور غزل کو تمام تر جذبات و کیفیات سے لبریز کر دیا۔

غزل کی یہی حقیقت ہے جس کو ولی نے نہایت اختصار کے ساتھ ایک شعر میں بیان کیا ہے ؎

ولی شعر میرا سراپا ہے درد　　خط و خال کی بات ہے خال خال

اور ولی کے بعد میر، سودا، درد، مصحفی اور مصحفی وغیرہ نے اسی فن کی تفسیر کی ہے۔

☆

قدماء کے دور میں سب سے پہلے مصحفی، آتش اور جرأت نے اس طرز میں کسی قدر تغیر پیدا کیا اور خارجی مضامین یعنی خال خال خد و خال کے ذکر سے بھی غزل کو آشنا کیا اس کے بعد متوسطین کے دور میں ناسخ، آتش اور ان کے تلامذہ نے اپنی تمام تر توجہ خارجی اوصاف کی طرف مبذول کر دی اور ناسخ جن اساتذۂ لکھنؤ کے زمانہ تک وہاں کے تمام شعراء زلف و کمر کے پھندے میں الجھے ہوئے ہیں لیکن اساتذۂ دلی نے قدماء کی روش کو بدستور قائم رکھا اس لیے ان کی غزلیں سودا و غزل سرائی سے باہر نہ جا سکیں۔

☆

شعرائے لکھنؤ میں جلال نے بھی کم و بیش قدماء ہی کے طرز کا تتبع کیا ہے۔

☆

اور شعرائے دور جدید کی گرم بازاری تو تمام تر اسی طرز کی بدولت ہے۔

(شعر الہند)

پروفیسر حامد حسن قادری

غزل کے معنی ہیں عشق و جوانی کا ذکر کرنا۔ شاعری میں غزل اس نظم کو کہتے ہیں جس میں حسن و عشق، اخلاق و تصوف وغیرہ مختلف مضامین ہوں اور ہر شعر الگ مضمون کا ہو۔

غزل کے پہلے شعر کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے۔ اس کو مطلع کہتے ہیں۔ اگر ایک کے بعد دوسرا مطلع ہو تو اس کو حسنِ مطلع کہتے ہیں۔ سب مطلع شروع میں ایک دوسرے کے بعد ہوتے ہیں۔ باقی اشعار میں صرف دوسرے مصرعے میں قافیہ ہوتا ہے۔ آخری شعر میں شاعر کا تخلص ہوتا ہے اس کو مقطع کہتے ہیں۔ غزل کے عمدہ شعر کو شاہ بیت یا بیت الغزل کہتے ہیں۔

اردو شاعری فارسی شاعری کی تقلید ہے اور فارسی عربی کی۔ عربی قصائد کی تشبیب میں غزل بھی شامل تھی یعنی قصیدوں کی تمہید میں عاشقانہ مضامین لکھتے تھے اور اس کو غزل و تغزل کہتے تھے لیکن یہ تمہید غزل مسلسل ہوتی تھی۔ فارسی والوں نے اس ٹکڑے کو غزل کے نام سے مستقل صنفِ شاعری بنا لیا۔ رفتہ رفتہ غزل عشق و محبت کے مضامین تک محدود نہ رہی بلکہ مختلف و متضاد مضامین لکھنے لگے۔ ایک شعر میں محبت، دوسرے میں نفرت، تیسرے میں وصل، چوتھے میں ہجر، پانچویں میں اخلاق، چھٹے میں تصوف۔ اس طرح ہر غزل تمام اقسام کے مضامین و خیالات کا مجموعہ ہو گئی اور یہ رنگا رنگی غزل کی مقبولیت کا سبب بن گئی۔

(پہلا دور) جس وقت اردو زبان بنی اور چال چلن میں آئی شروع ہوئی اسی وقت سے فارسی شاعروں نے ایسی غزلیں کہنی شروع کر دی تھیں جن میں آدھا مصرع فارسی آدھا اردو یا ایک مصرع فارسی ایک اردو ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت امیر خسرو دہلوی (وفات ۷۲۵ھ) کی بعض غزلیں اسی طرح کی موجود ہیں۔ مثلاً امیر خسرو کی غزل کا ایک شعر یہ ہے ؎

بکا یک از دل دو چشمِ جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

اس کے بعد اردو ہی میں غزلیں لکھی جانے لگیں۔ کبیر داس (وفات ۹۱۶ھ) مشہور درویش اور شاعر گذرے ہیں۔ انھا کی غزل کا مطلع ہے ؎

ہمن ہے عشق مستانہ ہمن کو ہوشیاری کیا
رہیں آزاد یہ جگ میں ہمن دنیا سے یاری کیا

اس کے بعد اکبر و جہانگیر کے زمانے میں بھی بعض شعراء نے غزلیں لکھیں۔ اسی زمانے میں دکن کی سلطنت گولکنڈہ کا بادشاہ محمد قلی قطب شاہ (وفات ۱۰۲۰ھ) بڑا زبردست اردو شاعر تھا۔ اس کا کلیات نظم جس میں غزلیں، قصیدے، مثنویاں، رباعیاں، مرثیے سب کچھ ہیں، حیدرآباد کے سرکاری کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے۔ اس کے دو شعر یہ ہیں ؎

قطب شہ نہ دے مجھ دہانے کو پند — یو دانے کو کیا پند دیا جاتے نا

مجھ عشق کے گدا کوں اورنگِ شاہی دیتا — سب عاشقاں سیں انگے میں مغل ہوں دلستاں

(دوسرا دور) قطب شاہ کے زمانے کے بعد غزل کا سب سے بڑا شاعر ولی اورنگ آبادی ہے۔ ولی کے کلام میں پہلے کچھ الفاظ اور محاورے زیادہ ہوتے تھے۔ جب وہ دہلی آئے تو یہاں کی زبان کہنے لگے۔ شروع میں ولی نے بھانڈ کی شاعری کا انداز بیان اور خیالات و جذبات اختیار کئے اور ایسے شعر بھی کہے ؎

بروگی جو کہاتے ہیں انھیں گھر بار کیا کرنا — ہو جوگن جو کوئی پی کی اسے سنسار کیا کرنا

پھر دہلی کا اثر قبول کیا اور ایہام گوئی کی ۔

مسی گل غازہ شبنم موتی　　دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

اس دور کے اور شاعر آبرو، ناجی، مضمون، یکرنگ، آزاد وغیرہ ہیں ۔ اس زمانے میں ایہام گوئی اور صنعت لفظی کا بہت رواج تھا ۔ مثلاً یکرنگ کا شعر ہے ۔

اس زلف کا یہ دل ہے گرفتہ ہاں ہاں
یکرنگ کے سخن میں خلاف ایک حرف نہیں

(تیسرا دور) اس زمانے میں شاہ حاتم دہلوی (۱۶۹۸ء تا ۱۷۹۲ء) نے غزل کی زبان، اسلوب، محاورہ میں اصلاح کی۔ فغاں دہلوی (۱۷۱۱ء تا ۱۷۵۸ء) نے ایہام گوئی کو ترک کیا اور سلاست و واقعیت، لطف و تاثیر کا خیال رکھا ۔ مثلاً ۔

ستم سے تیر سے میں جاؤں پھر نہ کیونکر　　کہ آشنائی کا حاتم نباہ بھی نہ کیا

کوئی آزردہ کرتا ہے سخن اپنے کیے ظالم　　کہ دولت خواہ اپنا، مظہر اپنا، جانجاں اپنا

(چوتھا دور) اس دور کے تین شاعر غزل گوئی میں سب سے مشہور ہیں ۔ سودا، درد، میر ۔ ان کے بعد میر سوز، میر حسن، یقین، ان کا رنگ رہے ہے ۔ اس زمانے میں جس قدر خوبیاں اور دلکشیاں زبان و بیان، سادگی، صفائی، لطف و اثر کے اعتبار سے پیدا ہوئیں ان سے پہلے اور اس کے بعد نظیر نہیں ملتی ۔ مثلاً ۔

تو نے سودا کے نہیں قتل کیا کہتے ہیں　　پھر اگر جی ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

جب سے ہم تو تیرے کوچے میں اسی گھڑی　　جب من کے تیرا نام سنا بیتاب سا ہوا

(پانچواں دور) اس زمانے کے شاعر گزشتہ دور والوں کے ساتھی ہیں لیکن ان سے کچھ چھوٹے یعنی صفی، تپش، آتش، ہم آتش، ناسخ، یقین وغیرہ ۔ ان شاعروں کی غزل میں اکثر وہی خوبیاں ہیں جو پہلے تھیں، صرف میر تقی کا سوز و گداز، میر درد کا تصوف نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ جرأت، انشا و رنگین نے اپنی جذبات اور بازاری معاملات و زبان کا اضافہ کر دیا ہے ۔ زبان پہلے سے کچھ زیادہ صاف ہو گئی ہے ۔ نمونہ یہ ہے ۔

پھٹ پڑا جب سے گریباں اپنا　　ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں
صفی یار کے گھر کے آگے　　ہم تو کتنے ٹکھرے بیٹھے ہیں

دل وحشی کو خواہش ہے تمہارے در پہ آنے کی
دوانہ ہے و لیکن بات کتنا ہے ٹھکانے کی

(چھٹا دور) یہ زمانہ جو ۱۸۵۷ء سے شروع ہوتا ہے، زمانۂ انقلاب ہے ۔ دہلی کے قدیم شاعروں کی سادگی اور شیرینی

ختم ہوگئی۔ لکھنؤ کی شاعری اور اس کے ساتھ مضمون آفرینی، تصنع، آورد شروع ہوگئی۔ لیکن ناسخ لکھنوی نے زبان اور شاعری میں اصلاح کر کے اور قاعدے مقرر کر کے بالکل گچ کو تصحیح بنا دیا اور بیہودہ مضامین بھی ترک کر دیے۔ اس زمانے کے مشہور شاعر تعشیر جوی ناسخ لکھنوی، آتش لکھنوی، شہید، رعیوی وغیرہ ہیں۔

(ساتواں دور) یہ زمانہ غزل میں بلند مضامین، نازک خیالات اور نئے نئے انداز بیان کا ہے۔ دہلی کے شعراء مومن ذوق، غالب کی غزلیں زبان و بیان کے اعتبار سے اردو میں نہایت قیمتی جواہر ہیں۔ لکھنؤ میں وزیر، رند، آتش، رشک وغیرہ نے اپنے استادوں سے بہتر مضامین پیدا کیے لیکن زبان و محاورات کو اور زیادہ صاف کر دیا۔

(آٹھواں دور) اس زمانہ میں (جو ۱۸۵۷ء سے شروع ہوتا ہے) ناسخ اور وزیر کی سی مضمون آفرینی بھی نہیں ہے اور مومن و غالب کی سی نزاکت اور باریکی خیال بھی نہیں بلکہ یہ سب خوبیاں کسی قدر کم اور معتدل درجے سے پہلے سے زیادہ وکش زبان کے ساتھ ملی گئی ہیں۔ دہلی کے داغ، حالی، ظہیر، اثر وغیرہ اور لکھنؤ کے امیر، جلال، نسیم وغیرہ شعرا غزل گو شعراء ہیں۔

(نواں دور) موجودہ بیسویں صدی کے شروع سے یعنی امیر و داغ، جلال کے انتقال کے بعد قدیم طرز کی غزل کے ساتھ جدید رنگ کی غزل گوئی بھی جاری ہوگئی جو شاعر پرانے انداز و خیالات کے دلدادہ تھے وہ پرانے رنگ کی غزل کہتے رہے جیسے ریاض، بیخود، بیخود، بیخود، بیخود وغیرہ وہ ایک طرز خاص ہے لیکن بعض بزرگ شعراء مثلاً شاد عظیم آبادی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، اقبال، سیماب، اصغر گونڈوی وغیرہ۔ ان شعراء نے اس سنہری پاکیزہ روایت و کیفیت، نزاکت و لطافت کو جو شاد و اصغر نے شروع کی تھی پوری طرح نباہا اور فکر و تخیل کے ذریعے سے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ (تاریخ و تنقید ادبیات اردو)

ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب

میں غزل کا عجیب کا مل سے قائل ہوں کہ نہ غزل گویوں سے ایسا قائل ہوں کہ شاعر اور قصائد میں اقتدار کر سکوں۔ نہ غزل کو ایسا ستیفنہ ہوں کہ مسلسل نظموں سے الجھ اور نہ ہو سکوں۔ اردو شاعری پر ہونے والے تبصرے کیے جا رہے ہیں جو نئے نئے میدان نکالے جا رہے ہیں، جو نئی نئی نظمیں تخلیق کی جا رہی ہیں ان میں سے بعض پہلوؤں کو اضافی طور پر غلط نہ سمجھنے کے باوجود مجموعی طور سے ان کو اردو شاعری کی جہت کے آثار اور ترقی کے اسباب سمجھ کر ان کی قدر کرتا ہوں۔ مگر میرا عقیدہ ہے کہ وہ شاعر جو قدیم اوصاف سخن میں دادِ سخنوری دے سکے ہیں اور جو نئی شاعری صرف کر رہے ہیں ان کے کارناموں کو غلط فہمی کی بدولت مٹنے نہیں دیکھ سکتا اور شاعر کا جو سرمایہ جاتی زبان نے دو تین صدیوں کی عمل بدت میں جمع کیا ہے اس کو ضائع ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔

(نگار، آگرہ نمبر ۱۹۲۷ء)

نیاز فتحپوری

لفظ "غزل" کے لغوی معنی اس قدر عام و مشہور ہو چکے ہیں کہ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں جس نے محبت کی ہے اسے تو جتانا ہی چاہئے لیکن جو اس کوچہ سے نابلد ہے، اس کو بھی سمجھائی یا تیا سی طور پر معلوم ہوگا کہ "محبوب سے باتیں کرنے کا نام غزل و تغزل ہے یا مغازلہ اگر یہ گفتگو بامید کرنا ہو" اب غور طلب امر یہ ہے کہ "مجرب سے ایک عاشق کیا باتیں کر سکتا ہے اور ان باتوں کا انداز و لب و لہجہ کیا ہونا چاہئے؟"

محبت یا عشق فی الحقیقت ایک شدید قسم کا احساس پسندیدگی ہے اور اسی احساس و کیفیت کا نام شعر ہے۔ ہم کسی پھول کو دیکھتے ہیں تو اس کے رنگ و بو سے متاثر ہو کر اس کی تعریف کرتے ہیں یہ بھی شعر ہے، ہر منظر کی دلکشی سے متاثر ہوتے ہیں اور اسے اظہار کرتے ہیں یہ بھی شعر ہے۔ ہم قوس قزح کو دیکھتے ہیں اور اسے اضطراری کلمات تحسین زبان سے نکل جاتے ہیں یہ بھی شعر ہے۔ اس طرح کائنات میں قدرت کے جلوے مظاہر و آثار ہیں وہ سب انسان کے احساس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور جو کیفیت ان سے پیدا ہوتی ہے اس کو ظاہر کر دینا شعر ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ آلائش اظہار میں نہ پڑ کر قاری کو محسوس کرانے اور اسی قسم کی پیدا کرنے کے لیے محسوس لب و لہجہ اور محسوس الفاظ کے گئے ہیں۔

جو اگر یہی جذبہ پسندیدگی افراد نوع انسانی سے کسی سے سوا ہو تو وہ بھی محبت کہلاتا ہے لیکن اس محبت کا تعلق عموماً کوئی سے ہے وہ مخصوص ہے۔ اس جذبہ سے جو جنسی کشش و خواہش سے پیدا ہوتا ہے۔ محبت ماں، اولاد اور عزیز و احباب سے بھی ہوتی ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی غزل کا موضوع نہیں، اس کا تعلق صرف ایسے فرد سے ہوتا ہے جس سے انسان میں ہیجان پیدا ہو سکتا ہے۔ بعض احباب کو میں نے کہتے ہوئے سنا ہے کہ علاوہ جنسی محبت کے ایک چیز اور بھی روحانی محبت بھی ہے جسے (INTELLECTUAL LOVE) کہتے ہیں لیکن میں اس کو محض شاعری سمجھتا ہوں، اور اس کا وجود جنسی کیفیت سے علیحدہ میرے خیال میں نہیں آتا۔ تاہم اگر تھوڑی دیر کے لیے مان لیا جائے کہ اس محبت کا وجود ممکن ہے تو بھی اس کا غزل کی کوئی سے کوئی واسطہ نہیں۔

الغرض تغزل کا تعلق میرے نزدیک صرف اُن جذبات محبت سے ہے جو اس گوشت و پوست سے پیدا ہوتے ہیں اور جس کے پورا ہونے کی تمنا ہر محبت کرنے والے کو ہوتی ہے۔

اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو بخوبی ہر معلوم ہوگا کہ یہ نہایت محدود جذبہ ہے، عاشق نے کہا "میں تم پر جان دیتا ہوں"، معشوق نے کہا "میری بلا سے" بس قصہ ختم ہو گیا لیکن اگر آپ اس سلسلہ میں ان تمام کیفیات و جذبات پر نگاہ ڈالیں جو اسی ایک خواہش جنسی سے متعلق ہو سکتے ہیں تو آپ کو اس کی وسعت کا اعتراف کرنا پڑے گا.....

دورِ حاضر کی غزل گوئی خواہ وہ لکھنؤ میں ہو یا لکھنؤ سے باہر بالکل دہلوی رنگ کی ہے اور اب عام احساس اس امر کا ہو چلا ہے کہ تغزل کا تعلق صرف جذبات سے ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ جو کچھ کہا جائے وہ تاثرات کا نتیجہ نظر آئے

نہ کہ محض تصورات کا۔ (انتقادیات و دیباچہ)

غزل کے آپ حلقے دور چاہیں قائم کریں، لیکن ولی اور میر کے زمانہ سے لے کر چند سال پہلے تک "حسن و جمال" کا ذکر خالص عشق و محبت کی زبان میں کم و بیش ہر دور میں غرض مشترک کی حیثیت سے پایا جاتا تھا۔ لیکن اب کچھ زمانہ سے مدحسن "بس پر پوش" کا ختم ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن "بیان اپنا" ضرور بدلتا جا رہا ہے۔ یقیناً یہ تبدیلی دفعتاً نہیں ہوئی، بلکہ وقت و زمانہ کے لحاظ سے آہستہ آہستہ ہر دور میں کچھ تغیر ہوا اور اس تغیر کا اثر چونکہ موضوع شاعری پر بھی پڑا، اس لیے غزل کی زبان اور اس کا اسلوب بیان بھی بدلتا رہا، لیکن اب اس تغیر نے چونکہ انقلاب کی صورت اختیار کر کے غزل گوئی کی طرف سے انحراف و بغاوت کے جذبات لوگوں میں پیدا کر دیئے ہیں، اس لیے ہم اب اسے نمایاں طور پر محسوس کرنے لگے ہیں۔

غزل میں سب سے پہلی آمیزش فلسفہ و تصوف کی ہوئی اور اس میں شک نہیں کہ جس نے اول اول غزل گوئی میں یہ مذہب اختیار کیا وہ سخت "ناکام" انسان تھا جو ہمارے کرۂ زمین کے "دبستان مہوش" کی "کارگاہ حسن و محبوبی" کو ہمیشہ کے لیے ویران کر گیا۔

(نگار۔ جنوری فروری ۱۹۴۱ء)

ڈاکٹر یوسف حسین خان

گزشتہ دو برس میں میر صاحب کے زمانے سے لے کر حسرت و جگر کے موجودہ دور تک اردو غزل کے اسلوب میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن اس کی بنیادی حقیقت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا۔ اس سے صاف طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ صنف سخن اپنی اصلی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف حالات سے مطابقت کی صلاحیت رکھتی ہے جو اس کے جان دار ہونے کی دلیل ہے۔ ہر غزل گو شاعر کے کلام میں ہمیں ایک قسم کی مخصوص دھنا ملتی ہے جو اس شاعر کی داخلی کیفیات اور ان تمدنی احوال کا نتیجہ ہوتی ہے جن میں اس نے نشو و نما پائی ہے۔ حسرت و جگر کے ہاں حسن و عشق کے معاملات کا اظہار اُس سے ایک حد تک مختلف ہے جو ہمیں میر و غالب کے ہاں ملتا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو؟ دنیا کی ہر چیز ارتقا پذیر رہتی ہے۔ آج ہمارا لباس، ہماری معاشرت اور طرز فکر و احساس وہ نہیں جو اگلے زمانے کے لوگوں کا تھا۔ ہمارے موجودہ دور کا غزل گو شاعر بعض اوقات حسن و عشق کو تجزیاتی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ جس کی مثال اردو کے ابتدائی یا درمیانی دور کے شاعروں کے یہاں نہیں ملتی۔ وہ اب احساس جمال کو حیات و کائنات کے سمجھنے کے لیے بطور قدر استعمال کرتا ہے جس سے اس کے پیشرو بڑی حد تک نابلد تھے اور اگر واقف تھے تو بالکل مبہم طور پر۔۔۔۔۔۔

مولانا حالی نے غزل پر چونکہ پیغمبری کی وہ اصلاحی محرکات کے تحت تھی نہ کہ ادبی مقاصد کے تحت۔ انھیں غزل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ یہ حسن و عشق کے معاملات کی شاعری ہے۔ عشق عقل اور اخلاق کو خراب کرنے والی چیز ہے۔ اس سے جتنا بھی اجتناب کیا جائے اتنا ہی قوائے صالح کی ترقی کا موجب ہوگا کہ یہ بیکاری کا مشغلہ ہے۔ لیکن یہ نقطۂ نظر سطحی ہے۔ مولانا حالی کی نیک نیتی اور ان کے اخلاص میں شبہ نہیں۔ لیکن اس ضمن میں اُن کا مشورہ قابل قبول نہیں۔ یہ بات ہمارے ادبی مزاج کی صحت پر دلالت کرتی ہے کہ مولانا حالی کے مشورہ کو قبول نہیں کیا گیا۔ اگر قبول کیا جاتا تو ہماری زبان حسرت اور جگر آور فانی اور اصغر کی زمزمہ سنجیوں سے

عدم ہی جو ایک ناقابل تلافی نقصان ہوتا ہے۔

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو پچھلے پچیس برس سال میں غزل نے نظم پر اور نظر نے غزل پر اپنا اپنا اثر ڈالا ہے۔ غزل کی پیرہ کاری اگرچہ حقیقت میں کوئی عیب نہیں لیکن پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عہد جدید کی زندگی کا رجحان کلاسیکی سنجیدگی کا متوقع نہیں ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ غزل میں تسلسل پیدا کیا جائے گا اور منفرد اشعار کے بجائے منظومیں وحدتِ احساس کی کارفرمائیاں بڑھتی جائیں گی اور اس کے ساتھ ساتھ نظم بھی اپنے اندر رمز و کنایہ اور موسیقیت کے ذریعہ غزل کی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرے گی اور اس طرح دونوں اصناف ایک دوسرے سے قریب آجائیں گی۔

(غزل)

ڈاکٹر سید عبداللہ

غزل اپنی تعمیر و ترکیب کے لحاظ سے نہایت خوشگوار امتزاج کی متقاضی ہے۔ لفظ و معنی کا حسین و لطیف پیوند، جذبے کی سچائی اور کیفیت — خون جگر اور لطافت نظر کا امتزاج ایک خاص قسم کی نغمگی اور موسیقیت، یہ سب ایک اچھی غزل کی خصوصیات ہیں۔ غزل حسن کا ایک ایسا نمونہ ہے جس میں ذرا سی بے اعتدالی بھی ناگوار محسوس ہونے لگتی ہے۔ کامل تناسب اور موزونیت غزل کی بنیادی صفت ہے اور اعتدال و توازن اس کی اساسی شرط۔

اچھی غزل کی بڑی ظاہری خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ وہ ساخت کے اعتبار سے متناسب ہو۔ علمائے فن نے غزل کی ساخت میں تعداد اشعار کو معین اور محدود کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور غزل کی طوالت کو عیب قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل کا جسم ایک خاص صورت رکھتا ہے جس کے حسن کے لیے ہر دوسرے جسم کی طرح تناسب کا لحاظ ضروری ہے۔ غزل کے اشعار تعداد میں جب آٹھ نو سے بڑھ جاتے ہیں تو عموماً اس کے جسم میں ڈھیلا پن، بے ڈھنگا پن اور کھلا کھلا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اور غزل کا جسم اپنے تناسب کو کھو بیٹھتا ہے۔ اور غزل اپنے مرکزِ ثقل سے ہٹ جاتی ہے۔

غزل میں مرکزِ ثقل سے مراد وہ مرکزی جذبہ ہے جس سے غزل کی تحریک ہوتی ہے، یا وہ خیال جو غزل کا سب سے نمایاں خیال ہوتا ہے۔ اگرچہ مشاعرے کے رواج نے غزل کو یہ نکتہ نظر عمل بنا دیا ہے۔ اور اس کے لیے عموماً مصرع طرح کے سوا کوئی خارجی تحریک ضروری نہیں سمجھی جاتی، مگر اصل شاعری کسی سچی جذباتی تحریک کے بغیر استوار نہیں ہو سکتی ہے۔ اسی لیے سب بڑے غزل گوؤں کی غزل میں یہ نمایاں جذبہ یا مرکزی خیال (جو اس غزل کی تخلیق کا باعث ہوتا ہے) صاف صاف نظر آجاتا ہے۔ یہ مرکزی جذبہ ہر اچھی غزل میں ضرور ہوتا ہے۔ باقی تمام میں غزل میں اس مرکزی جذبے کے زیر اثر نمودار ہوتی ہیں۔

اس خاص پہلو سے غزل میں تعداد اشعار کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ جب غزل میں اشعار کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے تو غزل کے مرکزی جذبے کا اثر کچھ جاتا ہے۔ دوائی کے تقاضوں سے بعض اوقات متضاد اور بے آہنگ مضمون پیدا ہو جاتے ہیں۔ باہم ارتباط جذبے کے بالمقابل دوسری لہریں اس بے ہنگم طریق سے غزل میں جمع ہو جاتی ہیں کہ غزل کا سرچشمۂ محرک بالکل غائب ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے غزل کی مقبولیت کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔

(بحث و نظر)

کلیم الدین احمد

اردو شاعری میں ایک انقلاب رونما ہوا یعنی غزل کی اہمیت اور ہر دلعزیزی میں کسی قسم کی کمی نہ ہوئی۔ آج بھی غزلوں کی وہی فراوانی ہے جو عصر حاضر کے آغاز سے پہلے تھی۔ اس کی ایک وجہ تو صنف غزل کی آسانی ہے۔ غزل کے لیے نہ قوت و عاسکی نہ عدت ہے نہ اوپاک و کار ہے۔ تخیل اور فکر کی بھی ضرورت نہیں کسی قدر ذاتی غنائیت کی تو جانی مقصود نہیں۔ خیالات و جذبات موجود ہیں الفاظ بندش ترکیب بھی موجود ہیں بحور و اوزان بھی موجود ہیں۔ ذرا سی محنت کی اور غزل تیار ہو گئی۔ جب اس قدر سہل و آسان طریقے پر شاعر بن سکتا ہر تو پھر کوئی کیوں دشوار راستے کو طے کرے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جدید اصناف غزل پر کیے گئے وہ مضامین غزل سے وابستہ تھے۔ کسی نئے صنف غزل کی خامیوں کو آشکارا نہ کیا اور یہ مشکل کام تھا جب وہ شعوری طور پر اس کے نقائص سے آگاہ بھی نہ تھے۔ حالی و آزاد نے غزل کو مشق و مشق کی قید سے آزاد کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ غزل مشق کی [illegible] کی کیفیت پر کچھ زیادہ زور دینے کے ساتھ نظمانے لگی۔ نئے نئے مضامین مصورانہ اخلاقی عصابین داخل غزل ہو گئے۔ لیکن حالی اور آزاد کی کوششوں سے کوئی ہمہ گیر تغیر پیدا نہ ہو سکا اور اردو شعرا اپنے پرانے راستے پر چلتے رہے اس لیے ضرورت ہوئی کہ حالی اور آزاد کی تحریک کا اعادہ کیا جائے۔ شعرا کے ایک طبقہ نے از سر نو غزل کی سرحدوں کو وسعت دینے کی کامیاب کوشش کی۔

یہ جناب کہتے ہیں:

"ہمارے معاصر شعرائے متغزلین آج بھی اپنی اکثریت کے ساتھ تقریباً وہی شاعری کی ترجیح و تہذیب میں بدستور مصروف و منہمک ہیں۔ وہ شاعری اور شاعروں کو صرف لفظ قافیہ و زبان کا ذریعہ سمجھ کر ان کے احیا کی کوشش میں منہمک ہیں مگر اپنے کو وہ اجمالی سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھے۔ وہی ان کی شاعری ہے، وہی شاعر ہے اور وہی بندیات و قافیہ کی طرف رجحان ہے"

شاعری کی ہیئت اور اس کی اہمیت سے وہ آشنا نہیں۔ شاعری اور غالباً شاعر کو وہ غزل کا مترادف سمجھتے ہیں محض ایک ذریعہ تفریح ہے اور تفریح کے علاوہ اگر اس سے کوئی فائدہ مقصود ہے تو وہ محاورہ زبان کا تحفظ۔ اس لیے وہ پرانے فرسودہ خیالات و مضامین کو روزمرہ اور سیا محاورہ زبان میں بیان کرتے ہیں۔ جناب بھی حالی و آزاد کی طرح اصلیت کے نقدان پر زور دیتے ہیں اور تقلید اور نقالی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ لفظ نظما نہیں۔ حالی و آزاد کا کہنا ہے۔ حالی کی تنقید جناب بھی اخلاقی معیار سے شعرائے متغزلین کو جانچتے ہیں۔ مضامین ہی نہیں زبان پر بھی نظر ڈالتے ہیں اور شعرا کی تنگ نظری کا انکشاف کرتے ہیں:

"لکھنؤ کی زبان کے حامیوں کا ایک گروہ ہے جو چاہتا تو یہ ہے کہ زبان کی صلاحیت پر حرف نہ آئے مگر فی الحقیقت اس کی ترقی کی راہیں بند کرنے کا خواہشمند ہے۔ نئے الفاظ نئے معانی اور نئے اسالیب بیان سے حد سے زیادہ ڈرنا ایک زبان کے لیے اس سے کچھ ہی کم مہلک ہے جتنا کہ ان مخترعات کی قطعی روک تھام نہ کرنا"

حالی نے بھی زبان کی طرف توجہ کی تھی اور جس طرح حالی نے غزل کو اپنا بیان سے نکالنے کے لیے مفید مشورے پیش کیے تھے، اسی طرح جناب بھی اپنے مشورے پیش کرتے ہیں۔ یہ حالی کے الفاظ ہیں:

"صحیح غزل کی صفات اور ادا ہے جو بیان ہوئی ہیں۔ یہ کیفیت عطا تو ہر طالب ہی کو ہو سکتی ہے مگر مشاہدہ سے اور مطالعے سے آپ دیکھ چکے ہیں کہ اچھی غزل کا اچھی طرح سمجھ لینا

فلسفہ، سیاسی و علمی جہاں و تجربہ، سماجی و دینی و پیام و اخلاق، جذبات اور محاکات

سب کو چھوڑ کر غزل میں لیکن یہ تغیر ہمارے خیال میں ہر گز مناسب نہیں۔ زمانہ کی

میں زبان کی سادگی کو جو بات چیت کی زبان اور عبارت کی صفائی کو اور

غزل کی جان اور موجودہ حالت کو ہر گز نہیں چھوڑنا چاہیے کہ زبان محاورہ اور

لطافت، نزاکت و نغمہ پارچوں سادگی کے ساتھ قدما سب فارسی تراکیب

جو اس قوت تخیل میں بالکل پیدا کر سکتے

یہ تجویزات کچھ نئے نہیں اور ان خیالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب غزل سے کچھ اور ہی قسم کی چیز بنانا چاہتے ہیں۔ وہ غزل میں پھر وہ لطیف و دلکش کیفیت پیدا کرنا چاہتے ہیں جو غالب اور مومن میں موجود ہے۔ ان کے خیالات اعتبار سے الفاظ غزل میں ایسے نئے خیالات نہیں ہیں جو عبارت اور ادا ہوں۔ اگر خیالی بھی تو لگی دل میں محو کر سکے گئے ہوں۔ الفاظ بھی لطیف علمی اور پر شوکت ہوں۔ اور جس لیے کے خیالات سکے وہ بھلا ہوں صنف غزل کے تقاضوں سے واقف نہیں۔ وہ بھی جناب حالی کی طرح غزل کو تباہ ہی کرنا چاہتے ہیں۔ ضروری صفت، مجھے ہیں یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ غزل اپنی صنفی خاصیتوں کے سبب سے افکار بلند و لطیف و شریف بھی ہو سکتی ہے اور اردو شاعری ترقی کر بھی سکتی ہے تک غزل سے ایک مدت تک کے لیے کنارہ کشی نہ کی جائے۔ یہ کیفیت دنیا اور پرانے تک غزل کی مثال اقبال کی ان دو غزلوں میں ملتی ہے۔ پرانا رنگ ؎

تڑپنے پھڑکنے کی وہ رات کیا تھی	لگن وعدہ کرنے کی ہو بات کیا تھی
تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی	نہ مندر میں نہ مسجد میں نہ کعبہ میں نہ بت خانے
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا	تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی
تامل تو تھا ان کے آنے میں قاصد	مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی

کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

نیا رنگ ؎

پھر اوجِ سارِ گانی اقبال غزل خواں ہو	غنچے ہوئے گر گل ہو گل ہے گلستاں ہو
تو شاخِ گل کی نمٹی ہے اجزا کی حرارت سے	برگِ گل تر تیرا مضراب ہے بیاباں ہو

کیوں ساز کے پردے میں مستور ہو نے نیری
تو نغمہ رنگیں ہے ہر گوش پہ عریاں ہو
اے رہرو فرسودہ زمانہ تجھے ہیں آئینہ سے
گلشن ہے تو شبنم ہو صحرا ہے تو طوفاں ہو

ساماں کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی
مقصد ہے اگر منزل غارت گر ساماں ہو

پہلی غزل میں خیالات خاص معمولی ہیں۔ ان کو سادگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ خیالات صرف معمولی ہی نہیں فرسودہ بھی ہیں۔ ان خیالات و جذبات نے شاعر کے دل میں ہیجان اور تخیل میں طوفان نہیں برپا کیا ہے اس لیے ان میں اصلیت مفقود ہے۔ اسی اصلیت کی کمی کی وجہ سے زبان اپنی سادگی کے باوجود بامحل معلوم ہوتی ہے لیکن رنگ معلوم ہوتی ہے لیکن شعر کا ایک معتدبہ حصہ ابھی تک اسی قسم کی شاعری کے دام میں پھنسا ہوا ہے جس کا نمونہ ان دو مصرعوں میں ملتا ہے:

(۱) "خطا اس بندے کی سرکار کیا تھی"
(۲) "تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی"

اسی پر سر دھنتا ہے اور ایسی غزلوں کی بنا پر اپنے کو شاعر کہلانے کا مستحق سمجھتا ہے۔ اس قسم کی غزلیں معیار شاعری پر پوری اُتر نہیں سکتیں۔ اگر انھیں غزلیت کے معیار سے بھی جانچا جائے تو نہایت ہی ہیچ ثابت ہوں گی۔ دوسری غزل بھی غزل ہے نظم نہیں اقبال پھر غزل خواں ہوتے ہیں لیکن یہاں ایک دوسرا عالم ہے۔ خیالات غزل کے ہیں خیالات سے ایک علم مختلف ہیں ہر شعر میں ایک پیغام مکمل پنہاں اور تازہ زندگی مستور ہے۔ خیالات بذات خود اہم و بلند پایہ ہیں لیکن ان کی اہمیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان میں اصلیت موجود ہے۔ یہ محض فرضی اور خیالی نہیں۔ تقلید و نقالی کا نتیجہ نہیں اس لیے ان میں گہری جذبات اور رنگ و تخیل دونوں چیزیں موجود ہیں۔ خیالات کی بلندی نے الفاظ کو بھی رفیع و بلند پایہ بنا دیا ہے۔ ایک طرف یہ رنگ ہے

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑ
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

جس میں اگر کوئی حُسن ہے بھی تو محض لفظی۔ مضمون عامیانہ اور طرز ادا بھی انفرادی نہیں اور دوسرا رنگ ایسا ہے

ساماں کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی
مقصد ہے اگر منزل غارت گر ساماں ہو

جس سے ولولے بھڑک اٹھیں اور دل اولوالعزمی کی بوستانگاہ بن جائے۔ سچ جوش نے ہر ہر لفظ میں ایک بے پناہ زور ڈال دیا ہے۔

پرانے رنگ کے علمبردار ایک دائرہ محدود سے نکلنا اور ترک و اختیار کی معذرتوں سے باہر آنا کفر شاعری سمجھتے ہیں۔ ہم کوٹھی کے دھان اس کوٹھی میں اور اس کوٹھی کے دھان اس کوٹھی میں منتقل کرنا ہو کا ایک مستقل مگر کھل تخیل ہے۔

معاصر ہی نہیں اکثر کہنہ مشق و فادار المکلام شعرا بھی اسی شغل میں منہمک نظر آتے ہیں۔ یہ نہیں چاہتے کہ غزل سے سر مُو بھی تجاوز کریں یا اس کے اسالیب و موضوعات میں تحدد و تصوف کی گنجائش پیدا ہو۔ یہ رہ زمرہ کی تدریج کے حامی ہیں۔ روایت لفظی احد

محاورہ بندی کو اصل شاعری سمجھتے ہیں۔ ان کے اشعار میں مطلب بیان کے سوا کچھ بھی نہیں اور اس معاملہ میں بھی وہ اپنے متقدمین و آج اتیرؔ کے پایہ تک نہیں پہنچتے اس لیے وہ تا ہنجار اور نامکمل فرحت بھی جو صنعت غزل سے حاصل ہوتی ہے ان کی غزلوں میں نہیں ملتی۔ ان غزلوں کی اہمیت محض شاعرانہ مشق کی سی ہے اور یہ مشق بھی زیادہ نمکین۔ کیونکہ شاعر کسی جدت طرازی یا انفرادیت کا ثبوت نہیں پیش کرتا۔ زوقؔ کی طرح یہ سنگلاخ زمینوں کو سرسبز و شاداب نہیں کرتے ہیں۔ چند مثالوں سے یہ نکتے واضح ہو جائیں گے۔

۱۔ ریاضؔ خیرآبادی

فرمائشیں شباب میں ہیں حسن یار کی — محو ہیں نئے نقار عروس بہار کی
بے بال و پر بھی آہ قفس سے اڑ گئے — کس نے اڑائی آہ قفس بہار کی
دیتا ہے سبزہ و ہ یہ چمن زار زر میں — کون ان کے ہوسے پھیرے ہے ہزار کی
خم کیا ہے گھر بھی لوٹی جو بھرے گی نیند — نیند بھی بھرے گی نظر بادہ خوار کی
یہ شوخیاں، ہیں یہ تری اے نگاہ شوخ — بے بے قراریاں ہیں دل بے قرار کی

زبان صاف و سادہ و پاکیزہ ہے۔ خیالات و جذبات میں کوئی جدت یا اصلیت نہیں۔ بوشعرائے متقدمین کہہ چکے ہیں انہی خیالات کی تکرار مقصود ہے اور ساری توجہ محض اس پر صرف کی گئی ہے کہ مطلع میں خیال کی طرف کوئی قلم توجہ نہیں۔ چند الفاظ کو ایک شعر میں منسلک کر دیا گیا ہے اور بس۔ دوسرے شعر میں دعائیہ ہے "لفظی عناصر" "بے بال و پر" "اڑ گئے" "آہ قفس" سے اسی طرح "سبزہ زار" "زر" "ہزار" "گھر بھر دے" "نیند نہ بھرے گی" تمام ہی روایت پر مبنی ہے۔ اگر قافیہ میں کوئی جدت ہوتی تو اس غزل کی ضیافت کی۔ اس ضیافت میں بھی کھانا باسی اور بے مزا ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اردو شعرا کسی ضلعی ضیافت میں مدعو ہوئے تھے اور وہاں سے کچھ ٹکڑے پارچے چرا کر لے آئے ہیں اور انہی ٹکڑوں پارچوں سے دوسروں کی ضیافت کرتے ہیں۔ چند ایسی غزلیں ہی نہیں اکثر اس کا شاہد موجود ہوتا ہے اور بس۔ ہر کیف آخری شعر میں کچھ شوخی ہے اور شوخیاں ہیں "نگاہ شوخ" "ایک طرح متعزربان اور "دل بے قرار" دوسری جانب اس توازن سے کچھ لطف حاصل ہوتا ہے لیکن یہ بھی محض الفاظ سے وابستہ ہے۔

۲۔ جلیلؔ

شریک بزم جاناں کب کوئی دیوانہ ہوتا ہے — جو جاتا ہے تو شمع حسن کا پروانہ ہوتا ہے
سمجھ والے سمجھ سکتے نہیں رمز محبت کو — وہی کچھ جانتا ہے جو کہ دیوانہ ہوتا ہے
بھلا ہو یا لگاوٹ ہو وفا ہو یا کہ دھوکا ہو — ترے بندوں کا ہر انداز افسانہ ہوتا ہے
شب وعدہ یہاں آخر ہوتی جاتی ہے دم بھر میں — وہاں زلف پریشاں میں ابھی تک شانہ ہوتا ہے

آخری دو شعروں میں خیالات نہایت ہی دعامیانہ ہیں۔ اسی قسم کے خیالات عام طور سے نظم کیے جاتے ہیں اور ان کی ستائش ہوتی ہے اور سامعین سر دھنتے ہیں اور بار بار پڑھتے ہیں ؎

شب وعدہ یہاں آخر ہوتی جاتی ہے دم بھر میں — وہاں زلف پریشاں میں ابھی تک شانہ ہوتا ہے

یہ دیوانہ کی بڑ بھی نہیں ہوتا کہ جیسا پیش پا افتادہ ہے۔ اصلیت سے بڑا ہے اور بندش الفاظ میں چستی کے سوا اور کوئی محسن بھی نہیں۔ طرفہ یہ انفرادی نہیں۔ ہر جگہ ہر اس شعر کے اشعار یا کسی نظر کرتا ہے۔ جہاں شاعر کے ذہن میں "شانہ" کا قافیہ آتا ہے وہاں "زلف پریشاں" کا خیال خود آتا ہے۔ پھر "زلف پریشاں" سے "زلف پریشاں میں شانہ ہونا ہے" کا مضمون مرتب ہوتا ہے ایک قدم اور پھر "زلف پریشاں" میں "کنگھی شانہ" سے "نظر" ہو گیا۔ پھر "وہاں" بھی تک "کی رعایت" نظر رکھتے ہوئے "سنوارنے" معرع کی تکمیل ہو گئی۔ شعر کی فضا پھاڑ کر نہیں آتی۔ اسی فضا کو شاعر تصور کیا جاتا ہے۔ پہلے تین شعروں میں نئے خیالات نہیں لیکن وہ بنا بھی نہیں۔ خیالات کی بندش کی وجہ سے الفاظ و تعبیر میں بھی جدتی نمایاں ہو گئی ہے ——— اشعار میں شوکت اور متانت آگئی ہے۔

کچھ والے سمجھ سکتے نہیں یار محبت کو
وہی کچھ باخبر ہوتا ہے جو دیوانہ ہوتا ہے

رعایت لفظی یہاں بھی ہے۔ "کچھ" "کچھ والے" "باخبر" "دیوانہ" لیکن قافیوں کی توجہ دام الفاظ میں پھنس کر رہ نہیں جاتی۔ یہ اس خیال سے بھی باخبر ہوتی ہے جس کا اس شعر میں اظہار کیا گیا ہے۔ خیال کی اہمیت الفاظ پر غالب ہے۔ غور طلب امر یہ بھی ہے کہ ابھی تک ایک غزل میں شعر در شعر قصداً ہر قافیہ کے اشعار داخل کر دیتے ہیں۔ اس معاملے میں بھی کبیر کے "نیر" بنے ہوئے ہیں۔ غزل میں مروجہ و مسلسل اشعار سے ہی کہ از کبیر یہ تو معلوم تھا کہ کم و بیش ایک ہی پایہ کے اشعار ایک غزل میں داخل کیے جاتے۔

تب۔ فوق کاروی

یہ مسئلہ ہرگز نہیں سکتا وہ قائل ہو نہیں سکتا
کوئی قاتل بے بننے سے قائل ہو نہیں سکتا

جو پہنچیں گے تو ہم پہنچیں گے مر کر کوئے جاناں تک
کہ جیتے جی کوئی جنت میں داخل ہو نہیں سکتا

یہ کہہ کہہ کر کیا بوسے آنکھیں لڑانے پر
نظر ہے اس کی شوخی وہ قاتل ہو نہیں سکتا

یہ مقتل وہ دریں کیسا ابرو سے خمدار کو جنبش
کوئی اس بال کے خنجر سے بسمل ہو نہیں سکتا

یہ فقرے ہیں یہ چالیں ہیں یہ باتیں ہیں یہ گھاتیں ہیں
مرے دشمن کو تم سے فتنہ قاتل ہو نہیں سکتا

استعجاب ہوتا ہے کہ بیسویں صدی میں تہذیب و تعلیم یافتہ طبقے میں اسے شاعری سمجھا جاتا ہے ؎

سر مقتل وہ دریں کیسا ابرو سے خمدار کو جنبش
کوئی اس بال کے خنجر سے بسمل ہو نہیں سکتا

ایسے اشعار سے کسی نوعیت یافتہ دماغ کو بے لطفی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ لطیف احساسات کو ایک صدمہ پہنچتا ہے۔ طبیعت سراسر منقبض ہو جاتی ہے۔ لیکن اردو شاعری کا ایک بڑا حصہ ابھی تک اسی قسم کے اشعار پر مشتمل ہے۔ دوسرے اشعار میں بھی کوئی خاص بات نہیں۔ واسوخ کے رنگ کا اتباع کیا گیا ہے اور بس۔ دوسرے شعر میں "کوئے جاناں" کو شاعر نے جنت قرار دیا ہے۔ یہی اس شعر کی جان ہے۔ اگر "کوئے جاناں" کو ایک محبوب کے لیے "جنت" نہ تصور کیا جائے تو شعر بے معنی اور مہمل ہو جاتا ہے

طلع اور آخری شعر میں داغ کی روانی اور برجستگی کی نقالی ہے اور تیسرے شعر میں داغ کی شوخی کا اتباع کیا گیا ہے لیکن یہ روانی و برجستگی، شوخی، یہ روزمرہ و محاورے کی چاشنی داغ میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ پھر اس کی نقالی حاصل ما حاصل ہے۔ جو اس قسم کی چیزوں کو پسند کرتے ہیں وہ داغ کے کلام میں ان سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ پھر وہ داغ کے تتبعین کے اشعار کی طرف توجہ ہی کیوں ہوں خصوصاً جب کہ داغ میں اور بھی اوصاف موجود ہیں جو ان میں موجود نہیں۔ داغ کے اشعار کامیاب اشعار ہیں تازگی و شگفتگی لئے ہوئے ہیں جس کے تتبعین یہ اشعار پڑھ کر مشک پھلی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان شاعروں نے داغ کے علاوہ داغ کے اشعار میں بھی عیب بھی ہے۔ وہ اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں اور ذاتی واقعات کے نقش و نگار کھینچتے ہیں ——— لیکن ان کے تتبعین دوسروں کے خیالات و جذبات کی نقالی کرتے ہیں اس لیے اصلیت کہیں نہیں ملتی۔

۴ - احسن مارہروی

نصیب سیر گل و دیدۂ خزاں میں نہیں — قفس میں رہتے ہیں گویا چمن آشیاں میں نہیں
کچھ ہوتی چلی آتی ہے کس لیے دنیا — کوئی گشش تو ترے عشق آسماں میں نہیں
یہ مانتا ہوں کہ پامالِ کفن ہے وہ بھی مگر — تمہاری چال کے انداز آسماں میں نہیں
بڑا ہے خضر سے بھی عمر میں اور اس کے سوا — کرامت اور کوئی پیر آسماں میں نہیں

یہ مرے ضعف پہ دنیا کی قوی ہے اک دلیل
کہ طاقت اس کے بیاں کی مری زباں میں نہیں

کیا خشک سا مانی ہے۔ تاثیر کا کہیں نام و نشان نہیں۔ اصلیت معدوم، تخیل کا معیار اس شعر سے ظاہر ہے ؎

بڑا ہے خضر سے بھی عمر میں اور اس کے سوا
کرامت اور کوئی پیر آسماں میں نہیں!

خیالات ہی مصنوعی اور پیش پا افتادہ نہیں۔ ان کی ترجمانی میں بھی جدت و کاوش سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اگر کچھ ہے تو بس یہ کہ الفاظ کی نشست میں کوئی جھول نہیں۔ بندشیں چست ہیں جس سے شاعری کا پتہ چلتا ہے لیکن شعریت مفقود ہے۔ اس پرانے بے لطف، بے رنگ طریقۂ شاعری سے عاجز آ کر بعض تعلیم یافتہ طبقوں نے اس سے کنارہ کشی کی ہے۔ نئے رنگ کے متعین زیادہ مستعد و سنجیدہ ہیں اور نئے خیالات یا نئی طرز ادا کے حامل ہیں۔ غزل کو حسن و عشق کی قید سے آزاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور انواع و اقسام کے تصورات و محسوسات و واقعات کو داخل غزل کرتے ہیں اور الفاظ میں علمیت، بلندی، اشتراکیت، ثنائیت کا خیال رکھتے ہیں۔ یہی وہ اصول، اختیار کرتے ہیں جن پر سودا، غالب، مومن کی شاعری کی بنا تھی۔ انھیں خود اعتراف ہے کہ اس قسم کی غزلوں میں بھی زیادہ گنجائش نہیں۔ لیکن پھر بھی غزل سے کنارہ کش نہیں ہوتے۔ جوش اس طبقے کے خیالات کی پوری ترجمانی کرتا ہے ؎

دل رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا ہم نے — اسلوبِ سخن نیا نکالا ہم نے
ذرات کو چھو کر حریفوں کے لیے — خورشید پہ بڑھ کے ہاتھ ڈالا ہم نے

تغزل ہر طرف یہ شعرا ہمہ کی قید سے آزاد رہنا چاہتے ہیں اور ہر شاعر ایک انفرادی اسلوب کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے اسی لیے ان کی غزلوں میں کم از کم ظاہری بے ربطی نہیں پیدا کرتی۔ ان کے حوصلے بلند ہیں۔ یہ روایات کو چھوڑ کر خود رشید کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں لیکن ہاتھ ڈالنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ ان کی ناکامیابی کی وجہ بھی معنوی ہے جو پرانے رنگ کی غزلوں میں بے ربطی پیدا کرتی ہے یعنی اصلیت کا فقدان۔ اس طبقے کے شعرا جدت طرازی اور نازک خیالی یا معنی آفرینی میں اس قدر منہمک ہو جاتے ہیں کہ صداقت و اصلیت کا خیال بھی نہیں رہتا۔ لفظی حسن تو حاصل ہو جاتا ہے لیکن تاثیر باقی نہیں رہتی ؎

تیری نمود ارتقا جلوہ گہ حیات کا — تیرا ورود مجرہ عالم ممکنات کا
کھینچ دیں اصل و فرع میں صاف حدود امتیاز — ذہن و نظر کو دے مزا معنی صفات ذات کا
تیرگی جمود سے زندگیاں ہوئیں طلوع — عقدہ کیا جو تو نے حل فلسفۂ حیات کا
کشمکش مآل سے روح کو کر دیا رہا — جلوہ بہانہ ہے تو حامۂ نجات کا
رہنے دے محو بے خودی خاطر پرخروش کو — راز کہن نہ فاش کر توضیح تعینات کا

الفاظ بلند آہنگ و رفیع الفاظ کی کثرت ہے "ارتقا" "جلوہ گاہ حیات" "فلسفۂ حیات" "کشمکش مآل" "حامۂ نجات" "خاطر پرخروش" "توضیح تعینات" "تیرگی جمود" زبان علمی ہے۔ جملا اور عوام کی زبان سے قریب بھی ہے لفظی حیثیت سے ان اشعار کو قوت اور اقتدار بھی حاصل ہے لیکن یہاں شاعری رضتوں کی حامل نہیں یعنی لفظی شوکت معنوی شوکت کے ہمدست ہے۔ خیالات عامیانہ و پیش پا افتادہ نہیں لیکن پھر بھی یہ اشعار نہیں اس لیے کہ خیالات محسوسات کے سانچے میں نہیں ڈھالے گئے ہیں۔ خیالات کی اہمیت و صداقت، الفاظ اور بندشوں کی رفعت و ندرت میں زائل ہو گئی جذبات معدوم ہو تو شعریت کیسے باقی رہے۔ اکثر اس طبقے کے شعرا زور کو جوش کا مترادف سمجھتے ہیں۔ جو خیالات ان کے دماغ میں آتے ہیں انہیں پرکھتے نہیں، محض زور لفظی رعب و نخوت کے ساتھ بیان کرتے ہیں اس لیے غزلیں اکثر مجذوب کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔

جب دل نے مجھ کو شعلہ بداماں بنا دیا — میں نے ہر ایک خار کو بستاں بنا دیا
زلفوں کی ہر گرہ کو عطا کی متاع دل — ابرو کی ہر شکن کو رگ جاں بنا دیا
جلووں کو دیں نظام دو عالم کی وسعتیں — شوخی کو کائنات بداماں بنا دیا
عشووں کی پختگی کو عطا کی شکستگی — شبنم کی بوند کو دُرِ غلطاں بنا دیا
کج کر کلاہ فخر کہ تیرے شباب کو — میں نے تمنائے عالم امکاں بنا دیا

جب یہ شعرا لفظی شوکت و ندرت کی قید سے آزاد رہ کر غزلیں لکھتے ہیں تو کچھ زیادہ کامیاب رہتے ہیں۔ سادہ پیرایہ میں اور مختصر بحروں میں اکثر دلچسپ اشعار موزوں کر لیتے ہیں۔ غالب و مومن کا رنگ اور اثر تو نہیں آتا لیکن یہ اشعار سراسر بے مزا نہیں ہوتے اور کانوں پر گراں نہیں گزرتے ؎

نہیں بنتی دل تنہا فغاں سے — کسی کو بھیج دے یار جہاں سے
کوئی دیکھے مری وحشت سوالی — انہیں کو مانگتا ہوں میں انہیں سے

کسی نے حال مجھ اس طرح پوچھا — دعا نکلی دلِ اندوہ گیں سے
یہ مایوسی کا تیرِ آخری ہے! — بچے رہنا نگاہِ واپسیں سے

عنایت ہو جو وحشی دے بخیہ گر تو
مرا دامن کسی کی آستیں ہے

"تنہا نشیں" "وحشت سوالی" "اندوہ گیں" علمیت و ادبیت کی چاشنی حادی ہے لیکن یہاں خیالات کی اہمیت الفاظ کی اہمیت سے کم نہیں۔ شاعر محض نئی بندشوں کے اختراع یا علمی الفاظ کی جستجو میں سرگرداں نہیں۔ معانی پر نظر ہے اور انھیں صفائی اور پختگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ خیالات جدیدہ بھی ان کی ترجمانی و کشش پیدا ہیں کی گئی ہے۔

کوئی دیکھے مری وحشت سوالی
انھیں کو مانگتا ہوں ہیں انھیں سے

وحشت سوالی کا کتنا اچھا ثبوت دوسرے مصرع میں پیش کیا گیا ہے۔ پورے شعر میں بھی ایک اچھوتا پن ہے۔ "نگاہِ واپسیں" کو مایوسی کا "تیرِ آخری" قرار دینا پھر بچے رہنا کا ٹکڑا اضافیت پر لطف ہے۔ یہ ہے رنگِ تغزل لیکن اس رنگ میں کامیاب غزلیں کم ملتی ہیں۔

(اُردو شاعری پر ایک نظر)

سید اعجاز حسین ایم۔اے

دورِ حاضر کی غزلوں کا رجحان بھی قابلِ دید ہے۔ اس دور سے پہلے جو خرابیاں غزل میں آگئی تھیں نہ صرف وہ دور ہوئیں بلکہ بعض لحاظ سے وہ خصوصیات بھی نمایاں ہوئیں جو شاید کسی ایک دور میں اُردو میں پیدا کر سکی تھی۔ ایک ایک خصوصیت کو بالتفصیل بیان کرنا تو طوالت کا باعث ہوگا۔ مختصراً موجودہ دور کی غزل گوئی میں حسب ذیل خصوصیات قابلِ ذکر و توجہ ہیں۔

دورِ حاضر میں غزل نے بھی نئے انداز سے فکر سرائی کی۔ تاثر، نرم، داخلی پہلو، ہواری، یک رنگی، جذباتی اور ذہنی کیفیت کے اظہار میں خاص توجہ کی گئی۔ تصنع اور لفظی بھرتی اور بے کار باتوں کے بجائے شعراء نے سادگی، سچائی، روانی، بندش کی چستی اور موسیقیت کو جگہ دی ہے۔ لطیف و پُرمعنی کنایات موجودہ اُردو غزل کی امتیازی خصوصیات سے ہیں۔ عام طور پر غزلوں میں فلسفۂ حیات اور حقیقتِ ہستی کا بیان زیادہ ہو چلا ہے۔ جو واقعات و امور باطن، النظر میں مخصوص و محدود نظر آتے تھے ان کو دورِ حاضر کے نگاہوں نے غیر متناہی اور بے پایاں دیکھ کر شعرا کے کلام میں حیرت کا عنصر بہت بڑھا دیا ہے۔

تصوف نے اصولی اور رسمی پیرایۂ بیان سے قدم بڑھا کر اکثر مقامات پر زیادہ رنگین اور شاعرانہ شکل اختیار کر لی ہے۔ مسائلِ تصوف کا بیان سیکڑوں نئے مضامین سے شعرا کرنے لگے ہیں۔ اپنی شخصیت اور انفرادی لب و لہجہ کو قائم رکھنے کی کوشش بھی دورِ حاضر کی ایک مخصوص چیز ہے۔ متعدد غزلیں عشقِ حقیقی اور مجازی دونوں عنوانوں سے الگ ہو کر محض مسئلہ حیات کے موضوع پر ملیں گی۔

ایک بڑی خصوصیت جو میرؔ اور غزل میں نظر آتی ہے، وہ اس کی حقیقت و واقعہ نگاری ہے۔ مبالغہ سے گریز کر کے ابتذال کے گڑھے سے بچتے ہوئے ہمارے شعرا نے جذبات و تخیل کی پاکیزہ دنیا کو آباد کرنا سب سے پہلا کام سمجھا۔ عموماً وہ ان ہی خیالات کو نظم کرنا چاہتے ہیں جن میں حقیقت و کیفیت ہو۔ نیز شوخی و بے کیف مبالغہ سے بڑی حد تک دور جدید نے محفوظ رکھا۔ فرسودہ اور مبتذل مضامین، تصنع اور محض رسمی باتیں مفقود ہو چلی ہیں۔ جو الفاظ و تراکیب کثرتِ استعمال سے پامال ہو چکی تھیں۔ ان سے گریز اور نئی ترکیبوں اور نئے انداز سے کلام کو سنوارنے کی جدوجہد جاری ہے

زبان سے زیادہ خیالات کی بلندی و پاکیزگی پر زور ہے۔ اس وجہ سے آج کل کبھی کبھی نامانوس ترکیبیں تو ضرور نظر آتی ہیں، لیکن جذبات کی بلندی اور مضامین کی نوعیت پہلے سے اب بہت زیادہ قابلِ قدر ہے۔ نفسیاتی تعلیل و سبب اور اس کے بار بار اثر سے غزل کی دنیا آراستہ کی جا رہی ہے۔ حسنِ تعلیل کی شاخیں زیادہ قاعدے کی اور قابلِ قبول آنے لگی ہیں۔ اس سلسلہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ فلسفۂ حیات و رموزِ ہستی کا بیان زیادہ ہو چلا ہے۔ کبھی کبھی اپنی خامیوں کو بکثیت فسانہ بیان کر دینا غزل گو شاعر نے بھی عاشق کیلئے مستحسن سمجھا ہے۔ حسرت موہانی کا شعر ہے ؎

نہیں آتی جو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

واردات قلب کے فطری پہلو کو شاعر نے اس لیے ضروری سمجھا کہ مبادی عشق کی تلقین ہیں۔ حقیقت پسند ہو جاتی ہے اور اپنے جذبات کا غلبہ ہوتا ہے جو واقعیت سے الگ ہوتے ہیں۔ عہد ماضی میں شعرا مثالیت پسندی سے متاثر ہو کر انسان کی فطری کمزوریوں کا بھی شمار معائب میں کرنے لگے تھے۔ ہر عاشق کو مجنوں و فرہاد کے فسانوی عشق کی کسوٹی پر کسنا چاہتے تھے لیکن عہد جدید میں نفسیاتی اور حقیقی رنگ غالب رہتا ہے۔

تیر و سودا کے زمانے میں داخلی پہلو غزل کی جان سمجھا جاتا تھا مگر دور حاضر میں ایک ایسا بھی زمانہ گذرا ہے کہ جس میں خارجی پہلو کو زیادہ جگہ مل گئی تھی۔ غزل اب ظاہری خدوخال کو اول تو سلمیٰ پیر سمجھ کر اپنے یہاں جگہ ہی نہیں دیتی اور اگر دیتی بھی ہے تو محض تعریف کر کے چپ نہیں ہو جاتی بلکہ ان کے دیکھنے سے جو کیفیات دل پر گزرتی ہیں ان کو بھی لے کر بیان کرنے کی کوشش کرتی ہے

ایک دوسری خصوصیت بھی آج کل کی غزل میں خاص طور پر نظر آتی ہے۔ اب سے پہلے بہت کم شعرا کا کلام ایسا ملے گا جو شروع سے آخر تک ہموار ہو۔ آج کل کے ممتاز شعرا اس کا زیادہ خیال رکھنے لگے ہیں۔ ہم تو یہ کہنے کو تیار نہیں کہ موجودہ غزلوں میں ناہمواری بالکل نہیں ہے مگر اس سے کافی تسکین ہو جاتی ہے کہ ایک بڑی حد تک لوگوں کا کلام اس عیب سے پاک ہے۔

یہ سب تو ہوا مگر قدما کے کلام کی سادگی، بھولاپن، معصومیت اور خالص تغزل کے تیور کو نگاہیں موجودہ غزلوں میں ڈھونڈتی ہیں لیکن مایوس ہو کر واپس آتی ہیں۔ تکلف اور خوشگوار آورد کی جھلک بڑھتی جا رہی ہے۔ سہل ممتنع کی مثالیں بہت کم ہوتی جا رہی ہیں۔ فارسی اور عربی کی نئی ترکیبوں کی تلاش و استعمال میں لوگوں سے کبھی کبھی لغزش ہو جاتی ہے اور قدم ڈگمگا کر راہ راست سے الگ پڑ جاتا ہے۔

موجودہ دور میں غزل کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ حسن و عشق کے تصادم کو زیادہ دیکھا جا رہا ہے۔ سینما میں یا افسانوں میں یا درس گاہوں میں یا سڑک پر ہے گا ہے اس کو دیکھنا بھی تفریح کی بنا پر مبنی ہوتا ہے۔ بہت کم سنجیدگی اور پاکیزگی کی کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ بجز چند شعرا کے زیادہ تر لوگوں کی غزلوں میں جو عاشقانہ اشعار ملتے ہیں ان میں بھی انہماک و گہرائی بہت کم ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کو بہت قریب سے نہیں دیکھا گیا۔ عشق میں مٹ جانے کی صلاحیت بہت کم غزل گو شعرا میں نظر آتی ہے یا تو رسمی باتوں پر اکتفا کرتے ہیں یا ان کا عشق سرسری مشاہدہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ذاتی تجربات اور ان میں عمق کی کمی درد و شدت کو اشعار پر زیادہ نہیں اُبھرنے دیتی۔

ان باتوں کا جواب اس راز میں مضمر ہے کہ غزل اور عشق کا نظریہ موجودہ دور میں وہ نہیں رہا جو اس سے پہلے تھا۔ غزل میں نفسِ قید حیات اور دیگر مضامین کو کافی جگہ دینے کا خیال رہتا ہے۔ محض حسن و عشق کی داستان تک محدود کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا اور عشق کو مثالی درجے پر رکھ کر نصب العین قرار دینا بھی ضروری نہیں خیال کیا جاتا ہے۔ عشق کا روحانی پہلو جسمی خواہشات میں تبدیل ہو چلا ہے۔ یہ نیچرل نظریہ ایسا ہے کہ انہماک و سپردگی کو خود کم کر دیتا ہے۔ بقول فراق ؔ ع

بدلتی جا رہی ہیں بزمِ ناز کی روایتیں

نظموں کے دائرے کو وسیع ہوتے دیکھ کر موجودہ غزل گوئی نے بھی بعض بعض باتوں کو جذب کرنے کی کوشش کی جس کا اثر کچھ اچھا نہیں پڑ رہا ہے۔ اشعار میں مضامین لانے کی وجہ سے کسی قدر تشنگی پیدا ہو گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ مضامین کو پوری طرح واضح کرنے میں ایک ایسا نقص پیدا ہو گیا کہ یہ غزلیں نہ نظم رہتی ہیں اور نہ غزل ہی کے صحیح مفہوم کو پورا کرتی ہیں۔

بلندیٔ تخیل کی کمی کہیے یا معاشی زندگی کی ابتری سے انتشار کا نتیجہ سمجھئے کہ موجودہ غزلوں میں ایسا مجموعہ بھی ہے جس میں غیر عاشقانہ اشعار کی بھرمار ہے۔ دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نظریاتی یا نظموں سے خیال لیے گئے ہیں اور اپنی ساخت کی وجہ سے چند عاشقانہ اشعار کی آمیزش سے ان کے مجموعہ کو بھی غزل کہا جا رہا ہے۔

موجودہ غزل میں ایسے مضامین کافی آنے لگے ہیں جن میں سائنس کے ان پہلوؤں پر زیادہ توجہ کی گئی ہے جو حقائق عالم یا جذبات کی طرف اشارہ کرتے رہتے ہیں جو ہمارے غیر شعوری احساسات کی لہروں کے حرکات و سکنات کا پتہ دیتے رہتے ہیں۔ نفسیاتی مسائل اور اس کے اثرات کا نتیجہ اردو غزلوں میں کچھ کم جگہ نہیں پا رہے۔ نظموں کی طرح یہاں بھی اہتمام لکھی اور خوشگوار یا ناخوشگوار مناظر قدرت کو بڑی خوبی کے ساتھ حقیقی و جذباتی رنگ دے کر پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ جملہ خصوصیات ہمارے نزدیک غزل کی دنیا میں معنوی حیثیت سے ایک خاص اضافہ ہیں جن کا وجود غزل کی تجدید و بقا کا ضامن ہو سکتا ہے۔

(نئے ادبی رجحانات)

آل احمد سرور

ولی کے وقت سے لے کر غالب اور ان کے ہم عصر شعرا تک تقریباً ڈیڑھ سو سال ہوتے ہیں۔ اس عرصہ میں غزل نے تکمیل فن کے تمام مراحل طے کیے اور وہ ہماری شاعری کی سب سے اہم اور سب سے مقبول صنف بن گئی۔ کہا جاتا ہے کہ آزاد اور حالی

نے سب سے پہلے غزل کے خلاف بغاوت کی مگر دراصل آزاد اور حالی غزل سے باغی نہ تھے۔ اس غزل کے خلاف تھے جو جامد و ساکن اور مصنوعی ہو گئی تھی۔ یہی اس معنی میں کہ استادی شاگردی کی روایت صنعتی معیار سے آگے بڑھ کر شاعر کی راہ میں کوئی مثبت کرتی تھی محدود اس معنی میں کہ معاملہ بندی، رمز و ایما، صنائع و بدائع، تصوف و فلسفہ کی آمیزش وغیرہ وغیرہ غزل کے لیے لازمی چیزیں بن گئی تھیں اور مصنوعی اس حیثیت سے کہ ناسخ اور ان کے رجحان مقلد شاہ نصیر نے غزل کو بھی رسمی ورزش یا کسی فن کا ایک زریعہ سمجھ لیا تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ شروع سے غزل یہی مصنوعی اور محدود تھی۔ غزل میں شروع ہی سے بادہ و ساغر کے پردے میں شاہدۂ حق بھی ہے اور شاہدۂ مجاز بھی مگر متاخرین کے رویہ میں صنعتی معیار زیادہ اہم ہو گیا تھا اور قدماء والی قدریں ذرا مدھم پڑ گئی تھیں اس لیے مشاہدۂ گرد و پیش جو غزل میں برابر ملتا ہے، اس زمانے میں آسانیاں نہ رہا تھا۔ اردو کے غزل گو شاعر کے متعلق یہ خیال بہت عام ہے کہ وہ اپنے ماحول سے بے نیاز، اپنے خیالات کی دنیا الگ بنائے رہتا تھا۔ دراصل اس کے خیالات کی دنیا اتنی الگ تھلگ نہ تھی وہ ان تمام چیزوں سے پوری طرح اثر لیتا تھا جو سیاسی، معاشرتی یا اس زمانے کی ادبی زندگی پر اپنا سایہ ڈالتی تھیں۔ وہ اس دنیا کی زنجیروں میں جکڑا ہوا نہ تھا مگر اپنی شاعری میں ان زنجیروں کو اس طرح جھٹکے دیتا تھا کہ قید میں آزادی بھی نصیب ہو جاتی تھی۔ اس کے یہاں انتشار اور پراگندگی ضرور تھی مگر نہ اتنی کہ کوئی خاص فکری خیال یا تصور سرے سے ناپید ہو۔ حسن و عشق اس کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے تھے مگر ان کے سوا کچھ اور چیزوں کا بھی وہ قائل تھا۔ "چیزے دگر" کے لیے وہ غزل سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا تھا اور بادہ و ساغر اور قفس و آشیاں کے پردے میں صرف تصوف اور فلسفہ ہی نہیں بلکہ اور بہت کچھ بیان کر جاتا تھا۔ اردو شاعری میں یہ رمزیت (SYMBOLISM) اس قدر عام تھی کہ اک سے بڑے چھوٹے شاعر نے فائدہ اٹھایا۔ ہاں غلطی بھی کی جو شعرا کے یہاں سوائے محاورہ، روزمرہ، معاملہ بندی، اخلاقی شاعرانہ نصیحتوں، پند و نصائح، صنعتِ مراعاۃ النظیر کے اور کچھ تلاش نہ کیا۔ حالی اور آزاد کے بعد وہ تلخی اور بھی زیادہ ہو گئی جو ہمارے شعراء محسوس تو کرتے تھے مگر عشق پردہ نشیں میں بہلانا چاہتے تھے مغرب کے اثر سے شاعر کے نصب العین میں آزادی ہوئی۔ مغربی ادب پڑھا جانے لگیں، سیاسی حالات بدلے، بدتر ہوتے گئے یہاں تک کہ حکومت کی بساط بھی بدل گئی اور اب نظموں میں وہ باتیں صاف صاف بیان ہونے لگیں جن کے لیے غزل میں پردے تلاش کیے جاتے تھے۔ جدید غزل قدیم غزل سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔ اس کی تشکیل یا فنی صورت وہی ہے۔ صرف زبان اور فن کے لحاظ سے اس میں قدیم غزل کے مقابلے میں تھوڑی سی بے راہ روی آگئی ہے اور اچھے اچھے شاعر خیال کے پیچھے لفظ کی صحت کو قربان کر دیتے ہیں یا کسی شاعرانہ جواز کے پردے میں پناہ لیتے ہیں مگر شاعر کی زندگی پہلے سے بہت بدل گئی ہے۔ اس میں اجتماعی نقطۂ نظر آگیا ہے۔ وہ یک وقت محبوب کی کم نگاہی اور سماج کی زیادتی دونوں کو محسوس کرتا ہے۔ دنیا مغرب ہی میں چھوٹی نہیں ہوئی بلکہ مشرق میں بھی چھوٹی ہو گئی ہے۔ سیاسی حالات نے زیادہ تلخی اور شدت حاصل کر لی ہے۔ برسوں کی غلامی کا بوجھ بعض اوقات گراں معلوم ہوتا ہے کہ ساقی کی مست نگاہی بھی اسے بھلا نہیں سکتی۔ اس وجہ سے اس دور کی غزل میں ایک بیرونی طرح جوش و گرمی کی اور ایک اندرونی طرح ناکامی و مایوسی کی پائی جاتی ہے۔ غزل اور نظم کے درمیان خلیج بھی کم ہو گئی ہے مگر پھر بھی شاعر اور کتابیے غزل میں اور صاف صاف باتیں نظم میں بیان ہونے لگی ہیں۔ اس سے دونوں کو فائدہ ہوا ہے۔

غزل کے میدان میں جو تجربے اس زمانے میں کیے گئے ہیں ان کا ذکر بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ تجربے غزل کے لیے بڑے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایک بڑی کوشش تو وہ ہے جو حالی کے وقت سے شروع ہوئی اور آج تک جاری ہے غزل کی

زبان کو آسان، عام فہم اور بول چال سے قریب لانے کے لیے بہت سے اشخاص نے کوشش کی ہے۔ اس سادگی میں اور میر و درد کے زمانے کی سادگی میں باوجود تھوڑی سی قدر مشترک کے فرق بھی ہے چنانچہ آزاد، آرزو، اثر، حفیظ، اختر وغیرہ کے یہاں جو رجحان ہے وہ خود رَو نہیں، ایک بہت بڑی ادبی تحریک کا نتیجہ ہے اور اس سے زیادہ کسی شاعر کو محفوظ نہ رکھا۔ غزل میں مسلسل مضمون نظم کرنے کا خیال نیا نہیں مگر شاید کسی شاعر نے اتنی پابندی اور استقلال سے اسے نبھانے کی کوشش نہیں کی جو جوش نے کی ہے مسلسل مضمون تو غالب کے یہاں بہت ملتے ہیں اور میر و غالب کی بہت سی غزلیں اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں مگر جوش کا تتبع عام طور پر نہیں کیا گیا اور شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلسل غزل، غزل نہیں رہتی، نظم بن جاتی ہے اور جوش کے ہاں رجز خوانی زیادہ ہے جو غزل کے لیے اتنی موزوں نہیں۔ اس کے علاوہ غزل کے مضامین کو وسیع کرنے کی ایک طرف حیاتی اور دوسری طرف آفاقی رنگ پیدا کرنا بھی اگرچہ یہ روش ابھی عام نہیں ہوئی۔ غالب کی تقلید نے لکھنؤ اور دلی کو، اور فراق سے نشاط دلی اور عام طور پر نئے شعرا کو جوش سے پرہیز سکھایا۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہمارے شاعر فرسودہ زبان برتنے کے بجائے خود زبان ایجاد کرتے ہیں یعنی نوا، انداز، استعمال کرتے ہیں ان میں ان کا جذبہ زیادہ شریک ہوتا ہے وہ اتنے عام نہیں کہ اپنی انفرادیت کھو چکے ہوں۔ اس دور کا تلطف بھی غالب کی تقلید کا نتیجہ ہے۔ ایک عرصہ تک یہ خشک فلسفہ نظم کرنے اور علمیت بگھارنے کے مترادف رہا مگر اب اس کی وجہ سے غزل میں محض جذبہ کے بجائے فکر کا جزو بھی آگیا ہے جو قدیم رنگ پر چلنے والے ہیں۔ وہ بھی اپنی غزلوں میں نیا نکھار اور نئی شگفتگی پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی میں غزلوں کا سرمایہ کسی طرح دوسرے دوروں سے کم اہم نہیں ہے بلکہ بعض حیثیتوں سے زیادہ اہم ہے۔

(نئے اور پرانے چراغ)

احتشام حسین

اُردو غزل گو فی نہ وحشی صنف سخن ہو یا محض روایت پرستی نگو کبھی کبھی اس تاریکی میں ایسے شعلے بھی لرزا اٹھتے ہیں کہ دل کی فضا کچھ دیر کے لیے بے قرار ہو جاتی ہے کیونکہ ہمارے وجدان کی تعمیر میں قدیم روایات کا بہت شاندار حصہ ہے۔ روایتی شاعری میں مقدار اور تعداد کا اضافہ ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ نئی خصوصیتیں مشکل سے پیدا ہوتی ہیں۔ صرف مضبوط اور جاندار انفرادیت رکھنے والے اس دائرے کو توڑنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اپنے عہد و ہی کے اندر رہ کر اپنے سینے کی آگ اور اپنے دل کا گداز اپنی شاعری میں بھر دیتے ہیں پھر چونکہ ان کے پڑھنے والے اپنے معاشی اور معاشرتی روابط کی وجہ سے خود اس ماحول سے طبعی مناسبت رکھتے ہیں اس لیے اثر ان کی خصوصیت بن جاتا ہے۔ ہم اور آپ غزل کی شاعری سے متنفر ہوں، عاجز ہوں، اس کے مٹا دینے کے درپے ہوں، ایام جاہلیت کی یادگار کہہ کر اس دور تہذیب کو اس سے پاک کر دینا چاہتے ہوں، سن کر اثر لینے سے دور بھاگتے ہوں مگر ہمارے ارادوں کا قلعہ توڑ کر کوئی میر، کوئی غالب، کوئی آتش، کوئی حسرت، کوئی جگر، کوئی فانی، کوئی فراق ہمارے وجود کے اندر جھانکتا ہے اور وہ نغمہ چھیڑتا ہے جسے جاری روح قبول کرنے پر تیار ہو جاتی ہے، زندگی کی کوئی گہری حقیقت، غم و درد اور محبت کا کوئی پریشان کرنے والا خیال۔ ان سے بھاگ کر کوئی کہاں جائے گا! ان کی آواز بھیا کرتی ہے اور اشعار دُہرانے پڑتے

ہیں کیونکہ وہ عقل نہیں ان سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرے تو کرے ہمارا دل اب بھی انھیں پناہ دیتا ہے اور غالباً دیتا رہے گا۔ پھر غور کیجئے تو غزل صرف دل کی شاعری ہے بھی نہیں اسے عقل سے گہرا تعلق ہے اور یہی امتزاج اچھا غزل گو پیدا کرتا ہے۔ اس نئے تصور سے چاہے غزل اور (ISM) کا مفہوم مجروح ہوتا ہو یا بدلتا ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ اچھا غزل گو عقل کے مسائل سے بہت زیادہ دور نہیں رہتا۔

(تنقیدی جائزے)

عبادت[1] بریلوی

غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں ارتقائی صلاحیتیں تو موجود ہیں لیکن ان ارتقائی صلاحیتوں کا احساس ذرا مشکل ہوتا ہے وہ بھری اصناف میں تو یہ کیفیت نمایاں ہو جاتی ہے کیونکہ ان کا عام انداز خارجیت سے مطابقت رکھتا ہے۔ توضیح و تفصیل ان کے مزاج کا جزو ہوتی ہے بات کو بڑھانا، استعارہ ہونا ہے لیکن غزل کا انداز اس سے ذرا مختلف ہے۔ غزل میں زندگی کے ہر خارجی پہلو کا انعکاس داخلیت کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ بات اس میں اگرچہ عمومی اور آفاقی انداز میں کی جاتی ہے لیکن توضیح و تفصیل کی جگہ اس میں اشاروں اور کنایوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ان اشاروں اور کنایوں کی تعمیر و تشکیل مختلف عناصر سے ہوتی ہے۔ یہی عناصر غزل کے اہم اجزا ہیں اور انھی کو غزل کی روایات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ غزل اپنی ان روایات کو بہت عزیز رکھتی ہے اور ان کو چھوڑنے کا خیال بھی اسے گراں گزرتا ہے۔ اس کی ارتقائی کیفیت پر انھی روایات کے پردے پڑے رہتے ہیں۔ اس کی پردہ دری ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو غزل کے مزاج سے صحیح واقفیت رکھتا ہے۔

زندگی کی ہر تبدیلی اور تبدیلی کے زیر اثر ارتقائی کیفیت غزل میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔ خارجی طور پر زندگی میں جو تغیر ہوتا رہتا ہے اس کے اثبات غزل میں پوری طرح نمایاں ہوتے ہیں۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیوں کا عکس اس میں صاف نظر آتا ہے اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ وہ اس بدلتی ہوئی زندگی کی عکاسی کرتے ہوئے خود اپنے آپ کو بھی بدل دیتی ہے۔ یہ تغیر غزل میں خارجی طور پر کم نمایاں ہوتا ہے لیکن در پردہ وقت کی تبدیلی کے ساتھ اس کی دنیا بدلتی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غزل اپنی ظاہری ہیئت کو بہت کم بدلتی ہے لیکن اس میں پیش کیے ہوئے خیالات و نظریات باوجود اظہار و بیان کی یک رنگی کے اپنے اندر رنگا رنگی پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ہر دور میں اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے اس لیے زندگی کی ارتقائی کیفیت اس میں جگہ جگہ اپنے آپ کو نمایاں کرتی ہے۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو غزل میں اتنے متنوع موضوعات نظر نہ آتے اس میں خیالات کی اتنی رنگا رنگی نہ ہوتی۔ اس میں سمٹے ہوئے افکار میں اس درجہ پر تلمونی نہ ہوتی۔ غزل کی بڑائی اسی تنوع اور رنگا رنگی میں ہے۔ اسی کے سہارے اس میں وسعت اور ہمہ گیری کی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں۔ غزل کا بنیادی موضوع عشق ہے لیکن صرف اس عشق کی ترجمانی ہی میں اس کی بڑائی

---

[1] انھوں نے ایک کتاب بھی "غزل اور مطالعہ غزل" کے نام سے لکھی ہے۔

نہیں ہے۔ اس کی بڑائی تو اس میں ہے کہ اس نے عشق کی متنوع اور مختلف کیفیات کی ترجمانی کی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے عشقیہ تصورات کو اپنے دامن میں سمویا ہے۔ زندگی کے مختلف ادوار میں عشق کے جو تصورات رہے ہیں ان سب کی تفصیل غزل میں تو مل سکتی ہے نہ صرف یہ بلکہ ایک ہی دور کے مختلف تصورات عشق کی زندگی سے بھرپور تصویریں جس طرح غزل میں ملتی ہیں کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتیں۔ پھر زمانے کے ہاتھوں جس طرح ان کیفیات میں تغیر ہوا ہے۔ غزل نے اس کی عکاسی بھی کی ہے اور غزل نے صرف اپنے آپ کو اسی حد تک محدود نہیں کیا ہے۔ وہ اس حصار سے باہر بھی نکلی ہے جب زندگی نے مادرائی اور مابعد الطبعیاتی موضوعات کو اہمیت دی ہے تو اس نے بھی ان کو اپنایا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو غزل میں تصوف کے مسائل کی ترجمانی ایک مستقل رجحان کی صورت میں نظر نہ آتی۔ تصوف اور اس کے مسائل کو غزل نے بڑی خوبی سے اپنایا اور تصوف نے اس کو وسعت اور ہمہ گیری عطا کی۔ زندگی کے نئے سے نئے مسائل کے لئے غزل کے دروازے کھلے اور یوں جہانیات غزل کا موضوع بننے لگی۔ تصوف کے توسط ہی سے حیات و کائنات کے بے شمار مسائل کی ترجمانی اس میں عام ہوا اور اس طرح اس میں اپنے دامن کو وسیع کرنے کی روایت قائم ہوئی۔ غزل میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل کی ترجمانی جو اس کی تاریخ کے مختلف ادوار میں ملتی ہے اس میں اسی صورت حال کے اثرات بڑے گہرے ہیں۔

ولی اور میر سے لے کر حسرت اور فراق تک اردو غزل اس ارتقائی کیفیت کی داستان نظر آتی ہے اس پہاڑی پودے کا تنہ جڑ بھی موجود ہے۔ سماجی عوامل کی بدلتی ہوئی کیفیات بھی موجود ہے۔ زندگی کے بدلتے ہوئے تصورات کی حقیقت بھی موجود ہے لیکن ان سب پر "بادہ و ساغر" اور "شیشہ و ساغر" کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔

"ماہ نو" فروری ۱۹۵۳ء

وقار عظیم

کیا غزل میں اس بات کے امکانات ہیں کہ وہ ہر آن آگے بڑھتے ہوئے زمانہ کا ساتھ دے سکے اور کیا اس کے مزاج میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ اپنے آپ کو بدلتے ہوئے ماحول اور حالات کے سانچے میں ڈھال کر ان سے مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کر سکے؟

اس سوال کا ایک بالکل غیر منطقی جواب تو یہ ہے کہ اردو غزل کی دو سو اور دو سو برس کی زندگی خود ایک ایسی شہادت ہے جس سے غزل کی ارتقائی صلاحیتوں کا یقین پیدا ہوتا ہے۔ ولی سے لے کر حسرت اور مگر بلکہ حفیظ ہوشیارپوری اور فیض تک زمانہ کے ان گنت اونچ نیچ اور انقلاب کے ساتھ غزل کو جذب و سلوک کی نہ جانے کتنی منزلیں طے کرنی پڑی لیکن ہر منزل میں غزل نے اپنی انفرادیت اور امتیازی شان برقرار رکھی اور گردوپیش کی سیاسی، سماجی و روحانی فضا کو اپنے اندر سمو کر برابر آگے بڑھتے ہوئے زمانہ کے ساتھ آگے بڑھتی رہی لیکن اس طرح کہ اپنی آن بان میں سرمو فرق پیدا نہیں ہونے دیا۔ زمانہ کچھ سے کچھ بنا لیکن غزل غزل ہی رہی۔

زمانہ کے ان انقلابات کے علاوہ ادبی زندگی میں بھی انقلاب آئے اور کبھی کبھی تو ان انقلابات کا مقصد ہی یہ تھا کہ غزل کے

راج کو ختم کر کے کسی اور کو اس کا تخت و تاج سونپ دیا جائے۔ غزل کو زندگی کی ہر اچھی قدر کا نشان گردانا گیا اور ملک و ملت، قوم اور انسانیت پر ایک گہری مسلمانی دے کر غزل کے خلاف سخت سے سخت محاذ قائم کیے گئے۔ یہاں تک کہ غزل کے خلاف تلوار اٹھانے اجتہاد اور انقلاب پسندی کی شان بن گیا لیکن غزل پر ان فتووں یا نعروں نے مطلق اثر نہ کیا۔ وہ ہر ایسے محاذ کو ریت کی دیوار سمجھ کر اس پر اور اس کے دلیلوں پر مسکرا دی ہے۔ اس کی اس مسکراہٹ میں استہزا بھی تھا اور تجربہ اعتمادی بھی اور اس کا یہ استہزا اور یہ خود اعتمادی ہمارے اپنے زمانے میں ہم نے اکثر اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اعلیٰ زندگی میں شاید کوئی اور جامعیت اتنی نہیں پائی جاتی جتنی ہماری زندگی نے پچھلے پانچ چھ برس میں ایک ایسا انقلاب دیکھا ہے جس کی مثال انسانی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی لیکن اس عہد آشوب و دور سے گذر کر بھی غزل نے اپنی انفرادیت کو برقرار اور قائم رکھا ہے ——— غزل کی دنیا اب بھی اچھے غزل گویوں سے خالی نہیں ہوئی۔ اب بھی اس کے آسمان پر مسلسل وفقوں کے ساتھ نئے ستارے روشن ہو کر فضا کو منور بنانے کے کام میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ غزل اپنی دو صدی کی روایت کے تسلسل کے باوجود نئے زمانہ کی ضرورتوں اور نئے مذاق اور مزاج کے تقاضوں سے ہم آہنگ نظر آ رہی ہے۔ اس میں زندگی کے دعائم کی علامتیں زیادہ مستحکم ہو رہی ہیں۔

تاریخ کی یہ شہادت ایک طرف ہے ایسی شہادت جسے میں نے غیر منطقی شہادت کہا تھا لیکن درحقیقت۔ کے پیچھے ایک بہت بڑی منطق بھی ہے۔ وہ منطق غزل کی ان خصوصیتوں سے وابستہ ہے جو بہر حال (زمان و مکان کی قید و بند سے آزاد رہ کر) اس کا جزو لازم ہیں۔ غزل میں فن اور ہیئت کے اعتبار سے بھی اور موضوع کے نقطۂ نظر سے بھی کچھ ایسی باتیں ہیں جو اسے ہر زمانہ کی چیز بناتی ہیں اور جن کی بنا پر اس میں ایسی لچک پیدا ہوتی ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات، ہر طرح کے ماحول اور ہر طرح کی فضا کو اپنے لیے سازگار بنا لیتی ہے اور اس کی اثر انگیزی کسی ایک خاص طرح کا مزاج اور رجحان رکھنے والوں کے لیے مخصوص یا کسی خاص طبقہ یا گروہ تک محدود نہیں ہوتی۔

فن کے اعتبار سے سب سے پہلی چیز غزل میں بیان کا ایجاز ایک ایسی خصوصیت ہے جس سے غزل کے علاوہ نثر اور نظم کی ہر صنف محروم ہے۔ غزل کے ایک شعر میں زندگی کی بڑی سے بڑی حقیقت اور دقیق سے دقیق نزاکت کو انتہائی حسن لطافت اور اثر کے ساتھ بیان کر دینے کی یہ قدرت اسے تقریباً وہ شرف بخشتی ہے جو کسی اور صنف کو کسی زمانہ میں میسر نہیں آیا۔

ایجاز کی اس قابلِ رشک صفت کے علاوہ ایمائیت اور رمزیت دوسری خصوصیت ہے جسے غزل کی روایت نے اپنا جزو خاص بنایا ہے۔ غزل اس وقت تک غزل ہی نہیں بنتی جب تک وہ اس رمزیت اور ایمائیت کو اپنا نہ بنا لے۔ اس کا یہ رمزی اور ایمائی حسن اسے تصور آفرینی اور تاثر انگیزی کی دوسری قابلِ رشک خصوصیت بخشتا ہے اور شاعر اپنی بات کہنے کے لیے جو اشارے، کنایے، تشبیہیں، استعارے اور حسنِ بیان کے دوسرے وسیلے کام میں لاتا ہے۔ ان میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ ہر دل کو ان میں اپنی دھڑکن سنائی دیتی اور اپنی کسک محسوس ہوتی ہے۔ صوفی، فلسفی، رند، عاشق، مصلح اور سیاست دان سب ایک ہی اشارے میں اپنے اپنے دل کی بات پا لیتے ہیں۔ وہی شاعر جو فطرت کا ہم راز و پرستار بن کر یہ کہتا ہے کہ ؎

اتنا مانوس ہوں فطرت سے کلی جب چٹکی — جوشؔ
جھک کے میں نے یہ کہا مجھ سے کچھ ارشاد کیا

یا ؎

فطرت پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں
جگر

جب عاشق، فلسفی، سیاست داں اور شاعر کا ترجمان بنتا ہے تو کلی اور پھول کے اشاروں میں ان کے دل کی بات اس طرح ادا کرتا ہے ؎

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
میر

وہ توڑتے ہیں تو کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں
وہ روندتے ہیں تو سبزہ نہال ہوتا ہے
اکبر

غزل اپنے اس ایمائی انداز میں جو غزل کی فطرت ہے زندگی کی بہت سے تعلیمی اور سماج سے داخلی پہلوؤں اور کیفیتوں کی ترجمانی اور عکاسی کرتی ہے۔ جذبہ اور احساس کی نزاکت، ذہن اور نفس کی جنبش اور الجھن، سیاسی معاشرتی زندگی کی ہر وہ کیفیت جو انسان کے دل پر گداز اور تاثیر پیدا کرتی، جگر کو دردآشنا بناتی اور آنکھوں سے اشک حزیں کا خراج وصول کرتی ہے۔ غزل کا موضوع ہے ——— اس کا ایک ایک شعر زندگی کی مسادی وحدتوں کا حامل بھی ہے اور اس بات کو جس طرح غزل سمجھ سکتی ہے کہ ان ساری وحدتوں کو ہر شخص کے دل کی گہرائیوں میں جذب کر دے۔

غزل کی یہی خصوصیتیں ہیں جو اسے ہر دیوانہ اور فرزانہ کے دل کی ترجمانی اور رازداری کا منصب عطا کرتی ہیں۔ ہر حادثہ کو اپنا بنا لینا، غزل کی سرشت اور ہر ایک کا رمز شناس بن کر رہ جانا اس کی فطرت ہے۔ صرف غزل کے نشتر سخن اور پڑھ کر ہی آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس میں اس کے دل کی بات کہی گئی ہے اور صرف غزل ہی کے نشتر پڑھ اور سن کر اسے یہ معلوم اور محسوس ہوتا ہے کہ اس کے زخموں میں ٹھنڈک پڑ رہی ہے اور کوئی نامعلوم قوت اس کے دل اور جگر کے چاکوں کو رفو کر رہی ہے۔

اور یہی سب کچھ ہے جس نے غزل کو یہ "انتقائی صلاحیت" بخشی ہے کہ وہ زندگی کے ہر دور میں، اس کی ہر رفتار کے ساتھ قدم ملا کر چلتی ہے، نہ پیچھے رہتی ہے نہ آگے نکلتی ہے اب تک اس نے ہمیں جو کچھ دکھایا ہے۔ اس کی بنا پر یہ حکم لگانا کچھ عجب نہیں کہ اس کی یہی سرشت اسے ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

(ماہ نو)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

غزل میں دو عناصر ایسے ہیں جنھوں نے اب تک غزل کا ساتھ دیا ہے اور جو بڑی حد تک غزل کو بحیثیت ایک صنف شاعری زندہ رکھنے کے ذمہ دار ہیں۔ ایک شدید قسم کی داخلیت اور دوسرے اس داخلیت سے براہ راست متعلق ایک خاص قسم کی اشاریت جسے اب غزل کی روایت کا نام دیا جاتا ہے۔ حالی کے عہد سے اردو غزل کے خلاف تنقید کا ایک طوفان اٹھا اور اگرچہ حالی کا مقصد صرف غزل کی اصلاح تھی لیکن شاعر اور نقاد یہ سمجھے کہ حالی نے دل زندہ کی کہانی جس دن تختہ کی شب کے رولوں کی وجہ سے کیل اسی دن بند ہوگئیں۔ عشق اور محبت کے سوتے سوکھ گئے، حسن اور جوانی ابدی نہیں سے ہم کنار رہ گئے اور اس طرح غزل کا دور ختم ہو گیا۔ شاعروں کا کام بیواؤں کی شادی کرانا، میخانوں کے لیے چندہ جمع کرنا، کسی کا نفرنس کے آغاز یا اختتام پر ترانہ کا فرض ادا کرنا رہ گیا ہے۔ یہ سب نہایت مبارک افعال ہیں لیکن ان پر شاعری کی عمارت کیوں کھڑی کیجیے۔ بہرحال حالی سے اقبال تک غزل پر ایک آزمائش کا دور گزر گیا لیکن اس میں بھی غزل کا شعلہ بالکل بجھا نظر نہیں آتا، لکھنؤ میں آخر آخر تک عزیز، آرزو اور صفی سے لے کر باقی پر عظیم حسرت، اصغر، فانی اور جگر نے غزل کو اپنے خون سے سینچا اور سنوارا۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا داخلیت اور روایت کو میں جان نقاد سمجھتا ہوں اور غزل کی تاریخ بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ اردو غزل کے عہد زریں یعنی میر و مرزا کے دور کا جائزہ لیجیے۔ اس عہد کے خاص سیاسی، ذہنی اور معاشرتی حالات پیش نظر رکھیے۔ معاشرہ میں ایک بے چینی، ایک کرب، ایک اضطراب کی کیفیت نظر آتی ہے۔ سیاسی انقلاب، درباری سازشوں اور معاشی بدحالی نے ایک بحران پیدا کر دیا تھا۔ اس میں بے اطمینانی سب سے نمایاں عنصر ہے۔ امرا کے دربار آئے دن بنتے بگڑتے رہتے تھے۔ ولی کے تخت پر نام نہاد بادشاہ کٹھ پتلیوں کی طرح چڑھتے اترتے، تجار اور پیشہ ور مفلس اور ناداری کا شکار تھے تو پھر شاعروں کو دن پوچھتا، ان کی قدردانی رئیسوں کی مجلسوں اور درباروں کی محفلوں تک محدود تھی۔ یہ نظام درہم برہم ہوا تو یہ بھی بے سروسامان ہو گئے۔ قدرتی طور پر یہ ایک شدید قسم کے داخلی ردعمل کا شکار ہوتے ہوں گے اور یہ شدت غزل کے ان بے شمار مضامین سے ناپی جا سکتی ہے جو میر کی کلیات میں موجود ہیں۔ تباہی و بربادی، غارت گری، قیامت، ہنگامۂ قیامت، خون، آگ، برق و باراں، طوفان، موج، گرداب کے سارے مضامین اسی داخلی کرب و بے چینی کی تفصیل بیان کرتے ہیں جو شاعروں کی رگ و پے میں سما رہی تھی۔

اور اس کے بعد غزل کا ایک اور دور ہمارے سامنے آتا ہے۔ ناسخ اور آتش کے زمانے کی لکھنوی غزل جو اپنے انداز اور آہنگ میں میر کی غزلوں سے بالکل مختلف ہے۔ ان غزلوں کو بعض ناقدین نے قصیدہ طور کہا ہے۔ بعض کو شبہ ہے کہ انھیں غزل کہنا بھی چاہیے یا نہیں کیونکہ ان میں محبوب کی وصف نگاری کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا۔ بہرحال ناسخ، آتش اور ان کے بے شمار شاگردوں نے اصلاح زبان کے لیے جو کوششیں کی ہیں ان کا پورا احترام کرتے ہوئے یہ تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہیں کہ شاعری اگر شدت جذبات کے اظہار کا وسیلہ ہے تو ان حضرات کی شاعری کسی قسم کے جذبے سے یکسر محروم ہے۔ اگر اس زوال کے اسباب کا اندازہ لگایا جائے تو ذہن فوراً اس پر تکلف معاشرہ کی طرف منتقل ہوتا ہے جو لکھنؤ کا دوسرا نام ہے اور جو غزل کے علاوہ بھی رقص و غنا، گفتار و کردار میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ یہاں تکلف، احتیاط، رکھ رکھاؤ بلکہ تصنع جذبات کی شدت پر غالب پا لیتے ہیں اور جذبات امنڈتے بھی ہیں

نئی راستوں اور وسیلوں کو تلاش کرتے ہیں جو اس خاص معاشرے نے ان کے لیے غیر ضروری قرار دیے ہیں۔ پھر پرانا بھی نیا ہوتا ہے۔ حزنی و خطاب، آہ و واویلا کی غزلیں دیکھیے۔ غزل اپنے اصلی رجحان کی طرف رجعت کرتی ہے۔ میر کی آواز کی اعتراف کیا جاتا ہے۔ جلوی شاعروں کا تو ذکر ہی کیا۔ میر کی روایت دلی کی روایت تھی۔ لکھنؤ میں مرزا اور ناسخ میر کی عظمت کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہی ہوا کہ غزل پھر اپنے اصلی رنگ پر آگئی۔ حسرت، اصغر، فانی اور جگر اس نشاۃ ثانیہ کی غزل کے استاد اور امام ہوئے لیکن اس نشاۃ الثانیہ کا شباب ۱۹۳۵ء سے پہلے نظر نہیں آتا۔ اس سال جو سیاسی انقلاب ہوا اس نے معاشرہ کو بھی ایک نیا دستور اور ایک نیا انداز فکر بخشا۔ پاکستان و ہندوستان کو بڑی امیدوں اور بڑی جدوجہد سے آزادی نصیب ہوئی — وہ آزادی جس سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں، بہت سی آرزوئیں تھیں جن کی شاید اس آزادی پر کوئی جوہر ملی لیکن جو ہمارے لیے نئی تھیں بہت سی امیدیں ہنوز نقشۂ تکمیل ہیں۔ پھر فرقہ وارانہ فسادات اور بڑے پیمانے پر آبادی کا تبادلہ ایسے سانحات ہیں جن سے تہذیب و ثقافت کی روح گھائل ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ عورتوں کی عصمت دری، بچوں کا ہولناک قتل، بڑھوں کے لیے کسی دیرانے کی صورت بھٹکتے گھومتے کا اچنبھا اور لہلہاتے کھیتوں کا چھوٹنا ایسے سانحات ہیں جو آسانی سے بھلائے نہیں جا سکتے۔ وہ الم جس کو انسان کو گزرے ابھی مدت گذری ہے کہ سکے آپ پر اس کے نقوش نظر آتے ہیں۔ وہ تمنا اور ارمان جو جذبات میں پیدا ہوا تھا باقی ہے اور اس نے غزل کو ایک نئی توانائی بخشی ہے۔

غزل کا دوسرا پہلو اس کی رمزیت ہے۔ اس کا ایک سبب جملہ فنون لطیفہ کی لطافت پسندی یا استعارہ پسندی ہے۔ ہلکے ہلکے تعوش دور سے آنے والی مدہم اور مبہم صدائیں ہمیشہ زیادہ کشش رکھتی ہیں۔ شاعری میں یہ پردہ جاں لطافت ہے اور جذبات جب انتہائی شدید اور ذاتی قسم کے ہوں تو اس پردہ داری کی اور بھی ضرورت پیش آتی ہے ایک ایسی سوسائٹی میں جہاں سولہ سالہ بیان بیوی کے ایک جوان اور ایک عورت کا عشق سماج کی نظر میں نہایت قبیح فعل ہو لیکن جہاں بھڑکنے والے دل اور سرکار گھر والے جو عشق و عاشقی کا اظہار پردہ سے ہی میں ہو سکتا ہے۔ اس پردہ داری کی مجبوری آئی بھی ہے کہ بعض عاشقوں نے ہر عورتوں سے عشق کرتے کرتے آخر میں اردوں کو اپنا محبوب بنایا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض غزل گو شعراء نے امرد پرستی بھی کی ہو لیکن اس کا بنیادی سبب یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ جنسی تشکیل کے صحت مند زوائد مسدود ہونے کے باعث جنسی جذبے نے بے راہ روی اختیار کی ہو۔

اس مسئلے سے ہٹ کر غزل کی اشاریت اور رمزیت دیکھیے۔ میر کا زمانہ سیاسی سماجی اور ذہنی انتشار کا تھا لیکن بیدار دلوں کا بھی تھا شخصی آزادی کا تصور یا تحریر و تقریر کی آزادی کے حقوق کے نعرے اس وقت تک بلند نہیں ہوئے تھے، پاسبان کا ڈر اور محتسب کا کوڑا ہر وقت لگا رہتا تھا یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی غزل میں جگہ جگہ کچھ گھٹن سی محسوس ہوتی ہے۔ بار بار قفس، صیاد، دام، زنجیر، حلقۂ زنجیر، زندان، یوسف اور اسی قسم کے مضامین آتے ہیں۔

اسی زمانے میں دلی پامال ہوئی اور نادر کی غارت گری سے دلی کا رہا سہا سہاگ (باہ یا) اس چمن کی ویرانی پر ہزاروں غزلوں نے نوحہ کیا ہے۔ اس نوحے میں پھر انفرادی عصر اور اسی قسم کے بہت سے اشارے پائے جاتے ہیں۔ پھر دہلی کی تباہی کے بعد ارباب علم، فضل لکھنؤ اور دوسرے مقامات کا رخ کرتے ہیں۔ وطن چھوٹتا ہے نیا وطن قفس معلوم ہوتا ہے۔ یہ سانحات کچھ کے پھر دگرگوں پیش جمع ہوتے ہیں۔ اپنا اپنا لولیاں بولتے ہیں۔ سننے والا سنتا ہے اور اس کا دم گھٹتا ہے یہ بھی مجبوری ہے کچھ نہیں کر سکتا اور

کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہاں بھی یہ معجزیت ہی اس کا سہارا بنتی ہے۔

اور آج ہم پھر اسی قسم کے حالات اور واقعات سے گذر رہے ہیں۔ سیاسی انقلاب کے بعد حالات اور واقعات ابھی معمول پر نہیں آئے۔ فضا میں ٹھہراؤ پیدا نہیں ہوا۔ یقین اور گمان میں کشمکش ہے، پرانی قدروں اور نئے تقاضوں میں تصادم ہے۔ نئے نئے عناصر کی ترکیب سے ایک نیا تصور تشکیل پا رہا ہے۔ بعض لوگ بہت مایوس ہیں اور بعض ابھی تک بہتری کی امید میں زندہ ہیں۔ اس تمام صورتِ حالات نے جو جذباتی ردِ عمل کیا ہے وہ پھر غزل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ آج جب میں ایسی غزلیں پڑھتا ہوں جو حیدرآباد سے شائع ہو کر کہی گئی ہیں تو مجھے پہلے سے زیادہ غزل کی ہمہ گیری، اس کی وسعت اور ابدیت محسوس کرتا ہوں۔

"ماہِ نو" جنوری ۱۹۵۳ء

سید باقر حسین

پرانی اور فرسودہ غزل کا دور رحمت ہوئی ختم ہو چکا۔ اب کنگھی چوٹی، محاطہ بندی اور سستی جذباتیت کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ایسی غزل میں کسی ارتقاء کا امکان نہیں پیدا ہوتا۔

فرسودہ غزل گوئی کے بعد نظموں کا دور آیا۔ ہزاروں نظمیں کہی گئیں اور خوب خوب کہی گئیں۔ نظموں کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے کسے خیال آسکتا تھا کہ غزل دوبارہ زندہ ہوگی لیکن ہم آپ سب دیکھ رہے ہیں کہ غزل ایک نئی حسن و رعنائی کے ساتھ جلوہ گر ہو رہی ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ زندگی کے ہر تجربے کی طرح شعر و ادب میں بھی عمل اور ردِ عمل کا اصول کارفرما ہے۔ لوگ جب ایک چیز سے سیر ہو جاتے ہیں تو دوسری چیز کے متلاشی ہوتے ہیں۔ نظموں کا دور پرانی غزل گوئی کے خلاف ردِ عمل تھا اور اب جدید غزل نظموں کے سیلاب کے خلاف ردِ عمل ہے۔ بہت لوگ ہیں جو غزل اور نظم کی خوبیوں کو پرکھنے کے بعد کوئی متوازن رائے قائم کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ غزل اور نظم محض صوری حیثیت سے مختلف نہیں ہیں بلکہ ان کے موضوع، ان کے کیف و کم اور ان کی اثر آفرینی میں اختلاف موجود ہے۔ اپنے اپنے مقام پر دونوں ضروری ہیں۔ بعض خیالات کے اظہار کے لیے نظم کا سانچہ ٹھیک ہے اور بعض کے لیے غزل کا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم دونوں کی جُدا جُدا خوبیوں کو ملحوظ رکھیں۔ اگر ہمارا یہ رویہ ہو تو ہم نہ غزل سے سیر ہوں گے اور نہ نظم سے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ غزل کی مقبولیت کا جدید دور کہاں تک باقی رہنے والا ہے اور آیا اس صنفِ کلام میں مزید ترقی کی گنجائش ہے یا نہیں؟ میرا خیال یہ ہے کہ اگر ہم غزل کی خصوصیتوں کا بغور جائزہ لیں تو خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ غزل کہاں تک بقا اور ارتقا کی صلاحیت رکھتی ہے۔ میرے نزدیک غزل کی خصوصیتیں چار ہیں:-

۱۔ تغزل

۲۔ صوت و آہنگ

۳۔ ایمائیت اور رمزیت

۴۔ اختصار اور جامعیت

تغزل کی صحیح تعریف قریب قریب نہیں ہوئی۔ میرے نزدیک غزل کی مخصوص زبان اور اسلوب کو تغزل کہتے ہیں۔ الفاظ اور ترکیبوں کا صحیح، خوبصورت، سبک اور مانوس ہونا تغزل میں شامل ہے۔ غزل کی یہ خصوصیت جذباتی شاعری کی جان ہے اور غزل تو ہے ہی جذباتی شاعری۔ یہ نہیں کہ غزل میں ذہنی آسودگی کا سامان نہیں ہو سکتا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ غزل کا مضمون خواہ کچھ ہو اس کی اپیل دماغ کی بجائے دل سے ہوتی ہے۔ عام انسانی نفس میں جذبات کا تناسب فکر کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے اس لیے جب تک انسان اپنے جذبات کے اظہار کے لیے کسی ذریعہ کا محتاج رہے گا اس وقت تک اسے تغزل کی ضرورت رہے گی۔ دوسرے لفظوں میں جہاں جذبات ہوں گے وہاں تغزل بھی ہوگا۔ خواہ وہ ہائی غزل کی صورت میں ہو یا انتخابی کی سانیٹ کی شکل میں۔ اس لحاظ سے تغزل غزل کے ارتقا کا ضامن ہے۔

غزل کے صوت و آہنگ کا دارومدار اس کے وزن، بحر، قافیہ، ردیف اور مترنم الفاظ کے استعمال پر ہوتا ہے۔ یہ چیزیں کم و بیش ہر صنف سخن میں ہوتی ہیں لیکن غزل اور دیگر اصناف سخن کے صوت و آہنگ میں فرق یہ ہے کہ غزل میں مترنم الفاظ کے استعمال کی گنجائش زیادہ ہوتی ہے۔ یہ علاوہ بریں اس لیے کہ جن میں رزم و بزم کی تکلف صورتیں زیادہ متنوع الفاظ کے استعمال کی متقاضی ہوتی ہیں۔ غزل کی اس خصوصیت سے بھی اس کے ارتقائی سلسلے میں روشنی پڑتی ہے۔ صوت و آہنگ کے مناسب استعمال سے جذبات کے تاروں کی تخفیف سے تخفیف ارتعاش بھی غزل کے اشعار میں بیکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے جذبات کا تنوع اور ان کا کیف و کم ایسے ساز کا متقاضی ہے جس کے پردوں پر ہر لمحے کی تخلیق ہو سکے۔ ایسا ساز غزل کے سوا کسی اور صنف کلام میں نہیں مل سکتا جب تک جذبات کی نزاکت کا احترام ہے، اس وقت تک غزل کی ضرورت بھی باقی رہے گی۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ جذبات کی سادگی کم ہوتی جا رہی ہے اور ان میں پیچیدگی اور گہرائی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ غزل کے صوت و آہنگ کی خصوصیت ان تغیرات کا ساتھ بخوبی دے سکتی ہے لہٰذا اس کے ارتقائی ایک صورت یوں بھی نظر آتی ہے۔

غزل کی سب سے اہم خصوصیت اس کی ایمائیت اور رمزیت ہے۔ یہ خصوصیت چند مخصوص علامات کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ علامات وہی ہیں جو سطح میں لوگوں کے نزدیک غزل کی فرسودگی کا باعث ہیں۔ یعنی گل و بلبل، قفس و آشیانہ وغیرہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان علامتوں کے لفظی معنی سے یکسر اتنا دور ہے کی بدمذاقی ہے۔ جدید غزل میں ان علامتوں کو نئے نئے معنوں میں استعمال کیا جا رہا ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ علامت کو اگر محض علامت سمجھا جائے تو غزل کے وہ اشعار جن میں ایمائیت اور رمزیت ہے بے اندازہ پُرمعنی ہو جائیں۔ ایسے اشعار کو متن کی مناسبت سے بے شمار نئے معنوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ یہ عمل استعمال پر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا یہ شعر خاص اسی موقع کے لیے کہا گیا تھا۔ غزل کے اشعار کی یہ خصوصیت انھیں موجودہ سیاسی اور سماجی مسائل کی ترجمانی کے لیے نہایت موزوں اور کارآمد بنا دیتی ہے۔ ذیل کے شعر میں ہے تو ہمارا اور مجھے ہمارا کا ذکر لیکن دیکھیے کہ علامات کے استعمال نے اسے سیاسی شعور کا کس قدر کامیاب نمونہ بنا دیا ہے ۔۔

کچھ اس طرح سے بہار آئی ہے کہ بجھنے لگے ہوائے لالہ و گل سے چراغ دیدہ و دل

غزل کے ارتقا کے لیے اس کی محض یہ خصوصیت کافی ہے۔ غزل کی یہ علمی خصوصیت اس سے کیسا شعر کا اختصار اور

جامعیت ہے۔ غزل کے اشعار میں تفصیل و تشریح کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کہانی کا نتیجہ ہوتا ہے کہانی نہیں ہوتی۔ تجربے کا نچوڑ ہوتا ہے خود تجربہ نہیں ہوتا۔ تاریخ کا ماحصل ہوتا ہے تاریخ نہیں ہوتی۔ آہ ہوتی ہے داستانِ غم نہیں ہوتی۔ غزل کے شعر میں قوموں کے عروج و زوال کی داستان صرف ایک مصرعے میں بنائی جاتی ہے ع شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

انگریزی میں اگرچہ غزل نہیں ہوتی لیکن بعض اشعار میں تغزل ضرور ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

OUR SWEETEST SONGS ARE THOSE WHICH TELL OF SADDEST THOUGHT

یعنی ؎ ہمارے وہی نغمے ہیں سب سے شیریں ہے جن میں بیاں سوزشِ اہلِ دل کا

غزل کی یہ خصوصیت بھی اس امر کی شاہد ہے کہ اس میں ارتقا کی بے شمار صلاحیتیں موجود ہیں۔

انسانی تجربوں اور تصورات کے بیان میں آفاقیت، تجریدی اور غیر اشکالی کیفیت پیدا کرنا صرف غزل کی تکنیک میں ممکن ہے میرے خیال میں اپنے تکنیک کی ضرورت ہمیشہ رہے گی بلکہ موجودہ زمانے کی عدیم الفرصتی اس بات کی متقاضی ہے کہ یہ تکنیک دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں میں بھی اختیار کر لی جائے۔ اگر ہماری غزلوں کے کامیاب تجربے غیر زبانوں میں ہونے لگیں تو عجب نہیں کہ دوسری زبانوں میں بھی غزل گوئی ہونے لگے۔ (ماہِ نو، فروری ۱۹۵۳ء)

فیض احمد فیض

نوادرِ شعر و سخن کا کل ہیں اور یہ بیش بہائے دور و دراز

یوں تو اس شعر میں کئی تغزلی رعایتیں موجود ہیں جنھیں روایتی غزل سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن شعر کی خوبی کا انحصار ان تغزلی رعایتوں پر بہت کم ہے۔ اس کا انحصار اس دھندلی سی جذباتی فضا پر ہے جو الفاظ کے اصوات و معانی مل کر پیدا کرتے ہیں۔ اسی فضا میں تصورات سے کئی کڑیاں بچھڑ جاتے ہیں اور ادھر سے ادھر نہیں جاتے ہیں اور یاد نہیں آتے کئی نئے کے کئی نقشے، کئی زاویے دیدے دھیرے نظر کے سامنے ابھرتے ہیں اور تکمیل ہونے سے پہلے محو ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف الفاظ کی تخلیقی تراش اور تکنیکی اور دوسری طرف معانی کی دسیع اشاریت۔ یہی تو یہ امتزاج ہر اچھے کلام میں لازمی ہے لیکن غزل کا انتخاب اور جامعیت اس کی خاص طور سے متقاضی ہے۔ یہ چند سطری سے نسبتاً مواقع تک ہر بڑے غزل گو کا اپنا اپنا رنگ، اپنے اپنے مضامین اپنا اپنا طریقِ اظہار ہے لیکن اس تنوع کے باوجود جو اعظم یہ تخصوص خصوصیات ان سب کے کلام کا خاصہ ہے اور اسی خصوصیت کو ہم نے غزل کے مزاج سے مخصوص کر لیا ہے۔

(سرآغاز، نوائے گل)

سردار جعفری

ترقی پسندوں نے غزل کے خمیر جھوری، تاریک اندیشی، فراری، کھوکھلے اور سوقیانہ مضامین کی مخالفت کے بجائے غزل کی صنعت ہی کو غیر جمہوری اور بے کار قرار دے دیا۔ اس رجحان کی امامت شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی نے کی جو

حالی کی طرح بڑی اچھی غزلیں لکھ چکے تھے اور غزل کی پرانی روایات کو اپنی شاعری میں سمو چکے تھے۔ حضرت جگر مرادآبادی نے جب ۱۹۲۶ء میں اپنی ایک غزل میں ترقی پسندوں کے مخلوص اور نیک پر چھا لیا اور انھیں قوم و وطن کا بہت پرست قرار دیا اور اس کے بعد مرزا یگانہ چنگیزی نے غزل کے سوا کسی اور صنفِ سخن کو شاعری ماننے ہی سے انکار کر دیا اور ترقی پسند ادیبوں اور ادب کے لیے انتہائی غیر ادبی زبان استعمال کی تو غزل کی مخالفت کے رجحان نے اور زور پکڑ لیا لیکن اس سلسلے میں ترقی پسندوں نے مجموعی طور سے کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اسی لیے ان غزل کی مخالفت بھی ترقی پسند تحریک کا پروگرام نہیں بنی۔ غزل مرصوع بحث رہی اور دنیا ادب اور رسالے سے ترقی پسند رسائل کے صفحات پر غزل کی مخالفت اور موافقت میں مضامین شائع ہوتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل پر حملے بھی ہوتے رہے اور ترقی پسند غزل کہی بھی جاتی رہی اور یہ واضح ہے کہ اس زمانے میں ترقی پسند غزل میں صرف جگر اور حسرت نے نہیں بلکہ ترقی پسند شاعروں سے بھی کئی اچھی غزلیں فراق گورکھپوری، مجاز، فیض، جذبی، مجروح، ساحر، کیفی اور اختر انصاری کے نام گنائے جا سکتے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ غزل کی مخالفت سب سے پہلے حالی نے شروع کی تھی۔ قطع نظر اس کے کہ حالی کا نظریہ کہاں تک صحیح یا غلط تھا ترقی پسند ادب کے معترضین حالی کے لیے دلیلیں تلاش کرتے ہیں اور ترقی پسند ادیبوں پر غیر ادبی الزامات لگاتے ہیں ..... ترقی پسند تحریک سے نظموں کے ساتھ ساتھ غزل پر بھی اثر پڑا ہے۔ اب الفاظ، جذبات اور مجموعی تصورات کی جگہ اجتماعی جذبات اور سماجی احساسات آ رہے ہیں۔ سیاسی مسائل بھی غزل کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں۔ ایک طرف تو روایتی تشبیہوں اور استعاروں کو بالکل اور بالکل استعمال ہے اور دوسری طرف نئے الفاظ اور نئی ترکیبوں کی آمیزش سے جو زندہ تازگی حاصل کی گئی اس کی کوشش میں وہ اکثر کامیاب ہوئے ہیں۔ فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، جاں نثار اختر، جذبی، حفیظ ہوشیارپوری اور مجروح سلطان پوری ہی نہیں جگر مرادآبادی بھی شریک ہیں۔

(ترقی پسند ادب)

(۲)

شمس الدین ولی

"از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد۔"

(نکات الشعرا)

"ذوقِ فکر رسائے داشت و دیوان لطیف از نگاشتہ"

طرح نمودہ۔" (گلشنِ گفتار)

"کمانِ چرخ سخن را بہ نیروئے فکرت کشیدہ و ناوکِ اندیشہ اش ہدف معنی رسیدہ۔" (تذکرہ گردیزی)

"تعریفش از حاطۂ تحریر و تقریر بیرون است بنائے ریختہ را چنیں مستحکم نمود کہ اعمال از بلندی طاق سپہر افزود۔"

(تذکرہ شعرائے اردو)

"در ریختہ قصبے بہ فصاحت و بلاغت می گفت کہ اکثر استادانِ آں وقت زراہِ موش شعر ریختہ موزوں می نمودند۔"

(مخزنِ نکات)

"شاعر والا اقتدار و سخن سنجِ شیریں گفتار است۔ زینۂ سخن ریختہ در زمانش باوجِ کمال رسیدہ۔" (چمنستانِ شعرا)

"سر شعرائے دکھن مشہور و ممتاز است اوّل کسے است کہ دیوانش در دکھن مشتہر و مدوّن گشتہ۔" (گلزارِ ابراہیم)

"قطع نظر از زبانِ دکنی شعرش بمرتبۂ اعلیٰ شاعری و سخن

بدرجۂ علیائے سخنوری است۔" (مجموعہ نغز)

"ان کی انشا پردازی اور شاعری کی دلیل اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ ایک زبان کو دوسری زبان سے ایسا بے معلوم جوڑ دیا ہے کہ آج تک زمانہ نے کئی پلٹے کھائے ہیں مگر یہ جوڑ میں جنبش نہیں آئی۔" (آبِ حیات)

"اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ولی اپنے ہم عصر شاعروں میں سب سے زیادہ ممتاز ہے اور اس کے کلام کو قبولِ عام حاصل ہوجانا اس کی شاعری کا طرۂ افتخار ہے۔" (گلِ رعنا)

میر سراج الدین سراج دکنی

"..... سخنِ او خالی از مزہ نیست۔" (نکات الشعرا)

"..... طبع روشنش شمع بزمِ سخن" (تذکرہ گردیزی)

"..... روشن طبع معلوم می شود۔" (تذکرۂ شعرائے اردو)

"..... ایجاد از سلیقۂ شعرش معلوم می شود۔ بسیار بہ درستی حرف می زند۔" (مخزنِ نکات)

"..... اما از سخنش بوئے عشق و محبت استشمام می نماید۔"

(مجموعۂ نغز)

"باجملہ غزلے کہ شعرے ازاں ایراد کردہ بے شود از شہرتِ تمام دارد۔" (گلشنِ بے خار)

"حاتم کے بعد دکن میں اس پائے کا کوئی شاعر نہیں ہوا۔"
(گلِ رعنا)

میاں نجم الدین شاہ مبارک آبروؔ

"..... شاعر نادرہ گوئے ریختہ می گوید کہ طبع شوخ و طبیعت خوش مستعنی موقت خود بود ....." (مکات الشعرا)

"..... اشعارش در تمام ممالک محروسہ مشہور و مروج و محسوس و روایا اطلاقہ شاہجہان آباد مستغنی از وقت است۔"
(گلشنِ گفتار)

"..... حقا کہ معنی تلاشی را بر طاق بلند گذاشتہ و استفتاح مملکت سخن رایت شاہی افراختہ ....."
(تذکرۂ گردیزی)

"شاعرِ خوش گو در روقتِ خود بود۔"
(تذکرۂ شعرائے اردو)

"..... بالجملہ شعر ریختہ و وضع خود بسیار مربوط می گفت ....." (مخزنِ نکات)

"..... ترکیب میں بیشتر اشعار انھوں نے ایہام کے کہے ہیں یعنی اکثر وہ الفاظ شعر میں لائے ہیں کہ جن کے دو معنی ہیں اگر چہ بامعنی یا لایعنی ....." (گلشنِ ہند)

"..... شعرا بطور یکہ در آں زمانہ رواج داشت بسیار بخوبی گفتہ ....." (تذکرۂ ہندی)

"..... در طرز گفتار حسبِ رواج آں وقت جنس تزبہ ایہام گوئی صرف ہمت می نمود ....." (مجموعۂ نغز)

"..... از زبان آوران نامی طبقۂ پیشین است۔ صنعت ایہام قائل بود ....." (گلشنِ بے خار)

"..... بیشتر صنعتِ ایہام میں شعر کہتے تھے۔"
(محسنِ شعرا)

"یہ اپنے زمانہ میں مسلم الثبوت شاعر زبانِ ریختہ کے اور صاحبِ ایجاد نظمِ اردو کے شمار ہوتے تھے۔"
(آبِ حیات)

"طبیعت رسا اور فکر معنی یاب تھی۔ اس زمانے کے دستور کے موافق تشبیہ اور استعارہ میں کلام الجھا ہوا ہے مگر خاوند کی چاشنی نے اس کو بامزا کر دیا ہے۔" (گلِ رعنا)

ظہور الدین شاہ حاتم

"..... مرد بسیار جاہل بکمال و مطبع و متواضع و بیریا و بے ادعا و خنداندارہ و یافتہ نمی شود کہ این رنگ کہن بسبب شاعری است کہ بچو من دیگرے بے نیست یا طبع او ہمیں است۔ خوب است مارا با تباہ چہ کار ..... شعر بسیار دارد ..... با من ہم آشنائے بیگانہ است۔" (نکات الشعرا)

"..... مرد صاحب ہمت و طبیعت عالی و ارادہ و تحمل و داد سخن شعر ہر گز نہ کردہ و در ایں امر کہ فی الحقیقت سخن در دست بشما بہ دست گوئی از حاتم بردہ صرفہ نہ دارد ....."
(گلشنِ گفتار)

"..... طبع وے نیش فقد و قلب سخن را نقاد۔"
(تذکرۂ گردیزی)

"..... کلیاتش ضخیم است و ابیات دلپذیرش قریب چہار ہزار بیت از نظر گزشتہ یک شعر خوب جستہ جستہ می برآید۔"
(مخزنِ نکات)

"..... صاحب کمال و پسندیدہ افعال، عالی فطرت و بلند ہمت معاصر میاں آبروؔ و دو دیوان ترتیب دادہ یکے بزبانِ قدیم بطور ایہام و دوم بہ زبانِ حال اداہیہ، شہرۂ اشعارش بسیار است، اکثر غزل ہائے او را نغمہ سرایانِ ہندی خوانند۔"
(تذکرۂ شعرائے اردو)

"..... شاعر خوش بیان تھا۔ صاحب دو دیوان تھا۔ ایک دیوان میں نہایت عمدہ ایہام کیا ہے اور دوسرا بطور متاخرین کے سرانجام کیا ہے۔ جامع ہے طور متاخرین اور طرز ایہام کا"

(گلشن ہند)

"..... نغز گو خوش حال وضع و شریف اور استاد مسلم الثبوت می دانند"

(تذکرہ ہندی)

"..... شاعر سادہ بامکین از طبقۂ دوم بین....."

(مجموعۂ نغز)

"..... در اقوال حال فکر نش مقصور و بہ تتبع قدما مانندہ کلی و غیرآں بود، چوں طریقہ متاخرین طراز جیب و دامان شہرت گشت، وے نیز دست بداماں ایشاں زدہ بسائے دیوان ثانی بریں طریقہ نہاد"

(گلشن بے خار)

"..... ای سے ایک دیوان بہ طرز قدیم اور دوسرا بطرز سودا موسوم بہ دیوان زادہ یادگار ہے....."

(سخن شعراء)

"در مضمون ان کے صاف عاشقانہ عارفانہ ہیں بشوخ آپس کی باتیں اور زبان شستہ و رفتہ ہے"

(آب حیات)

"شعر و سخن کا شوق شروع ہی سے تھا۔ مشق سخن کرتے کرتے استاد بن گئے"

(گل رعنا)

اشرف علی خاں فغاں

"بسیار جوان قابل و ہنگامہ آرا، شعر ریختہ را بہ خوبی می گوید"

(نکات الشعراء)

"وضع ظریفانہ دارد۔ بمقتضائے مزاج طبیعت و صافی باریاب سخن گرم می جوشد و سر رشتہ اختلاط می نماید"

(تذکرۂ گردیزی)

"خان ظریف طبع و خوش اختلاط بود با ہر کس خوش طبعی داشت، شاعر مربوط بطور خود لطائف و ظرائف او مشہور است"

(تذکرۂ شعرائے اردو)

"سلیقۂ سخن سنجی درست دارد" (مخزن نکات)

"نظم ریختہ بہ طبیعت ان کی رسا ہے"

(گلشن ہند)

"شعر را بہ صفائی تمام می گوید" (تذکرۂ ہندی)

"شعرش پختگی تمام دارد" (مجموعۂ نغز)

"اگرچہ فغاں کی زبان اسی زمانے کی زبان ہے مگر اپنی کے اعتبار سے نہایت با اصل اور برجستہ ہے اور الفاظ کی بندش ان کی مشق سخن پر گواہی دیتی ہے" (آب حیات)

"فغاں شعر و سخن ہی میں ماہر نہ تھے بلکہ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں یکتائے زمانہ تھے"

(گل رعنا)

میر تقی میر

"فقیر بسیر اشعارش نمودہ و چشمے آب دادہ حقا کہ دراں تلاش معنی بیگانہ کردہ است و حرف آشنا را بر مے کار آوردہ"

(تذکرۂ گردیزی)

"از اساتذہ صاحب قدرت است طرزش مانا بطرز شفائی"

(تذکرۂ شعرائے اردو)

"تازگی مضمون کی اور علو معانی کا بیان سے ان کے ظاہر ہے۔ فی الحقیقت کہ شاعر مذکور لطافتوں سے ریختہ کی بخوبی ماہر ہے۔ میر شیریں مقال ہیں اور ریختہ گویان سابق و حال ہیں نسبت خورشید و ماہ ہے اور فرق سفید و سیاہ ہے بلکہ حجاب اگر مانع نہ ہو میان کا تو تفاوت ہے زمین اور آسمان کا۔ اقسام نظم میں یہ صدر نشین بارگاہ سخن دانی ہر قسم چیدۂ خامۂ معجز نگار رکھتا ہے لیکن بہ تو یہ ہے کہ نظم غزل میں یہ بیضا رکھتا ہے"

(گلشن ہند)

"استادی ریختہ بر مسلم است۔ ہمہ ریختہ گویان ہند سرمۂ خاطش می آرند و در ریختہ فن مستند امید اند و الحق کہ چنیں است۔"
(تذکرۂ ہندی)

"شاعرے است بے نظیر و سخن سنجے است خوش فکر ..... میر اظہیر بیانی و بہرہ تمام در اسلوب البیانی طرز گفتارش بے بدل انداز اشعارش ضرب المثل۔" (مجموعۂ نغز)

"در ایہام و ریختہ سرائی و مثنوی گوئی گوئے سبقت می رباید۔ پست و بلند کہ در کلامش ہمی درخشد و یاس کہ در ابیاتش بنگری نظر نکنی و از نظرش نیفگنی کہ گفتہ اند۔ فرد ؎

شوخیٔ ایہام باشد فی الجملہ پست نیست!
در ہمہ بیتے ہمہ گفتہ یکے پست نیست!"

(گلشنِ بے خار)

"میر صاحب کی زبان شستہ، کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں۔ دل کے خیالات کو تو کہ سب کی تہ بہ تہ کے مطابق ہیں، محاورہ کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں اس واسطے ان میں بہ نسبت اور شعرا کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے گویا نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دلوں پر اثر بھی زیادہ کرتی ہیں۔ وہ گویا اُردو کے سعدی ہیں۔"

(آبِ حیات)

"میر صاحب غزل کے بادشاہ ہیں۔"

(گلِ رعنا)

مرزا محمد رفیع سودا

"مرد سودا مزاج و کم سخن ..... غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید۔ سرآمد شعرائے ہندی اوست۔ بسیار خوش گو است، ہر شعرش طرف لطافت بستہ، رشتہ در چمن سخندانی الفاظش گل معنی دستہ، ہر مصرعہ بر جستہ اش را سرو آزاد بندہ، پیش قد رعنایش طبع عالی تر زندہ، شاعر ریختہ چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ او را شاید۔" (نکات الشعراء)

"حقا کہ رتبۂ شعرش عالی است و سخن در دہ مذاقش حالی۔ امروز در سیدانی گفت گوئے سبقت از قرآن دارد شاملِ خود می رباید و ساد معنی و رنگین خیالی می وجد۔" (تذکرۂ گلرعنا)

"در زندگی سخن و بستہ زبان اوست۔"

(تذکرۂ شعرائے اُردو)

"در ریختہ بہت کام ہمی برد و سے و سے کمادہ است کہ در وسعت کلک آرزش نہفتہ را آمادہ اشعار رنگین و نمایندہ تعین دارد۔" (گلزارِ نکات)

"نظم ریختہ کو طبع معنی آفریں پر اس کے گیسوئے اوناز۔"

(گلشنِ ہند)

"در روانی طبع نظیر خود نداشت۔ اگر در قتال بندگی اشعار غزل صائب فتنہ گریم بجا است و اگر در عموم اتب معانی ابیات قصیدۂ خاقانی گویم روا و دلفاش اول نظم قصیدہ در زبان ریختہ اوست۔" (تذکرۂ ہندی)

"شعر خوبی شعارش کیفیتے دارد کہ سامع نکتہ پرداز صاحب فراست داند۔ بہ کلام صحت انتظامش حلاوتے دارد کہ ذائقہ طبع سخن سنج صاحب گفتار شناسد۔" (مجموعۂ نغز)

"بین الانام شہرت پذیر است کہ قصیدہ اش بہ از غزل است حرفیست نعل۔ بر قدِ فقیر غزلش بہ از قصیدہ است و قصیدہ اش بہ از غزل۔" (گلشنِ بے خار)

"دیوان ریختہ وقت کی زبان سے قطع نظر کر کے باعتبار جوہر کلام سرتاپا مرقع ہے۔ بہت سی غزلیں دلچسپ اور ایسے بحروں میں ہیں کہ اس وقت تک اُردو میں نہیں آئی تھیں۔ زمینیں

شگلاخ ہیں اور ردیف قافیے بہت مشکل، مگر جس پہلو سے انھیں جما دیا ہے ایسے جچے ہیں کہ دوسرے پہلو سے کوئی بٹھائے تو معلوم ہو۔"

(آبِ حیات)

"طبیعت شعر و سخن کے مناسب تھی۔ کثرتِ مشق نے اس میں جلا دے دی تھی۔ ۔ ستاد کی زندگی ہی میں ان کی استادی کو خاص و عام نے مان لیا تھا اور ان کی غزلیں گھر گھر ہر ایک کی زبان پر چڑھ گئیں۔"

(گلِ رعنا)

خواجہ میر درد

"ریختہ اے حمار زمانہ است و سخن گوئی یگانہ بے اغراق طبع بلندش ۔ سا است و فکر دل پسندش عالا۔"

(تذکرۂ گردیزی)

"دیوانش اگرچہ مختصر است لیکن چوں کلام حافظ سراپا انتخاب۔"

(تذکرۂ شورشِ اردو)

"ابیاتِ دیوانش قریب ہفت صد شعر از نظر گزشتہ بحق لب لباب و نامی انتخاب است۔" (محزنِ نکات)

"اگرچہ دیوان ان کا بہت مختصر ہے لیکن سراپا درد و اثر ہے۔"

(گلشنِ ہند)

"شعر ہندیش از بس شہرت تامہ مشہور ہر دیار۔"

(تذکرۂ ہندی)

"دیوانے مختصر بر شاہ چشمۂ آبِ حیات۔ ریختہ از طبع وقاد ایشاں ریختہ۔ در بحر خفی بدرجہ اعلیٰ فصاحت و مرتبہ اقصیٰ بلاغت است و با ایں ہمہ شاعری کہ میں مرتبہ آں جہیں پر سار گرفتی است۔"

(مجموعۂ نغز)

"فکرش سحر و نظمش فصیح گفتارش از رکاکت و خلاط پاک و در جنب گل ہائے خیالش گل ہائے چمن ہم از خس و خاشاک دیوانش از نظر گزشت۔ از اشعار پر کمن خالی است و اکثر ابیات با علو معانی و سمو مضامین و کشش و حالی۔" (گلشنِ بے خار)

"خواجہ میر درد صاحب کی غزل سات شعر تو شعر کی ہوتی ہے مگر انتخاب ہوتی ہے خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے تھے گویا تو اصل کی آبداری انشتر میں بھر دیتے تھے۔ خیالات ان کے سنجیدہ اور متین تھے کسی کی ہجو سے زبان آلودہ نہیں ہوئی۔ تصوف جیسا انھوں نے کہا اُردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا۔"

(آبِ حیات)

"قصیدے کی طرف مائل نہیں ہوئے۔ اس واسطے کہ جس مرتبہ کے وہ آدمی تھے اس کو ہیلتی سے کیا نسبت۔ بزرگوں کا دیوان بقول میر حسن کے مثل دیوان حافظ کے سراپا انتخاب ہے، تصوف اور اخلاق کی چاشنی کے اعتبار سے ان کا کلام میر و میرزا کے کلام سے زیادہ دلآویز ہے۔" (گلِ رعنا)

مظہرِ جانِ جاناں

"دیوانِ مختصر شعر فارسی او بہ نظر فقیر تولف آمدہ است از سلیم و کلیم پاسے کمی ندارد۔ اگرچہ شعر گفتن دوں مرتبہ است لیکن گاہے متوجہ ایں فن بے حاصل نیز می شود۔"

(نکات الشعراء)

"اشعار فارسی، ہندی او از بلادِ ہندوستان تا دکن زبان زدِ عالم اظہر من الشمس است۔"

(گلشنِ گفتار)

"شعر فارسی اش بغایت لطافت و نظم ریختہ اش نہایت غذوبت۔"

(تذکرۂ گردیزی)

"میرزا جامع خفتہ و فضیلت و سخن گستری است۔"

(چمنستانِ شعرا)

"مشہور بخوبی رعمل میں وقتی کے نظم و نثر ریختہ میں نہایت خوش بیان اور اندازِ گفتگو میں نادرِ زبان تھے۔"

(گلشنِ ہند)

"در عہد ما بہ ایہام گویاں اوّل کسے کہ شعر ریختہ پختہ گفتہ اوست۔"
(تذکرۂ بنفشہ)

"مخترعِ کلام و کلام در و صیغش پایانے ندارد۔"
(مجموعۂ نغز)

"مگر سخن خاری سبیاری کرد ہر چند اہلِ سخن را در زبان
ایشاں حرف و است اما واقعاً بعض خیالات بغایت پسندیدہ و
مطلوب و مقبول دارد۔ وقتی ابیات ریختہ ہم می گفت۔"
(گلشنِ بے خار)

"زبان کی اصلاح اور اندازِ سخن اور طرز کے ایجاد
میں انھیں وہ یدِ طولیٰ حق ہے جیسا کہ سودا اور میر کو۔"
(آبِ حیات)

"شعرِ سخن سے ان کو خداداد مناسبت تھی۔ اُردو
میں پورا دیوان نہیں، غزلیں اور اشعار ہیں۔ جو سودا اور میر کی زبان
ہے وہی ان کی ہے۔"
(گلِ رعنا)

سید محمد میر سوز

"در عہدِ خود از جملہ ارجمندی ممتاز۔"
(تذکرۂ شعرائے اُردو)

"سید عالی نسب اور فنِ سخنوری میں استاد اور مرزا داؤد
کے بادشاہ اور صورتِ مضمون درد و آہ تھے۔ کلام ان کا سر سے
پاؤں تک سوز و ساز ہے اور پاؤں سے سر تک ناز و نیاز۔"
(گلشنِ ہند)

"طرزِ خود استاد است۔"
(تذکرۂ ہند)

"در ریختہ گوئی طرزِ خاص دارد و تتبع طرزِ کسے نکند اگرچہ
اکثرے از مشتاقان ایں فن گرائیدہ اند۔ اکثر کسے سخن بہ اندازِ دے
رسانیدہ۔"
(مجموعۂ نغز)

"دکھاش از جادۂ مستقیم برکراں۔"
(گلشنِ بے خار)

"میر سوز مرحوم کی زبان عجب میٹھی زبان ہے اور حقیقت
میں غزل کی جان ہے۔ چنانچہ غزلیں خود ہی کہے دیتی ہیں۔ ان کی
انشا پردازی کا سخن تکلف اور صنائعِ معنوی سے بالکل پاک
ہے۔ اس خوشنمائی کی ایسی مثال ہے جیسے ایک گلاب کا پھول
سرخ بھری مٹھی پر کٹورا سا دھرا ہے اور سبز سبز پتیوں میں اپنا اصلی رنگ
دکھا رہا ہے۔ جن اہلِ نظر کو خدا نے نظرِ باریک آنکھیں دی ہیں، وہ
جانتے ہیں کہ ایک سخن خداداد کے سامنے ہزاروں بناوٹ
کے بناؤ سنگار قربان ہوا کرتے ہیں۔ البتہ غزل میں دو تین شعر
کے بعد ایک آدھ پرانا لفظ ضرور کھٹک جاتا ہے۔"
(آبِ حیات)

شیخ قیام الدین قائم

"شعرش پسندیدہ است و فکرش سنجیدہ۔"
(تذکرۂ گردیزی)

"..... طرزش بطرزِ طالب آملی می ماند۔"
(تذکرۂ شورشِ اُردو)

"نظرِ ریختہ میں استاد مسلّم الثبوت تھے۔ ساتھ
طبعِ بلند اور ذہنِ رسا کے موصوف، مضمون تراشی اور معنی بندی
میں معروف۔ سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو
کی نظر کا یہ اسلوب نہیں ہے۔"
(گلشنِ ہند)

"در بخلی کلام وحشی مصراعِ غزل دہد یا قصیدہ و
مثنوی وغیرہ موافقِ رواجِ زمانہ روشِ بدوشِ استاد را۔ میر درد
بلکہ در بعض مقام غلبہ می جوید۔"
(تذکرۂ ہندی)

"شاعرے بود فصیح زبان، شیریں بیان، فصاحت یمین،
بلاغت آگین، صاحب گفتار، استوار، مالکِ اشعارِ آب دار،
بلبلِ خوش نوا، عندلیبِ بوستاں۔"
(مجموعۂ نغز)

"شاعر لیست خوش گفتار و بلند پایہ موزونیت عالی مضامین گرانمایہ۔"
(گلشن بے خار)

"ان کے طرز ادا کو دیکھ کر سودا کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔"
(گلِ رعنا)

انعام اللہ یقین

"قائلۂ شعر فہمی مطلق ندارد، و شاید از تہیدستی راہ مردمان گمان نامرزونیت در حق او داشتہ باشند حق بہ ایں اتفاق دارند کہ شعرش اوضاعی ازیں قبیل نیست۔"
(نکات الشعراء)

"شاعر متین است۔"
(گلشن گفتار)

"شہباز خیالش بہ صید معنی بلند پرواز است و مضامین اندیشہ اش بر قطعہ تاقہ سخن پرفشانی ممتاز بے اخوان ریختہ گوئی را بر طاق بلند گذاشتہ و بحر معنی در زمین سخن کاشتہ۔"
(تذکرۂ گردیزی)

"..... اشعارش بسیار متین و موثر اند سخن او خالی از دردمندی نیست۔"
(تذکرۂ شعرائے اردو)

"شاعر صاحب طرز یگانہ عروض و حید دہر است۔ بر اخلاق حمیدہ انصاف دارد و مصرع از زبان ہائے بحر طرازش بر ایں مہر لطف و خوبی می تراود کہ مجرد استماع دل عشاق قطرات خوں شدہ از دیدہ فرو می چکد۔"
(مخزن نکات)

"بالجملہ صاحب یقین کمتائے عصر و یگانۂ زمانہ است۔"
(چمنستان شعرا)

"در دورۂ ایہام گویان اول کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ، ایں جوان بود بعد زاں نقش بدیگراں رسید۔"
(تذکرۂ ہندی)

"در فن نظم کلماتی مطلوب با دوست کلامش بیرنگ امت حلاوت دل خواہ دارد۔"
(گلشن بے خار)

"۲۵ برس کے سن میں یقین کا کام تمام ہو گیا اگر جیتے۔ رہتے تو میر جیسا بیرزا کسی کا چراغ نہیں جل سکتا تھا۔"
(گلِ رعنا)

میر محمدی بیدار

"مصرع ریختہ درست موزوں میکند۔"
(نکات الشعراء)

"طبع دردمند داشت۔"
(تذکرۂ شعرائے اردو)

"نزاکت سے معنی کے بخوبی آشنا اور زبان دانی سے ہمیشہ ہم نوا رہے ہیں۔"
(گلشن ہند)

"زبانش بسیار شستہ و رفتہ۔"
(تذکرۂ ہندی)

"و شعرش بسیار با کیفیت و چستگی و بہ نہایت حلاوۃ و دل بستگی است بندش الفاظ و استحکام بندی آں بدرجۂ اعلیٰ دارد و با ایں ہمہ نزاکت معانی بوجہ اتم نازک خیالاں خیلے سے سازد۔"
(مجموعۂ نغز)

"مدتہا بر سر مشق سخن بود و مہارتے شایان بدست آوردہ۔"
(گلشن بے خار)

"میر و میرزا کے ہم عصر تھے جب انھوں نے رعایت لفظی کے ناپسندیدہ رنگ کو ترک کیا تو بیدار نے بھی اس میں کوشش کی اور صفائی کے ساتھ تصوف کا رنگ بقدر مناسب شامل کر کے اپنا طرز کلام کو علیحدہ کر لیا۔ ان کے اشعار دلآویزی کے باعث اب تک لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔"
(گلِ رعنا)

میر عبدالحی تاباں

"خوش فکر و خوب صورت، خوش خلق، پاکیزہ سیرت،

"مشوق عاشق مزاج تا حال در دوتہ اشعار بچو شاعر خوش ظاہر از کمین جلوہ ہر ہر صفحہ ظہور جلوہ گر نہ شدہ بود۔ زبان پختہ پاکیزہ مزاج پر اصل بگفتار سخن را نازک دماغ بلبل بسمند رنگینی فکر ش با فکر پیاد بہار طاق المثل بامثل است۔" (نکات الشعراء)

"جوانے بود خوب صورت و خوش سیرت شیخ محمل جانہا و چراغ بزم دلہا۔" (تذکرہ گردیزی)

"شاعر بامزہ و رنگین طبع بود۔" (تذکرہ شعرائے اردو)

"جوانے بود در نہایت حسن و جمال مسمی بہ یار جمال با وجود میل منشی مخمس را آداب صحبت آموختہ و با کمال تمکین آرائی شمع دار مزاج ہر جگر سوختہ۔ اخلاق حمیدہ و اوصاف پسندیدہ داشت۔"

(مخزن نکات)

"مقامات مہیش دل نازک خیالان را صید فتراک۔"

(چمنستان شعرا)

"دیوان ریختہ اش مشہور و ست۔"

(تذکرہ ہندی)

"با لجملہ اشعار آبدارش بیشتر بر زبان خاص و عام جاری است و خالی از کیفیت نخواہد و جاری از چاشنی دل رباتی نیست۔" (مجموعہ نغز)

"ان کے اصل حال سے زبان ان کی نہایت معترف و شستہ و شگفتہ ہے۔" (آب حیات)

سید محمد میر اثر

"مرد رویشے است موقر و صاحب سخنے است مؤثر عالم و فاضل و تتبع قدرش بغایت بلند گو ہر صدرش زیبائے جمعہ۔"

(تذکرہ شعرائے اردو)

"شعر ہندی و فارسی کم از برادر بزرگ نمی گوید۔"

(تذکرہ ہندی)

"دیوان قلیل الحجم وارد ملاحظہ شد بعض خیالات ایشان بحضور نے غایت درد مندانہ و دل پذیر و مطبوع واقع شدہ۔"

(گلشن بے خار)

"تصوف و شاعری میں جو رنگ بڑے بھائی کا ہے وہی ان کا بھی ہے۔" (گل رعنا)

رنگین

"خیالش سیاہ توش تحریر۔ ہر چند چندان بہرہ از علم ندارد اما ذوقے دارد طبعش بر صاحب علمان غالب چوں مزاحم مشاعرہ ہا گاہ گاہ قطعات خوب و غزل و نامرتبے نیز بنظر رسیدہ۔" (تذکرہ ہندی)

"جمع دیوان با اصناف سخن نظم کردہ و آں را مرتب ذاہم آوردہ ترتیب نامہ کردہ جوں دواوین دیگر مبنی بر ہزل و ریختے وغیرہ است کہ ابراہاں بایں نغمہ ہا ساز دو بنابراں از دیوان ریختہ و پختہ بہ نسبت تمام ایں ابیات گزیدہ شد۔"

(گلشن بے خار)

"رنگینی ہمہ گیر طبیعت رکھتے تھے۔ ہر رنگ میں انھوں نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔" (گل رعنا)

مصحفی

"قصیدہ و غزل و مثنوی ہمہ خوب، کلام متین شیوہ شاعرانہ۔"

(تذکرہ شعرائے اردو)

"بندش نظم میں اس کے ایک صفائی و شیرینی ہے (اور معنی بلند ہیں، اس کے بلندی و رنگینی۔" (گلشن ہند)

"بر کتب متداولہ نظر و نثر نظر سے خوب دارد و بہر دو زبان سخن سازی بر روے کار می آرد۔"

(مجموعہ نغز)

"ہر چند بہ تقاضائے شیوۂ بسیار گویان اکثر کلامش بر کم پایہ و فاقد معانی عالی است اما گزیدہ اشعارش در نہایت رتبت و علو مرتبت و عالی است۔" (گلشن بے خار)

"ان کی ہمہ گیر طبیعت نے کسی خاص رنگ پر قناعت نہیں کی۔ ان کے کلام میں کہیں میر کا گداز ہے، کہیں سودا کا انداز کہیں تصدق کی سادگی، درد جاں کہیں ان کی کمر مشقی اور استادی اپنے چشمۂ استادہ کی خوبیوں کو سمجھا کر دیتی ہے تو وہ شاعری کے بہترین نمونے قرار دیے جا سکتے ہیں۔" (گل رعنا)

میر غلام حسن حسن

"اقسام علم سے تو بہرہ علوم میں بخصوص یکجا معانی ہے، یاں بھی اشعار میں ان کے البتہ ایک صفائی اور روانی ہے۔" (گلشن ہند)

"چوں زادہ اوائل عمر طبعش موزوں بود اکثر خود را مشغول بایں شغل خلیہ میداشت و شعر خود را از نظر میر ضیاء الدین ضیا کہ در آں ایام ایشاں از مستعدان زماں عدیل دیار بعد از آں گردید بعد از آں کہ در مرزا رفیع شدہ زبان ریختہ چنانکہ بود زیادہ بر آں دریں دیار بعد اوج یافت۔ بحکم فوت نمیزد قدم بر جادۂ مستقیم سلیقۂ مستم الثبوت یعنی خواجہ میر درد و مرزا رفیع سودا و میر محمد تقی میگذاشت کلام خود بر تہہ پاکیزگی و شستگی رسانیدہ دیوان مثنوی اش متعدد در سلک نظم کشیدہ خصوصاً مثنوی آنکہ کہ ابھیان نام دارد۔ بدیہا فرودہ الحق کہ کار راہ است۔ قطع نظر از بلاغت شاعری زبانش بسیار بامزا و شیریں و عالم پسند افتادہ۔"

(تذکرۂ ہندی)

"طرز گفتارش بہ شاعر فصاحت آفرید محمد میر سوز مرحوم مانا است مختصر کلام شاعر فصیح زبان مذہب البیان است دیوانے دارد اقسام سخن دارد۔" (مجموعۂ نغز)

"سالم فطرت سلیم فکرت است و براصناف سخن فی الجملہ قدرتے داشت..... و قطع نظر از یا مزہ ہائے شاعری بہ محاورہ بہ تکلف، بلکہ دارد طلاقت دادہ۔" (گلشن بے خار)

"ان کے اشعار غزل کے اصول پر گلاب کے پھول ہیں اور محاورات کی خوش بیانی معانی میں عاشقانہ کے رنگ میں ڈوبی ہوتی ہے۔ میر سوز کا انداز بہت ملتا ہے۔"

(آب حیات)

"غزل میں ان کا درجہ بہت بلند ہے اور مثنوی میں تو یکتائے زمانہ تھے جس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔"

(گل رعنا)

شیخ قلندر بخش جرأت

"کلامش نمکین و بیانش شیریں و دیوانہ فی شعرا مست کہ گاہے بے نمکی ماند و بیاد و سخنہ و گداز است۔"

(تذکرۂ شعرائے اردو)

"شاعر شیریں کلام ہے۔" (گلشن ہند)

"در شعر خود تلاش مانیانہ بسیار می کند عباس تمام از کلامش تتبع و مزاجش بطرف مسلسل گوئی و غزل و غزل گفتن میشتر مائل است۔" (تذکرۂ ہندی)

"بسبب میر متقی حسب مدارج آں دیار آں چناں اشعار آبدار از طبع گوہر بارش تراوش نمیکند کہ مشعر فصاحت آنجا نیست۔" (مجموعۂ نغز)

"سخن بعضا چنے کہ بیان عاشق و معشوق می کردہ می گزرد طبعے رسا داشت۔" (گلشن بے خار)

"ان کی طرز انھی کی ایجاد ہے اور آج تک انھی کے لیے خاص ہے۔ جیسی اس وقت مقبول خلائق تھی آج تک ویسی ہی چلی آتی ہے خصوصیت اس میں یہ ہے کہ فصاحت اور

خاوند کی جان ہے۔ لفظ معشوق و عشق کے معاملات ہیں ——— امد
عاشق و معشوق کے خیالات گیا اس میں شریک و ساتھ کا سوز و گداز
کرتے ہیں۔"
(آب حیات)

"دیوان میں رطب و یابس بہت نہیں ہے۔"
(گل رعنا)

انشاء اللہ خاں انشا

"نو مشق است اکثر طرز او بطرز میر سوز سے نباہ۔"
(تذکرۂ شعرائے اردو)

"دیوان ان کا زبان ریختہ میں مشہور ہے اور کلام ان کا
نہایت لطف اور خوش اختلاطی سے معمور۔"
(گلشن ہند)

"ابتدائے عمر بگمان موزونی طبع شعر در ہر سہ زبان
می گوید و در طبیعت ہی غایدانہ میلان طبع اش بطرف ریختہ بیشتر است۔"
(تذکرۂ ہمیشہ)

"میر مصوف شاعرے است بزبردست و سخن
سست قوی باندہ۔"
(مجموعہ نغز)

"یکی صنف را بطریقہ۔ انجمن شعرا نہ گفتہ اما در
شوخی طبع و جودت ذہن او سخنے نیست۔"
(گلشن بے خار)

"غزلوں کا دیوان عجب طلسمات کا عالم ہے زبان
پر قدرت کامل، بیان کا لطف، محاوروں کی نمکینی نزاکتیں کی
وہ شوخ تراشیں، دیکھنے کے قابل ہیں مجربہ عالم ہے کہ ابھی کچھ
ہیں ابھی کچھ ہیں۔ جو نو لبیں یا غزلوں میں اشعار بالکل ہو گئے
وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں اور جہاں طبیعت اور طرف جا پڑی
وہاں ٹھکانا نہیں۔ غزلوں میں غزلیت کے اصول کی پابندی نہیں
سبب یہ ہے کہ وہ جن آفریں ایک ذخیرہ افر مضامین و الفاظ
کا اپنے پاس رکھتا تھا۔ اس سے جس قسم کی مخلوق چاہتا تھا پیدا
کر لیتا تھا۔"
(آب حیات)

"سراتو یہ خیال ہے کہ سیادت جیسا ذہن
اگر اپنی طبیعت پر نا بور رکھتا ہو تو سعادت علی خان کے مزاج
میں داخل ہو جانے پر وہ کوئی اور چیز بن جاتا اور اس کا رویوں
لطائف و غرائب سے مالا مال ہونے کی بجائے ملک کے
سامنے آج ایک بیانمونہ پیش کرتا۔"
(گل رعنا)

نظیر اکبر آبادی

"در شاعری است، در ریختہ مشق کرد با فصل و دوق
فوان علم، شاعری می فرماید۔"
(مجموعہ مغز)

"اشعار بسیار دارد کہ بزبان سوقیین جاریست
و لطف بآں ابیات لا محدود نصیب انشا پردازی۔"
(گلشن بے خار)

نصیر

"فقیر در یابا یکہ در شاہجہان آباد بود اکثر در شاعرہ
می آمد۔ در ہماں عالم نوشتی در طبعش روانی و تیزی دریافت میشود
و حالا گویند کہ قوت شاعری بسیار پیدا کردہ۔"
(تذکرۂ ہندی)

"در روانی طبعش شکے نیست۔"
(دیباچہ اضحا)

"کلامش پر معز معلوم میشود۔"
(مجموعہ مغز)

"نوین ہائے سنگلاخ طرح میکند۔"
(گلشن بے خار)

"زبان شکوہ الفاظ اور حسن ترکیب میں سودا کی زبان
تھی اور گرمی و ندت اس میں خدا داد تھی۔ انھیں اپنی نئی مثنویوں
اور استعاروں کا دعوے تھا اور بیدعوے بجا تھا نئی نئی زمینیں
نہایت برجستہ اور پسندیدہ نکالتے تھے مگر ایسی سنگلاخ ہوتی
تھیں جن میں بڑے بڑے شہسوار قدم نہار سکتے تھے تشبیہ

اور استعارہ کر لیا ہے اور نہایت آسانی سے برتا ہے جسے اکثر زبردست انشاپرداز ناپسند کر کے کہ استعاداری کا نتیجہ نکالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تشبیہ یا استعارہ شاعر نے نہیں باندھی ہے لیکن یہ ان کی غلطی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کہتے تو کلام میں یہ ضم کیونکر ہوتا اور ہم ایسی سنگلاخ زمینوں میں نرم گرم شوکیوں سنتے پھر وہ ہزاروں شاعروں میں خاص وعام کے منہ سے واہ وا کیونکر لیتے۔"

(آب حیات)

"کلام میں شکوہ الفاظ کے ساتھ نئی نئی ترکیبیں اور استعارے پائے جاتے ہیں۔ زمینیں بھی نئی نئی نکالی ہیں۔ شعر میں شعر کا سر پیدا کرنا یہ کسی کا کام نہیں، زبان استاد انشاء پر ختم کی ہے۔ کچھ الفاظ ان کے ایسے ہیں جو مگر اتنے نہیں ہیں کہ تاج و افسر کے ساتھ ان کو جگہ دی جائے۔"

(گل رعنا)

میر نظام الدین ممنون

"جوانے است شیریں سخن واقف اکثر اصوات فن سلیس گفتار فصیح بیان بیک... کردہ۔ عذوبت بیان در سلک شعرا پائے میر پر خاقانی انتظام بقدر شناسی دیدہ وری عشرت ظل سبحانی خطاب مستطاب فخر الشعراء عز و احترام داشت و مواقف بلیغ مشکل پسند بادشاہی بدیہہ ہمراز سرانجامی یافت۔"

(مجموعۂ نغز)

"در عرصۂ قلیل قوت شاعری چنانکہ شاعر را باید پیدا کردہ و کلام خود بر تربۂ کلام بدر رسانیدہ۔"

(تذکرۂ ہندی)

"طرز گفتارش خیلی دلچسپ و دلنشین است و طالبت کلامش نہایت عذب و شیریں و در بستن مضامین بیگانہ یگانہ است و فکر صحیح صائب از ملکش استادانہ قوت نظم اکثر اصناف سخن دارد۔"

(گلشن بے خار)

"زبان ان کی صاف اور شیریں ہے۔ اس میں جابجا محاوروں کی چاشنی دیتے ہیں تو کلام اور بھی مزیدار ہو جاتا ہے، پھر ترکیب و بندش کی چستی سے پامال و فرسودہ مضامین بھی اس انداز سے ادا کرتے ہیں کہ اس میں ایک قسم کی لطافت و نزاکت پیدا ہو جاتی ہے۔"

(گل رعنا)

اسد اللہ خاں غالب

"پایہ اش از فحول استادان مکمل است غزلش چوں غزل و قصیدہ اش چوں قصیدہ خوانی و پذیرفتن مضامین شعر را کما حقہ ادا می نماید و بجمیع نکات و دقائق لفت بے لغزی برد۔"

(گلشن بے خار)

"جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے۔ اس سے ہزاروں درجہ عالم معنے میں کلام بلند ہے بلکہ اکثر شعر ایسے اعلیٰ درجہ کے پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس پر یہ کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاثیر سے مضامین معانی کے بیشہ کے نیستاں تھے، دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ مخصوص معلوم ہوتی ہیں، اول یہ کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی ان کا شیوۂ خاص تھا، دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے انھیں طبعی تعلق تھا۔ اس لیے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب سے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں لیکن جو شعر صاف صاف نکل گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے۔"

(آب حیات)

"مرزا صاحب نے اپنی غزل کی بنیاد ایسے اچھوتے اسالیب پر رکھی ہے جن کو اور شعرا نے چھوتے ہی نہیں تھے۔ وہ معمولی سے معمولی مضمون کو ایسے نرالے انداز سے ادا کرتے ہیں جو بالکل نیا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ضرور نہیں کہ ہر ایک مضمون ان کا اپنا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عام

درمثل تشبیہیں جو عموماً شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہیں ان سے جہاں تک ہو سکتا ہے بچتے ہیں اور نئی نئی تشبیہیں پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً سانس کو موج سے، بے خودی کو دریا سے، اضطراب کو شعلہ و حرارت سے، مغز سر کو بیضہ باش سے، رتبۂ انگور کو عقدِ وصال سے، تنوع کو خشت سے، بدن کو قالب خشت سے اور اسی قسم کی بہت سی تشبیہیں ان کے ابتدائی رنگ میں موجود ہیں۔ ان میں ایک خصوصیت ہے کہ متانت اور سنجیدگی کو شوخی اور نزاکت سے ایسا ہم دست کرتے ہیں کہ دونوں مل کر شعر میں تڑپ پیدا کر دیتے ہیں۔ سودا اور انشا نے شوخی اور ظرافت میں نزاکت سے بڑھ کر بعض دفعہ شوخی پر آتے ہیں تو نزاکت ان کے ہاں سے جھمت ہو جاتی ہے۔"

"ایک خصوصیت مرزا کی یہ ہے کہ ان کے مزاج میں ایک خاص چیز ہے جو (مومن کے سوا) اردو کے کسی شاعر میں کم دیکھی جاتی ہے۔ ان کا کلام ایسا پہلو دار ہوتا ہے کہ ہر وقت نظر میں ان سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں بلکہ غور کرنے کے بعد دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا شعر ہمیشہ ایک نیا لطف دیتا ہے۔" (گل رعنا)

مومن

"مومن خاں آں چناں مکالمہ دانی دارد کہ کسے را در یک صنف سخن ہمسر نیفتادہ و باوجود تخالف اسالیب بہ ہمرہ لفظ چنداں پسندیدگی نصیب او گشتہ کہ پارسیان ازاں نمودی انگشتہ و ہنیاں خود شیفتہ این نسبت پہ نازند کہ دانند۔" (گلشن بے خار)

"غزلوں میں ان کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں اور استعارہ اور تشبیہ کے زور نے اور بھی اعلیٰ درجہ پر پہنچایا ہے۔ ان میں معاملات عاشقانہ عجیب مزے سے ادا کیے ہیں۔ سبھی واسطے جو شعر ادا ہوتا ہے اس کا اندازہ جرأت سے ملتا ہے اور اس پر وہ خود بھی نازاں تھے۔ اشعار مذکورہ میں فارسی کی عمدہ نزاکتیں اور دلکش تراشیں ہیں کہ اردو کی سلاست میں اشکال پیدا کرتی ہیں۔ ان کی بیاض میں چند وصف خاص ہیں جن کا جاننا لطف سے خالی نہیں۔ وہ اکثر اشعار میں ایک شے کی طرف نسبت کرتے ہیں اور اس پر پھیر سے شوخی عجب لطف لطیف بلکہ معانی پیدا کرتے ہیں۔"

(آب حیات)

"موسیٰ خاں سے ہیں بقدر اسامیب بیان ہیں نزاکت و لطافت پیدا کرتے ہیں۔ وہ ان کی ذہانت اور جولانی طبع کا گہوارہ ہے۔ قصیدوں میں غزلوں میں مثنویوں میں ہر جگہ ان کا انداز بیان کیفیت سے خالی نہیں مگر افسوس ہے کہ ان کو مولانا حالی جیسا نقاد نہیں ملا جو ان کی کاوش فکر کے نتائج کو ملک میں نمایاں کرتا۔"

(گل رعنا)

ذوق

"قوت شعلی کہ او را ست دیگر ست۔ زادہ نہ شد و مہذا رطب و یابس کہ شیوۂ بسیار گویان است۔ در کلامش کمتر رود۔ ہر چہ از جمیع اصناف سخن قدرت تمام دارد و بلاغت او مسلم و مقرر است۔"

(گلشن بے خار)

"عام جوہر ان کے کلام کا تازگی مضمون صفائی کلام، چستی ترکیب، خوبی محاورہ اور عام فہمی ہے مگر حقیقت میں رنگ مختلف وقتوں میں مختلف۔ ابتدا میں مرزا رفیع کا انداز تھا شاہ نصیر سے ان دنوں معرکے ہو رہے تھے۔ ان کا ڈھنگ وہی تھا اس لیے انھوں نے بھی وہی اختیار کیا اس کے علاوہ مرزا کی طرز کو جلسہ کے گرمانے میں اور لوگوں کے لب و دہن سے داد و اکے نکال لینے میں ایک عجیب جادو کا اثر ہے چنانچہ

وہی مشکل طرحیں، سخت بندشیں، رعایتِ لفظی، صفائی کی بلندی، الفاظ کی شکوہ، ان کے ہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ چند روز کے بعد الٰہی بخش خان معروف ایک دیرینہ سال مشاق اور فقیر مزاج شخص تھے۔ ان کی پسند طبع کے موجب انھیں بھی تصوف اور عرفان اور درد و داغ کی طرف خیالات کو مائل کرنا پڑا۔ نوجوان ولیعہد طبیعت کے بادشاہ تھے۔ اِدھر یہ بھی جوان اور ان کی طبیعت بھی جوان تھی۔ وہ جرأت کے انداز کو پسند کرتے تھے اور جرأت اور تیدا نشا اور مصحفی کے مطلع اور اشعار بھی کھنٹوں سے اکثر آتے رہتے۔ مجھے ان کی غزلیں انہی کے انداز میں بناتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ان کی غزل اخیر کو ایک گلدستہ گل ہائے رنگا رنگ کا کہہ لیا تھا۔ دو تین شعر بلند خیالی کے ایک دو تصوف کے دو تین معاملے کے اور بیچ اس میں یہ ہوا تھا کہ ہر قافیہ بھی ایک خاص انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے کہ اسی میں بندھے تو لطیف دے۔ نہیں تو لچکا رہے۔ پس وہ مشاق باکمال اس بات کو پورا پورا سمجھا ہوا تھا اور جس قافیہ کو جس پہلو کے مناسب دیکھتا تھا اس میں باندھ دیتا تھا اور اس طرح باندھتا تھا کہ اور پہلو نظر نہ آتا تھا، ساتھ اس کے صفائی اور محاورہ کو ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے اور انہی اصول کے لحاظ سے تیر، نادر، مصحفی، سید انشا، جرأت بلکہ عام شعرائے متقدمین کو اس ڈھب سے یاد کرتے تھے گویا انھی کے شاگرد ہیں۔

(آبِ حیات)

بہادر شاہ ظفر

"شعرے کہ از طبع دُر بار جناب ایشاں می تراود لولوے باشد لالائے سخنے کہ از فکر صائب حضرت شاں سر برآرد درے باشد بکسر معانی سرمایہ بہا۔"

(مجموعۂ نغز)

"با ایں ہمہ بسیار مالوف است۔"

(گلشنِ بے خار)

"تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اوّل سے آخر تک یکساں ہے لیکن اس میں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے۔ طبقہ کی کمزوری صحیح اور ان کے اساتذہ کی کاوش فکر مسلّم مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کی ساری عمر کی محنت پر پانی پھیر کر اساتذہ کو ان کے دیوانوں کا مالک بنایا جائے۔"

(گلِ رعنا)

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ

"دیوان مرتب نظم و نثر اداے خاص و ادبہ بروز زبان ریختہ و پارسی بحرے می طرازد۔"

(طورِ کلیم)

"اس زمانہ میں نواب کی سخن گوئی سے زیادہ ان کی سخن فہمی کی دھوم تھی۔ مرزا نوشہ تک ان کی سخن فہمی کے معترف تھے۔ مرزا کے نزدیک نواب کی پسند شعر کے حسن و قبح کا معیار تھی۔"

(گلِ رعنا)

ناسخ

"از سن بست سالگی بمقتضائے موزونی طبع فکر شعر ہندی میکند و در تلاش ہائے معنی تازہ می نماید۔"

(ریاض الفصحا)

"سوا اللہ یہ عالی پایہ بلند اندیش نازک خیال است و در تلاش مضمون تازہ و معنی بیگانہ بے مثل و مثال از اقسام مخمور ہر غزل سرائی مائل و خیرا در غزلیات و ما بعیات صنعتے آخراز و دیدہ شور۔"

(گلشنِ بے خار)

"غزلوں میں شوکتِ الفاظ اور بلند پروازی اور نازک خیالی بہت ہے اور تاثیر کم، صائب کی تشبیہ و تمثیل کو اپنی صفت میں

ترکیب دے کر ایسی دستکاری اور مینا کاری فرمائی کہ صفحۂ قرطاس پر
بجلی اور ناصر علی کی حد میں جا پڑے اور اُردو میں وہ اسی صاحب طرز
بنا دیئے۔ انھیں ناسخ کھٹکا بھا ہے کیونکہ طرزِ قدیم کو نسخ کیا۔"
(آبِ حیات)

"ناسخ کی قوتِ تخیل نہایت زبردست ہے،
ایک چیز کو وہ سو سو طرح دیکھتے ہیں اور ہر دفعہ ان کو ایک جدا نظر
آتی ہے، پھر وہ کلام کی بنیاد اس پر قائم کر کے تشبیل اور مبالغہ سے
اس میں گرمی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس قوت کے
استعمال کرنے میں اکثر اعتدال سے گذر جاتے ہیں۔"

"کہیں پر مبالغہ اصلیت اور حاقیت سے اتنا
دور جا پڑتا ہے کہ ان کی بلند پروازی کے سامنے آفتاب تارا
بن کر رہ جاتا ہے، کہیں پر تمام عمارت کی بنیاد صرف لفظی تناسب
یا ہام پر ہوتی ہے، کہیں فرضی تشبیہوں اور استعاروں پر شعر کی
بنا قائم کرتے ہیں جو لطیف اور قریب الماخذ نہیں ہوتے،
کہیں پر کسی چیز سے تشبیہ دے کر اس کے تمام لوازم اور اوصاف
اس میں ثابت کرتے ہیں، حالانکہ اس سے کسی قسم کی مناسبت
نہیں ہوتی۔"

"یہ ان کا انداز بیان ہے جس کا نام نازک خیالی
یا خیال بندی رکھا گیا ہے اور اس نے متاخرین کی شاعری کو تباہ
کر کے چھوڑا۔ یہ لوگ صرف گل و بلبل سے دیوان تیار کر کے
اس کو گلستانِ خیال بنا دیتے ہیں اور افسوس ہے کہ یہی ان کی
شاعری کا طرۂ افتخار ہے۔" (گلِ رعنا)

آتش

"اگر عمرش وفا کردہ چند سالی بر ہمیں رویہ رفت
وقد بیش را منے در پیش نیا یدیکے از بے نظیرانِ روزگار
خواہد شد۔" (ریاض الفصحا)

"جو کلام ان کا ہے بحقیقت ہیں محاورۂ اُردو کا
بستہ العین ہے اور انشا پردازی ہند کا اعلیٰ نمونہ۔ شرفا کے گھر
کی بول چال کا انداز اس سے معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح لوگ
باتیں کرتے ہیں اسی طرح انھوں نے شعر کہہ دیے ہیں۔ ان
کے کلام نے پسند خاص اور قبولِ عام کی سند حاصل کی۔"
(آبِ حیات)

"زبان کی صحت و صفائی میں یہ اپنے حریف ناسخ
کے دوش بدوش چلتے ہیں مگر نازک خیالی اور بلند پروازی میں
ان کا حریف ان سے بہت زیادہ اونچا جاتا ہے اور سوز و گداز
میں یہ ان سے آگے ہیں۔" (گلِ رعنا)

شہید

"طبع خوشے دارد و در عروض دستگاہے معقول
و در حساب مکاتی مقبول۔" (گلشنِ بے خار)

"مشقِ سخن میں ایسی عمدہ کال بہم پہنچائی تھی کہ
جس کیسی ہی سنگلاخ ہو ایک طرح میں چوغزلہ چوغزلہ لکھتے تھے
اور کوئی غزل پچیس و پینتیس شعر سے کم نہ ہوتی۔"
(گلِ رعنا)

مرزا قربان علی سالک

"چند روز کی مشق میں سخن سنجی اور سخن فہمی میں یہ اپنے
معاصرین سے بہت بڑھ گئے اور مرزا غالب کے شاگردوں
میں سب سے بہتر نظر آنے لگے۔" (گلِ رعنا)

میر مہدی مجروح

"مجروح کی زبان نہایت صاف و سادہ ہے
چھوٹی چھوٹی بحروں میں اکثر غزلیں لکھی ہیں جن میں محاوروں کی چاشنی

زیادہ پائی جاتی ہے مگر اسا سیب کلام میں جدت و تازگی نہیں ہے۔ انھی مضمونوں کو جنھیں متوسط طبقہ کے شعرا نے اپنی مخصوص زبان و طریقۂ بیان میں ادا کیا ہے بھی کام میں لائے ہیں مگر بعض جگہ نزاکت خیال کی دلفریبی جھلک نہیں سکی معمولی بات میں جدت کا رنگ پیدا ہو گیا ہے تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زبان کی صفائی اور سادگی کے ساتھ کلام میں پختگی کے لوازم اچھی طرح پائے جاتے ہیں۔"

(گلِ رعنا)

میر حسین تسکین

"صاحب فکر بلند و اسلوب گفتار شیریں۔"

(گلشنِ بے خار)

"اساتذہ کی طرز ادا، معاملہ بندی اور شوخی کو روزمرہ کی صفائی اور سادگی کے ساتھ اس طرح سے ملا جلا دیا ہے کہ ان کے کلام میں دلآویزی کی شان بڑھ گئی ہے اور موقع و محل کے ساتھ اس قدر ہم رنگی پیدا ہو گئی ہے کہ اگر ان دونوں کے کلام کو مخلوط کر دیا جائے تو ایک کے کلام کو دوسرے کے کلام سے تمیز کرنا دشوار ہو جائے گا۔"

(گلِ رعنا)

نواب مرزا خاں داغ

"شوخی کہ در کلام اوست، بندہ ندانم کہ امروز کہ را دادہ باشند و زمانے کہ او را انگشت نما ندانند کی کس را میسر نیست، پیش ازیں ستائشِ گفتار او چہ تواں گفت۔ نیز اکلام ماقل و دل۔"

(طورِ کلیم)

"زبان میں فصاحت و سادگی، بیان میں شوخی اور بانکپن، کلام کو دیکھیے فصاحت اور محاورے کا دریا بہہ رہا ہے۔ حسن و عشق کے معاملات ہیں اور عاشق و معشوق کے خیالات، گویا اس میں تراب و ناب کا سرور پیدا کرتے ہیں جس کو سن کر عوام سر دھنتے ہیں اور خواص مزے لیتے ہیں۔"

(گلِ رعنا)

منشی امیر احمد امیر

"اہلِ سخن کا اتفاق ہے کہ امیر اس فن میں استاد مسلم الثبوت تھے۔ وہ ایسی طبیعت لے کر آئے تھے جو شعر و انشاء کے لیے موزوں تھی۔ انھوں نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، اس پر کلام کا زور، مضمون کی نزاکت سے ہر جگہ دست و گریبان ہے۔ بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو خوبصورتی سے پہلو بہ پہلو جڑے جاتے ہیں، خیالات بازاری اور مضامین بلند اس طور پر باندھتے تھے کہ اس باریک نقاشی پر فصاحت آئینہ کا کام دیتی ہے ان میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے جو داغ میں نہیں ہے کہ جیسے جیسے یہ بوڑھے ہوتے گئے۔ کلام میں جوانی کی آنکھیں پڑ رہی تھیں۔"

(گلِ رعنا)

خواجہ الطاف حسین حالی

"اُردو کا دیوان انھوں نے مرتب کیا ہے اور اُردو شاعری پر سوا اردو سو صفحہ کا ایک مبسوط مقدمہ لکھ کر اس میں شامل کر دیا ہے جو دیکھنے کے قابل ہے اور اُردو زبان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہے۔ اس سے مولانا کے مذاقِ شاعری کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔"

(گلِ رعنا)

حکیم ضامن علی جلال

"کثرتِ مشق سے کلام میں رنگ پیدا ہو گیا۔"

(گلِ رعنا)

شیخ امیر اللہ تسلیم

"عام جوہر ان کے کلام کا پختگی کلام، رنگینیٔ کلام،

لفظی الفاظ اور دلپذیر مضامین ہے جس سے بے ساختگی کی شان اس میں کھلی چھٹی معلوم ہوتی ہے۔" (گلِ رعنا)

سید اکبر حسین اکبر

"پنشن لے کر خانہ نشین ہونے کے بعد ان کی شاعری نکلی اور زمانے کے ہیجانِ عام اور جدید طرزِ معاشرت کی خرابیوں کا جو اثر ان کے دل پر پڑا ہوا تھا، اس کو ظرافت کے پیرہ میں ظاہر کرنے کی راہ انھوں نے ڈھونڈ نکالی۔ اکبر دشتِ خیال کے ساتھ مشرقی کی بھی محبت کا داعیہ ہے اس کے نزدیک ہر مشرقی نژاد کا فرض ہے کہ اپنے وطن سے محبت رکھے، اپنے مذہب کی حفاظت کرے، اپنے بزرگوں کا ادب ملحوظ رکھے، اپنے ہر رسم و رواج کو صرف اس لیے مذموم نہ سمجھے کہ وہ کسی مغربی رسم و رواج کے خلاف ہے بلکہ جائز حد تک اپنی چیزوں پر ناز ان کو ہے، اپنے ماضی سے واقف ہو، اپنے حال کی تنقید کر سکے اور اپنے مستقبل کی نسبت اچھی امید رکھے۔ یہ خیالات اس زور اور اس خوبی کے ساتھ معاصرین سے کسی کے ہاں نہیں ملتے۔" (گلِ رعنا)

شاد عظیم آبادی

"غزل جدید کے پیش رو کہے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے روایتی طرز تخیل کو لکھنوی زبان کے ساتھ اس خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے کہ منزلِ قدیم و منزلِ جدید کے درمیان میں نہایت دلکش و پُرسوز غزل نکل آتی ہے۔ ان کی فکر میں جرأت، تخیل میں وسعت اور بیان میں لطافت ہے۔ مولوی سید سلیمان صاحب ندوی نے طرزِ شاد کا آئینہ ہے۔ اس کو نقل کرنا کافی ہے:

"شاد کی شاعری حسن و عشق کے عام مضامین اور روایاتی انداز بیان سے قدم نہ پاک ہے۔ پاکیزہ تر حسن و عشق، سوز و درد، کشمکش و روداد کے علاوہ ان کی شاعری میں اخلاقی فلسفہ، تصوف اور توحید کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ غزل گوئی کے لحاظ سے شاد میر کے بہت سے انداز پائے جاتے ہیں۔ حسن و عشق کی داستان سرائی میں وہی سادگی اور متانت ہے۔ چھوٹے الفاظ میں سادہ نزاکتیں ہیں۔ بیان میں وہی رفعت ہے۔ میر ہی کے اوزان و بحور ہیں۔ وہی انداز کلام ہے۔ وہی فقیرانہ صدا ہے اس لیے شاد کو اس دورِ نو میں کا میر کہا جائے تو بالکل بجا ہے۔"

اس پر اس قدر اضافہ کی ضرورت ہے کہ شاد اپنی فضیلت علمی کے اثر سے اور انشائے قدیم کی مہارت و حذاقت کے سبب سے عربی کے بعض الفاظ اور ترکیبیں بھی استعمال کر گئے ہیں جس طرح ڈاکٹر مزمل حسین احمد دہلوی اپنے زمانہ طالب علمی میں لکھے ہوئے نوٹ میں مولانا فضل حق نے "نافع الاصباح" و "تبیان" "طلاب" "جراثیموں" "عین الحیات" جیسے الفاظ کو لطافتِ غزل کے منافی قرار دیا ہے۔ شاد عظیم آبادی کا کلام بھی اس انداز سے خالی نہیں۔" (تاریخ و تنقید) ادبیاتِ اردو

ریاض خیرآبادی

"ریاض کے لسان العصر ہونے میں شک و شبہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ وہ یقیناً اپنے زمانہ کی آواز تھے اور ایسی آواز جس کے آگے ہر آواز کچھ بیٹھ سی گئی۔ وہ زبان پر وہی قدرت رکھتے تھے جو ایک کھلاڑی بازی گر اپنے فنون پر رکھتا ہے ان کی شاعری ایسی فقرہ بازی ہے جو کسی وقت کسی صحبت میں رنج نہیں ہوتی۔ بعض نقادوں نے شاعری کو فاضل قوت کا مظاہرہ بتایا ہے۔ کم سے کم ریاض کی شاعری یہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ شاعر طوع کے بے چین دور سے گزر رہا ہے اور اس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی ہے۔ قوت اور توانائی کی فراوانی کا بڑھتا ہوا احساس اس کو طرح طرح کی دلچسپ حرکتیں کرنے پر مجبور کر رہا ہے جن پر سنجیدہ سے سنجیدہ اور بوڑھے سے بوڑھے آدمی کو تھوڑی دیر کے لیے ایسا مزا آتا ہے کہ وہ اپنی ساری بزرگی اور سنجیدگی بھول جاتا ہے جیسے بچوں کے بعض کھیل ہوتے ہیں مثلاً پتنگ بازی کہ سن رسیدہ سے سن رسیدہ اور مشغول سے مشغول ہستیاں بھی ایک مرتبہ نظر اٹھا کر کچھ دیر کے لیے محو ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ معاً یہ بھی احساس ہو سکتا ہے کہ بچوں کا کھیل ہے، زیادہ وقت نہ دو ورنہ کام کا حرج ہو جائے گا۔"

(تنقیدی حاشیے)

آرزو لکھنوی

"آرزو ان شعرا میں سے ہیں جو چلے لکھنؤ کی آخری بہار یعنی جلال کی گرمی اور سختی سے لیکن اس سے بھی نئے انداز بیان کی سادگی بھی پیدا کی۔ یہاں تک کہ آج اردو کے ممتاز شعراء میں آرزو کا نام دو حیثیتوں سے قابل ذکر ہے۔ ایک خیال کی سادگی اور نرمی کی وجہ سے دوسرے زبان کی عام فہم شیرینی کی وجہ سے غزل کی زبان کو بول چال کی زبان کے قریب لاکر شاعر نے یہ واضح کیا ہے کہ شاعر کی بولی دنیا والوں کی بولی سے الگ نہیں ہوتی اور نہ وہ قدیم بحروں کی قید میں ہمیشہ اسیر رہتی ہے۔"

(نئے اور پرانے چراغ)

اقبال

"اقبال کی غزل کی خصوصیت اس کا جوش بیان اور رمزیت ہے جس کی مثال حافظ اور غالب کو چھوڑ کر دوسروں کے ہاں مشکل ہی سے ملے گی۔ اس کے نظم الفاظ میں بلا کی ایجاز قوت پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہ حسن ادا کے جادو سے انسانی ذہن کو مسحور کر دیتا ہے۔

اس کی تمام غزلوں میں غنائی عنصر کا بہترین اظہار ہوا ہے۔ وہ ایسی بحریں اور زمین منتخب کرتا ہے جو تغزل کے لیے خاص طور پر موزوں ہوتی ہیں۔ شگفتہ زمینیں اور مضمون کے مناسب وزن منتخب کرنے سے شاعر اپنے کلام میں بے پایاں دلفریبی اور دلکشی پیدا کر دیتا ہے۔ اقبال کے ہاں بھی شراب و غیرہ، باده خوار اور مے فروش، زلف و خال اور رخسار و دندان کا بھی پیرایہ بیان موجود ہے لیکن وہ ان کے ذریعے رمز و کنایہ کی ایسی دنیا تخلیق کر دیتا ہے کہ جذبہ و وجدان جھومنے لگتے ہیں ——

اقبال نے اپنی شاعری کے بالکل ابتدائی زمانے میں ایک غزل لکھی تھی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

اس ایک شعر پر بہت سے شعراء کے دیوانوں کو قربان کیا جا سکتا ہے۔

بعض اردو غزلیں سہل ممتنع کے معیار پر پوری اترتی ہیں ان کا ایک ایک لفظ جذبات و کیفیات کی آواز بازگشت ہے۔ لوازم عشق کی کیفیات کو وہ کس لطف اور بے تکلفی کے ساتھ بیان کرتا ہے ؎

خط آنے تک ہمیں اس دن انتظار کیا تھی	مگر وعدہ کرتے ہوئے تو کیا تھی
تمھارے پیامی نے سب راز کھولا	خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاکا	تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں	مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
کسی کو ہو عدہ بے حجابی	کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی	بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

(روح اقبال)

کے خواہی کہ غالب مرحوم کے بعد ہندوستان میں کون سا شخص پیدا ہوگا جو اردو شاعری میں ایک نئی روح پھونک دیگا اور اس کی دولت غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالا انداز بیان تھا جو ان میں نہ تھے اور اردو ادب کے فروغ کا باعث ہوئے ہیں اردو کی خوش اقبالی دیکھئے کہ اس زمانے میں اقبال ایسا شاعر اسے نصیب ہوا جس کے کلام کا سکہ ہندوستان بھر کی اردو دان دنیا کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اور جس کی شہرت روم و ایران بلکہ فرنگستان تک پہنچ گئی ہے۔

غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اگر میں شاعر کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا اس نے ان کی روح کو عالم بیکسی میں جی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔

(دیباچہ بانگ درا)

حسرت موہانی

حسرت اپنی زندگی ہی میں کلاسیکل حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ انھوں نے ہر استاد سے فیض اٹھایا ہے لکھنؤ کی زبان کے باوجود رنگ دہلی کی نمود قائم رکھی ہے۔ مومن، جرأت، نسیم، تسلیم سب کا نام روشن کیا ہے۔ ان کا حسن و عشق ان کے بجز و فراق سب اسی دنیا کی چیزیں ہیں مگر الفاظ نے ان میں ایک ابدی چاشنی بھر دی ہے اور زمان و مکاں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ حسرت نے گھر بلو فضا کے حسن کو دیکھا ہے اور اس دنیا کی عورت میں حور آسمان کا تقدس اور جمال دیکھا یا ہے۔ ان کے حسن کی طرح ان کا کلام بھی سدا بہار ہے۔

(نشے اور پرلے چراغ)

اصغر گونڈوی

جناب اصغر فطرتاً شدید الاحساس، اندیشہ اور صاحب وجد و حال ہیں اس لیے ان کا ایک ایک شعر سننے والوں پر جو شکوہ الفاظ، قوس ترکیب، جوش بیان، ندرت ادا کا ایک دلفریب سحر ہے اسے اور معارف ان کی شاعری کا پہلو، وجد و حال اس کی روح، ندرت ادا اس کی صورت اور روش بیان اس کا جسم ہے۔ یہ سب مثالاً شعر ذیل ملاحظہ طلب ہے۔

خرمن گل سے لپٹ کر وہیں مر جانا تھا
اب کرے میرے گلہ شمع شبستاں کوئی

حقیقت یہ ہے کہ غالب، مومن نے اساتذۂ ایران کے تتبع اور اپنے ذہنی رجحانات سے اردو شاعری میں جو روشیں اختیار کیے تھے رفتہ رفتہ نقش اولیں بن گئے۔ جناب اصغر حکیم مومن خاں کے سلسلۂ تلامذہ میں ہیں اور غالب کے شیدائیوں میں اور خوش قسمتی سے بادۂ عرفان کے ذوق شناس بھی ہیں اس لیے ان کی شاعری میں حکیم مومن خاں کی بلاغت اسلوب اور شگفتگی ترکیب و غالب کا زور بیان اور کتنہ آفرینی شیر و شکر ہو کر ایک نئی صورت میں جلوہ گر ہوئے ہیں جس میں تصوف و عرفان نے تاثیر کی روح پھونک دی ہے۔ ان کی شاعری پر نقش ثانی ہے اس لیے نقش اولیں کی خامیوں سے پاک ہے۔ اس حیثیت سے اگر ان کو ایک اور اعلیٰ کا موجد کہا جائے گا تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا (تبصرہ نشاط دوراں)

احباب میری کوتاہ قلمی سے خفا ہیں ہیں
خصوصاً تقریظ کے معاملہ میں۔ لیکن بعض تعلقات ایسے ہوتے ہیں جن کی تعمیل کرنی ہی پڑتی ہے۔ ایسا ہی ایک تقاضا ان سطور کی نگارش کا باعث ہوا ہے۔ تقاضا اگر صاحب کلام کا ہوتا تو میں حسب معمول معذرت کر دیتا مگر خود کلام کا تقاضا ہے

اور اس کے لیے میرے پاس کوئی معذرت نہیں۔

اُردو شاعری کی دو سو رہ صف طویل نہیں ہے اور اگر معیار بندی پوری طرح قائم رکھی جائے تو معدودے چند اصحاب ذوق سے شمار آگے نہیں بڑھتا۔ انہی اصحاب ذوق میں مولوی اصغر حسین صاحب اصغر بھی ہیں جن کے کلام کا پہلا حصہ "نشاطِ روح" اور دوسرا حصہ "سرودِ زندگی" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔

کئی سال کی بات ہے انھوں نے اپنے کلام کا پہلا مجموعہ "نشاطِ روح" کے نام سے شائع ہوا تھا مجھے بھیجا تھا۔ اس وقت تک ان کا کلام میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔ چونکہ وقت کی عام ادبی سرگرمیوں کی طرف سے طبیعت مایوسی کی عادی ہو چکی ہے اس لیے قدرتی طور پر ذہن کسی غیر معمولی دلچسپی کے لیے مستعد نہ تھا۔ میں نے بے دلی سے مجموعہ اٹھایا اور چاہا کہ ورق گردانی کر کے رکھ دوں لیکن مجھے اس اعتراف میں تامل نہیں کہ جونہی دو چار شعر نظر سے گزرے ۔۔۔ میں چونک اٹھا اور جوں جوں مطالعہ کرتا گیا، یہ تعجب انگیز مسرت بڑھتی گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وقت کی عام مایوسیاں مستثنیات سے خالی نہیں۔

میری نگاہ نکتہ چینی میں کمی نہیں کرتی۔ میں معیار کی پستی پر کسی طرح اپنے آپ کو راضی نہیں کر سکتا۔ اہل فن کو مجھ سے خوش گمانی کی نہیں بدگمانی کی شکایت ہے۔ تاہم میں محسوس کرتا ہوں جس شاعر کے کلام میں حسب ذیل اشعار موجود ہوں اس کی شاعری کی وقعت بحث و اثبات کی محتاج نہیں ہو سکتی ؎

قیدِ قفس میں طاقتِ پرواز کہاں
رعشہ سا کچھ ضرور ابھی بال و پر میں ہے

بھائے درد و الم، درد تم کی لذت ہے
وہ رنگ عشق ہے جو آہ ہو اثر کے لیے

نہ کی کچھ لذتِ افتادگی میں اعتنا میں نے
مجھے دیکھا کیا الٹ کر غبارِ کارواں برسوں

(نقوش: سرودِ زندگی)

فانی بدایونی

"فانی کے یہاں فلسفہ طرازی، غم، تغزل، الطف زبان سبھی کا امتزاج ہوتا ہے۔ اس دور میں غالب کی پیروی میں اگر کوئی صحیح معنی میں کامیاب ہوا ہے تو وہ فانی اور اقبال ہیں۔ اقبال نے نظم میں غالب کی رعنائ تخیل اور بلاغت اسلوب، فانی نے غالب ہی کے میدان میں غالب کی تقلید کی۔ فانی کی زندگی ان سے عبارت ہے۔ یہ لوگ یہ کہہ کر فانی کی عظمت کو کم کرنا چاہتے ہیں کہ اس میں سوائے رونے اور بسورنے کے کچھ نہیں، وہ بھی مقصد کرتے ہیں۔ فانی نے زندگی اور موت دونوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کے چہرے سے نقاب اٹھایا ہے انھوں نے موت سے اس کی ہیبت اور پُراسرار کیفیت چھین لی ہے اور اسے زندگی کی طرح گویا بنا دیا ہے۔"

(نئے اور پرانے چراغ)

جگر مرادآبادی

"جگر اس دور کے سب سے زیادہ مقبول اور مشہور غزل گو شعراء میں سے ہیں، ان کو لوگ مانیں یا نہ مانیں، ان کے کلام پر سبھی سر دھنتے ہیں۔ جگر کے یہاں داغ، حسرت اور کچھ کچھ مومن کی شان پائی جاتی ہے۔ بعض کے نزدیک ان میں جدت فکر کم اور جدتِ کلام و دہن زیادہ ہے۔ بجائے والہانہ انداز کے ایک ہیجانی اضطراب کی کیفیت نظر آتی ہے۔ جگر نے اُردو غزل کو حافظ کی رنگینی و سرمستی پھر سے عطا کی، حسرت کے یہاں شگفتگی و شادابی ہے، جگر کے یہاں تندی و تیزی جگر اس

...ر کے نام شعراء سے زیادہ سیر دگی ۱۸۵۷ء اور سرسی
...ر کے ہاں ہے۔ (نئے اور پرانے چراغ)

جوش ملیح آبادی

"جوش ان شعراء میں سے ہیں جو نظم اور غزل دونوں
...ں قدرت رکھتے ہیں۔ اقبال کے بعد یہی غزل کو نظم کا
...ل اور کائناتی لباس اور نظم کو غزل کی رنگینی اور تیزی بخشنے میں
...یاب ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں جگر سے زیادہ ملبہ آہنگی
...ر روانگی پائی جاتی ہے۔ جگر کے یہاں رنگینی اور مستی زیادہ ہے
...جوش کے یہاں عرشاب اور شاعر انقلاب کے نام سے اکثر یاد
...کیا جاتا ہے۔ نظموں میں انھوں نے بہت سے انقلابی مضامین
...ہ کیے ہیں مگر نظموں میں ان کی فنائیت کہاں موجود ہے۔"
(نئے اور پرانے چراغ)

فراق گورکھپوری

"ہمارے تمام شعراء میں فراق گورکھپوری سب سے
...زیادہ مغربی ادب سے واقف اور مغربی سانچوں سے آشنا
...ہیں نظر آتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں زیادہ تنقید حیات کی ایک
...مسلسل کوشش ملتی ہے اور یوں بھی انھیں اردو کا نقاد شاعر
...کہا جاتا ہے۔ فراق کے یہاں نفسیاتی تجزیہ بھی ہے جہاں جدید
...بھی ان کی اکھڑی اکھڑی سی مگر منفرد زبان بھی ایک دلکشی رکھتی
...ہے۔ ان کے ہر مصرعہ شفا کی طرف وہ خود اشارہ کرتے ہیں، ابھی
...وہ نیم خوابیدہ سی ہے شاید وقت اسے بیدار کر دے۔"
(نئے اور پرانے چراغ)

اثر لکھنوی

"اثر اس وقت جس مقام پر ہیں وہ کافی بلند ہے۔
...لکھنؤ کی شاعری میں مستی کی کمی ہے یا خشک آہیں ہیں یا سرسری فلسفہ
...غالب کی تقلید بھی انھیں فلسفہ کی طرف لے گئی وحدت میں کثرت
...نام لکھنوی شعراء میں اگر کہیں بھی رنگینی اور شادابی ملتی ہے تو عشق
...ہیں۔ دیا شنکر اور اثر کے یہاں ان کے یہاں خود رنگ کی
...جھلک ہے اور جدید رنگ کی رسائی۔ وہ بھی مست اور بے خود
...نہیں ہوتے ان کی لطیف اور ہلکی چاشنی بھی اپنے جانی ہے۔"
(نئے اور پرانے چراغ)

یاس یگانہ

"لکھنؤ اسکول سے تو علی کے طور پر ان کے
...یہاں بغاوت کے خلاف بغاوت ضرور ملتی ہے مگر اسے صحت بخش
...نہیں کہہ سکتے۔ ان کے یہاں وہ مردانگی ہے جو جوش میں ہے
...وہ رعنائی جو حسرت میں ہے وہ نفاست جو اصغر کے یہاں ہے
...وہ مستی جو جگر کے یہاں ہے نہ وہ ندرت جو اقبال میں ہے
...لوگوں سے زیادہ یہ اعمیوں میں اور قطعات میں کامیاب
...تے ہیں جہاں کوئی ایک خاص بات اختصاص اشارہ ہی کافی
...ہوتا ہے۔ ان کے یہاں قوت ایجاد کی کمی نہیں انھیں کوئی مکمی
...مقلد نہیں کہہ سکتا مگر ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے
...کہ انھوں نے پیشرو سے ہی کوئی سبق لیا ہے۔"
(نئے اور پرانے چراغ)

حفیظ جالندھری

"حفیظ کے یہاں آرزو اور حسرت کی طرح گیتوں
...کا سا رچاؤ پایا جاتا ہے۔ غزل میں ایک سادگی تو وہ تھی جو یگانہ
...نے برتی دوسری یہ جو حالی اور عظمت اللہ خاں کے اثر سے
...آئی۔ اس میں موسیقی کا زیادہ لحاظ ہندی کے نرم اور شیریں الفاظ
...بول چال کی زبان لمبی لمبی بحریں کامیاب ہیں۔ حفیظ سے پہلے

گنبدوں کے ذریعہ سے شہرت پائی مگر ان کی غزلوں میں بھی گنبدوں کی سادگی اور شیرینی موجود ہے۔"

(نئے اور پرانے چراغ)

سیماب اکبرآبادی

"یہ تینوں اچھے شاعروں میں سے ہیں، وہ ان لوگوں میں نہیں جو کوئی ذاتی اُلجھن کوئی ہیجان کوئی ہیجان کو بنیاد بنا کر شعر کہتے ہیں مگر وہ خوش گو اور خوش فکر ضرور ہیں۔ ان کے یہاں کہیں کہیں بھی ہیں اور لطیف اور نرم جذبات بھی، مگر باوجود استاد ہونے کے کبھی وہ اقبال کبھی جوش اور بعض وقت جگر کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں۔ سیماب کے کلام سے اس دور کے تمام رجحانات معلوم ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے ہر رنگ میں شعر کہے ہیں اور ہر جدید کی ترجمانی کی ہے۔"

(نئے اور پرانے چراغ)

کتابیات

میر محمد تقی — نکات الشعراء
محمد آلدین خواجہ اور گنج بادی — گلشنِ گفتار
فتح علی حسینی گردیزی — تذکرۂ گردیزی
قائم۔ قیام الدین چاند پوری — مخزن نکات
شفیق۔ لچھمی نراین — چمنستانِ شعراء
حسن۔ میر غلام حسن — تذکرۂ شعرائے اُردو
علی ابراہیم خاں — گلشنِ ابراہیم
مصحفی۔ غلام ہمدانی — تذکرۂ ہندی۔ ریاض الفصحاء
لطف۔ مرزا علی — گلشنِ ہند
تشنہ۔ نواب مصطفےٰ خاں — گلشنِ بے خار
نساخ۔ عبدالغفور خاں — سخن شعراء
آزاد۔ مولوی محمد حسین — آبِ حیات
حالی۔ مولوی حکیم — گلِ رعنا
حالی۔ خواجہ الطاف حسین — مقدمہ شعر و شاعری
نیاز فتحپوری۔ نیاز محمد خاں — انتقادیات (حصہ دوم)
عبدالسلام ندوی — شعر الہند
حامد حسن قادری — تاریخ و تنقید
طور کلیم

مسعود حسن رضوی ادیب ڈاکٹر رشید۔ "نگار" لکھنؤ (انتقاد نمبر ۱۹۴۶ء)
کلیم الدین احمد — اُردو شاعری پر ایک نظر
یوسف حسین خاں، ڈاکٹر — غزل (طبع اوّل)۔ روحِ اقبال
اعجاز حسین، سید — نئے ادبی رجحانات
سرور۔ آل احمد — نئے اور پرانے چراغ (طبع دوم)
احتشام حسین — تنقیدی جائزے
عبداللہ۔ ڈاکٹر سید محمد — بحث و نظر
عبادت بریلوی۔ ڈاکٹر — ماہِ نو کراچی، فروری ۱۹۵۳ء
وقار عظیم، سید — ماہِ نو کراچی، فروری ۱۹۵۳ء
ابواللیث صدیقی۔ ڈاکٹر — ماہِ نو کراچی، جنوری ۱۹۵۲ء
باقر حسین۔ سید — ماہِ نو کراچی، فروری ۱۹۵۲ء
فیض۔ فیض احمد — سرآغاز "نقشِ فریادی"
سرزا جعفری۔ علی — ترقی پسند ادب
عبدالقادر، سر — دیباچہ "بانگِ درا"
مجنوں۔ گورکھپوری — تنقیدی حاشیے
سہیل۔ اقبال احمد — تبصرہ "نشاطِ روح"
آزاد۔ ابوالکلام — تقریظ "سرودِ زندگی"

سمپوزیم

اُردو غزل کا مستقبل

حصہ لینے والے :-

— چراغ حسن حسرت
— عبدالمجید سالک
— ابوالاثر حفیظ صدیقی
— دتاتریہ کیفی
— عبادت بریلوی
— حفیظ جالندھری
— حامد علیخاں
— صوفی تبسم
— احمد ندیم قاسمی
— سبط حسن
— احسان دانش
— نظیر کاشمیری
— حبیب اشعر

اُردو غزل کا مستقبل

حفیظ جالندھری: ۔ اچھا تو آیئے پہلے یہ طے کر لیا جائے کہ غزل کیا ہے؟

چراغ حسن حسرت: ۔ غزل کا آغاز در اصل قصیدہ کی تشبیب سے ہوا۔

صوفی تبسم: ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک غزل قصیدہ ہی کی ایک قسم ہے۔

حامد علی خاں: ۔ اس سلسلہ میں میں دو خصوصیات کو پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ ایک غنائیت اور دوسری موضوع۔ غزل کا موضوع ایسے انسانی جذبات ہیں، جو داخلی طور پر ایک فرد کے ہیں۔ لیکن ان میں ایک آفاقیت ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کے دل کے تاروں کو جھنجھوڑتے ہیں۔ سب سے بڑا موضوع محبت ہے۔

ابو اللیث صدیقی: ۔ یہ موضوع تو نظم کا بھی ہو سکتا ہے۔

حامد علی خاں: ۔ غزل کے تمام اشعار کا موضوع ایک نہیں ہوتا۔ ہر شعر میں مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک شعر میں نفرت ہو سکتی ہے۔ اور دوسرے شعر میں انتہائی اُلفت۔

حفیظ جالندھری: ۔ نفرت بھی تو محبت ہی کا ایک پہلو ہے۔

حامد علی خاں: ۔ لیکن اگر غزل میں تین بنانے کا طریقہ بتایا جائے تو وہ غزل نہیں ہو سکتی۔

حفیظ جالندھری: ۔ اس کا ایک اپنا مزاج ہے۔

حامد علیخاں: ۔ بلکہ یہ کہئے کہ ایک فرد اپنے تجربہ کو اس طرح پیش کرے کہ وہ سب کا تجربہ معلوم ہو تو وہ غزل ہے۔

صوفی تبسم: ۔ صرف محبت کا تجربہ؟

حامد علیخاں: ۔ یہ ضروری نہیں، مثلاً اقبال کے ہاں عورت اور محبت کا ذکر کم ہے۔

حفیظ جالندھری: ۔ اگر آپ اس بحث میں اقبال کی غزل کو لائیں گے تو ہم اپنی عقیدت کی وجہ سے اس سے الگ ہو جائیں گے۔

صوفی تبسم: ۔ ہمیں کسی ترتیب سے چلنا چاہیئے۔

ظہیر کاشمیری: ۔ ہاں یہ فروعی باتیں ہیں۔ ہم تو بنیادی عناصر کا تجزیہ کرنے چلے ہیں جو اسے دوسری اصنافِ سخن سے علیحدہ کرتے ہیں۔

حامد علیخاں: ۔ میں یہ کہوں گا کہ نظم میں ربط اور توضیح ضروری ہے۔ برخلاف اس کے غزل میں تسلسل نہیں ہوتا۔ غزل میں خیال کے اس عمل کو نہیں پیش کرتے جو CONCENTRATED ہے۔ اس کے مقابلہ میں نظم میں زیادہ کوشش کی ضرورت ہے۔ کلیم الدین احمد نے شاید اس لئے غزل کو غیر وحشی صنفِ سخن کہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں ان کے خیال میں غزل میں عمومیت زیادہ ہے۔

ظہیر کاشمیری: ۔ غزل کے ایک شعر میں مضمون ادا کر دیا جاتا ہے۔ لیکن نظم میں منطقی تسلسل ہوتا ہے۔ اور فکر کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔

صوفی تبسم: ۔ غزل کی پہلی خوبی اس کا ایجاز اور اختصار ہے۔

چراغ حسن حسرت: ۔ تبسم صاحب نے درست فرمایا۔ ایجاز و اختصار اور رمز و کنایہ غزل کی خصوصیات ہیں۔

حفیظ جالندھری: ۔ شاعر جو بڑھا ہو کر رباعی کہتا ہے، اس لئے کہ دو مصرعوں میں خیال کو ادا نہیں کر سکتا تو چار مصرعے

کہتا ہے۔

احسان دانش: ۔ یہی اُسے جو کچھ کہنا ہوتا ہے۔ وہ پھر بھی عموماً ایک ہی مصرع میں کہتا ہے اور باقی تین مصرعے اسے تمہیداً یا رسماً لکھنے پڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رباعی زیادہ مقبول نہ ہو سکی۔

چراغ حسن حسرت: ۔ اکثر نظمیں غزل کے ایک شعر کو پھیلا کر لکھی گئی ہیں۔

ظہیر کاشمیری: ۔ غزل میں موڈ کی ہم آہنگی فارم میں ہوتی ہے لیکن اشعار میں نہیں۔ ہر شعر بذاتِ خود خیال کی اکائی ہوتا ہے۔

سبطِ حسن: ۔ غزل کی صنف پر گفتگو کرتے وقت یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ہمیں غزل کی جامع تعریف بیان کرنی چاہیے۔ اگر اس پر تاریخی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی جائے تو زیادہ بہتر ہو۔ غزل کی ایک مسلسل ارتقائی تاریخ ہے اور ہر دور میں بدیع ابھرتی ہوئی ہیں۔ فارم کے علاوہ بحریں بھی نئی ایجاد ہوئی ہیں۔

حامد علیخاں: ۔ فارم سے مراد ظاہری ہیئت ہے۔ مطلع، اشعار اور مقطع ——— یہ فارم ہے۔

سبطِ حسن: ۔ میری مراد اس سے نہیں۔ غزل فارسی زبان سے آئی ہے، ہندی میں گیت اس سے پہلے موجود ہے، جسے آپ غزل کا مزاج کہتے ہیں۔ غزل عورتوں سے بات چیت کرنے کو کہتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ غزل میں ابتدا میں محبت کے جذبات بیان ہوئے ہوں۔ اور بعد میں تصوف اور فلسفے کے مسائل شامل ہوئے ہوں۔ اقبال تک آتے ہیں اس میں بڑی بڑی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ علامتیں، اشارات اور شکل کے علاوہ معانی بھی بدل گئے ہیں۔

حامد علیخاں: ۔ یہ فارم نہیں۔ بلکہ اس کی ظاہری ہیئت فارم ہے۔

حفیظ جالندھری: ۔ ہم نے فارسی سے فارم لی ہے۔ عربی میں غزل نہیں ملتی۔

چراغ حسن حسرت: ۔ یہ درست ہے کہ عربی میں غزل نہیں ہے۔ لیکن قصائد میں تشبیب تو ہے۔

حفیظ جالندھری: ۔ میری مراد یہ ہے کہ مضمون کو ادا کرنے کا یہ طریقہ یعنی پورے مضمون کو ایک اکائی میں بیان کرنے کا طریقہ کسی دوسری زبان میں نہیں تھا۔

ظہیر کاشمیری: ۔ غالباً حفیظ صاحب غزل سے مراد LYRICAL THOUGHT لیتے ہیں۔ اس وجہ سے بات اور سمت کو چل گئی۔

چراغ حسن حسرت: ۔ ہم غلط راستہ پر جا پہنچے۔ غزل فارسی سے آئی ہے۔ اور اقبال تک پہنچنے میں اس نے بڑی لمبی مسافت طے کی ہے۔ سعدی کی غزل کا استاد ہے۔ سعدی کے ہاں موڈ کا تسلسل ہے۔ مائل گرتا گیا اور موڈ کا تسلسل کم ہوتا گیا۔ حافظ کے ہاں بھی موڈ کا تسلسل ہے۔ بعد میں ہر شعر الگ الگ ہونے لگا۔

ظہیر کاشمیری: ۔ فارم کے لحاظ سے غزل دیگر اصناف سخن سے علیحدہ ہے۔ جہاں تک خیالات کو سمونے کا تعلق ہے، زمانہ کے عروج و زوال کے ساتھ اپنے اندر مختلف خیالات کو سمو لیتی ہے۔

احسان دانش: ۔ یہ بات تو سارے لٹریچر پر حاوی ہو سکتی ہے

ظہیر کاشمیری: ۔ لیکن قصیدہ مر گیا ہے اور غزل زندہ ہے۔

احسان دانش: ۔ یہ بالکل درست ہے، یہی ایک صنف سخن ہے جس میں ہم ایک شعر کے احاطہ میں وسیع خیالات کو بند کرتے ہیں۔ اور یہی اس صنف کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی وجہ ہے۔

ابو اللیث صدیقی: ۔ ہمیں بحث کو محدود کرنا چاہیے۔ موجودہ غزل کی فارم وہ ہے جو فارسی سے آئی۔ ہمارے یہاں اودھ میں امیر خسرو کی پہیلیاں فارسی کی بہ نسبت ہندی سے زیادہ قریب ہے اور اردو کی پوری غنائیہ شاعری ہندی شاعری سے متاثر معلوم ہوتی ہے لہٰذا غزل نے اپنی خصوصی انفرادیت کے ساتھ ترقی

گی مثلیں ملے گیں۔ وہ نظم کی ایک ایسی شکل ہے جس کے اشعار میں کوئی ہم آہنگی ضروری نہیں اس کا موضوع محض محبت نہیں۔ محبت قصیدہ اور نظم کا موضوع بھی ہو سکتی ہے بلکہ اس کی روح وہ شدید قسم کی داخلیت ہے جس کے تحت شاعر اپنے جذبات اور احساسات کو اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ وہ غم دوراں کا پرتو معلوم ہونے لگتے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ غزل گو شاعر خارجی حالات سے متاثر نہیں ہوتا۔ اثر وہ انہی سے لیتا ہے۔ لیکن اس کا انداز بیاں اور اظہار کلیتہً ان احساسات کے تابع ہوتا ہے جو اس تاثر کے بعد اس کے اپنے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ کیفیت ہے جسے رمزیت یا ایمائیت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے ——— اس کی روح وہ شدید قسم کی داخلیت ہے جس کے تحت شاعر اپنے جذبات اور احساسات کو اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ وہ تبسم دوراں کا پرتو معلوم ہونے لگتے ہیں۔

ظہیر کاشمیری: ۔ اس سے مجھے اختلاف ہے۔ شاعر کا (ATTITUDE) عمل طور پر داخلی نہیں ہوتا۔ خارجی بھی ہو سکتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ فارم کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ اس میں خیال کے عمل کو کسی (SUBJECTIVE) انداز میں ظاہر کیا جائے۔

ابواللیث صدیقی: ۔ فارم کا یہ تقاضا ہرگز نہیں۔ لکھنؤ کی ساری غزلیہ شاعری داخلیت سے عاری ہے۔ آپ کو ایسی بہت سی غزلیں ملیں گی جن میں داخلیت قطعاً نہیں۔ لیکن ان میں تغزل کی کمی ہے۔

چراغ حسن حسرت: ۔ اگر یہ بحث اسی طرح جاری رہی تو غزل کے مستقبل کا فیصلہ نہ ہو سکے گا۔ ہمیں اب جلد از جلد تشبیب سے گریز کرنی چاہئے۔

(قہقہہ)

حفیظ جالندھری: ۔ اب تک جو کچھ بحث ہوئی اس سے گویا ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ شاعر جو کچھ کہتا ہے۔ وہ (UNIVERSAL) ہوتا ہے۔ وہ اپنے محسوسات اور تجربہ کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ سننے والا یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے اور فارم اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے جس کی رو سے ہر شعر ایک علیحدہ اکائی ہوتا ہے اور مختلف موڈوں کی نمائندگی کرتا ہے ہر شعر میں ایک خاص تاثر ہوتا ہے۔ اس کے بعد کوئی بات باقی نہیں رہتی۔ اگر وہ جائے تو اسے قتع بند کہتے ہیں۔

صوفی تبسم: ۔ غزل کی سب سے بڑی خصوصیت فارم کو نہ کہئے بلکہ اس کی ایمائیت اور رمزیت اس کی سب سے بڑی جان ہے۔ جسے ابواللیث صاحب نے شدید داخلیت سے تعبیر کیا ہے۔ یہ ایمائی قوت جس شعر میں زیادہ سے زیادہ بھر دی گئی ہو گی وہ شعر تغزل کی جان ہے۔

چراغ حسن حسرت: ۔ ؎ برسر نکتہ ، اوامی کنم کہ خلوتیاں
سر بکشا و ندورہ فرو بستہ

(نظیری)

صوفی تبسم: ۔ جذبے کا پھیلاؤ نظم ہے خواہ محبت کا ہو یا کوئی اور۔ یہی جذبہ سمٹ کر یا جھول نچوڑ صاحب کنسٹریٹ ہو کر غزل کے شعر میں آجاتا ہے تو وہ غزل ہے، تغزل ایک اسلوب بیان ہے۔ دوسری بات جو سبطِ حسن نے کہی غزل اور تغزل میں ہر دور میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

ابواللیث صدیقی: ۔ یہاں ایک بات رہ گئی ہے جس کی طرف ابتدائی بحث میں سبطِ حسن صاحب نے اشارہ کیا تھا کہ غزل کی عام تعریف جو کی گئی ہے، عورت سے ہم کلام ہونا تو اس سے ایک مغالطہ پیدا ہو گیا ہے۔ شاعر فی الحقیقت اپنے آپ سے زیادہ ہم کلام ہوتا ہے۔

احسان دانش: ۔ لوگ اس صنف کو غلطی سے صرف عشق و عشق کے معاملات بیان کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ درآں حالیکہ اس کی صحیح وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جس احتیاط سے عورتوں کیساتھ بات چیت کی جاتی ہے کہ انداز بیاں میں اختصار ہو، شرینی ہو، لوچ ہو، سلاست ہو، جامعیت ہو، وہی احتیاط غزل کا مزاج ہے۔

ظہیر کاشمیری: ۔ اس بحث سے اب تک ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جہاں تک غزل کی فارم کا تعلق ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ جہاں تک خیال کا تعلق ہے، یہ کلیہ نہیں بن سکتا کہ داخلی تصورات ہی غزل کے مزاج کا حصہ ہیں۔ کئی اشعار یک وقت داخلی اور خارجی حقیقتوں کی زندہ مثالیں ہیں۔

صوفی تبسم: ۔ مثالیں بھی تو دیجئے۔

ظہیر کاشمیری: ۔ کرنہ کچھ ٹکرجام دینا، ہمارا رہنے تو دو ہمیں اپنے حال پر
گلوں سے بھی لگے گا زنگ مے تو کیا نگینوں کی آب ہوگی نثار پیدا

کوئی بھی خیال جو جب تک شاعر کے اپنی ذات کا حصہ نہیں بنتا اس وقت تک کسی اچھی تخلیق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہر اچھا غزل گو جب تک غم دوراں کو اپنی ذات کا حصہ بنا کر اور خارجی حقیقتوں کو اپنا کر پیش نہیں کرے گا۔ اس وقت تک کوئی بامعنی شعر نہیں کہہ سکتا۔

ابواللیث صدیقی: ۔ یہ تو وہی داخلیت ہوئی۔

(خاموشی)

ابواللیث صدیقی: ۔ بحث فارم سے شروع ہو کر موضوع تک آگئی۔ میرے خیال میں اب یہ زیادہ مناسب ہوگا۔ کہ قلی قطب شاہ سے لے کر فیض تک غزل کے مختلف ادوار کا تجزیہ ہو جائے۔

سبط حسن: ۔ لیکن ہمیں تو اس کا مستقبل پیش کرنا ہے۔

ابواللیث صدیقی: ۔ جی ہاں میں اسی سلسلہ کی تمہید کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے دور میں امیر خسروؒ اور قلی قطب شاہ تک پہلا دور ہے۔ یعنی نصف ہندی اور نصف فارسی ملا کر شعر کہنا۔ یہ روایت ولی دکنی تک چلی گئی ہے۔ ولی سے فارسی کی شدت میں نمایاں کمی ہو گئی ہے۔ شاہ سعداللہ گلشن نے مضامین اردو میں شروع کئے ..... لکھنوی شعراء کے زمانے سے یعنی بیچ کے دور میں ایہام اور صنائع و بدائع کا دور ہے۔ اس دور کا موضوع محبت تھی۔ ولی تک کم و بیش یہی حال رہا۔ دوسرا اہم موضوع تصوف اور اس سے متعلق مسائل تھے اور تیسرا موضوع ذاتی غم تھا۔ جسے غم جاناں کہا گیا ہے۔ اور جو درحقیقت غم دوراں تھا۔ یہ تین بڑے موضوعات ہیں جو غزل کے ہر دور میں نمایاں ہے ہیں اور اب اس کا معیار داخلیت ہے۔

ظہیر کاشمیری: ۔ ہر حال غزل ہر دور میں مختلف خیالات کی ترجمانی کرتی رہی ہے۔ اور غم جاناں کو غم دوراں بنا کر پیش کرنا اس کا حقیقی مقصد قرار پایا ہے۔ جس میں سرمیت اور اشارت اور ایہام کے ذکر سے مزید کشش اور حسن پیدا ہو گیا ہے۔ اور جب تک جمالیاتی ذوق رکھنے والے اس رمزیت اور اشاریت سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔ غزل کبھی نہیں مر سکتی۔

ابواللیث صدیقی: ۔ ظہیر صاحب نے بڑا نفاذ استعمال کئے ہیں۔ ان میں مجھے ایہام سے اختلاف ہے غزل میں ایہام کا صرف ایک ہی دور آیا ہے۔

صوفی تبسم: ۔ ایہام کو ظہیر صاحب غالباً ایمائیت کے معنوں میں استعمال کر رہے ہیں۔

حامد علیخاں: خوب، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آئے ذلف اور معنی بلغ لئے جائیں۔ (قہقہہ)

(خاموشی)

صوفی تبسم: ۔ بہرحال جو جاذبیت غزل میں ہے اور جس کی بنا پر اس کے مقبول ہونے کا رجحان روز بروز بڑھ رہا ہے اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ سوچ بچار کا مادہ بڑھ رہا ہے انسان کا دور۔ ملکوں ملکوں زندگی کی پیچیدگیوں کا بڑھنا تعلیم کی کمیت اور وقت کی تنگی میں ایجاز و اختصار پسندی کا بڑھتا ہوا احساس یہ سب چیزیں غزل کے حق میں بہت سازگار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبال جیسا شاعر بھی جس نے نظمیں کہیں زیادہ اور غزلیں کہیں کم کہیں ہیں۔ اپنی نظموں میں اتنا زیادہ کامیاب نہیں جتنا کہ غزلوں میں ہے

احسان دانش: ۔ غزل زمانے کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں ایک آفاقیت اور پائیداری ہوتی ہے۔ نظم کسی خاص ہنگامے یا تحریک کی بنیاد پر لکھی جاتی ہے۔ اس لئے اس کی عمر مختصر ہوتی ہے

حامد علیخاں: ۔ غزل کی سب سے بڑی خصوصیت ایمائیت ہے جس میں آدھی لطیف اشاروں اور کنایوں میں وہ سب کچھ کہہ سکتا ہے جو وضاحت اور تفصیل کے ساتھ کہنے میں قابلِ گرفت ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک سیاسی آدمی بھی اس مفہوم کو کہ آج ہمارے اقتدار کی باگ ڈور مخالفوں کے ہاتھ میں ہے آج اپنی قسمت رقیب کے ہاتھ میں ہے۔ کہے گا۔ اور یہ قابلِ گرفت نہ ہوگا۔

صوفی تبسم: ۔ الفاظ، محدود الفاظ، اشارات، اختصار، مزہ، لطافت غزل کی جان اور حسن ہیں۔ اور آنے والا پیچیدہ دور اس کے لئے موزوں ہے۔ کئی سال ہوئے میں نے مولوی شرر مرحوم کی ایک نظم "شبِ غم" پڑھی تھی جو ایک رسالے کی شکل میں تھی، حسرت صاحب نے مزہ دیکھی ہوگی۔ اس وقت میرے اندر ادبی شعور بالکل بیدار نہ تھا۔ اس کے بعد میں نے غالب کا ایک شعر پڑھا ؎

کہوں کچھ سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اگرچہ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا اور تعلیم کے بالکل ابتدائی دور میں تھا لیکن میں نے سوچنا شروع کیا کہ یہ تمام طویل نظم جب غزل کے ایک شعر میں کہی جا سکتی ہے تو ایک نظم کی کیا ضرورت تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح سوچنے کا رجحان بڑھتا رہے گا۔

سبطِ حسن: ۔ لیکن غزل کی افادیت کے راستے میں بعض دشواریاں بھی ہیں۔ غزل بڑے خیال کو اور تفصیلی تاثر کو پیش کرنے سے عاجز ہے۔ چنانچہ ادب کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی شاعر بڑے خیال کو ایک دو مصرعوں میں قید نہیں کر سکا تو مثنوی یا قصیدہ کا سہارا لیتا ہے۔ بڑے خیالات کے لئے غزل کی فارم شاید کبھی ساتھ نہیں دے سکتی۔

صوفی تبسم: ۔ گویا آپ کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تجربہ وسیع ہو، وہاں غزل موزوں نہ ہوگی۔ میرے خیال میں کسی تجربے کا وسیع ہونا اس کی دلیل نہیں کہ اس کے بیان کے لئے جگہ اور پیمانہ بھی وسیع ہو۔ طویل تجربے چھوٹے پیمانے میں ادا ہو سکتے ہیں ۔۔۔ حافظ کا شعر

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے
اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔

ظہیر کاشمیری: ۔ سبطِ حسن کے دلائل تو ٹھیک ہیں لیکن نتیجہ درست نہیں۔ پھیلے ہوئے خیالات کو منطقی تسلسل کے ساتھ پیش کرنے کے لئے نظم ہے۔ لیکن اشاراتی انداز میں بات کہنے کے لئے غزل بہتر ہے اگر لوگوں کو فراغ نصیب ہو تو نظم کی کامیابی کا امکان زیادہ ہے۔ اور اگر معاشرہ بحران میں ہو تو غزل بہترین فارم ہو سکتی ہے۔

حفیظ جالندھری ... کی بھی بھگت آگئی ہے۔ یہ تو ان کی ... ہوئی ... کی بیک گراؤنڈ ... ایک عملی تجاویز اور مقصد کی خیالات ... کارگر نہیں ہو سکتی ... وہاں آپ کو ... کرنا ہوگا۔

چراغ حسن حسرت ... دوست سے مراد غزل کی زبان و اسلوب ... لوگ اس کو ... سکتے۔ شیخ و برہمن، رند و ساقی، گل و بلبل، ... آتشیدہ و چنگ و بربط اشارت سے عوام کے ذہن کو ... متوجہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ آہستہ آہستہ اصلاحیت کا معیار بدل گیا ہے۔ لیکن ان میں تفصیلات کے اظہار کی تاب نہیں۔

سبط حسن ... میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ صرف ایک نظری صنف ہے۔ مقصدی اور تعلیمی اغراض کے لئے شعراء کو ہمیشہ غزل کو ترک کرنا پڑا ہے۔ جب کوئی بڑا فلسفۂ حیات یا مسئلہ حیات پیش کرنا ہو تو نظم کہی جاتی ہے۔ جب بھی کوئی فکری مسئلہ درپیش ہو، وہاں آپ ایک نظم پڑھیں اور ایک غزل لیکن غزل سے ذہنی انقلاب ہرگز پیدا نہ ہوگا۔

ابو اللیث صدیقی :- بنا فادیت کے معیار سے غزل اور نظم کی بات آپ کے خیالات صحیح ہیں۔ نظیر تک غزل کے شباب کا دور رہا ہے۔ لیکن فکری مسائل کے لئے اس زمانے میں بھی شاعروں کو شہر آشوب لکھنا پڑے۔

حفیظ جالندھری :- اے ماؤ، بہنو، بیٹیو، غزل میں نہیں کہا جا سکتا تھا۔

چراغ حسن حسرت :- حالی کی غزل "تذکرہ دہلی مرحوم" اے دوست نہ پھیر۔ داغ کے شہر آشوب سے زیادہ مؤثر ہے۔

ظہیر کاشمیری :- اس سے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ غزل میں تفکر نہیں۔ البتہ اگر تفصیل دلائل کے ساتھ کوئی چیز بیان کی جائے تو اس کے لئے کوئی اور خادم اختیار کرنی ہوگی۔

حفیظ جالندھری :- میرا خیال ہے کہ جہاں زندگی اتنی گھٹ جائے کہ کچھ کہنے کی پابندی ہو وہاں غزل زیادہ کامیاب رہے گی۔ کیونکہ وہاں کنایہ سے کام لینا پڑے گا۔

سبط حسن :- ہاں یہ صحیح ہے۔

چراغ حسن حسرت :- تمام یورپ کے عہد میں غزل زیادہ پھیلی ہے۔

صوفی تبسم :- یہاں دو تین غزل گو شاعر موجود ہیں وہ اپنے تجربات بتائیں کہ کون سا موڈ ایسا ہوتا ہے جب وہ غزل کہتے ہیں اور کون سا ایسا جب وہ نظم کہتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی :- سبط حسن کی بات دہرانی پڑے گی فکری بحث کے پھیلاؤ کے لئے نظم اور کنایہ کیلئے غزل۔

حفیظ جالندھری :- مجھے جب غزل کہنی ہوتی ہے تو میں ہر ہر شعر کو ایک لمبی نظم یا گیت کی خارم میں سوچتا ہوں یا دہ اسے دوہرعوں میں کہتا ہوں۔

ظہیر کاشمیری :- بعد خیال کوئی چیز نہیں۔ خیال جب آتا ہے تو اپنے ساتھ سب کچھ لاتا ہے۔ بعض خیالات اس طرح آتے ہیں کہ ان کا اظہار غزل میں لازمی ہوتا ہے اور بعض خیالوں کا عمل ایسا ہوتا ہے کہ غزل میں نہیں سماتا اور نظم کی خارم اختیار کرنی پڑتی ہے۔ خیال کا عمل ذہن میں خارم اپنے ساتھ لاتا ہے۔

سبط حسن :- یہ تو طے ہوا۔ اب ایک دشواری مصنوعی پابندیوں کی ہے۔ جس سے غزل کے مستقبل کا براہ راست تعلق ہے مثلاً قوافی، ردیف وغیرہ۔ یہ پابندیاں فضا کو مصنوعی بنا دیتی ہیں۔ کیوں کہ سارا خیال قافیہ کے تابع ہوتا ہے۔

ظہیر کاشمیری :- قافیہ اور ردیف کوئی ایسی چیز نہیں جو اظہار

...یب اور کلیم
...ی اشتراکی نہیں ساس
...ا جاپانی محرکات ہیں۔ جن میں مغربی علوم کی تدریس
کو سب سے زیادہ دخل ہے۔ مغربی ادب کی تقلید میں
ہمارے شعراء اس صنف سخن کی اہمیت ہی کو نظر انداز
کر بیٹھے تھے۔

احسان دانش: ۔ دوسری بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس
وقت ہمارے سامنے خاص خاص تحریکیں تھیں۔ جن
کو چلانے کے لئے عوام تک APPROACH ضروری
تھی اور اس کے لئے نظم کی فارم ہی موزوں ہو سکتی
تھی۔ آج ہمارے سامنے مسائل ہیں۔ تحریکیں نہیں۔
تحریکیں ختم ہو چکیں۔ اس لئے نظمیں بھی ختم ہو چکیں۔
اب کوئی خاص رجحان پیش نظر نہیں۔ اب تو موجودہ
ماحول کی اصلاح اور اس کے عیوب و محاسن پر
اشارات کافی اثر رکھتے ہیں۔ اور غزل ان کی متحمل
ہو سکتی ہے۔ اس لئے غزل پھر زندہ ہو گئی ہے اور
یہ اس لئے بھی زندہ رہے گی کہ اس میں زمانہ
کا ساتھ دینے کی پوری پوری صلاحیتیں ہیں۔ اس
لحاظ سے اس کا مستقبل بھی درخشاں ہے۔

* * *

حفیظ جالندھری: ۔ بہر حال غزل کامیاب رہے گی یہ ضروری
کہ یہ عوام الناس تک خیالات پہنچانے کے لئے نہیں۔
ظہیر کاشمیری: ۔ جب تک شاعر غم و عشق کو غم دوراں نہ بنائے
گا اس وقت تک غزل زندہ نہیں رہ سکتی۔ جب وہ اسے
غم دوراں بنا کر کہے گا تو غزل ضرور زندہ رہے گی۔
حامد علیخاں: ۔ جب تک ہیں کو ہم میں تحلیل کر کے نہ پیش
کیا جائے۔ واقعی اس وقت تک غزل کا کوئی مستقبل نہیں۔

دکھتا تھا پر کی لذت کہ جو اس نے کہا
ہیں یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

چراغ حسن حسرت: ۔ ہر کامیاب شاعر ہر دور میں یہی کرتا رہا
ہے۔ قدما کی غزلوں کا جائزہ لیجئے جا بجا فقیہ شہر، واعظ،
جاگیر دار نظام کی مخالفت کی گئی ہے جس سے اس دور کی
روایتی تیور و حدود کے خلاف بغاوت کا اظہار ہوتا ہے
اس لحاظ سے حافظ سب سے بڑا مانی شاعر ہے جو ایک
بناؤ اور رچاؤ کے ساتھ زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔
محمد طفیل: ۔ اس کی کیا وجہ تھی کہ آج سے سترہ اٹھارہ سال پیشتر
غزل کے مقابلے میں نظم کو زیادہ فروغ حاصل ہوا تھا۔
حفیظ جالندھری: ۔ بعض اشتراکی شعراء نے مخالفت کی تھی۔

محمد طفیل: ۔ چند دن پہلے اردو غزل کے مستقبل پر چند ایک
دوستوں کے درمیان گفتگو ہوئی تھی۔ اب چونکہ بعض احباب
یہاں پھر جمع ہیں۔ اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس
موضوع پر تھوڑی سی اور باتیں ہو جائیں۔

وقار عظیم: ۔ جب ہم غزل کے مستقبل کے متعلق سوال کرتے
ہیں تو ہمیں کچھ نہ کچھ ایسا ہونا ہے کہ اس کا مستقبل شاندار ہے
بھی یا نہیں۔ لیکن اگر غزل کی موجودہ زمانے تک کی ترقی پر
نظر ڈالی جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ بہت سی روایتی خامیوں

آرزو کر دیا گیا ہے۔

احمد ندیم قاسمی:۔ ... اس نے کس حد تک نئی چیزوں کو قبول بھی تو کیا ہے۔

... یہ صحیح ہے کہ غزل ہر دور میں اپنے ... کے ساتھ ... قدر طاقت دے ... اس کی خامیں قدروں مسلمات ... لیکن ... صحیح ... دائرے سے

... اہم ہیں۔ جو اس دور میں بھی او ... اس کے اندر ملتی ہیں کہ اس نے ... کو برقرار رکھتے ہوئے ہر ... انداز کی ترجمانی کی ہے۔

... غزل کو ہر دور میں زمانے سے متاثر ... ہے۔ اس دور میں اور اس سے پہلے بھی۔ ... کلام میں آپ کو پیشہ خارجی انداز کی ... ملیں گی ... پر صحیح ... کہ دور قدیم ... ہیں علما، صوفی اور واعظ کی فکر کی چیزیں معاشرہ ... ہیں۔ اس کے کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے ... ان لوگوں سے گریز کر رہا ہے۔ اس لئے وہ حقیقتاً ... شاعر تھا۔ وہ روایت کی مخالفت کرتا ہے۔ ... کی مخالفت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ بادشاہوں پر بھی چوٹ کر جاتا ہے۔ صوفیوں اور مولویوں کو تو معاف ہی نہیں کرتا۔

احمد ندیم قاسمی:۔ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس زمانے میں واعظانہ انداز کی شاعری ہوتی تھی اور اس دور کے شعراء نے تغیرات زمانہ اور ماحول کا کوئی اثر نہیں لیا۔ لیکن بعض متاخرین واضح طور پر یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ حالات سے متاثر ہو کر اور اپنے تاثرات کو نظم زمانہ کر شاعری کتے تھے اور یہی غزل کا صحیح مزاج ہے۔

عبدالمجید سالک:۔ جی ہاں۔ بالکل صحیح ہے۔ مثلاً یہی شعر ہے

ایں چہ شوریست کہ در دور قمری بینم

تقریباً اس دور کے سیاسی حالات کا نہایت واضح تاثر ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سوسائٹی UNSETTLED تھی اور سیاسی تغیرات کا اس پر اثر ہو رہا تھا۔

عبادت بریلوی:۔ شاعر غزل میں ان خیالات کا اظہار کرتا ہے جو خارجی حالات کے ردعمل کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ان کی ہو بہو ترجمانی کرے۔ غزل کا عالم انداز، مزاج اور مایائیت سے مطابقت رکھتا ہے۔ اور یہ روایت اور مایائیت اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتی۔ غزل کے اشعار میں بڑی، نہیں ہوتی ہیں۔ جن کے اندر اس تمدن اور ماحول کی عکاسی ہوتی ہے۔ غالب کی پوری شاعری اس کی مثال ہے ان کا یہ شعر بظاہر عشقیہ معلوم ہوتا ہے۔

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں سب فروزاں ہو گئیں

کہنے کو یہ ایک انفرادی تجربہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں ایک پوری تہذیب کی آواز شکست کی گونج سنائی دیتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی:۔ غزل گو فنکار کا کمال یہ ہے کہ شاعر واقعات و سانحات کو اشارات اور آفاقی انداز میں پیش کرتا ہے اس طرح پر نکلتی ہیرو ایک شعر اس توقع پر پیش کرتا ہے کہ وہ اس قسم کی شاعری کر سکتا ہے۔

کے پیمانے پر اُتارا جائے۔ سارا تانا بانا خیال کے تابع ہوتا ہے۔ شاعر جب خیال کے نہ پر شہ کہتا ہے تو قافیہ اور ردیف کا تصنع معلوم بھی نہیں ہوتا۔

حفیظ جالندھری: ۔ بہر حال غزل کامیاب رہے گی یہ ضرور ہے کہ یہ عوام الناس تک خیالات پہنچانے کے لئے نہیں۔

ظہیر کاشمیری: ۔ جب تک شاعر غم دوراں کو غم جاناں نہ بنائے گا اس وقت تک غزل زندہ نہیں رہ سکتی۔ جب دونوں غم دوراں بنا کر کہے گا تو غزل ضرور زندہ رہے گی۔

حامد علیخاں: ۔ جب تک ہیں کو ہم میں تحلیل کر کے نہ پیش کیا جائے۔ واقعی اس وقت تک غزل کا کوئی مستقبل نہیں ہے

دیکھا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

چراغ حسن حسرت: ۔ ہر کامیاب شاعر ہر دور میں یہی کرتا رہا ہے۔ قدما کی غزلوں کا جائزہ لیجئے جا بجا فقیہ شہر، واعظ، جاگیردار تمام کی مخالفت کی گئی ہے جس سے اس دور کی رجعتی قیود و حدود کے خلاف بغاوت کا اظہار ہوتا ہے اس محاذ سے حافظ سب سے بڑا باغی شاعر ہے جو ایک بناؤ اور رچاؤ کے ساتھ زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔

محمد طفیل: ۔ اس کی کیا وجہ تھی کہ آج سے سترہ اٹھارہ سال پیشتر غزل کے مقابلے میں نظم کو زیادہ فروغ حاصل ہوا تھا۔

حفیظ جالندھری: ۔ بعض اشتراکی شعراء نے مخالفت کی تھی۔

ظہیر کاشمیری: ۔ بالکل غلط۔ مخالفت حالی، عندلیب اور نیم نے بھی کی ہے اور ان میں سے کوئی بھی اشتراکی نہیں۔ اس کی تہ میں بعض سماجی محرکات ہیں۔ جن میں مغربی علوم کی تدریس کو سب سے زیادہ دخل ہے۔ مغربی ادب کی تقلید میں ہمارے شعراء اس صنف سخن کی اہمیت ہی کو نظر انداز کر بیٹھے تھے۔

احسان دانش: ۔ دوسری بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس وقت ہمارے سامنے خاص خاص تحریکیں تھیں۔ جن کو چلانے کے لئے عوام تک APPROACH ضروری تھی اور اس کے لئے نظم کی فارم ہی موزوں ہو سکتی تھی۔ آج ہمارے سامنے مسائل ہیں۔ تحریکیں نہیں۔ تحریکیں ختم ہو چکیں۔ اس لئے نظمیں بھی ختم ہو چکیں۔ اب کوئی خاص رجحان پیش نظر نہیں، اب تو موجودہ ماحول کی اصلاح اور اس کے عیوب و محاسن پر اشارات کافی اثر رکھتے ہیں۔ اور غزل ان کی متحمل ہو سکتی ہے۔ اس لئے غزل پھر زندہ ہو گئی ہے اور یہ اس لئے بھی زندہ رہے گی کہ اس میں زمانہ کا ساتھ دینے کی پوری پوری صلاحیتیں ہیں۔ اس لحاظ سے اس کا مستقبل بھی درخشاں ہے۔

* * *

محمد طفیل: ۔ چند دن پہلے اردو غزل کے مستقبل پر چند ایک دوستوں کے درمیان گفتگو ہوئی تھی۔ اب چونکہ بعض احباب یہاں پھر جمع ہیں۔ اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر تھوڑی سی اور بات چیت ہو جائے۔

وقار عظیم: ۔ جب ہم غزل کے مستقبل کے متعلق سوال کرتے ہیں تو ہمیں کچھ تردد سا ہوتا ہے کہ اس کا مستقبل شاندار ہے بھی یا نہیں۔ لیکن اگر غزل کی موجودہ زمانے تک کی ترقی پر نظر ڈالی جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ بہت سی روایتی خامیوں

کو ترک کر دیا گیا ہے۔

احمد ندیم قاسمی: ۔ اور اس نے کسی حد تک نئی چیزوں کو قبول بھی تو کیا ہے۔

عبدالمجید سالک: ۔ یہ صحیح ہے کہ غزل ہر دور میں اپنے آپ کو دوسری اقدار کے ساتھ جس قدر مطابقت دے سکتی تھی اس نے دی۔ اس کی خارجی قدروں، مسلمات اور روایات میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی لیکن معنوی حیثیت سے وہ اقدار اپنا تضاد اور ایہام کے دائرے سے نکل چکی ہے۔

وقار عظیم: ۔ غزل میں دو باتیں اہم ہیں۔ جو اس دور میں بھی اور اس سے پہلے بھی ہمیں اس کے اندر ملتی ہیں کہ اس نے اپنے مزاج کی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے بدلتے زمانے کے خصوص انداز کی ترجمانی کی ہے۔

عبدالمجید سالک: ۔ غزل گو ہر دور میں زمانے سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ اس دور میں اور اس سے پہلے بھی۔ مثلاً حالی کے کلام میں آپ کو بیشتر خارجی انداز ملیں گے اور وہ غزلیں بھی مل جائیں گی مثلاً

جو چشم وہ ست کہ در دورِ قمر می بینم

نے میں ملا، صوفی اور واعظ کی قسم کی چیزیں معاشرہ میں نظر آتی تھیں۔ اس کے کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کو دیکھ کر وہ متاثر ہوا ہے۔ اس لئے وہ حقیقتاً اس دور کا شاعر تھا۔ وہ روایت کی مخالفت کرتا ہے اور مخالفت کرتا ہے حتیٰ کہ وہ بادشاہوں پر بھی چوٹ کرتا ہے۔ صوفیوں اور مولویوں کو تو معاف نہیں کرتا۔

احمد ندیم قاسمی: ۔ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس زمانے میں داخلی انداز کی شاعری ہوتی تھی اور اس دور کے شعراء نے تغیرات زمانہ اور ماحول کا کوئی اثر نہیں لیا۔ لیکن بعض حالتیں واضح طور پر یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ حالات سے متاثر ہو کر اور اپنے تاثرات کو غزل زبان کرنا شاعری کہتے تھے اور یہی غزل کا صحیح مزاج ہے۔

عبدالمجید سالک: ۔ جی ہاں۔ بالکل صحیح ہے۔ مثلاً یہی شعر ہے ؎

ایں چہ شوریست کہ در دورِ قمر می بینم

تقطعاً اس دور کے سیاسی حالات کا نہایت واضح تاثر ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سوسائٹی (UNSETTLED) اور سیاسی تغیرات کا اس پر اثر ہو رہا تھا۔

عبادت بریلوی: ۔ ہر شاعر غزل میں ان خیالات کا اظہار کرتا ہے جو خارجی حالات کے ردِ عمل کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ان کی ہو بہو ترجمانی کرے۔ غزل کا عام انداز روایت اور اساطیر سے مطابقت رکھتا ہے۔ اور یہ روایت اور اساطیر (۲) بات کی اجازت ہی نہیں دیتی۔ غزل کے اشعار میں بڑی نہیں ہوتی ہیں۔ جن کے انداز اس تمدن اور ماحول کی عکاسی ہوتی ہے۔ غالب کی پوری شاعری اس کی مثال ہے ان کا ہر شعر بظاہر عشقیہ معلوم ہوتا ہے۔

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں سب فروزاں ہو گئیں

کہنے کو یہ ایک انفرادی تجربہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں ایک پوری تہذیب کی آواز شکست کی گونج سنائی دیتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی: ۔ غزل گوئی کا کمال یہ ہے کہ شاعر واقعات و سانحات کو اشارات اور آفاقی انداز میں پیش کرتا ہے اس نقطہ پر میں ایک شاعر اس توقع پر پیش کرتا ہوں کہ وہ اس قسم کی شاعری کر سکتا ہے ؎

شہاں کہ کحل جواہر عقیق خاک پائے جن کی
انھی کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں پھیریں

عبادت بریلوی: ۔ میر تو غزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے تو اپنے زمانے کے حالات سے اس حد تک اثرات قبول کئے ہیں کہ غزل کا انداز تک بدل دیا ہے۔ اس زمانے کی تباہی کو سامنے رکھ کر انھوں نے نئے اشارے تک وضع کئے ہیں۔ ان کا یہ شعر

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

دل کی ویرانی کو نگر کے لٹنے سے تعبیر کرنا حالات کے بھاری دست تاثر کا نتیجہ ہے۔

وقار عظیم: ۔ تو غزل کی امتیازی خصوصیت اصل چیز ہے اور ایک بڑے اور گہرے تاثر کو چند لفظوں میں بیان کر دینا ہی غزل کی خوبی ہے۔

خواجہ درد اپنے گوشہ میں بیٹھے کہتے ہیں۔

کوہکن کو شہ بیٹھا اے پرویز
اس کے تیشے کی بھی زباں ہے تیز

عبادت بریلوی: ۔ اور اصغر کا شعر بھی تو اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔

آلام روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم دیا اسے غم جاناں بنا دیا ۔

تو بہر حال غزل ایک روایت کا تسلسل ہے اور ایک تہذیب اور معاشرت کا تسلسل ہے۔ اور اپنی اسی خصوصیت کیساتھ وہ آج تک زندہ ہے یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جو سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ غزل اب ختم ہو جائے گی جیسا کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے ہوا۔ آزاد نظم کے عروج کے زمانے میں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی رفتار ارتقاء مدھم ہو گئی ہے لیکن پچھلے چند سال سے غزل کی مقبولیت پھر بڑھتی جا رہی ہے اور اب یہ احساس پھر ہونے لگا ہے کہ غزل بڑی اہم صنف سخن ہے اور ہمارے مزاجوں سے مطابقت رکھتی ہے۔

وقار عظیم: ۔ اس عارضی خلل یا تعطل کی وجہ غالباً یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی علامتیں اس کا ساتھ نہیں دے رہیں۔ لیکن پھر وہ ساتھ دینے لگتی ہیں۔

عبدالمجید سالک: ۔ اور بعض بعض شعراء کی علامتیں اتنی پختہ اور ٹھوس ہوتی ہیں کہ ہم فوراً ان کے کلام سے ان کو پہچان لیتے ہیں۔

ان کے اشارات اتنے پختہ ہوتے ہیں کہ ہم فوراً سمجھ لیتے ہیں کہ یہ ان کا کلام ہے۔ میں میرآجی اور آزاد نظم والوں سے کہا کرتا ہوں کہ جہاں تمہیں شاہ عالمی دروازہ کہنا ہوتا ہے، وہاں تم دو ٹانگیں کہا کرتے ہو۔

(قہقہہ)

عبادت بریلوی: ۔ موجودہ دور کی غزل میں بعض نئے اشارے (ٹرام، بس، ریڈیو) بھی پیدا کئے گئے ہیں اور پرانے اشارات کو نئے معنوں میں بھی برتا گیا ہے۔ علامہ اقبال کی جو غزلیں بال جبریل میں شامل ہیں وہ اس زمان کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔ اقبال کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس تجربے کے باوجود غزل کو غزل باقی رکھا ہے۔ اسی لئے ان کی غزلیں ایک اجتہادی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے غزل کو ایک نیا آہنگ دیا ہے۔ ان غزلوں سے یہ حقیقت ذہن نشین ہوتی ہے کہ غزل محدود نہیں ہے

وقار عظیم: ۔ یہ غزلیہ۔ اشارات اور رمزیت کی مقبولیت ہی کا اثر ہے کہ اقبال کو بھی بعض اوقات مجبور ہونا پڑا

ہے کہ وہ تغزل کا رنگ نظم میں بھی اختیار کریں۔

عبدالمجید سالک: ۔ حالی اور اقبال میں یہی فرق ہے۔ حالی خشک اور ناصحانہ انداز میں تنقید کرتے ہیں اور اقبال ان میں تغزل کا رنگ لاتے ہیں۔

عبادت بریلوی: ۔ اقبال کا مزاج غزل کا مزاج ہے۔ درحقیقت اسی مزاج نے ان کی نظموں میں تغزل کو پیدا کیا ہے۔ ذوق و شوق، مسجد قرطبہ، شمع اور شاعر اور خضر راہ، اس کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔ یہ سب نئی معنویت کی حامل ہیں لیکن ان میں تغزل ہے۔

عبدالمجید سالک: ۔ یہ ٹھیک ہے کہ اشارات وہ علامتیں پرانی ہیں۔ لیکن انھوں نے ان کو نئے معنی میں لیا ہے۔

وقار عظیم: ۔ یہ خصوصیت تو ہر کامیاب شاعر کے ہاں ملتی ہے۔ مثلاً کبیر کے ہاں

وہ توڑتے ہیں تو کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں
وہ روندتے ہیں تو سبزہ نہال ہوتا ہے

ستم کی کامیابی پر مبارک باد دیتا ہوں
یہ ان کی بدگمانی ہے کہ فریادی سمجھتے ہیں!

حبیب اشعر: ۔ جن لوگوں نے جان بوجھ کر سیاسی شعر نہیں کہے ان کے کلام میں بھی ایسے اشارے ملتے ہیں۔ جو لوگ خالص غزل گو ہیں اور غزل کو صرف بازنان سخن گفتن سمجھتے ہیں۔ ان کے کلام سے بھی ماحول کی ترجمانی ہوتی ہے اور تشبیہات کے پردے اٹھا کر دیکھیں تو ماحول کی عکاسی ملتی ہے۔

وقار عظیم: ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قدیم اور جدید غزل گو شعراء غزل کے ذریعے اپنے زمانے کی عکاسی کرتے ہیں۔ اسی لئے آج بھی غزل ہی کو مقبولیت حاصل ہے۔

احمد ندیم قاسمی: ۔ الغرض غزل کا مستقبل روشن ہے اور جیسا کہ وقار صاحب نے ابتداء میں فرمایا تھا کہ جب ہم غزل کے مستقبل کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ اس کا مستقبل شاندار ہے بھی یا نہیں تو ہمیں کچھ تردد سا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج سے دس پندرہ سال پہلے نظم گو شعراء جو ہوا۔ ہیں کی وجہ مغربی شاعری کا اثر تھا۔ قافیہ اور ردیف کی پابندی کو برا سمجھا گیا۔ مثلاً کیٹس کی کتاب، جوش کی نظمیں، یہ سب چیزیں لوگوں کے سامنے ہیں اور موجودہ ROMANCE کو دیکھ کر بھی لوگ کہتے ہیں۔

عبادت بریلوی: ۔ شاعر باز شاعروں نے بھی غزل کو خراب کیا ہے۔ پڑھنے کا ڈرامائی انداز اور داد دینے کا روایتی طریقہ ان سب چیزوں نے غزل کی روح ختم کر دی۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ بہت سے اشعار مشاعروں میں بہت پرلطف معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن مشاعرے سے اٹھئے تو ان میں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ غزل کی مخالفت کا ایک سبب یہ بھی

عبدالمجید سالک: ۔ اقبال کہتے تھے۔ I HATE THE MUSHAIRAS THESE ARE CALCULATED TO VULGRISE LITERATURE.

عبدالمجید سالک: ۔ میں نے اپنی پہلی غزل لاہور میں ایک مشاعرہ میں پڑھی تھی۔ جہاں اقبال بھی موجود تھے اس کا قافیہ تھا۔ تاروں میں ستاروں میں۔ میں نے شعر پڑھا۔

یہ کس کا نام لے کر جان دی بیمار الفت نے
یہ کس ظالم کا چرچا رہ گیا تیماردروں میں

لوگوں نے بڑی داد دی لیکن ڈاکٹر اقبال خاموش رہے۔ اس طرح پوری غزل میں انھوں نے صرف دو شعروں کی داد دی لیکن ہم لوگوں کی داد پر نہ گئے۔ بلکہ ڈاکٹر صاحب کی داد کو معیار سمجھا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ پست اشعار سے

جلدی طبیعت ہٹ گئی۔

حبیب الشعرا: ۔ اب کی تاریخ میں ایسے شاعروں کا ذکر تو برابر ملتا ہے لیکن شاعروں کے لئے یہ شاعرے معیار کبھی بھی نہیں رہے۔

عبادت بریلوی: ۔ مشاعرے شعر کی معنویت کے کبھی معیار نہیں رہے۔ مشاعروں میں داد حاصل کرنے والے شعر کے لئے ضروری نہیں کہ وہ زندہ بھی رہے۔ بالکل یہی معیار خود غزل کا ہے۔ ایک اچھی صنف ادب کی حیثیت سے وہ ضرور زندہ رہے گی۔

عبدالمجید سالک: ۔ ایک بات جو ندیم صاحب نے غزل کے متعلق اس سے پہلے کہی تھی کہ غزل کو بعض تحریکات نے دبایا تو میں یہاں کہوں گا کہ ادب کو کبھی کسی تحریک سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اور ہر ادب اور ہر صنف خود اپنے زور پر زندہ رہتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ادب تجربوں کے تسلسل کا نام ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ غزل نے ابتدا سے اب تک اپنے مزاج کو کافی بدل لیا ہے۔ اب رفتہ رفتہ اس کی وہ ناہمواہنگی ختم ہو رہی ہے جو پہلے کسی دور میں خیال تھی کہ ایک شعر زمین کا ہے اور ایک آسمان کا ایک میں زار نالی ہے اور دوسرے میں خوشی اور انبساط۔ آج کل غزل میں موڈ کے تسلسل کی رعایت کی جاتی ہے اور آئندہ کی غزل شاید اسی قسم کی چیز ہو۔

عبادت بریلوی: ۔ اس قسم کی غزلیں قدما کے ہاں بھی کافی ملتی ہیں۔ مثلاً میر و غالب کی بہت سی غزلوں میں یہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

حبیب الشعرا: ۔ بعض پرانے شعرا تو مسلسل غزلیں ہی کہتے تھے۔ مثلاً سودا۔ جرأت اور قطعہ بند بھی اسی کی ایک شکل ہے۔

عبادت بریلوی: ۔ لیکن پرانے زمانے میں شعرا کو موڈ کی ہم آہنگی کا احساس بہت کم تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے شعور بڑھتا گیا۔ موڈ کی ہم آہنگی اور تسلسل کا یہ احساس بڑھتا گیا ہے۔ اسی لئے جدید دور کی غزلیں پرانی غزلوں کے مقابلے میں اس اعتبار سے زیادہ اہم معلوم ہوتی ہیں۔

وقار عظیم: ۔ مثلاً اس دور میں اگر فیض اور ناصر کاظمی کی غزلوں میں یہ خصوصیت کافی نمایاں ہو گئی ہے۔ فیض کی غزل۔

ع۔ ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے

اور ناصر کاظمی کی غزل ؎

ہم نے دیکھے ہیں خزاں کے صدمے
ہم سے پوچھے کوئی افسانۂ گل

کا ہر شعر اگرچہ الگ ہے لیکن ملا کر پڑھئے تو ان میں ایک وحدت کا احساس ہوتا ہے۔

عبادت بریلوی: ۔ جوش کی نظم نما غزلیں بھی اسی رجحان کی آئینہ دار ہیں۔

وقار عظیم: ۔ مومن کی غزل "تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" اور حسرت کی غزل "آغازِ محبت کا زمانہ یاد ہے" کسی ایک واقعہ کی ترجمان معلوم ہوتی ہیں۔ اسی لئے ان میں ایک تسلسل کا احساس ہوتا ہے۔ اسے مسلسل غزل بھی کہہ سکتے ہیں۔

عبادت بریلوی: ۔ لیکن مسلسل غزل موڈ کی ہم آہنگی سے ایک الگ چیز ہے۔ موڈ کی ہم آہنگی کا مطلب یہ ہے کہ غزل کے تمام اشعار میں ایک خاص ذہنی کیفیت موجود ہو۔ چاہے جذبات و کیفیات میں کتنا ہی تنوع موجود ہو۔ مسلسل غزل کے لئے ضروری ہے کہ اس میں کوئی

خاص واقعہ یا ذہنی کیفیت ایک ایک تسلسل کے ساتھ بیان کی جائے جس کو تمام اشعار ایک وحدت کی صورت میں ظاہر کریں۔

حبیب الشعراء: یہ اسی چیز سے ملتی جلتی کوئی چیز ہے جسے تغزل کہتے ہیں۔

عبادت بریلوی: جی ہاں۔

وقار عظیم: غزل مسلسل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگر اس کا ایک شعر نکال دیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز کم ہے۔ لیکن ایک روڑ کی غزل میں یہ بات نہیں ملے گی۔

احمد ندیم قاسمی: مسلسل غزل کے سلسلے میں ذاتی طور پر میں سوچتا ہوں کہ غزل کی یہ خصوصیت کہ ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہو آئندہ برقرار ہی نہ رہ سکے گی۔ اور وہ نظم کے قریب قریب پہنچ جائے گی۔

عبادت بریلوی: نظم اور غزل میں فرق ہمیشہ باقی رہے گا غزل کی تکنیک نظم سے بالکل مختلف ہے۔ غزل میں عموماً طور پر روڑ کی ایک وحدت ہوتی ہے لیکن اس کا ہر شعر بھی اپنی جگہ پر مکمل ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت اس میں ہر حال باقی رہنا چاہئے ورنہ وہ یقیناً نظم ہو جائے گی۔

عبدالمجید سالک: مسلسل غزلوں یعنی ایسی غزلوں کا تناسب جو ایک موضوع سے متعلق ہوں ——— موجودہ شعراء کے ہاں زیادہ نہیں۔ مرزا غالب کے ہاں زیادہ ہے۔

عبادت بریلوی: نوجوانوں کے ہاں بھی مسلسل غزلیں کم ہیں۔ روڑ کی ہم آہنگی کی غزلیں زیادہ ہیں۔ فیض اور ناصر کاظمی کی غزلیں اس کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔

حبیب الشعراء: ایسی غزلیں قدماء کے یہاں بھی ملتی ہیں۔

عبادت بریلوی: میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ قدماء شعوری طور پر ایسا نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ایسا کرنا ضروری بھی نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود جذبے کی شدت اور خلوص نے اس صورتِ حال کو پیدا کیا ہے میر کی غزلوں میں یہ خصوصیت سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ مثلاً میر کی یہ غزل ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا
یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں — داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا
یہ سرشوری ہی نہیں یہ سر زمیں — تخم خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا
تا بہ بیخ ہر مژہ کاک شوے ہے — جیتی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا

غربتِ یوسف ہے یہ وقت عزیز
میرؔ اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ لیکن یہ تو ایک ایسی غزل ہے جس میں اشعار کم و بیش ایک ہی طرح کے خیالات اور جذبات و احساسات کے حامل ہیں۔ بعض غزلیں ان کے یہاں ایسی بھی ہیں جن میں خیالات اور جذبات و احساسات مختلف اور متنوع نہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان میں روڑ کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ان کی مشہور غزل ہے ؎

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا
کاش اب برقع منہ سے اٹھا دے ورنہ پھر کیا حاصل ہے
آنکھ مندے پر ان نے گو دیدار کو اپنے عام کیا

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

ساعد سیمیں دونوں اُس کے ہاتھ میں لے کر چھوڑ دیئے
بھولے اُس کے قول و قسم پر ہائے خیال خام کیا

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
کیا اعجاز کیا جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

میر کے دین و مذہب کو پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

یہ تمام اشعار مختلف خیالات اور متنوع جذبات و احساسات کے حامل ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان میں ایک وحدت پائی جاتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب کے سب ناکامی حسرت اور مایوسی کے گرد گھومتے ہیں۔ اسی پس منظر نے اس غزل میں موڈ کی ہم آہنگی کو پیدا کیا۔

وقار عظیم: ۔ جب آپ نے دوسری غزل کا ذکر کیا تھا تو میں یہ سمجھا تھا کہ آپ یہ اعتراض کریں گے کہ اس میں موڈ کی ہم آہنگی نہیں ہے۔ لیکن اس میں تو ہے۔

عبادت بریلوی: ۔ ظاہر ہے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اتنی متنوع ہونے کے باوجود اس میں ایک ہم آہنگی بھی ہے۔

جمیب الشعرا: ۔ تمام مستند غزل گوؤں کے ہاں نکتہ اور نوک کی وحدت ملتی ہے۔

عبادت بریلوی: ۔ یہ شک ملتی ہے لیکن اس کو محسوس کرنے کے لئے ایک مخصوص ذہنی اور جذباتی تربیت کی ضرورت ہے۔ غزل اس تربیت کا تقاضا کرتی ہے۔ ہمارے غزل گو شعرا اس ہم آہنگی کو غزل کا لازمی جزو نہیں سمجھتے تھے لیکن جو بات شعرا کے یہاں بالقصد نہیں پیدا ہوتی ہے جو شعوری طور پر نہیں کی جاتی اس کو ہم اپنے عہد کی تنقید کی روشنی میں دشواری پیش نہیں آسکتی۔

عبدالمجید سالک: ۔ میر کے یہاں کہیں کہیں یہ ہم آہنگی نہیں بھی ملتی۔ مثلاً وہ غزل جس کا مطلع ہے ۔

مفت و بروئے زاہد علامہ لے گیا
اک منجم اُتار کے عمامہ لے گیا

میر ہی پر کیا منحصر ہے، تقریباً تمام غزل گو شعراء کے یہاں یہ صورت حال ملتی ہے۔ میر کا غیر زیادہ عجیب معلوم ہونے کا سبب یہ بھی ہے کہ اس میں ایک شگفتگی پائی جاتی ہے۔ یہ شگفتگی میر کے یہاں بظاہر عجیب معلوم ہوتی ہے۔ شاید یہ اُس حزن و یاس کا ردِ عمل ہے جو میر کے یہاں شیخ اور واعظ پر کہیں کہیں چوٹیں ملتی ہیں۔ وہ اسی ردِ عمل کے اظہار کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے یہ بھی اسی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتی ہے لیکن بہرحال موڈ کی ہم آہنگی کا اس میں کوئی تعلق نہیں۔

وقار عظیم: ۔ اس میں قافیہ پیمائی کو بھی بڑا دخل ہے۔ قافیہ کی کمی پوری کرنے کے لئے انہیں مجبوراً دو چار شعر زبردستی کے کہنے پڑتے تھے مثلاً اسی وزن پر علامہ ایک قافیہ تھا جسے باقی غزل کہنے کے بعد شاعر نے مطلع میں عمامہ کے ساتھ جوڑ دیا۔

عبادت بریلوی: ۔ ہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قافیوں کی ایک فہرست پہلے سے تیار کر لی ہے۔ اور اس کے مطابق شعر ڈھالے جا رہے ہیں۔

جمیب الشعرا: ۔ سر غزلے اور چار غزلے یہ سب اسی قافیہ پیمائی کی پیداوار تھے۔

عبدالمجید سالک: ۔ بعض بعض جگہ تو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ لوگ ARTISAN نہیں تھے بلکہ ARTIST تھے۔ اور شعر قافیہ کے مطابق ڈھالا کرتے تھے۔

عبادت بریلوی: ۔ آتش نے تو اس کا اظہار بھی کر دیا ہے۔

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

شاعری کو یہ لوگ مرثیہ سازی سمجھتے تھے۔ اس زمانے کا یہی معیار تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ معنویت کا خیال ان کے پیش نظر نہیں تھا مدعا و معنویت کا خیال بھی رکھتے تھے لیکن الفاظ کی اہمیت بھی ان کے نزدیک کم نہیں تھی۔ اور شاعری میں الفاظ کے استعمال کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بات درحقیقت یہ ہے کہ قافیہ پیمائی وہیں پیدا ہوتی ہے جہاں جذبے کی شدت اور احساس کا خلوص نہیں ہوتا۔ غزل کے لئے یہ دونوں باتیں ضروری ہیں۔ اسی لئے غزل کے بارے میں اساتذہ امام اثر نے فارسیات تجدید اور موزونِ ذہنیہ کو ضروری قرار دیا ہے اور یہ صحیح ہے اگر ایسا نہ ہو تو وہ قافیہ پیمائی بن جاتی ہے۔

عبدالمجید سالک: ۔ غزل کے لئے ریاضت مزید ہے۔ غزل خاصے ریاض کی چیز ہے۔

عبادت بریلوی: ۔ غزل میں واقعی ریاضت کی ضرورت بھی اور ہے۔ ہمارے نوجوان شعراء میں اس کی زبردست کمی محسوس ہوتی ہے اور اسی نے غزل کو خراب کیا ہے۔ صرف چند غزلیں لکھ کر وہ سمجھتے ہیں کہ استاد ہو گئے۔ اسی وجہ سے ان میں سے بعض تو قافیہ پیمائی کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے۔

عبدالمجید سالک: ۔ ان نوجوانوں کو پریس نے بھی بہت خراب کیا ہے۔ اچھا برا مطلب دیا بس سب اسی قسم کا کلام چھپ جاتا ہے۔ نوجوان پہلی ہی دوسری غزل کہنے کے بعد پریس کی طرف بھاگتے ہیں۔

وقار عظیم: ۔ غزل کی ایمائیت گہرائی اور گیرائی معنویت اور دیگر تقاضوں سے کماحقہ عہدہ برآ ہونے کے لئے زبان پر عبور بڑا ضروری ہے۔

عبادت بریلوی: ۔ صرف غزل ہی پر کیا منحصر ہے۔ زبان پر عبور تو ہر صنفِ ادب کے لئے نہایت ضروری ہے۔ کولرج نے شاعری کے بارے میں جو (BEST WORDS IN BEST ORDER) کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ نوجوان شعراء کو اس طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

عبدالمجید سالک: ۔ نظم و نثر کے جامہ ابانی پیمانہ اور زبان دانی کی طرف اور بالخصوص شعراء کو واقعی توجہ دی جانی چاہئے۔ جس کی آج کل بے حد کمی ہے۔ حسن بیان حسن زبان حسن ترتیب ایک اچھے شاعر یا ادیب کی پہلی صفت ہونی چاہئے۔

وقار عظیم: ۔ اس گفتگو سے یہ حاصل بات نمایاں ہوئی کہ ہمارے بہت سے نوجوان غزل گو انداز بیان اور زبان کی طرف توجہ نہیں کر رہے ہیں۔ اور اگر چند سے ان کا یہی حال رہا تو غزل ترقی نہیں کر سکے گی۔

عبدالمجید سالک: ۔ قدماء شاگرد کو دواوین کے مطالعہ کی نصیحت کرتے تھے۔ آج کل یہ چیز مفقود ہے۔ پھر اصلاح سخن کا رواج بھی ایسا نہیں اور یہ چیز غزل اور شاعری کے مستقبل کے لئے کوئی نیک فال نہیں۔

عبادت بریلوی: ۔ قدماء کے کلام کے مطالعہ اور موازنہ کے بغیر غزل کی روایت کا صحیح احساس پیدا نہیں ہو سکتا۔ غزل کا مزاج اور انداز اس کی مخصوص فضا اور مخصوص اصطلاحی زبان کی جو باریکیاں اساتذۂ قدیم کے پہلے دیوانے مطالعہ ہی سے پیدا ہو سکتی ہیں۔

وقار عظیم: ۔ اس کی بعض زندہ شہادتیں موجود ہیں مثلاً ہمارے جدید شعراء میں جنہوں نے فارسی کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کے ہاں بھی رچی ہوئی غزلیں ہوتی ہیں۔ مثلاً فیض اور راشد۔

عبدالمجید سالک: ۔ لیکن راشد صاحب ایران چلنے سے

پہلے زیادہ اچھی فارسی ترکیبیں لکھتے تھے۔ (قہقہہ)

عبادت بریلوی: ۔ سالک صاحب کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ غزل میں استادی اور شاگردی کا سلسلہ ایک اچھا رواج تھا۔ اس سے مشق ہوتی تھی اور نوجوان محنت کرتے تھے۔ اس سے ملے اس کا ہونا آج بھی ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو غزل تجربہ کاروں کی تختۂ مشق بنتے بنتے پست ہو جائے گی۔

عبدالمجید سالک: ۔ جی ہاں یہ بہت ضروری ہے۔ فی زمانہ نکاتِ سخن اور رموزِ سخن کی قسم کی چند کتابیں موجود ہیں لیکن ان سے اتنا سمجھ میں نہیں آتا جو استادہ کی اصلاح اور عملی ہدایات سے آتا تھا۔ اور موجودہ شاعر تو ان کتابوں کو بھی نہیں پڑھتے۔

وقار عظیم: ۔ آج کل کے شاعر قدیم استادہ کو پڑھتے تو ہیں۔ اور میر سے معذرت کے ساتھ، کے عنوانوں سے ان کے ڈنگ میں کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عبادت بریلوی: ۔ بلکہ بعض اپنی غزلوں پر "بطرزِ میر" لکھ دیتے ہیں۔ حالانکہ میر سے انھیں کوئی نسبت نہیں ہوتی۔

عبدالمجید سالک: ۔ اسی لئے تو لکھنے کی ضرورت پڑتی ہے کہ وہ بطرزِ میر نہیں ہوتیں۔ اور انھوں نے میر کو پوری طرح پڑھا نہیں ہوتا۔ حالانکہ اگر وہ میر کو پڑھ لیں تو میر کا طرزِ خود ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی: ۔ موجودہ شعراء میں زبان کے علاوہ فکر کی کمی بھی ہے۔

عبدالمجید سالک: ۔ فکر کی کمی کا تو کوئی علاج ہی نہیں۔ یہ تو علم اور مطالعہ کی کمی سے پیدا ہوتی ہے اور مطالعہ اور علم سے استفادہ کرنا ہی اس کا واحد حل ہے۔

عبادت بریلوی: ۔ موجودہ دور کے شعراء کا اندازِ فکر ذرا مختلف ہے۔ سماجی اور عمرانی مسائل پر ان کے ہاں فکر کی کمی نہیں۔ ہاں مابعد الطبیعاتی انداز اور فلسفیانہ انداز جو غالب کے ہاں بیشتر ہے۔ اس کی کمی ضرور ہے۔ ہمارے غزل گو شعراء کو سماجی اور عمرانی مشکلات کا احساس ہے اور بہت سے شعراء کے کلام سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اپنے وقت کے سماجی حالات سے متاثر ہو کر لکھ رہے ہیں۔

حبیب اشعر: ۔ احساس تو ہے لیکن علاج اور حل ان کے پاس کوئی نہیں۔ ویسی روشنی جو اقبال کے کلام سے اخذ کی جاتی ہے۔ ان کے کلام سے نہیں حاصل ہوتی۔

عبادت بریلوی: ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی کوئی ایسا واضح نصب العین لوگوں میں پیدا نہیں ہوا جیسا کہ اقبال کے ہاں تھا۔

عبدالمجید سالک: ۔ اب تو جمہوریت ہر چیز کو تباہ کر رہی ہے۔ ادب، مذہب، سیاست، سب کو اس جمہوریت نے خاک میں ملا کر رکھ دیا ہے۔ اور یہی نصب العین کے فقدان کی ذمہ دار ہے۔

وقار عظیم: ۔ فراق جیسے شاعر کے ہاں بھی زندگی کو کائنات کا حساس تو ہوتا ہے مگر کوئی بڑی حمہ گیری ان کے ہاں بھی نہیں۔

حبیب اشعر: ۔ اقبال کو بھی چھوڑیئے۔ اصغر کے ہاں رجا اور رجعت ہے۔

احمد ندیم قاسمی: ۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ اصغر کے ہاں رجا بالکل نہیں بلکہ اپنے کو کھو دینے کا احساس ہے۔

عبادت بریلوی: ۔ میرے خیال میں یہاں غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے۔ شاید حبیب اشعر صاحب کی مراد یہ ہے کہ اصغر کے یہاں جو ایک سرمستی پائی جاتی ہے اور ایک والہانہ انداز

نظر آتا ہے وہ غزل میں بالکل نئی چیز ہے۔ اصغر نے غزل کو بالکل ایک نیا انداز اور آہنگ دیا ہے ان کی ساری شاعری میں پھول سے کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔

وقار عظیم: ۔ اصغر کے ہاں یہ احساس پہلی بار ہوتا ہے۔

حبیب اشعر: ۔ یہی میری مراد ہے۔

عبادت بریلوی: ۔ حبیب اشعر جو بات کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہے۔ بعض نوجوان شاعروں کے ہاں ماحول کی تنوطیت کا اثر ہے۔ مثلاً جذبی، ناصر کاظمی کی شاعری سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر غم حزن و یاس کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ شاید یہ سیاسی اور سماجی ماحول کا اثر ہے۔

وقار عظیم: ۔ ماحول کی تنوطیت نے لوگوں پر بہت کچھ اثر کیا ہے۔ ملک کی تقسیم سے لوگ اداس اور مرعوب سے ہو گئے قریب ہر شاعر نے اس پر اپنا اپنا خیال کیا ہے مثلاً احسان کا یہ شعر ہے

میں دیوانہ بھلا مجھ کو مرے صحرا میں بسنے دو
کہ میں پابند آداب گلستاں ہو نہیں سکتا

اسی رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔

عبادت بریلوی: ۔ لیکن یہ تنوطیت سب کے یہاں نہیں ہے۔ مجاز صاحب کے یہاں بھی یہ رجحان پیدا ہوا ہے لیکن اس رجحان کو پیش کرتے ہوئے وہ تنوطی نہیں ہوتے اُن کے دو شعر مجھے یاد آ رہے ہیں ؎

گو کعبہ رسمی کوئے صنم خانہ سہی
خاک اڑانی ہے تو پھر کوئی بھی ویرانہ سہی

تشنہ لب ہاتھ پہ کیوں ہاتھ دھر بیٹھے ہیں
کچھ نہیں ہے تو شکست غم و خمخانہ سہی

یہ اشعار گزشتہ چند سال کے سیاسی معاملات کو پیش کرتے ہیں لیکن ان میں رجائی نقطۂ نظر اور جارحانہ انداز ہے۔ پھر بھی یہ غزل کے شعر معلوم ہوتے ہیں۔

وقار عظیم: ۔ یہ تو غزل کا رچا ہوا انداز ہے۔ اقبال کے متعلق جو کچھ ہم کہہ رہے تھے اس میں شخصیت اور کردار کو بھی بڑا دخل ہے۔ موجودہ دور میں اخلاقی اقدار کا کوئی احساس نہیں اس لئے اقبال کے ہاں جو پیغام ہے اور احساس کے ساتھ جو علاج ہے وہ موجودہ دور کے نوجوان شعراء میں اسی وجہ سے کم ملتا ہے۔

عبادت بریلوی: ۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ نوجوانوں کے شعور میں وہ ارتقائی کیفیت ہے جو اقبال کے یہاں تھی۔ نوجوان شعراء کی غزلوں میں اسی وجہ سے واضح نقطۂ نظر نہیں ملتا۔ حزن و یاس کی کیفیت بھی اسی لئے پیدا ہوتی ہے۔

عبدالمجید سالک: ۔ شدت احساس جو ہمارے شعراء کے ہاں ملتی ہے وہ بھی عارضی ہے اس کے پیچھے فکر نہیں۔ اگر یہ عارضی نہ ہو تو یہ علامتیں کا مجموعہ بن جائیں۔

(قہقہہ)

اقبال کے ہاں یاس و حرماں کہیں کہیں سارے کلام میں انڈر کرنٹ موجود ہے

عبادت بریلوی: ۔ لیکن اس کے باوجود یہ عارضی معلوم ہوتا ہے کہ نوجوان شعراء اپنے ارد گرد کے مسائل سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور ان مسائل کو اپنی غزلوں کا موضوع بناتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس میں فکر کی گہرائی اور شعور کی پختگی ہو۔ کیونکہ تاریخی حرکت جذبات کی یہ بیچارگی کا نام نہیں ہے۔ جدید تنقید اس کے لئے فکر و شعور کو بھی لازمی قرار دیتی ہے۔ اگر ہمارے نوجوان شعراء نے اس طرف توجہ نہیں کی تو ان کی غزلوں میں گہرائی پیدا نہیں ہو سکتی۔

سالک: ۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر ان پر جذبہ طاری بھی ہوتا ہے اور یہ فکر بھی کرتے ہیں تو اس کو بیان نہیں کر پاتے۔

چوٹ تو لگتی ہے۔ درد کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لیکن صحیح اظہار کی صلاحیت نہیں۔

عبادت: ۔ غزل کو نئے جوان غزل گو شعراء سے یہ شکایت ہے کہ انھوں نے فنکارانہ انداز پیدا نہیں کیا۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ سب سے بڑا سبب تو یہ ہے کہ ماحول روح کش ہے۔ نوجوان شعراء زندگی کی تلخیوں سے گھبراتے ہیں۔ انھیں برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لئے ان کی زندگی اور ادب دونوں میں ایک فرار کی ذہنیت نظر آتی ہے۔ ان کی غزلیں بھی غم غلط کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ وہ اسی میں ڈوبے رہتے ہیں۔

وقار: ۔ اسے ہم مان بھی لیں کہ ابھی شاید ایسا ماحول نہیں جو فکر کے لئے سازگار ہو۔ تاہم فنی پہلو تو ہر حال لازمی ہے۔

سالک: ۔ جیسا کہ عبادت صاحب نے فرمایا لوگ پڑھتے ہی نہیں۔ اور اسی لئے فکر کی کمی نظر آتی ہے۔

وقار: ۔ اللہ شاید کچھ معاشی بدحالی بھی اس کی وجہ ہے۔

ندیم: ۔ فکر کی کمی کا الزام موجودہ معاشی بدحالی پر نہیں ڈال سکتے۔ حافظ کا دور بھی ایسا ہی تھا۔ گذشتہ پندرہ سال میں ترقی پسند مصنفین نے اسے غلط ثابت کر دکھایا ہے۔

عبادت: ۔ آپ بالکل درست کہتے ہیں۔ انسان کی بڑائی تو یہ ہے کہ ماحول کا اسیر ہو کر نہ رہ جائے۔ اس پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ جدید غزل گو شعراء کے لئے یہ ضروری ہے۔ ایسے شعراء بھی ہمارے یہاں موجود ہیں۔ جنھوں نے اسے صحیح ثابت کر دکھایا ہے۔

سالک: ۔ لیکن کم ہیں اور ہر دور میں ایسا ہوتا ہے۔ پچاس ہزار شاعروں میں سے پانچ باقی رہ جاتے ہیں ۔۔ باقی شعراء زندہ نہیں رہتے۔

عبادت: ۔ غزل کی تاریخ سے یہ بات صحیح ثابت ہوتی ہے باقی رہنے والے وہی شعراء ہوتے ہیں جن کے یہاں زندگی کا شدید احساس اور حالات کا صحیح شعور ہوتا ہے۔ اور جو ان سب کو غزل کے انداز میں پیش کر سکتے ہیں۔

جیب اشعر: ۔ اسی کو ایک عمومی انداز کہہ سکتے ہیں۔

سالک: ۔ غزل کے لئے یہ عمومی کیفیت ضروری ہے۔

عبادت: ۔ غزل میں فکر کے ساتھ بھی یہ عمومی انداز پیدا کیا جا سکتا ہے۔ جدید دور میں یگانہ کی شاعری اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ فانی کے یہاں بھی اس کی کمی نہیں ہے۔

سالک: ۔ یہ صحیح ہے لیکن جس زمانے میں آتش گزرے اس زمانے میں آتش ہی کیوں استاد مانے گئے۔ حالانکہ کئی اور شعراء تھے۔

اشعر: ۔ بقائے اصلح

سالک: ۔ بقائے اصلح ٹھیک ہے لیکن اس کے اسباب دیکھئے نا۔ وہی تعلیم، فکر، نشو اور صحت کا اثر ہے۔

اشعر: ۔ ہاں یہ ضروری چیزیں ہیں

سالک: ۔ یہ بیان بزدانی کے یہاں بہ خصوصیات ملتی ہیں۔ لیکن ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔

عبادت: ۔ وقار صاحب نے ان پر ایک مضمون لکھا ہے۔

(قہقہہ)

وقار: ۔ وہ جو سروالیوں آف دی سنٹرسٹ کی بات ہو رہی تھی آج کل کے سینکڑوں شعراء میں ایسا معیاری شاعر کون ہے، کوئی بھی نہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ڈیا کرپی خوب چلتی ہے۔ اس سے تو HIGH BROW ATTITUDE ٹھیک تھا۔

امیر مینائی اسی لئے مواخذے کی کوشش کرتے ہیں۔

سالک: ۔ جی ہاں ستیاناس ہو گیا اتنے بڑے شاعر کا۔

وقار: ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک سیدھے مولوی تھے۔

عبادت: ۔ امیر مینائی مولوی ضرور تھے لیکن ماحول نے انہیں

خواب کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ماحول کے اسیر ہو گئے۔ لکھنؤ کے دربارِ قیام میں انھوں نے اپنے آپ کو طبقہ امرا کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی۔ تعریفِ باغ کی تعریف میں انھوں نے اس طرح کے شعر کہے۔

پاؤں کا یاں ذکر کیا صاف ہے یہ زمیں
دل پسینے میں ہے سر بازارِ تعمیرِ باغ میں

پھر رام پور میں انھوں نے داغ کی تقلید کی۔ اسی نے انھیں خراب کیا۔ کاش وہ صوفی رہتے۔

وقار: ۔ یہ خیال بالکل صحیح ہے۔ لیکن بیاقی اس کے بالکل برعکس ہیں۔ وہ ٹیک آدمی تھے لیکن خرابات کے اصول سے ایسے شعر کہے کہ جن کا جواب نہیں۔ حالانکہ کبھی شراب کو ہاتھ نہ لگایا۔

عبادت: ۔ نئے شعراء میں بھی خاص ذکر ہو جائے۔ بعض شعراء ایسے بھی ہیں جو غزل سے بھرپور غزلیں لکھتے ہیں اور انھیں دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ بعض شعراء نے جذبات کے اظہار میں حالات سے ایسی مطابقت باقی رکھی ہے کہ معلوم ہوتا ہے بالکل ڈوب کر کہا ہے۔ پوری سماجی طبقاتی الجھنوں کا بیان اور زندگی کے معاملات کا اظہار ان کے ہاں ملتا ہے۔ اسی احساس نے ان کی غزلوں میں فراق اور جدید لب و لہجہ سے ہم آہنگ کیا ہے۔ یہ جدید غزل کا سب سے ہم رجحان ہے اور اس رجحان نے اس کو حقیقت سے قریب کیا ہے۔

سالک: ۔ جی ہاں اس میں قافیہ پیمائی نہیں معلوم ہوتی۔

وقار: ۔ بہت سی باتیں اگرچہ غزل کے لئے اس دور میں سازگار نہیں لیکن بعض کرنیں ضرور دکھائی دیتی ہیں اور اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ غزل کا مستقبل روشن ہے۔

عبادت: ۔ جدید غزل نے بہت سے اضافے کئے اور غزل کو حقیقت سے قریب کیا ہے۔ اور اسی سے ہم غزل کی ترقی اور اس کے آئندہ امکانات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

سالک: ۔ حقیقت کی طرف آنا ہی غزل کی ترقی کا ثبوت ہے۔

عبادت: ۔ بہرحال نوجوان شعراء بالکل گمراہ نہیں ہیں۔ انھوں نے غزل کو سمجھا ہے۔ اس کو زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں اظہار و بیان کی نئی راہیں نکالی ہیں۔

سالک: ۔ لیکن نقادوں کو غافل نہیں رہنا چاہئے۔ کوتوالی ضرور کرنی چاہئے۔ (قہقہہ)

وقار: ۔ سوچ اور فکر ضرور ہے۔ نوجوان شعراء کو چاہئے کہ وہ پوری روایت کو اپنے اندر جذب کریں اور بیان میں زور اور رچاؤ پیدا کریں۔

سالک: ۔ زمانے کی رفتار کا ساتھ دینا چاہئے۔ اس وقت جو ذہنیت تن آسانی اور سہل انگاری کی ہے اسے ترک کرنا ضروری ہے۔ ہر صنف محنت چاہتی ہے۔

ندیم: ۔ قدماء کی کوششوں سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔ مجھے میر درد کی ایک قشقیہ بحر یاد آئی۔

جیدھر گڑے ہیں پاؤں ادھر سے آواز ہے کہ ہم
ایسی جگہوں سے خانہ ما اٹھانا ضروری ہے۔

وقار: ۔ مجموعی حیثیت سے غدر کے بعد سے آج تک دیکھیں تو آجکل کے شعراء کے ہاں اکثر اچھے شعر ملتے ہیں۔

ندیم: ۔ شاید اس لئے کہ پڑھنے والا اسی دور کا آدمی ہے۔

سالک: ۔ جو بھی ہے کہ فکر ترقی کر گئی ہے۔

وقار: ۔ بہرحال غزل امتحان سے رہی ہے۔ اسے ٹھیک طور سے برتنا چاہئے۔ غزل میں ایسی صلاحیتیں ہیں کہ وہ زمانے کا ساتھ دے سکے۔

عبادت: ۔ غزل نے بدلنے کا ساتھ دینے کی صلاحیت ہے۔ اسی نے اس کو زندہ رکھا ہے۔ جو وجوہ دور کی غزل میں جو انقلاب انگیز تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ اس کا فطری ثبوت ہیں۔ آج اس میں نئے اشاروں اور نئے کنایوں کی فراوانی ہے۔ اسی نے اس میں

نئی [illegible] کو پیدا کیا ہے یہ [illegible] موجودہ حالات سے مطابقت رکھتی ہے۔ اقبال کے وقت سے اس کا آغاز ہوتا ہے جو جدید نظم اور اس شعراء میں فیض، ناصر کاظمی اور مجروح نے اس سلسلے میں بڑا کام کیا ہے۔

وقار: ۔ جدید غزل ان کو کبھی خاموش نہیں کر سکتی۔

عبادت: ۔ جدید غزل کو شعراء پر غصہ نکالتے ہوئے ایک بات اکثر کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہتے ان کی حیثیت شعلۂ مستعجل کی ہوتی ہے۔ نقادین کی تخلیقی کاوشوں کا سلسلہ خاصے عرصے تک جاری رہتا تھا۔ موجودہ دور میں شعراء چند غزلیں لکھ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

وقار: ۔ یہ غزل ہی پر منحصر نہیں۔ افسانہ کا بھی یہی حال ہے۔

عبادت: ۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ حالات سازگار نہیں ہیں نا سازگار حالات اعصاب کو مضمحل کر دیتے ہیں اور اس سے تخلیقی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

وقار: ۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نوجوان شعراء محنت نہیں کرتے۔ چند غزلیں لکھ کر اپنے آپ کو استاد سمجھ لیتے ہیں۔

سالک: ۔ معاشی مشکلات بھی اس کا ایک سبب ہیں یہ دور ہے مصنف عرصہ دراز تک تخلیق میں منہمک رہتا ہے۔ پریم چند کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

عبادت: ۔ لیکن اسکے باوجود جدید غزل کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے اپنے ماحول کی عکاسی کی ہے اور اسطرح ایک نئی معنویت کو پیدا کیا ہے۔ حزن و یاس کے باوجود اس میں زندگی کو سمجھنے اور اس کو برتنے کی خواہش نمایاں نظر آتی ہے اصغر نے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔

غزل کیا اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغر
یہاں افسوس گنجائش نہیں فرہاد و قاتم کی

ندیم: ۔ یہاں مجھے اپنا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

ہم نے ہر غم سے غمخواری ہی تمہاری چاہی
ہم کو کوئی غم ملتے جو وابستۂ غم بھی نہ ہوئے

عبادت: ۔ زندگی کو جتنے زاویوں سے برتا جا سکتا ہے یہ تمام جہتیں جدید غزل میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے آرٹ سے بے نیاز تنقید کے یہاں ملتے ہیں۔ ان کے اس شعر میں ؎

گراں ہے دل پہ غمِ دوست کا ہجوم سحر ہے آج وہی جانِ انتظار کا موسم

غم دوست کی آمائش جس انتظار کا موسم کہتا ہے اس خیال کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ اس اعتبار سے جدید غزل قدیم غزل سے الگ نظر آتی ہے اور یہی ثبوت ہے کہ وہ آگے بڑھ رہی ہے اور آئندہ بھی آگے بڑھتی جائے گی۔

سالک: ۔ غزل کی زندگی کا یہی ثبوت ہے جو صنف انقلاب کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتی ہو اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ زندہ رہے گی۔

عبادت: ۔ غزل نے انقلابات زمانہ سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کیا ہے۔ اس میں تجربے بھی ہوئے ہیں۔ لیکن ان تجربات میں انتہا پسندی نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل کی صنف انتہا پسندی کو روا نہیں رکھتی۔ نظم میں جو تجربات ہوئے ہیں ان کا عکس غزل میں نہیں ملتا۔ لیکن تجربات ہوئے ضرور ہیں۔ یہ تجربات نئی اشاریت، نئی ایمائیت، نئے انداز اور نئے آہنگ کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

سالک: ۔ نئے انداز اور آہنگ میں ہندی کی بحروں کو بھی خاصا دخل ہے۔ اس طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کی ضرورت ہے۔

عبادت: ۔ بحروں کے استعمال کا شعور موجودہ دور کی غزل میں بہت بڑھا ہے ہندی کی بحروں کے استعمال میں خاصے تجربے کئے گئے ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے بحروں کا استعمال کیا گیا ہے۔

سالک: ۔ اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غزل ترقی کر رہی ہے اور آئندہ بھی اس کے لئے ترقی کا امکان ہے۔ لیکن نقادوں کو غافل نہیں رہنا چاہئے۔

شعرائے متغزلین

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

ہمیں جو شعرائے کرام کی غزلیں "غزل نمبر" میں شائع ہوئی ہیں ان کے مختصر حالاتِ زندگی جس وقت مجھ سے مرتب کرنے کیلئے دیر صاحب "نقوش" نے فرمائش کی تو میں نے اسے معمولی کام سمجھ کر حامی بھر لی لیکن جس وقت کام کرنے بیٹھا تو معلوم ہوا کہ کام اتنا آسان نہ تھا جتنا میں سمجھا تھا یعنی صرف تذکروں، تاریخوں، رسالوں اور اخباروں کو الٹنا پڑا جب جا کر چھ ماہ کی مدت میں کچھ حالات جمع ہو سکے میں نے اپنے دوستوں اور کرم فرماؤں سے بھی اس کام میں مدد لی اور خود بھی یونیورسٹی لائبریری اور پنجاب پبلک لائبریری کے چکر لگائے اور جہاں سے جو کچھ ملا جمع کرتا رہا۔ بعض شعراء جن کے حالات کہیں لکھے ہوئے نہ مل سکے ان سے خود بھی ملا اور اپنے احباب کو بھی ان کے پاس بھیجا جب جا کر بہت تگ و دو اور تلاش و تفحص کے بعد میں یہ حالات تذکرہ نگر اہم کی خدمت میں پیش کرنے کے قابل ہو سکا۔ اب بھی اگر کسی محترم بزرگ کے حالات اس میں آپ کو نظر نہ آئیں تو اس کی وجہ صرف یہ سمجھیں کہ مجھے باوجود کوشش کے ان کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔

میں نے اس تذکرہ کے مرتب کرنے میں اگرچہ بہت اختصار سے کام لیا ہے مگر اس امر کو ضرور ملحوظ رکھا ہے کہ اختصار میں بھی جامعیت پیدا ہو جائے اور کسی شاعر کے حالات میں سے کوئی اہم اور ضروری بات چھوٹنے نہ پائے۔ جہاں کسی شاعر کے سنہ پیدائش یا سنہ واقعہ کے بیان میں اختلاف تھا وہاں حتی الامکان تلاش و تحقیق کر کے کتاب سنہا در سنہ تقویم اس تذکرہ میں درج کی گئی ہے۔ اس طرح یہ اوراق ایک "جدید تذکرۂ شعراء" کے حامل بن گئے ہیں جو امید ہے کہ شعر و سخن کے شائقین اور شعراء کے تذکروں کے طالبین کے لیے اچھے مرقع کا کام دیں گے۔

میں نے اس تذکرہ کی ترتیب شاعروں کے تخلص کا خیال کرتے ہوئے حروفِ تہجی کے لحاظ سے رکھی ہے یعنی آپ کو جس شاعر کا حال دیکھنا ہو اس کا بیان شاعر کے تخلص کے لحاظ سے دیکھیں نہ کہ نام کے لحاظ سے اور اس تخلص میں حروفِ تہجی کی ترتیب کا خیال رکھیں۔ ترتیب کی بعض اور صورتیں بھی پیشِ نظر تھیں مگر تخلص کے لحاظ سے حروفِ تہجی کی ترتیب ہی نسبتاً آسان اور بہتر معلوم ہوئی اس لیے وہی اختیار کی گئی۔ امید ہے کہ ناظرین بھی اس ترتیب کو پسند فرمائیں گے البتہ اس کے تین حصے ہیں، پہلے حصہ میں پرانے شعراء، دوسرے میں نئے اور تیسرے میں وہ جو باقی رہ گئے تھے۔

حالاتِ شعراء کی فراہمی کے سلسلہ میں یہ آخری بات بھی عرض کر دوں کہ میں نے شعرائے کرام کے سوانح تلاش کرنے میں اپنی طرف

سے کوشش کا کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا اور بغیر اس خیال کے کہ کسی شاعر کا حال تلاش کرنے میں کتنا وقت خرچ ہوتا ہے؟ اس کام کو کیا ہے قدیم: مشہور شعراء تو تقریباً سب آگئے اور ان کے کہ دبیش حالات مل گئے۔ بالکل جدید اور موجودہ شعراء کے حالات فراہم کرنے کی بھی انتہائی سعی کی گئی مگر افسوس ہے کہ اس کوشش میں سو فی صدی کامیابی نہیں ہوئی اور بعض کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے جس کے لیے میں ان سب اصحاب سے معذرت خواہ ہوں کیونکہ ان کے سوانح نہ کسی جدید تذکرۂ الشعراء میں مل سکے نہ کسی اور ذریعے سے حاصل ہو سکے اس لیے میں باوجود خواہش کے ان کو اس تذکرہ میں شامل کرنے سے قاصر رہا۔

آبرو:- بجھ الدین نام، عرف شاہ مبارک تخلص آبرو۔ درویش منش، قلندر مشرب اور حسن پرست انسان تھے۔ سراج الدین علی خاں آرزو کے شاگرد ہیں۔ وطن گوالیار تھا۔ طبقاتوں کے مشہور شعراء میں سے ہیں۔ صاحب دیوان تھے لیکن کلام تلف ہو گیا۔ کچھ نساخ اورنگ آبادی نے اپنے تذکرہ چمنستانِ شعراء میں ان کے بہت سے اشعار تلاش کر کے نقل کیے ہیں۔ ۱۷۴۸ء میں بہ عہد محمد شاہ بادشاہ دہلی وفات پائی۔

آتش:- خواجہ حیدر علی نام، خواجہ علی بخش کے بیٹے تھے۔ آبائی وطن دہلی، آتش کے والدین ترکِ وطن کر کے فیض آباد چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ پیری مریدی کا سلسلہ کرتے تھے۔

والد کی وفات چونکہ صغر سنی میں ہو گئی تھی اس لیے باقاعدہ تعلیم نہیں پائی۔ بڑے ہو کر نواب میر محمد تقی کی سرکار میں سپاہی بھرتی ہو گئے جو ان کو ۱۷۸۵ء کے قریب لکھنؤ میں لے آئے۔ اس کے بعد انھوں نے ساری عمر اسی شہر میں گزار دی۔ یہیں مصحفی کی شاگردی کی اور آتش کا نام پیدا کیا۔ سرکار یا دربار سے اتنی معقول سپاہیانہ وظیفہ ملتا تھا جو پیدا چار دن بھی نہ ہوتا اور مہینے کے باقی دن قرض پر گزارہ چلتا تھا۔ مزاج میں توکل کچھ ضرورت سے زیادہ ہی تھا۔ جو کچھ آتا خرچ کر دیتے اور کل کے لیے کچھ بچا کر نہ رکھتے۔ ننگے بدن صرف ایک لنگوٹ باندھے سارا دن ایک جھلنگے پر تکیہ لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ ایک ٹوٹا پھوٹا سٹرل ساحقہ سامنے رکھا رہتا تھا۔ جو آتا اس کے سامنے یہ حقہ پیش کر دیا جاتا۔ پلنگ کا بھی شغل جاری رہتا تھا۔ خوب گھٹی تھی اور خوب پی جاتی تھی۔ وضع سپاہیانہ تھی جب مشاعرہ میں غزل پڑھنے جاتے تو تلوار میان سے دو انگل باہر رہتی تھی۔ ۱۷۶۷ء (بقول صاحب مراۃ الشعراء ۱۷۶۵ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۸۴۵ء میں انتقال کیا۔ دو دیوان چھوڑے جو تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہیں۔ بعض نامور شاگرد یہ تھے۔ سید محمد خاں رند، میر وزیر علی صبا، میر دوست علی خلیل، ہدایت علی جلیل، مرزا عنایت علی مسہل اور پنڈت دیا شنکر نسیم۔

آثر:- شمس العلماء نواب امداد امام آثر ۱۷ اگست ۱۸۴۹ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی اور انگریزی زبان کے فاضل تھے۔ ان کی شاعری خاری جذبات اور محققانہ مسائل سے معمور ہے۔ دیوان چھپ چکا ہے۔ بڑے معرکے کی ایک کتاب کشف الحقائق کے نام سے بھی لکھی ہے۔ انتقال کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی۔

میر اثر: ۔ سید محمد میر اثر۔ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے اور فقیری اور شاعری دونوں میں اپنے بھائی کے پیرو اور مرید۔ کلام اگرچہ صاف اور سادہ ہے مگر درد اور اثر میں میر درد کے برابر نہیں۔ مولوی عبدالحق ان کے متعلق لکھتے ہیں "مضمون کو دیکھئے تو اس میں تصوف ہے نہ اخلاق نہ حکمت ہے بلکہ سچے دل کی واردات ہے جو صاف صاف سیدھے الفاظ میں اس طرح بیان کردی ہے جیسے کوئی باتیں کرتا ہو۔" دیوان اثر کو مولوی عبدالحق نے معہ مقدمہ کے انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع کردیا ہے ان کی مثنوی خواب وخیال بھی انجمن نے شائع کی ہے۔

احسان: منشی احسان علی خاں المتخلص بہ احسان۔ بریلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد ترک وطن کرکے شاہجہانپور (یو۔پی) آگئے تھے۔ جلال لکھنوی کے شاگرد تھے۔ شاہجہانپور کی عدالت میں مختار تھے۔ ارمغان کے نام سے ایک ماہوار رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ ۱۸۵۵ء میں بمقام اوڈار (ضلع بریلی) پیدا ہوئے اور ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔ کشمیر کے مؤرخ منشی غلام الدین فوق انہی کے شاگرد تھے۔ مجموعۂ خیال ان کے دیوان کا نام ہے شاہجہان پور کی تاریخ بھی لکھی تھی۔ فن تشبیہ میں ایک رسالہ موسوم بہ تشبیہ یار بھی تصنیف کیا تھا اور اپنے مجموعہ سنہ ارمغان کے ساتھ بالاقساط چھاپا تھا۔

شعر وسخن کا شوق ۱۶ سال کی عمر سے ہوگیا تھا۔ پہلے شاہجہان پور میں حافظ شاہ احمد خاں تاب کے شاگرد ہوئے۔ پھر حکیم میر حسن علی جلال کے۔ پھر دکن جاکر داغ کی شاگردی اختیار کی۔ لالہ سری رام مولف خمخانۂ جاوید ان کے متعلق لکھتے ہیں "سوانحی کی دیانت بقدر ضرورت اور خاکی کی استعداد زبردست ہے۔ آپ کے اشعار محبوب واستقام سے مبرا اور پاک ہوتے ہیں۔ بلندی مضمون وشیرینی زبان کلام میں دلچسپی پیدا کرتی ہیں طبیعت غزل گوئی کی طرف زیادہ مائل ہے۔ گو چند قصیدے بھی لکھے ہیں۔"

احسن مارہروی: ۔ سید علی احسن المتخلص احسن اردو زبان کے نہایت کامیاب مصنف۔ اعلیٰ پایہ کے ادیب، زبان کے ماہر، قادر الکلام سخنور اور کامل الفن استاد تھے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں تاریخ نثر اردو نہایت مفید اور بڑی بلند پایہ کتاب ہے۔ مخزن احسن کے علاوہ اور کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔ یہ کتاب بھی انھوں نے بچوں کے لیے لکھی تھی جس میں اردو عربی الامثال کی کہانیوں کو نظم کیا گیا ہے۔ ۹ نومبر ۱۸۷۶ء کو مارہرہ (ضلع پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی سید مجتبےٰ تھا جو احسن تخلص کرتے تھے۔ چودہ سال کی عمر سے شوق سخن ہوا اور آخر تک رہا۔ ۱۸۹۵ء میں ایک ماہوار نگارستان سخن کے نام سے جاری کیا جو عرصہ تک جاری رہا۔ فن شعر میں آپ داغ کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے استاد کی سوانح بھی جلوۂ داغ کے نام سے لکھی ہے۔ داغ کے انتقال کے بعد ان کی یاد میں ایک رسالہ فصیح الملک کا اجرا کیا جو ۱۹۱۰ء تک شائع ہوتا رہا کچھ دنوں تک خمخانۂ جاوید کی ترتیب وتصنیف بھی ان سے متعلق رہی۔ ایک دفعہ تلاش معاش کے سلسلہ میں لاہور بھی آئے تھے اور برس ڈیڑھ برس یہاں قیام کیا تھا۔ ۱۹۲۶ء میں مسلم یونیورسٹی میں اردو فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور ۱۹۳۶ء تک کام کرتے رہے۔ ۳۰ یا ۳۱ اگست ۱۹۴۰ء کو پٹنہ میں انتقال کیا جہاں آپ علاج کے لیے گئے ہوئے تھے۔

[illegible]

آرزو :- [illegible] کی خان آرزو کے شاگرد ہیں۔ دلی کو پیارا تھا۔ مقاتل کے شہر شعرا میں ہیں۔ صاحب دیوان تھے لیکن کلام تلف ہوگیا۔ مگھی زبان اور مگ آبادی نے اپنے تذکرہ چمنستانِ شعرا میں ان کے بہت سے اشعار کاش کر کے نقل کیے ہیں۔ ۱۱۴۳ھ میں بہ عہد محمد شاہ بادشاہ دہلی وفات پائی۔

آتش :- خواجہ حیدر علی نام، خواجہ علی بخش کے بیٹے تھے۔ آبائی وطن وہلی، تاجگران کے والد بن ترک وطن کر کے بیس آباد چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔ پیری مریدی کا سلسلہ کرتے تھے۔

والد کی وفات چونکہ صغر سنی میں ہوگئی تھی اس لیے باقاعدہ تعلیم نہیں پائی۔ بڑے ہوکر نواب میر محمد تقی کی سرکار میں سپاہی بھرتی ہو گئے جہاں کو لکھنؤ کے قریب لکھنؤ میں لے آئے اس کے بعد انھوں نے ساری عمر اسی شہر میں گذار دی۔ یہیں مصحفی کی شاگردی کی اور اسی شہر میں نام پیدا کیا۔ سرکار اودھ سے اتنی روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا جو بڑا چارہ بھی نہ تھا اور مہینے کے باقی دن قرض پر گزارہ چلتا تھا۔ مزاج میں توکل کچھ ضرورت سے زیادہ ہی تھا۔ جو کچھ آتا خرچ کر دیتے اور کل کے لیے کچھ بچا کر نہ رکھتے۔ ننگے بدن صرف ایک انگوچھا باندھے سارا دن ایک چھینکے پر تکیہ لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ ایک ٹوٹا پھوٹا مٹرل سامنے رکھا رہتا تھا جو آتا اس کے سامنے یہ حقہ پیش کر دیا جاتا۔ بھنگ کا بھی شغل جاری رہتا تھا۔ خوب گھٹی تھی اور خوب پی جاتی تھی۔ وضع سپاہیانہ تھی جب مشاعرہ میں غزل پڑھنے جاتے تو تلوار میان سے دو انگل باہر رہتی تھی۔ ۱۱۶۱ھ (بقول صاحب مراۃ الشعراء ۱۱۶۰ھ) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۵۸ھ میں انتقال کیا۔ دو دیوان چھوڑے جو تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہیں۔ بعض نامور شاگرد یہ تھے۔ سید محمد خاں رند، میر وزیر علی صبا، میر دوست علی خلیل، ہدایت علی جلیل، مرزا عنایت علی مشکل اور پنڈت دیا شنکر نسیم۔

آثر :- شمس العلماء نواب امداد امام آثر، اگست ۱۸۴۹ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی اور انگریزی زبان کے فاضل تھے۔ ان کی شاعری خارجی جذبات اور محققانہ مسائل سے معمور ہے۔ دیوان چھپ چکا ہے۔ بڑے معرکے کی ایک کتاب کشف الحقائق کے نام سے بھی لکھی ہے۔ انتقال کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی۔

...اثر - سید محمد میر متخلص بہ اثر۔ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے اور فقیری اور شاعری دونوں میں اپنے بھائی کے ...چھ صاف ... سادہ ہے مگر درد و اثر میں میر درد کے برابر نہیں۔ مولوی عبدالحق ان کے متعلق لکھتے ہیں "مضمون کو ...وف ہے ... تعلق نہ حکمت ہے نہ فلسفہ بلکہ سچے دل کی واردات ہے جو صاف سیدھے الفاظ میں اس طرح ...ہے جیسے کوئی ... کرتا ہو۔ ... مولوی عبدالحق نے معہ مقدمہ کے انجمن ترقی اُردو کی جانب سے شائع کر دیا ہے ...ستی خواب و ... ہے۔

... علی جان المتخلص بہ احسان بریلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد ترک وطن کر کے شاہجہانپور ... تھے۔ شاہجہانپور کی عدالت میں مختار تھے۔ ارمغان کے نام سے ایک ماہوار رسالہ بھی ... بریلی) پیدا ہوئے اور ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔ کشمیر کے مؤرخ منشی محمد الدین فوق انہی کے شاگرد تھے ... کا نام ہے مثنا شاہجہان پور کی تاریخ بھی لکھی تھی۔ فن شعر میں ایک رسالہ موسوم بہ شہپر یا عروض تصنیف کیا ... اصلاح چھپا تھا۔

... سال کی عمر سے ہو گیا تھا پہلے شاہجہان پور میں حافظ شاہ احمد خاں تاب کے شاگرد ہوئے۔ پھر سکندر میر ... شاگرد ہوئے کی شاگردی اختیار کی۔ لالہ سری رام مؤلف خمخانۂ جاوید ان کے متعلق لکھتے ہیں "عروض کی ... درست ہے۔ آپ کے اشعار عیوب و اسقام سے مبرا اور پاک ہوتے ہیں۔ بلندی مضمون و فقیری مذاق ... غزل گوئی کی طرف زیادہ مائل ہے۔ گو چند قصیدے بھی لکھے ہیں۔"

... ہروی :- سید علی احسن المتخلص احسن اُردو زبان کے نہایت کامیاب مصنف۔ اعلیٰ پایہ کے ادیب، ... الکلام سخنور اور کامل الفن استاد تھے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں تاریخ شرار اردو نہایت مفید اور ... ہے۔ مجموعہ احسن کے علاوہ اور کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔ یہ کتاب بھی انھوں نے بچوں کے لیے لکھی تھی جس میں ... کو نظم کیا گیا ہے۔ ۹ نومبر ۱۸۶۷ء کو ماہرہ (ضلع پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی سید مجتبیٰ تھا جو ... تھے۔ چودہ سال کی عمر سے شوق سخن ہوا اور آخر تک رہا۔ ۱۸۹۵ء میں ایک ماہوار گلدستہ ریاض سخن کے نام سے ... تک جاری رہا۔ فن شعر میں آپ داغ کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے استاد کی سوانح بھی جلوۂ داغ کے نام سے لکھی ... انتقال کے بعد ان کی یاد میں ایک رسالہ فیض الملک کا اجرا کیا جو ۱۹۱۰ء تک شائع ہتا رہا کچھ دنوں تک خمخانۂ جاوید ... و تصنیف بھی ان سے متعلق رہی۔ ایک دفعہ تلاش معاش کے سلسلہ میں لاہور بھی آئے تھے اور برس ڈیڑھ برس یہاں قیام کیا تھا۔ ... سلم یونیورسٹی میں اُردو فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور ۱۹۳۵ء تک کام کرتے ... انتقال کیا جہاں آپ علاج کے لیے گئے ہوئے تھے۔

احسن :- مرزا احسن علی نام، احسن تخلص۔ سودا اور ضیاء کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ زیادہ حالات نہ مل سکے۔

اختر:- نواب واجد علی شاہ اختر اودھ کا آخری بادشاہ اپنے باپ امجد علی شاہ کے انتقال کے بعد ۱۸۴۷ء میں تخت پر بیٹھا۔ ہر وقت عیش و عشرت اور لہو و لعب میں مشغول رہتا۔ انتظام سلطنت اور ملک کی خبر گیری سے کچھ واسطہ نہ رکھتا۔ ناچ کا نے اور قص و سرور کی محفل ہر وقت بھی رہتی۔ آخر انگریزوں نے ۱۸۵۶ء میں معزول کر کے مٹیا برج کلکتہ میں بھیج دیا مگر اس کی رنگ رلیاں وہاں بھی ختم نہ ہوئیں۔ پندرہ لاکھ سالانہ وظیفہ ملتا تھا اور سب کا سب خرچ ہو جاتا تھا۔ اسی عیش و نشاط کی حالت میں ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء کو سفر آخرت کیا۔ امیر اور فخر الدولہ بہتی سے اصلاح لیتا تھا۔ اردو زبان کا بہت اچھا شاعر تھا۔ علمی لیاقت میں بھی کچھ کم نہ تھا۔ فن موسیقی کا ماہر تھا۔ چالیس کے قریب تصانیف چھوڑی ہیں۔ حال میں "واجد علی شاہ اور ان کا عہد" کے نام سے مولانا رئیس احمد جعفری نے اس پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔

آرزو۔ سراج الدین علی خاں نام آرزو تخلص۔ فارسی اور اردو کے بلند پایہ شاعر۔ اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز اور پندرہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ والد کا نام شیخ حسام الدین تھا بمقام آگرہ ۱۶۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ جوان ہوئے تو گوالیار میں منصب دار مقرر ہوئے۔ محمد فرخ سیر کے عہد میں دہلی آئے اور شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں لکھنؤ چلے گئے اور وہیں ۱۷۵۶ء میں انتقال کیا مگر لاش حسب وصیت دہلی لا کر دفن کی گئی۔ تمام تذکرہ نویس متفق ہیں کہ نہایت خوش طباع، فن شعر میں کامل اور فصاحت و بلاغت میں بے مثل تھے۔ ان کے متعلق میر تقی میر کا قول ہے کہ ان کے زمانہ میں ان سے بڑھ کر کوئی محقق اور قادر الکلام نہ تھا۔ لطف یہ کہ ان کے شاگرد ان سے بھی زیادہ نامور ہوئے ہیں مثلاً مرزا مظہر جان جاناں، مرزا رفیع، میر تقی میر اور خواجہ میر درد۔

نہایت شگفتہ مزاج بھلے مانس واقع ہوئے تھے مگر مزاج میں بہت انکسار تھا۔ سلطنت کی طرف سے قاضی القضاۃ کے عہدہ پر متعین ہوئے مگر غرور اور فخر نام کو نہ تھا۔

ان کے فارسی دواوین میں قریباً ۳ ہزار اشعار ہیں۔ تصانیف کی مختصر فہرست یہ ہے۔ شرح سکندر نامہ، شرح قصائد عرفی، شرح گلستان، سراج اللغات (فارسی)، نوادر الصفات (اردو)، موہبت علی، عطیہ کبریٰ، تذکرہ مجمع النفائس مرسوم بہ تذکرہ آرزو، تنبیہ الغافلین۔

آرزو لکھنوی:- نام سید انور حسین، تخلص آرزو اور وطن لکھنؤ ہے۔ آپ کے آباء اجداد حضرت اورنگ زیب کے عہد میں ہرات سے وارد ہند ہوئے اور اجمیر میں قیام کیا۔ اجمیر سے لکھنؤ چلے گئے اور یہیں ۱۸۷۲ء (۱۲۸۹ھ) میں آرزو پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید ذاکر حسین تھا۔ پانچ برس کی عمر میں تعلیم شروع ہوئی۔ ذہن عمدہ تھا اس لیے جلد ہی فارسی و عربی کی کافی لیاقت حاصل کر لی۔ ۱۲ سال کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ فن شعر میں جلال لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ غزل گو شعراء میں ممتاز درجہ کے مالک ہیں۔ کلکتہ اور بمبئی کی علم کمپنیوں کے لیے عرصہ دراز تک انھوں نے گانے اور گیت لکھے ہیں۔ فلمستان آرزو، جہان آرزو اور سریلی بانسری ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔ سریلی بانسری کی زبان نہایت سادہ، آسان اور عام فہم ہے اور فارسی اور عربی الفاظ سے خالی۔ ۱۹۵۱ء میں وفات پائی۔

ارشد ۔ خاندانِ مغلیہ کے چشم و چراغ صاحب عالم مرزا عبدالغنی گورگانی متخلص بہ ارشد ۱۸۵۸ء میں قلعہ معلی دہلی میں پیدا ہوئے۔ شاعری میں مرزا قادر بخش صابر کے شاگرد تھے۔ طرزِ قدیم اور طرزِ جدید دونوں میں غزلیں لکھتے تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کی سوانحعمری اردو میں لکھی ہے جو اب نایاب ہے۔ بچپن سے بزرگوں میں بہت قابل اور لائق شخص رہے۔ پنجاب میں سررشتہ تعلیم میں مدرس ہو گئے تھے اور انبالہ میں ساری عمر گزار دی۔ ملتان میں ۱۲ فروری ۱۹۰۶ء کو وفات پائی۔

آزاد انصاری :۔ ابوالاحسان حکیم الطاف احمد آزاد انصاری ۱۲ اکتوبر ۱۸۵۸ء کو ناگپور میں پیدا ہوئے حضرت ابوایوب انصاری کی اولاد سے تھے اور سہارن پور میں رہتے تھے۔ عربی فارسی کی تحصیل کے بعد طب پڑھی اور ڈیرہ دون، سہارنپور، انبالہ، علی گڈھ، دہلی اور حیدرآباد دغیرہ میں پھرتے اور تلاشِ معاش میں مصروف رہے کبھی طبابت کی اور کبھی صینکوں کی تجارت۔ فنِ شعر میں مولانا حبیب الرحمن حبیبؔ سہارنپوری سے اصلاح لی اور پھر شمس العلماء مولانا حالیؔ کی شاگردی اختیار کی جن سے ان کو نہایت درجہ عقیدت تھی۔ کلام نہایت ستھرا، شائستہ، بلند پایہ اور سنجیدہ ہوتا تھا۔ ان کی نظموں کا مجموعہ چھپ گیا ہے۔ ۱۹۴۲ء میں انتقال کیا۔

آزردہ :۔ مفتی صدرالدین نام، آزردہ تخلص، مولوی لطف اللہ کے بیٹے، کشمیری الاصل۔ دہلی کے باشندے۔ ۱۲ دسمبر ۱۷۸۹ء کو پیدا ہوئے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر اور مولانا فضل امام خیرآبادی سے علومِ عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل کی۔ فنِ شعر میں شاہ نصیر اور میر محسن دہلوی کے شاگرد تھے۔ دہلی کے مفتی اعظم تھے لیکن ۱۸۵۷ء کی تباہی میں قید ہوئے۔ جائداد، کتب خانہ اور مکان سب ضبط ہوا۔ بہ ہزار خرابی قید سے مخلصی پائی۔ ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء کو انتقال ہوا۔ اپنے علم و فضل اور اپنے اعلیٰ اخلاق کے لیے مشہور تھے۔ بیدار عالم اور یگانۂ فاضل ہونے کے ساتھ عربی، فارسی اور اردو کے نادر الکلام شاعر تھے۔ نواب یوسف خاں والیِ ریاست رامپور، نواب صدیق حسن خاں آف بھوپال، سرسید احمد خاں اور مولوی فیض الحسن سہارنپوری وغیرہ ان کے شاگرد ہیں۔

اسدؔ ۔ میر امانی نام تھا اور اسدؔ تخلص کرتے۔ سوداؔ کے شاگرد تھے۔ تلاشِ معاش میں لکھنؤ گئے۔ ۱۸۱۷ء میں وفات پائی۔ مجموعۂ نغز کا مصنف اول کے متعلق لکھتا ہے "جوانے بذوق طبع تیز زبان، بذلہ سنج، طیب بیان، خلیق و یارباش خوش فکر پاکیزہ تلاش"۔

اسمٰعیل :۔ محمد اسماعیل نام۔ میرٹھ کے باشندے۔ ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء کو پیدا ہوئے۔ مروجہ عربی و دینی تعلیم کے بعد ۱۶ سال کی عمر میں محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے سنٹرل نارمل سکول آگرہ سے ۱۸۹۹ء میں ریٹائر ہوئے اور باقی عمر تصنیف و تالیف میں گزار دی یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو میرٹھ ہی میں انتقال ہوا۔

بچوں کے لیے آسان نظمیں لکھنے میں ان کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے بڑی بڑی کتابیں جو ۷ حصوں میں ہیں بحیثیت مجموعی قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کی بیشتر شاعری طرزِ جدید کی حامل ہے جس میں اصلاحی رنگ جھلک رہا ہے۔

ان کی شاعری کے متعلق مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ "حالی کے بعد اگر کسی نے سننے کے قابل کچھ کہا ہے تو وہ اسماعیل میرٹھی ہیں کلیات اسماعیل مدت ہوئی چھپا تھا مگر آج کل کیاب ہے۔

آسی:- مولوی عبدالباری نام، آسی تخلص، جائے پیدائش جون ضلع بیرٹھ، سال ولادت ۱۸۹۳ء مگر ۱۹۱۴ء سے لکھنؤ میں سکونت اختیار کرلی تھی سناطق گلاوٹھوی کے شاگرد تھے۔ آپ نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن کی تعداد ۳۴ تک پہنچتی ہے۔ بصائر آپ کی رباعیات اور قطعات کا مجموعہ ہے۔ دیوان غالب اور تحفۃ العراقین کی شرحیں بھی آپ نے کی ہیں جو شائع ہو چکی ہیں۔

اسیر:- سید مظفر علی نام، دبیر الدولہ خطاب اور اسیر تخلص تھا۔ علامہ سید مدعلی کے فرزند تھے اور ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۴ء) میں قصبہ اٹیلی (نواح لکھنؤ) میں پیدا ہوئے۔ دس برس کے ہوئے تو لکھنؤ چلے آئے تحصیل علوم متداولہ کے بعد شاعری کا شوق پیدا ہوا تو اسیر تخلص رکھ کر شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی شاگردی اختیار کی۔ نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں سرکاری ملازم ہوئے اور ۲۴ گھنٹے خدمت میں حاضر رہتے تھے جس نے ان کو جیلخانوں کا افسر اعلیٰ اور خلاصہ نویس تمام کچہریات سرکاری کا بنا دیا تھا جب واجد علی شاہ معزول ہو گئے تو یہ رام پور چلے گئے اور وہاں عزت کے ساتھ رہے ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) میں بعمر ۷۰ سال انتقال کیا۔ شاعری کے علاوہ فن عروض کے ماہر تھے معیار الاشعار کا نہایت قابلیت سے ترجمہ کیا۔ شفاء العروض اور کئی رسالے فن عروض پر لکھے۔ اردو کے چار اور فارسی کے دو دیوان یادگار چھوڑے۔ ان کے علاوہ مراثی اور مثنویاں بھی بہت سی لکھیں۔ فن شعر میں ان کی وقعت کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ منشی امیر مینائی مہدی حسن ماہر، احمد علی شوق قدوائی، سلیمان خاں اسد، ظہور الحسن ظہور، ریاض خیرآبادی، نواب سید یوسف حسن طباطبائی اور پنڈت رتن ناتھ سرشار جیسے مشاہیر ادب ان کے شاگرد تھے۔

اشتیاق:- شاہ ولی اللہ نام اور اشتیاق تخلص ہے۔ سرہند (ریاست پٹیالہ) کے رہنے والے اور وہاں کے پیرزادے تھے۔ شیخ ظہور الدین حاتم کے ہم عصر تھے۔ بکثرت شعر کہتے کبھی کبھی کیا کرتے تھے۔ نہایت متوکل اور عابد زاہد شخص تھے ۱۱۷۶ھ میں وفات پائی۔

آشفتہ:- ان کا نام حکیم الدین تھا لیکن بھورے خاں کے نام سے مشہور تھے۔ آشفتہ تخلص کرتے تھے مصنف مجموعہ نغز ان کے متعلق لکھتے ہیں "جوانے است خوش فکر، شیریں بیان، عالی طبیعت، فصاحت بیان، غزل طرح از دو خوب سرانجام می یافت و بہ فصاحت می نگاشت" شروع میں شاعری کا نہایت شوق تھا لیکن بعد میں ایک بزرگ میاں محبوب الدین کے ہاتھ پر بیعت کر کے شاعری چھوڑ دی اور زہد و پارسائی کی زندگی اختیار کی۔ مگر صوفیانہ اشعار کبھی کبھی کہتے تھے۔ شاہ محمدی ناظل کے شاگرد تھے۔

آشفتہ:- مرزا رضا قلی نام اور آشفتہ تخلص تھا۔ حکیم محمد یحییٰ شیدہ کے صاحبزادے تھے میر سوز کے شاگرد اور فن طبابت میں ماہر تھے طبیعت درد مندانہ ملی اور شعر بامزا کہتے تھے۔

اصغر گونڈوی :- نام اصغر حسین، تخلص اصغر، وطن گورکھپور ہے مگر گونڈہ میں مستقل قیام کے باعث گونڈوی کہلاتے ہیں۔ یکم مارچ ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے۔ باقاعدہ تعلیم کسی سکول یا کالج میں نہیں پائی مگر پرائیویٹ طور پر انگریزی عربی اور فارسی کی علمی قابلیت پیدا کرلی تھی۔ فوجہ میں منشی خلیل احمد و سید بلگرامی اور منشی امیراللہ تسلیم کے شاگرد ہیں۔ نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ کلام میں متانت اور سنجیدگی اور انداز بیان میں شگفتگی اور رنگینی پائی جاتی ہے۔ غزلوں میں خارجی الفاظ و محاورات کی کثرت ہے مگر ساتھ ہی سلاست اور روانی بھی موجود ہے۔ کچھ دنوں تک لاہور میں رہ کر ادبی خدمت کی۔ پھر الہ آباد میں پریس میں اسسٹنٹ ایڈیٹی کے رسالہ ہندوستان کے ایڈیٹر ہو گئے اور وہیں ۲۷ نومبر ۱۹۳۶ء کو انتقال ہوا۔ نہایت راسخ العقیدہ اور متقی اور درویش صفت بزرگ تھے۔ تصوف سے خاص ذوق رکھتے تھے۔ نشاط روح اور سرود زندگی ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

آصف :- یحییٰ خاں نام، مرزا زمانی عرف آصف تخلص تھا۔ لکھنؤ کے نواب تھے۔ ۱۷۷۵ء میں تخت نشین ہوئے اور ۲۱ ستمبر ۱۷۹۷ء کو وفات پائی اور اپنے ہی بنا کردہ امام باڑہ میں دفن ہوئے۔ امام باڑہ آصف الدولہ لکھنؤ کے تمام امام باڑوں میں بہتر سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنا دارالسلطنت فیض آباد سے لکھنؤ میں منتقل کر لیا تھا۔

شعر و سخن کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ میر سوز کے شاگرد تھے۔ میر قدرت اللہ ان کے متعلق اپنے تذکرہ مجموعہ نغز میں لکھتے ہیں "گاہ گاہ طبع فیض بخش میل سخن می کرد و بامزائی گفت"۔ "نخستان جاوید" کے مصنف کی ان کے متعلق یہ رائے ہے "ان کے کلام میں پختہ استاد میر سوز کی سی سادگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ خیال تھرا ہے اور زبان پاکیزہ"۔

آفتاب :- ابوالمظفر جلال الدین سلطان حالی گیہر شاہ عالم دہلی میں منصب وزارت خطاط کا ایک کمزور بادشاہ تھا۔ ایک طرف مرہٹوں نے سلطنت پر قبضہ کر رکھا تھا۔ دوسری طرف انگریز چھائے ہوئے تھے۔ تیسری طرف روہیلے قتل و غارت مچا رہے تھے۔ غلام قادر روہیلے نے قلعہ معلی دہلی پر قابض ہو کر اور چھاتی پر چڑھ کے بادشاہ کی آنکھیں نکال ڈالیں مگر یہ میں خود بھی کسنے کی موت مارا گیا۔ بادشاہ علم کا قدر دان اور شعراء کا سرپرست تھا۔ خود بھی اردو اور فارسی میں شعر کہتا تھا۔ آفتاب تخلص تھا اور صاحب دیوان تھا۔ سودا، میر، میر سوز، مصحفی اور امانت سب اس کے ہاں سے وظیفہ پاتے تھے۔ ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷ء) میں پیدا ہوا، ۱۱۷۳ھ (۱۷۵۹ء) میں تخت نشین ہوا اور کم و بیش ۴۵ سال سلطنت کرنے کے بعد ۸۰ سال کی عمر میں ۷ رمضان ۱۲۲۱ھ مطابق ۸ نومبر ۱۸۰۶ء کو انتقال کیا۔

افسوس :- میر شیر علی نام، افسوس تخلص، فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں بہت مشہور شخص گزرے ہیں۔ میر حیدر علی حیران کے شاگرد تھے۔ نارنول (ضلع گڑگاؤں) کے رہنے والے دہلی میں ۱۷۸۳ء میں پیدا ہوئے۔ بڑے ہو کر اس وقت کے علوم پڑھے۔ پھر تلاش معاش میں لکھنؤ پہنچے۔ مرزا جواں بخت جہاندار شاہ ولیعہد دولت منصب ان دنوں لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے ان کا کلام سنا تو اپنی سرکار میں ملازم رکھ لیا۔ جب دہلی واپس جانے لگے تو انھوں نے لکھنؤ کی شاعرانہ دلچسپیوں کو چھوڑنا نہ چاہا اور یہیں رہ گئے۔ نواب سعادت الدولہ نے سرپرستی کی اور ان کو فکر معاش سے آزاد کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد فورٹ ولیم کے لیے لائق اور قابل مصنفوں

کی تلاش ہوئی۔ نواب سعد یار الدولہ نے ان کا نام پیش کر دیا اور یہ لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ دو سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی اور آٹھ نو سال تک اس منصب پر نہایت آرام سے رہے۔ ۱۸۰۹ء میں انتقال کیا۔ تصانیف میں ایک پورا دیوان یادگار چھوڑا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے۔ (۲) گلستانِ سعدی کا اردو میں ترجمہ کر کے باغ اردو نام رکھا (۳) لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ آرائش محفل ہے جو "خلاصۃ التواریخ" کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب ابتداً مفتی سجان رائے ساکن بٹالہ نے فارسی میں ہندوستان کی تاریخ کے متعلق لکھی تھی اور عہد قدیم کی بڑی مستند تاریخوں سے اسے ترتیب دیا تھا مگر آرائش محفل صرف عہد ہندو کی تاریخ کا ترجمہ ہے۔ پوری کتاب کا ترجمہ نہیں۔

اقبال :۔ شاعرِ مشرق، ترجمان حقیقت ڈاکٹر سر محمد اقبال ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آبا و اجداد کشمیری پنڈت تھے۔ بچپن میں شمس العلماء مولوی سید میر حسن کی صحبت سے مستفید ہوتے رہے۔ ایف اے گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس کیا جہاں مشہور مستشرق پروفیسر آرنلڈ فلسفہ کے معلم تھے اور اقبال کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آتے تھے۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں فلسفہ اور تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں مزید تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے۔ جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۰۸ء میں وطن واپس آئے اور بیرسٹری شروع کر دی۔ ۱۹۲۲ء میں سر کا خطاب ملا۔ ۱۹۳۱ء میں مسلم لیگ کے صدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلینڈ گئے۔ پاکستان کا نظریہ سب سے پہلے ڈاکٹر اقبال ہی نے قوم کے سامنے پیش کیا تھا۔ آخری عمر نہایت تکلیف اور درد و کرب میں گزری اور مختلف عوارض ایسے لگ گئے جنھوں نے آخر وقت تک پیچھا نہ چھوڑا اور بالآخر اس حالت میں ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ایشیا کا یہ بہت بڑا شاعر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ ڈاکٹر اقبال کا نام ان کی دلنواز نگیز نظموں کے باعث ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ان کی نظموں کے مجموعے مندرجہ ذیل ہیں:۔ بانگ درا۔ اسرار خودی۔ رموز بے خودی۔ پیام مشرق۔ زبور عجم۔ جاوید نامہ۔ بال جبریل۔ ضرب کلیم۔ پس چہ باید کرد اے اقوام شرق۔ ارمغان حجاز۔ باقیات اقبال۔ ان کی سب سے پہلی کتاب کا نام علم الاقتصاد ہے۔

اکبر الہ آبادی :۔ سید اکبر حسین نام، اکبر تخلص، لسان العصر لقب، وطن الہ آباد، تاریخ پیدائش ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء۔ والد کا نام سید تفضل حسین رضوی تھا۔ گھر میں خوشحالی اور امیری نہ تھی اس لیے معمولی تعلیم کے بعد نوکری کی فکر ہوئی اور محکمۂ تعمیرات میں ملازم ہو گئے۔ پھر نوکری چھوڑ کر مختاری کا امتحان پاس کیا۔ پھر وکالت کا امتحان دیا۔ ۱۸۸۰ء میں منصف ہو گئے۔ ۱۸۹۴ء میں جج عدالت خفیفہ مقرر ہوئے اور ۱۹۰۳ء میں ملازمت چھوڑ کر تصنیف و تالیف کا شغل اختیار کیا۔ اہلیہ کی وفات اور اپنے بیٹے ہاشم کی موت کے باعث آخری عمر نہایت حزن و غم میں گزری۔ ۱۹۲۱ء میں انتقال کیا۔ اعلیٰ پایہ کی ظریفانہ شاعری ان پر ختم تھی۔ ان کا کلیات چار جلدوں میں چھپ چکا ہے۔

الم :۔ حضرت خواجہ میر درد کے بھتیجے صاحب میر نام۔ میاں صاحب کے لقب سے مشہور تھے۔ الم تخلص کرتے تھے۔ میر قدرت اللہ قاسم ان کے متعلق لکھتے ہیں:۔ "کلام صحت نظام ایشاں علاوتے دارد کہ زائقۂ سخن داں داند و لیفیتے دارد کہ وجدان مادہ نوشاں جام وحدت شناسد۔

امانت :- نام سید آغا حسن تخلص امانت۔ پیدائش ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۵ء) وطن لکھنؤ، میر آغا رضوی کے بیٹے تھے۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ بیس برس کی عمر میں کسی بیماری کے باعث گونگے ہو گئے۔ یہ سخت تکلیف دہ مرض ۹ برس تک عذاب جان بنا رہا۔ اس کے بعد اس سے رہائی ملی۔ اُردو میں سب سے پہلے ڈراما انھوں نے ہی لکھا جس کا نام اندر سبھا ہے۔ اپنے واسوخت کے لیے بھی مشہور ہیں۔ دلگیر کے شاگرد تھے۔ ۱۲۷۵ھ (۱۸۵۸ء) میں وفات پائی۔

امانی :- میر امانی نام اور امانی تخلص تھا۔ ۱۱۷۷ھ میں انتقال ہوا۔ زیادہ تفصیل کے ساتھ ان کے حالات نہیں ملے۔

امید :- ان کا نام مرزا محمد رضا تھا۔ بہادر شاہ بادشاہِ دہلی کے دربار سے قزلباش خاں خطاب اور منصب یک ہزاری ملا تھا وطن ہمدان تھا۔ جوانی میں اصفہان آئے۔ وہاں مرزا ماہر وحید کے شاگرد ہوئے پھر ہندوستان چلے آئے۔ یہ فارسی کے شاعر تھے اور امید تخلص کرتے تھے مگر کبھی کبھی اُردو میں بھی کہتے تھے۔ ۱۱۵۹ھ (۱۷۴۶ء) میں لکھنؤ کی بیماری سے وفات پائی۔

امیر مینائی :- امیر احمد نام۔ امیر تخلص۔ ایک بزرگ حضرت شاہ مینا کی اولاد میں سے تھے اس لیے امیر مینائی کہلاتے ہیں۔ فن شعر میں منشی مظفر علی اسیر کے شاگرد ہیں۔ ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کی تحصیل کے بعد شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ اُن میں علم الثبوت استاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ۲۰ سال کی عمر تھی کہ شاعری کا شہرہ واجد علی شاہ تک پہنچا اور اس نے بلا کر کلام سنا۔ ۱۸۵۳ء میں نواب یوسف علی خاں والیِ رام پور نے بلایا اور نہایت تعظیم و تکریم کی۔ بعد میں نواب کلب علی خاں نے ان کو اپنا استاد بنایا۔ آپ وہاں عدالت و دیوانی کے حاکم بھی تھے۔ ۲۴ برس نہایت حرمت کے ساتھ رام پور میں گزارے پھر نظام کے ایلچی وزیر نے حیدرآباد بلایا۔ مگر وہاں کی فضا لے گئی تھی۔ پہنچے ہی تھے کہ بیمار ہو گئے اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو انتقال کیا۔ مرحوم نہایت عالم و زاہد، متقی، پرہیزگار اور نہایت نیک نفس بزرگ تھے۔ فن شعر میں کامل ہونے کے علاوہ عربی و فارسی کے جید عالم تھے۔ ہندی اور سنسکرت بھی بہت اچھی جانتے تھے۔ طب سے بھی واقف تھے اور علم جفر کے بھی ماہر تھے۔ نظم اور نثر میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ بعض نام یہ ہیں۔ ارشاد السلطان، ہدایت السلطان، مراۃ الغیب (دیوان)، مسمن خانۂ عشق (دیوان)، محامد خاتم النبیین، مینائے معنی (نظم میں ہیں)۔

نثر کے بعض رسائل یہ ہیں۔ خیابان آفرینش، نماز کے اسرار، زوال امیر، شعراء کا ایک تذکرہ انتخاب یادگار کے نام سے لکھا جس میں ۴۰ سے زیادہ شاعروں کا حال ہے۔ امیر اللغات لکھنی شروع کی جو اُردو کی بے نظیر لغت ہوتی مگر صرف ۲ جلدیں چھپ سکیں جن میں الف کی تقطیع آئی۔ حضرت امیر مینائی کے بعض شاگردوں کے نام یہ ہیں۔ حافظ جلیل حسن جلیل، حفیظ جونپوری، وفا رام پوری، رباض حیدرآبادی، حضرت حافظ سید مختار احمد مختار شاہجہانپوری (جو الحمد للہ حیات ہیں اور جو دھامل بلڈنگ لاہور میں سکونت پذیر ہیں)، حکیم ضمیر، سائل دہلوی (جو شاہجہان پور میں تشریف رکھتے ہیں) آپ کے ایک ممتاز شاگرد مولوی احسن اللہ خاں ثاقب اکبرآبادی پروفیسر وکٹوریہ کالج گوالیار نے آپ کے خطوط کا مجموعہ مکتوبات امیر مینائی کے نام سے شائع کیا تھا مگر اب نہیں ملتا۔

امیر: نواب محمد یار خان نام، امیر تخلص، نواب فیض اللہ خاں نواب رام پور کے بھائی تھے اوشاندہ میں رہائش رکھتے تھے۔ ہر وقت پیرہ شکار اور شعر و سخن میں مصروف رہتے تھے۔ شیخ امام الدین علی قائم کے شاگرد تھے۔ حق استادی کے ۱۰۰ روپیہ ماہوار دیتے تھے۔ اکثر شعراء ان کے ملازم تھے اور دن رات شعر و شاعری کی مجلس لگی رہتی تھی مگر ۱۸۵۷ء کی غدر میں تمام مجلس عیش و نرم برہم ہو گئی اور یہ بھائی کے پاس رام پور چلے گئے جہاں انھوں نے ۵ ہزار روپیہ سالانہ ان کا وظیفہ مقرر کر دیا اور انھوں نے اسی کی عافیت میں اپنی عمر بسر کر دی ۱۸۷۴ء میں انتقال ہوا۔

امین: ان کا نام شاہ امین الدین تھا اور تخلص امین کرتے تھے عظیم آباد کے رہنے والے تھے ۱۸۱۵ء میں انتقال کیا اور غزلیات کا ایک دیوان یادگار چھوڑا۔

انجام: نواب امیر خاں نام، عمدۃ الملک خطاب، انجام تخلص شاہ نعمت اللہ ملی کی نسل میں سے محمد شاہ رنگیلے کے متعدد درباری تھا۔ کچھ عرصہ آصف الدولہ کا عطیہ دار بھی رہا۔ نہایت حاضر جواب اور بذلہ سنج تھا اس لیے بادشاہ کو بہت عزیز تھا اور وہ اس کو اپنے سے جدا کرنا نہ چاہتا تھا مگر یہ شاہی عنایات کے بھروسے پر نہایت گستاخ ہو گیا آخر بادشاہ نے ناراض ہو کر ایک امیر کو اشارہ کیا اور اس نے ۱۷ دسمبر ۱۷۴۷ء کو اسے قتل کر دیا۔ دہلی سرائے روح اللہ خاں میں دفن ہوا۔ فارسی اور اردو میں سمع کہتا تھا (مختلف تذکروں میں اس کے قتل کا سنہ مختلف لکھا ہے جس نے قتلتہ معتبر تاریخ کو لیا ہے)

انشا: میر انشاء اللہ خاں نام، حکیم ماشاء اللہ خاں مصدر کے بیٹے اور اردو کے نہایت نامور شاعر تھے۔ نہایت ذی علم شخص تھے مگر طبیعت کو ہر دل عزیز سخن فہمی میں ڈال کر اپنے علم سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اسی سخن پن کی بدولت آخر عمر نہایت مصیبت سے کٹی اور بڑی حسرت کے ساتھ جان دی۔ مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ جوان ہو کر دہلی آئے۔ یہاں سے لکھنؤ پہنچے اور وہیں ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) میں فوت ہو گئے کلیات کے علاوہ دریائے لطافت ان کی نہایت مشہور کتاب ہے جو صرف و نحو، معانی و بیان، عروض و قافیہ پر اردو میں سب سے پہلی تصنیف کہی جاتی ہے۔

انیس: میر ببر علی انیس مرثیہ گوئی کے فن میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ جب تک واقعہ کربلا کی یاد لوگوں کے دلوں میں باقی ہے انیس کا نام بھی باقی رہے گا۔ ابتدائے شاعری میں کچھ غزلیں کہیں پھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بڑے ہو کر لکھنؤ چلے گئے اور وہیں ساری عمر گزار دی۔ نہایت اوضع اور بڑے خود دار شخص تھے۔ انتہا یہ ہے کہ اپنے گھر والوں سے بھی صرف معمولہ اوقات پر ملتے تھے۔ استغنا، خود داری اور قناعت کے گویا مجسمہ تھے۔ جب تک کوئی آدمی لینے نہ آیا اور اصرار سے نہ بلایا گیا اس وقت تک بادشاہ کے ہاں بھی نہ گئے۔ اردو شعرا میں چوٹی کے شخص سمجھے جاتے ہیں۔ ساری عمر میں ڈھائی لاکھ کے قریب اشعار کہے۔ ان کی زبان نہایت مستند اور شستہ مانی جاتی ہے۔ اردو کو انھوں نے بہت سے نئے محاورے دیے اور بیان کے نئے نئے طریقے سجھائے۔ ان کی لغات

ب بھی نہایت وسیع تھیں۔ منظوم نگاری کا بہت اعلیٰ درجہ کا سلیقہ رکھتے تھے۔ الفاظ اور محاورات کا استعمال ان کے ہاں بڑی خوبصورتی
تھا۔ ۷۰ سال کی عمر میں ۲۹ دسمبر ۱۸۵۰ء کو انتقال کیا۔

بحر:- شیخ امداد علی نام تھا اور بحر تخلص کرتے تھے۔ ناسخ کے نامور شاگردوں میں سے تھے اور لکھنؤ کے شعراء میں خصوصیت
سے شعر و شاعری کے مشغلے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ اس لیے ساری عمر عسرت و غربی میں گزری۔ ارادے بڑے بڑے تھے مگر سب
پر پانی پھیر دیتے۔ زبان کے سادہ لکھے اور صحت الفاظ کا خاص خیال رکھتے تھے ۱۸۱۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۶۸ء میں وفات پائی۔

برق:- مرزا محمد رضا نام، برق تخلص، وطن لکھنؤ۔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ ۲۸ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو انتقال کیا۔ اس سے زیادہ
کے حالات نہ مل سکے۔

بقا:- نام شیخ بقاء اللہ ابن حافظ لطف اللہ خوشنویس۔ وطن آگرہ۔ پیدائش رہلی کی۔ عنفوان شباب میں دہلی کو چھوڑا
لکھنؤ میں جا رہے۔ فارسی میں مکین اور اردو میں بقا تخلص کرتے تھے۔ فارسی شاعری میں مرزا فاخر مکین کے اور اردو نظم میں شاہ حاتم کے شاگرد
تھے۔ اردو سے بھی اصلاح لی ہے۔ زندگی بھر بلفظ اور فقرہ فقرہ میں کرتی رہی۔ طبیعت فن شعر کے لیے نہایت موزوں پائی تھی۔
کلام صاف اور سادہ ہے، مزاج شگفتہ اور طبع رنگین رکھتے تھے۔ تصوف اور اس کی اصطلاحوں کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ نواب شیفتہ
نے متعلق فرماتے ہیں "دوسرا رتبہ شگفتہ و رنگین و طرز ادا و شیریں دارد"۔ ۱۷۸۷ء میں وفات پائی۔

بیان:- نام خواجہ احسن اللہ خاں تھا اور بیان تخلص کرتے تھے۔ مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد۔ مولانا فخر الدین کے
بھتیجے تھے۔ قدرت اللہ قاسم مؤلف نسخہ قدرتیہ سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ حیدرآباد میں ملازم تھے اور وہیں ۱۳ ۱۲ھ میں
وفات پائی۔ مولوی عبدالحق اپنے مقدمہ کلیات میں لکھتے ہیں "خواجہ صاحب اصول شاعری سے باخبر خوش گو، پر بلیغ اور مشاق سخنور تھے
مگر مکین کی طرح تعصب کی ہے کہ شعر ریختہ کو دل سے ترک کر دیا تھا۔ دوسرا دیوان اس کا متعارف ہے جو ہندوستان سے کلام پاک
ہے۔ سادگی میں ان کا انداز ایسا ہے جس پر ہزاروں بناوٹیں قربان ہیں"۔

بیان و یزدانی:- نام سید محمد مرتضیٰ تھا (صاحب مرآۃ الشعراء نے محمد تقی غلط لکھا ہے) والد کا نام میر گوہر علی تھا ۱۸۰۰ء
(صاحب مرآۃ الشعراء ۱۸۴۶ء اور بقول صاحب خاموں المشاہیر ۱۸۴۲ء) بمقام میرٹھ پیدا ہوئے۔ سید امام بخش یزدانی کے
شاگرد تھے۔ اردو میں بیان اور فارسی میں یزدانی تخلص کرتے تھے۔ بہت اچھے شاعر تھے مگر کلام کا کوئی مجموعہ نہ ملا۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ
سفر میں گزرا۔ مختلف اخباروں اور رسالوں میں اپنی غزلیں اور نظمیں چھپواتے رہتے تھے۔ ایک رسالہ جواہر گذستہ سال الملک کے نام سے خود بھی
جاری کیا تھا۔ ملوٹی ہند کے بھی ایڈیٹر رہے۔ اردو کے سادہ عزاء رہا ہی کی حامی نیات رکھتے تھے صاحب مرآۃ الشعراء ان کے حال میں

لکھتے ہیں کہ "ہمیشہ اندھیری کوٹھڑی میں پڑے رہتے تھے۔ صفائی کا مطلق خیال نہ تھا۔ ہر وقت ایک لحاف اوڑھے رہتے تھے خواہ کیسا موسم ہو کھڑکی پر کچھ بوجھ رکھا رہتا تھا۔ باہر کبھی آتے جاتے نہ تھے۔ پلنگ پر ہی کبھی کبھی نہا لیتے تھے محض شاعر تھے اور کسی کام کے نہ تھے۔

تصنیفات: ہیں (۱) مسدسِ حالی کا جواب (۲) پانچ بند در جواب شکوۂ بند (حالی) (۳) سیلی استاد اور مثنوی حقوق اولاد (حالی) (۴) مجموعہ نعت (۵) مارچ ۱۹۰۹ء کو انتقال ہوا۔ کلام کا کچھ انتخاب صاحب مراۃ الشعراء نے شائع کیا ہے۔ کچھ کلام فروری ۱۹۵۲ء کے رسالہ المحرم لاہور میں بھی چھپا تھا۔

بیخود بدایونی:- ان کا نام مولوی عبدالحی تھا اور مولوی غلام سرور صدیقی سے فرزند تھے۔ بیخود تخلص تھا اور بدایوں! بدایونی کے رہنے والے تھے ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ خوش وضع، رنگین طبع اور نہایت ہنس مکھ انسان تھے۔ فن شعر میں مولانا حالی کی شاگردی اختیار کی مگر طبیعت کو چونکہ غزل سے بڑی مناسبت تھی لہٰذا بعد میں داغ کو استاد بنایا اور طبع کی خوب خوب جولانیاں دکھائیں۔ نومبر ۱۹۱۲ء میں وفات پائی۔ ایک دیوان مراۃ الخیال یادگار چھوڑا۔

بیخود دہلوی:- حاجی سید وحید الدین احمد بیخود دہلوی عہد حاضرہ کے نہایت نامور ادیب اور اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے اور نہایت شریف اور نجیب خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو سارے کا سارا علم و فضل اور شعر و ادب کی دولت سے مالا مال تھا۔ والد کا نام سید شمس الدین سالک اور دادا کا سید بدرالدین سالک تھا جو غالب کے شاگرد تھے پردادا بادشاہ عالم گیر ثانی کے وزیر رہتے جن کا نام امتیاز الدولہ افتخار الملک منصور جنگ نواب سید احمد امیر خاں تھا۔ منشی محمد کرم اللہ خاں شیدا ماموں اور مفتی صدرالدین خاں آزردہ ان کی والدہ کے چچا تھے۔

۳ رمضان ۱۲۷۹ھ (۲۲ فروری ۱۸۶۳ء) کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد حضرت شمس العلماء مولانا حالی کی شاگردی اختیار کی۔ رنگِ طبیعت دیکھ کر انھوں نے داغ سے مشورۂ سخن کی صلاح دی۔ چنانچہ حیدرآباد پہنچے اور چھ ماہ تک داغ سے اصلاح لیتے رہے پھر دہلی چلے آئے اور ساری عمر شعر و شاعری کے شغل میں اور انگریزوں کو اردو پڑھانے میں گزار دی۔ بیخود مرحوم اس صدی کے ان بزرگوں میں سے تھے جن کے ہوتے ہوئے شعر و ادب اور زبان و بیان کی وہ روایتیں زندہ تھیں جو خاص دہلی کی ادبی مجالس سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے اشعار میں محاورہ کی بے ساختگی الفاظ کی بندش، خیالات کی صفائی، بیان کی سادگی اور زبان کی شیرینی بدرجۂ اتم موجود ہے ۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو دہلی میں وفات پائی۔ اردو شاعری میں دہلوی رنگ کی یہ آخری شمع بھی بجھ گئی۔

ان کے کلام کا پہلا مجموعہ "گفتارِ بے خود" ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء) میں چھپا اور دوسرا مجموعہ "شہوارِ بے خود" ۱۳۳۸ھ (۱۹۱۹ء) میں چھپا۔ "گفتارِ بے خود" ۷ ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔

بیدار:- میر محمدی عرف سید محمد علی نام اور بیدار تخلص تھا۔ میر درد اور ظہور الدین حاتم کے شاگرد ہیں۔ نہایت دین دار اور باخدا بزرگ تھے۔ مجموعۂ نغز میں ان کے متعلق ہے "خوش گو، شیریں گفتار، پاکیزہ خو، فرشتہ کردار۔ شعرش بسیار با کیفیت و شستگی در نہایت حلاوت و دل سنگی است"۔ دیوانِ بیدار ۱۹۳۵ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے شائع کیا۔ ۱۱۴۵ھ (۱۷۳۲ء) میں

ہوئے۔ انتقال کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی۔

تاباں:۔ نام سید عبدالحی اور تخلص تاباں تھا۔ شاہ حاتم یا میر شدت کے شاگرد اور حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے مرید تھے۔ بطور پیر بھی اور خود بھی صاحب دعوت واقع ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ دلی کے لوگ ان کو یوسف ثانی کہتے تھے۔ پھانک جیش خاں میں ان کا مکان تھا۔ ان کے حسن کی شہرت میں اتنی شہرت ہوئی تھی کہ ایک مرتبہ بادشاہ ان کو دیکھنے ان کے مکان پر آئے تھے۔ عین جوانی میں انتقال ہوا تو سارا دلی نے سوگ منایا۔ ان کے انتقال کی صحیح تاریخ معلوم نہ ہو سکی۔ فغیر صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۷۹۸ء میں زندہ تھے۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا اپنے تذکرہ نشتر عشق میں لکھتے ہیں کہ ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) اور ۱۱۶۲ھ (۱۷۵۲ء) اور ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) کے درمیان انتقال ہوا۔

ان کے کلام کی نسبت رام بابو سکسینہ کی رائے ہے کہ "کلام عاشقانہ، شیریں و نمکین ہے۔ خیالات نہایت نازک اور زبان درست سلیس ہے"۔ ان کا دیوان انجمن ترقی اردو نے شائع کر دیا ہے۔

تاجور نجیب آبادی:۔ (مولانا) تاجور تخلص۔ اصل نام احسان اللہ خاں۔ وطن نجیب آباد (یوپی) مقام پیدائش تنی تال۔ سال ولادت ۱۸۹۲ء۔ والد کا نام محبت اللہ خاں تھا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد دیوبند میں پڑھا اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۹۱۰ء میں لاہور آ کر اورینٹل کالج سے مولوی فاضل اور منشی فاضل کی ڈگریاں حاصل کیں۔ دیال سنگھ ہائی سکول میں اور ٹیچرز ٹریننگ کالج میں پروفیسر ہو گئے اور بقیہ زندگی وہیں گزارنے کے بعد ۳ جنوری ۱۹۵۱ء کو انتقال کیا۔

تاجور بحیثیت شاعر یا ادیب کے حافی زیادہ تھے۔ سب سے پہلے ۱۹۱۱ء میں ادبیہ سے ماہنامہ آفتاب اردو نکالا اور ۱۹۱۲ء میں تاج الکلام۔

ملاہوا کر ۱۹۱۶ء میں "مخزن" کے مدیر ہوئے اور پانچ سال تک اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ پھر میاں سراج الدین کے جاں نشین بن گئے۔ اپنے بلا لیا اور اس مشہور و معروف ماہنامہ کا پہلا پرچہ جنوری ۱۹۲۰ء میں مولانا کی زیر ادارت شائع ہوا۔ کچھ عرصہ تک یہاں کام کرنے کے بعد مولانا نے اپنا پرچہ "ہمایوں" کے نام سے جاری کیا جو بچوں کے لیے وقف تھا اور بہت ہی دلچسپی اور قابلیت سے ایڈٹ کیا جاتا تھا۔ یہ تقریباً ملک سے کچھ پہلے تک جاری رہا۔ زاں بعد ۱۹۲۹ء میں رسالہ "ادبی دنیا" جاری کیا۔ یہ پرچہ آج کل مولانا صلاح الدین کی زیر ادارت شائع ہو رہا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں علامہ تاجور نے لاہور سے "شاہکار" نکالا اور اس شان سے نکالا کہ سارے ماہنامے اس کے آگے ماند پڑ گئے۔

مولانا کی ادبی اور علمی خدمات بھی کچھ کم قابل قدر نہیں۔ انھوں نے لاہور کی مشہور ہندو فرم میسرز لعل چند کپور اینڈ سنز کو "ادارہ مرکز" کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کرنے کا مشورہ دیا اور خود اس ادارہ کے نگران بنے۔ اس ادارہ نے اردو نظم و نثر کا بہترین انتخاب ۳۴ جلدوں میں شائع کیا۔ اس سے پہلے بھی وہ دو مبسوط جلدوں میں اردو نظم و نثر کا انتخاب اور اس پر ریویو شائع کر چکے تھے۔ اگرچہ وہ بہت اچھے شاعر تھے اور انھوں نے کافی بھی بہت کچھ اور ان کے شاگرد بھی بہت سے تھے مگر ان کے اپنے کلام کا مجموعہ اب تک شائع

جاکر ملازم ہو گئے، پھر لکھنؤ پہنچے اور مرزا سلیمان شکوہ کے پاس نوکر ہو گئے۔ انشا سے اکثر صحبتیں رہتی تھیں۔ جوانی ہی میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ غزل ان کا خاص مضمون ہے۔ قصیدہ و مثنوی کو ہاتھ نہیں لگایا۔ دیوان مرتب ہے۔ آزاد ان کے متعلق کہتے ہیں: طبیعت غزل گوئی کے لیے عین مناسب واقع ہوئی تھی۔ حریف، ظریف، خوش طبع، عاشق مزاج تھے، طبیعت عشرت پسند تھی اور ساری عمر عیش میں گزری۔ کلام میں بلند پروازی، لفظوں میں شان و شکوہ اور معنوں میں دقت نہیں مگر کہتے ایسا ہے کہ اب تک دل پھڑک اٹھتے ہیں۔ مشاعرے میں غزل پڑھتے تھے تو جلسے کے جلسے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ ناسخ نے تاریخ لکھی ؎

ہائے ہندوستان کا شاہ ہوا

۲۵ ۲ ۱ھ

جلال لکھنوی:- حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی بہت مشہور غزل گو شاعر ہیں۔ ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۴ء) میں پیدا ہوئے۔ نسبی شجرہ میں امیر علی خاں جلیل اور ان کے استاد رشک اور نواب فتح الدولہ برق کے شاگرد ہیں۔ ابتداءً ۱۸ برس تک نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں والیان رام پور کے ہاں ملازم رہے۔ وہاں ان کے معاصر داغ، تسلیم اور امیر مینائی تھے۔

اس صحبت کے بکھرنے کے بعد آپ نواب حسین مہدی والی مکنول کے ہاں چلے گئے اور آخر عمر میں وطن آ گئے جہاں ۷۶ برس کی عمر میں ۵ شوال ۱۳۲۵ھ (مطابق ۲ اکتوبر ۱۹۰۷ء) کو وفات پائی۔ تصانیف میں غزلوں کے چار دیوان، سوانح زبان اردو، افادہ، تاریخ شعب القواعد، تشحیذ اللغات، کلشن فیض، رسالہ دستور الفصحاء و مفید الشعراء ان کی یادگار ہیں۔ شاگردوں میں سے بعض کے نام یہ ہیں میر ذاکر حسین یاس، آرزو لکھنوی، احسان شاہجہان پوری اور سردار دوعم سنگھ۔

جلیل مانک پوری:- نواب فصاحت جنگ حافظ جلیل حضرت امیر مینائی کے ممتاز شاگرد اور ان کے جانشین تھے۔ امیر اللغات کی تدوین انہی کے سپرد تھی۔ اس کے بعد حیدر آباد دکن چلے گئے۔ داغ کے انتقال کے بعد آپ ہی نظام دکن محبوب علی خاں کے استاد مقرر ہوئے اور نواب فصاحت جنگ خطاب پایا۔ حیدر آباد میں محبوب الکلام اور دبدبہ آصفی کے ایڈیٹر رہے۔ مدرسۂ دانش پر ان کی ایک تصنیف لاجواب ہے۔ اپنے استاد کی سوانح حیات بھی قلمبند کی تھی اور دکن کی ایک شعری تاریخ بھی مرتب کی تھی۔ ان کے علاوہ آپ کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:-

تاج سخن - جان سخن - معراج سخن - سرتاج سخن - معیار اردو - عطر سخن - اردو کا حوض - گل صد برگ - روح سخن، بحر سخن اور بہار سخن آخر الذکر تینوں غیر مطبوعہ ہیں۔

جنوری ۱۹۴۶ء (۱۳۶۵ھ) میں بمقام حیدر آباد انتقال کیا۔ ولادت ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) میں مانک پور (اودھ) میں ہوئی۔ مؤلف تذکرہ جدید شعرائے اردو نے سال پیدائش ۱۸۶۹ء لکھا ہے۔

ان کی شاعری کی خصوصیات کے متعلق اس تذکرہ میں حسب ذیل رائے ظاہر کی گئی ہے:-

(۱) سادگی بیان کے ساتھ ساتھ تازک خیالی۔

(۲) غزلوں میں الفاظ کی جانکاری نشست سے ترنم کا لطف۔

(۳) بیانِ حسن و عشق میں روزمرہ و ملاست کی روانی۔

ان کے بہت سے اشعار روایتِ لفظی اور محاورہ بندی کے طلسم سے باہر نہیں نکلے۔ تاہم بندش کی چستی اور بیان کی ملاست اس رنگ کو بھی دلچسپ بنا دیتی ہے۔ ان کا اصل رنگ حسن و عشق کا اظہار اور جذبات نگاری ہے۔" ان کے دیوان اہلِ صنعت کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔ ہمارے دوست جناب کسریٰ منہاس نے ان کی ہجری و عیسوی دونوں تاریخیں کہی ہیں جو قارئین کرام کی دلچسپی کے لیے یہاں لکھی جاتی ہیں:۔

ملہم غیبی نے کسریٰ! یہ کہا سالِ وفات
ہے امام الفن سہیل اللہ کی رحلت ہوئی (۱۳۶۵ھ)

اور عیسوی تاریخ ؎ نکلا ہے فوراً رنگ میں اپنے یہ سالِ فوت
مرگِ سخن ہے اصل میں رحلتِ جبیل کی (۱۹۴۶ء)

جوان:۔ ان کا نام مرزا نعیم بیگ اور تخلص جوان تھا۔ فنِ شعر میں مصحفی کے شاگرد ہیں۔ مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں یہ مؤثر شعرا ملازم تھے۔

جوشش:۔ شیخ محمد حسن یار دکنی عرف نام جوشش تخلص اور وطن ہلیم آباد (ہلیم پیٹ) ہے۔ بقول صاحب تذکرہ شعرائے دکن ان کی بلندی فکر قدرتِ تخیل اور مہارتِ عروض کی بہت تعریف کی ہے۔

دیوان کے علاوہ انھوں نے شعرا کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا جو اب نہیں ملتا۔ تیرھویں صدی ہجری میں وفات پائی۔ سنہ معلوم نہیں ہو سکا۔

جوہر:۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر ایڈیٹر کامریڈ و ہمدرد سے کون واقف نہیں۔ ہندوستان کی کامل آزادی کے بہت زبردست علم بردار اور مسلمانوں کے محبوب لیڈر تھے۔ شروع شروع میں محض اس خیال سے کہ کانگریس آزادی کی حامی ہے اس کے ساتھ رہے۔ یہ محمد علی ہی تھے جنھوں نے گاندھی جی کو مشورہ دیا کہ اپنے پہلے ملک میں ان کا کوئی اثر نہ تھا نہ رسوخ ——— آزادی کی جو تڑپ ان کے دل میں تھی وہ ان کے اس فقرے سے ظاہر ہے جو انھوں نے لندن میں کہا تھا کہ "میں غلام ملک میں واپس جانا نہیں چاہتا۔ یا تو تمھیں ہم سے کو آزادی دینی پڑے گی یا مجھے دو گز زمین قبر کے لیے۔" وہ انھوں نے اپنا یہ عزم پورا بھی کر دکھایا۔ لندن ہی میں ان کا انتقال ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو ہوا اور نعشِ بیت المقدس لا کر دفن کی گئی۔ آزادی کے عشق میں متعدد مرتبہ قید و بند کی تکلیفیں اٹھائیں مگر استقامت میں فرق نہ آیا۔ علوم الکلام شاعر، انگریزی، اردو کے اعلیٰ پایہ کے ادیب، زبردست نعماتی، شعلہ بیان خطیب، ماہر سیاست دان اور نہایت بلند کیرکٹر کے انسان تھے۔ ۱۸۷۸ء میں رامپور میں پیدا ہوئے۔ دو برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ نے جو عوام میں بی اماں کے نام سے مشہور تھیں ان کی نہایت اعلیٰ تربیت کی۔ بی۔ اے علی گڑھ کالج سے کیا۔ پھر آئی۔ سی۔ ایس کی تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے۔ واپس آکر رامپور اور بڑودہ میں کچھ عرصہ ملازمت کی مگر جلد ہی نوکری کی پابندیوں سے گھبرا کر مستعفی ہو گئے اور کلکتہ سے ۱۴ جنوری ۱۹۱۱ء کو کامریڈ جاری کیا۔ اس میں ایسے

زبردست معاملے سمجھے اور انشا پردازی کے ایسے شاندار نمونے دیکھائے کہ مشہور انگریز ادیب ایچ۔ جی ویلز نے کہا: "محمد علی نے بک کی زبان، مکالمے کا قلم اور پرسنلٹی کا دل پایا ہے۔"

مولانا کے اشعار جذب، اثر، جوش سے بھرے ہوتے تھے۔ "کلام موہر" ان کی منظومات کا مجموعہ ہے مگر شاعری ان کا اصلی میدان نہیں۔ ان کی عظمت کے جھنڈے سیاست کے میدان زار میں گڑے ہوئے ہیں۔ کاش محمد علی جیسے باہمت مخلص ہمدرد مستقل مزاج اور صداقت پیشہ لیڈر مسلمانوں کو جتنی جلدی میسر آجائے۔

چکبست :- پنڈت برج نرائن نام، چکبست تخلص، وطن فیض آباد (یو۔پی) ۱۸۸۱ء یا ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۲ء میں بی۔ اے کرنے کے بعد ۱۹۰۵ء میں وکالت کا امتحان دیا اور لکھنؤ میں وکیل ہوگئے۔ ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو خلیج کے حملے سے وفات پائی شاعری کا شوق بچپن سے تھا مگر کسی کے شاگرد نہیں ہوئے۔ ان کی شاعری میں حب الوطنی اور قوم پرستی نہایت نمایاں ہیں۔ ان کی منظومات کا مجموعہ صبح وطن کے نام سے چھپا اور نثری مقالات مضامین چکبست کے نام سے شائع ہوئے۔ مرکہ چکبست و شعرا ان کے آٹھ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو مثنوی گلزار نسیم کے متعلق مولانا عبدالحلیم شرر کے جواب میں لکھے۔ علاوہ گلدستہ تبرک کا دیباچہ اور مثنوی گلزار نسیم پر مقدمہ بھی انھوں نے لکھا اور خوب لکھا۔ دآغ کے کلام پر تنقید ان کے وجدان صحیح اور خوش ذوقی کا بہترین نمونہ ہے۔

حاتم :- ولی کے ہم عصر شاعروں میں سے ہیں۔ شیخ ظہور الدین نام تھا اور حاتم تخلص کرتے تھے۔ دہلی میں شیخ فتح الدین کے ہاں ۱۶۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ سپاہی پیشہ انسان تھے مگر نوجوانی سے شعر کا چسکہ لگ گیا۔ نواب عمدۃ الملک امیر خان کے ندیم خاص اور داروغہ مطبخ تھے۔ بعد ازاں میر یادگار علی شاہ کے مرید ہوگئے اور ملازمت ترک کرکے درویشی اختیار کرلی۔ تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ مصحفی ۱۷۸۱ء بتاتے ہیں۔ بعض تذکروں میں ۱۷۹۱ء رقم ہے۔ صاحب مراۃ الشعراء نے ۱۷۹۰ء لکھا ہے

"دیوان زادہ" ان کا اردو کا دیوان ہے جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں قلمی موجود ہے۔ اس میں دو ہزار اشعار ہیں۔ فارسی دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ ایک مثنوی قہوہ کی تعریف میں بھی لکھی ہے۔ ۶۰ سال کے طویل عرصہ تک شعر کہتے رہے۔ مرزا رفیع سودا اور عبدالحی تاباں ان کے ممتاز شاگردوں میں سے ہیں۔

حالی :- نام خواجہ الطاف حسین تخلص حالی۔ خواجہ ایزد بخش کے بیٹے اور پانی پت کے رہنے والے تھے۔ باپ کی طرف سے انصاری اور والدہ کی طرف سے سید ہیں۔ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ فن شعر میں غالب اور شیفتہ کے شاگرد ہیں۔ عربی و فارسی صرف و نحو فقہ و دیگر استادوں سے حاصل کی۔ ۱۸۶۳ء سے ۱۸۶۹ء تک نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے بچوں کے اتالیق رہے۔ شیفتہ کے انتقال کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازم ہوگئے۔ پھر دہلی کے اینگلو عربک مکتب میں مدرسی کی۔ درمیان میں کچھ عرصہ اسکیسن کالج کے ہوسٹل میں طلباء کے اتالیق کے طور پر رہے مگر پھر گھبرا کر دہلی چلے گئے۔ جب ریاست حیدرآباد سے ۴۰۰ روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوگیا تو مرکب گیل کی نوکری چھوڑ دی اور باقی عمر تصنیف و تالیف میں بسر کی۔ یہاں تک کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو پانی پت میں طویل علالت کے بعد آپ کا انتقال ہوگیا۔

آپ نظم اردو کے مجتہد اور بہت سی کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔ مسدس مدوجزر اسلام کی تصنیف نے آپ کے نام کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی سوانح، تاریخی، اخلاقی، اصلاحی اور معاشرتی تصنیفیں آپ نے لکھیں جن میں سے اکثر کو نہایت قبولیت حاصل ہوئی۔ مناجات بیوہ۔ مثنوی حقوق اولاد۔ حب وطن۔ تحفۂ برادران۔ شکوۂ ہند اور چپ کی داد وغیرہ۔ دیوان ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا جو بیشتر شاعری کا بہترین نمونہ تھا۔ نثر میں حیات سعدی۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ یادگار غالب اور حیات جاوید نہایت مشہور ہیں۔ سرسید احمد خاں کے علمی مشن کو کامیاب کرنے میں حالی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ۱۹۰۴ء میں آپ کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ حالی اخلاق اور انسانیت کے لحاظ سے سرسید احمد خاں صاحب کے تمام گروہ میں خاص درجہ رکھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس بے نظیر انسان کی مفصل سوانح عمری اب تک کوئی شائع نہیں ہوئی۔ چھوٹی چھوٹی سوانح عرباں کی ہیں جو اکثر تاریخی اور واقعاتی غلطیوں سے پُر ہیں۔

حزیں: ۔ نام میر محمد ماؤ تھا اور مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے اور انہی کے پاس رہتے تھے۔ پھر عظیم آباد چلے گئے جہاں نواب صولت جنگ نے ان کی خوب قدر دانی کی۔ صاحب دیوان تھے۔ تیمتان شعراء میں ان کے متعلق لکھا ہے "نقش دلنشین و گفتگوش شیریں است..... اشعار سوز انگیز و مضامین دلچسپ بسیاری دارد"۔

حسامی: ۔ حسام الدین حیدر ان کا نام تھا اور حسامی تخلص کرتے تھے۔ ۱۷۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ خدا بخش تویر کے شاگرد تھے۔

حسرت موہانی: ۔ رئیس المتغزلین سید فضل الحسن حسرت موہانی موجودہ دور کے غزل گو شعراء میں نہایت بلند مقام رکھتے ہیں اور غزل کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ ۱۸۷۵ء میں موہان ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں علی گڈھ سے بی۔ اے کیا اور علی گڈھ ہی سے اردوئے معلی نکالا جو کم و بیش ۲۰ سال تک نکلتا رہا۔ والد کا نام سید اظہر حسن تھا۔ ان کے بزرگ نیشاپور سے ہندوستان میں آئے اور قصبہ موہان ضلع اناؤ (یو۔پی) میں سکونت اختیار کی۔ تسلیم لکھنوی اور نسیم دہلوی کے شاگرد ہیں۔ دوسرے اساتذہ سے بھی فیض حاصل کیا ہے۔ خود کہتے ہیں ؎

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن
طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

اعلیٰ درجہ کے شاعر ہونے کے علاوہ متقدر سیاست دان بھی تھے۔ اس وجہ سے عرصہ دراز تک قید کی صعوبتیں برداشت کیں۔ انگریزوں کے سخت دشمن اور کانگریس کے رکن تھے اور ساری عمر کانگریس کی حمایت میں بسر کر دی۔ ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ بہت سے شعراء کے نایاب دیوان بہت تلاش کے بعد شائع کیے۔ دیوان غالب کی ایک بے نظیر شرح لکھی۔ نکات سخن اصول تنقید پر ان کی لاجواب تصنیف ہے۔ نہایت با اخلاق، منکسر المزاج، سادہ طبع، پابند وضع اور صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ حج بیت اللہ کا شرف کئی بار حاصل کر چکے تھے۔

حسرت :- چراغ حسن نام حسرت تخلص ۱۹۰۰ء میں ریاست پٹیالہ کے ایک گاؤں بیہالہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ بدرالدین تھا۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد کچھ دنوں مدرسی کی پھر کلکتہ چلے گئے وہاں عصر جدید۔ جمہوری دنیا۔ استقلال کے ایڈیٹر رہے۔ کچھ دنوں مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار "پیغام" میں کام کیا، پھر ظفر علی خاں نے "زمیندار" میں بلایا۔ اس کے بعد ہمدرد۔ مدینہ۔ شہباز۔ احسان۔ اخبار دل کی ایڈیٹری کی۔ پھر لاہور آکر امروز کے مدیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ چار برس یہاں گزارے، پھر ایک جھگڑا ہونے کے باعث ملازمت چھوڑ کر کراچی چلے گئے جہاں کچھ دنوں ماہ نو کی ایڈیٹری کی۔ ریڈیو پر ملازم ہو گئے پھر سورٹ کمپنی نیویارک کے لیے کام کیا۔ ازاں بعد لاہور چلے آئے اور وفات وقت میں انگلستان و حوادث لکھنے شروع کیے یہاں تک کہ ۲۶ جون ۱۹۵۵ء کو انتقال ہو گیا۔ سند باد جہازی آپ کا قلمی نام تھا۔ اعلیٰ درجہ کے ادیب نہایت اعلیٰ پایہ کے شاعر، بہترین مصنف زبان و بیان اور محاورے کے استاد، نکات اور مغلقات کے گل سرسبد، ہر ادبی محفل کی جان اور ہر علمی مجلس کی روح رواں تھے۔ صاف ستھرا اور صحیح اردو لکھنے میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے "پرت کی بیٹی" ان کی انشا پردازی کا شاہکار ہے۔ دیگر تصانیف یہ ہیں۔ مردم دیدہ۔ دو ڈاکٹر۔ کیلے کا جھٹکا۔ زریخ کے خطوط۔ سرگذشت اسلام۔ مطائبات۔ پنجاب کا جغرافیہ۔ بغاوت عرب۔ خلافت اعظم۔ کشمیر۔

حسرت :- جعفر علی نام حسرت تخلص۔ دہلی کے باشندے تھے۔ رہائش لکھنؤ کی تھی جہاں عطاری کی دکان کرتے تھے فن شعر میں سائے سرب سنگھ دیوانہ کے شاگرد ہیں۔ ان کے کلام کا انتخاب حسرت موہانی نے شائع کیا تھا۔ ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۲ء) میں بمقام لکھنؤ وفات پائی۔ دہلی کا دبستانِ شاعری" میں ۱۲۱۰ھ (۱۷۹۵ء) لکھا ہوا ہے۔

میر حسن :- میر غلام حسین ابن میر غلام حسین ضاحک نام۔ حسن تخلص۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ آباؤ اجداد کا وطن ہرات تھا۔ خوش مزاج اور شیریں بیان تھے۔ شعر کا شوق بچپن ہی سے ہو گیا تھا۔ اس فن میں میر درد، میر ضیاء الدین ضیا اور مرزا سودا کے شاگرد ہیں۔ بڑے ہوئے تو دہلی چھوڑ کر فیض آباد چلے گئے۔ وہاں سے لکھنؤ آکر مقیم ہو گئے۔ ان کی شہرت ہندوستان میں لکھنؤ ہی سے پھیلی۔ کلام سادہ لیکن بامزا ہوتا ہے۔ مثنوی لکھنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کا دیوان قریباً آٹھ ہزار اشعار کا مجموعہ ہے۔ حسرت موہانی نے اس کا انتخاب گیارہ سو اشعار میں چھاپا ہے۔ کہتے ہیں کہ ۱۱ مثنویاں لکھیں مگر سحر البیان معروف بہ مثنوی بدر منیر سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ۱۱۴۳ھ (۱۷۳۰ء) میں پرانی دہلی کے محلہ سید واڑہ میں پیدا ہوئے اور ۶۰ سال کی عمر پا کر ۱۲۰۳ھ (۱۷۸۸ء) میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔ میر مستحسن خلیق، میر اسن علی اور میر محسن ان کے تین لڑکے تھے۔ مرثیہ گو شعراء کے امام میر انیس ان کے پوتے تھے۔

ان کی مثنوی سحر البیان کے متعلق آزاد لکھتے ہیں :-

"زمانہ نے اس کی سحر البیانی پر تمام شعراء اور تذکرہ نویسوں سے محضر شہادت لکھوایا۔ اس کی صفائی بیان، لطف محاورہ، شوخی مضمون، طرز ادا اور سوال و جواب کی نوک جھوک حد توصیف سے باہر ہے۔ آج کس کا منہ ہے جو ان تمہیدوں کے ساتھ پانچ شعر بھی

سوزوں کر سکے۔ قبولِ عام نے اسے ہاتھوں ہاتھ لے کر آنکھوں پر رکھا اور آنکھوں سے دل و زبان کے حوالے کیا۔"

ان مثنویوں کا ایک مجموعہ مدت ہوئی نولکشور پریس سے شائع ہوا تھا جس میں سحر البیان، گلزارِ ارم اور رموز العارفین وغیرہ شامل تھیں۔ اندر سبھا کا ایک مذکر بھی ان کی یادگار ہے جسے انجمن ترقی اردو نے چھاپ کر شائع کر دیا ہے۔ حسرت کے علاوہ نولکشور پریس سے بھی ان کی غزلوں کا انتخاب شائع ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں ایک صاحب علی حسن نے بھی لکھنؤ سے حیاتِ میر حسن کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی۔ مجموعی ڈاکٹر وحید قریشی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور نے بڑا زبردست تحقیقی مقالہ میر حسن پر لکھا ہے۔

حسنؔ:۔ حسن رضا خاں ان کا نام تھا۔ بریلی (یو۔ پی) کے رہنے والے اور داغ کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۹ء سالِ پیدائش ہے اور ۱۹۰۸ء سنہ وفات۔

حسینؔ:۔ ان کا نام سید صادق علی تھا اور حسینؔ تخلص کرتے تھے۔ غالباً ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود اچھے شاعر تھے۔

(آغا) حشرؔ:۔ مشہور ڈرامہ نگار آغا حشرؔ کاشمیری کا نام آغا محمد شاہ تھا۔ وطن کشمیر اور پیدائش امرتسر کی ہے۔ ڈرامہ نویسی کی ابتدا بمبئی میں ہوئی۔ شروع میں بہت سے ڈرامے نیو الفریڈ کمپنی کے لیے تصنیف کیے۔ پھر کلکتے چلے گئے اور وہاں نیو ایکٹرن کمپنی شکوہ یورپ اور موجِ زمزم ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ بہت سے ڈراموں کے مصنف ہیں۔ ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو لاہور میں انتقال کیا۔ یکم اپریل ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ڈرامہ نویسی کے علاوہ غزل گوئی میں بھی کمال رکھتے تھے۔

حفیظؔ جونپوری:۔ ان کا نام محمد علی تھا اور حفیظؔ تخلص کرتے تھے۔ جون پور کے رہنے والے تھے۔ شیخ عبدالقادر کے مشہور رسالہ "مخزن" کے نامہ نگاروں میں سے تھے اور اس میں ان کی نظمیں اور غزلیں اکثر چھپا کرتی تھیں۔

حیاؔ:۔ مرزا رحیم الدین ان کا نام تھا اور حیاؔ تخلص کرتے تھے۔ پہلے شاہ نصیر کے اور پھر ذوق کے شاگرد رہے۔ ۱۸۰۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۸۸ء میں انتقال کیا۔

حیرانؔ:۔ میر حیدر علی ان کا نام تھا اور حیرانؔ تخلص کرتے تھے۔ فورٹ ولیم کالج کے مشہور مصنف میر شیر علی افسوس ان کے شاگرد تھے۔ اور یہ خود رائے سرب سکھ (یا سرب نگھ) دیوانہ کے استاد تھے۔ ضلع ہمار میں ایک شخص نے ان پر حملہ کر کے قتل کر دیا مگر مرنے سے پہلے انھوں نے بھی نہایت جواں مردی سے اپنے قاتل پر تلوار کا ایسا بھرپور وار کیا کہ وہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ اٹھارویں صدی میں گزرے ہیں۔ شاہجہان آباد کے رہنے والے تھے اور رائے ملکیت رائے رئیس لکھنؤ کے ہاں سپاہیانہ میں ملازم تھے۔ مجموعہ نغز کا مصنف ان کی

شاعری کے متعلق لکھتا ہے "خوش گو نوجوان شاعری خیلے درد مائل جاگر دیدہ"

خلیق:۔ میر مستحسن نام، خلیق تخلص، میر حسن مصنف مثنوی بدر منیر کے فرزند، میر انیس کے والد اور مصحفی کے شاگرد تھے ابتدا میں غزلیں کہتے تھے پھر مرثیہ کہنے لگے اور اسی میں نام پیدا کیا لکھنؤ اور فیض آباد میں تعلیم پائی سولہ برس کی عمر سے شوق سخن کا شوق ہوا گھر میں غربت تھی۔ غزلیں بیچ کر گزر اوقات کرتے تھے کلام نہایت فصیح و بلیغ اور صاف و شستہ ہوتا تھا۔ ۱۸۵۶ء کے قریب انتقال کیا۔

داغ:۔ مقرب السلطان، جبل ہندوستان، جہاں استاد، ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ استاد فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی غزل گو شعراء کے امام ہیں۔ ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے بعد میں پرورش پائی۔ فارسی غیاث اللغات کے مصنف غیاث الدین سے اور فن خوش نویسی شہور عالم خطاط میر خجستہ کش سے حاصل کی نظم میں استاد ذوق کے شاگرد اور حرارت کے مقلد میں تیراندازی، شہسواری اور نشانہ بازی وغیرہ فنون میں بھی طاق تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں دہلی سے نکلے اور رام پور پہنچے اور نواب یوسف علی لعل کلب علی والیان رام پور کے درباروں میں رہے۔ نواب کلب علی کے انتقال کے بعد حیدر آباد گئے کیا کمر وہاں کسی نے بات نہ پوچھی، چلے آئے کچھ عرصہ بعد نواب محبوب علی خاں والی حیدر آباد نے خود طلب کیا تو ساڑھے تین برس کے بعد باریابی نصیب ہوئی اور ساڑھے چار سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی جو موت تک ایک ہزار ہوگئی اور انھیں نواب حیدر آباد کے استاد ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ ۱۸۸۵ء کا واقعہ ہے۔ زندگی کے باقی ایام نہایت عیش و آرام اور امن و اطمینان سے کاٹنے کے بعد ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ (مطابق ۱۷ فروری ۱۹۰۵ء) کو ۷۴ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ لاولد تھے ایک عما جزادی چھوڑی جو نواب سراج الدین خاں سائل کی اہلیہ تھیں۔ سلاست، روانی، صفائی، شگفتگی اور شوخی ان کے کلام کا خاص زیور ہیں۔ غزلوں میں تجربات کا بھی بہت سا حصہ ہے مگر خود شراب بالکل نہیں پیتے تھے بلکہ اگر دسترخوان پر کوئی شرابی شریک طعام ہوتا تو کھانا نہ کھا سکتے۔

ان کی مشہور مثنوی فریاد داغ، یعنی جاہ و طوائف کی داستان عشق و محبت ہے۔ آخر میں بھی اختر جہاں طوائف دو سو روپیہ ماہوار ان کے ہاں سے تنخواہ پاتی تھی۔ چار دیوان غزلوں کے یادگار چھوڑے گلزار داغ، آفتاب داغ، ماہتاب داغ، یادگار داغ، مثنوی فریاد داغ۔ بیشمار شاگردوں میں سے بعض شعراء کے نام یہ ہیں۔ نظام دکن، محبوب علی خاں، نوح ناروی، نسیم بھرت پوری، رسا رام پوری، بیخود بدایونی، بیخود دہلوی، نواب سراج الدین خاں سائل دہلوی، آغا شاعر دہلوی، اصغر مارہروی، جگر مراد آبادی۔ سب سے بڑھ کر شاعر مشرق علامہ اقبال۔

(میر) **درد**:۔ ایک نہایت ہی صوفی منش اور محترم بزرگ تھے نام [illegible] میر تھا، درد تخلص کرتے تھے اس لیے میر درد کے نام سے مشہور ہیں۔ حضرت امام موسیٰ کاظم کی اولاد سے ہیں اور خود [illegible] کے بیٹے تھے۔ ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۰ء) میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ اپنے وقت کے تمام مروجہ علوم سے استفادہ کیا اور اپنے زمانہ کے بڑے بڑے صوفیائے کرام سے فیض حاصل کیا چونکہ

حصول معاش سے بے فکری تھی لہٰذا تمام وقت ذکر الٰہی میں گزرتا تھا۔ دہلی دہلی تھا اور سودا، میر تقی، مرزا مظہر جان جاناں جیسے قادر الکلام ہم عصر ۶۵ سال کی عمر میں ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ مطابق ۶ جنوری ۱۷۸۵ء کو دہلی میں انتقال کیا۔ ایک مرید نے تاریخ کہی ؎

حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب

میر درد طبقۂ فقہا و شعراء دونوں میں یکساں عزت و احترام کے ساتھ یاد کیے جاتے ہیں۔ ان کا اردو دیوان نہایت منتخب اشعار کا ایک دلفریب مجموعہ ہے۔ ساری عمر کبھی کی ہجو کبھی نہ تعریف لکھی۔ نام دیوان نہ زندگی کے آلام، دنیا کی بے ثباتی، تعلق باللہ اور فقر و استغنا جیسے مضامین سے لبریز ہوا ہے۔ فارسی کا دیوان بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی کتابیں فارسی میں لکھیں مثلاً رسالہ اسرار الصلوٰۃ، واردات درد، علم الکتاب (یہ چھوٹے بڑے ایک سو گیارہ رسالوں کا مجموعہ ہے) ارنام تصوف کے عنوان سے مشہور ہیں، واقعات درد، رسالہ در حرمت غنا۔ ان کی بزرگی اور تقدس اتنا بڑھا ہوا تھا کہ شاہ عالم بادشاہ نے خود ان کی خدمت میں حاضر ہونا چاہا مگر انھوں نے منظور نہ کیا۔ ایک روز جب مجلس تصوف میں بادشاہ بے اطلاع پہلے آ گئے تو کوئی توجہ نہ دی بلکہ خلاف مجلس ایک حرکت پر سر مجلس ٹوک دیا۔ بادشاہ نے معذرت کی۔ ان کی شاعری کے متعلق آزاد کی رائے سننے کے قابل ہے۔ لکھتے ہیں:

"چھوٹی چھوٹی بحروں میں تو اکثر غزلیں کہتے تھے گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے تھے۔ خیالات ان کے سنجیدہ اور متین تھے۔ کسی کی ہجو سے زبان آلودہ نہیں ہوئی۔ تصوف جیسا انھوں نے نباہا ہے اردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا۔"

ان کے شاگردوں میں قیام الدین قائم، ہدایت اللہ خاں ہدایت، ثناء اللہ خاں ثاقب، میر محمدی بیدار، مرزا اسمٰعیل بیتاب اور محمد پناہ نثار مشہور ہوئے۔

دل:۔ اعتبار الملک حکیمہ مولوی ضمیر حسن دل شاہجہان پوری۔ دور موجودہ کے غزل گو شاعروں میں نہایت بلند درجہ رکھتے ہیں اور حضرت میر بیتابی کے جانشین ہیں۔ ۱۸۷۵ء میں شاہجہان پور کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر دلائی گئی۔ سندرہ برس کی عمر سے شاعری کا چسکہ پڑا۔ آپ اپنے بیتابی کے ہمراز شاگردوں میں رہتے ہیں۔ عربی میں معقول کی کچھ کتب مولوی محمد علی خیال سے پڑھیں کتب فقہ کا درس مولوی نادر الدین پشاوری سے اپنا تشکوٰۃ اور جلالین کی تکمیل مولوی بشیر احمد مراد آبادی اور مولوی عبد الباسط شاہجہان پوری سے کی۔ طب باقاعدہ طور پر مولوی حکیم محمد اور ان کے بعد حکیم محمد نصیر اللہ خاں سے حاصل کی۔ حکیم صاحب بہ لحاظ اخلاق و عادات نہایت درجہ خصلت انسان ہیں۔ بڑے دیندار ہیں ان کے اخلاق کا امتیازی وصف ہے۔ نہایت ملنسار، ہمدرد، وضع، شفیق و مہربان اور راست باز شخص ہیں اور ہر شخص سے نہایت تواضع اور انکساری کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ آپ کا کلام اکثر رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ نغمۂ دل آپ کے کلام کا مجموعہ ہے۔ آپ کا پہلا مجموعہ کلام ترانۂ دل کے نام سے عام میں شائع ہوا ہے۔ اس میں نغمۂ دل اور اس کے بعد کا کلام شامل ہے۔ درد دل اور داستان غم دل بھی آپ نے لکھے ہیں۔ آپ کے شاگرد بکثرت ہیں بعض کے نام یہ ہیں:۔

عابد شاہجہان پوری اور شاہجہان پوری، مضطر شاہجہان پوری، عزیز بریلوی، فضا جالندھری، عیش فیروزپوری، سلیم شاہجہانپوری، غلام حسن کسرتی، پیام شاہجہان پوری ایڈیٹر اخبار کمایت اسلام لاہور ——— ۲۶۔ دسمبر ۱۹۵۹ء کو حضرت دل انتقال فرما گئے۔

دیوانہ :۔ رائے سرب سکھ (بعض تذکروں میں سرپ سنگھ لکھا ہے) متخلص بہ دیوانہ اردو اور فارسی کے نہایت پرگو شاعر تھے دہلی کے باشندے اور قوم کے کھتری تھے مگر وضع قطع اور لباس بالکل ایرانیوں جیسی رکھتے تھے۔ راجہ ہمانا مائی دیوان نواب شجاع الدولہ صوبہ دار اودھ کے شیفتہ زادے تھے۔ جب دہلی تباہ ہوئی تو یہاں سے لکھنؤ چلے گئے۔ مثنویہ، دیوان اور دو قطعات ان کے تین فارسی دیوانوں میں۔ اردو کا مقبول صاحب نخانہ جاوید ایک دیوان ہے۔ بیحد خوش مشرب اور حمید دل جوان تھے۔ مرزا فاخر مکین سے بارہ برس اصلاح لی اور اپنے وقت کے مستند شاعر مانے جاتے تھے۔

ذوق :۔ محمد ابراہیم نام، شیخ محمد رمضان کے بیٹے، ذوق تخلص۔ دہلی کے ایک بہت غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۲۰۴ھ (۱۷۸۹ء) میں پیدا ہوئے۔ نوع شعر میں غلام رسول شوق اور شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ اکبر شاہ ثانی کے دربار سے "خاقانی ہند" کا خطاب پایا۔ بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے اور قصیدہ گوئی کے فن میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اپنے دور کے بزرگ ترین شعراء میں سے ہیں۔ غزل بھی خوب کہتے تھے۔ زبان و بیان اور محاورات کے بادشاہ ہیں۔ علاوہ شعر کے علم و فضل کے بھی مالک تھے۔ طب میں بھی دخل رکھتے تھے۔ علم نجوم سے بھی واقف تھے۔ علاوہ بہادر شاہ ظفر کے شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد، نواب مرزا داغ، سید ظہیر الدین ظہیر، سید شجاع الدین الور، نواب الٰہی بخش خاں معروف اور حافظ غلام رسول وہرآن بھی ذوق کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ ۱۱ نومبر ۱۸۵۴ء کو انتقال کیا۔ بعد میں آزاد نے دیوان مرتب کیا۔

راسخ :۔ "خلاق المعانی" مولوی محمد عبدالرحمٰن المتخلص بہ راسخ دہلی کے مشہور واعظ، مصنف اور شاعر تھے آپ فن شعر میں اپنے والد کے شاگرد تھے جن کا نام وہ خود اس طرح لکھتے ہیں "مداح رسول بشیر و نذیر حاجی الحرمین شریفین، حافظ القرآن شیخ الوقت حسان الہند علامہ جناب حضرت مولانا مولوی محمد حسین صاحب دہلوی مدظلہ العالی المتخلص بہ فقیر نقشبندی، چشتی، شاذلی، قادری مصنف کلیات مدیحہ فقیر تعلیم محمد و تلمیذ فقیر برگزیدہ شریر سابق سفیر قسطنطنیہ بجانب ریاست بھوپال"۔

طالب علمی کا زمانہ تھا اور عربی، فارسی کی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ بقول خود مکہ بختی کے دن آ گئے یعنی سر پہ شاعری کا جنون آ پڑا۔ ہنوز تعلیم عربی کا سلسلہ تمام نہ تھا کہ شعر گوئی کا شوق مدرسہ عقل و نقل سے اٹھا کر مصطبۂ حسن و عشق میں لے گیا۔ پیر مغاں سے بیعت ہوئی عنبریں زلفوں کا سلسلہ سنداً ملا۔ عشق ابرو نے تلوار کے گھاٹ اتارا اور کسی کی مراد کی بانکی چتون نے ایک سیدھے مسلمان کا کام تمام کر دیا۔ یہ مشہور شعر انہی کا ہے ؎

جاوڑی قاف ہے یا خلد بریں ہے راسخ
جمگھٹے حوروں کے پریوں کے پرے ملتے ہیں

مرأۃ الخیال اور آئینہ کمال دو دیوان یادگار چھوڑے۔ مثنوی مولانا روم کے پہلے دفتر کا منظوم ترجمہ مع شرح کتاب ہے مرقوم کے نام سے

۹۲-۹۰ نسخہ پر نہایت عمدگی و صفائی سے لکھا اور ۲۹ اپریل ۱۸۶۹ء کو بڑے اہتمام سے مطبع احسن المطابع دہلی سے چھپ کر شائع ہوا۔ آج کل یہ مثل کمیاب اور نایاب ہے۔ حق یہ ہے کہ بے نظیر شرح اور ترجمہ ہے۔ دوسرے دفتر کی شرح مسک ختوم کے نام سے اور تیسرے دفتر کی مفتاح مقسوم کے نام سے بھی تیار کی تھی مگر غالباً ان کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ بعارضہ فراسیہ ۲۹ ستمبر ۱۹۰۰ء کو انتقال کیا۔ ۶۴ برس کی عمر پائی۔

مؤلف تذکرہ جاوید ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ قصبہ بہت (نواح پانی پت) کے رہنے والے تھے مگر تعلیم دہلی میں پائی اور یہیں قیام رہا۔ ابتدائے شباب میں اخبار بے مثال نکالا، چلتا پرزہ اور خیر خواہ عالم کے برسوں ایڈیٹر رہے۔ دہلی سے باہر ان کی شاعری کی شہرت رسالۂ زبان جاری کرنے کے بعد ہوئی۔ طبیعت نہایت ظریف پائی تھی اور زبردست عالم تھے۔ وعظ بہت اچھا کہتے تھے۔ فقہ معقول منقول اور کتب سیئہ پر کامل عبور تھا۔ داغ دہلی کے نوآموز شاعروں کو کہا کرتے تھے کہ "راسخ کی موجودگی میں اپنی غزل انہی کو دکھاؤ" مرنے سے چار سال پہلے عشقیہ شاعری بالکل ترک کر دی تھی اور وعظ و نصیحت اور درس و تدریس کا اپنا شغل بنا لیا تھا۔

راقم :- خواجہ قمر الدین نام، راقم تخلص، وطن دہلی، خواجہ بدر الدین ترجم پرستان خیال کے فرزند اور غالب کے شاگرد تھے۔ ریاست جے پور سے وظیفہ مقرر تھا جس پر گزران تھی۔ آخر عمر میں دہلی چھوڑ کر جے پور ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی جہاں ۱۹۰۹ء کے قریب ان کا انتقال ہوا۔ دیوان چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ "عقد ثریا" تعلیم نسواں کے متعلق ان کی ایک بہت ہی دلچسپ کتاب ہے جو قصہ کے پیرایہ میں لکھی گئی ہے مگر اس میں کمال یہ دکھایا ہے کہ ہر فقرہ مسجع اور مقطع ہے۔

رخشاں :- نواب ضیاء الدین احمد خاں دہلی کے رئیس اور عربی، فارسی اور اردو کے بے مثل عالم تھے۔ فارسی اور اردو میں بہت اعلیٰ پایہ کے اشعار کہتے تھے۔ اردو میں رخشاں اور فارسی میں نیر تخلص کرتے تھے۔ تاریخ کے بہت بڑے فاضل تھے۔ الیٹ صاحب نے اپنی تاریخ ہند انہی کی مدد سے لکھی تھی۔ سفرنامہ حکیم ناصر خسرو انہی کے کتب خانہ میں قلمی موجود تھا جہاں سے ڈاکٹر شیفر نے گورنمنٹ ہند کی وساطت سے وہ فرانس منگوایا اور اسے شائع کیا۔ بعد میں وہی اصل نسخہ مولانا حالی نے نواب صاحب سے لے کر دہلی سے ۱۸۸۳ء میں چھپا۔ سرسید کی آثار الصنادید پر ایک بہت عمدہ تقریظ لکھی، غالب کے دیوان پر مفصل تنقید کی۔ مسدس حالی کے متعلق ایک لطیف رباعی کہی جو مسدس کے پہلے ایڈیشن میں شائع ہوئی۔ غالب کے نہایت عزیز شاگرد تھے۔

باوجود رئیس ابن رئیس ہونے کے نہایت منکسر المزاج اور با اخلاق انسان تھے۔ نایاب اور قلمی کتابوں کا بے نظیر کتب خانہ بڑے شوق سے جمع کیا تھا جس میں بڑی قیمتی قیمتی کتابیں تھیں۔ ۱۳ رمضان ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۶ جون ۱۸۸۵ء بروز شنبہ انتقال کیا۔ شمس العلماء مولانا شبلی نے فارسی میں پُر درد مرثیہ کہا۔ حضرت مولانا حالی ان کے متعلق فرماتے ہیں ؎

عمرے بہت کہ دہلی جید بے جان است — وز قطرہ رجال سر بسر ویران است
اما صدف شکر کہ کنب مخفش — روشن ز فروغ نیر رخشاں است

رسا :- نام کاظم علی، رسا تخلص کرتے تھے۔ رام پور کے رہنے والے تھے مگر دہلی شاعری پر فدا تھے۔ رسا مرزا داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے شمس العلماء مولانا آغا جور نجیب آبادی فن شعر میں آپ ہی کے شاگرد ہیں۔

رشک :- میر علی اوسط نام رشک تخلص۔ بمقام فیض آباد ۱۲۱۴ھ (۱۷۹۹ء) میں پیدا ہوئے۔ بہت دنوں تک لکھنؤ میں رہے پھر کلکتہ جا کر وہیں کی مستقل سکونت اختیار کر لی۔ فن شعر میں ناسخ کے شاگرد اور تسلیم لکھنوی آبادی کے استاد ہیں۔ اُنھوں نے زبان کی ایک بسط لغت مرتب کرنے کی محنت کے بعد مرتب کی محنت سے چھپنا نصیب نہ ہوا۔ نظم مبارک اور نظم گرامی ان کے کلام کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۷ء) میں وفات پائی۔

رشکی :- نواب محمد علی خاں نام رشکی تخلص۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے فرزند اکبر تھے۔ اپنے والد ماجد کی طرح شعر کا نہایت صحیح ذوق رکھتے تھے اور دہلی کی ادبی مجالس کی رونق تھے۔ فن شعر میں غالب سے تلمذ تھا۔ حضرت مولانا حالی کو انھوں نے تا بیق مقرر کر کے شیفتہ اپنے ساتھ جہانگیر آباد لے گئے جہاں آٹھ سال تک مولانا نے یہ خدمت بہت احسن طریقہ پر ادا کی۔ اپنے والد کی وفات کے بعد بھی جہانگیر آباد کے رئیس رہے۔ ۱۸۹۹ء میں وفات پائی۔ حضرت مولانا حالی نے بہت پُر درد مرثیہ ان کا فارسی میں لکھا۔

رند لکھنوی :- سید محمد خاں نام اور رند تخلص تھا۔ نواب غیاث الدین حیدر فیض پوری کے بیٹے تھے۔ ۱۱ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ مطابق ۳ ستمبر ۱۷۹۷ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بڑے ہوئے تو شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ وفا تخلص اختیار کیا اور میر مستحسن خلیق کے شاگرد ہو گئے۔ ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ء) میں لکھنؤ آ گئے اور یہیں کی رہائش اختیار کر لی۔ یہاں آ کر خواجہ حیدر علی آتش کی شاگردی اختیار کی اور وفا سے بدل کر اپنا تخلص رند رکھ لیا اور خلیق کی شاگردی کے زمانہ کا سارا کلام دریا میں غرق کر دیا۔

گلدستہ عشق ان کے کلام کا مجموعہ ہے۔ آخر عمر میں کربلا کی زیارت کو عراق جا رہے تھے مگر بمبئی ہی پہنچے تھے کہ پیغام اجل آ گیا تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی۔ ۱۸۵۰ء کے قریب بمبئی ہی میں انتقال ہوا۔ دیوان میں غزلیات کے قریباً سات ہزار اشعار ہیں۔

رنگین :- نام سعادت یار خاں تخلص رنگین۔ سرہند میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں تعلیم پائی۔ فن شعر میں شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے شوخی و بذلہ سنجی کے ساتھ طبیعت میں مجادلہ پسندی تھی۔ ہر صنف شعر میں انھوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ معاصر چوابی میں طاق تھے شہسواری اور تیراندازی میں کمال حاصل تھا۔ گھوڑوں کے علاج میں ماہر تھے۔ دہلی سے نکل کر کچھ مدت مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں بھی بمقام لکھنؤ رہے ہیں آخر عمر میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ ۱۱۷۱ھ (۱۷۵۷ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵ء) میں وفات پائی۔ چار دیوان ان کی یادگار ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ ریختہ۔ پختہ۔ آمیختہ اور انگیختہ۔ ان کے علاوہ اعجاز رنگین۔ فرس نامہ۔ رنگین نامہ۔ مجالس رنگین اور مثنوی دل پذیر بھی ان کی تصانیف میں سے ہیں۔ ڈاکٹر صابر علی خاں پروفیسر کرین میری کالج لاہور نے ان پر نہایت تحقیقی مقالہ لکھا ہے جو انجمن ترقی اُردو نے شائع کیا ہے۔

ریاض: ریاض احمد نام اور ریاض تخلص ہے۔ خیر آباد وطن ہے جہاں ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں پیدا ہوئے۔ [illegible] ۳۲۲) والد کا نام سید طفیل احمد تھا۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق پیدا ہو گیا۔ پہلے لکھنؤ جا کر اسیر کے شاگرد ہوئے اور ان کے انتقال کے بعد امیر مینائی کے۔ ریاض لکھنؤ کے نہایت بلند پایہ غزل گو شعراء میں سے ہیں۔ ان کے اشعار نہایت دلکش، دلفریب اور دلچسپ ہیں۔ ریاض الاخبار، گلِ نغمہ، عطرِ فتنہ، گلکدۂ ریاض اور تحفہ وغیرہ پرچے وقتاً فوقتاً نکالے۔ حرم سرا ـــــ اور نظارہ تین ناول بھی آپ کی یادگار ہیں۔ ریاضِ رضوان کے نام سے آپ کا دیوان چھپ گیا ہے۔ مختلف مضامین عقیل احمد جعفری نے مرتب کر کے "نثرِ ریاض" کے نام سے شائع کیے۔ انتخاب "مینائے ریاض" کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ مطابق ۳۰ جولائی ۱۹۳۴ء کو انتقال ہوا۔

زکی: نواب سید محمد زکریا نام، زکی تخلص۔ کشمیر کے سادات میں سے تھے۔ بمقام دہلی ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) میں پیدا ہوئے۔ مختلف اوقات میں الٰہ آباد، بریلی، گورکھپور اور بدایوں میں ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز رہے۔ عربی اور فارسی بہت اچھی جانتے تھے۔ حدیث، فقہ، تصوف اور نجوم میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ موسیقی اور خوش نویسی سے بھی بہت زیادہ شوق تھا۔ فنِ شعر میں طرزِ قدیم کے استاد مانے جاتے ہیں۔ [illegible] اوّل صہبائی، پنڈت رام کشور نیشل سے اور بعد میں غالب سے اصلاح لیتے تھے۔ مولوی سید احمد دہلوی مؤلف فرہنگِ آصفیہ ان کے شاگرد ہیں۔ بدایوں میں ۱۳۲۱ھ (۱۹۰۳ء) میں انتقال کیا۔ دیوان چھپ گیا ہے۔

ساحر دہلوی: پنڈت امرناتھ مدن نام اور ساحر تخلص ہے۔ دہلی کے رہنے والے اور نہایت باذوق، صاحبِ علم اور پرانی وضع کے بزرگ تھے۔ ان کے والد کا نام رائے بہادر پنڈت جانکی ناتھ مدن رئیس دہلی تھا۔ آپ رائے بریلی میں ۲۹ مارچ ۱۸۶۳ء کو پیدا ہوئے۔ بارہ برس کی عمر میں پنڈت رام پرشاد رازداں سے شاگرد ہوئے۔ عربی اور فارسی کی تعلیم نہایت لائق اور فاضل علماء سے پائی، فارسی شاعری میں مولوی عبدالحلیم حاتم کاشانی کے شاگرد ہیں۔ نہایت وسیع الاخلاق، ملنسار اور منکسر المزاج بزرگ تھے۔ وضع قطع میں پرانے بزرگوں کی نشانی تھے۔ مولانا حالی کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں انتقال کیا۔ سحرِ ساحر، ترجمہ مثنوی پران، ترجمہ گیتا فارسی [illegible] آپ کی تصنیفات ہیں۔

سالک: مرزا قربان علی بیگ نام، مرزا امام بیگ کے فرزند۔ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں پرورش پائی۔ پہلے مومن کے اور بعد ازاں غالب کے شاگرد ہوئے۔ پہلے [illegible] تخلص کرتے تھے، پھر سالک کہلانے لگے۔ غالب کے بہترین شاگردوں میں ان کا شمار تھا۔ ۱۸۵۷ء کی قیامت میں یہ بھی دہلی سے نکلے اور ریاست الور میں جا کر وکیل ہو گئے۔ پھر حیدرآباد دکن جا کر محکمہ تعلیمات کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ حیدرآباد کے زمانہ قیام میں آپ کچھ عرصہ تک وہاں کے ایک ماہنامہ "مخزن الفوائد" کے ایڈیٹر بھی رہے جو نواب عماد الملک بہادر کی زیرِ سرپرستی اس وقت نکلا کرتا تھا۔ ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) میں آپ کا حیدرآباد ہی میں انتقال ہوا۔

سائل دہلوی: نواب ابو المعظم سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی دورِ حاضر کے نہایت نامور غزل گو شاعر۔

۱۸۶۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب آپ کے والد اور نواب سعید الدین خاں طالب آپ کے چچا کا نام تھا۔ سائل عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ ہندی اور سنسکرت سے بھی واقف تھے۔ طب میں بھی خاصا دخل تھا جس میں آپ حاذق الملک حکیم اجمل خاں صاحب مسیحا کے شاگرد تھے۔ نواب ضیاء الدین خاں آف لوہارو اپنے دادا کی زیر نگرانی ان کی تعلیم کی تکمیل ہوئی۔ نواب مرزا داغ دہلوی ان کے خسر تھے اور فنی شعر میں استاد بھی۔ نہایت نفاست پسند اور جامہ زیب بزرگ تھے۔ مشرقی تہذیب کا مکمل نمونہ اور پرانے بزرگوں کے اخلاق کا مجسمہ تھے۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو طویل علالت کے بعد انتقال کیا۔ غزلوں کے چھ دیوان یادگار چھوڑے مگر چھپا ایک بھی نہیں۔ ان کے مفصل حالات عرصہ ہوا دہلی کے رسالہ البرہان کے کئی نمبروں میں چھپے تھے۔ کلام کا انتخاب ۹ صفحات پر مذکر جدید شعراء اردو میں دیا گیا ہے۔

سجاد:- میر سجاد ان صاحب کا نام تھا۔ آگرہ کے رہنے والے تھے اور شاہ نجم الدین آبرو کے شاگرد تھے۔

سراج دکنی:- دکن کے مشہور شاعر تھے۔ سید سراج الدین نام، سراج تخلص اور اورنگ آباد وطن تھا۔ درویش منش اور فقیر دوست شخص تھے۔ کلام میں شوخی، خیالات میں بلندی اور مضامین میں صفائی و سادگی پائی جاتی ہے۔ غزلوں میں حسن و عشق اور توحید و معرفت سب کچھ ہے۔ ریختہ گوئی میں ولی کے قائم مقام تھے۔ دیوان پانچ ہزار اشعار کا مجموعہ ہے۔ فارسی شعراء کے کلام کا انتخاب منتخب دیوان پانچ کے نام سے ۱۷۵۵ء میں کیا جس میں ۶۸۰ شعراء کے اشعار ہیں۔ ایک مثنوی بوستان خیال کے نام سے ۱۷۵۹ء میں مکمل کی جس میں ایک ہزار سات ابیات ہیں۔ ۱۷۱۲ء میں پیدا ہوئے اور ۶ اپریل ۱۷۶۳ء کو انتقال کیا۔

سلیم پانی پتی:- ابوالمحاسن مولوی سید وحید الدین سلیم ۱۸۶۹ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ گھر میں نہایت عزت علمی تھی۔ ابتدائی معمولی تعلیم مکتب میں ہوئی پھر لاہور چلے آئے۔ گھر پر فیض الحسن سہارنپوری اور مولانا عبدالرشید سے فارسی و عربی کی تحصیل کی۔ مولانا حالی کی سفارش سے سررشتہ کے لائبریری اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔ ۱۸۹۹ء میں ایک رسالہ معارف کے نام سے نکالا جو نہایت ہی اعلیٰ پایہ کا ادبی اور تاریخی ماہنامہ تھا۔ پھر پانی پت سے شائع ہونے لگا۔ ۱۹۰۱ء میں بند ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد مولانا علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ایڈیٹر ہو گئے۔ مشہور رشہ آفاق اخبار مسلم گزٹ بھی کچھ عرصہ تک انہی کی ایڈیٹری میں نکلتا رہا۔ پھر لاہور آ کر کچھ دنوں تک زمیندار میں رہے۔ پھر عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہو کر چلے گئے جہاں آخر عمر تک رہے۔ ۲۹ جولائی ۱۹۲۸ء کو سرطان کے عارضے میں بمقام سیح آباد (یو۔پی) انتقال کیا۔ اردو زبان کے بے نظیر فاضل اور زبردست ادیب تھے۔ اعلیٰ درجہ کے شاعر بے نظیر نقاد اور بہت بڑے ماہر لسانیات تھے۔ نئے انقلاب ایجاد کرنے کی ان میں خاص قابلیت تھی۔ نہایت زندہ دل ہنس مکھ اور خوش ذوق شخص تھے۔ ان کے کلام کا مجموعہ افکار سلیم کے نام سے میں نے ۱۹۳۵ء میں شائع کیا تھا۔ ۲۱۸ صفحات کی ضخیم کتاب ہے لیکن آج کل کہیں نہیں ملتی۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں اس کی ساری کاپیاں تباہ ہو گئیں۔ میں نے ان کے مضامین کا مجموعہ بھی تین جلدوں میں تیار کیا تھا وہ بھی فسادات کی نذر ہوا۔ فسادات سلیم کے نام سے مضامین کا ایک مجموعہ چھپ چکا ہے۔ وضع اصطلاحات ان کی نہایت بلند پایہ علمی کتاب ہے۔ حضرت عروس العاص کی بسط سراج عمری بھی انھوں نے شائع کی جو سب سے پہلے مولانا حالی کے مضامین جمع کر کے انھوں نے ہی شائع کیے تھے۔ مولانا حالی کے بہت گہرے دوستوں میں سے تھے۔ مولانا حالی

کے نام پر مالوہ پر بھی پانچ ہزار کا تقرر کیا تھا جس میں بہت اچھی اچھی کتابیں انھوں نے شائع کیں۔

سلیمان قلی: ۔ نواب مرزا سلیمان نگرہ شاہزادگان مغلیہ میں سے اُردو زبان کے بہت زبردست قدردان اور سرپرست گزرے ہیں۔ سلیمان تخلص کرتے تھے۔ شاہ عالم ثانی کے لڑکے تھے اور دہلی کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ میں جا بسے تھے۔ نواب آصف الدولہ عالی اور ان کو بڑا کچھ ہزار روپے ماہوار وظیفہ دیتے تھے۔ ۳۸ سال کامل لکھنؤ میں رہنے کے بعد آگرہ چلے گئے تھے۔ ۱۸۲۲ء میں انتقال کیا۔ علی الترتیب شاہ حاتم، مصحفی اور انشا سے مشورہ سخن کرتے رہے۔ ان کا دربار شعراء اور اہل علم کا ملجا و ماویٰ تھا اور مرزا ایسا مرکز تھے کہ ہر شاعر اور ادیب دوڑا ہوا ان کی طرف چلا آتا تھا اور ان کی سرکار سے وظیفہ انعام اور خلعت پاتا تھا۔ راقم الحروف کے جد امجد شیخ غلام غوث بھی سخا کی سرکار سے بہت معزز محمد سے پر تعینات تھے اور لکھنؤ سے مرزا کے ساتھ ہی آگرہ آ گئے تھے۔ اسی سرکار سے وابستگی کی جاگیریں ان کی نسلوں میں چلی آتی۔

اشد ضرورت ہے کہ اُردو کے اس مربی، قدردان اور سرپرست کی ادبی قدردانیوں اور اس کے ادبی و علمی کارناموں کے متعلق ایک مبسوط مضمون مرتب کیا جائے۔ جواب تک نہیں ہوا۔

سودا: ۔ سودا کا نام محمد رفیع اور باپ کا نام محمد شفیع تھا جو سلسلۂ تجارت کابل سے دہلی آئے اور یہیں رہ پڑے۔ سودا ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء) میں پیدا ہوا۔ کابل دروازہ کے محلہ میں مکان تھا۔ جوان ہوا تو شاعری کی سوجھی۔ پہلے سلیمان قلی خاں روہیلہ کا شاگرد ہوا۔ پھر شاہ حاتم سے مشورہ سخن کرنے لگا۔ فارسی چھوڑ کر اُردو شعر کہنے کی ترغیب خان آرزو نے دی۔ بہت جلد شاعری میں کمال حاصل کر لیا۔ یہاں تک کہ شاہ عالم ثانی کا شاگرد ہوئے مگر اس وقت کی دلی بدامنی کا گہوارہ بنی ہوئی تھی۔ مجبوراً ۶۰ برس کی عمر میں دلی سے نکلا اور نواب بنگش کے پاس فرخ آباد میں پہنچا۔ وہاں سے ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۲ء) میں لکھنؤ آیا۔ نواب شجاع الدولہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کے بعد آصف الدولہ نے بڑی خاطر مدارات سے رکھا اور چھ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ نہایت عیش و آرام سے زندگی گزار کر ۴ رجب ۱۱۹۵ھ (۲۶ جون ۱۷۸۱ء) کو ۷۰ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ شاہ حاتم نے سُنا تو کہا "افسوس ہمارا پہلوان سخن مر گیا"۔

سودا کا کلیات بڑا ضخیم ہے جسے حکیم سید امام الدین خاں نے مرتب کیا۔ آزاد کی زبانی کلیات سودا کی کیفیت سُنیے

"اقلیم قصائد و بزمگان دیں کی مدح میں اور اہل دول کی تعریف میں ہیں۔ اسی طرح چند قصائد فارسی، ۴ مثنویاں ہیں بہت سی حکایتیں اور لطائف منظوم ہیں۔ ایک مختصر دیوان فارسی کا تمام و کمال۔ دیوان ریختہ جس میں بہت سی لاجواب غزلیں (قریباً ۵ ہزار اشعار) اور مطلع، رباعیاں، مستزاد، منظومات، تاریخیں، پہیلیاں اور سوغت، ترجیع بند، خمس اور ہجویں سب کچھ کہا ہے۔ ایک تذکرہ شعراء اردو کا ہے۔ ایک کتاب عبرۃ الغافلین مرزا فاخر مکیں کے جواب میں لکھی ہے"۔

مرزا اُردو کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ بدنام ہجو گو شاعر ہے جس کی ہجو کرنا بقول آزاد "شرم کی آنکھیں بند اور بے حیائی کا منہ کھول دینا" تھا۔ سنتا تھا کہ شیطان بھی اس کے نام سے بھاگتا ہے۔ سودا کی ہجو گوئی اس قدر طعن ہوئی تھی کہ جانوروں تک کو نہ بخشا۔ یہ ہجویں حقیقت میں مسلمانوں سے بدتر ہیں اور اُردو شاعری کی پیشانی پر سیاہ داغ۔

(میر) صورؔ :- سید محمد میر نام اور صورؔ تخلص تھا۔ حضرت قطب صاحب بختیار کاکی کی اولاد سے ہیں۔ آباو اجداد بخارا سے آئے اور دہلی میں آباد ہو گئے۔ میر صورؔ دہلی ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں پرورش اور تعلیم پائی۔ جب بڑے ہوئے تو طوائف الملوکی کے باعث وطن سے بیزار ہو گئے۔ پہلے اودھ اور وہاں سے مرشد آباد۔ کچھ دنوں وہاں رہ کر پھر لکھنؤ آئے۔ یہاں نواب آصف الدولہ نے ان کی شاگردی اختیار کی اور میر صاحب باقی ماندہ عمر یہیں گذاری۔ سنہ ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۱ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۸ء) میں وفات پائی۔ شاعری کے ساتھ ساتھ شہسواری اور تیراندازی میں بھی ماہر تھے۔ خط نہایت عمدہ اور پاکیزہ تھا۔ خوش گفتار، عالی طبیعت، درویش صفت اور ظریف الطبع بزرگ تھے۔ دیوان تو بڑا سات سو اشعار کا مجموعہ ہے۔

سیمابؔ :- عاشق حسین نام، محمد حسین صدیقی کے فرزند۔ آگرہ کے رہنے والے۔ ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۰ء) میں پیدا ہوئے۔ عربی ادب، اصول منطق اور فارسی کی تحصیل کے بعد انگریزی کی تحصیل شروع کی۔ ابتدا میں تھے کہ والد کے انتقال کے باعث تعلیم ترک کرنی پڑی اور ریلوے میں ملازم ہو گئے مگر شعر و شاعری کے شوق میں ملازمت کو خیرباد کہا اور آگرہ آکر زبان اور ادب کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ رسالہ مرصع جاری کیا۔ پھر ۱۹۱۸ء سے میں جا کر آگرہ اخبار کی ادارت کی پیمانہ بنایا۔ شاعر اور تاج کے ایڈیٹر بھی رہے ہیں۔ فی شعر میں داغ کے شاگرد ہیں۔ ان کی شاعری کا موضوع بقول خود "حسن محض اور عشق محض" ہے۔ باقاعدہ شاعری کا آغاز بنام صفیر الادب قائم کیا اور سینکڑوں شاگرد بنائے۔ چار مہینے خالم میں مبتلا رہنے کے بعد ۷۱ سال کی عمر میں ۱۴ جنوری ۱۹۵۱ء کو کراچی میں انتقال کیا۔ بقول خود ۲۸ کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی نظموں کے تین مجموعے صہبائے کہن، باقۂ دوشیزہ اور شیرازہ کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ مقدمات آہنگ، سرود غم، نغمۂ کارامروز اور دستور الاصلاح بھی ان کی کتابیں ہیں۔ خوش گو اور قادر الکلام شاعر تھے۔

شادؔ عظیم آبادی :- سید علی محمد نام اور شادؔ تخلص تھا۔ والد سید عباس مرزا حضرت امام زین العابدین کی اولاد سے تھے۔ ۱۸۴۶ء کو عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم قابل اساتذہ سے پائی۔ پندرہ برس کی عمر سے شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ شاہ اکبر داناپوری کی شاگردی کی۔ رائج عظیم آبادی سے بھی بڑی حد تک متاثر تھے۔ شادؔ نے اپنی ساری زندگی ادب اور زبان کی خدمت میں گزار دی۔ گورنمنٹ سے خان بہادر کا خطاب ملا۔ نیز ایک ہزار سالانہ وظیفہ بھی ملتا تھا۔ ۲۴ سال تک لگاتار آنریری مجسٹریٹ رہے۔ جنوری ۱۹۲۷ء میں دماغ کی شریان پھٹنے سے انتقال کیا۔ اعلیٰ درجہ کے ادیب، نہایت خوش گو شاعر اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے جو بعض چھپ گئی ہیں۔ بعض نہیں چھپیں۔ چھپی ہوئی کتابوں کے نام یہ ہیں۔ کلام شاد۔ الہامات شاد۔ نغمۂ الہام۔ مکتوبات شاد۔ حیات مزید اور فکر بلیغ (اصول فصاحت و بلاغت)۔ ان کی سوانح عمری گلشن حیات کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

شادؔ :- ہز ایکسلنسی راجہ راجان یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد کے سی۔ آئی۔ ای۔ جی سی آئی۔ ای وزیر اعظم ریاست حیدرآباد بہت عمدہ زاد، مشہور شاعر اور اردو۔ عربی۔ فارسی۔ انگریزی۔ تلنگی اور سنسکرت کے فاضل تھے۔ نظم و نثر نہایت بے تکلفی اور صفائی سے لکھتے اور شاگرد تھے کرتے۔ اہل علم کے قدردان اور خود بہت صاحب فہم تھے۔ دبدبہ آصفی اور محبوب الکلام نامی دو جرائد کے ایڈیٹر بھی رہے ہیں۔ نہایت

صوفی مشرب۔ خوش اخلاق۔ متواضع۔ منکسر المزاج۔ وسیع الحوصلہ اور مشرقی تہذیب کا بہت اعلیٰ نمونہ تھے۔ مزاج میں تکبر اور غرور بالکل نہ تھا۔ جب راقم مضمون ۱۹۳۰ء میں حیدرآباد گیا اور مہاراجہ بہادر سے بھی ملا تو مہاراجہ بہادر بہت ہی خوش اخلاقی اور تواضع کے ساتھ پیش آئے۔ چائے منگوائی اور خود اپنے ہاتھ سے پان بنا کر مجھے مرحمت فرمایا۔ پھر اپنے کتب خانہ سے ایک قلمی کتاب منگوا کر دکھائی جو ان کی اپنی خود نوشت سوانح عمری تھی اور جس پر جابجا مولانا حالی نے اپنے قلم سے اصلاح دے رکھی تھی۔ مہاراجہ بہادر نظم و نثر کی اکیاون باون کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں بزم خیال۔ جریدہ شاد۔ فریاد شاد۔ مطلع خورشید۔ نغمہ شاد۔ ارمغان وزارت۔ مخزن القوافی۔ مثنوی آئینہ وجود۔ سیر پنجاب۔ روزنامچہ گلبرگہ۔ فسانہ شیدا وغیرہ۔ ادبی مذاق نہایت صاف ستھرا اور متین و سنجیدہ تھا۔ آپ کا کلام حسن تخیل۔ سلاست زبان اور بندش الفاظ کے لحاظ سے بہت اعلیٰ ہے۔ تقریباً سارا کلام تصوف کے رنگ میں رنگین ہے۔ ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۰ء میں انتقال کیا۔

آغا شاعر دہلوی۔ آغا شاعر کے مورث علی نادر شاہ درانی کے ساتھ ہندوستان آئے۔ اور دہلی میں رہائش اختیار کی۔ والد کا نام آغا عبد علی تھا۔ آغا شاعر دہلی میں ۵ مارچ ۱۸۷۱ء کو پیدا ہوئے۔ عربی۔ اور فارسی کی تعلیم گھر ہی پر پائی۔ فن شعر میں نواب احمد سعید خاں طالب دہلوی کے شاگرد ہیں۔ پچیس چھبیس برس کی عمر میں جب حیدرآباد گئے تو داغ کی شاگردی اختیار کی۔ آپ کا کلام قدیم شاعری کا اچھا نمونہ ہے۔ زبان میں شیرینی اور روانی ہے۔ معاشرت قدیم بزرگوں جیسی تھی۔ قرآن پاک کا منظوم ترجمہ آپ کا کارنامہ ہے۔ غزلیات کا مجموعہ تیر و نشتر کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ عمر خیام کی رباعیوں کا بھی منظوم ترجمہ کیا تھا۔ آغا صاحب کے مضامین کا مجموعہ خمارستان کے نام سے شائع ہوا۔ آویزہ گوش۔ پر پرواز اور دامن مریم بھی آپ کی کتابیں ہیں۔ ۱۱ مارچ ۱۹۴۰ء کو وفات پائی۔

شبلی نعمانی۔ دور حاضرہ کے بہت بڑے ادیب۔ زبردست مورخ۔ اعلیٰ پایہ کے سوانح نگار اور نہایت فاضل و عالم بزرگ تھے۔ نظم میں خاص درجہ حاصل نہیں۔ مگر جتنا اور جو کچھ کہا نہایت مقبول ہوا۔ قومی اور تاریخی نظمیں انھوں نے جتنی لکھیں سب نہایت بے نظیر تھیں۔ جتنی مبسوط کتابیں تحریر فرمائیں سب اپنے موضوع کے لحاظ سے بیحد قابل قدر تھیں۔ الفاروق کا جواب تمام اردو لٹریچر میں نہیں۔ شعر العجم پانچ جلدوں میں فارسی شاعروں کی مبسوط تاریخ ہے۔ المامون۔ سیرۃ النعمان۔ سوانح مولانا روم۔ الغزالی ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ اسلامی تمدن و تہذیب کے متعلق جس قدر بلند پایہ مضامین انھوں نے لکھے وہ رہتی دنیا تک مولانا کے نام کو زندہ رکھیں گے۔ نظم شبلی ان کی نظموں کا مختصر سا مجموعہ ہے۔ سب سے آخری تصنیف سیرۃ النبی ہے۔ جو ان کا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ محمد شبلی نام تھا۔ شبلی تخلص کرتے تھے۔ موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ بڑے بڑے فاضل استادوں سے تعلیم پائی۔ کئی سال تک علی گڑھ کالج میں پروفیسر رہے۔ ممالک اسلامیہ کی سیاحت کی اور اپنا سفرنامہ قلمبند کیا۔ انگریزی گورنمنٹ سے شمس العلماء کا خطاب پایا۔ ندوۃ العلماء کو قائم کیا۔ ندوۃ المصنفین انہی کی یادگار میں قائم کیا گیا ہے جس نے اسلامی تاریخ اور ثقافت کے متعلق نہایت اہم اور نہایت قابل قدر کتابیں شائع

کی ہیں۔ ۱۰ر فروری ۱۹۳۳ء کو انتقال ہوا۔

شرر۔ مولوی عبدالحلیم شرر۔ اردو زبان کے نہایت فاضل خامہ نگار اور ناول نویس تھے۔ اردو میں اسلامی کلچر کی ناول انہی کی ایجاد ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے صحت مند اور انشا پرداز تھے۔ اردو لٹریچر کو انھوں نے اپنی لاجواب تصنیفات سے مالا مال کر دیا۔ اگر ان کی تمام تصنیفات کی تعداد گنی جائے تو ایک لمبی فہرست بن جائے۔ ۱۴ر جنوری ۱۸۶۸ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور ۱۴ر دسمبر ۱۹۲۶ء کو انتقال کیا۔ ابتدا میں اودھ اخبار لکھنؤ میں کام کیا۔ پھر مختلف اخبارات و رسائل دلگداز نکالے۔ جن میں خاص طور پر دلگداز کو نہایت شہرت و قبولیت حاصل ہوئی۔ مصنف، مؤلف اور ناول نویس ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ اور شرر تخلص کرتے تھے۔

شفق۔ اُن کا نام مولوی سید حسن مرتضیٰ تھا اور یہ مولوی سید حسن تخلص حسد اور اصطلاح عرفی و شعائی کے بڑے تھے۔ نگینہ (بجنور) ان کا مولد و مسکن ہے جہاں یہ ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ چار برس کی عمر تھی کہ شفقت پدری سے محروم ہو گئے اور یتیم بچے کا کوئی والی وارث نہ ہوا۔ مگر اللہ نے بڑے ہو کر اس قدر ترقی دی کہ سارا یہ اُن کی ذات پر فخر کرنے لگا۔ تعلیم کی خاطر گیا۔ عظیم آباد اور الہ آباد کے سفر اختیار کیے اور ہر جگہ قابل اساتذہ سے علم کی تحصیل کی۔ حکیم ماہد علی کوثر خیرآبادی سے طب اور مولانا ظہیر احسن شوق نیموی سے حدیث پڑھی۔ نو برس کی عمر میں شعر کہنے شروع کیے پہلے اپنا کلام کوثر کو دکھایا۔ بعد شوق نیموی کو۔ ۱۸۹۴ء میں امیر مینائی کے شاگرد ہوئے اور ہر صنف سخن میں کچھ نہ کچھ کہا۔ ان کا زیادہ تر کلام نعتیہ ہے۔ ان کی نظمیں یعنی مثنویاں نعتیہ اشعار اور باغیوں اور غزلوں کے مجموعے تدوین ہو چکے ہیں۔ مثلاً خیابان رحمت، حدیقۂ اعزت، ثمرہ محبت، عنچہ نوبہار، دل صد پارہ۔ اخلاق کی تعلیم پر ایک کتاب تہذیب الاخلاق اور شاعری کے متعلق دو کتابیں منتخب المعروض اور تحقیق سخن اور نگارستان (قدیم) کا ایڈیٹر رہا۔ انتظار پردازی کا نمونہ گنجینۂ تاریخ وغیرہ۔ ۱۳۶۲ھ ۱۹۴۳ء میں انتقال کیا۔

شوق قدوائی۔ شیخ احمد علی شوق قدوائی نواح لکھنؤ کے رہنے والے، اور حضرت امیر لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے عربی اور فارسی کے فاضل تھے۔ غزل اور مثنوی خوب کہتے تھے۔ اردو پنچ کے مشہور مضمون نگاروں میں سے تھے۔ آپ کی مثنویوں کی زبان نہایت پاکیزہ اور شیریں ہے۔ عرصہ تک اخبار آزاد لکھنؤ کے ایڈیٹر رہے۔ آپ کی نظمیں ملک کے مشہور جرائد میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ لکھنؤ سے بھوپال آ گئے تھے۔ وہیں ۵۳ سال تک ملازمت کی۔ پھر رام پور چلے گئے۔ وہاں بعد انکار اپنی بیٹی کے پاس جا کر قیام کیا۔ اور دہلی میں ۱۰ر اپریل ۱۹۲۵ء کو انتقال کیا۔ بعض تصانیف کے نام یہ ہیں۔ قاسم و زہرہ۔ میکدہ۔ مسدس مولوی شوق، عالم خیال۔ دیوان بھی چھپ گیا ہے۔

شہیدی۔ نام کوہت علی۔ تخلص شہیدی اور وطن بانس بریلی تھا۔ تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ شاعری کا شوق پیدا

پہلے تو مصحفی کے شاگرد ہو گئے تھے اور ان کی وفات کے بعد اپنا کلام شاہ نصیر دہلوی کو دکھانے لگے۔ جب کبھی دہلی آتے تو شیفتہ سے بھی صحبت رہتی۔ بقول صاحب مرآۃ الشعرا نہایت یار باش۔ زندہ دل۔ بذلہ سنج۔ مرنجاں و مرنج اور وارستہ مزاج آدمی تھے۔

آخر عمر میں حج کو گئے۔ حج سے فراغت کے بعد جس وقت مدینہ منورہ کے لیے سوار ہوئے اور روضہ اقدس کے سامنے آپ کا اونٹ پہنچا تو نعت پڑھتے ہی حرکت قلب بند ہو گئی اور آپ کا انتقال ہو گیا۔ تاریخ وفات ۹ صفر ۱۲۵۸ھ (۲۰ اپریل ۱۸۴۲ء) ہے۔ شہیدی کے مشہور شعروں میں یہ نعت کے بیت مشہور ہیں۔

شیدا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں المتخلص بہ شیدا۔ دہلی کے نہایت نامور طبیب، خاندانِ شریفی کے چشم و چراغ، مجدد طب حکیم محمود خاں کے فرزند اور ملک کے بڑے سیاسی لیڈر تھے۔ ۱۷ شوال ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۱ فروری ۱۸۶۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ بیس برس کی عمر میں اس وقت کے تمام متداول علوم یعنی منطق، فلسفہ، ادب، طبیعیات، حدیث اور تفسیر وغیرہ میں کامل مہارت پیدا کر لی۔ طب کا فن اپنے بڑے بھائی حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں سے حاصل کیا۔ خاندان کے دوسرے بزرگوں سے بھی چند طبی کتابیں پڑھیں۔ ابتدائی زمانہ ریاست رام پور میں گزرا جہاں ان کا محبوب مشغلہ مطالعہ کتب تھا۔ ہزاروں کتابیں ہر علم و فن کی پڑھ ڈالیں۔ اپنے بھائی حکیم واصل خاں کے انتقال کے بعد دہلی آئے اور اپنی آبائی گدی پر بیٹھ کر مطب کرنے لگے۔ طب یونانی کے گہرے مطالعہ کے علاوہ ڈاکٹری کی طرف بھی آپ نے توجہ کی۔ طبیہ کالج دہلی کا قیام آپ ہی کی کوششوں کا رہین منت ہے۔ جس کا سنگ بنیاد وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ نے رکھا تھا۔ ملک کے جن رہنماؤں نے وطن کی آزادی میں حصہ لیا حکیم اجمل خاں کا نام ان میں ہمیشہ نہایت بلند مقام پر لیا جائے گا۔ حکیم صاحب کی ہستی ملک کے نہایت معتمد رہنماؤں میں سے سمجھی جاتی ہے۔ اور درحقیقت وہ ملک کے حقیقی اور نہایت مخلص خادم تھے۔ ان کی آخر عمر کا بہت کافی حصہ ملک کے سیاسی مسائل کے حل میں گزرا۔ یہاں تک کہ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو رام پور میں اس یگانۂ روزگار ہستی کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۰۸ء میں گورنمنٹ نے ان کو حاذق الملک کا خطاب دیا۔ جب سیاسی کشمکش بہت زیادہ بڑھی تو انھوں نے اپنا خطاب واپس کر دیا۔ جس پر قوم نے ان کو مسیح الملک کا خطاب دیا۔ آپ شاعر بھی تھے اور شیدا تخلص کرتے تھے۔ کلام کا مجموعہ چھپ گیا ہے۔

ان کی عمدہ طبیعت، بلند اخلاق اور اعلیٰ کیرکٹر کی یہ مثال نہایت مشہور ہے کہ ان کو علاج کے سلسلہ میں نواب رام پور سے مستقل تنخواہ ماہوار ملتی تھی۔ کسی بات پر نواب کی اور حکیم صاحب کی ان بن ہو گئی۔ اس نے بلانا چھوڑ دیا۔ انھوں نے جانا چھوڑ دیا۔ تنخواہ بدستور جاری رہی۔ بہت عرصہ اسی طرح گزر گیا آخر ایک دفعہ نواب کو حکیم صاحب کی ضرورت پڑی۔ اس نے گزشتہ ایام کی تنخواہ پچاس ہزار روپے بھیج کر مصالحت کرنی چاہی۔ حکیم صاحب تشریف لے گئے اور نواب صاحب علاج کے بعد تندرست ہو گئے مگر پچاس ہزار روپیہ تنخواہ کا لینے سے صاف انکار کر دیا اور فرمایا کہ اس عرصہ میں میں نے کام کوئی نہیں کیا پھر کس بات کی تنخواہ لوں! نواب نے ہر چند اصرار سے رقم پیش کرنی چاہی مگر حکیم صاحب کسی طرح بھی راضی نہ ہوئے۔

شیفتہ۔ نواب محمد مصطفیٰ خاں رئیس دہلی و جہانگیر آباد۔ فن شعر کا نہایت اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔ ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ تجوید، تفسیر، حدیث، فقہ، ادب اور تاریخ کی تعلیم ہندوستان، مکہ اور مدینہ کے مستند علما و فضلا سے

پائی۔ نہایت عابد زاہد اور پاک باطن بزرگ تھے۔ پہلے مومن سے اور پھر غالب سے اصلاح لیتے تھے۔ اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ سفرِ حج سے واپس آنے کے بعد شعر گوئی بہت ہی کم کر دی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں ان پر بھی بڑی آفت پڑی۔ قید ہوئے۔ جائداد ضبط ہوئی۔ بہزار مشکل چھٹکارا ملا۔ شمس العلماء مولانا حالی ان کے مصاحب اور ان کے لڑکوں کے اتالیق تھے۔ حالی کو شعر کا صحیح مذاق انہی کی صحبت سے میسر آیا۔ خود فرماتے ہیں ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

آپ کا اُردو دیوان حال ہی میں مولوی صلاح الدین احمد صاحب نے ایک مبسوط مقدمہ کے ساتھ لاہور سے شائع کیا ہے۔ گلشنِ بے خار۔ اُردو شعراء کا بہترین تذکرہ انہی کا لکھا ہوا ہے۔ دیوان فارسی۔ رقعات فارسی۔ سفرنامہ حجاز موسوم بہ رہ آورد بھی اُن کی تصنیفات ہیں۔ ۲۲ جمادی الآخر ۱۲۶۹ھ مطابق ۲۹ ستمبر ۱۸۶۹ء کو بدھ کے دن وفات پائی۔

صابر دہلوی۔ صاحبزادہ مرزا قادر بخش ان کا نام تھا اور صابر تخلص کرتے تھے۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ دیوان صابر ان کی یادگار ہے۔

صبا لکھنوی۔ مشہور غزل گو شاعر ہیں۔ نام میر وزیر علی ابن میر نبدہ علی خاں۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ فن شعر میں خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد ہیں۔ گھوڑے سے گر کر ۱۳ جولائی ۱۸۵۵ء کو انتقال ہوا۔ کلام بقول صاحب مرآۃ الشعراء دلچسپ۔ اور صاف ہے۔ زبان پاکیزہ اور عمدہ ہے۔ خیالات سلجھے ہوئے ہیں۔ ان کا دیوان ساڑھے تین ہزار اشعار کا مجموعہ ہے۔ اور اس میں ۲۲۷ غزلیں ہیں۔

صفی۔ سید علی نقی زیدی نام۔ صفی تخلص اور لسان القوم لقب ہے۔ ۲ جنوری ۱۸۶۳ء کو بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ اور محکمہ دیوانی کے چالیس سال ملازمت کے بعد ۱۹۲۳ء میں پنشن پائی۔ ۱۹۵۰ء میں انتقال کیا۔ شاعری میں اگرچہ کسی کے شاگرد نہیں مگر ان کا شمار لکھنؤ کے مشہور شاعروں میں ہوتا ہے۔ تمام اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کے اشعار میں بہت زیادہ دلچسپی اور ان کے کلام میں بڑی شگفتگی پائی جاتی ہے۔ صفی کی مشہور مثنوی تنظیم الحیات ہے۔ جس پر ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد نے پانچ سو روپیہ انعام دیا۔ یہ اکانوی آف ہیومن لائف کا ترجمہ ہے۔ اُن کے کلام کا ایک مجموعہ "لختِ جگر" عرصہ ہوا شائع ہوا تھا۔ بعد میں بھی ایک دوسرا مکمل مجموعہ تین نامور ادیبوں کی کوشش سے چھپا ہے۔

صنعت۔ ان کا نام شیخ کریم الدین تھا۔ مراد آباد (یو۔ پی) کے رہنے والے تھے۔ اور صاحبِ [illegible] کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۷ء میں انتقال ہوا۔

ضیاؔ ۔ میر ضیاء الدین نام ۔ ضیاؔ تخلص ۔ دہلی کے باشندے اور سودا کے ہم عصر تھے ۔ دلی کی طوائف الملوکی سے گھبرا کر فیض آباد چلے گئے ۔ وہاں سے لکھنؤ جا رہے ۔ پھر عظیم آباد پٹنہ میں جا کر زندگی کے دن پورے کیے ۔ یہاں راجہ شتاب رائے رئیس ٹیکا کا لڑکا ان کا مربی اور سرپرست تھا ۔ میر صاحب نہایت تنہا پسند بزرگ تھے ۔ اور اسی حالت میں عمر گزار دی ۔ نہ کسی سے واسطہ رکھا نہ مطلب ۔ ان کو سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے کا شوق تھا ۔ اصناف سخن میں غزل ان کا خاص مضمون ہے ۔ میر حسن انہی کے شاگرد تھے ۔ مجموعہ نظر میں ان کے متعلق یہ رائے ظاہر کی گئی ہے "شاعر خوش گو ۔ شیریں گفتار صاحب اشعار آبدار ۔ سنوہ اطوار ۔ پسندیدہ کردار بود" ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) میں پٹنہ میں وفات پائی ۔

طاہرؔ ۔ سید اطہر علی کے بیٹے ۔ طاہر علی ان کا نام ہے اور فرخ آباد کے رہنے والے ہیں ۔ امداد حسین صغیرؔ کے شاگرد ہیں ۔ ایک دیوان ان سے یادگار ہے ۔ ۱۲۱۲ھ (۱۸۹۷ء) میں مرتب کیا تھا ۔ ۱۸۹۵ء میں مطبع محمدی کانپور میں چھپا (ج ۱) ہر سخن جلد چہارم بحوالہ دیوان طاہر ص ۲۶)

ظفرؔ ۔ بہادر شاہ ظفر مغلیہ خاندان کے سب سے آخری بادشاہ تھے ۔ طبیعت کو شعر و سخن سے لگاؤ تھا ۔ ان کے اکثر اشعار صدا اور اثر میں ڈوبے ہوئے ہیں ۔ بالترتیب شاہ نصیرؔ کا ظلِ حسین بیقرار ۔ محمد ابراہیم ذوقؔ اور مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کے شاگرد رہے ۔ ۱۸۵۷ء میں بغاوت کے جرم میں گرفتار ہو کر رنگون بھیج دیئے گئے جہاں ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو انتقال کیا ۔ شمس العلماء مولانا حالیؔ کی رائے میں "دیوان کی صفائی اور رفعت مرتبہ کی بدولت ظفر کا نام دیوان یکساں ہے" ۔ ان کے چار دیوان ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی مطبع سلطانی قلعہ معلی دہلی سے چھپ کر شائع ہو چکے تھے ۔ جن میں ۳۰ ہزار کے قریب اشعار تھے ۔

ظہیرؔ دہلوی ۔ ظہیر الدین نام اور ظہیرؔ تخلص تھا ۔ دہلی کے رہنے والے اور ذوقؔ کے شاگرد تھے ۔ ان کے والد کا نام سید جلال الدین حیدر تھا جو بہت اعلیٰ درجہ کے خطاط تھے اور دربار شعر و سخن میں بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے ۔ بادشاہ کی درگاہ سے اصلاح الدولہ مرتضیٰ رقم اور خان بہادر کا خطاب ملا تھا ۔ بڑے ہوئے تو یہ بھی قلعہ معلی میں بعہدہ توپ خانی ملازم ہو گئے ۔ ۱۸۵۷ء کی قیامت خیز آندھی میں دہلی سے نکلے اور بھٹکتے سوتی پہنچے ۔ نجیب آباد ہوتے ہوئے بریلی پہنچے ۔ پھر رامپور میں چار برس رہنے کے بعد واپس دہلی چلے آئے ۔ پھر جے پور میں ملازم ہو گئے ۔ ۱۹ برس یہاں ملازمت کی ۔ پھر نواب احمد علی ریاست والی ٹونک کے دربار میں پندرہ سولہ برس تک رہے ۔ آخر عمر میں حیدر آباد جانے کا شوق ہوا ۔ وہاں گئے مگر کوئی قدر دانی نہ ہوئی ۔ اور وہیں ۱۹۱۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا ۔ غزلوں کے چار دیوان ان کی یادگار ہیں ۔

عاجزؔ ۔ ان کا نام عادت الدین خاں اور تخلص عاجزؔ ہے ۔ ان کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے ۔

عزیز لکھنوی ۔نام مرزا محمد ہادی۔ محمد علی کے لڑکے۔ دہلی لکھنؤ اور تخلص عزیز ہے۔ ۵ ربیع الاول ۱۲۷۵ھ مطابق ۴ اکتوبر ۱۸۵۸ء کو پیدا ہوئے۔ معقول و منقول۔ فقہ و اصول۔ صرف و نحو۔ ادبیات و درسیات کی تعلیم لکھنؤ کے مشہور علماء و فضلا سے پائی۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ غزل اور قصیدہ ان کے خاص مضمون ہیں جن میں آپ نے خوب طبع کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔ صفی لکھنوی کے شاگرد تھے۔ گل کدہ و صحیفۂ دلاں ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

عظیم ۔مرزا عظیم بیگ المتخلص بہ عظیم۔ شیخ ظہور الدین حاتم المتوفی ۱۷۸۳ء کے شاگردوں میں سے ایک اور شاعر تھے۔ انشاء اللہ خاں انشا کے ہم عصر تھے۔ اُن کی ہجو میں ایک پُر زور مخمس بھی لکھی ہے۔ یہ اُس عہد کے مشہور غزل گو شاعر ہیں۔ مگر ہر صنف کلام میں کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ اشعار میں نفاست بیان اور لطف زبان دونوں موجود ہیں۔ انشاء کی ہجو بڑی دلچسپ ہے۔ جس کا ایک مصرع تو بطور ضرب المثل اب تک زبان زد خاص و عام ہے یعنی:۔

ع تیری زباں کے آگے نہ دہقاں کا ہل چلے

غالب ۔مرزا اسد اللہ خاں غالب کے نام سے کون واقف نہیں۔ اردو اور فارسی کے مسلم الثبوت شاعر۔ اور دورِ موجودہ کی اُردو شاعری کے امام مانے جاتے ہیں۔ جتنی شاندار ان کی نظم ہوتی ہے اتنی ہی شاندار نثر لکھتے ہیں۔ اُردوئے معلیٰ کی زبان اسی قلم سلیس۔ شیریں۔ اور دلچسپ ہے کہ اُردو میں اس کا کوئی نمونہ اور موجود نہیں۔ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آبا و اجداد کا پیشہ تیغ زنی اور سپہ گری تھا۔ انھوں نے اپنا پیشہ انشا پردازی اور شعر و شاعری بنایا اور ساری عمر اسی شغل میں بسر کردی۔ کم ہی لوگوں کو ایسی بلند شہرت نصیب ہوئی ہوگی جیسی غالب کو۔ شادی دہلی میں ہوئی اس لیے ۱۳ برس کی عمر میں دہلی چلے آئے۔ اور ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو رہے۔ ان کی شاعری کے متعلق مولانا غلام رسول مہر کا صرف ایک فقرہ سن لیجئے۔ فرماتے ہیں "یہ سپہ گری میں اگر غالب بڑی سے بڑی ترقی کرتے تو اپنے چچا کی طرح رسالدار یا اپنے نانا کی طرح کمیدان بن جاتے۔ مگر ادب و شعر میں انھیں وہ پایہ حاصل ہوا جو سلطنت و تاجداری میں افراسیاب۔ طغرل۔ سنجر۔ الپ ارسلان اور ملک شاہ نے حاصل کیا (غالب ص۲۳)

۱۸۵۵ء میں (ذوق کے انتقال کے بعد) بہادر شاہ ظفر کے استاد مقرر ہوئے اور نجم الدولہ۔ دبیر الملک۔ نظام جنگ۔ خطاب ملا۔ جب ۱۸۵۶ء میں بہادر شاہ قید کرکے رنگون بھیج دیئے گئے تو نواب یوسف علی خاں والی رامپور نے ستر روپے ماہوار وظیفہ مقرر کردی جو آخر تک ملتی رہی۔ مگر ہمیشہ تنگدستی اور عسرت میں مبتلا رہے۔ مولانا مہر غالب کے انتقال کی تاریخ ان الفاظ میں کہتے ہیں۔ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء (مطابق ۱۳ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ) کو دو شنبہ کے دن ادب و شعر کا یہ درخشندہ آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا جس کی عالمتابی دور و نزدیک کے لیے سرمایۂ ناز اور قرون آئندہ کے لیے منار ہدایت تھی"۔ اُن کے انتقال کے بعد ان کے دیوان کی جتنی قدر ہوئی اور جیسی عمدگی۔ خوبصورتی اور نفاست کے ساتھ وہ بار بار چھاپا گیا۔ اتنی مقبولیت غالباً اُردو کی کسی اور کتاب کو نصیب نہیں ہوئی۔ ممتاز شاگردوں میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ نواب ضیاء الدین نیر رخشاں۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ۔ [illegible] مرزا قربان علی بیگ سالک۔ منشی ہرگوپال تفتہ۔ اور نواب علاؤ الدین خاں۔

فانی بدایونی۔ شوکت علی خاں نام تھا اور فانی تخلص کرتے تھے۔ ان کے باپ شجاعت علی خاں سب انسپکٹر پولیس بڑے پکے اہلحدیث تھے اور بیٹے کو مولوی بنانا چاہتے تھے۔ مگر اس کی قسمت میں محض شاعر ہونا لکھا تھا۔ فانی بدایوں کے قریب موضع اسلام نگر میں ۱۴ ستمبر ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئے۔ شاعری کا شوق بچپن ہی سے ہو گیا۔ ۱۱ سال کی عمر میں پہلا شعر کہا اور شوکت تخلص رکھا۔ جو آٹھ برس بعد فانی سے بدل لیا۔ گورنمنٹ ہائی سکول بدایوں سے انٹرنس پاس کرنے کے بعد بریلی کالج سے بی۔ اے ہو کر علیگڈھ گئے اور ۱۹۰۳ء میں ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کی۔

کالج سے فارغ ہونے کے بعد بریلی میں وکالت شروع کی مگر وہ شاعری کے سر صدقے ہوئی۔ بریلی سے لکھنؤ لکھنؤ سے شاہ آباد وہاں سے آگرہ گئے مگر کہیں بھی وکالت نہ چلی۔ مگر ہاں شاعری ہر جگہ خوب زوروں پر رہی۔ اور شعراء کا جمگھٹا ہر وقت ارد گرد رہا۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد کے بلاوے پر ۱۹۱۳ء میں حیدرآباد گئے۔ مگر بدقسمتی سے ساتھ ساتھ گئی۔ مہاراجہ نے اگرچہ بہت خاطر مدارات کی اور منصفی کی کوشش کی مگر ملی ایک مکتب کی ہیڈ ماسٹری۔ بہت افسردہ ہوئے مگر کر ہی پڑی۔ تھوڑے دنوں بعد مہاراجہ کا انتقال ہو گیا۔ ملازمت بھی چھوٹ گئی۔ ادھر جوان بیٹی کا انتقال ہو گیا اُدھر بیوی داغ مفارقت دے گئی۔ سخت بیمار اور مضمحل رہنے لگے۔ اور مرنے کے دن گننے لگے۔ آخر ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو بلاوا آ گیا اور ایک بہت ہی خوش گو شاعر دنیا کے مصائب اور آلام بڑی تکلیف کے ساتھ برداشت کرتا ہوا ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

حیدرآباد میں مرزا داغ کی قبر سے کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر درگاہ یوسفین ناپلی کے مشرقی دروازے کے باہر والے چبوترے پر ان کا مزار ہے۔

مفصل حالات اور فوٹو ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کے اخبار آئینہ دہلی میں شائع ہوئے ہیں۔ دیوان فانی، باقیات فانی، مقالات فانی، وجدانیات فانی۔ کلیات فانی۔ ان کے کلام کے مجموعے ہیں جو مختلف اوقات میں شائع ہوئے۔

فدوی، لاہوری۔ فدوی لاہور کے رہنے والے تھے۔ اور ہندو سے برضا و رغبت مسلمان ہوئے تھے۔ صابر علی شاہ صابر ایک صاحب تھے۔ ان کے ہاتھ پر انھوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ اور انھیں سے ان کو شاعری میں تلمذ تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد ضیاء خاں کے منیب ہو گئے تھے۔ "یوسف و زلیخا" فارسی کو انھوں نے ہی اردو نظم کا جامہ پہنایا تھا۔ پچاس سال سے زیادہ کی عمر پا کر ۱۷۹۸ء میں انتقال کیا۔

فراق۔ حکیم ثناء اللہ خاں نام اور فراق تخلص ہے۔ میر درد کے مرید اور شاگرد تھے۔ ہدایت اور سودا سے بھی اصلاح لی ہے۔ مجموعہ نغز میں ان کے متعلق یہ الفاظ درج ہیں موصوف گزیں۔ محبت آئیں۔ مرا مرجیا۔ سربسر وفا۔ شیریں زبان۔ ملاحت بیاں۔ فصاحت قرین بلاغت نگیں۔ جادو طراز سحر پرداز۔ صاحب انداز شریف مالک طرز لطیف" بقول صاحب مرآۃ الشعراء انداز ۱۱۷۴ھ (۱۷۶۰ء) میں پیدا ہوئے اور قریباً ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۰ء) میں انتقال کیا۔

فغاں - اشرف علی نام اور شریف الملک خطاب تھا۔ فغاں تخلص کرتے تھے۔ احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ تھے۔ نہایت حاضر جواب اور لطیفہ گو واقع ہوئے تھے۔ حاضر جوابی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ فنی شعر میں قدر تلاش خاں امیہ کے شاگرد تھے صاحب گلشن ابراہیمی اور مصحفی کو حل قلی ندیم کا شاگرد بتاتے ہیں۔ جب احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو یہ گھبرا کر دلی سے نکلے اور اپنے چچا میر خاں کے پاس مرشد آباد میں چلے گئے۔ کچھ دنوں وہاں رہنے کے بعد لکھنؤ آئے۔ نواب شجاع الدولہ والی اودھ بہت تعظیم و تکریم سے پیش آیا مگر نہایت ہی نازک مزاج تھے۔ ایک ذرا سی بات پر نواب سے ناراض ہو کر مرشد آباد چلے گئے اور وہاں ماہر شناب دسائی کی نوکری کر لی۔ چونکہ نہایت عالی نسب۔ باکمال، شیریں زبان اور علم مجلسی کے پورے ماہر تھے۔ اس لیے راجہ صاحب ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ یہ بھی قدردانی دیکھ کر یہیں رہ پڑے اور بڑی فراغت اور عیش کی زندگی گزار کر ۱۱۸۶ھ (۱۷۷۲ء) میں وفات پائی۔ گلشن بیخار میں ۱۱۹۶ھ (۱۷۸۲ء) لکھا ہے۔ آزاد ان کی شاعری کے متعلق کہتا ہے "فنی شاعری کے اعتبار سے ان کی زبان نہایت با اصول اور برجستہ ہے۔ اور الفاظ کی بندش ان کی مشق سخن پر گواہی دیتی ہے" فنی شعر میں ان کے کمال کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ کہ بقول آزاد "مرزا رفیع جیسے صاحب کمال اکثر ان کے اشعار مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے اور بہت تعریف کیا کرتے تھے"۔

فقیر - میر شمس الدین نام تھا اور فقیر تخلص کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مفتون بھی تخلص کرتے تھے۔ دہلی کے رہنے والے تھے لیکن ۱۱۶۵ھ میں دہلی چھوڑ کر لکھنؤ جا بسے۔ اور وہیں ۱۱۷۶ھ میں دریا میں غرق ہو گئے۔ ایک دیوان اور ایک مثنوی موسوم بہ "تصویر محبت" ان کی تصنیف ہے۔

قائم چاندپوری - ان کا نام کوئی تذکرہ نویس محمد قائم بتاتا ہے۔ کوئی قیام الدین علی اور کوئی قائم الدین۔ مگر صحیح نام محمد قیام الدین ہے۔ والد کا نام محمد ہاشم اور دادا کا محمد اکرم تھا۔ وطن چاندپور (ضلع بجنور۔ یو۔ پی) ہے۔ جوانی میں تلاش معاش چاندپور سے دہلی آ کر شاہی توپ خانہ کے داروغہ ہو گئے۔ یہ شاہ عالم کا زمانہ تھا۔ اور یہیں اپنا تذکرہ "مخزن نکات" لکھنا شروع کیا۔ اسوقت دہلی کی شاعری عروج پر تھی اور میر تقی میر۔ خواجہ میر درد اور سودا جیسے باکمال شعراء یہاں موجود تھے۔ قائم پہلے شاہ ہدایت اللہ ہدایت کے شاگرد ہوئے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مزاج کے نہایت اکھڑ اور تند خو تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں اُستاد سے ایسی بگڑی کہ ان کی ہجو لکھی۔ پھر خواجہ میر درد کے شاگرد ہوئے۔ اُن سے بھی نہ نبھی تو سودا کو کلام دکھانے لگے۔ یہ سلطنت مغلیہ کا دور انحطاط تھا جب کچھ گڑبڑ واقع ہوئی تو قائم دہلی سے نکلے اور کچھ دنوں نواب محمد یار خاں عاجز والی ٹانڈہ کے ہاں ملازمت کر لی۔ جو بڑے علم دوست اور صاحب ذوق بزرگ تھے اور امیر تخلص کرتے تھے۔ ان دونوں معشوقی بھی یہاں ملازم تھے تین ماہ کے بعد یہاں سے رامپور چلے گئے۔ اور فوج میں سپاہی بھرتی ہو گئے۔ یہیں ۱۲۰۶ھ (۱۷۹۲ء) میں وفات پائی۔

مجموعہ نغز میں ہے کہ امروہہ کے قاضی مقرر ہو گئے تھے اور یہیں انتقال کیا۔ نام کی طرح سنہ وفات میں بھی اختلاف ہے۔ کسی تذکرہ میں ۱۲۰۶ھ (۱۷۹۲ء) لکھا ہے۔ کسی میں ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۳ء) اور کسی میں ۱۲۱۰ھ (۱۷۹۵ء)۔ مولوی عبدالحق مقدمہ مخزن نکات میں ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۳ء) کو صحیح بتاتے ہیں۔ قائم کی شاعری کے متعلق آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں "ان کا دیوان ہر گز

یہ نمونے کے طور سے نہیں ہو سکتے۔ مگر کیا کیجئے کہ قبول عام کچھ اور شے ہے شہرت دنیائی۔" مولوی عبدالحق اس پر یہ تبصرہ فرماتے ہیں۔ "اس میں شک نہیں کہ قائم بہت بڑا شاعر ہے مگر اُسے میر و مرزا کا ہم رتبہ کہنا سراسر ناانصافی ہے۔ اُس کا کلام ہر صنف میں موجود ہے۔ غزل، رباعی، قطعہ، مثنوی، قصیدہ، ترکیب بند، تاریخ سب کچھ کہا ہے۔ ہجو کہنے اور فحش بکنے میں اپنے استاد سودا کا ہم پلہ ہے۔ متعدد مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ قصیدوں میں بھی زور پایا جاتا ہے۔"

ان کا تذکرہ شعراء نایاب تھا۔ مولوی عبدالحق نے تلاش کر کے اس پر مقدمہ لکھا اور ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے چھاپ کر شائع کر دیا۔ اس میں قائم سمیت ۱۱۴ اردو شاعروں کا تذکرہ ہے۔ تذکرہ کی زبان فارسی ہے۔ ابتدائی ۲۵ صفحات میں مقدمہ اور قائم کے کلام کا انتخاب ہے۔ پھر ۹۰ صفحات پر اصل تذکرہ ہے۔ قائم کا مختصر مجموعہ کلام مولانا حسرت موہانی نے شائع کیا۔ کلام کا انتخاب صاحب مرقع الشعراء نے بھی دیا ہے۔

قدر۔ مولوی سید غلام حسین ان کا نام تھا۔ سید خلعت علی کے بیٹے اور حضرت امام زین العابدین کی اولاد سے تھے۔ ۱۷۳۳ء میں بمقام ہگلی پیدا ہوئے۔ کچھ بڑی عمر میں بعہد واجد علی شاہ لکھنؤ آئے اور یہیں تعلیم پائی۔ شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ اور اسوقت اس وبا میں قریباً ہر شخص بُری طرح مبتلا تھا۔ انھوں نے پہلے سحر اور برق کی شاگردی اختیار کی۔ جب ان دونوں کا انتقال ہو گیا تو شیخ امداد علی بحر سے اصلاح لینی شروع کی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی چلے آئے اور غالب کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ آخر عمر میں حیدرآباد دکن جا کر نواب کے ملازم ہو گئے تھے۔ کیونکہ ایسے لوگوں کی طبیعت ایسی ہی جگہ ہو سکتی ہے۔ سودا، فن قوافی اور صنائع و بدائع کے استاد تھے۔ ہندی فن عروض کے واقف تھے۔ حاشیا عجاز خسروی آپ ہی کا لکھا ہوا ہے۔ عروض پر بھی ایک کتاب "قواعد العروض" کے نام سے لکھی ہے۔ کلیات بھی شائع ہو چکا ہے۔ ۱۵ ستمبر ۱۸۸۴ء کو انتقال ہوا۔

قدرت۔ ان کا نام شاہ قدرت اللہ تھا۔ اور اپنے نام کی مناسبت سے قدرت تخلص کرتے تھے۔ مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے۔ ۱۸۱۰ء میں انتقال کیا۔

قلق۔ ان کا نام خواجہ ارشد علی اور خطاب آفتاب الدولہ تھا۔ خواجہ بہادر حسین فراق کے فرزند خواجہ وزیر علی وزیر لکھنوی کے شاگرد اور واجد علی شاہ اختر شاہ اودھ کے درباری شاعر اور مصاحب تھے۔ ۱۸۸۰ء میں انتقال کیا۔ "دیوان قلق" اور مثنوی "طلسم الفت" ان کی تصنیفات ہیں۔

کمال۔ شاہ کمال الدین ان کا نام تھا اور کمال تخلص کرتے تھے۔ جرأت اور قائم کے شاگرد تھے۔

کیفی۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ نام اور کیفی تخلص۔ ۱۲ دسمبر ۱۸۸۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد پنڈت کنہیا لال رائے جلد

میں افسر پولیس تھے۔ جی کا انتقال کمپنی کی صغر سنی میں ہو گیا۔ انھوں نے اپنے شوق اور محنت سے علم حاصل کیا۔ دوار حاضرہ کے نہایت اعلیٰ پایہ کے ادیبوں اور شاعروں میں آپ کا شمار ہے۔ نہایت صلح کل اور سرنجان و مرنجاں پالیسی کے مالک اور بیحد خوش اخلاق۔ ملنسار اور بے تعصب بزرگ تھے۔ عربی و فارسی کے فاضل انگریزی زبان کے ماہر اور اردو کے اعلیٰ پائے کے ادیب تھے سنسکرت و ہندی بھی بہت اچھی جانتے تھے۔ تصانیف یہ ہیں۔ عبارت دربن (جو مدرس حالی کی طرز پر ہندوؤں کے لیے لکھی) خطابۂ کیفی۔ پریم تر نگنی۔ شوکت ہند۔ تزک قیصری۔ منشورات۔ کیفیہ۔ آئینہ ہند۔ جگ بیتی۔ خمسہ کیفی۔ مرأت خیال۔ ناگوپر نیس و قال عورت اور۔ اس کی تعلیم۔ چراغ ہدایت۔ پریم دیوی۔ نہتا ماجہ۔ راج دُلاری۔ مراری دادا وغیرہ۔ آپ کا دیوان "وارداتؔ" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ فن شعر میں مولانا حالی سے تلمذ تھا۔ یکم نومبر ۱۹۵۵ء کو دہلی کے قریب قصبہ غازی آباد میں وفات پائی۔

گستاخ۔ کرامت اللہ خاں نام۔ گستاخ تخلص اور رامپور وطن تھا۔ آپ امیر مینائی کے شاگرد ہیں ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔

گویا۔ نواب حسام الدولہ تہور جنگ فقیر محمد خاں گویا مشہور شاعر جوش ملیح آبادی کے جد امجد لکھنؤ کے رہنے والے۔ عربی و فارسی کے جید عالم۔ اور مشہور شاعر تھے۔ نواب اودھ کی سرکار میں رسالداری اور نظامت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ دو ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ فرائض ملازمت کے علاوہ نہایت علم دوست اور خوش طبع بزرگ تھے۔ اہل علم اور شعراء کا ہر وقت اُن کے ہاں جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ ان کا کلام دیوان گویا کے نام سے چھپ چکا ہے مشہور عالم فارسی کتاب "انوار سہیلی" کا سب سے پہلے انھوں نے ہی ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۶ء) میں اردو میں ترجمہ کیا اور بستان حکمت نام رکھا۔ ۱۸۶۶ء (۱۸۵۰ء) میں انتقال کیا۔

مجروح۔ سید اسد حسین مجروح میر حسن نگار کے بیٹے اور دہلی کے نہایت خوش گو شاعروں میں سے تھے۔ غالب کے شاگرد اور ذوق۔ مومن۔ آرزو۔ شیفتہ۔ صہبائی۔ نیر اور حالی کے دوست اور معاصر تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی سے نکلے اور پانی پت چلے گئے۔ پھر مہاراجہ الور نے بلا کر ریاست میں تحصیلداری کا عہدہ دیا۔ مگر وطن کی کشش نے پھر دہلی میں کھینچ بلایا۔ زبان کے لحاظ سے ان کا دیوان اردو لٹریچر کا بہترین نمونہ ہے۔ خیالات کی فراوانی اور تخیل کی بلند پروازی مجروح کی غزلیات کو بقائے دوام بخشتی ہے۔ حالی انھیں کے متعلق کہتے ہیں ؎

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز.....!

● اکتوبر ۱۹۰۰ء کو دہلی میں انتقال کیا اور درگاہ قدم شریف کے زیر فصیل دفن ہوئے۔

محب۔ شیخ ذوالجلال نام اور تخلص محبؔ ہے۔ آباؤ اجداد سرہند کے رہنے والے تھے۔ دہلی آگر شاہ عالم کے دربار

شاعر مقرر ہوئے۔ پھر مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں لکھنؤ چلے گئے۔ یہیں ۱۲۰۷ھ (۱۷۹۲ء) میں انتقال کیا۔ ایک دیوان اور دو ایک مثنوی فارسی ان کی یادگار ہے۔ ان کے ہم عصر شعراء قمر الدین منت۔ شکیبا۔ فراق اور قاسم وغیرہ تھے۔ ان کے متعلق مجموعہ نغز میں یہ رائے لکھی ہے "یہ بسیار پرمشق دیوانے مملو بہ انوار سخن باز دے یادگار زمانہ است"۔

محروم۔ لالہ ملوک چند نام۔ محروم تخلص۔ تحصیل جیسی ضلع گیل کے ایک گاؤں میں ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد مدت تک جیسی خیل اور میانوالی کے سکولوں میں ماسٹر اور ہیڈ ماسٹر رہے۔ ۱۹۴۷ء میں گورڈن کالج راولپنڈی میں پروفیسر ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد دہلی چلے گئے اور پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج دہلی میں لکچرار مقرر ہوئے۔ کچھ دنوں ہفتہ وار تیج کی بھی ادارت کی۔ مگر وطن کی یاد سے مزاج ستاتی رہتے۔ نہایت خوش فکر شاعر ہیں۔ کلام صاف سلیس اور عام فہم ہوتا ہے۔ دیوان چھپ گیا ہے۔ جو الفاظ کی برجستگی۔ بندش کی چستی اور خیالات کی پاکیزگی کا آئینہ دار ہے۔ ان کے کلام کے متعلق اکبر الہ آبادی کی رائے سنئے۔ فرماتے ہیں۔ ؎

ہے داد کا مستحق کلام محروم — لفظوں کا جمال۔ معانی کا ہجوم
ہے ان کا سخن مفید دانش آموز — ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

جمیل احمد ایم۔ اے اپنی کتاب اردو شاعری کی مختصر تاریخ میں ان کے متعلق لکھتے ہیں "ملوک چند محروم اردو کے مایہ ناز شاعر ہیں۔ ان کے یہاں جذبات و حسیات کی فراوانی ہے۔ زبان غایت درجہ شستہ و پاکیزہ ہے۔ حسن الفاظ حسن ادا اور معنی آفرینی محروم کے خاص جوہر ہیں۔ نظم میں وہ اپنا حریف نہیں رکھتے۔ انھوں نے نظموں میں جذبات کی جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے"۔ ان کے اشعار کا پہلا مجموعہ "کلام محروم" کے نام سے ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔ رباعیات محروم۔ نیرنگ معانی اور ہری درشن بھی ان کی تصنیفات میں سے ہیں۔ پاکستان کے ادبی پرچوں میں اکثر اپنا کلام بھیجتے رہتے ہیں۔ فارسی کلام بھی بہت اچھا ہوتا ہے۔

محنت۔ مرزا حسین علی بیگ نام محنت تخلص تھا۔ نیلپورہ (دہلی) کے رہنے والے تھے۔ مگر صفر سنی میں ہی لکھنؤ چلے گئے تھے اور وہیں رہنے لگے تھے۔ فن شعر میں تلندر بخش جرأت کے شاگرد تھے۔

مصحفی۔ نام شیخ غلام ہمدانی تھا۔ اور مصحفی تخلص کرتے تھے۔ شیخ ولی محمد کے بیٹے اور مراد آباد کے باشندے تھے۔ جوانی میں دہلی چلے آئے اور یہاں کے علماء سے علمی استفادہ کیا۔ اس وقت دہلی میں اہل کمال کا مجمع تھا۔ ان کو بھی شعر کہنے کا شوق ہوا۔ اور بالآخر اس میں کمال حاصل کیا۔ شیخ امانی کے شاگرد تھے۔ دہلی سے نکل کر مختلف مقامات پر ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ اور مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم ہو گئے۔ ۱۱۶۳ھ (۱۷۵۱ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ء) میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔ اور آٹھ دیوان یادگار چھوڑے۔ دو تذکرے اردو شعراء کے تذکرہ ہندی (۱۷۹۴ء) اور ریاض الفصحاء (۱۸۲۰ء) اور ایک تذکرہ

فارسی شعراء کا عقد ثریا (۱۸۴۸ء) فارسی میں ترتیب دیا۔ بقول تنہا "لکھنؤ کی شاعری کے باوا آدم ہی بزرگوار ہیں" آتش۔ میر علیخ اور امیر وغیرہ شعراء ان کے شاگرد تھے۔ یہ ایسے اعلیٰ پایہ کے استاد تھے کہ اپنے شاگردوں کو بھی استاد بنا دیا۔ چنانچہ ضمیر کے شاگرد دبیر اور خلیق کے شاگرد انیس تھے۔ صاحب مرأۃ الشعراء نے مصفی کے کلام پر یہ دلچسپ تبصرہ کیا۔ "مصفی کا کلام ہر قسم کا ہے۔ پُرجوش بھی اور پردرد بھی۔ شیریں بھی ہے اور پرکیف بھی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ پھیکا بھی ہے اور بے لطف بھی۔ پھس پھسا بھی ہے اور کرکرا بھی۔ بندشیں چست بھی ہیں اور سست بھی۔ مضمون آفرینی کم ہے اور قافیہ پیمائی زیادہ۔ عشق و عاشقی معمولی ہے اور سادگی بہت ہے تصوف بالکل نہیں۔"

مضطر۔ ان کا نام سید افتخار حسین تھا اور امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ وطن خیرآباد تھا ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۶ء میں انتقال کیا۔

مظہر جانِ جاناں۔ مرزا جانِ جاں یا جانِ جاناں نام مظہر تخلص۔ نہایت صحیح النسب سید اور بڑے عالی مرتبت بزرگ تھے۔ والد بیجاپور کے ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ باپ مرزا جاں المخلص بہ جانی شہنشاہ اورنگ زیب کے دربار میں صاحب منصب تھے۔ دادا بھی دربار شاہی کے معزز عہدہ دار تھے۔ پردادا سے شہنشاہ جلال الدین اکبر کی دختر منسوب تھی۔ جب اورنگ زیب دکن میں تھا، اُس وقت ان کے والد شہنشاہ سے خصومت ہو کر دہلی کو چلے تو راستہ میں بمقام کالا باغ (مالوہ) ۲۰ فروری ۱۶۶۱ء کو یہ پیدا ہوئے۔ باپ نے شمس الدین نام رکھا۔ لیکن شہنشاہ نے سنا تو فرمایا بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے تو بیٹے کا نام جانِ جاناں ہونا چاہئے۔ آخر باپ کے رکھے ہوئے نام کو کوئی جانتا ہی نہیں۔ شہنشاہ کا رکھا ہوا نام زبان زد خاص و عام ہے ان کے والد مرزا جان بھی شاعر تھے اور جانی تخلص کرتے تھے۔ مظہر ۶ برس کے تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ یہ جوان ہوئے تو صوفیت اور فقیری کو شاہی مصاحبت پر ترجیح دی۔ اور صوفیائے کرام کی صحبت اختیار کی۔ شیخ محمد افضل سیالکوٹی سے حدیث پڑھی۔ غرض بھرے میلے ہی دنوں میں صوفی باصفا اور درویش کامل بن گئے۔ یہاں تک کہ سینکڑوں ہندو مسلمان آپ کے مرید ہو گئے۔ بشرو شاعری کا شروع سے ذوق تھا۔ مظہر تخلص اختیار کیا۔ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں کہ "آپ کا کلام زبان اردو کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ آپ نے نہ صرف زبان کو ثقیل الفاظ سے پاک کیا بلکہ اس میں نئی نئی ترکیبیں بھی ایجاد کیں۔ آپ کا کلام نظم و نثر دونوں میں نہایت سادہ سلیس اور فصیح ہوتا ہے اور جذبات و تاثر کے ساتھ تصوف سے بھی مالا مال ہے۔"

میر تقی میر اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر ان الفاظ سے کرتے ہیں "مردِ سید۔ مقدس۔ مطہر۔ درویش۔ عالم۔ صاحب کمال شہرۂ عالم۔ بے نظیر۔ معزز کرم اکثر اوقات دریادِ الٰہی صرف رہے کند۔" ان کے پاک باطن بزرگ اور باکمال صوفی ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ قاضی ثناء اللہ محدث پانی پتی جیسا فاضل اجل انسان ان کا مرید تھا اور انہی کے نام پر انھوں نے اپنی مشہور عالم اور بے نظیر تفسیر لکھی ہے۔ جو تفسیر مظہری کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی تاریخ وفات بہت سے مصنفین نے مختلف لکھی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ ۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ (مطابق ۶ جنوری ۱۷۸۱ء) کو ان کا انتقال ہوا۔ بعض شاگردوں کے نام یہ ہیں۔ انعام اللہ خلف یقین۔

لوہ ان حال بیدار۔ میر باقر حزیں۔ احسن اللہ خاں بیان۔ میر تقی خاں حسرت۔ شاہ قدرت اللہ قدرت۔ مصطفےٰ خاں یک رنگ۔ محمد تقیہ درد مند

معروف۔ نواب مرزا الٰہی بخش خان نام۔ معروف تخلص۔ والی فیروز پور جھرکہ و رئیس لوہارو اور فخر الدولہ والملک نواب احمد بخش خاں رستم جنگ کے چھوٹے بھائی تھے۔ نہایت عابد، زاہد اور پرہیزگار شخص گزرے ہیں۔ فن شعر میں شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ بعد میں ذوق سے اصلاح لینے لگے تھے۔ ان کی بیوی امراؤ بیگم کی شادی مرزا اسد اللہ خاں غالب سے ہوئی تھی۔ معروف نے ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۶ء میں وفات پائی۔ اور درگاہ نظام الدین دہلی میں دفن ہوئے۔ دیوان چھپ گیا ہے۔

مقتول۔ مرزا ابراہیم بیگ نام اور مقتول تخلص تھا۔ مصحفی کے شاگرد تھے۔

منت۔ میر قمر الدین نام۔ منت تخلص۔ سونی پت (نزد پانی پت) کے رہنے والے تھے۔ دلی میں تعلیم و تربیت پائی۔ تمام درسی کتابیں حضرت شاہ عبد العزیز سے پڑھیں۔ فارسی میں میر شمس الدین کے اور اردو میں شیخ ضیاء الدین کے شاگرد رہے۔ دونوں زبانوں میں بہت اچھے شعر کہتے تھے۔ آصف جاہ ثانی والی دکن کے زمانہ میں حیدرآباد گئے اور نواب کی مدح میں قصیدہ کہے پر دس ہزار نقد ملا اور دو سو ماہوار پر وظیفہ مقرر ہوا۔ کلکتہ میں ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء میں انتقال ہوا۔ ایک دیوان اور چند مثنویاں اور کاتان کے جواب میں ایک کتاب شکرستان ان کی یادگار ہیں۔ میر نظام الدین ممنون مشہور شاعر انہی کے فرزند ہیں۔

ممنون۔ میر نظام الدین ابن میر قمر الدین نام۔ ممنون تخلص۔ وطن سونی پت جو پانی پت اور دہلی کے درمیان ایک قدیم قصبہ ہے۔ تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں صدر الصدور کے عہدہ پر فائز تھے۔ پنشن کے بعد دہلی میں سکونت اختیار کی۔ صاحب گل رعنا ان کے متعلق لکھتے ہیں: "ان کی زبان صاف و شیریں ہے۔ جس میں جا بجا محاوروں کی چاشنی موجود ہے۔ جس کے باعث کلام اور بھی مزیدار ہو جاتا ہے۔ پامال اور فرسودہ مضامین کو بھی اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ اُن میں ایک لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ بقول صاحب مراۃ الشعراء "سنہ ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) میں ایک ضخیم دیوان چھپوا کر راہی ملک بقا ہوئے۔" شیفتہ جیسا نقاد سخن ان کے متعلق کہتا ہے: "طرز گفتار ش خیلے دلچسپ و دل نشیں است و ملاحت کلامش نہایت عذب و شیریں۔"

منتظر۔ میاں نور الاسلام ان کا نام تھا اور منتظر تخلص کرتے تھے۔ مصحفی کے شاگرد تھے۔

منیر۔ ان کا نام سید محمد اسماعیل حسینی تھا۔ شکوہ آباد (ضلع مین پوری) کے رہنے والے تھے۔ منیر تخلص کرتے تھے۔

اور ۱۸۱۵ء میں پیدا ہوئے۔ فن شعر میں پہلے ناسخ کے شاگرد ہوئے۔ پھر شک سے اصلاح لی۔ غزل اور قصیدہ ان کے خاص مضمون ہیں۔ جس میں انھوں نے بلیغت کی خوب خوب جولانیاں دکھائی ہیں۔ طویل گوئی ان کی خصوصیت ہے اور کلام میں مبالغہ کی انتہا نہیں۔ مرثیہ بھی کہتے تھے جس میں وہ دبیر کے شاگرد ہیں۔ اُن کی غزلوں میں لکھنویت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ لکھنؤ سے اُن کو عشق بھی بہت تھا۔ کانپور میں نواب نظام الدولہ کے مصاحب رہے۔ اور لکھنؤ میں ظفر الدولہ کے۔ فرخ آباد میں نواب تجمل حسین خاں کے۔ بانده میں والی ریاست نواب علی بہادر اور آخر میں نواب کلب علی خاں والی رامپور کے ہاں ملازم رہے جہاں ۱۸۸۱ء میں وفات پائی۔ ایک طوائف کے قتل کے سلسلے میں کالے پانی کی سزا بھی ہوئی تھی۔۔۔ مگر پھر رہائی مل گئی تھی۔ منتخبات عالم تذکیر الاشعار اور نظم منیر ان کے تین مجموعہ کلام ہیں۔ معراج المعانی میں ایک مثنوی بھی لکھی تھی۔

مومن ۔ دہلی کے رہنے والے اور حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے۔ جب پیدا ہوئے تو حضرت شاہ عبد العزیز نے اُن کے کان میں اذان دی اور مومن خاں نام رکھا۔ عربی ادب میں حضرت شاہ عبد القادر کے اور طب میں اپنے والد اور چچا کے شاگرد ہیں۔ شاعری میں شاہ نصیر سے شرف تلمذ ہے۔ حافظ نہایت عمدہ تھا حضرت شاہ عبد العزیز کا وعظ سنتے تو سنا دیتے۔ شاعری کے علاوہ نجوم سے بھی شوق تھا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ نجوم میں ایسا ملکہ پیدا کیا تھا کہ احکام سُن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے۔ شطرنج کا بھی نہایت شوق تھا۔ بقول مولانا حالی شعر و سخن سے طبعی مناسبت تھی اور عاشقانہ مزاجی نے اسے اور بھی چمکا دیا تھا۔ رنگین مزاج۔ رنگین طبع۔ خوش وضع اور خوش لباس تھے۔ ساری عمر کسی کی تعریف میں قصیدہ نہیں کہا۔ ہاں اس قدر تھے کہ کسی عزیز یا دوست کا ادنیٰ احسان بھی کبھی گوارا نہیں کیا۔ ان کی تہ بہ کہیں جو وہ مختلف اوقات میں کہتے تھے۔ بالعموم نہایت دلچسپ اور پُر لطف ہوتی تھیں۔ ان میں سے چند آب حیات میں درج ہیں۔ اُن کے کلام کے متعلق آزاد کی رائے ہے کہ "غزلوں میں، اُن کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں۔ استعارہ اور تشبیہ کے زور سے انھیں اور بھی اعلیٰ درجہ پر پہنچا دیا ہے۔ قصائد اپنے درجہ میں عالی رتبہ رکھتے ہیں۔ مثنویاں نہایت درد انگیز ہیں۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ ان کے بھتیجے بھائی نواب محمد اکبر خاں۔ میر حسین تسکین۔ سید غلام علی وحشت۔ غلام ضامن کرم۔ میر عبد الرحمٰن اسی۔ حکیم منور علی آشفتہ۔ نواب اصغر علی خاں نسیم اور شہزادہ خواجہ بخش قیصر ان کے شاگرد تھے۔ ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) میں وفات پائی۔

آب حیات کی تدوین کے وقت مومن کے حالات آزاد کو کہیں نہیں ملتے تھے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے ان کی درخواست پر مومن کے مفصل حالات لکھ کر بھیجے جو آزاد نے آب حیات کے دوسرے ایڈیشن میں شائع کیے مگر وسعتِ قلب کو دیکھیے، مولانا کا نام بالکل نہ لکھا۔ صرف یہ فقرہ تحریر کیا کہ "ایک صاحب کے الطاف و کرم کا شکر گزار ہوں جنھوں نے یہ حالات لکھ کر عنایت فرمائے" اگرچہ لفظ الطاف سے مولانا حالی کے نام الطاف حسین کی طرف اشارہ کر دیا۔ جس سے سمجھنے والے سمجھ گئے۔ مگر صاف نام نہ لیا۔

مہر ۔ احاتر علی بیگ نام اور مہر تخلص ہے۔ ۱۸۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کی قیامت کے وقت وفاداری سرکار کے صلہ میں خلعت اور دو گاؤں جاگیر میں ملے جن کی آمدنی سے بقیہ عمر عیش سے گزاری۔ اس سے پہلے پانی کورٹ میں وکیل تھے۔ چودہ برس کی عمر سے شعر کہنے شروع کیے۔ نہایت پُرگو شاعر تھے۔ تاریخ کہنے کا خاص ملکہ تھا۔ کلام میں سلاست اور روانی ہے۔ زبان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ آگرہ میں آنریری مجسٹریٹ تھے۔ ۱۸۹۹ء میں انتقال ہوا۔

دیوان مہر۔ پیرایہ عوض۔ باغ و فرنگستان۔ مثنوی داغ نگار۔ داغ دل مہر مثنوی شعاع مہر تصانیف ہیں۔

میر۔ غزل کے شعراء کے مرتاج ہیں۔ نام محمد تقی۔ تخلص میر۔ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ کلام سادہ دلاویز اور درد و اثر سے لبریز ہوتا ہے۔ ہر مصنف شعر میں میر کی جولانی دکھائی دیتی ہے۔ تمام استادان فن ان کی استادی کے قائل ہیں۔ غالب کہتا ہے ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

ذوق بھی ان کو مانتے ہیں ؎

ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا
ہو ا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب

حالی کہتے ؎

حالی فن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

حسرت موہانی فرماتے ہیں ؎

شعر میرے بھی ہیں پُر درد و لیکن حسرت
میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

ان کو اپنی استادی پر خود بھی فخر تھا۔ کہتے ہیں اور کس زور سے کہتے ہیں۔ ؎

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

نہایت نازک مزاج۔ عزلہ دار۔ خود پسند اور بے حد قانع اور متوکل شخص تھے۔ آپ بیتی میں آزاد نے ان کی عجیب عجیب حکایتیں سپرد قلم کی ہیں۔ بچپن میں یتیم ہو گئے اور اپنے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کے پاس دہلی میں چلے آئے۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ جوان ہوئے تو نواب آصف الدولہ کے بلانے پر لکھنؤ چلے گئے۔ اور وہیں ستاسی برس کی عمر پا کر ۱۸۱۰ء میں انتقال کیا۔ چھ دیوانی غزلوں کے یادگار چھوڑے۔ دو دو اسوخت اور کئی مخمس بھی لکھے۔ مثنویوں کے نام یہ ہیں۔ شعلۂ عشق۔ دریائے عشق۔ اعجاز عشق۔ خواب و خیال۔ معاملات عشق۔ شکار نامہ۔ اژدر نامہ۔ اردو شعراء کا ایک تذکرہ معروف بہ نکات الشعراء کے مصنف بھی ہیں۔

مرزا رفیع سودا۔ خواجہ میر درد۔ مرزا مظہر جان جاناں۔ قائم۔ یقین۔ مصحفی۔ جرأت اور انشاء کے ہم عصر تھے۔

ان کے فرزند میر عسکری عرف میر کلو بھی صاحب دیوان شاعر تھے عزیز تخلص کرتے اور لکھنؤ میں رہتے تھے۔

ناسخ ۔ شیخ امام بخش نام ناسخ تخلص۔ آبائی وطن لاہور۔ پیدائش فیض آباد اور شاعری کا میدان لکھنؤ ہے۔ انشا، مصحفی وغیرہ کے ہم عصر ہیں۔ فن شعر میں کسی کے شاگرد نہیں۔ مگر شعر میں وہ نام پیدا کیا کہ بعض مشہور شاعران کے شاگرد ہیں مثلاً خواجہ وزیر۔ مرزا محمد رضا خاں برق۔ والاجاہ میر علی اوسط رشک۔ شیخ امداد علی بحر۔ منیر شکوہ آبادی۔ آغا کلب حسین خاں نادر۔ ورزش اور ریاضت کا بے حد شوق تھا۔ انتہا یہ ہے کہ ۱۲۹۷ ڈنٹر روز پیلا کرتے تھے۔ جیسے تنومند اور طاقتور تھے۔ ایسی ہی خوراک بھی تھی۔ کھانا اگرچہ ایک وقت کھاتے مگر وہ پانچ سیر سے کم نہ ہوتا۔ آم کھانے بیٹھتے تو بیس چار ٹوکرے ہضم کر جاتے جامنیں آتیں تو پانچ چھ سیر سے کم نہ کھاتے۔ غرض نہایت پُرخور تھے۔ مگر کھاتے عموماً تخلیہ میں تھے۔ حقہ کے عشق تھا۔ اور سینکڑوں طرح طرح کے حقے جمع کر رکھے تھے۔ جی سے ایک کوٹھڑی بھری ہوئی تھی۔ نہایت درجہ مستغنی المزاج بے پروا۔ اور عالی دماغ شخص تھے۔ لگی لپٹی بالکل نہ رکھتے اور جو بات ناگوار طبع ہوتی فوراً منہ پر کہہ دیتے تھے۔ خواہ مخاطب کو کتنی ہی ناگوار گزرے۔ سیاحی کا بھی شوق تھا۔ اس سلسلہ میں الہ آباد۔ بنارس عظیم آباد۔ پٹنہ کی سیر کی۔ دیوان تین ہیں مگران میں دو مشہور ہیں۔ ایک شنوی بھی لکھی جو حدیث مفصل کا ترجمہ ہے۔ نظم سراج نام ہے۔ تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ اُن کی غزل کے متعلق آزاد کی رائے ہے کہ "اس میں شوخت الفاظ۔ بلند پروازی اور نازک خیالی تو بہت ہے مگر تاثیر کم ہے۔" مزاج کے متعلق آزاد کہتے ہیں کہ "بہت خوش اخلاق تھے۔ مگر اپنے خیالات میں ایسے محو رہتے تھے کہ ناواقف شخص خشک مزاج اور بد دماغ سمجھتا تھا۔" مگر اس میں شبہ نہیں کہ نہایت درجہ نازک مزاج واقع ہوئے تھے۔ ان کی نازک مزاجی کے بعض بہت دلچسپ لطیفے آب حیات میں مرقوم ہیں۔ قریباً سو سال کی عمر پائی اور ۱۸۳۶ء میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔

ناطق لکھنوی ۔ ان صاحب کا نام سعید احمد ہے۔ اور ۱۸۷۵ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اس سے زیادہ اُن کے حالات نہیں ملے۔

نائم ۔ نواب یوسف علی خاں والی رامپور اپنے باپ کے بعد ۱۸۵۴ء میں تخت پر بیٹھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں انگریزوں کا ساتھ دیا جس کے صلہ میں ستارہ ہند کا خطاب اور ایک لاکھ روپیہ کی جاگیر ملی۔ فن شعر میں غالب کے شاگرد تھے۔ اور نائم تخلص کرتے تھے۔ منطق اور فلسفے کے بھی خوب ماہر تھے۔ ۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء کو انتقال ہو گیا۔

نثار ۔ میاں محمد امان نام اور نثار تخلص تھا۔ شیخ ظہور الدین حاتم کے شاگرد تھے۔ وطن دہلی تھا۔ مگر لکھنؤ چلے گئے تھے وہاں شاعروں سے خوب خوب چوٹیں ہوتی تھیں۔ سودا۔ درد اور قائم کے ہم عصر تھے۔

نُدرت میرٹھی ۔ شعیب احمد نام۔ نُدرت تخلص۔ مولانا احمد حسین شوکت (مجدد السنہ شرقیہ) کے لڑکے ہیں ۱۸۶۶ء میں بمقام میرٹھ پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی کی تعلیم شروع میں تو اپنے والد سے پائی۔ پھر اس کی تکمیل مختلف اساتذہ سے کی تعلیم سے

فراغت کے بعد اپنے والد کے اخبار شحنۂ ہند کے سب ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۰۰ء میں خود ایک ادبی رسالہ عندلیب نکالا۔ پھر ناصر الاخبار کی ادارت کی اور مختلف اخبارات میں نظمیں اور مضامین لکھتے رہے۔ ۱۹۱۲ء میں میرٹھ سے نظارہ جاری کیا اور پھر ۱۹۲۳ء سے آئینہ نکالا۔ آخر عمر میں ہم بیٹے اور ایک بیٹی کا اپنے سامنے انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے نہایت دل شکستہ اور غمگین و مہجور رہنے لگے۔ کلام میں شستگی، روانی اور سلاست ہے۔ خونناب دل ان کے کلام کا مجموعہ ہے۔

نسیم بھرت پوری۔ نام سید شبیر حسین (ایک تذکرہ میں شبیر حسین لکھا ہے) اور تخلص نسیم ہے۔ ریاست بھرت پور کے رہنے والے اور داغ کے شاگرد تھے۔ استاد کو ان کی شاگردی پر فخر تھا۔ اور اکثر اپنے پاس حیدر آباد بلوایا کرتے تھے۔ فن گو شعراء میں بڑا نام پیدا کیا اور اکثر معرکتہ الآرا طرحوں پر بڑے زور کی غزلیں لکھیں۔ ریاست کے محکمہ پولس میں ملازم تھے۔ ۱۸۷۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۶ء میں انتقال کیا۔ ۵۲ برس کی عمر پائی۔

نسیم دہلوی۔ نواب مرزا اصغر علی خاں نام۔ نواب آغا علی خاں قاچار کے پوتے۔ نسیم تخلص۔ وطن دہلی تھا۔ ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ فن شعر میں حکیم مومن خاں کے شاگرد ہیں۔ خانگی جھگڑوں کے باعث دلی چھوڑ کر لکھنؤ کی راہ لی۔ کچھ دنوں واجد علی شاہ کے دربار میں رہے۔ لیکن جب وہ معزول ہو کر کلکتہ گئے تو یہ لکھنؤ ہی رہے۔ بعد کے زمانہ میں نسبتی نواب کلب علی خاں کو اپنے مطبع میں نوکر رکھ لیا اور الف لیلہ کو منظوم کرنے کی خدمت ان کے سپرد کی۔ مقدمہ ابھی تمام ہوا تھا کہ پیغام اجل آ گیا۔ اور ۱۲ رمضان ۱۲۸۲ھ (۳۰ جنوری ۱۸۶۶ء) کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

بے پروائی اور آزاد روی کے باعث کبھی اپنا کلام جمع نہیں کیا۔ دیوان شاگردوں کا مرتب کیا ہوا ہے۔ حسرت موہانی نے انتخاب ۱۰۰ اشعار کا چھاپا تھا۔ آپ کے کلام میں تشبیہات و استعارات اور فارسی تراکیب بھی ہیں۔ کلام میں بالعموم شیرینی اور حلاوت ہے۔ غزل آپ کا خاص معنون ہے۔ حسرت موہانی کی ان کے کلام کے متعلق یہ رائے ہے کہ "لکھنؤ کی زبان اور دہلی کے بیان کی پسندیدہ اور معتدل ترکیب کا جیسا مرزا نسیم کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ اس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتی۔"

نسیم لکھنوی۔ پنڈت دیا شنکر نام۔ پنڈت گنگا پرشاد کول کے بیٹے۔ نسیم تخلص۔ وطن لکھنؤ۔ سال پیدائش ۱۸۱۱ء۔ ایک معزز کشمیری خاندان کے فرد اور شاہ اودھ کی فوج میں بخشی گری کے عہدہ پر تعینات تھے۔ بچپن ہی سے شاعری کا شوق ہوا۔ بیس سال کی عمر میں خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد ہوئے۔ نہایت طباع۔ ذہین اور حاضر جواب تھے۔ اور بڑی رعایت کے ساتھ اشعار اُن کے دماغ سے نکلا کرتے تھے۔ لکھنؤ کے اکثر اساتذہ سے فیض حاصل کیا اور فن شعر میں جلد تر نہایت نامور ہو گئے۔ ۵۰ برس کی عمر میں قصۂ گل بکاولی کو نظم کیا اور مثنوی گلزار نسیم نام رکھا۔ یہ میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے مقابلہ میں لکھی گئی تھی۔ یہی لاجواب اور دلچسپ مثنوی نسیم کی لازوال شہرت کا باعث ہوئی۔ اس مثنوی پر پہلے اودھ پنچ میں موافق و مخالف بہت

سے مضامین شائع ہوئے اور زمانی بعد ۱۹۰۵ء میں برج نارائن چکبست اور مولانا عبدالحلیم شرر میں بڑے زور شور کی قلمی جنگ ہوئی جس کی روداد کتاب معرکۂ چکبست و شرر میں مفصل مذکور ہے۔ نسیم نے یہیں جوانی ہی بعمر ۳۲ سال ۱۹۲۳ء میں انتقال کیا۔ یعنی یہ پھول ابھی کھلا بھی نہ تھا کہ مرجھا گیا۔

ان کی تصنیف گلزار نسیم کے متعلق رام بابو سکسینہ اپنی مشہور تالیف تاریخ ادب اردو میں لکھتے ہیں "اس کا ایجاز۔ روانی۔ مناسبت الفاظ برجستگی محاورات۔ نادر تشبیہات و استعارات یہ سب قابل تعریف ہیں البتہ تصنع ضرور ہے۔۔۔۔ یہ مثنوی اسقدر مقبول ہوئی کہ اس کے بہت سے اشعار بطور ضرب المثل زبان پر چڑھ گئے ہیں۔ اس سے پنڈت دیا شنکر نسیم کا نام ہمیشہ کے لیے روشن ہے اور وہ اردو کے ایک مایہ ناز شاعر کہلائے جانے کے قرار واقعی مستحق ہیں" (تاریخ ادب اردو صفحہ ۴۵)

شاہ نصیر الدین نصیر۔ شاہ نصیر الدین نام۔ نصیر تخلص۔ دہلی کے رہنے والے۔ فن شعر میں شاہ محمدی ماہلی کے شاگرد تھے۔ دو مرتبہ لکھنؤ گئے۔ حیدرآباد بھی کئی مرتبہ گئے اور آخر ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء) میں وہیں وفات پائی۔ نہایت نیک نفس۔ نفیس طبع۔ لطیف مزاج۔ باوضع اور خوش پوشاک تھے۔ یار باش۔ ظرافت اور زندہ دلی کا گویا مجسمہ تھے۔ ان کا کلیات میرٹھ میں چھپا تھا لیکن آج کل نہیں ملتا۔ ان کی شاعری کا درجہ اس بات سے سمجھ لو کہ ذوق اور مومن ان کے شاگرد تھے۔

نظام۔ سید نظام علی شاہ ان کا نام تھا اور نظام تخلص۔ رامپور کے سیدوں میں سے تھے فن شعر میں پہلے شیخ علی بخش بیمار سے اصلاح لی پھر نواب یوسف علی خاں ناظم والی رامپور کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ ۲۸ اکتوبر ۱۸۶۲ء کو رامپور ہی میں انتقال ہوا۔ دیوان مرنے کے بعد رامپور میں چھپا۔

نظم طباطبائی۔ سید علی حیدر نظم طباطبائی لکھنؤ میں ۲۹ نومبر ۱۸۵۲ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید مصطفےٰ حسین طباطبائی تھا جو ایک سپاہی آدمی تھے۔ جب پڑھ لکھ کر قابل ہوئے تو معزول شاہ اودھ واجد علی شاہ کے پاس مٹیا برج کلکتہ میں شاہزادوں کو پڑھانے پر ملازم ہو گئے۔ جب وہ میلہ بچھڑ گیا تو حیدرآباد دکن جا کر نظام کالج کے پروفیسر ہو گئے۔ پھر کتب خانہ آصفیہ کے معتمد بنا دیے گئے۔ مگر پھر واپس کالج میں چلے گئے۔ جب ۳۰ سال کی ملازمت کے بعد ریٹائر ہوئے تو شاہزادوں کی تربیت کا کام ان کے سپرد ہوا۔ دارالترجمہ عثمانیہ میں نادر ادب کی خدمات بھی انجام دیں۔ پھر زنانہ کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ ۲۲ مئی ۱۹۳۳ء کو وہیں انتقال ہوا۔ آپ اخلاق و آداب میں پرانے بزرگوں کی ایک مثال تھے۔ آپ کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ مولوی عبدالحلیم شرر اور مہاراجہ کشن پرشاد وزیر اعظم حیدرآباد بھی آپ ہی کے شاگرد تھے۔ شرح دیوان غالب۔ شرح دیوان امراء القیس۔ تشریح الافلاک اور تاریخ یورپ آپ کی تصنیفات ہیں۔ نظم طباطبائی اور دیوان طباطبائی ان کی نظموں کے مجموعے ہیں۔

نظر لکھنوی۔ نوبت رائے نام نظر تخلص۔ وطن لکھنؤ۔ کائستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ پیدائش ۱۸۶۶ء کی ہے۔ فارسی اردو۔ انگریزی اچھی جانتے تھے۔ شاعری کا شوق شروع ہی سے تھا۔ آغا مظہر کے شاگرد ہیں۔ ۱۸۹۷ء میں لکھنؤ سے رسالہ خدنگ نظر جاری کیا۔ چوسات سال تک جاری رہا۔ ۱۹۰۵ء میں رسالہ زمانہ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ لیکن ۱۹۱۱ء میں استعفیٰ دے دیا۔ اور کان پور آکر اخبار آزاد کی ایڈیٹری سنبھال لی۔ زاں بعد لکھنؤ جاکر "تفریح" کی ادارت کی۔ پھر اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہو گئے۔ لیکن خرابی صحت کی بنا پر دنیا سے بھی قطع تعلق کر لیا۔ آخر میں اخبار خادم ہند کے بھی کچھ مدت ایڈیٹر رہے۔ نہایت سادہ مزاج۔ سادہ وضع اور خوش اخلاق شخص تھے۔ تودد و نمائش اور غرور و تکبر سے بالکل پاک تھے۔ اعلیٰ پایہ کے مضمون نگار ہونے کے علاوہ خوشنویس اور مصور بھی تھے۔ آخری عمر بہت تفکرات اور مصائب میں گذری۔ یہاں تک کہ زندگی سے تنگ آ گئے۔ اسی حالت میں ۱۰ اپریل ۱۹۲۳ء کو انتقال کیا۔

ان کے متعلق منشی دیانرائن نگم ایڈیٹر زمانہ کی رائے سننے کے قابل ہے فطرت سے انھوں نے علم و ادب کے لیے نہایت موزوں طبیعت پائی تھی۔ قدرت نے انھیں نہایت شستہ و سنجیدہ ذوق سخن عطا کیا تھا۔ بچپن میں اُن کو صحبت بہت اچھی ملی جس سے طبیعت میں رفعت۔ مزاج میں متانت اور عادت میں سنجیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ ذہن بلا کا تھا۔ معیار خیال بہت اونچا اور مطمح نظر نہایت بلند تھا۔"

نظیر اکبرآبادی۔ ولی محمد نام۔ محمد فاروق کے بیٹے اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ نظیر تخلص تھا۔ ۱۷۳۵ء (۱۱۴۸ھ) میں پیدا ہوئے۔ ۲۶ برس کے تھے کہ احمد شاہ ابدالی نے دہلی پر حملہ کیا۔ اس موقع پر یہ دہلی سے نکلے اور اکبرآباد (آگرہ) چلے گئے۔ اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ اردو کلیات خاصا ضخیم ہے۔ فارسی میں ۹ کتابیں لکھیں۔ سید زوار حسین صاحب نے ۱۹۵۲ء میں لاہور سے اردو شاعروں کا ایک اہم نہایت ہی نفاست کے ساتھ آرٹ پیپر پر شائع کیا تھا۔ جس میں تصاویر کے ساتھ ہر شاعر کے مختصر حالات بھی ہیں۔ نظیر اکبرآبادی کے متعلق لکھتے ہیں۔

"نظیر ایک نغز گو اور بذلہ سنج شاعر تھے۔ فن شعر میں کسی کے مقلد نہ تھے۔ بلکہ خود ہی اپنے رنگ کے موجد تھے۔ اُن کا موضوع انسان اور اس کی معاشرت ہے۔ انسانی ہمدردی۔ جزئیات کا مطالعہ اور ہمہ گیر تخیل ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ زبان پر جدت۔ معاشرتی حالات پر عبور۔ فطرت کی رمز شناسی۔ مناظر قدرت کی مصوری۔ مختلف فنون کا وقوف۔ سیاسی بصیرت۔ رفتار زمانہ سے دلچسپی۔ اختراع۔ الفاظ کا سلیقہ۔ ظرافت۔ سوز و گداز اور ترنم۔ غرض نظیر میں شاعری کے سارے لوازم اور محاسن موجود ہیں۔ نظیر نے اردو زبان میں نئی بندشوں اور جدید ترکیبوں کا اضافہ کیا۔ اردو شاعری میں نیچرل شاعری کا پیوند سب سے پہلے انھوں نے لگایا۔ نظیر نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ زندگی کا کوئی پہلو۔ اور معیشت و معاشرت کا کوئی انداز۔ احساسات و تاثرات کا کوئی منظر ایسا نہیں جو کلیات نظیر میں نہ ملتا ہو۔" ۱۲۴۶ھ ۱۸۳۰ء میں آگرہ میں انتقال کیا۔

نوا۔ ان کا نام شیخ ظہور اللہ تھا اور نوا تخلص کرتے تھے۔ بدایوں کے رہنے والے اور وہاں کے صدیقی خاندان

سے تعلق رکھتے تھے۔ بدایوں سے لکھنؤ جاکر شاہ اودھ کے ہاں نوکر ہوگئے اور "خاں" کا خطاب پایا۔ کچھ دنوں بعد وہاں سے ایران گئے اور بہت دنوں تک وہاں رہ کر عوام وخاص کے دلوں پر اپنے علم وفضل کا سکہ جمایا۔ پھر واپس لکھنؤ چلے آئے اور یہیں ۱۸۳۶ء میں انتقال کیا۔

نوح ناروی - ہندوستان کے غزل گو شعراء میں نہایت مشہور شاعر ہیں۔ داغ کے ارشد تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ خود ۴۰ سے زیادہ شاہوں کے اُستاد ہیں۔ کلام میں سلاست اور روانی ہے۔ ساری عمر حسن وعشق اور ہجر ووصال کے جھگڑوں میں گزار دی۔ سوائے اس کے کچھ کام نہ کیا۔ سفینۂ نوح۔ طوفان نوح۔ اور اعجاز نوح ان کے کلام کے ضخیم مجموعے ہیں۔ ہمدرد از سہ ماہوار رسالہ رہنمائے تعلیم پہلے لاہور سے اور اب دہلی سے ان کی زیر سرپرستی نکل رہا ہے۔ نام محمد نوح ہے۔ ۱۸ ستمبر ۱۸۸۹ء کو بھوانی پور (ضلع بریلی) میں پیدا ہوئے۔ وطن نارہ (ضلع الٰہ آباد) ہے۔

نیاز - شاہ نیاز احمد ان کا نام تھا۔ نیاز تخلص کرتے تھے۔ بریلی کے رہنے والے تھے۔ ۱۷۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۳۴ء میں انتقال کیا۔

واقف - شاہ واقف کے نام سے مشہور تھے۔ اور سودا کے معاصرین میں سے تھے۔ لکھنؤ میں سکونت تھی۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں وفات پائی۔

وحشت - رضا علی نام۔ مولوی شمشاد علی کے فرزند۔ وحشت تخلص۔ کلکتہ کے رہنے والے اور یہیں ۱۸ نومبر ۱۸۸۱ء کو پیدا ہوئے۔ فن شعر میں مولوی ابوالقاسم محمد شمس کے شاگرد ہیں۔ اعلیٰ تعلیم سے فراغت کے بعد امپیریل ریکارڈ ڈپارٹمنٹ کلکتہ میں ملازم ہوگئے۔ پھر اسلامیہ کالج کلکتہ کی پروفیسری پر چلے گئے۔ ۱۹۳۱ء میں خان بہادر کا خطاب ملا۔ اور ۱۹۳۶ء میں پنشن پر ریٹائر ہوگئے۔ پاکستان بننے کے بعد کلکتہ سے ڈھاکہ چلے گئے۔ ان کی شاعری کے متعلق مولانا شبلی فرماتے ہیں "وحشت کے کلام میں جدت۔ ندرت اور پختگی ہوتی ہے۔ غالب اور مومن کی طرز ادا ان سے خوب بن پڑتی ہے"۔ ان کے آباؤ اجداد دہلی کے رہنے والے تھے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی قیامت میں جب دلی اجڑی تو ان کے دادا حکیم غالب علی دہلی چھوڑ کر بنگلی چلے گئے تھے۔

کلام کا پہلا مجموعہ دیوان وحشت کے نام سے ۱۹۱۰ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ جس کی مولانا حالی نے بڑی تعریف کی۔ ۱۹۵۰ء میں ترانۂ وحشت کے نام سے ان کے مکمل کلام کا مجموعہ لاہور سے شائع ہوا۔ جس میں قریباً ۴ ہزار اشعار ہیں۔ ۲۰ جولائی ۱۹۵۶ء کو آپ نے وفات پائی۔

وزیر لکھنوی - خواجہ محمد وزیر نام تھا اور وزیر تخلص کرتے تھے۔ حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند کی اولاد سے تھے۔

دلی لکھنؤ تھا۔ فارسی اور عربی کی تعلیم لکھنؤ میں پائی۔ فنِ شعر میں ناسخ کے شاگرد تھے اور نہایت قانع، متوکل اور گوشہ نشین بزرگ تھے۔ واجد علی شاہ اودھ نے دو مرتبہ دربار میں بلایا مگر نہ گئے۔ آخر عمر میں شعر کہنا چھوڑ دیا اور علمِ جفر سے شوق پیدا ہو گیا تھا۔ ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۳ء) میں وفات پائی۔ دیوان چھپ گیا ہے۔ جس میں چار ہزار کے قریب اشعار ہیں۔

وفا رامپوری ۔ حکیم عبدالہادی خاں ان کا نام تھا رامپور کے رہنے والے تھے۔ داغ اور امیر کے شاگرد تھے۔ ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۵ء میں انتقال کیا۔

ولا ۔ اصلی نام مرزا لطف علی گھر نظر میں ان کے استاد ہوئے۔ ولا تخلص فرمایا شیفتہ نے والا لکھا ہے۔ سنوانی، بلیش اور مصحفی کے شاگرد ہیں۔ عربی۔ فارسی۔ ہندی اور سنسکرت بہت اچھی جانتے تھے۔ اردو کو مادری زبان کہتے تھے۔ وطن دہلی تھا۔ دیوان کا قلمی نسخہ شاہجہان اودھ کے کتب خانہ میں تھا۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں فارسی اور ہندی کتابوں کے ترجمہ پر مامور تھے۔ جہاں انھوں نے ترجمہ بادصبا اور کام کلا۔ گرمیا کا ترجمہ۔ ترجمہ ہفت گلشن۔ انالیق ہندی۔ ترجمہ بابتالا پچیسی۔ ترجمہ تاریخ شیرشاہی۔ توزک جہانگیری کے ایک حصہ کا ترجمہ۔ غرض کئی کتابیں لکھیں۔ انیسویں صدی کے شروع میں وفات پائی۔

ولی دکنی ۔ ان کے نام میں سخت اختلاف ہے۔ کوئی شمس الدین بتاتا ہے۔ کوئی شمس الحق مولا۔ کسی کا خیال ہے کہ نام ولی الدین تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ نہیں حاجی ولی تھا۔ کوئی ولی محمد لکھتا ہے تو کوئی ولی اللہ۔ غرض مختلف تذکروں میں مختلف نام ان کے لکھے ہوئے ہیں۔ مولد بعض اورنگ آباد دکن بتاتے ہیں بعض احمد آباد گجرات۔ لیکن ہاں اس امر پر سب متفق ہیں کہ انتقال احمد آباد میں ہوا۔ سنہ ولادت میں بھی اختلاف ہے۔ صاحب قاموس المشاہیر ۱۶۶۸ء بتاتے ہیں۔ مصنف مراۃ الشعراء ۱۶۶۷ء لکھتے ہیں۔ اسی طرح سنہ وفات کوئی ۱۷۴۲ء بتاتا ہے کوئی ۱۷۴۱ء۔ ڈاکٹر ظہیر الدین اپنی کتاب "دکنی گجراتی" میں ۱۱۱۹ھ (مطابق ۲۰ اکتوبر ۱۷۰۷ء) لکھتے ہیں۔ ولی اب تک اردو شاعری کے باوا آدم سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اب یہ بات تحقیق ہو گئی ہے کہ ان سے پہلے بھی کئی اردو شعراء گزرے ہیں۔ ان کا کلیات انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ ولی دہلی بھی آئے تھے اور حج کو بھی گئے تھے۔ ان کا کلام قدیم اور متروک الفاظ سے بھرا پڑا ہے۔ اور اردو میں ایسی کوئی لغت موجود نہیں جس سے ان فرسودہ الفاظ کے معنی معلوم ہو سکیں۔ آپ "نور المعرفت" کے بھی مصنف ہیں جو فن سلوک میں ہے۔ ولی شاہ کی میں سعد اللہ گلشن کے شاگرد ہیں۔

ہادی ۔ ان کا نام میر محمد جواد تھا۔ اور ہادی تخلص کرتے تھے۔ ۱۸۰۰ء میں وفات پائی۔ دیوان ہادی چھپ گیا ہے۔

ہاشمی ۔ میر ہاشم ان کا نام تھا۔ اور نام ہی کی مناسبت سے ہاشمی تخلص کرتے تھے۔ سودا کے شاگرد تھے۔

ہجر۔ نواب ناظم علی خاں نام تھا اور ہجر تخلص۔ شاہجہان پور کے رہنے والے تھے اور داغ کے شاگرد تھے۔

ہدایت۔ شیخ ہدایت اللہ نام۔ ہدایت تخلص۔ اردو کے مشہور شعرا میں سے ہیں۔ خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ مجموعہ نغز میں ان کے متعلق لکھا ہے "بزرگے بود درویش دل مسکین نہاد والا نژاد۔ مرا بسر حلم۔ مرا بسر حیا۔ کیسر مہر۔ یک قلم وفا نیک محضر۔ پاکیزہ سیر۔ محبت پرور۔ مروت گستر۔ صاف دل۔ یک رو۔ صافی طینت۔ فرخندہ خو۔ نہ بر دل کس از وے غبارے نہ بخاطر حدے از راہ آرے"۔

ان کے اشعار کے متعلق صاحب مجموعہ نغز کے الفاظ یہ ہیں "فصاحت کلامش مستغنی البیان است و بلاغت سخنش بے پروا از تبیان روزمرہ زبان اردوئے معلی کہ بدستش افتادہ بکسے کم دست بہم دادہ۔ محاورۂ گفتگوئے ریختہ کہ بدستش رسیدہ در شعر احدے این فقیر ندیدہ"۔ ان کا دیوان ۹ ہزار اشعار کا مجموعہ ہے "چراغ ہدایت" نامی ایک کتاب کے بھی مؤلف ہیں جو تصوف میں ہے۔ ان کے علاوہ چند مثنویاں اور بھی لکھی ہیں۔ قیام الدین قائم اور قدرت اللہ قاسم ان کے شاگرد تھے۔ سنہ ۱۱۸۴ھ (۱۷۷۰ء) میں پیدا ہوئے۔ اور سنہ ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) میں وفات پائی۔

ہوس۔ نواب مرزا محمد تقی خاں شوستری۔ مؤتمن الدولہ نواب محمد اسحٰق خاں صوبہ دار گجرات کے پوتے اور نواب مرزا علیخاں دلاور جنگ کے فرزند تھے۔ پہلے میر تخلص کرتے تھے۔ پھر ہوس کرنے لگے۔ عہد آصف الدولہ میں فیض آباد سے لکھنؤ آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ مگر جو کچھ کہا ہمیشہ دہلی کے رنگ میں کہا۔ مشاعروں میں کم شامل ہوتے تھے۔ طبیعت میں رنگینی اور کلام میں شوخی تھی۔ اپنے وقت میں لکھنؤ کے نامی شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ اردو میں یہی مجنوں کا قصہ انھوں نے ہی لکھا تھا۔ ایک دیوان بھی چھوڑا۔

یکی۔ یحییٰ خاں نام اور یکی تخلص تھا۔ دہلی کے نہایت معزز اور رئیس شخص تھے۔ آخر عمر میں سورج مل جاٹ کے پاس چلے گئے تھے اور وہیں اُن کا انتقال ہوا۔

یقین۔ ان کا نام انعام اللہ اور ان کے والد کا نام شیخ اظہر الدین خاں سنہ ۱۱۴۱ھ (۱۷۲۷ء) میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ شاعری میں مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد ہیں۔ جوانی ہی میں اپنے باپ کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ سنہ انتقال ۱۱۶۹ھ (۱۷۵۵ء) ہے۔ میر تقی میر ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ محتاج بہ تعریف و توصیف نیست؟ خوش گو شاعر تذکرہ چمنستان شعراء میں کہتے ہیں "یقین یکتائے عصر و یگانۂ زمانہ است۔ چشم روزگار چنیں معنی آفرینے نکتہ رس ندیدہ"۔ میر حسن فرماتے ہیں "اشعارش بسیار نمکین و شوخانہ"۔ مولوی کریم الدین پانی پتی طبقات الشعراء میں لکھتے ہیں "تمام قسم کے اشعار میں ہر دو گلدستہ یعنی گلشن بیخار میں ہے"۔ "کلامش سیر نمک است حلاوت دلخواہ دارد"۔

اثر لکھنوی ۔ خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی ۱۲ جولائی ۱۸۸۵ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے ۱۹۰۶ء میں بی۔ اے پاس کیا۔ ۱۹۰۹ء میں ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے اور سیٹلمنٹ کمشنر تک ترقی کی۔ ۱۹۴۰ء میں ریٹائر ہوئے۔ پھر کشمیر کے ہوم ممبر اور وزیر تعلیم ہو کر سری نگر آ گئے جہاں تقسیم تک رہے۔ بعد ازاں لکھنؤ واپس آ گئے جہاں اب تک مقیم ہیں اور زبان اور ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ فن شعر میں عزیز لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ پاکستان و ہندوستان کے بلند پایہ رسائل میں ان کی شگفتہ اور شائستہ نظمیں برابر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ انھوں نے بہت سی بلند پایہ انگریزی نظموں کو بڑی خوبی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ صرف انگریزی سے بلکہ بنگلہ، سنسکرت اور عربی سے بھی اکثر اعلیٰ پایہ کی نظموں کے اردو میں ترجمے کیے ہیں۔ سنسکرت سے بھاگوت کا منظوم ترجمہ کر رہے ہیں۔ [illegible] بہاریاں، رنگ بست، مزامیر جہاں ہیں۔ انیس کی مرثیہ نگاری اور مطالعہ [illegible]

احسان دانش ۔ [illegible] احسان دانش کا مدھلا سنا [illegible] (یوپی) کے رہنے والے اور احسان دانش کے [illegible] ہیں۔ [illegible] ہے [illegible] ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ والد قاضی دانش علی عزیز ۔ وہی تھے۔ [illegible] کو اعلیٰ تعلیم نہ دلا سکے۔ احسان کو شروع ہی سے [illegible] کے مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ کبھی دونوں وقت کی محنت مزدوری کی۔ کبھی باغبانی کر کے پیٹ بھرا۔ کبھی معماری کا کام کیا۔ کبھی چوکیداری و چپراسی کی ملازمت کی مگر مصائب اور تکالیف کے اس تمام طویل عرصہ میں اس باہمت اور اولوالعزم شخص نے ہمت نہ ہاری اور کتابوں کا مطالعہ اور اپنی لیاقت بڑھانے کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ اس طرح اپنی زندگی خود بنائی۔ کبھی کسی کا احسان نہ لیا۔ دوں پر نہیں لیا۔ سخن کا شوق اور لیاقت علمی حاصل کرنے کا ذوق شروع سے تھا۔ آخر اس جواں ہمت انسان نے زمانہ کو شکست دے کر اپنی شہرت اور عزت کا سکہ بٹھا ہی لیا۔ چنانچہ آج آپ مکتبہ دانش کے مالک۔ بہت سی کتابوں کے مصنف اور ایک خوش گو اور مقبول شاعر ہیں۔ مزدور کی ترجمانی جتنی عمدگی کے ساتھ نظم میں آپ نے کی ہے وہ کوئی اور شاعر نہ کر سکا۔ اپنی نظموں میں واقعیت اور حقیقت کا رنگ بھرنے اور اثر اور جذب پیدا کرنے میں آپ بلا شبہ دور موجودہ کے شعراء میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اخلاق و عادات کے لحاظ سے نہایت خوش طبع۔ نرم دل۔ شگفتہ مزاج اور مخلص انسان ہیں۔ ان کی غزلوں اور نظموں کی زبان پاکیزہ اور سلیس ہے۔ لغت اردو کے متعلق بہت دنوں سے نہایت تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ نایاب کتب کا ایک کافی ذخیرہ عرصہ دراز کی تلاش میں مہیا کیا ہے۔ غرض علمی اور عملی دونوں لحاظ سے ملنے کے قابل آدمی ہیں۔

نظموں کے مجموعے:۔ نوائے کارگر۔ نغمۂ فطرت۔ آتش خاموش۔ مقامات۔ زخم و مرہم۔ جادۂ نو۔ گورستان۔ چراغاں۔ شیرازہ۔

دوسری تصانیف:۔ لغات الاصلاح۔ دستور اردو۔ طبقات خضر عروض روشنیاں۔ شام زندگی۔

اختر انصاری - یکم اکتوبر ۱۹۰۹ء ان کی تاریخ پیدائش اور دھن بادیوں، گھوسی کا ہمیشہ حصہ دہلی میں بسر ہوا۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ ۱۹۳۰ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ پھر علی گڈھ سے بی ٹی کر کے وہیں ملازم ہو گئے۔ وہیں سے ایم اے کیا۔ اور مسلم یونیورسٹی کے ٹریننگ کالج میں لکچرار ہو گئے۔ بہ نسبت غزل کے قطعات بہت اچھے کہتے ہیں۔ کلام کے یہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نغمۂ روح۔ آبگینے۔ شعلۂ طور۔ خون ناب۔ ناظم ہونے کے علاوہ آپ فسانہ نگار بھی بہت اچھے ہیں۔

اختر حیدرآبادی - علی اختر المتخلص بہ اختر حیدرآبادی در اصل علی گڈھ (یو۔پی) کے رہنے والے ہیں۔ رامپور (حیدرآباد) میں پیدا ہوئے۔ سنہ ولادت ۱۸۹۳ء ہے۔ ۱۹۱۰ء سے حیدرآباد دکن میں ملازم رہے۔ اس لیے حیدرآبادی کہلاتے ہیں۔ شعر کا شوق بچپن سے تھا۔ اس فن میں اپنے والد حضرت باغ کے شاگرد ہیں۔ ان کی غزل اور نظم دونوں پختہ ہیں۔ ان کے کلام میں غنچوں شاعری کے بہت اچھے نمونے ملتے ہیں۔ مبالغہ اور غزل قدیم طرز سے پرہیز کرتے ہیں۔ آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ "افشار" ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔

اختر شیرانی - نام داؤد خاں اور تخلص اختر تھا۔ مشہور فاضل اور محقق حافظ محمود خاں شیرانی پروفیسر پنجاب یونیورسٹی کے لڑکے تھے اور افغانوں کے تعلید شیرانی سے متعلق تھے۔ ۴ مئی ۱۹۰۵ء کو ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں ایم اے او ٹونک کی نظر عنایت کے باعث حافظ صاحب اور اختر لاہور آ گئے۔ ۱۹۲۱ء میں یہیں پہنچ کر منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ اور ۱۹۲۳ء میں ادیب فاضل کا۔ شعر گوئی کا بچپن سے شوق تھا۔ پہلی نظم جو کہ سنہ ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی۔ جو اتنی شاندار تھی کہ اس نے ان کو سارے ہندوستان میں مشہور کر دیا۔ مخلتف اوقات میں ہمایوں، انتخاب، بہارستان، خیالستان، رومان اور مولانا تاجور کے رسالہ شباب کے ایڈیٹر رہے۔ مولانا محمد علی جوہر کے روزنامہ ہمدرد دہلی میں بھی کام کرتے رہے اور ادارہ اردو مرکز میں مولانا تاجور کے معین و مددگار رہے۔ انجمن ترقی اردو دہلی میں بھی کچھ عرصہ کام کیا۔ ۱۹۴۷ء میں وطن واپس چلے گئے مگر تقسیم ملک کے بعد پھر لاہور آ گئے۔ کثرت شراب نوشی نے ان کے دل، دماغ اور دوسرے اعضاء پر بہت برا اثر کیا۔ جس کے باعث یہ نامور ادیب اور اعلیٰ پایہ کا شاعر بہت جلد دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو میو ہسپتال لاہور میں انتقال ہوا۔ اور میانی صاحب کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ ان کی رومانی شاعری نہایت پُراثر، نہایت دلچسپ اور پر لطف ہے۔ ان کی نظموں کے مجموعے مندرجہ ذیل شائع ہو چکے ہیں۔

صبح بہار۔ اخترستان۔ لالہ طور۔ طیور آوارہ۔ شہناز۔ پھولوں کا گیت۔ نغمۂ حرم۔ شہ ود

ان کے علاوہ ان کی تالیفات و تصنیفات کے نام حسب ذیل ہیں۔

آئینہ خانے میں (پارسی افسانوں کا مجموعہ)

جوامع الحکایات (ترجمہ از فارسی) برائے انجمن ترقی اردو۔ دو جلد۔

دھڑکتے دل (ادبی مضامین۔ ترجمہ افسانوں کا مجموعہ)

"وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ" (مختلف ادیبوں اور فنکاروں کے ڈراموں کا مجموعہ)
ان کے متعلق ان کے دوست حکیم نیر واسطی نے جو کتاب "اختر واسطی" کے نام سے لکھی ہے پڑھنے کی چیز ہے۔

اختر۔ پنڈت ہری چند المتخلص بہ اختر ہندوستان و پاکستان کے شاعروں میں سے ہیں۔ وطن ہوشیار پور ہے۔ تقسیم ملک تک لاہور میں مقیم رہے۔ فارسی میں منشی فاضل اور انگریزی میں ایم۔ اے ہیں۔ شروع ہی سے فنون نگاری اور شاعری سے نہایت درجہ لگاؤ رہا۔ فارسی میں بہت سے مضامین رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور میں وقتاً فوقتاً لکھے۔ اپریل ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ سی شعور کے بعد ابتدا میں چند سال تک اخبار نویسی کی۔ بعد ازاں وفاقی پنجاب اسمبلی اور محکمہ اطلاعات میں کام کیا۔ دوسری جنگ عظیم میں سرکار انگریزی کے جنگی پراپیگنڈے کے محکمے سے متعلق رہے۔ اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ یکم جنوری ۱۹۵۸ء کو آپ کا انتقال ہو گیا۔

آزاد۔ جگن ناتھ آزاد اردو کے موجودہ شعراء میں خاص شہرت کے مالک ہیں۔ ان کی شاعری نہایت درجہ درد۔ اثر اور جذب میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے۔ منشی تلوک چند محرومؔ کے فرزند اور عیسیٰ خیل (میانوالی) کے رہنے والے ہیں۔ سال پیدائش دسمبر ۱۹۱۸ء ہے۔

ان کی تمام تعلیم پنجاب میں ہوئی ہے۔ اے پاس کرنے کے بعد روزنامہ ملاپ کے سب ایڈیٹر ہو گئے۔ جو اس زمانہ میں لاہور سے نکلا کرتا تھا۔ کچھ دنوں روزنامہ احسان سے بھی متعلق رہے۔ پھر ایم۔ اے کا امتحان دیا۔ آپ پنجاب یونیورسٹی کے منشی فاضل بھی ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد اپنے والد کے ہمراہ دہلی چلے گئے۔ وہاں اردو کے مشہور ہفت روزہ "آج کل" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہو گئے۔ اُن کے کلام کے تین مجموعے اس وقت تک چھپے ہیں۔ ایک "بیکراں" اور دوسرا "سفارش" سے ذرا تک "تیسرا" "وطن میں اجنبی" "اردو" پر بھی اُن کی ایک بلیغ نظم چھپ چکی ہے۔ سنا ہے کہ اقبال پر ہندی میں ایک مبسوط کتاب آج کل لکھ رہے ہیں۔

اسد ملتانی۔ محمد اسد خاں المتخلص بہ اسد۔ ماہ دسمبر ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ ضلع ملتان ہے۔ ۱۹۲۴ء میں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد انشس نامی ایک اخبار ملتان سے جاری کیا۔ ۱۹۳۳ء میں انگریزی گورنمنٹ کی ملازمت کی اور سیکرٹریٹ میں ملازم ہو گئے۔ تقسیم ملک کے وقت لاہور اپنی سابقہ ملازمت پر آ گئے۔

شعر و شاعری کا شوق آٹھ برس کی عمر سے ہوا اور عمر کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا۔ وہ ایک مشہور اور کامیاب شاعر ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں انتقال ہوا۔

حبیب اشعر۔ حکیم حبیب احمد نام۔ اشعر تخلص۔ یکم جنوری ۱۹۱۹ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی کے معزز ترین

خاندان شرفی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابتدا میں قرآن حکیم کی تعلیم حافظ بشیر حسین سے حاصل کی۔ فارسی کی تحصیل مولوی جلال الدین سے کی۔ عربی مشہور منطقی و فلسفی بزرگ مولوی عبدالسلام سے پڑھی۔ طب کی سند حکیم مولوی محمد مبین پروفیسر طبیہ کالج دہلی سے لی۔ اور تقسیم ملک کے وقت دہلی سے لاہور چلے آئے۔ یہاں شاہی محلہ میں قیام پذیر ہیں۔ آپ کا مطب "دواخانہ حاذق الملک" رنگ محل میں ہے۔ نہایت قابل اور لائق نوجوان ہیں۔ ملک کے مشہور ادیب اور عروضی کے بہت اچھے مترجم ہیں۔ آپ کے ابتدائی کلام کا مجموعہ "راز و نیاز" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ تراجم کی تفصیل جو آپ نے اب تک کئے ہیں اور شائع ہو چکے ہیں حسب ذیل ہے:۔

جبران خلیل جبران کے ترجمے۔ ٹوٹے ہوئے پر۔ شیطان۔ دلہن کی بیچ۔ بغشہ کا پھول۔ ریت اور جھاگ۔ اشک تبسم۔ پکار۔ مصطفیٰ لطفی المنفلوطی کے تراجم۔ رخسانہ۔ تاج اور شہنانہ۔ نیز محمد حسین ہیکل کی کتاب عمر فاروق۔

ان کے علاوہ متعدد ادبی اور تاریخی عربی کتابوں کے بھی آپ نے نہایت سلاست اور روانی کے ساتھ ترجمے کیے ہیں۔

اکبر۔ چوہدری جلال الدین المتخلص بہ اکبر ستمبر ۱۹۰۸ء میں موضع علی دال نہراں والا (ضلع گورداسپور) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام چودھری فتح علی تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں پائی۔ انٹرنس کا امتحان اسلامیہ ہائی سکول گوجرہ سے دیا۔ بی۔ اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا۔ بی۔ ٹی کی تعلیم سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں پائی اور چھ سال کی پیشہ اختیار کیا۔ نقوش اور رنگ اپنے کلام کا مجموعہ ۱۹۲۶ء میں چھپا۔ ۱۹۳۸ء میں ایک مرد و رسیتی حاجی حافظ حاکم علی سے بیعت کی اور ۱۹۴۱ء میں اُن کے انتقال کے بعد ان کے خلیفہ ہوئے۔ اکبر ایک غزل گو شاعر ہیں۔ بقول صاحب تذکرہ جدید شعرائے اردو "ان کے تغزل میں ایک سادگی ایک دھیما پن اور ایک مخصوص رکھ رکھاؤ پایا جاتا ہے۔ جذبات عام طور پر بلند ہیں اور ان میں بڑی کشش ہے۔ اُن کی اکثر غزلیات اپنے سادہ مگر حسین اسلوب اور زبان کی بے پناہ لطافت و روانی کے محاسن سے آراستہ ہیں۔"

مجید امجد۔ عبدالمجید نام امجد تخلص۔ عام طور پر مجید امجد کہلاتے ہیں۔ جھنگ کے رہنے والے ہیں۔ جہاں یہ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ راقم الحروف نے ۱۹۴۲ء میں جھنگ سگھیانہ جا کر وہاں سے ایک نیم سرکاری اخبار اصلاح دیہات کے لیے جاری کیا اور عروج اُس کا نام رکھا۔ خرابی صحت کی بنا پر مجھے وہاں سے ۱۹۴۳ء میں استعفیٰ دینا پڑا۔ تو مجید امجد صاحب ہی میری بجائے عروج کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ اور عرصہ تک وہاں کام کرتے رہے۔ یہ اخبار آج کل بھی پرائیویٹ ملکیت میں نکلتا ہے۔ اور غلام محمد صاحب رنگین اس کے ایڈیٹر ہیں۔ مجید امجد صاحب آج کل منٹگمری میں راشننگ انسپکٹر ہیں۔

انجم رومانی۔ فضل الدین نام ہے اور انجم تخلص۔ موضع سلطان پور لودھی (ضلع) ریاست کپورتھلہ میں پیدا ہوئے۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد ویال سنگھ کالج میں شعبہ ریاضیات کے صدر ہیں۔

باقی صدیقی ۔ محمد فضل الٰہی نام۔ باقی تخلص۔ موضع سہام ضلع راولپنڈی کے رہنے والے ہیں۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۰۹ء کو پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں والد کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے شروع ہی سے فکر معاش جان لیوا رہی۔ دیہاتی مدرسی کی۔ بمبئی جا کر فلم میں کام کیا۔ مگر پھر بیزار ہو کر چھوڑ دیا۔ دوسری جنگ عظیم اُس وقت ہو رہی تھی۔ یہ بھی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ دو سال بعد وہاں سے ملجدہ ہونے اور مختلف ملازمتیں کرتے رہے۔ ۱۹۵۰ء میں اخبار راہ و منزل راولپنڈی میں ملازم ہو گئے۔ پھر ریڈیو میں نوکری مل گئی۔ مگر بعد میں یہ بھی چھوٹ گئی۔ آج کل اپنے موضع سہام ہی میں قیام پذیر ہیں اور فکر شعر میں مشغول۔

تابش صدیقی ۔ آپ کا نام جماعت علی ہے۔ اور ۱۹۱۶ء میں بمقام نہرا سندھواں (ضلع سیالکوٹ) آپ کی ولادت ہوئی۔ ۱۹۳۸ء میں آپ نے اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے پاس کیا اور چند سال اردو اخبار نویسی کے [illegible] میں کام کرنے کے بعد حکومت ہند کے محکمہ مالیات میں ملازم ہو گئے۔ آج کل آپ وزارت مالیات میں سیکشن آفیسر ہیں۔

تاثیر ۔ محمد دین نام تاثیر تخلص ۲۰ فروری ۱۹۰۲ء کو پیدا ہوئے۔ آباؤ اجداد کا تعلق وادی کشمیر سے ہے۔ دو برس کے تھے۔ کہ ماں باپ دونوں کا انتقال ہو گیا۔ یتیم بچے کو خانوادے نے پرورش کیا۔ ۱۹۲۷ء میں ایم اے پاس کرنے کے بعد ایکسٹرا ٹریٹ میں ملازم ہو گئے۔ پھر انگریزی زبان و ادب کے پروفیسر کی حیثیت سے اسلامیہ کالج لاہور میں کچھ عرصہ کام کیا۔ کچھ دنوں لاہور کے رسالہ ''ہزار داستان'' کی ادارت کی۔ ۱۹۳۴ء میں انگلینڈ چلے گئے جہاں انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے ''اقبال کی شاعری ادب میں ہندوستان اور مشرق بعید'' پر مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے شادی ایک یورپین لیڈی سے کی۔ جنھوں نے مسلمان ہو کر اپنا نام بلقیس تاثیر رکھا۔ نکاح ڈاکٹر اقبال نے پڑھا۔ اور نکاح نامے پر اپنے دستخط کیے۔

انگلینڈ سے واپسی پر ۱۹۳۶ء میں ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر کے پرنسپل مقرر ہوئے پھر آزاد کشمیر چلے گئے۔ اور وہاں ملازمت کر لی۔ آخر میں اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل ہو کے گئے تھے۔ ۲ نومبر ۱۹۵۰ء کو انتقال کیا۔ گورنمنٹ نے ان کے پسماندگان کا وظیفہ مقرر کر دیا ہے۔

تاثیر مرحوم نہایت باذوق اور نہایت ذی علم شخص تھے۔ نظم و نثر کا نہایت اعلیٰ پایہ کا مذاق رکھتے تھے۔ اُن کے نام مضامین اور نظموں کا مجموعہ اگر شائع ہو جائے تو ادب اردو میں یقیناً گرانقدر اضافہ ہوگا۔ آتش کہ ان کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ ان کی بیگم بلقیس تاثیر نے شوہر کے انتقال سے ڈھائی برس بعد شائع کیا ہے۔ ان کے خطوط کا ایک مجموعہ ''عزیزم کے نام'' بھی شائع ہو چکا ہے۔ کنول بھی ان کی ایک کتاب ہے۔ نہایت ہی باخلاق ملنسار۔ شریف الطبع اور بے ریا انسان تھے۔ دوستوں پر جان دیتے اور ان کے لیے ہر قربانی پر تیار رہتے تھے۔ ان کے ملنے والوں میں ہر مشرب اور ہر عقیدہ کے لوگ تھے۔ اور وہ سب سے انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ رحمدلی اور ہمدردی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ غریبوں اور معمولی درجہ کے لوگوں سے بے حد جھک کر اور بڑی تواضع کے ساتھ ملتے تھے۔ اگر کبھی کوئی معمولی وضع قطع کا آدمی ملنے آتا۔ اور نوکر اُس سے بے اعتنائی سے پیش آتے تو نہایت سخت ناراض ہوتے۔ دوسروں کے جذبات اور احساسات کا بے حد

خیال رکھتے۔ اور کسی کو حق الوسع اپنے سے ناراض ہونے کا موقع نہ دیتے۔ جو شخص اُن سے ایک مرتبہ ملتا ہمیشہ کے لیے اُن کا گرویدہ ہو جاتا۔ جس چیز میں حُسن اور نفاست نظر آتی اُسے بے حد پسند کرتے اور وہ ڈرا خرید لیتے۔ خواہ وہ اُن کے کام کی نہ ہوتی۔ صفائی ستھرائی کا بے حد خیال رکھتے۔ اولاد کو مارنے اور ڈانٹنے ڈپٹنے کے سخت خلاف تھے۔ بچوں سے بچہ بن کر نہایت الفت اور محبت سے باتیں کرتے۔ غرض نہایت عیش و مسرت کی زندگی گزارتے ہوئے پاکستان کا یہ نامور ادیب، شاعر اور انشاپرداز ہم سے رخصت ہوا۔

تبسم۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم پاکستان کے مشہور ادیب اور شاعر ہیں۔ وطن امرتسر ہے۔ جہاں آپ مہر اگست ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے۔ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں علوم شرقیہ کے پروفیسر ہو گئے۔ وہاں سے گورنمنٹ کالج لاہور میں تبدیل ہو گئے۔ اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔ فارسی کے بہت اچھے فاضل ہیں۔ آپ کا فارسی کلام نہایت شستہ اور شائستہ ہوتا ہے۔ اردو کلام میں بھی نہایت سلاست اور روانی ہے۔

جذبی۔ سید احسن جذبی کا سال ولادت ۱۹۱۲ء شروع کی تعلیم جھانسی میں پائی۔ بعد ازاں آگرہ، لکھنؤ اور دہلی میں پھرتے رہے۔ ۱۹۴۲ء میں علی گڑھ سے ایم۔ اے کیا۔ کچھ دنوں رسالہ آج کل کے ایڈیٹر رہے۔ پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اردو کے لکچرار ہو گئے۔ اور ابھی تک وہیں کام کر رہے ہیں۔ نظم اور غزل دونوں خوب کہتے ہیں۔ اشعار بڑی خوش آوازی سے پڑھتے ہیں۔ اور موجودہ شعراء میں بہت مقبول ہیں۔ "فروزاں" ان کے کلام کا مجموعہ کا نام ہے۔

جگر۔ نام علی سکندر تخلص جگر اور وطن مراد آباد ہے۔ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ دورِ حاضرہ کے نہایت نامور غزل گو شاعر ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "شعلہ طور" ادارہ فروغ اردو نے نہایت نفاست اور کمال اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ داغ، جگر اور آتش گل بھی ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔ اُن کے والد مولوی علی نظر بھی شاعر اور صاحب دیوان تھے۔ فنا تخلص کرتے تھے۔ جگر شگفتہ مزاج اور رنگین طبع ہیں۔ مشاعرہ میں غزل پڑھنے کا انداز بہت دلفریب ہے۔ شراب کے بہت رسیا تھے۔ مگر اب چھوڑ دی ہے۔ ان کا کلام بے حد مقبول ہوا۔ غالب، حالی اور اقبال کو چھوڑ کر ان کا مجموعہ کلام سب سے زیادہ فروخت ہوا۔ فن شعر میں اپنے والد۔ تسلیم اور داغ کے شاگرد ہیں۔

جوش ملسیانی۔ پنڈت بھورام جوش ضلع جالندھر کے گاؤں ملسیان میں یکم فروری ۱۸۸۲ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا بچپن میں انتقال ہو گیا۔ مگر انھوں نے اپنی ذاتی کوشش اور سعی سے ایسی عمدہ لیاقت پیدا کی کہ آج ملک میں ان کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔ منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحان دیئے اور صوبہ بھر میں اول آئے۔ طالب علمی کے زمانہ سے شاعری کا شوق تھا۔ ۱۹۰۲ء میں داغ کے شاگرد ہوئے مگر ۱۹۰۵ء میں داغ کا انتقال ہو جانے کے بعد پھر کسی سے اصلاح نہیں لی۔

پنجاب کے مختلف سرکاری سکولوں میں عرصہ دراز تک فارسی کے اول مدرس رہے۔ ۱۹۳۳ء میں ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۱۴ء سے مخزن شیخ جمالند ھری میں قیام ہے جو طیبان کے پاس ہی ہے۔ عرصہ دراز سے رسالہ رجمانِ تعلیم کے حصہ نظم کی ادارت کے فرائض آنریری طور پر بڑی قابلیت سے انجام دے رہے ہیں۔ رسالہ مذکور کا حصہ نثر راقم الحروف کے متعلق ہے۔ ہندوستان کے غزل گو شعراء میں آپ کا درجہ نہایت ممتاز ہے۔ غزلوں کی زبان نہایت شستہ و شائستہ۔ فصیح و بلیغ اور نہایت با محاورہ ہوتی ہے۔ عادات و خصائل کے لحاظ سے پرانے بزرگوں کا نمونہ ہیں۔ بیحد سادہ مزاج۔ سادہ وضع اور نیک نفس انسان ہیں۔ کلام کا قلیل حصہ بادۂ سرجوش کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا مجموعہ جنون و ہوش ہے۔ غالب کی ایک غزل پر درجہ کی شرح بھی آپ نے کی ہے جو شائع ہو چکی ہے۔ غرض نہایت خاموشی کے ساتھ ایک کونے میں بیٹھے ہوئے ادب اور فن کی خدمت کر رہے ہیں۔ اُن کا شمار ملک کے مقتدر شعراء میں ہوتا ہے۔

جوشؔ ملیح آبادی۔ شبیر حسن خاں نام بشیر احمد خاں کے بیٹے۔ جوشؔ تخلص۔ "شاعرِ انقلاب" خطاب۔ اور ملیح آباد (یوپی) وطن ہے۔ ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۴ء) میں پیدا ہوئے۔ مشہور شاعر فقیر محمد خاں گویا ان کے پردادا تھے۔ جنہوں نے سب سے پہلے انوار سہیلی کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۴ء تک دس سال عارف ترجمہ حیدر آباد دکن میں ناظر ادبی رہے۔ نئی شعر میں عزیز لکھنوی سے اصلاح لی۔ موجودہ دور کے نہایت نامور شعراء میں سے ہیں۔ دہلی سے انھوں نے ماہنامہ کلیم جاری کیا تھا۔ تقسیم کے بعد دہلی کے ماہنامہ "آج کل" کے چیف ایڈیٹر رہے۔ مگر اپنے بیوی بچوں کا مستقبل بھارت میں تاریک دیکھ کر نومبر ۱۹۵۵ء کے آخر میں کراچی چلے آئے اور پاکستان کے شہری بن گئے۔

روح ادب۔ اوراقِ لحر۔ مقالاتِ زرین۔ جذبات فطرت اور آوازۂ حق۔ ان کی ابتدائی کتابیں ہیں۔ بعد کی تصنیفات یہ ہیں:۔ جنون و حکمت۔ سنبل و سلاسل۔ عرش و فرش۔ فکر و نشاط۔ حسین اور انقلاب۔ شاعر کی راتیں۔ آیات و نغمات۔ نقش و نگار۔ شعلہ و شبنم۔ حرف و حکایت۔ حرف آخر۔ سیف و سبو۔ پیغمبر اسلام اور ارشادات۔ ان کی تصنیفات ہیں۔

حفیظؔ جالندھری۔ خان بہادر ابوالاثر حفیظ جالندھری ہندوستان و پاکستان کے نامور شاعر شاہنامۂ اسلام کے مؤلف۔ پاکستان کے قومی ترانہ کے مصنف۔ ۱۹۰۰ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے شروع ہی سے حصول معاش کی پریشانیوں میں مبتلا رہے اور معمولی ملازمتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سٹیشن پر تلیوں کے میٹ بھی رہے۔ جب اپنے وطن میں کوئی ترقی کی سبیل نظر نہ آئی تو لاہور آئے اور دارالاشاعت پنجاب میں پھول کے ایڈیٹر ہو گئے۔ مذاق سلیم فطری تھا جسے ملک الشعراء شیخ غلام قادر گرامی جالندھری کی صحبت نے جلا دی اور کندن بنا دیا۔ اور آہستہ آہستہ حفیظ کو اپنے زمانے کا سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ مقبول شاعر بنا دیا۔ عزت۔ دولت۔ شہرت سب کچھ مل گئی۔ ان کا لازوال اور بے مثل کارنامہ شاہنامۂ اسلام ہے جس کی اب تک چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ کاش حفیظ صاحب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوں۔

ان کی دوسری مظوم تصانیف نغمہ زار۔ سوز و ساز۔ نخلِ شیریں۔ تصویرِ کشمیر۔ بہار کے پھول۔ پھول مالا اور ہندوستان ہمارا کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔

حفیظ ہوشیارپوری۔ شیخ عبدالحفیظ سلیم نام۔ حفیظ تخلص۔ والد کا نام شیخ فضل محمد خاں وطن ہوشیارپور (مشرقی پنجاب) تاریخ پیدائش ۵ جنوری ۱۹۱۲ء۔ ۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد کچھ دنوں تک ادبی مشاغل میں مصروف رہے۔ اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو لاہور میں ملازم ہو گئے۔ تقسیم ملک کے بعد ریڈیو پاکستان سے متعلق ہو گئے۔ کچھ دنوں لاہور رہی رہے۔ اور آج کل کراچی میں ہیں۔ اردو کے علاوہ آپ نے انگریزی میں بھی نظمیں کہی ہیں۔ فارسی بھی بہت اچھی جانتے ہیں۔ تاریخ گوئی میں آپ کو خاص ملکہ ہے۔ بقول صاحب تذکرہ جدید شعرائے اردو آپ پاکستان کے خوش فکر شعراء میں سے ہیں اور آپ کا کلام پختگی و روانی۔ سلاست و شگفتگی اور درد و اثر کی خصوصیات کا حامل ہے۔ ذاتی لحاظ سے بہت با اخلاق منکسر المزاج اور خوش طبع انسان ہیں۔

خاطر غزنوی۔ محمد ابراہیم بیگ خاطر غزنوی۔ پشاور میں ۵ نومبر ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ آج کل ریڈیو پاکستان پشاور میں کام کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ شعر و شاعری کا مشغلہ بھی جاری ہے۔ انجمن ترقی اردو کے بہت سرگرم ممبر ہیں۔ کئی اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ دسمبر ۱۹۵۳ء میں ماہنامہ زندگی نکالا۔ مگر جلد ہی بند ہو گیا۔ خاطر صاحب آج کل کے شعراء میں خاصے مشہور ہیں۔ شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی لیکن نظمیں اور گیت بھی خوب لکھتے ہیں۔ ان کی نظمیں رومانی اور انقلابی ہوتی ہیں۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ خاطر صاحب افسانہ نگار بھی ہیں۔ "فسانہ" اور پھول اور پتھر ان کی کتابیں ہیں۔ مجموعہ کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ پشتو ادب کے متعلق انھوں نے بہت عمدہ مضامین لکھے ہیں۔

ذوالفقار۔ ان کا نام سید ذوالفقار علی بخاری ہے۔ اور ذوالفقار تخلص کرتے ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں بمقام پشاور پیدا ہوئے۔ بڑے ہو کر اورینٹل پاس کرنے کے بعد پہلے گورنمنٹ پریس پشاور میں کلرک رہے۔ پھر اپنے بڑے بھائی پطرس بخاری کی امداد سے بی۔ بی۔ سی لندن میں اناؤنسر ہو گئے۔ وہاں بعد ریڈیو سٹیشن بمبئی کے ڈائرکٹر۔ تقسیم ملک کے بعد ریڈیو پاکستان کے کنٹرولر ہوئے۔ طبیعت میں شوخی اور مزاح بھی ہے۔ نہایت زندہ دل اور با اخلاق ہیں۔ کلام میں جان اور اشعار میں دلکشی ہے۔ پر گو اور بدیہہ گو شاعر ہیں۔ نظم میں بندش الفاظ اور اسلوب بیان خوب ہے۔ پڑھنے کا انداز دلکش ہے۔

رضا ہمدانی۔ مرزا رضا حسین ہمدانی نام۔ رضا تخلص اور وطن پشاور ہے۔ جہاں یہ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ والد خیاط تھے۔ یہ نوگرفتار ہوئے۔ کام کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری کا بھی دور چلتا رہا۔ جب کام نہ چلا تو کسی چائے فروش کے ہاں

دس روپے ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ پھر خود تمباکو کی دکان کھولی۔ اس سے بھی پوری نہ پڑی تو پشاور سے راولپنڈی چلے آئے۔ اور چرخی رفوگری کا پیشہ اختیار کیا۔ کچھ دنوں بعد لاہور آ کر ایک ہفتہ وار اخبار "شباب" کے نام سے جاری کیا۔ مگر جب نہ چلا تو اسے بند کر کے کراچی چلے گئے اور ایک پریس میں کمپوزیٹر بن گئے۔ کچھ دنوں بعد وطن واپس چلے آئے اور طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ اور اب وہ پشاور میں ڈاکٹر عرفانؔ کے نام سے مشہور ہیں۔ مگر زندگی کے کسی مرحلہ میں بھی مشورۂ سخن نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ برابر کہتے اور کہتے رہے۔ بہت سی کتابیں ان کی تصنیفات سے موجود ہیں۔ پشتو ادب کو اردو میں ڈھالنے کا سہرا انہی کے سر ہے "ادبیات سرحد" میں ان کا تذکرہ ۱۲ صفحات میں دیا گیا ہے اور ان کی شاعری کے بہت سے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔

روشؔ صدیقی۔ شاہد عزیز صدیقی المتخلص بہ روشؔ۔ ۱۰ جولائی ۱۹۱۱ء کو جوالا پور میں پیدا ہوئے جو سہارنپور کے ضلع میں مشہور مقام ہے۔ اردو۔ فارسی۔ سنسکرت۔ ہندی اور انگریزی سے بقدر ضرورت واقف ہیں۔ سات سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ موجودہ زمانہ کے رومانی شاعروں میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ غزل بھی بہت اچھی کہتے ہیں۔

ساحرؔ لدھیانوی۔ عبدالحی نام۔ ساحرؔ تخلص۔ وطن لدھیانہ۔ سنہ پیدائش ۱۹۲۳ء۔ نوجوانی ہی میں سیاسیات میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اس لیے تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ لدھیانہ سے لاہور آ کر کالج میں داخل ہوئے مگر امتحان نہ دے سکے۔ بعد ازاں ادب لطیف۔ شاہکار اور سویرا میں کام کرتے رہے۔ پھر بمبئی چلے گئے اور وہیں آج کل فلمی گانے اور مکالمے لکھ کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ شاعری کا شوق ۱۶ برس کی عمر سے ہوا۔ اس دوران میں انھوں نے ہر قسم کی نظمیں کہی ہیں۔ رومانی بھی۔ سیاسی بھی اور سماجی بھی۔ اسلوب بیان بالعموم دلچسپ ہوتا ہے۔ ان کے مجموعہ کلام کا نام "تلخیاں" ہے۔

ساغرؔ نظامی۔ محمد صدیار خاں ساغرؔ ۲۸ دسمبر ۱۹۰۵ء کو علیگڈھ میں پیدا ہوئے۔ بارہ تیرہ سال کی عمر سے شاعری کا شوق ہوا۔ سیمابؔ اکبرآبادی کے شاگرد ہیں۔ استاد شاگرد نے مل کر ۱۹۲۳ء میں آگرہ سے رسالہ "پیمانہ" نکالا۔ لیکن صرف تین ہی سال بعد لڑائی ہو گئی اور ایک دوسرے پر چوٹیں ہونے لگیں۔ ستمبر ۱۹۲۶ء میں علیگڈھ سے مستقبل نکالا۔ مگر جلد ہی بند کر کے اخبار علیگڈھ بیچ جاری کیا۔ ۱۹۲۹ء میں استقلال کی اشاعت شروع کی۔ مگر وہ بھی بند ہوا۔ پھر پیمانہ جاری کیا۔ جو بڑی شان سے نکلا۔ ۱۹۳۳ء میں میرٹھ میں ادبی مرکز اور ساغرؔ پریس جاری کیا۔ یہیں سے ماہنامہ "ایشیا" نکالا۔ ۱۹۴۳ء میں پونا جا کر ایک شالیمار کمپنی میں ملازم ہو گئے۔ آج کل بمبئی میں کسی فلم میں کام کر رہے ہیں۔ بقول مولوی عبدالحق "ان کے کلام کی بہت بڑی خصوصیت اس کا ترنم اور موسیقیت ہے"۔ بادہ مشرق۔ صبوحی اور رنگ و خیال وغیرہ ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

سالکؔ۔ پاکستان و ہندوستان کے مشہور ادیب۔ مرحوم روزنامہ انقلاب کے مدیر۔ اور بہت سی کتابوں کے مولف اور مصنف ہیں۔ مولانا عبدالمجید سالکؔ ۱۲ دسمبر ۱۸۹۱ء کو ڈیالہ ضلع گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حضرت منشی

[illegible] محمد صاحب ایک محترم بزرگ تھے۔ عقائد کے لحاظ سے آپ احمدی تھے۔ موضع دولت پور [illegible] کورٹ میں میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری تھے۔

[illegible] کی ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم کے زیر سایہ پٹھان کوٹ میں ہوئی۔ انٹرنس کا امتحان پٹا [illegible] لاہور میں آکر کیا۔ ۱۹۱۳ء میں پٹھانکوٹ سے ایک ادبی ماہنامہ فانوس خیال جاری کیا۔ مگر یہ [illegible] آپ لاہور آکر پھول اور تہذیب النسواں کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ سید امتیاز علی نے کہکشاں [illegible] اس کے بہترین مصور نگار سالک صاحب ہی تھے۔ بہت اعلیٰ اور بلند پایہ نظمیں، فسانے اور مضامین انھوں نے اس کے لیے لکھے۔ یکم مئی ۱۹۱۸ء کو مولانا ظفر علی خاں کے اصرار پر "زمیندار" میں چلے آئے اور اسے بڑی کامیابی کے ساتھ چلایا۔ ان کا "افکار و حوادث" کا کالم مزاح نویسی کا بہترین نمونہ ہوتا تھا اور بیحد دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ پھر نومبر ۱۹۲۱ء کو تحریک عدم تعاون کے سلسلہ میں گرفتار ہوئے اور میانوالی جیل میں ایک سال تک قید رہے۔ رہا ہونے کے بعد پھر "زمیندار" کو سنبھالا۔ ۲۱ مارچ ۱۹۲۷ء کو زمیندار کی ایڈیٹری سے استعفیٰ دیا اور ۲۰ اپریل ۱۹۲۷ء کو مولانا غلام رسول مہر کے ساتھ مل کر "انقلاب" نکالا۔ تقسیم ملک کے بعد تک نہایت کامیابی اور نہایت شہرت کے ساتھ نکلتا رہا۔ پھر مولانا کراچی چلے گئے اور دو سال تک وہاں علمی مشاغل میں مصروف رہے۔ ۱۹۵۳ء میں لاہور واپس چلے آئے۔ تقسیم ملک کے وقت تک اپنی سوانح عمری "سرگذشت" کے نام سے آپ نے لکھی ہے جو نہایت دلچسپ ہونے کے علاوہ پوری نصف صدی کی سیاسی سرگرمیوں کی تاریخ ہے۔ اور پڑھنے کے قابل چیز ہے۔ ۱۹۵۳ء کے فسادات کے متعلق "تحقیقاتی رپورٹ" کا بھی ترجمہ آپ ہی نے کیا۔ لاہور کی ادبی مجالس کی رونق آپ ہی کے دم سے تھی۔ شاعری کا آغاز ۱۹۰۶ء سے ہوا۔ کلام بہت ہی پرمغز۔ بلند پایہ اور لطیف ہوتا ہے۔ آپ موجودہ دور کے مزاح نویسوں کے امام سمجھے جاتے تھے۔ "افکار و حوادث" کا تاریخی کالم آپ کی لازوال شہرت کا باعث ہے۔ چچا اور دیگر فسانے چترا۔ نیا چاند۔ الف لیلہ جدید۔ خود کشی کی انجمن۔ راجہ کا ہیرا۔ قصر ساحل۔ آئین حکومت ہند۔ امداد باہمی۔ کاریگری۔ ایجادات۔ داستانیان فرنگ۔ سیاحوں کی کہانیاں۔ تدریس مذہبیات وغیرہ آپ کی تصانیف ہیں۔ راہ و رسم منزلہا۔ ان کی ابتدائی نظموں کا مجموعہ ہے۔ تازہ تصانیف "ذکر اقبال" "یاران کہن" ہیں۔ ۷ ستمبر ۱۹۵۹ء کو انتقال کیا۔

سکندر علی وجد - آپ کا نام سکندر علی اور وجد تخلص ہے۔ ۱۹۱۴ء میں بمقام اورنگ آباد (دکن) پیدا ہوئے۔ تعلیم حیدر آباد دکن میں پائی اور عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ اے ہونے کے بعد ریاست کے مختلف اضلاع میں ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ پر تعینات رہے۔

وجد صرف غزل گو شاعر ہی نہیں۔ بلکہ نظم کے میدان میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور بہت کامیاب رہے ہیں۔ "لمو ترنگ" اور "آفتاب تازہ" ان کے کلام کے دو مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔

سلام - سلام صاحب بنگال کے قصبہ کھلنی شہر میں غالباً یکم جولائی ۱۹۲۳ء کو پیدا ہوئے۔ "میرے نغمے" اور "سیتی"

ان کے کلام کے دو مجموعے شائع بھی ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے حالات اور کلام کا انتخاب خود رسالہ داستان لاہور کے "نوجوان شاعر نمبر" میں دیا تھا جو ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ سوائی حالات میں سوائے الفاظ کے ایک فقرہ بھی ہمیں ایسا نہ ملا جو ہم اس تذکرہ میں شامل کر سکتے۔ صرف اتنی سی بات "سوانح" سے ہم اخذ کر سکے کہ یہ حالات لکھتے وقت سلام صاحب کی عمر اکیس بائیس سال کی تھی۔ اور یہ کی تاریخ ہمنے عرض ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے مضمون سے نقل کی ہے۔

سیف ۔ سیف الدین نام۔ سیف تخلص۔ امرتسر کے رہنے والے۔ مارچ ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ دسویں جماعت میں تھے کہ آزادی کے ہنگامہ خیز تحریک میں شامل ہونے کی پاداش میں دو سال کی قید ہو گئی۔ چھوٹ کر آئے اور کالج میں داخل ہوئے تو وہاں سے بھی اخراج ہو گیا۔ اس لیے تعلیم ہی کو خیرباد کہا۔ اور معاش کی تلاش میں دہلی سے کشمیر تک گئے۔ آخر میں فلمی گانے بھی لکھے۔ چنانچہ انھوں نے اس کام کو ہی اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ غزل گو شعراء میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ کلام کے مجموعہ کا نام "نغمہ کامل" ہے۔

شاد عارفی ۔ خان احمد علی نام ہے۔ شاد تخلص۔ ریاست لوہارو میں ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ لیکن تمام ریاست مالیر کوٹلہ میں رہتا ہے۔ "سماج" ان کی تصنیف ہے۔

شاعر لکھنوی ۔ لکھنؤ کے نوجوان شعراء میں شاعر لکھنوی امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ عام طور پر غزل کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ ان کی نظمیں بھی اکثر دیکھنے میں آتی ہیں۔ لیکن وہ بھی ایک طرح کی غزلیں ہی ہوتی ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد ترک وطن کر کے پاکستان آ گئے۔ پہلے لاہور رہے تھے، اب کراچی میں ہیں۔ عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی نام محسن ہے۔ شاعر تخلص کرتے ہیں۔

شوکت تھانوی ۔ "سودیشی ریل" کے موجد۔ کتابی "مصنف اور ریڈیو کے "قاضی جی" کو کون نہیں جانتا۔ جو ان کے تعارف کی ضرورت ہو۔ مزاح نگاری اور ظرافت کی شہرت کو اپنے ساتھ لکھنؤ سے پاکستان لائے۔ جہاں یہ شہرت اور بھی زیادہ پھیل پھول گئی۔ اور شہرت و مقبولیت کے اس درخت میں بہت سے شیریں اور مزے دار پھل لگے۔ جو ان کے قدردان کھاتے اور لطف اٹھاتے ہیں۔ آپ مزاح نگار۔ فسانہ نویس۔ ناولسٹ اور صحافی ہونے کے علاوہ شاعر بھی واقع ہوئے ہیں اور "گلستان" کے نام سے مدت ہوئی اپنا مجموعہ کلام بھی شائع کر چکے ہیں۔ ان کے مزاحیہ مضامین کے ابتدائی مجموعے طغیان تبسم۔ دنیائے تبسم۔ موج تبسم۔ بحر تبسم اور سیلاب تبسم ہیں اور پنجاب میں ان کی سب سے پہلی کتاب ۱۹۴۲ء میں "شیش محل" شائع ہوئی۔ ان کا سب سے مشہور فسانہ "سودیشی ریل" کے نام سے ۱۹۳۰ء میں چھپا۔ جس نے ان کے نام کو ملک کے آخری کونے تک مشہور کر دیا۔ پاکستان ہندوستان کے مزاحیہ نگاروں میں ان کا نام آج سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اب تک ساٹھ ستر کتابیں لکھ چکے ہیں جو کتاب لکھتے ہیں۔ فوراً قبولیت کے پر لگا کر اڑ جاتی ہے۔ محمد عرنم ہے۔ مگر آج نام کو کوئی جانتا بھی نہیں اور شوکت تھانوی کو سب جانتے

ہیں۔ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر (یو۔پی) میں ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ شاعری کا دورہ زمانہ تعلیم ہی میں پڑ گیا تھا۔ ۱۹۲۶ء میں مراسلہ نگاری شروع کی اور ایسی کی کہ حد ہی کو پہنچا کر چھوڑا۔ کافی عرصہ فلم کمپنیوں میں بھی کام کیا۔ اخباروں کی ملازمت بھی کی یا خود بھی اخبار نکالے۔ تقسیم ملک سے پہلے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں تھے۔ تقسیم کے بعد لاہور آ کر ریڈیو پاکستان میں ملازم ہو گئے۔ آجکل کراچی کے روزنامہ جنگ میں کام کر رہے ہیں۔

شہرت بخاری۔ آپ کا نام سید محمد انور ہے اور تخلص شہرت۔ عام طور پر شہرت بخاری کے نام سے مشہور ہیں۔ ۲ دسمبر ۱۹۲۵ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ انٹرنس کا امتحان لاہور ہی میں پاس کیا۔ جس کے بعد مالی پریشانیوں اور اقتصادی مشکلات کے باعث اپنی تعلیم آگے جاری نہ رکھ سکے۔ مگر پرائیویٹ طور پر ادبی لیاقت برابر بڑھاتے رہے۔ شروع میں حصول معاش کی خاطر ایک لوہے کے کارخانہ میں مزدوری بھی کی۔ مگر ہمت کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اور ترقی کی امنگ مسلسل دل کو دلاسا دیتی رہی۔ بالآخر سخت نامساعد حالات کی موجود گی میں آپ نے ایم۔ اے پاس کر ہی لیا۔ آج کل مغربی پاکستان کی لنگویج کمیٹی میں مترجم کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ "غزلیں" ان کے مجموعہ کلام کا نام ہے۔

ضیا جالندھری۔ سید نثار احمد نام۔ ضیا تخلص۔ ۱۹۲۳ء میں بمقام جالندھر پیدا ہوئے۔ وطن میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے پاس کیا۔ پہلے کچھ دنوں اسلامیہ کالج میں لکچرار رہے۔ پھر آل انڈیا ریڈیو میں چلے گئے۔ آج کل مشرقی پاکستان کے اسسٹنٹ پوسٹ ماسٹر جنرل ہیں اور ڈھاکہ میں قیام پذیر ہیں "سرِ شام" ان کی نظموں کا مجموعہ ہے۔

ظفر تاباں۔ ظفر تاباں دبلی میں پروفیسر تھے۔ تقسیم ملک سے پہلے اُن کا انتقال ہو گیا۔

سراج الدین ظفر۔ سراج الدین ظفر ایک قابل ادیب اور شاعر ہیں۔ ان کی والدہ مسز عبدالقادر مشہور فسانہ نگار خاتون ہیں۔ سراج الدین ظفر جبلپور کے باشندے ہیں اور ۲ مارچ ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ایل۔ ایل۔ بی پاس کرنے کے بعد چند روز وکالت کی۔ پھر ہوائی فوج میں افسر ہو کر چلے گئے جب طبیعت گھبرائی تو ملازمت چھوڑ کر تجارت شروع کی۔ آج کل کراچی میں مقیم اور فیروز سنز سے متعلق ہیں۔ شعر و شاعری کا شوق اور فسانہ نویسی کا ذوق بچپن سے ہے۔ شاگرد کسی کے نہیں۔ ہر صنفِ سخن میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا کلام اکثر رسائل میں چھپتا رہتا ہے۔ "زمزمۂ حیات" ان کی نظموں کا مجموعہ اور "آئینے" اُن کے فسانوں کا مجموعہ ہے۔

یوسف ظفر۔ نام شیخ محمد یوسف تخلص ظفر۔ وطن گوجرانوالہ۔ یکم دسمبر ۱۹۱۴ء کو مری میں پیدا ہوئے۔ رسالہ

ہمایوں لاہور کے ایڈیٹر رہے۔ اس کے بعد ریڈیو پاکستان میں چلے گئے۔ کچھ دنوں اخبار آزاد کشمیر راولپنڈی کے ایڈیٹر رہے۔ بی۔ اے ۱۹۳۶ء میں کیا تھا۔ زنداں اور زہرخند ان کی نظموں کے مجموعے اور "شمشوار" ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ چھول بالا اور روح زندگی ان کی ابتدائی کتابیں ہیں۔

ظہیر کاشمیری ۔ غلام دستگیر کشمیری ۱۹۲۰ء میں بمقام امرتسر پیدا ہوئے۔ ظہیر تخلص ہے۔ تعلیم بی۔ اے تک ہے۔ لاہور میں قیام ہے۔ "عظمت آدم" ان کے مجموعہ کلام کا نام ہے۔

عابد ۔ سید عابد علی عابد لاہور کے رہنے والے شاعروں میں خاص درجہ رکھتے ہیں۔ وطن لاہور ہے۔ ۷ ستمبر ۱۹۰۲ء کو پیدا ہوئے۔ والد فوج میں ملازم اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں مقیم تھے۔ اسی لیے ابتدائی تعلیم وہیں پائی۔ انٹرنس رنگ محل مشن ہائی سکول لاہور سے ۱۹۱۹ء میں کیا۔ ۱۹۲۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے اور ۱۹۲۵ء میں ایل۔ ایل۔ بی کیا۔ اسی دوران میں آپ نے رسالہ "نقش" اور "ہزار داستان" کی ادارت بھی کی۔ اپنے وقت میں دونوں رسالے اردو ادب کے نہایت شاندار نمونے تھے۔ "ہزار داستان" نہایت دلچسپ اور پُرلطف سلسلہ اور مختصر فسانوں کے لیے مشہور تھا۔ فی نہال اور دورِ جدید کے بھی ایڈیٹر رہے۔ بعد ازاں زرعی دنیا اور صادق کی بھی کچھ دنوں ایڈیٹری کی۔ آج کل مجلس ترقی ادب کے سرماہی مجلہ صحیفہ کے اعزازی مدیر ہیں۔

ایل۔ ایل۔ بی ہونے کے بعد آپ نے گجرات میں وکالت شروع کی۔ مگر جس دل میں ادبی امنگ اور شعری ذوق ہو اُس کا دل قانون جیسے خشک مضمون میں کیا لگ سکتا ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں اُسے خیرباد کہہ کر لاہور چلے آئے اور ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ جس کے بعد ۱۹۳۴ء میں ایف۔ سی کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ اس کے بعد نظم "پوتر گنگا" کا ڈائیلاگ لکھنے کے لیے بمبئی چلے گئے۔ وہاں سے واپس آکر ۱۹۴۲ء میں دیال سنگھ کالج کی پروفیسری سنبھالی۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے کے بعد اُس کے پرنسپل مقرر ہو گئے۔ مگر کچھ دنوں بعد کالج کے ٹرسٹیوں سے اختلاف کے باعث علیحدہ ہو گئے۔ آپ پاکستان کے چوٹی کے شعراء میں سے ہیں۔ ادبی مذاق بھی بہت اعلیٰ پایہ کا ہے۔ فن موسیقی میں بھی بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ گفتگو اور تحریر دونوں شگفتہ اور پُرلطف ہوتی ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے نقاد اور ملک کے مشہور ادیب ہیں۔ حجاب۔ زندگی۔ چاندنی قسمت۔ دُکھ سُکھ۔ درد سہاگ۔ نیرنگ۔ طلسمات۔ روپ متی اور دلی میں قتل عام۔ یہ بیتہ۔ شہباز خاں۔ نشہ۔ بشر ہے کیا کہئے۔ انتقاد اردو کا تنقیدی سرمایہ۔ گلہائے بہار۔ اصول انتقاد ادبیات وغیرہ آپ کی تصنیفات ہیں۔ کلام کا انتخاب شب نگار بندراں کے نام سے شائع ہوا ہے۔ آپ کی تازہ تالیفات تلمیحات اور شعر اقبال ہیں۔

عارف عبدالمتین ۔ عبدالمتین نام ہے اور عارف تخلص۔ یکم مارچ ۱۹۲۶ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ایم اے او کالج امرتسر سے ۱۹۴۵ء میں ایم۔ اے اور سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے ۱۹۵۰ء میں بی۔ ٹی کا امتحان پاس کر کے کچھ

دولت آباد، ویمنس ٹیکنیکل امرتسر اور اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں کلرکی کی۔ مگر جلد ہی کلرکی سے طبیعت اُکتا گئی اور اُسے چھوڑ کر محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔ آج کل اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ لاہور میں طلباء کو سائنس پڑھاتے ہیں۔ دیدہ و دل اُن کے بچھائے ہوئے کا نام ہے۔

عارف صاحب ترقی پسند مصنفین میں سے ہیں۔ امرتسر میں انھوں نے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری سے مل کر وہاں کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے تن بے جان میں اڑسر نو جان ڈالی۔ اور لاہور آئے تو یہاں بھی اس انجمن سے عرصہ تک وابستہ رہے۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک انھوں نے بحیثیت ایڈیٹر میدان صحافت میں کام کیا اور اس دوران میں ادب لطیف، سویرا اور جاوید کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آج کل بھی ماہنامہ مجسمہ راولپنڈی کے اعزازی مدیر ہیں۔

عدمؔ ۔ سید عبدالحمید نام۔ عدمؔ تخلص۔ ماہ جون ۱۹۰۹ء میں بمقام تلونڈی موسیٰ خاں (ضلع گوجرانوالہ) پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت لاہور میں ہوئی۔ اور یہیں سے بی۔ اے پاس کیا۔ پھر فوجی ملازمت سے منسلک ہو گئے۔ آج کل ملٹری اکاؤنٹ کے محکمہ میں آڈیٹر ہیں۔ ابتداہی سے شعر و شاعری کا شوق ہوا۔ کسی کی شاگردی نہیں کی۔ مسلسل مشق و مزاولت کے باعث کلام میں بڑی روانی پیدا ہو گئی ہے۔ اور ان کا شمار پاکستان کے مشہور شعراء میں ہوتا ہے۔ "نقش دوام"، "خرابات"، "نزلب پریشاں"، "بیخ و خم"، "مدگر دش جام"، "قول و قرار"، "شہر خوباں" ان کی تصنیفات ہیں جزا برد، باغ و بہار۔ اور غریب و شہود ان کی تصنیفات میں۔

عرشؔ ملسیانی ۔ بالکند عرشؔ ملسیانی پنڈت لعل رام جوش جیسے فاضل استاد کے لائق فرزند ہیں۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۸ء کو ملسیان ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ باپ کا ادبی ذوق پوری طرح بیٹے میں منتقل ہوا۔ اور آپ دور حاضر کے نہایت کامیاب اور مقبول شعراء میں۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد مدرسی کی لائن اختیار کی۔ اور پندرہ برس تک یہ شغل جاری رکھا۔ آج کل دہلی کے سرکاری ماہنامہ "آج کل" کے ایڈیٹر ہیں۔ کلام کے دو مجموعے ہفت رنگ اور چنگ و آہنگ چھپ چکے ہیں۔ جن کی زبان نہایت شستہ۔ شائستہ۔ سلیس اور بامحاورہ ہے۔

عشرتؔ رحمانی ۔ عشرتؔ رحمانی ۱۹ اپریل ۱۹۰۵ء کو رامپور (یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اُردو فارسی تعلیم گھر پر ہوئی..... انگریزی تعلیم رامپور۔ کلکتہ۔ دہلی اور لاہور میں حاصل کی۔ فارسی اور انگریزی میں آنرز کرنے کے علاوہ ہندی اور بنگلہ بھی سیکھیں۔ نیز ٹیچرز ڈپلوما حاصل کیا۔ ۱۹۲۴ء سے شعر و شاعری اور مضمون نگاری کا شوق ہوا۔ دہلی میں کچھ عرصہ اردو فارسی اور معاشرتی علوم کے معلم بھی رہے۔ یکم مئی ۱۹۳۵ء سے آل انڈیا ریڈیو دہلی میں اسسٹنٹ پروگرام ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں پروگرام ڈائرکٹر ہو گئے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے اور اب تک یہ سلسلہ قائم ہے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔

عندلیب شادانی ۔ ان کا نام وجاہت حسین ہے ۔ اور عندلیب تخلص کرتے ہیں ۔ شادانؔ ان کے اُستاد سید اولاد حسین کا تخلص ہے ۔ اُس کی نسبت سے عندلیب شادانی کہلاتے ہیں ۔ سنبھل ۔ ضلع مراد آباد (یو ۔ پی) میں یکم دسمبر ۱۹۰۶ء کو پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم اپنی ننھیال رامپور (ریاست) میں پائی ۔ بڑے ہو کر منشی فاضل پاس کرنے کے بعد ۱۹۲۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے ایم ۔ اے کیا ۔

تعلیم سے فراغت کے بعد پہلے ہندو کالج دہلی میں اور پھر ڈھاکہ یونیورسٹی میں لکچرار مقرر ہوئے ۱۹۳۱ء میں لندن سے پی ۔ ایچ ۔ ڈی کا امتحان دیا اور ڈھاکہ واپس چلے آئے ۔ جہاں آپ اردو اور فارسی کے شعبہ کے صدر رہے ۔ شاعری کا شوق بچپن سے پیدا ہوا ۔ اور برابر بڑھتا رہا ۔ اس فن میں کسی کے شاگرد نہیں ۔ تصنیفات ۔ اب تک حسب ذیل ہیں ۔

عہد حاضر اور اردو غزل گوئی ۔ تحقیقات ۔ چھوٹا خدا ۔ نوشہ فیشن ۔ بچی کہانیاں ۔ ترجمہ ۔ انشاء ابوالفضل ۔ ترجمہ و تشریح رباعیات بابا طاہر ہمدانی ۔ ترجمہ چہار مقالہ ۔ نقش بدیع ۔ لغت فارسی جدید ۔

آپ کے کلام کا مجموعہ نشاط ، نغمہ کے نام سے شائع ہو چکا ہے ۔

احمد فراز ۔ احمد شاہ نام ہے اور فراز تخلص ۔ احمد فراز کے نام سے پکارے جاتے ہیں ۔ سرحد کے مشہور شاعر برق کوہاٹی کے فرزند ہیں ۔ ۱۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو پشاور میں پیدا ہوئے ۔ بچپن سے شعر و شاعری کا ذوق تھا ۔ اسی لیے سکول چھوڑ کر ریڈیو پاکستان میں ملازم ہو گئے ۔ پاکستان بننے کے بعد شعر کہنے شروع کئے ۔ پہلے گوہر تخلص کیا پھر بدل لیا ۔

فراق ۔ رگھوپتی سہائے فراق منشی گورکھ پرشاد عبرت کے لڑکے اور گورکھ پور کے باشندے ہیں ۔ ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے ۔ تعلیمی لحاظ سے ایم ۔ اے ہیں اور یو ۔ پی کے مختلف کالجوں میں پروفیسر رہے ہیں ۔ آج کل الہ آباد میں ہیں ۔ شعر و سخن کا شوق بچپن سے ہے ۔ فن شعر میں ناصری مرحوم اور وسیم خیرآبادی کے شاگرد ہیں ۔ غزلوں میں امیر مینائی کا رنگ غالب ہے ۔ غزل گو شعراء میں ان کا درجہ بہت بلند ہے ۔ بلکہ غزل میں نئی طرز کے موجد ، جتنے بڑے یہ شاعر ہیں ۔ اتنے ہی بڑے نقاد ہیں ۔ "اندازے" ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے ۔ روح کائنات ۔ شبستان ۔ روپ ۔ روح کائنات ۔ مشعل ۔ شعلہ و ساز ۔ ان کے کلام کے مجموعے ہیں ۔

فیض ۔ فیض احمد نام ۔ فیض تخلص ۔ سلطان محمد خان بیرسٹر سیالکوٹ کے فرزند ہیں جو کشمیر کے دربار میں افغانستان کے سفیر تھے ۔

سال پیدائش میں اختلاف ہے ۔ ایک تذکرہ میں ۱۹۱۰ء ۔ ایک میں ۱۹۱۱ء اور ایک میں ۱۹۱۲ء لکھا ہے ۔ بی اے مرے کالج سیالکوٹ سے اور ایم ۔ اے گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس کیا ۔ اورنٹیل کالج لاہور سے عربی کا ایم ۔ اے بھی کیا ۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۰ء تک ایم ۔ اے او کالج امرتسر اور ہیلی کالج لاہور میں پڑھاتے رہے ۔ ۱۹۴۲ء میں گورنمنٹ ہند کی فوجی ملازمت اختیار کی جو پانچ سال تک رہی ۔ بعد میں لاہور آکر ۱۹۴۶ء میں پاکستان ٹائمز اور ۱۹۴۸ء میں روزنامہ امروز کے چیف ایڈیٹر

مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں عالمی امن کونسل میں پاکستان کے نمائندے مقرر ہوئے جنوری ۱۹۵۳ء میں انھیں مفسدہ سازش راولپنڈی میں ۷ سال کی سزا ہوئی۔ ۱۹۵۵ء کے مارشل لا میں بھی کچھ دنوں نظر بند رہے۔ پھر چھوڑ دیئے گئے۔ فیضؔ اعلیٰ درجہ کے خوش گو شاعر مشہور نقاد اور اچھے صحافی ہیں۔ ادب اور شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں کے تین مجموعے نقش فریادی، دست صبا اور زنداں نامہ چھپ چکے ہیں۔ تنقیدی مضامین کا مجموعہ "میزان" زیر طبع ہے۔

قتیلؔ شفائی ۔ نام اورنگ زیب۔ تخلص قتیلؔ شفائی۔ وطن ہری پور (ہزارہ) تاریخ پیدائش ۲۵ دسمبر ۱۹۱۹ء نوعمری ہی میں راولپنڈی کے حکیم شفاؔ کے شاگرد ہو گئے۔ اس لیے قتیلؔ شفائی کہلاتے ہیں۔ والد کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا۔ اس لیے اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ جوان ہوئے تو تلاش معاش کے سلسلہ میں کہیں چونگی کی محرری کی۔ کہیں لاریوں کے اڈے پر ملازمت۔ شعر اور گیت کہنے کا شروع سے شوق تھا۔ آج کل فلموں کے گیت بھی لکھتے ہیں۔ دو برس تک "ادب لطیف" کی ادارت بھی کی اور ہفتہ وار رسالہ "ادا کار" میں بھی کام کیا۔ لاہور آ کر اُن کی شعری صلاحیتیں پورے عروج پر آئیں اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے لاہور کے ادبی حلقوں میں مشہور ہو گئے۔ گیت بھی خوب لکھے اور غزلیں بھی خوب کہیں۔ منظوم ڈرامے۔ ریڈیو فیچر۔ سینکڑوں نظمیں۔ بیسیوں مثنویاں اُنھی کی تصنیف ہیں۔

قتیلؔ کی شاعری اور اُن کے گیتوں پر مفصل تبصرہ مولف "ادبیات سرحد" نے ۲۰ صفحات پر کیا ہے۔
ہریالی۔ گجر۔ جھلر تنگ۔ بانسار اور روزن ان کی نظموں کے مجموعے ہیں۔

ماہرؔ القادری ۔ نام منظور حسین۔ تخلص ماہرؔ۔ سلسلہ قادری اور وطن کبیر کلاں (ضلع بلند شہر) ہے۔ والد کا نام محمد عشق علی تھا۔ جو ظریفؔ تخلص کرتے تھے۔ سال ولادت ۱۳۲۴ھ (۱۹۰۶ء) ہے۔ نام سے تاریخ نکلتی ہے۔ تحصیل علم کے بعد مختلف مقامات میں قیام رہا۔ کئی سال حیدر آباد میں ملازمت کی۔ پھر بمبئی چلے آئے۔ اس کے بعد دہلی کا رُخ کیا۔ کچھ دنوں بجنور میں رہ کر مدینہ اور منیجر کی ادارت کی۔ ۱۹۳۳ء میں بلاد اسلامیہ کا سفر بھی کیا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آ کر کراچی میں مقیم ہیں۔ کراچی پہنچ کر رسالہ "خاندان" جاری کیا۔ اس وقت تک بیس پچیس کتابیں لکھ چکے ہیں جن میں "دُرِ یتیم" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری ہے۔ روزنامچے۔ آخری رسول۔ طلسم حیات بھی آپ کی تصنیفات ہیں۔ کلام کے مجموعے "محسوسات ماہرؔ" جذبات ماہرؔ۔ نغمات ماہر اور ذکر جمیل ہیں۔ غزل میں بے اعتدالی اور لااُبالی پن سے احتراز کرتے ہیں۔ مذہب اسلام۔ تاریخ اسلام اور اسلامی ادب سے بہت گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔

مجازؔ ۔ نام اسرار الحق۔ تخلص مجازؔ۔ والد شیخ سراج الحق تھے۔ ۱۹۱۱ء میں قصبہ ردولی۔ ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں علی گڈھ سے بی۔ اے کیا۔ پھر آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم ہو گئے۔ محکمہ اطلاعات بمبئی اور براڈ کاسٹنگ لائبریری دہلی میں بھی کچھ دنوں نوکری کی۔ لیکن طبیعت لاابالی پائی تھی۔ نوکری چھوڑ کر گھر بیٹھ گئے۔ اور شعر و شاعری کے مشوق میں ساری عمر گزار دی۔

۵ دسمبر ۱۹۵۹ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔
آہنگ۔ شب تاب اور ساز نوا ان کی نظموں اور غزلوں کے مجموعے ہیں۔ جو شائع ہو چکے ہیں۔ کلام میں روانی اللہ شیریں دونوں باتیں ملتی ہیں۔

مختار صدیقی ۔ نام مختار الحق۔ تخلص مختار۔ آبائی وطن سیالکوٹ تھا۔ لیکن والد نے گوجرانوالہ میں رہنا شروع کر دیا۔ لہٰذا اب وہی وطن بن گیا۔ صدیقی صاحب یکم مارچ ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے تھے۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد کچھ عرصہ کلرک رہے۔ پھر ریڈیو پاکستان میں پروگرام اسسٹنٹ منتخب ہو گئے۔ آج کل راولپنڈی میں تعینات ہیں۔ فن شعر میں سیماب اکبر آبادی کے شاگرد ہیں۔ ان کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر بات کو ایک نئے ڈھنگ سے نظم کرتے ہیں۔ جس سے نظم کی دلکشی اور دلچسپی میں نمایاں اضافہ ہو جاتا ہے۔

آنند نرائن ملا ۔ پنڈت آنند نرائن المتخلص بہ ملا پنڈت جگت نرائن ملا کے فرزند اور لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۳ء میں ایم۔ اے اور ۱۹۲۵ء میں ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کیا۔ اردو فارسی کی تعلیم مولانا برکت اللہ رضا فرنگی محلی سے پائی۔ پہلے انگریزی میں شعر کہنے شروع کیے پھر اردو میں۔ مگر کسی سے اصلاح نہیں لی۔ کلام کے مجموعے کا نام "جوئے شیر" ہے۔

میراجی ۔ نام ثنا اللہ ڈار تھا۔ ایک بنگالی طالبہ میرا سین کے عشق میں ایسے بیخود اور از خود رفتہ ہوئے کہ اس کے نام پر اپنا نام میراجی رکھ لیا۔ ادبی ساری عمر اس کی یاد اور محبت میں گزار دی۔ شروع شروع میں لاہور کے ادبی رسائل میں مضامین اور نظمیں لکھیں جو اپنی ندرت۔ سلاست۔ عمدگی اور خوبی کے باعث نہایت درجہ مقبول ہوئیں اور بہت جلد ایک نوجوان ادیب اور شاعر کی حیثیت سے لاہور کی ادبی مجالس کی رونق بن گئے۔ بعد میں انھوں نے دوسرے ادیبوں کے ساتھ مل کر حلقہ ارباب ذوق کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۱ء تک "ادبی دنیا" کے نائب ایڈیٹر رہے۔ پھر ریڈیو میں ملازم ہو کر دہلی چلے گئے۔ وہاں سے بمبئی گئے اور اختر الایمان کی شراکت میں "خیال" جاری کیا۔ شراب کی کثرت نے صحت کا بالکل ستیاناس کر دیا۔ یہانتک کہ نہایت بے بسی بے کسی اور کس مپرسی کی حالت میں ایک ہسپتال کے اندر چند روز بیمار رہ کر ۳ نومبر ۱۹۴۹ء کو انتقال کیا۔ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے تھے بقول بعض ۱۹۱۲ء میں۔ ان کی تصانیف میراجی کی نظمیں۔ میراجی کے گیت۔ اور نگارخانہ وغیرہ ہیں۔

ناصر کاظمی ۔ ناصر رضا نام ہے اور ناصر تخلص۔ انبالہ میں ۸ دسمبر ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد سلطان تھا۔ جو فوج میں صوبیدار میجر تھے۔ ناصر صاحب نے لاہور میں بی۔ اے تک پڑھا مگر امتحان نہ دے سکے۔ سر عبدالقادر مرحوم کی یاد گار میں ان کے لڑکوں نے جو رسالہ "اوراق نو" کے نام سے نکالا تھا۔ اس کے مدیر بھی تھے۔ پھر ہمایوں کے ایڈیٹر ہو گئے۔ آپ نہایت

سلجھے ہوئے غزل گو شاعر ہیں۔ کلام کا مجموعہ "برگ نے" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ نوجوان شعراء میں خاصے مشہور ہیں۔

احمد ندیم قاسمی ۔ احمد شاہ نام ہے اور ندیم تخلص کرتے ہیں۔ میر غلام نبی عرف چن بیر کے فرزند ہیں۔ ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو موضع انگہ (ضلع سرگودھا) میں پیدا ہوئے۔ پیر دادا کا نام محمد قاسم تھا۔ اسی نسبت سے قاسمی کہلاتے ہیں اور احمد ندیم قاسمی کے نام سے مشہور ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں جب مالد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو چچا اپنے ساتھ کیمبل پور لے گئے جہاں وہ ملازم تھے۔ ان کے چچا خان بہادر پیر حیدر شاہ عربی کے عالم۔ فارسی کے فاضل اور شعر و سخن کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ وہیں ان کو بھی شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اور تفسیر حقانی کا درس بھی چچا سے لیا۔ ۱۹۲۹ء میں انٹرنس پاس کیا۔ ایچ ٹن کالج بہاولپور میں داخل ہو گئے جہاں ان کے چچا ریاست کے مشیر مال ہو کر چلے گئے تھے۔ مگر ۱۹۳۳ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ جس کے باعث ان پر مصائب و آلام کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ لیکن انھوں نے ہمت نہ ہاری اور جس طرح بھی ہو پڑا ۱۹۳۵ء میں بی۔ اے کر لیا۔ اب حصول معاش کا سوال تھا۔ چار سال اس تگ و دو میں گزرے۔ آخر ۱۹۳۹ء میں ملتان کے انسپکٹر آبکاری مقرر ہوئے۔ مگر نوکری نہ طبیعت کے موافق تھی نہ ذوق کے مطابق۔ اس لیے ۲ ستمبر ۱۹۴۲ء کو مستعفی ہو کر لاہور چلے آئے۔ اور پھر تو تہذیب النسواں میں ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک کام کیا۔ اسی دوران میں کچھ مدت ماہنامہ ادب لطیف کو بھی ایڈٹ کیا۔ اسی اثنا میں ادب لطیف کے ایک مضمون کی بنا پر آپ پر ایک مقدمہ قائم ہوا۔ جو ایک سال تک چلتا رہا۔ اس سے آپ مئی ۱۹۴۵ء میں بری ہوئے۔ ستمبر ۱۹۴۶ء سے مارچ ۱۹۴۸ء تک پشاور ریڈیو میں ملازمت کی۔ اس ملازمت کے دوران میں رسالہ سویرا کی ایڈیٹری بھی کرتے رہے۔ پھر لاہور آ گئے اور محمد طفیل صاحب مالک ادارہ فروغ اردو سے مل کر رسالہ نقوش نکالا۔ اس کے ابتدائی دس پرچے ان کے اور ہاجرہ مسرور کی ادارت میں شائع ہوئے۔ ماہ مئی ۱۹۵۱ء سے نومبر ۱۹۵۱ء تک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت نظر بند رہے۔ وہاں سے آئے تو مختلف ادبی اور علمی مشغولیتوں میں مصروف رہنے کے بعد ۵ مارچ ۱۹۵۳ء کو روزنامہ امروز لاہور کے ایڈیٹر ہوئے اور اب وہاں استعفیٰ دے دیا ہے۔ شادی ۱۹۴۳ء میں ہوئی تھی۔ جس سے دو بچیاں نشاط اور ناہید ہیں۔

ملک کے نامور افسانہ پردازوں۔ معروف شاعروں اور مشہور فسانہ نگاروں میں آپ کا خاص مقام ہے۔ آپ کا منظوم کلام نہایت شستہ و شائستہ اور لطیف و دلکش ہوتا ہے۔ شعر و سخن کی ہر مجلس میں آپ کی غزلیں اور نظمیں گہری دلچسپی اور پورے ذوق و شوق سے سنی جاتی ہے۔

ذاتی لحاظ سے نہایت درجہ خلیق۔ بیحد ملنسار۔ بہت متواضع اور بڑے منکسر المزاج واقع ہوئے ہیں۔ دوستوں کے ہمدرد عزیزوں کے بھی خواہ۔ رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والے۔ دشمن کے بھی وقت پڑنے پر مدد کرنے والے۔ تکلیف پر صبر کرنے والے۔ مصائب سے نہ گھبرانے والے۔ ہر وقت خوش رہنے والے۔ تکلف سے بری ریا سے دور۔ دکھاوے سے علیحدہ۔ فیاض طبع۔ سیر چشم۔ فراخ دل۔ نیک طینت نیک سرشت۔ یہ ہیں احمد ندیم قاسمی۔

آپ کی منظوم تصانیف جلال و جمال۔ شعلۂ گل اور رم جھم ہیں۔

نثر تصنیفات اور فسانوں کے مجموعے اب تک حسب ذیل شائع ہو چکے ہیں۔

چوپال۔ بگھی۔ گرداب۔ طلوع و غروب۔ سیلاب۔ آنچل۔ آبلے۔ آس پاس۔ در و دیوار۔ سناٹا۔ انگڑائیاں۔ بیتا جیل کے شب و روز۔ نقوش لطیف۔ کیسر کیاری اور بازار حیات۔

قیوم نظر۔ عبدالقیوم نام ہے اور نظر تخلص ہے قیوم نظر کے نام سے مشہور ہیں۔ وطن لاہور۔ تاریخ پیدائش ۱۹۱۸ء ۱۹۴۲ء میں اورینٹل کالج لاہور سے اردو میں ایم۔ اے کرکے اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں عرصہ تک کام کیا۔ پھر گورنمنٹ کالج کیمپور میں لکچرار ہو گئے۔ آج کل گورنمنٹ کالج لاہور میں ہیں۔ شعر و شاعری کا شوق زمانہ طالب علمی ہی میں ہوا۔ ان کے کلام کی خصوصیت انداز بیان کی دلکشی اور سادگی ہے۔

ان کی منظومات کے دو مجموعے "قندیل" اور "پون جھکولے" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ سویدا بھی آپ ہی کی کتاب ہے۔

نہال سیوہاروی۔ منشی عبدالخالق المتخلص بہ نہال بیوہارہ ضلع بجنور (یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت ۲۷ اگست ۱۹۰۱ء ہے۔ والد کا نام قاضی عبدالواسع تھا۔ تعلیم معمولی تھی۔ جوان ہوئے تو حصول معاش کے لیے اکاؤنٹس آفس نارتھ ویسٹرن ریلوے دہلی میں ملازم ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی منتقل ہو گئے۔ جنوری ۱۹۵۲ء میں وفات پائی۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ کلام میں پختگی آتی گئی۔ کلام میں سادگی۔ سلاست۔ روانی اور جذب و تاثیر بدرجہ غایت موجود ہے۔ گلہائے نغمہ و آزادی۔ اور شباب و انقلاب اُن کی منظومات کے مجموعے ہیں۔

وحید قریشی۔ آپ کا نام عبدالوحید قریشی ہے اور وحید تخلص کرتے ہیں۔ وطن گوجرانوالہ ہے۔ مگر آپ میانوالی میں ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ ایم۔ اے کے بعد بی۔ ایچ۔ ڈی حاصل کی۔ اور آج کل اسلامیہ کالج لاہور میں لکچرار ہیں۔ "شبلی کی حیات معاشقہ" آپ کی نہایت مشہور اور دلچسپ کتاب ہے۔ مقدمہ دیوان حالی کو بھی آپ نے نہایت خوبی، عمدگی اور محنت کے ساتھ ایڈٹ کیا ہے۔ مثنوی سحر البیان، اردو تنقید۔ انتخاب سودا، انتخاب جدید اردو شاعری زیر ترتیب اور زیر طبع ہیں۔ نقوش کے غزل نمبر کے پہلے اڈیشن میں شعرائے کرام کے حالات بھی آپ نے مرتب فرمائے تھے۔ نہایت قابل اور لائق شخص ہیں ادب سے خاص ذوق رکھتے ہیں۔ حال میں آپ نے "میر حسن" پر خاص ریسرچ کی ہے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے ہیں۔

یاس یگانہ چنگیزی۔ مرزا واجد حسین نام۔ یاس و یگانہ تخلص اور وطن عظیم آباد ہے۔ ۱۸۸۴ء سال پیدائش ہے۔ پہلے بیتاب کے شاگرد ہوئے۔ بعد ازاں شاد عظیم آبادی کے۔ عظیم آباد سے لکھنؤ آکر آباد ہوئے۔ پھر واپس ترجمہ میں ملازم ہو کر حیدرآباد چلے گئے۔ لاہور بھی کچھ دنوں آکر رہے ہیں۔ نشتر یاس، چراغ سخن، آیات وجدانی۔ غالب شکن۔ ترانہ اور گنجینہ تصنیفات میں سے ہیں۔ طبیعت میں تعلی، فخر اور خود ستائی و خود پسندی کا مادہ بے حد تھا۔ اسی کی وجہ سے اکثر جگہ نقصان اور تکلیف دہ واقعات کی۔ اپنے دور تلمذ کے لئے غالب کو بھی بے حقیقت سمجھتے تھے۔ ۹ فروری ۱۹۵۶ء کو انتقال ہوا۔

اختتامیہ

میں شعرائے کرام کے حالات لکھ چکا تھا کہ جناب محمد طفیل صاحب نقوش نے "غزل نمبر" کا دو سو اایڈیشن شائع کیا۔ اور اس میں کچھ مزید شعراء کی غزلیں بھی شامل کیں۔ ان بعد کے شعراء کے حالات (جہاں تک دستیاب ہو سکے) اس اختتامیہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ ان میں سے چھ سات شعراء کے حالات میرے محترم دوست مکرمی پیام صاحب شاہجہان پوری ایڈیٹر حمایت اسلام لاہور نے میرے لیے فراہم کئے۔ جو مجھے نہیں مل رہے تھے۔ اس عنایت کے لیے میں اُن کا نہایت ممنون ہوں۔

خاکسار محمد اسماعیل پانی پتی

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد۔ نہایت فصیح و بلیغ۔ نہایت لطیف و شیریں اور نہایت سلیس و روں نشین انداز

لکھنے مولانا محمد حسین آزاد پر ختم ہے۔ ان سے پہلے اور ان کے بعد ایسی شاندار اردو لکھنے والا جس کا ہر فقرہ دل میں بیٹھتا چلا جائے۔ کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ آپ ۱۸۳۳ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی محمد باقر تھا۔ جو ایک علم دوست اور ذی علم انسان تھے اور غدر ۱۸۵۷ء میں مارے گئے۔ آزاد بھی دہلی کی تباہی کے بعد گھر سے نکلے اور تلاش معاش میں جگہ جگہ کے دھکے کھاتے ہوئے لاہور پہنچے۔ یہاں کے ڈاکخانہ میں نوکری کی درخواست دی تو جواب ملا کہ ایک ماہ تک بلا تنخواہ کام کرو۔ کام اچھا کیا تو رکھ لیے جاؤ گے۔ مصیبت کے مارے آزاد نے یہ بھی کیا اور نوکر ہو گئے۔ بعد میں لالہ پیارے لال آشوب کی سفارش سے محکمہ تعلیم میں جگہ مل گئی۔ جہاں رفتہ رفتہ ترقی کرتے کرتے آپ گورنمنٹ کالج میں عربی و فارسی کے پروفیسر ہو گئے۔ دو مرتبہ علمی تحقیقات کے لیے ایران گئے۔ اور وہاں سے بڑے نوادرات ساتھ لائے۔ ۱۸۸۸ء میں آپ کو گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ محکمہ تعلیم کے سرکاری پرچوں کا تالیف پنجاب بک ڈپو میں کے بعد پنجاب میگزین کے نائب مدیر رہے۔ کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب کے ایما سے آپ نے "انجمن پنجاب" کے جلسوں میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی ایک موضوع پر نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ یہ مشاعرے جدید شاعری کی سب سے پہلی بنیاد تھے۔ اس قسم کا سب سے پہلا مشاعرہ ۱۸۷۴ء مئی ۱۸۷۴ء کو انجمن پنجاب کے دفتر میں منعقد ہوا جس میں آزاد نے اپنی مثنوی "شب قدر" سنائی۔ شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی نے بھی ان مشاعروں میں نہایت دلچسپی سے حصہ لیا اور اپنی چار ابتدائی مثنویاں انہی مشاعروں میں پڑھ کر سنائیں۔ آخر میں اپنی ایک جوان اور لائق بیٹی کی وفات کے باعث مولانا آزاد کا دماغ مختل ہو گیا تھا اور یہ عارضہ جان کے ساتھ گیا۔ ۲۲ جنوری

۱۹۱۰ء کو اردو فارسی اور عربی کے اس لاثانی ادیب کا انتقال ہو گیا۔ اور اُردو اپنے ایک ایسے انشا پرداز سے خالی ہو گئی جس کا مثیل و نظیر پھر پیدا نہ ہو سکا۔ آزاد شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ استاد کا دیوان آپ ہی نے بڑی تلاش کے بعد فراہم کر کے شائع کیا تھا۔ آپ کا کلام مجموعہ نظم آزاد کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ آپ نے آب حیات کے نام سے لکھی۔ نیرنگ خیال۔ دربار اکبری۔ سخندان پارس۔ نگارستان فارس۔ سپاک۔ خاک وغیرہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ بچوں کی ابتدائی ریڈریں آپ نے کی لکھیں۔

جاں نثار اختر۔ جاں نثار اخترؔ تخلص۔ اختر ۱۹۱۴ء میں بلقام گوالیار پیدا ہوئے۔ آبائی وطن خیر آباد ہے مشہور معروف شاعر مضطر خیر آبادی آپ کے والد تھے۔ اختر خاندانی لحاظ سے ایک بہت بڑے ذی علم گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس کے اولو العزم مولانا فضل حق اور مولانا عبدالحق جیسے نابغہ روزگار رکھتے۔

اختر انٹرنس پاس کرنے کے بعد علیگڈھ میں تکمیل تعلیم کے لیے بھیج دیئے گئے۔ جہاں سے آپ نے ۱۹۳۷ء میں ایم اے پاس کیا۔ اور وکٹوریہ کالج گوالیار میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔

شاعری کا شوق علی گڈھ میں پیدا ہوا جو عمر کے ساتھ بڑھتا رہا۔ علیگڈھ کی زندگی میں آپ عرصہ تک کالج کی ادبی انجمن "مجلس اشعراء" اور انجمن اردوئے معلیٰ کے معتمد رہے۔ "علیگڈھ میگزین" کی ادارت بھی آپ نے عرصہ تک کی۔ مجموعہ کلام "سلاسل" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

علی اختر۔ آپ کا نام سید علی اختر ہے اور آپ نے اپنے نام کے آخری حصے کو بطور تخلص اختیار کیا۔ ان کے والد کاس گنج (ضلع ایٹہ) یو۔ پی کے متوطن تھے مگر آپ کی پیدائش علی گڈھ میں ہوئی اور تعلیم بھی وہیں پائی۔ تعلیم کے بعد حیدر آباد چلے گئے اور وہاں محکمہ آبکاری میں ملازم ہو گئے۔ مدت تک وہیں مقیم رہے۔ مگر سقوط حیدر آباد کے بعد کراچی چلے آئے۔ اور اب وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔ فارسی ادب میں بہت کافی دستگاہ رکھتے ہیں اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اصناف سخن میں غزل سے بالخصوص طبیعت کو نہایت لگاؤ ہے۔ کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

اختر تلہری۔ آپ کا نام سید اختر علی ہے اور نام ہی کے ایک حصہ کو بطور تخلص استعمال کرتے ہیں۔ مضافات شاہجہانپور میں ایک مشہور قصبہ ہے تلہر۔ آپ وہاں کے رہنے والے ہیں۔ اس لیے اختر تلہری کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ نے بی اے تک تمام امتحانات نہایت اعزاز کے ساتھ پاس کرنے کے بعد اپنے لیے معلمی کے پیشہ کو پسند فرمایا اور گورنمنٹ ہائی سکول شاہجہانپور میں مدرس مقرر ہو گئے۔ شاعری کا شوق آپ کو شروع سے تھا۔ نثر میں مضامین بھی خوب لکھتے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔

امجد حیدر آبادی۔ آپ کا نام سید امجد حسین ہے۔ نام کا پہلا جز امجد آپ نے اپنا تخلص اختیار کیا۔ حیدر آباد دکن

آپ کا وطن ہے۔ جہاں آپ ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ والد صوفی سید رحیم علی کا انتقال بچپن ہی میں ہوگیا تھا۔ امجد نے بڑے ہو کر حیدرآباد کے مدرسہ نظامیہ میں تعلیم پائی۔ اس کے بعد مولانا ناد والدین اور نواب سند الملک آغا سید علی شوستری سے عربی اور فارسی پڑھی۔ تعلیم کے بعد مقامی مدرسہ دارالعلوم میں مدرس ہو گئے۔ مگر جلد ہی اُسے چھوڑ کر محکمہ محاسبی میں ملازم ہو گئے اور ۲۵ سال تک نوکری کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے۔

ان کی زندگی کا بڑا المناک واقعہ یہ ہے کہ حیدرآباد کی موسیٰ ندی میں ۱۹۱۷ء میں ایک بڑا قیامت خیز طوفان آیا۔ اور ان کا مکان بھی اچانک اس طوفان کی لپیٹ میں آگیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ والدہ۔ اہلیہ اور بھتیجی بچی ان کی آنکھوں کے سامنے پانی میں غرق ہو گئیں۔ اس ہولناک اور جگر پاش واقعہ نے اُن کی زندگی کو سراسر بدل دیا۔ اور اُن کی شاعری درد اور تڑپ سے لبریز ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد ان کے استاد مولوی نادر الدین نے اپنی دختر کی شادی ان سے کر دی۔ یہ خاتون نہایت قابل اور لائق منتظم۔ سمجھ دار اور شوہر سے بیحد محبت کرنے والی تھیں۔ مگر سفر حج سے واپسی کے بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ جس کا صدمہ دل پر ایسا پڑا کہ امجد بالکل تارک الدنیا بن گئے۔ اور ان کی زندگی ہر دلچسپی اور ہر خوشی سے خالی ہو گئی۔ فن شعر میں حبیب کنتوری کے شاگرد ہیں۔ فارسی اشعار ترنم کو دکھایا کرتے تھے۔ ان کی نظمیں نہایت زوردار۔ نہایت پراثر اور نہایت بلیغ ہوتی ہیں۔ بالخصوص داخلی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مولوی وحید الدین سلیم۔ ڈاکٹر اقبال۔ مولانا گرامی۔ عظمت اللہ خاں اور پروفیسر مناظر حسن گیلانی نے نہایت عمدہ اور شاندار الفاظ میں ان کی شاعری کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ نذر امجد۔ جمال امجد۔ حج امجد۔ گلستان امجد۔ ریاض امجد خرقہ امجد۔ آپ کی نظم و نثر کے مجموعے ہیں۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے آپ کے خطوط کا مجموعہ شائع کیا ہے۔ اور آپ کی شاعری پر ایک مبسوط کتاب لکھی ہے۔

برق دہلوی۔ منشی مہاراج بہادر نام تھا۔ اور برق تخلص۔ منشی ہرنرائن داس حسرت کے فرزند تھے۔ قدیمی وطن سکیٹ ضلع ایٹہ (یو۔ پی) تھا۔ مگر بزرگوں نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اور وہیں برق ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ انٹرنس میں پڑھ رہے تھے کہ ۱۹۰۶ء میں والد کا انتقال ہو گیا جس سے ان پر آئندہ تعلیم کے دروازے بند ہو گئے اور یہ روزی تلاش کرنے پر مجبور ہوئے۔ جو بھی چھوٹی موٹی نوکری مل کر لی۔ مگر معاشی مجبوریوں کے باوجود تعلیم جاری رکھی۔ ۱۹۱۰ء میں منشی فاضل کا امتحان دیا اور ۱۹۱۶ء میں پرائیویٹ طور سے بی۔ اے کیا۔ ۱۹۲۲ء میں محکمۂ امتحان پاس کرنے کے بعد دہلی کے ڈاکخانہ میں سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے جب جا کر معاش کی طرف سے اطمینان نصیب ہوا۔

فن شعر میں آپ آغا شاعر قزلباش کے شاگرد تھے اور غزل گوئی اور نظم نگاری کا بہت اچھا سلیقہ رکھتے تھے۔ پانی پت میں اپنے ایک دوست لالہ شگن چند روشن کی لڑکی کی تقریب میں آئے ہوئے تھے کہ یکایک حرکت قلب بند ہونے سے ۹ فروری ۱۹۳۶ء کو انتقال کیا۔ "مطلع انوار" ان کے کلیات کا نام ہے جو بہت شگفتہ نظموں کا مجموعہ ہے۔

بیتاب عظیم آبادی۔ آپ کا نام سید کلب علی تھا۔ اور آپ سید فیضا علی کے فرزند تھے۔ پٹنہ عظیم آباد وطن تھا۔ یہ بزرگ

ساری عمر کیا کی تلاش اور جستجو میں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر سارے ہندوستان میں مارے مارے پھرتے رہے۔ مگر افسوس گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ اور ہمیشہ ایک آگ کی کسر رہی۔

(تذکرہ ذکاء بحوالہ یادگار شعرا صد ۴۲)

بے نظیر شاہ۔ ان کا نام سید محمد ہے نظیر شاہ ہے اور نام ہی کا پہلا حصہ بطور تخلص استعمال کرتے ہیں۔ یعنی بے نظیر ان کا تخلص ہے۔ شاہ صاحب ایک صوفی منش کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ کڑپا ناک پور ضلع الہ آباد ان کا وطن ہے۔ مگر وطن کی سکونت ترک کر کے حیدر آباد چلے گئے اور اسی کو اپنا وطن بنا لیا۔ مولانا شاہ احسان علی قادری ان کے والد اور بہت بڑے صاحب طریقت بزرگ تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے خلیفہ ہونے کا ان کو شرف حاصل تھا۔

بے نظیر شاہ عربی و فارسی کے ماہر کامل اور بہت اعلیٰ پایہ کے غزل گو شاعر ہیں۔ مگر جتنے اچھے غزل گو ہیں مثنوی لکھنے میں بھی ان کا پایہ اتنا ہی بلند ہے۔ چنانچہ ان کی مشہور عالم مثنوی "الکلام" جو ایک صوفیانہ رنگ کی نظم ہے۔ نہایت درجہ مقبول ہوئی اور بقول عبدالقادر سروری اردو کی کوئی مثنوی اس کے رتبہ کو نہیں پہنچ سکتی۔ اس کے اکثر حصے اردو شاعری کے جدید انتخابات کے لیے سرمایہ زینت بنے ہوئے ہیں۔ اکثر منازل طویل ہیں۔ مگر تسلسل کے اعتبار سے تقریباً سب کے سب حسن و خوبی کے بلند ترین معیار پر واقع ہیں (جدید اردو شاعری صد ۱۹۶)

ثاقب۔ آپ کا نام ابو محمد ہے۔ اور تخلص ثاقب۔ کان پور کے رہنے والے ہیں۔ جہاں آپ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۶ سال کی عمر میں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اور بہت جلد یو۔ پی اور پنجاب میں مشہور ہو گئے۔ "متاع درد" آپ کے کلام کا مجموعہ ہے جو ۱۹۲۸ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔

جگر بریلوی۔ کنور کنہیا لال کے فرزند منشی شام موہن لال المتخلص بہ جگر۔ ۱۸۹۰ء میں بمقام بریلی پیدا ہوئے۔ دس گیارہ سال تک گھر ہی پر اردو۔ فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ پھر سکول میں داخل کر دیے گئے۔ تعلیم کے مختلف مراحل طے کرنے کے بعد ۱۹۱۶ء میں بریلی کالج سے بی اے پاس کیا۔ اور نائب تحصیلدار بن گئے۔ اور اسی عہدہ سے قبل از وقت ریٹائر ہو کر خانہ نشین ہو گئے۔ فن شعر میں آپ کے استاد مرزا احمد ہادی عزیز لکھنوی تھے۔ آپ کی نظمیں اور مضامین رسالہ زمانہ۔ کانپور۔ لگاتار لکھنؤ اور ہمایوں لاہور میں اکثر چھپتے رہتے تھے "اردو اور ہند" اور رسالہ صحت زبان آپ کی تالیفات ہیں۔ مضامین کے بھی تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ غزلیات۔ رباعیات اور مثنویاں بھی انھوں نے بہت سی کہی ہیں۔ آپ کی تالیفات اور تصنیفات میں دو کتابوں کو بڑی شہرت حاصل ہوئی ایک "یادِ رفتگاں" جو ایسے ہندو مشاہیر ادب کا تذکرہ ہے جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ دوسری "بہار جاوداں" جس میں موجودہ ہندو ادیبوں اور شاعروں کے حالات ہیں۔

آپ کا جنوری ۱۹۵۶ء کے آخری دنوں میں انتقال ہوا۔

جلیل قدوائی۔ جلیل قدوائی عصر حاضر میں قدیم غزل گو شعراء کے نمائندے ہیں۔ حسرت موہانی کے دوست ہیں اور شاعری میں انہی کے قدم بقدم چل رہے ہیں۔ اصغر ماہروی کے شاگرد ہیں۔

راسخ عظیم آبادی۔ شیخ غلام علی نام، راسخ تخلص۔ ۱۱۶۲ھ (۱۷۴۹ء) میں بمقام پٹنہ عظیم آباد پیدا ہوئے۔ ابتدا میں مرزا فدوی اور مرزا شرر سے اصلاح لیتے تھے۔ آخر میں میر تقی میر کی شاگردی کی۔ اپنی جوانی کے زمانہ میں وطن سے نکل کر کلکتہ، غازی پور، دہلی اور لکھنؤ کی خوب سیر کیں۔ اور ہر جگہ شعر و سخن کے خوب چرچے رہے۔ پھر پٹنہ واپس آئے۔ اور وہیں مستقل یہاں بھی زور شور کے ساتھ جاری رکھا۔ بہار کے نامور اور مشہور شاعر ہوئے ہیں۔ مؤلف تاریخ ادب اردو کی ان کے متعلق یہ رائے ہے کہ زبان پاکیزہ اور طرز بیان صاف و سادہ ہے۔ ان کے کلام میں سادہ اشعار کے ساتھ رنگین اشعار بھی ملتے ہیں۔ ۱۲۳۵ھ (۱۸۲۲ء) یا ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۴ء) میں وفات پائی۔

رسوا۔ نام محمد ہادی۔ مرزا اور رسوا تخلص۔ آغا محمد تقی کے فرزند۔ ۱۸۵۷ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ پہلے فارسی درسیات کی تکمیل کی۔ پھر ریاضی۔ اقلیدس۔ حساب اور علم ہیئت کی تعلیم اپنے فاضل باپ سے پائی۔ لکھنؤ کے مختلف علماء سے عربی پڑھی۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ امریکہ کی اورنٹیل یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ رڑکی سے اوورسیری کا امتحان پاس کیا اور بلوچستان میں ریلوے کے محکمہ میں ملازم ہو گئے۔ مگر اس نوکری سے علم دوست طبیعت کو کیا مناسبت۔ ایک دفعہ کیمسٹری کی ایک کتاب مل گئی جسے دیکھ کر کیمسٹری کا ایسا شوق دل پر غالب ہوا کہ نوکری سے استعفیٰ دے۔ کوٹھی کا سامان نیلام کر گھر آ بیٹھے اور ولایت سے کیمسٹری کے آلات اور کتابیں منگوا کر تجربات شروع کر دیئے۔ علم کا شوق دیکھو کہ ایک لوہار کے لڑکے کو اس بات پر پڑھنا منظور کیا کہ وہ اپنی بھٹی فارغ اوقات میں ان کو تجربات کے لیے دے دیا کرے۔ آخر عمر میں عثمانیہ یونیورسٹی کے وابستہ ترجمہ میں ملازم ہو گئے تھے۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو انتقال کیا۔ اور اپنے پیچھے اپنی بہت سی تصنیفات بطور یادگار چھوڑ گئے۔ جن میں سے امراؤ جان ادا سب سے زیادہ مشہور ہے۔ جس کا ایک ایڈیشن ادارہ فروغ اردو نے بھی گذشتہ دنوں شائع کیا تھا۔

رسوا کو فارسی، عربی۔ عبرانی۔ انگریزی۔ ہندی اور سنسکرت پر پورا عبور تھا۔ اور وہ اپنی علمی تصنیفات میں ان سب زبانوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ وہ مغربی اور مشرقی علوم پر حاوی اور منطق۔ فلسفہ۔ ریاضی اور ہیئت کے اعلیٰ درجہ کے ماہر تھے۔ اسلام اور اس کے عقائد کا بھی انھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ۲۵ کے قریب اعلیٰ پایہ کی علمی۔ اور ادبی کتب انھوں نے لکھی ہیں۔ جیسا اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے ویسے ہی بلند پایہ ادیب اور انشا پرداز بھی تھے۔ لطف زبان اور شگفتگی بیان کوئی ان کی کتابوں سے سیکھے۔ طبیعت کے نہایت بھولے بھالے۔ سادہ مزاج۔ تکلف اور تصنع سے دور۔ صاف دل۔ مخلص۔ غیور اور بہت ہی زندہ دل انسان تھے۔ ان کی شہرت بہ نسبت ایک شاعر کے ایک نثر نویس زیادہ ہے۔ علاوہ امراؤ جان ادا کے اختری بیگم۔ ذات شریف۔ عصمت۔ بہرام کی رہائی۔ خونی جورو۔ شمشاد۔ شمشاد لذت فنا۔ شمشاد بہار ہند۔ شمشاد امید و بیم۔ شمشاد لیلیٰ مجنوں اور کلیات اردو ان کی تصانیف ہیں۔ خالص علمی اور سائنٹیفک کتابیں بھی انھوں نے متعدد لکھی ہیں۔

رواں ۔ نام چودھری جگت موہن لال اور تخلص رواں تھا۔ یکم جنوری ۱۸۸۵ء کو اناؤ (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام چودھری گنگا پرشاد تھا۔ ابھی رواں کی عمر ۷ سال ہی کی تھی کہ شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بڑے بھائی چودھری کنہیا لال نے اُن کی تعلیم کا انتظام کیا۔ رواں نے ذہین اعلیٰ اور حافظہ بہت اچھا پایا تھا۔ ایم۔اے اور ایل۔ایل۔بی کے امتحانات نہایت اعزاز سے پاس کئے اور وطن ہی میں وکالت کرنے لگے۔ جلد ہی سارے اناؤ میں ان کی لیاقت کا سکہ بیٹھ گیا۔ اور وہ شہر کے مشہور وکلاء میں شمار ہونے لگے۔ فنِ شعر میں آپ عزیز لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ کلام نہایت شگفتہ۔ مؤثر اور زوردار ہوتا ہے۔ سید اعجاز حسین اعجاز ایم اے اپنی تاریخ ادب اردو میں اُن کے متعلق یہ رائے ظاہر کرتے ہیں۔

"اُن کی نظمیں کردار کی بلندی کا نہایت عمدہ نمونہ ہیں۔ صاف گوئی و سچ کردار نگاری اُن کی نظموں کی دو نمایاں خصوصیات ہیں۔ وارداتِ حسن و عشق کو جہاں بیان کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ خود انہی کے دل پر کیفیت گزر رہی ہے۔ مناظرِ قدرت کے بیان میں خاص امور کو نہایت پر اثر انداز میں نظم کرتے ہیں۔ غیر مادی چیزوں پر طبع آزمائی کرتے وقت نہایت بلند مضامین لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نظموں میں عام طور سے روانی ہے۔ لیکن کہیں کہیں ناہمواری بھی پیدا ہو گئی ہے۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں بعمر ۵۱ سال انتقال کیا۔ "روحِ رواں" ان کے کلام کا مجموعہ ہے "رباعیاتِ رواں" لاہور سے عرصہ ہوا چھپی تھیں۔

سراج دکنی ۔ آپ کا نام سید سراج الدین تھا اور سراج تخلص کرتے تھے۔ شاہ سراج دکنی یا سراج اورنگ آبادی کے نام سے مشہور ہیں۔ سادات حسینی سے تعلق رکھتے تھے اور ۱۱۲۷ھ (۱۷۱۴ء) میں بمقام اورنگ آباد (دکن) پیدا ہوئے۔ تعلیم اورنگ آباد ہی میں پائی اور بقول میر تقی میر فن شعر میں سید حمزہ کے شاگرد ہوئے۔ طبیعت پر تصوف کا رنگ بچپن غالب تھا اور تمام عمر اسی رنگ میں رنگی رہے۔ شاعری کی ابتدا فارسی اشعار سے ہوئی مگر جو کچھ کہتے تھے "اپروا ہی کے باعث لکھتے نہیں تھے۔ اس لیے وہ سب کلام ناپید ہو گیا۔ یہ عبدالرحمٰن چشتی کے ہاتھ پر بیعت کر کے طریقہ چشتیہ میں منسلک ہو گئے تھے۔ نہایت صاحب دل بزرگ اور خوش فکر شاعر تھے۔ اردو کلام تقریباً پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ آخر عمر میں شعر گوئی ترک کر کے تزکیہ باطنی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ کلام سادہ مگر دل نشین اور پُر اثر ہوتا ہے۔ اور بالعموم تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا۔ ایک دیوان فارسی اشعار کا اور ایک دیوان اردو کلام کا یادگار چھوڑا۔ فارسی شعراء کے کلام کا ایک نہایت عمدہ انتخاب بھی "منتخب دیوانہا" کے نام سے کیا تھا۔ مضامین تصوف پر مشتمل ایک مثنوی "بوستانِ خیال" بھی لکھی تھی۔ اُن کا کلیات انجمن ترقی اردو نے خاص اہتمام سے شائع کیا تھا۔ ۱۶ اپریل ۱۷۶۳ء مطابق ۳ شوال ۱۱۷۶ھ کو وفات پائی۔

سردار جعفری ۔ علی سردار آپ کا نام ہے۔ اور نام ہی کی مناسبت سے سردار تخلص کرتے ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں بمقام ریاست بلرام پور (یو۔پی) پیدا ہوئے۔ شروع میں لکھنؤ کے "سلطان المدارس" میں داخل ہو کر کچھ دینی تعلیم حاصل کی۔ پھر طبیعت کو مولویت سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اس لیے اُسے چھوڑ کر بلرام پور کے ہائی مکتب میں انگریزی پڑھنے کے لیے داخل ہو گئے۔ ۱۹۳۲ء میں مڈل کالج دہلی سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۳ء میں سبط حسن اور مجاز کے ساتھ لکھنؤ سے رسالہ "نیا ادب" جاری کیا۔ طبیعت میں آزادی کی بے پناہ تڑپ تھی اور تمام سیاسی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اس لیے ۱۹۴۰ء میں گرفتار کر لیے گئے جب

بچے تو بلیئی پہلے گئے اور اب تک وہیں قیام ہے۔ علی سردار جعفری موجودہ زمانے کے ہونہار اور کامیاب شاعروں میں اور بعض بعض تنقیدی الجھنوں کے بڑی بلند بھی ہیں۔ اُن کی رومانی شاعری بھی اچھی خاصی بلند ہے۔ اپنی شاعری میں جوش ملیح آبادی اور ڈاکٹر اقبال سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ پرواز۔ خون کی کلیر اور کشمیر جاگ اٹھا۔ ان کی نظموں کے مجموعے ہیں۔

اصغر سلیم ۔ محمد اصغر آپ کا نام ہے اور سلیم تخلص کرتے ہیں۔ اصغر سلیم کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۵ نومبر ۱۹۱۹ء کو گجرات میں ہوئی۔ گجرات اور لاہور میں تعلیم کی تکمیل کرنے کے بعد فوج سے محکمہ تعلیم میں ملازم ہوگئے جہاں آپ اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

جب آپ قریباً ۱۳ سال کی عمر میں پانچویں جماعت کے طالب علم تھے۔ اُس وقت سے آپ کو شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اس لحاظ سے آپ کی شاعری کی عمر قریباً ۲۵ سال ہے۔ اس تمام عرصہ میں ملک کے مشہور ادبی رسائل میں آپ کا کلام شائع ہو کر خراج تحسین وصول کرتا رہا ہے۔ لاہور کی متعدد علمی اور ادبی مجالس میں بھی آپ سرگرمی سے حصہ لیتے رہے ہیں۔ آپ کی غزلوں کا مجموعہ "متاع ہنر" زیر طبع ہے۔

شعلہ ۔ اُن کا نام منشی بنواری لال تھا اور شعلہ تخلص کرتے تھے۔ منشی موتی لال ان کے والد کا نام تھا۔ شعلہ ۱۸۹۷ء میں بمقام سہارنپور پیدا ہوئے۔ مگر آبائی وطن حصار تھا۔ بچپنے ہی میں والد کا انتقال ہو جانے سے بڑے ہوتے ہی معاش کی فکر دامنگیر ہوگئی۔ کچھ دنوں علیگڈھ کے محکمہ بندوبست میں نوکری کی۔ پھر ملازمت کی پابندیوں سے اُکتا کر وکالت کا امتحان دیا۔ اور علیگڈھ میں وکالت کرنے لگے۔

فن شعر میں منشی بال مکند صبر اور غالب کے مشہور شاگرد مرزا تفتہ کے شاگرد تھے۔ آپ کا کلام ۱۹۳۶ء میں آگرہ یونیورسٹی کے ایم اے کے امتحان میں شامل تھا۔ نظموں اور غزلوں کا بہت سا مجموعہ یادگار چھوڑا جو کچھ طبع ہو گیا۔ کچھ نہ ہوا۔ ۱۹۰۳ء میں انتقال ہوا۔

پروفیسر شور علیگ ۔ آپ کا نام مظہر حسین ہے اور شور تخلص کرتے ہیں۔ جولائی ۱۹۱۰ء میں بمقام امراوتی (سی پی) پیدا ہوئے۔ وطن میں ابتدائی تعلیم کے بعد علیگڈھ چلے گئے۔ جہاں سے ۱۹۳۶ء میں ایم اے ایل ایل بی ہو کر فارغ ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں ناگپور یونیورسٹی میں ممدر شعبہ اردو و فارسی مقرر ہوئے اور تقسیم ملک تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ ازاں بعد پاکستان آکر مختلف کالجوں میں تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے۔ آج کل گورنمنٹ کالج لائلپور میں ہیں۔ شاعری کا آغاز علیگڈھ کی علمی فضا سے ہوا جو عمر اور وقت کے ساتھ بڑھتا گیا۔ آپ پاکستان کے خوش فکر شعراء میں ایک ہیں۔

عظیم قریشی ۔ محمد عظیم آپ کا نام ہے۔ عظیم تخلص کرتے ہیں اور عظیم قریشی کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ والد کا نام احسن قریشی ہے جو خود بھی شاعر ہیں۔ یعنی عظیم صاحب کو شاعری ورثہ میں ملی ہے۔ آپ کا آبائی وطن ٹوانہ (مشرقی پنجاب) ہے مگر آپ

۲۴ مارچ ۱۹۱۰ء کو کشمیر کی حسین و جمیل وادی اننت ناگ میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالا تو تعلیم لاہور میں پائی اور بیسویں جنرل پوسٹ آفس میں ملازمت کا آغاز ہوا۔ جو اس وقت تک جاری ہے۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ اور بارہ سال کی عمر میں پہلی غزل کہی تھی۔ اگرچہ آپ کی شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی مگر آپ نے نظم کے میدان میں شہرت حاصل کی۔ مختصر نظم لکھنے میں آپ کو خصوصیت حاصل ہے۔ یعنی ان کی اکثر نظمیں ایک ایک دو شعروں پر مشتمل ہیں۔ "رادھا کے گیت" اور "آج کے نغمے کل کے شعلے" اُن کی نظموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ غزلیات کا دیوان زیرِ طبع ہے۔

نظم کے علاوہ نثر کے میدان میں بھی آپ کا اسلوبِ قلم تیز دوڑتا ہے۔ چنانچہ "راہبہ کے محبت نامے" ان کی دلچسپ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ اور دوسری "عجب جینیس مسکراتا ہے" عنقریب چھپنے والی ہے۔

کلیم۔ آپ کا نام یکمین حسنی اور تخلص کلیم ہے۔ ۱۵ نومبر ۱۹۲۳ء کو یاسمت محمود آباد (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم محمود آباد سیتا پور اور لکھنؤ میں پائی۔ گورنمنٹ کالج الہ آباد سے بی۔اے کا امتحان دیا۔ اور ایم۔اے کی ڈگری بھی ۱۹۴۳ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد حکومت ہند کے محکمۂ اطلاعات و نشریات میں ملازم ہو گئے۔ مگر ادبی ذوق اور علمی شوق کا پورا ہونا اس محکمہ میں ممکن نہ تھا اور طبیعت کو شاعری اور صحافت سے خاص لگاؤ تھا۔ اس لیے ایک ہی سال بعد اس ملازمت کو چھوڑ کر روزنامہ "قومی آواز" لکھنؤ میں چلے گئے اور تقسیمِ ملک تک اسی میں کام کرتے رہے۔ تقسیم کے بعد لاہور آ گئے۔ چونکہ طبیعت کو اسی پیشے سے مناسبت اور دلچسپی تھی۔ لہٰذا یہاں آ کر بھی اسی کو اختیار کیا۔ ہفت روزہ "ملت" لاہور میں کام کرتے رہے۔ اور آج کل ہفت روزہ "فسانۂ وقت" کے شعبہ ادارت سے منسلک ہیں۔

آپ کی شاعری کا آغاز ۱۹۴۲ء سے ہوا۔ اس فن میں کسی کے باقاعدہ شاگرد نہیں۔ مگر علامہ اقبال، مولانا سہیل، ڈاکٹر تاثیر اور فراق گورکھپوری کے کلام سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ احباب میں سے مجروح سلطانپوری کے اشعار آپ کو خاص طور پر پسند ہیں جہاں تک معلوم ہے آپ کا کوئی مجموعہ کلام اب تک شائع نہیں ہوا۔

مائل دہلوی۔ "مجموعہ نغز" میں اُن کا نام مرزا محمد یار بیگ لکھا ہے اور تخلص مائل ہے۔ یہ نہایت ہی صاحب حیا، بہت با اخلاق، متواضع، منکسر المزاج، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور حلیم الطبع شخص تھے۔ فنِ شعر میں ان کو میاں تلندر بخش جرأت سے تلمذ تھا۔

اسی تخلص کے ایک شاعر دہلی ہی میں اور گزرے ہیں۔ جن کا نام میر محمدی شاہ تھا۔ یہ میاں قیام الدین علی قائم۔ استاد بھورے خاں آشفتہ اور محمد نصیر الدین نصیر کے شاگرد تھے۔ حکیم ابو القاسم میر قدرت اللہ قاسم اپنے تذکرہ مجموعہ نغز میں ان کے متعلق لکھتے ہیں "بزیورِ علم و حیا آراستہ و بحلیہ مروت و پیراستہ۔ بسیار رند و عیاش و آزاد و ایام بسری بودہ" (صفحہ ۱۵۲) شاہ عالم کے زمانہ میں دہلی سے مرشد آباد چلے گئے تھے۔

مجنوں گورکھپوری۔ احمد صدیق نام اور مجنوں تخلص ہے۔ ۱۹۱۰ء میں بمقام موضع پلڈھہ ضلع بستی (یو۔پی) میں

پیدا ہوئے۔ ایف۔ اے کا امتحان مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے پاس کیا۔ اے کا سینٹ اینڈریوز کالج گورکھ پور سے پاس کیا۔ اور وہیں اسلامیہ ہائی اسکول میں مدرس ہو گئے۔ ۱۹۲۴ء میں آگرہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔ پھر علیگڈھ اور گورکھپور کے کالجوں میں پروفیسر رہے۔ اعلیٰ درجہ کے مترجم، مشہور افسانہ نگار۔ اور مقبول شاعر ہیں۔ آپ کی تصنیفات میں سے بعض یہ ہیں۔ سادگی۔ خواب و خیال۔ محن پوش۔ افسانہ (فن افسانہ نگاری کی تاریخ)۔ شہنشاہ۔ جنہ دستان کی بہادر عورتیں۔ مجنوں کے افسانے۔

مہر دہلوی ۔ منشی سورج نرائن نام۔ مہر تخلص۔ اور وطن دہلی تھا۔ جہاں کے ایک معزز کائستھ خاندان میں آپ کی ولادت ہوئی۔ بی۔ اے کی ڈگری آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور سے لی اور محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔ جہاں آپ مدت دراز تک راولپنڈی اور دہلی میں انسپکٹر مڈل تعلیمات رہے۔ کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیمات پنجاب کے زمانہ میں ریورڈر آف بکس بھی رہے۔ بچوں کے لیے درسی کتب بھی آپ نے محکمہ کی طرف سے لکھیں۔

شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ سب سے پہلے ماہوار رسالہ "کائستھ مترا" میں آپ کی نظمیں چھپیں۔ اس کے بعد رسالہ نمائندہ کانپور میں بھی آپ اپنا کلام بھیجا کرتے تھے۔ اپنے پیر و مرشد مہاتما شیو برت لال کے رسالہ "سادھو" کو آپ ہی ایڈٹ کرتے تھے اور اس میں اپنی نظمیں بھی شائع کرتے تھے۔ آپ کی نظموں میں تصوف کا رنگ بہت غالب ہے جسے سنسکرت میں ویدانت کہتے ہیں۔ آپ کی تمام نظمیں پاکیزہ خیالات اور اخلاق موعظت سے بھری ہوئی ہیں۔ بچوں کے لیے بھی آپ نے بکثرت نظمیں لکھی ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کی نظموں کا مجموعہ کلام مہر کے نام سے چھپ چکا ہے۔ بچوں کے لیے جو نظمیں تھیں۔ وہ دو علیحدہ حصوں میں شائع ہوئی ہیں۔

نشتر جالندھری ۔ آپ کا نام محمد عبدالحکیم خاں ہے اور نشتر تخلص کرتے ہیں۔ ۱۸۹۶ء سال پیدائش ہے۔ اور مقام ولادت میانوالی۔ جو مکھور ضلع جالندھر کے مضافات میں ایک مشہور موضع ہے۔ یہ گاؤں آپ ہی کے بزرگوں کا آباد کیا ہوا ہے جو حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے عہد حکومت میں افغانستان سے یہاں آئے تھے۔

نشتر نے ابتدائی تعلیم شاہ کوٹ نکودر اور جالندھر میں پائی۔ پھر اپنے بھائی مولوی عبدالغفور کے پاس کوئٹہ چلے گئے۔ جہاں، نٹرنس پاس کرنے کے بعد وہیں ایک اسلامیہ سکول کے صدر مدرس مقرر ہو گئے۔ پھر اردو ٹیچرشپ کا امتحان پاس کر کے ایک فوجی کالج میں تعینات ہو گئے۔

آپ کی صحافتی زندگی کا آغاز روزنامہ وکیل امرتسر سے ہوا۔ جس کے بعد لاہور آکر تہذیب النسواں۔ پھول۔ زمیندار۔ انقلاب۔ ادیب۔ دلگداز۔ پیام ادب اور اخبار حمایت اسلام میں کام کرتے رہے۔ اور مختلف پبلشرز کے لیے درسی کتب لکھتے رہے۔ ۱۹۲۴ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ دس سال کی عمر سے شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اس فن میں نظم طباطبائی کو اپنا استاد بنا دیا۔ پاکستان کے غزل گو شعراء میں خاصے مشہور ہیں۔ نہایت خلیق۔ متواضع اور سلاہ طرز رکھنے والے بزرگ ہیں۔ غزل کے علاوہ تمام اصناف سخن پر حاوی ہیں۔

ن۔م۔ راشد۔ مجھ خاندان کے ایک معزز فرد ہیں۔ ان کے والد ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز رہے تھے۔ نام نذر محمد۔ تخلص راشد عام طور پر ن۔م۔ راشد کے نام سے مشہور ہیں۔ یکم اگست ۱۹۱۰ء کو اکال گڑھ ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام خضر محمد ہے۔ انڈین سکول ہائی سکول اکال گڑھ سے پاس کیا۔ ایف اے گورنمنٹ کالج لاہور سے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۳۲ء میں ایم۔ اے کیا۔ کچھ دنوں تک رسالہ نخلستان ملتان کو اور ایک سال رسالہ شاہکار لاہور کو ایڈٹ کیا۔ ملتان کمشنری میں کلرک رہے۔

۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے۔ اس سلسلہ میں ۱۹۵۲ء میں امریکہ بھی گئے تھے۔ ان کی نظموں کے دو مجموعے ایک "ماورا" اور دوسرا "ایران میں اجنبی" شائع ہو چکے ہیں۔ پاکستان کے بلند پایہ شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ بلینک ورس (نظم آزاد) کے تو راشد گویا مجدد ہیں۔ جس کی تقلید اردو کے دوسرے شعراء نے بھی کی۔

---

(۲)

محمد عبداللہ قریشی

آباد۔ مرزا مہدی حسن خاں نام، لکھنؤ کے رہنے والے۔ جعفر خاں کے بیٹے اور ناسخ کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ ۱۲۳۶ھ میں پیدا ہوئے۔ نواب ذوالفقار الدولہ آباد سے قرابت تھی۔ زندگی فراغت سے بسر کی۔ بہت پرگو اور شاعروں کے شائق تھے۔ عبدالغفور نساخ تذکرہ سخن شعرا میں لکھتے ہیں "ان سے تیس چالیس غزل کا ایک ایک دیوان ہے"۔ ایک مثنوی ان کے تمر بھر کی کمائی بتائی جاتی ہے۔ نگارستان عشق ان کا دیوان مشہور ہے لیکن نایاب ہے۔ بہارستان ایک مجموعہ شائع ہوا ہے جس میں ناسخ، آتش، آباد کی ہم طرح غزلیں ردیف وار درج ہیں۔ ان کا کلام ناسخ کے کلام سے ملتا جلتا ہے مگر مضمون آفرینی میں بہت پیچھے ہیں۔

احسن لکھنوی۔ مہدی حسن نام۔ احسن تخلص، شوق لکھنوی کے نواسے اور مرزا داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ عرصہ تک بمبئی میں قیام رہا۔ ناول اور ڈرامے لکھنے میں شہرت حاصل کی۔ آپ کے کلام میں جوش، درد اور سوز پایا جاتا ہے۔

احمد۔ خان احمد حسین خان بی اے۔ ام آر اے ایس خان بہادر ڈاکٹر محمد حسین خاں آنریری مجسٹریٹ دبانی میڈیکل کالج لاہور کے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے اور بی اے کرنے کے بعد فلکہ سول میں ملازم ہو گئے۔ ایک عرصے تک سب جج رہنے کے بعد ڈسٹرکٹ جوڈیشل ہونے کے بعد آپ نے رسالہ شباب اردو لاہور سے جاری کیا۔ اور ڈیڑھ دو سو کے قریب کتابیں بھی لکھیں جن میں سے کئی ایک پر حکومت کی طرف سے انعام بھی ملا۔ بہت سے افسانے اور ناول لکھے اور تھیٹر کے کئی ڈراموں کا اردو ترجمہ کیا۔ شعر گوئی کا مذاق نہایت شائستہ تھا۔ آپ کا کلام کا مجموعہ چھپ چکا ہے۔ یکم جنوری ۱۹۵۶ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔

اختر۔ محمد صادق خاں نام، بنگال کے رہنے والے تھے۔ مگر ترک وطن کر کے لکھنؤ آ گئے تھے۔ مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ اردو

اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اور شعبدہ بازی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کا اس قدر شہرہ ہوا کہ فانی الدین حیدر فرمانروائے اودھ نے ان کو ملک الشعراء کا خطاب دیا۔ انہوں نے صحنی اور انشا سے لے کر وزیر اور صبا تک کا زمانہ دیکھا اور بہت سی کتابیں لکھیں۔ خیالات کی ندرت، مضامین کا تنوع، بندش کی چستی۔ فارسی ترکیبوں کی دل آویزی اور بیان کی شوخی اختر شاہجہانپوری کی چند خصوصیات ہیں۔ انہوں نے ۱۹۵۸ء میں انتقال کیا۔

اختر اورینوی - اختر تخلص ہے علی گڑھ کالج کے فارغ التحصیل اور پٹنہ کالج میں پروفیسر ہیں۔ صوبہ بہار کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں میں آپ کا ممتاز درجہ ہے۔ کلام میں صفائی پائی جاتی ہے۔

ازل - ابوالاعجاز منشی عبدالمجید ازل لاہور کے ایک شریف رامی خاندان کے چشم و چراغ تھے بچپن ہی سے شعر کہتے تھے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۰ء تک مرزا داغ دہلوی سے اصلاح لی جس سے سلاست زبان اور صفائی بیان کی خوبی آپ کے کلام میں پیدا ہو گئی۔ آپ کی غزلیں ۱۹۴۰ء طور پر استاد کے رنگ میں ہوتی تھیں۔ ۱۹۵۷ء میں انتقال ہوا۔

اسد - سلیمان خاں نام، نواب خطاب، نواب محبت خان مغفور کے نواسے امیر کے شاگرد اور لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ خواجہ آتش کا زمانہ دیکھا تھا، رند اور صبا کے عاصر تھے کچھ دنوں کے لئے ٹونک چلے گئے تھے۔ نواب صاحب ٹونک اور ان کے صاحبزادے ان کے تلامذہ میں داخل ہوئے۔ پھر یہیں قیام کر لیا۔ امیر کے شاگردوں میں ان کا رنگ خاص ہے۔ زبان بہت صاف ترکیب بھی ہوتی، بندشوں میں مضامین پیدا کرتے ہیں۔

اشک رامپوری - واجد علی خاں نام، اچھن صاحب عرف تھا۔ نواب یوسف علی خاں ناظم رامپور کی اولاد سے تھے۔ جوانی میں بڑے بانکے چھیلے تھے۔ بڑی آن بان، بڑے ٹھاٹ باٹ اور کروفر سے رہتے تھے۔ چودہ برس انگلستان اور جرمنی میں گزارے۔ انقلاب زمانے طبیعت نے پلٹا کھایا تو فقیر گوشہ نشین ہو گئے۔ تقسیم پاک و ہند کے بعد گوجرہ (راولپنڈی) کی خانقاہ میں رہتے تھے پھیپھڑوں میں کینسر ہو گیا تھا پرسوں کہنے پر حرکت قلب بند ہو گئی۔ اس طرح ۱۹۵۵ء کے آخر میں یہ بڑا شاعر دنیا سے اٹھ گیا۔

اظہر امرتسری - خدا بخش نام، اظہر تخلص، امرتسر وطن تھا ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم باقاعدہ حاصل نہ کر سکے لیکن کثرت مطالعہ سے عربی، فارسی اور اردو میں اتنی استعداد پیدا کر لی کہ شعر کہنے لگے۔ تحریک خلافت کے بعد سیاست میں دخل دینے لگے۔ کئی بار قید ہوئے۔ راولپنڈی سے ہفت روزہ ترجمان سرحد جاری کیا۔ ان کی نثر میں مولوی محمد حسین آزاد کے استعارے اور تشبیہات اور مولانا ظفر علی خان کا سا طنز پایا جاتا تھا عرصہ دراز تک زمیندار کی ادارت کے فرائض انجام دیئے اور اداریے لکھے۔ نظمیں بھی لکھتے تھے اور غزلیں بھی۔ کلام بلند، زبان فصیح اور اسلوب بیان اچھوتا تھا۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں ۷۲ سال کی عمر پا کر وفات پائی۔

اعظم ۔ مرزا اعظم علی نام، الہ آباد کے رہنے والے، منشی محمد رضا کے فرزند اور آتش کے شاگرد تھے۔ آگرہ میں عرصہ تک سرکاری ملازم رہے، پنشن لے کر الہ آباد آ گئے تو خانہ نشیں ہو گئے۔ ۱۸۷۲ء میں ان کا دیوان چھپا۔ کمیاب ہے۔ اعظم نے آتش کے رنگ کو خوب (نبھایا) ہے۔ سادگی اور لطف زبان ایک ایک شعر میں نمایاں ہے۔

بیتاب ۔ منشی کنور رائے نام، قائم چاندپوری کے معاصر تھے۔ ان کے کلام میں بےتکلفی، سوز و گداز اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ (جواہر سخن)۔

بیدل ۔ (پروفیسر) حبیب الحسن نام، بیدل تخلص ہے۔ صوبہ بہار کے نغز گو شاعر ہیں۔ کلام میں پختگی پائی جاتی ہے۔ زبان صاف اور سلیس ہے۔ فارسی ادب پر بھی آپ کو قدرت حاصل ہے۔ نظم کے علاوہ اردو ادب کے ایک بلند پایہ نثر نویس بھی ہیں۔

پیام شاہ جہانپوری ۔ نام محمد مبین خاں۔ تخلص پیام ہے۔ پیدائش ۱۶ اگست ۱۹۲۰ء کو شاہ جہانپور کے ایک پٹھان رئیس خاندان میں ہوئی۔ چھ سال کی عمر میں قرآن مجید ختم کیا۔ اس کے بعد اسکول میں داخل ہو کر اردو۔ انگریزی اور فارسی کی تحصیل کی۔ کتب بینی کا شوق ابتدائے عمر سے ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے آرڈیننس کور و گنج فیکٹری میں کلرک تھے۔ تقسیم کے بعد لاہور آ گئے۔ کچھ عرصہ آزاد کشمیر فورسز میں ملازم رہ کر محاذ پر خدمات انجام دیں۔ کشمیر سے واپس آ کر ادبی زندگی شروع کی۔ شعر و شاعری کا شوق تو شاہ جہانپور ہی سے تھا۔ اعتبار ملک حضرت دیوان شاہجہان پوری کی شاگردی اختیار کر کے شاہ جہانپور کے علاوہ بریلی۔ بدایوں۔ سہارنپور۔ بنی بھیت۔ ہردوئی اور دیوہ شریف وغیرہ کے مشاعروں میں شریک ہو کر داد سخن دے چکے تھے۔ پاکستان آ کر ان کی نثر نگاری کی ابتدا ہوئی۔ مختلف اوقات میں ہفت روزہ آشیانہ اور برق لاہور میں ادارت کے فرائض انجام دیئے آج کل ہفت روزہ حمایت اسلام کے ایڈیٹر اور ماہنامہ معاشرتی ہمدرد کے مدیر اعزازی ہیں؟ تصنیف و تالیف کا بھی شوق ہے۔ تاریخ اسلام بیسویں صدی کی ابتدا نثر۔ جنوبی ہند میں اردو۔ میخانۂ عجم۔ روح نگارش (علمی و ادبی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ) مقام حسین۔ علی اور ان کی خلافت وغیرہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ شعری میں غزل ان کی محبوب صنف ہے۔ کلام میں سوز و گداز اور تکیلا پن ہے۔ تیوروں کی شعری کی جان ہیں۔ پامال اور فرسودہ خیالات سے اکثر دامن بچاتے ہیں۔

عبدالرشید تبسم ایم اے ۔ آپ کا تعلق ادبجہ ضلع گجرات کے ایک علمی خاندان سے ہے۔ ۲۹ جون ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئے میٹرک اینگلو سکول قصور سے۔ انٹر اورینٹل کالج لاہور سے بی اے پاس کیا اور انعامات حاصل کئے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری لی۔ کالج سے فارغ ہو کر اخبار نویسی کا پیشہ اختیار کیا۔ بعض روزانہ اخبارات اور ماہوار رسالوں کی ادارت کی۔ ۲۵ اپریل ۱۹۴۱ء کو کرنسی حکومت ہند کے محکمہ دفاع میں ملازم ہو کر گیارہ سال رہی۔ سیالکوٹ۔ احمد آباد۔ بمبئی۔ شاہجہان پور اور لاہور میں متعین رہے۔ ۱۹۵۲ء میں استعفیٰ دے کر دو سال ادارہ ثقافت اسلامیہ کے پبلسٹی افسر کی حیثیت سے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی علمی صحبت سے فائدہ اٹھایا۔ یہاں مولانا رومی کی فارسی تصنیف "فیہ ما فیہ" کا اردو میں ترجمہ بھی کیا جو "ملفوظات رومی" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ گزشتہ چار سال سے ہفت روزہ کوہ پریشن کے ایڈیٹر ہیں۔ ایک ناول "زندہ لاش" کا اردو میں ترجمہ بھی کیا جو "ملفوظات رومی" کے نام سے چھپ چکا ہے۔

اور کہانیوں کی تین کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ افسانوں کا ایک مجموعہ زیر طبع ہے۔ غزلیں اور نظمیں بھی کہتے ہیں۔ زبان کے متعلق ابتدا ہی سے مولانا عبدالمجید سالک سے مشورہ کرتے ہیں۔

تشنہ بلند شہری ۔ حافظ محمد یوسف خاں تشنہ بلند شہر کے رہنے والے اور نواب مرزا داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ آپ ملاگڑھ کے مقام پر ایک پٹھان سپاہی پیشہ خاندان میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ سوداگری کرتے رہے پھر ایک برس کے قریب دکن میں داغ کے پاس مقیم رہے۔ مغربی تھان اور مشق کی وجہ سے شعر بہت اچھے کہتے تھے۔ آخری عمر میں بینائی جاتی رہی تھی۔ ان کا دیوان جمع ہو گیا تھا مگر اب نایاب ہے تشنہ نے عمر بھر شادی نہ کی۔ ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔ آپ کے بیٹے ضمیر الدین ضمیر اسد دہلوی کے شاگرد تھے۔ تشنہ بالکل اپنے استاد کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ روزمرہ کی صفائی بندش کی چستی اور زبان کی شیرینی ان کی غزلوں کی خصوصیات ہیں۔

تعشق ۔ سید مرزا نام، لکھنؤ کے رہنے والے، ناسخ کے شاگرد تھے۔ مگر غزل میں ان کا رنگ سب سے نرالا تھا۔ زبان کے ساتھ طرز ادا بے ساختگی کی خوبی اور سوز و گداز کے مضامین اس طرح ادا کرتے ہیں کہ دل کھنچ جاتا ہے۔

تمنا عادی مجیبی (پھلواری) فی الدین نام، تمنا تخلص ہے آپ عظیم آباد کے بڑے پرگو شاعر ہیں کلام میں پختگی اور متانت پائی جاتی ہے۔ بہار کے نئے آپ کا دم بہت غنیمت ہے۔

ثاقب زیروی ۔ خوجہ صدیق نام ہے اپریل ۱۹۱۹ء میں وادی سنج کے ایک گاؤں ماہی والہ تحصیل قصور میں پیدا ہوئے لیکن دو سال بعد والدہ کے تنازعات کے نتیجے میں سارا خاندان زیرہ ضلع فیروز پور میں منتقل ہو گیا جس سے نسبت خصوصی کے باعث ۱۹۳۷ء میں بالجبر نکال دئے جانے کے باوجود اب تک زیروی کہلاتے ہیں۔ وہیں ۱۹۳۳ء میں انٹرنس پاس کیا۔ پھر کلرکی، نظارت، سب انسپکٹری اور نہ جانے کیا کیا کچھ حصول معاش کی خاطر کیا لیکن فسکر سخن فوں جماعت سے لے کر ہمیشہ ہمرکاب رہی۔ ثاقب تخلص آپ کی والدہ کا عطا کیا ہوا ہے ۱۹۴۶ء کے اوائل میں لاہور آکر روزنامہ انقلاب کے عملہ میں شامل ہوئے۔ ۱۹۴۷ء کے وسط میں زیرہ لوٹے تو تقسیمات تقسیم کے چکر میں جا پھنسے تمام انسان ہند و مسلم اور سکھ بن چکے تھے۔ کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ اس ہو کے عالم میں ڈوب کر ساڑھے چودہ میں سے صرف پانچ افراد کے ساتھ لاہور پہنچے۔ کچھ عرصہ روزنامہ احسان میں جہاں گشت کے نام سے "مطالعات نویسی" کرتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ پرائیویٹ طور پر ایم اے تک تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد ڈیڑھ دو سال مختلف جرائد و رسائل میں کالم نویسی کرنے کے بعد ہفت روزہ "لاہور" جاری کیا جو اب تک کامیابی سے چل رہا ہے۔

۱۹۵۰ء سے قبل قومی منظومات کے تین مجموعے "ہمارے نغمے"، "ماہ کامل" اور "دور خسروی" شائع ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں امروز کمیٹی لاہور نے "قافیہ مخلوط" کا ایک مجموعہ "اس بازار میں" شائع کیا۔ اور اب پہلا حاصل فکر سخن۔ شہاب ثاقب ——— زیر طباعت ہے۔ غزل میں ان کا اپنا رنگ ہے۔ اور بہت خوب ہے۔

جالب ۔ سید بشارت علی نام اور جالب تخلص تھا ۔ دہلی کے رہنے والے اور داغ کے شاگرد تھے ۔ نہایت پختہ مغز اخبار نویس تھے بہت عرصہ تک پیسہ اخبار کے ایڈیٹر رہے ۔ معلومات کے لحاظ سے چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا سمجھے جاتے تھے ۔ آخری عمر میں لکھنؤ جا کر تعلقہ دار ان اودھ کے روزنامہ اخبار ہمدم کے ایڈیٹر ہو گئے تھے ۔ بعد میں اپنا اخبار بمبئی جاری کر لیا تھا ۔ وہیں ساٹھ ستر برس کی عمر پا کر جولائی ۱۹۳۰ء میں فوت ہوئے ۔

جگر بسوانی ۔ نام حکیم محمد افتخار علی تخلص جگر تھا ۔ آپ کے والد شیخ امیر علی خاں جزا حضرت آتش لکھنوی کے شاگرد تھے ۔
جگر ۱۲۸۹ھ بمطابق ۱۸۷۲ء بسوان ضلع سیتاپور (اودھ) میں پیدا ہوئے فارسی کی تکمیل کے بعد اسکول میں انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجے گئے ۔ لکھنؤ میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا ۔ ۱۸۹۶ء میں رامپور جا کر حضرت امیر مینائی سے شرف تلمذ حاصل کیا ۔ جہانگیر آباد کے راجہ نوشاد علی خاں آپ کے خاص قدردان تھے ۔
۱۸۹۷ء میں تجارت شروع کی لکھنؤ میں ان کا کاروبار خوب چمکا ۔ لیکن ۱۹۰۰ء میں مستقل طور پر کپڑے کا کاروبار کرنے کی نیت سے چلے گئے چونکہ فطرتاً عزلت پسند تھے ۔ اس لئے ترقی کی بیل افسردہ ہو کر رہ گئی ۔ ۱۹۰۱ء میں وطن واپس آئے ۔ کلکتہ بھی تشریف لے گئے ۔ لیکن وہاں بھی کام نہ چلا ۔
آپ کی شاعری میں قدیم رنگ نمایاں ہے ۔ دیوان ۱۹۲۳ء میں طبع ہو چکا ہے ۔
۱۹۵۰ء میں وفات پائی ۔ اور اپنے وطن بسوان ہی میں سپرد خاک ہوئے ۔

جگر بہاری ۔ سید شاہ نصیر الدین نام ، جگر تخلص ہے ۔ شاعری میں شاہ شفیع سے تلمذ حاصل ہے ۔ یہ صوبہ بہار کے دردمند شاعر ہیں ان کی زندگی سراپا حسرت اور درد و الم کی تصویر ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر شعر میں درد اور تڑپ ہے ۔

جمیل مظہری ۔ آپ صوبہ بہار کے مقبول شاعر اور ادبی دنیا میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں ۔ تمام زیادہ تر کلکتہ میں رہتا ہے ۔ حضرت لکھنوی مرحوم سے شرف تلمذ حاصل ہے ۔ (بہار اور اردو شاعری ص ۳۲۰)

جوشش ۔ احمد حسن خاں نام ، نواب عطاب ، اچھے عرف عام ، لکھنؤ کے رہنے والے تھے ، ابتدا سے طبیعت شاعری کی طرف راغب تھی ۔ پہلے نواب عاشق علی خاں عاشور اور راسخ مرحوم سے مشورۂ سخن کیا ۔ آخر میں امیر کے شاگردوں میں داخل ہوئے ۔ مگر راسخ اور امیر دونوں سے مختلف رنگ ہے ۔ غزل میں سلاست اور روانی کے ساتھ درد بھی ہے ۔ انداز بیان میں تاثیر اور شگفتگی ہے ۔
۱۲۴۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۰۳ھ میں وفات پائی ۔

جوشش ۔ شیخ محمد روشن نام ، جسونت رائے ناگر کی اولاد سے تھے ۔ علم عروض میں کافی دخل تھا ۔ خواجہ میر درد کے پیرو کہے جاتے ہیں لیکن ان کا کلام درد کی خصوصیات سے خالی ہے ۔ بہر حال اپنے رنگ میں اچھا کہتے ہیں ۔ ان کے کلام میں خاص طرح کی جاشنی ہے ۔

جوہر - مادھو رام نام، جوہر تخلص، لالہ جاہر مل ساہوکار کے بیٹے، فرخ آباد کے رہنے والے، منیر شکوہ آبادی کے شاگرد، مستند اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ایک دیوان یادگار ہے۔ بارھویں صدی ہجری کے شروع میں وفات پائی۔ کلام دلچسپ، صاف اور شستہ ہے بے تکلف کہتے ہیں۔ معاملہ بندی میں کامیاب طرز خوبی سے خالی نہیں (خمخانۂ جاوید ج ۲ ص ۲۹۷ جواہر سخن جلد ۴ ص ۱۳۹)

جوہر - جوہر سنگھ نام، جوہر تخلص، منشی بقاء اللہ رقم کے بیٹے، لکھنؤ کے رہنے والے، قوم کے کائستھ اور راجا لال جی کے حقیقی بھتیجے تھے۔ واجد علی اور واجد علی شاہ کے زمانے میں فوج کے بخشی تھے۔ علی محمد خاں ناظم اور خواجہ وزیر سے اصلاح لیتے تھے۔ (سخن شعرا ص ۶۱۸ خمخانۂ جاوید ج ۲ ص ۲۱۲) اور مرزا غالب کے شاگرد رشید تھے۔ اردو کے پانچ دیوان ان سے یادگار ہیں۔ غالباً ۱۲۷۳ھ میں وفات پائی۔ زبان کی خوبی اور سلاست کے علاوہ کلام میں تصوف غالب ہے۔ اکثر جگہ مسئلہ وحدۃ الوجود کو تغزل کے مقبول رنگ میں بیان کیا ہے۔ (جواہر سخن جلد ۴ صفحہ ۱۸۲) -

---

جنوں - علی محمد خاں نام، نواب سر زین الدولہ سر جارج خطاب، فیض آباد کے رئیس تھے۔ ان کے والد نواب محتشم الدولہ مدبر الملک مرزا باقر علی خاں بہادر رفیع جنگ مشہور تھے، دادا رستم جنگ کے صوبیدار تھے۔ جنوں نے ابتدا میں آتش سے مشورۂ سخن کیا۔ آتش کی وفات کے بعد اسیر کو اپنا کلام دکھایا۔ ان کے دو دیوان سراج النظم اور مصباح النظم کے نام سے چھپے۔ دونوں دیوان غزلوں کے مجموعے ہیں۔ کلام میں فنی شان و شوکت زیادہ ہے۔

حامی - پیر و زیر علی شاہ علی ہمارے عہد کے مشہور علم دوست بزرگ پیر غلام دستگیر نامی کے بڑے بھائی اور طالع کے شاگرد تھے، آپ غزلیں، نظمیں، قصیدے، مرثیے، قطعے اور رباعیاں سب ہی کچھ کہتے تھے مگر آخری عمر میں نعتوں کے سوا سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ آپ نے دو دیوانی، ایک غزلوں کا اور دوسرا نعتیہ اپنی یادگار چھوڑے ہیں، نعتیہ دیوان چھپ چکا ہے مگر غزلوں کا غیر مطبوعہ ہے۔ ۱۹۳۳ء میں بھرسا ڑھے ترپن سال فوت ہوئے۔

حرماں خیر آبادی - زید احمد نام، حرماں تخلص ہے۔ ولادت ۱۹۱۰ء میں خیر آباد میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام وحید احمد اور پیشہ زمینداری ہے۔ حرماں چھ سات سال کی عمر میں اپنی نانہال سندیلہ چلے آئے اور پندرہ سولہ برس تک یہیں پرورش پائی مگر تعلیم سے برابر بے بہرہ رہے۔ علمی ذوق نے آوارگی پر مجبور کیا۔ سندیلہ سے کانپور، اگرہ ہوتے ہوئے حیدرآباد دکن پہنچے اور مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاد کے حضور باریاب ہوئے۔ قیام حیدرآباد کے زمانے میں مولانا حمید الدین قمر فریدی کی کوشش سے آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۷ء میں لاہور چلے آئے اور میٹرک تک انگریزی پڑھی اس وقت سے پاکستان ہی میں قیام ہے۔ آپ کے کلام کا مجموعہ "کلام حرماں" کے نام سے لاہور میں شائع ہو چکا ہے۔

حسن ۔خواجہ حسن نام، خواجہ ابراہیم کے بیٹے اور بھکاری مودودی کے نواسے تھے ۔ دہلی ان کا وطن تھا ۔ وجیہ اور خوبصورت تھے ۔ بذلہ گوئی اور موسیقی میں کمال حاصل تھا ۔ لکھنؤ کی بخشی نام طوائف کو دل دے بیٹھے تھے ۔ اشعار میں جا بجا اپنے خیال میں اس کے نام کا نگینہ جڑا ہے ۔ علم نجوم سے بھی واقف تھے ۔ اکثر اشعار دل کی زبان سے کہتے ہیں ۔ جذبات عشق کے اظہار میں محاورات اور زبان کی چندداں پروا نہیں کرتے شاعری میں جعفر علی خاں حسرت کے شاگرد تھے ۔ (جواہر سخن، سخن شعرا، نجوم الزجاجہ)

خاموش ۔شاہ معین الدین نام، بیدر (دکن) کے رہنے والے تھے ۔ صابریہ طریقے کے پیر تھے ، کلام میں تصوف کا رنگ ہے ۔ اس کی خاص خاص اصلاحیں دو زوں طریقے سے لاتے ہیں ۔ زبان عام فہم ہے ۔ ۱۲۸۶ھ میں انتقال ہوا ۔ (دکن میں اردو، جواہر سخن جلد اول ص ۳۹۲)

خلیل ۔دوست علی نام، سید جمال علی کے بیٹے ، بارولی (اودھ) کے رہنے والے آتش کے شاگرد تھے ۔ قیام زیادہ تر لکھنؤ میں رہا ۔ واجد علی شاہ کے زمانہ میں چکلہ دار تھے ۔ اس کے بعد زندگی عیش و راحت سے بسر کی ۔ ۱۲۷۲ھ میں کلکتہ گئے ۔ غزلوں کا دیوان چھپ چکا ہے ۔ کلام میں تصوف کا رنگ جا بجا نظر آتا ہے ۔ کہیں کہیں ابتذال بھی ہے ۔ دل نشینی کم ہے البتہ لفظ کا اہتمام زیادہ ہے ۔

راقم ۔بندرابن نام، قوم کائستھ ، دہلی کے رہنے والے تھے ۔ بعض انہیں مظہر کا شاگرد بتاتے ہیں ، بعض سودا کا اور بعض میر کا ۔ مگر صحیح یہ ہے کہ میر ہی شاگرد تھے کیونکہ خود میر نے ان کو اپنے تذکرہ میں اپنا شاگرد بتایا ہے ۔ آخر میں سودا کو بھی کلام دکھاتے تھے ۔ فن شعر کے ماہر تھے اور خوب کہتے تھے ۔ ان کے اشعار میں روانی ہے ، غزل میں رنگ کسی قدر پھیکا ہے تاہم لطف سے خالی نہیں ۔ (جواہر علی جلد اول ص ۲۸۷ ۔ خزن نکات ، چمنستان شعرا ، نکات الشعرا)

رسا جالندھری ۔کبیر خاں نام ، رسا تخلص ، جالندھر وطن ہے ۔ تقسیم کے بعد جالندھر سے پاکستان آ گئے ہیں اور لاہور میں رہتے ہیں ۔ غزل خوب کہتے ہیں ۔ زبان نہایت شیریں اور شگفتہ ۔ بندش چست اور استادانہ اور تخیل بلند اور ارفع ہے ۔

رحماں ۔دیا کرشن نام ، گنگا بشن عزیز کے بیٹے اور قوم کے کائستھ سری واستو تھے ۔ مولد شاہ آباد تھا مگر لکھنؤ میں آ بسے تھے عام طور پر مصحفی کے شاگرد مشہور ہیں مگر صاحب خم خانۂ جاوید نے موجد تلمیذ مصحفی کا شاگرد لکھا ہے ۔ واجد علی شاہ کے زمانہ میں راجہ الفت رائے کے بخشی تھے ۔ نازک مزاج ، وضعدار اور خوش تقریر تھے ۔ علمی استعداد معقول تھی ۔ غزل میں اخلاقی مضامین کا عنصر غالب ہے سوز و گداز اور ادائی اور صفائی بھی ہے ۔ لفظی پابندیوں سے دامن بچاتے ہیں انداز بیان دلنشیں ہے ۔ ۱۸۸۵ء میں وفات پائی (جواہر سخن) دوسری جلد ص ۵۵۴

ذاکر ۔ذاکر علی نام ، ذاکر تخلص ، شاہ پور ضلع فتحپور رسوہ کے رہنے والے ، آگرے کی کشمری میں سررشتہ مار اور حاتم علی مہر

کے شاگرد تھے ۱۸۴۳ء کے بعد وفات پائی۔ ان کا دیوان جس کا تاریخی نام "نغمۂ بہار" (۱۳۰۳ھ) ہے مطبع بہار ہند آگرہ میں ۱۳۰۴ھ میں چھپا۔ فارسی کا بھی ایک مختصر مجموعہ ان سے یادگار ہے۔ ذاکر پر گو شاعر تھے۔ کلام میں سادگی، روانی اور صفائی کا عنصر کم ہے۔ انداز بیان پاکیزہ ہے اور تغزل میں ناسخ کا رنگ معلوم نہیں ہوتا بلکہ آتش کا گداز موجود ہے۔ (جواہر سخن جلد چہارم ص ۴۹، انجمن خانہ جاوید ج ۳ ص ۲۳۰)

ذکی ۔ مہدی علی خاں نام، کرامت علی خاں کے بیٹے۔ آبا و اجداد لکھنؤ کے رہنے والے تھے مگر ان کا مولد و مسکن مراد آباد تھا۔ محمد سعید خاں والیٔ ریاست رام پور سے وظیفہ ملتا تھا۔ فازی الدین حیدر بادشاہ اودھ کے زمانے میں لکھنؤ آئے اور ناسخ کے شاگرد ہوئے کچھ دنوں دہلی، سہارنپور اور حیدر آباد دکن میں بھی رہے اور ہر جگہ ان کی قدر ہوئی۔ واجد علی شاہ کے عہد میں پھر لکھنؤ آئے اور ملک الشعراء کا خطاب حاصل کیا۔ غدر کے بعد خانہ نشین ہو گئے تھے۔ لیکن نواب یوسف علی خاں ناظم نے ان کا شہرہ سن کر رام پور بلا لیا۔ وہیں ۱۸۷۳ء میں وفات پائی۔ ان کے کلام میں درد و گداز بھی ہے اور زبان و بیان کی خوبیاں بھی۔ اکثر اشعار دلنشین ہیں۔

سجاد علی انصاری ۔ سجاد علی انصاری بی اے۔ ایل ایل بی (علیگ) گورکھپور ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے تھے۔ بڑے خوش شمائل، خوش فکر اور خوش باش تھے۔ جوانی میں انتقال ہو گیا۔ وہ ادب برائے ادب کے نظریے کی پیداوار آزاد خیال صاحب طرز ادیب اور شاعر تھے۔ ان کا شعب تم بعض اوقات تو ایسی دوشیزہ زمینوں کو پامال کرتا تھا کہ رسم و رہ عوام کے پابند جھجک کر رہ جاتے تھے۔ ان کی نظم و نثر کا مجموعہ "محشر خیال" کے نام سے ان کے دوست خواجہ منظور حسین صاحب ایم اے (علیگ) نے ان کی وفات کے بعد ۱۹۲۶ء میں مرتب کیا تھا اب لاہور میں دوبارہ طبع ہوا ہے۔

سحر ۔ راجہ نواب علی خاں نام، بہادر جنگ خطاب، ریاست محمود آباد کے والی، واجد علی شاہ کے خاص مصاحب تھے۔ ابتدا میں ناسخ کے شاگرد ہوئے۔ پھر مرزا فرخ کے۔ لیکن رنگ دونوں سے جدا ہے۔ ۱۸۷۲ء میں وفات پائی۔ کلام سے مضمون آفرینی اور طباعی کا پتہ چلتا ہے۔ محاورہ بندی بھی ہے اور سلاست بھی۔ لفظی رعایات، تشبیہ اور استعاروں کے استعمال سے سوز و گداز پیدا کرتے ہیں۔

سحر ۔ شیخ امان علی نام، لکھنؤ کے رہنے والے، شیخ امین علی کے بیٹے اور ناسخ کے شاگرد تھے۔ کچھ عرصہ ناسخ کے شاگرد برق بھی مشورہ سخن کیا تھا۔ شہرت نے واجد علی کے دربار تک رسائی کر دی۔ بڑے سجیلے اور جامہ زیب تھے۔ غدر کی آندھی میں کچھ دنوں فرخ آباد، شاہجہاں، کاکوری وغیرہ بھٹکتے رہے۔ آخر لکھنؤ آ گئے اور یہیں پیوند خاک ہوئے۔ انہوں نے اکثر اصناف میں طبع آزمائی کی ہے مگر واسوخت میں زیادہ شہرت پائی ہے۔ زبان سلیس اور بامحاورہ ہے۔ لفظی صنائع بدائع کی پابندی کبھی کبھی ضلع جگت تک پہنچ جاتی ہے۔

سحر ۔ اقبال بہادر و رامانام، سحر تخلص، وطن ہنگام ضلع فتح پور ہے۔ ان کے والد منشی شیو نرائن اپنے قصبہ کے باقاعدہ

اور بچپن سے مزاج رئیس اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ سحر نے پہلے کتب میں اردو فارسی پڑھی، پھر انگریزی؛ ۱۹۰۰ء میں انگریزی مڈل کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۰۵ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا مگر آگے تعلیم جاری نہ رہ سکی، اسی دوران میں صحت خراب ہو گئی۔ قدسے آرام ہوا تو ۱۹۱۰ء میں کالی داس کے مشہور ناٹک شکنتلا کا ترجمہ (مثنوی سحر) ختم کیا جو زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا، پھر عرصہ بعد عمر خیام کی تقریباً پانچسو رباعیوں کا ہندی نظم میں ترجمہ کیا جسے انڈین پریس الہ آباد نے ۱۹۲۳ء میں سج دھج سے مصور شائع کیا۔ سحر کے اردو کلام میں لطافت نازک خیالی اور سوز کے اثبات موجود ہیں۔

مسرور جہاں آبادی ۔ منشی درگا سہائے نام، مسرور تخلص، جہاں آباد (ضلع پیلی بھیت) وطن تھا۔ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے فارسی مولوی کرامت اللہ سے پڑھی اور شاعری میں بیان یزدانی میرٹھی سے اصلاح لی۔ کثرت بادہ نوشی کی وجہ سے ۳۷ سال کی عمر میں ۱۹۱۰ء کو انتقال کیا۔ بہت زود گو تھے۔ بے تکلف شعر کہتے تھے۔ ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے مزاج میں حزن و یاس اور رنج و الم غالب تھے۔ اسی لئے کلام میں جذبات نگاری اور درد و سوز زیادہ ہے۔ ان کا مجموعہ کلام نغمۂ سرور کے نام سے چھپ چکا ہے۔

شاعر ۔ میر کلو نام، میر درد کے نواسے اور مرزا مظہر کے شاگرد تھے۔ تفصیلی حالات معلوم نہ ہو سکے۔ مرزا مظہر کے شاگردوں کا جو رنگ ہے۔ ان کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے جواہر سخن، گلشن ہند، خم خانۂ جاوید، تذکرہ میر حسن، تذکرہ مصحفی میں ان کا ذکر مل جاتا ہے

شرف ۔ نام سید سادات حسین، عرف آغا جو، سید محمد میر عرف میرن صاحب کے بڑے لکھنؤ کے رہنے والے تھے غزلوں میں جا بجا آتش کا رنگ جھلکتا ہے۔ لفظی رعایات کے پیچھے نہیں پڑتے۔ معنوی خوبی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

شمس مینائی ۔ شیخ عبد الرحمن نام، ابو المعانی کنیت، تخلص اردو میں شمس فارسی میں مینائی تھا۔ ۱۸۴۶ء میں بمقام امرتسر پیدا ہوئے۔ مڈل تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۸۶۹ء میں بمبئی چلے گئے اور چاندی کے برتن بنانے والے ایک کارخانہ میں کام کرنے لگے۔ وہاں حاجی جمیل حسین، مرزا مفتون لکھنوی، عاشق دہلوی اور حفیظ جونپوری کی صحبت میسر آجانے سے شعر کہنے لگے اور مطالعہ و مزاولت کی بدولت فارسی میں اچھی خاصی استعداد بہم پہنچالی۔ آپ نے قدیم و جدید طرزوں میں ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی اور اردو فارسی دونوں زبانوں میں قادر الکلامی کے جوہر دکھائے۔ آخری زمانے میں ضعف پیری کے سبب بینائی کی دولت سے محروم ہو گئے تھے ۱۹۲۶ء میں اپنے اردو فارسی کلام کا مجموعہ "جام مینائی" کے نام سے مرتب کر کے امرتسر میں چھپوایا مگر وہ تقسیم ملک کے ہنگاموں میں ضائع ہو گیا۔ آخر ۱۹۳۴ء کو لاہور میں انتقال کیا۔

شمس نیری ۔ (حافظ) شمس الدین نام، شمس تخلص خانوادہ نیری سے تعلق رکھنے کی وجہ سے نیری کہلاتے ہیں۔

صوبہ بہار کی چند مشہور ہستیوں میں ہیں۔ شعر و ادب کا پاکیزہ مذاق رکھتے ہیں پٹنہ کالج میں پروفیسر ہیں، ہر صنف پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ نثر نویسی میں بھی آپ کا امتیاز درجہ ہے۔

شوق ۔ پنڈت جگموہن ناتھ رینہ نام، شوق تخلص، پنڈت وشیشور ناتھ رینہ کے بیٹے تھے جن کا آبائی تعلق ریاست جاورا سے تھا۔ شوق کے جد امجد کو نواب مغفور خاں نے ریاست جاورہ کا دیوان مقرر کیا تھا۔ شوق ۱۸۶۳ء میں بمقام اندور پیدا ہوئے اور تلاش معاش میں شمالی ہندوستان آئے اور ۱۸۹۰ء میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ آپ نے صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے تیرہ ضلعوں میں خدمات انجام دیں اور ۱۹۲۳ء میں پنشن لی شعر و شاعری کی دنیا میں آپ کو پہلے امیر مینائی۔ پھر سید محمد نوح صاحب شہید مچھلی شہری اور آخر میں تاباں بدایونی جیسے استاد ملے۔ آپ کے کلام کا مجموعہ "پیام شوق" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ جس کے مطالعہ سے تدریجی ترقی کا پتہ چلتا ہے۔

شوق نیموی ۔ مولانا نہیر احسن شوق نیموی عظیم آبادی ضلع پٹنہ کے قریہ نیمی میں پیدا ہوئے سنہ ولادت ۱۲۷۸ ہجری ہے۔ شوق صوبہ بہار کی بزرگ ترین ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کی اردو دانی کا لوہا لکھنؤ اور دہلی والے بھی مانتے ہیں۔ آپ کی تالیف آثار السنن علم حدیث کی بڑی معتبر کتابوں میں شمار کی جاتی ہے دیوان ۱۳۲۶ھ میں شائع ہوا تھا۔ اصلاح، انشتہ الاغلاط اور تذکرہ یادگار وطن بھی آپ کی چند تصانیف ہیں۔

صاحب و شفیق ۔ لچھمی نرائن نام، اورنگ آباد دکن کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد لالہ منسا رام عرصہ تک سلطنت دکن میں صدر الصدور کے عہدہ پر فائز رہے۔ ۱۸۵۵ء میں پیدا ہوئے۔ مولوی شیخ عبدالقادر سے کتب درسی پڑھیں۔ فن شعر میں علامہ میر غلام علی آزاد بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔ پہلے صاحب تخلص کیا۔ جب میر محمد مسیح "صاحب" کا شہرہ ہوا تو آزاد کے مشورے سے شفیق تخلص اختیار کیا۔ چنانچہ پہلے دیوان میں صاحب اور دوسرے میں شفیق ملتا ہے۔ ان کی زبان دکن کے ہمعصروں کے مقابلے میں صاف ہے لیکن شاعری میں کوئی خاص درجہ نہیں لفظی رعائتیں زیادہ ہیں۔ (جواہر سخن دوسری جلد ص ۷۷۰)

ضیا جعفری ۔ سید عنایت علی شاہ نام، ضیا تخلص ہے۔ آپ کے والد سید مرتضےٰ شاہ کیمبل پور میں انسپکٹر تھے۔ وہیں بمقام جاتری ۱۹۰۸ء میں ضیا پیدا ہوئے ابتدائی زمانہ کیمبلپور میں گزرا۔ والد کی پنشن کے بعد پشاور چلے گئے۔ دسویں جماعت میں تھے ہار تھے کہ پولیس میں سب انسپکٹر لے گئے۔ افتاد طبع کے باعث زیادہ دن ملازمت نہ کر سکے مستعفی ہو کر شعر و ادب کو اپنا شعار بنا لیا۔ اس کے بعد روزنامہ "سرحد" اور "انگارہ" ہفت روزہ "شرر" "اصلاح سرحد" اور "تعمیر نو" کے اداروں میں مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ بزم سخن پشاور آپ کی ادبی زندگی کا پہلا گہوارہ ہے جہاں آپ کی شاعری پہلی پھولی اور پروان چڑھی۔ آپ نے دائرہ ادب کی طرح بیل ڈالی جس نے ترقی یافتہ ادب کی طرف قدم اٹھایا۔ پشاور میں انجمن ترقی اردو کا قیام بھی آپ ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ شعر و سخن کی طرف آپ کا فطری رجحان ہے۔ اگرچہ نظم، قصیدہ قطعہ مرثیہ غرض ہر صنف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ مگر غزل سے خاص لگاؤ ہے۔ تنقید نگاری میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ فارسی کے بھی بے بدل شاعر ہیں آپ کی رباعیات کا ایک مجموعہ "صبوحی" کے نام سے شائع

سے چھپ چکا ہے۔ مذہبی مضامین "لہروں پر" اور مجموعہ کلام "یمانے" زیر طبع ہیں۔

طالب باغپتی ۔ کنور محمد لطافت علی خاں طالب باغپتی بقول جگر مرادآبادی "سلیم الفطرت" "وسیع المشرب، لطیف الخیال انسان واقع ہوئے ہیں۔ تکلف سے بالکل دور و طرح رکھتے ہیں، ترقی و رعنائی کے ساتھ ساتھ بہت سادہ مزاج، تکلفات، تصنعات سے بڑی حد تک کنارہ کش ۔ ان کی زندگی راز دار حسن و عشق بھی ہے ۔ ان کے کلام میں یہ تمام صفاتی خصوصیات زندگی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں ۔ انہوں نے شعر و حسن و عشق کی نازک نازک عادات، لطیف لطیف جذبات و محاکات، نفسیات و خیالات تک محدود رکھا ہے ۔ ان کے کلام میں حکیمانہ حقائق و معارف بھی ہیں ۔ کلام کا مجموعہ شاخ نبات کے تاریخی نام (۱۹۵۸ء) سے چھپ چکا ہے ۔

طالب انصاری ۔ طالب انصاری گنور بدایوں کے رہنے والے ہیں ۔ آپ کے والد شیخ برکت اللہ وہاں کے قدیم شہری تھے ۔ تھوڑی بہت زمینداری بھی تھی ۔ طالب ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے ۔ عربی تعلیم مولوی محمد یوسف ہزاروی سے حاصل کرکے باقی تعلیمی منزلیں اور تشکیل خود ہی پوری کی ۔ ۱۹۳۸ء میں تلاش معاش میں لاہور پہنچے ۔ یہیں منشی فاضل اور میٹرک کیا اور درس و تدریس میں مشغول ہوگئے ۔ کئی سال سے گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ (لاہور) میں مدرس ہیں ۔ شاعری کا شوق بچپن سے ہے ۔ فن عروض اور شاعری کی درس و تدریس کی پانچ چھ کتابوں کے علاوہ آپ کی غزلوں کا ایک مجموعہ سرد دیجات کے نام سے چھپ چکا ہے ۔ زبان پاکیزہ، انداز بیان سلجھا ہوا اور جذبات سمجھے ہوئے ہیں۔ حسن و عشق کی خودنمائی کا نام نہیں ۔ ایک پرسکون ندی ہے کہ خاموشی سے بہتی چلی جاتی ہے ۔

عابد شاہجہان پوری ۔ عابد حسین نام ۔ عابد تخلص ۔ وطن شاہجہان پور عمر ۷۰ سات کے قریب ہے ۔ ۱۹۱۸ء میں اقتدار الملک حضرت دل شاہجہان پوری کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہوئے اور ۱۹۳۳ء میں فارغ الاصلاح ہوگئے ۔ اب کہنہ مشق شعراء آپ کے حلقہ شاگردی میں داخل ہیں آپ کو تمام اصناف سخن پر قدرت ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ آپ کا میدان غزل قطعہ اور رباعی ہے ۔ عروض میں بہت اچھا دخل ہے ۔ زبان صاف اور محاورہ روزمرہ بیان میں ندرت اور شگفتگی ہے ۔

عاصی کرنالی ۔ جناب عاصی کرنالی بقول اہر القادری "ان ممتاز شعراء میں بلند مقام رکھتے ہیں جنہوں نے معاشرے کو پاکیزہ فکر، شعر و ادب کو حسین اسلوب اور زبان کو ندرت و روانی دی ہے ۔ عاصی کے کلام میں توازن فکر، تصدیت اور عمل و حرکت کی قوت پائی جاتی ہے عاصی نے زبان کو بگاڑا نہیں سنوارا ہے اور گیسوئے اردو کی شانہ کشی کی ہے" رگ جاں ان کے کلام کا مجموعہ ہے ۔

عبرت صدیقی ۔ محمد تبارک علی نام عبرت تخلص ہے ۔ اردو ہندی کی تعلیم سرکاری مدارس سے حاصل کی ۔ عربی فارسی مکاتب کے علاوہ اپنے والد الحاج منشی مبارک علی صدیقی سے پڑھی جو فارسی عربی کے متبحر عالم تھے ۔ ۱۹۲۷ء سے سررشتہ تعلیم میں ملازم ہیں اور محکمہ سے ۱۹۵۱ء سے شاہ آباد بریلی میں ہیڈ ماسٹر ہیں ۔ شاعری سے فطری لگاؤ ہے ۔ بارہ سال کی عمر میں شعر کہنے شروع کئے ۔ اعتبار الملک اور محمد عشرت سولہ سال سے شاہ آباد بریلی میں ہیڈ ماسٹر ہیں ۔ شاعری سے فطری لگاؤ ہے ۔ بارہ سال کی عمر میں شعر کہنے شروع کئے ۔ اعتبار الملک

حکیم المشرق حضرت دلی شاہجانپوری کی توجہ نے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ قدرت نے درد بھرا دل ودیعت کیا ہے عام طور پر صوفیانہ خیالات نظم کرتے ہیں۔ غم انسانیم کا دامن کسی عالم میں بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ ترقی پسند ہیں۔ لیکن اس کے گمراہ کن اثرات سے متاثر نہیں۔ حقیقی کیف و سرور سے حظ اندوز ہونے کے لئے شعر کہتے ہیں۔ ان کی شاعری انہیں پاکیزہ جذبات اور گہرے حسیات کی آئینہ دار ہے۔

عبدالعلیم آسی۔ سکندرپور ضلع بلیا کے رہنے والے، ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے طالب علمی کے زمانے ہی سے طبیعت شعر و شاعری کی طرف مائل تھی جلال علی اعظم سے تلمذ تھا پچاسی برس کی عمر پاکر ۱۳۳۵ھ میں وفات پائی یہ اپنے وقت کے باکمال بزرگ، جید عالم اور حاذق طبیب بھی تھے۔ ایک مختصر سا دیوان عین المعارف[۱۴] ان کی وفات کے بعد اسی سال مطبع سلیمانی بنارس سے شائع ہوا۔ کلام تاریخ کے رنگ میں ہے جس میں شوخی بلند پروازی، بے ساختگی، مناسب و موزوں الفاظ کا اہتمام پایا جاتا ہے۔ تغزل میں جابجا تصوف کا فلسفہ نظر آتا ہے دیباچہ عین المعارف (دیوان آسی) تحفۂ جاوید ج ۱ ص ۶۴ - ۶۵، جواہر سخن چوتھی جلد ص ۲۱۴)

عزیز صفی پوری۔ منشی ولایت علی خاں عزیز کے والد محمد یحییٰ علی خاں، دادا ثابت علی خاں اور پردادا رونق علی شاہان اودھ نواب سعادت علی خاں، نواب غازی الدین حیدر، نواب نصیر الدین حیدر محمد علی شاہ امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے عہد میں میر منشی تھے منشی ولایت علی خاں ۱۲۴۱ھ یا ۱۲۴۲ھ میں پیدا ہوئے۔ نو برس کی عمر تک مکتب میں پڑھتے رہے۔ بعد ازاں مولوی محمد حسن بنگالی اور مولوی محمد رضا باگر مری سے عربی فارسی پڑھی۔ ۱۴ یا ۱۵ برس کے ہوئے تھے کہ حکومت کا تختہ الٹ گیا۔ واجد علی شاہ مٹیا برج چلے گئے۔ سوا برس بعد غدر ہو گیا اور عزیز کے سکانات جو شاہی عمل کے قریب تھے لوٹ کر کھو دڈالے گئے۔ عزیز جان بچا کر صفی پور ضلع انا ؤ (اودھ) میں پہنچ گئے جہاں ان کا ننہال تھا اور باقی عمر وہیں گزار دی۔

اسی زمانے میں عزیز نے پنج رقعہ فارسی میں لکھا، شعر کہنے شروع کئے اور غالب کو اصلاح کے لئے لکھا۔ غالب نے پنجر قعہ کو پسند کیا اور اصلاح کلام منظور کی۔ اس کے بعد عزیز نے سرور کے فسانۂ عجائب کو فارسی میں نظم کیا اور غالب کے پاس بغرض اصلاح بھیجا۔ غالب نے لکھا کہ فسانۂ عجائب کو اگر میں خود بھی فارسی میں لکھوں تو سرور سے زیادہ دلچسپ نہ ہو گا پھر میری ۶۶ برس کی عمر ہے اتنا کثیر کام (بارہ ہزار اشعار) دیکھنے سے معذور ہوں عزیز نے دوبارہ لکھا کہ اگر آپ نہ دیکھیں گے تو میں کتاب چاک کر ڈالوں گا۔ چنانچہ عزیز نے اپنے پاس کا نسخہ چاک کر ڈالا۔

عزیز فارسی کے شاعر ہیں اور ان کی کل تصانیف نثر و نظم فارسی زبان میں ہیں جن میں سے ارمغان فنون یا اور رسالہ اشعار لاشعار مثنوی اور حالی پسند فرما چکے ہیں۔ اردو کلام کا مجموعہ حاجی محمود علی انصاری نائب ناظم و مجسٹریٹ سدھاول ریاست بھوپال کے اہتمام سے نظم دلفریب کے نام سے چھپ چکا ہے۔ (شباب اردو مارچ ۲۳ء)

عشق۔ رکن الدین نام، عشق تخلص تھا۔ دہلی کے مشہور درویش شاہ فرہاد کے نواسے تھے۔ شروع جوانی میں دہلی سے عظیم آباد گئے۔ جب تک وہاں رہے وہ ینوی اعزاز حاصل رہا۔ وہاں سے عظیم آباد آئے تو فقر و درویشی ساتھ لائے اور توکل کے سوا کوئی سرمایہ پاس نہ

تھا۔ غزل میں تصوف کی چاشنی بھری ہوئی ہے، انداز بیان دل نشین، زبان سلیس اور اثر انداز ہے۔ (جواہر سخن جلد اول ص ۳۱۱)

عیش فیروزپوری ۔ جان محمد خاں نام، عیش تخلص ہے۔ آپ کے بزرگ شہاب الدین غوری کے ساتھ ہندوستان آئے۔ عیش ۱۸۹۳ء میں فیروزپور چھاؤنی میں پیدا ہوئے۔ عیش کو تعلیم و تربیت گھر ہی میں ہوئی۔ بچپن ہی سے شعر کہنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ تقسیم ہند (اگست ۱۹۴۷ء) تک فکر معاش سے بے نیاز رہے۔ صرف و شاعری اور شکار کا شغف تھا۔ ابتدا میں حکیم کوثر ضیر آبادی سے بعد میں مولانا ضامن کی علی لکھنوی سے بھر علامہ نظم طباطبائی سے مشورۂ سخن کیا اور غزل گوئی میں ایک خاص مقام حاصل کیا۔ آپ کی زبان شیریں اور پر کیف، انداز بیان پر زور اور تخیل بلند ہوتا ہے۔ تقسیم کے بعد وہ امیر آباد فیروزپوری میں رہ گیا اب خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ کوئٹہ میں رہتے ہیں۔

عیشی ۔ طالب علی خاں نام، لکھنؤ کے رہنے والے، مصحفی کے شاگرد تھے۔ فارسی میں قتیل سے اصلاح لیتے تھے، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں صاحب دیوان تھے مگر دونوں دیوان نایاب ہیں۔ بعض اردو کتابوں میں بھی ان کی تصنیف سے قطعے مگر [illegible] قتیل۔ بیان میں زور، بندش میں چستی اور خیالات میں رفعت کے باوجود کلام پر تکلف ہے۔ کہیں کہیں مصحفی کا رنگ جھلک جاتا ہے (جواہر سخن)

غافل ۔ منور خاں نام، فخر محمد خاں گویا کے دوست، لکھنؤ کے رہنے والے، مصحفی کے شاگرد تھے [illegible] خوش گو شاعر ہیں ان کا کلام حشو و زوائد سے پاک ہے ان کی زبان میں شیرینی اور طرز بیان میں دل نشینی ہے۔ ان کی شاعری درد سے خالی نہیں مگر انبساطی کیفیت غالب ہے۔ ان کی بعض غزلیں عوام میں مشہور ہیں (جواہر سخن)

غضنفر ۔ غضنفر علی خاں نام، لکھنؤ کے رہنے والے، جرأت کے شاگرد تھے۔ کلام میں صفائی اور روانی ہے۔ محاورہ بندی کا خیال زیادہ ہے۔ واردات عشق کے علاوہ دوسرے مضامین بہت کم نظر آتے ہیں۔ (جواہر سخن دوسری جلد ص ۹۳)

فیض ۔ میر شمس الدین نام، دکن کے رہنے والے، امیر اور فارسی کے فاضل اور صوفی تھے۔ اشعار میں ہندی الفاظ اور محاورات اکثر لاتے ہیں، ہم دہلی کے رنگ میں صاف اور سلیس کہتے ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ کئی دیوان چھپ چکے ہیں۔ ۱۱۹۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۸۲ھ میں وفات پائی۔ (دکن میں اردو۔ جواہر سخن)

منشی محمد الدین فوق ۔ محمد الدین نام، فوق تخلص تھا۔ فروری ۱۸۸۷ء میں موضع کوٹلی ہرزائیں میں پیدا ہوئے جو سیالکوٹ سے جنوب کی جانب دو تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ آبائی وطن کشمیر تھا مگر کاروبار کی وجہ سے گکھڑ ہی میں رہتے تھے۔ آپ ایک کامیاب اخبار نویس، مایۂ ناز مورخ اور نقاد و نظام شاعر تھے۔ شاعری میں پہلے احسان شاہجہان پوری کے، بعد میں داغ کے شاگرد ہوئے۔ اخبار کشمیری کی ادارت کے علاوہ بیشمار کتابیں تصنیف کیں۔ کلام فوق اور نغمہ و نگار انطوں اور غزلوں کے دو مجموعے یادگار ہیں۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو

۱۹۳۵ء میں انتقال ہوا۔

کامل ۔ علی میاں نام، کامل تخلص، محمد آباد ڈھنا ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں قیام کر لیا تھا۔ ان کا خاندان، علم و فضل کے لئے شہرہ و امتیاز ہے۔ لکھنؤ کے شعرا ان کے کمال کا اعتراف کرتے ہیں۔ کلام کا مجموعہ ان کے اعزا کے پاس موجود ہے۔ کامل معمولی مضمون کو بندش کی خوبی اور ترکیب کی چستی سے بہت بلند کر دیتے ہیں۔ تازہ مضامین بھی پیدا کرتے ہیں (جواہر سخن جلد ۴ ص ۱۴۴)

کسریٰ منہاس ۔ نام غلام حسن، تخلص کسریٰ ہے۔ ۱۰ جنوری ۱۹۱۲ء کو راولپنڈی کی ایک قدیم مردم خیز بستی ٹمہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ڈسٹرکٹ بورڈ سکول میں ہوئی۔ ۱۹۲۹ء میں خالصہ مشن ہائی سکول سے (جو اب کامنیہ ہائی سکول کے نام سے مشہور ہے) میٹرک کیا۔ عربی فارسی کی تعلیم اپنے عم بزرگوار میاں فضل الدین منہاس سے حاصل کی۔ ۱۹۳۳ء میں امام الفن فراب فصاحت جنگ بہادر [redacted] سے تلمذ حاصل کیا۔ ان کی عدیم المثالی کے باعث اپنا کلام اعتبار الملک حضرت داغ، شمس العلماء امیر مینائی اور لسان الحق حضرت حقی لکھنوی کی ذات گرامی سے بھی بہت سا فیض حاصل کیا۔ فن تاریخ گوئی کے متعلق بہت سے شکوک ان ہی کی توجہ سے حل ہوئے۔

مطالعہ زندگی کا خاص شغل ہے۔ تاریخ گوئی، فلسفی مباحث اور تنقید کا خاص شوق ہے۔ ہزاروں کتابیں خود خریدیں۔ قدیم طرز اور قلمی نسخے سیکڑوں روپیہ صرف کر کے مختلف مقامات سے حاصل کئے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ بہت بڑا ادبی سرمایہ ہے۔

کلیم ۔ محمد حسین نام، دہلی کے رہنے والے تھے۔ میر تقی سے قرابت تھی، نظم و نثر دونوں پر قدرت رکھتے تھے۔ شاعری کے علاوہ فضل و کمال علمی میں بھی شہرت تھی۔ تبدیل کے طرز کی پیروی کرنے کی وجہ سے کلام صاف اور سلیس نہیں البتہ مضمون کے اعتبار سے بلند ہے۔ خصوص الکلم کا ترجمہ اردو میں کیا، عروض و قافیہ پر ایک رسالہ اردو میں لکھا نثر نگاری میں بھی ایک کتاب یادگار چھوڑی (جواہر معدن، نکات الشعراء، مخزن نکات، تذکرہ میر حسن، سخن شعرا)

کوثر نیازی ۔ محمد حیات خاں نام، کوثر تخلص نیازی قبیلے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے نیازی کہلاتے ہیں۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۴ء کو کوٹ نیل ضلع میانوالی میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کئے۔ ابھی عربی اور انگریزی کی تحصیل جاری ہے۔ دو سال تک سرور کو ثر لاہور کی ادارت کرتے رہے ہیں۔ گذشتہ پانچ سال سے ماہنامہ تعمیر انسانیت لاہور اور دو سال سے روزنامہ تسلیم لاہور کے عملہ ادارت سے وابستہ ہیں۔ نظم و نثر پر یکساں قدرت ہے۔ کلام کا ایک مجموعہ زد گل کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا مجموعہ دجیل کے نام سے زیر ترتیب ہے۔ آپ کی غزلوں میں انداز مسرت کا اور جذبات محبت کے ہوتے ہیں۔

کیفی حیدرآبادی ۔ سید رضی الدین حسن نام، کیفی تخلص، حیدرآباد دکن کے رہنے والے اور داغ کے شاگرد تھے۔ ان کی

طبیعت ایک نغمہ اطمینان تھی، کبھی دو غزلے اور سہ غزلے کہہ ڈالتے تھے۔ الفاظ لونڈی غلام بن کر ہاتھ باندھے چلے آتے تھے۔ گو غزلوں میں مضامین کی شیرینی زیادہ ہوتی تھی گویا بعض داغ کے طرز تحریر کا تتبع ہوتا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے کلام کا مجموعہ کلام کہنی کے نام سے ۱۹۳۸ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا تھا۔

قبول ۔ مرزا مہدی علی خاں نام، مقبول الدولہ خطاب، محمد مرزا کے بیٹے، وطن لکھنؤ تھا۔ واجد علی شاہ کے مصاحب اور قوپ خانہ کے داروغہ تھے۔ شاہ اودھ کے ساتھ کلکتہ کا سفر بھی کیا۔ تاریخ کے شاگردوں میں صاحب دیوان تھے۔ کتاب "شمیر ثانی" کا ترجمہ بھی اردو نظم میں کیا ہے۔ ۱۸۷۶ء میں وفات پائی لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ اشعار میں صفائی اور گداز ہے۔

گرفتار ۔ سنگی بیگ نام، قوم کے مغل، فوج میں ملازم، حاتم کے شاگرد تھے۔ کلام میں تغزل کی شان ہے۔ زبان بھی صاف اور سلیس ہوتی ہے۔ (جواہر سخن جلد اول ص ۴۰۵، مجموعہ نغز، قدرت اللہ قاسم مرتبہ محمود شیرانی)

لطف ۔ مرزا علی نام اور لطف تخلص تھا کاظم بیگ کے فرزند اور اسٹرآباد (ایران) کے رہنے والے تھے مرزا کاظم بیگ نادر شاہ کے ساتھ ہندستان آئے اور دربار میں داخل ہو گئے، فارسی کے اچھے شاعر تھے۔

لطف نے تھوڑے ہی عرصہ میں اردو سیکھ کر استادوں میں قدم رکھا اور غزلیں کہیں۔ انہوں نے اکثر ترکیب اور مضمون فارسی سے لے کر اردو کا رنگ دیا۔ دیوان لطف میں سلاست کے ساتھ ساتھ جذبات تغزل کا اظہار بھی ہے اور زبان و محاورہ کا لطف بھی تذکرہ گلشن ہند نہایت تحقیق سے لکھا ہے (جواہر سخن جلد اول ص ۳۴۴، گل رعنا، دیوان لطف)

لطیف انور گورداسپوری لطیف انور نام، انور تخلص، وطن گورداسپور ہے۔ تعلیم و تربیت سرحد میں ہوئی جہاں ان کے والد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ اسلامیہ کالج میں کچھ عرصہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد گورداسپور میں مقیم ہو گئے۔ جہاں سے اگست ۱۹۴۷ء میں آپ نے ماہنامہ پاسبان جاری کیا جو سرمایہ کی کمی کے باعث بند ہو گیا۔ تقسیم کے بعد لاہور چلے آئے۔ پہلے لاہور ریڈیو اسٹیشن پر پچوں کا پروگرام مرتب کرنے پر مامور تھے۔ اب اخبار نویسی کرتے ہیں۔ نظم کم اور غزلیں زیادہ کہتے ہیں۔ آپ کے رنگ تغزل میں میر اور فانی بدایونی کی سی جھلک پائی جاتی ہے۔ زبان بامحاورہ گو بہت سادہ اور سلیس استعمال کرتے ہیں۔ شعر یوں کہتے ہیں جیسے باتیں کرتے ہیں۔ باتیں بھی ایسی جنہیں ہم گویا بھول گئے تھے اور اب وہ ہمیں یاد کرا رہے ہیں۔

مائل ۔ میر محمدی نام، دہلی کے رہنے والے تھے۔ غزل گوئی میں ایک خاص انداز کے مالک تھے۔ قدرت اللہ قدرت سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ (جواہر سخن جلد اول ص ۳۲۴)

مدہوش ۔ سنت پشاور نام ، مدہوش تخلص قوم کے کائستھ ہیں ۱۹۰۶ء میں بمقام بانڈہ (یوپی) پیدا ہوئے ۔ بی اے الہ آباد اور ایم اے آگرہ یونیورسٹی سے پاس کیا ۱۹۳۸ء میں اقتصادیات کے لکچرار مقرر ہوئے اور ۱۹۴۶ء میں ادھاسوامی منگت کے سیکرٹری ۔ بعد میں ڈیال باغ انٹرمیڈیٹ کالج اور پریم دویالہ ڈگری کالج میں اقتصادیات کے شعبہ کے صدر بنائے گئے ۔ مدہوش کو فلسفہ اور دینیات سے غیر معمولی لگاؤ ہے ۔ عربی میں استعداد حاصل کی کہ قرآن شریف پڑھ سکیں ، سنسکرت میں عبور حاصل کیا کہ ویداد گیتا کا مطالعہ کر سکیں ۔ فارسی میں دستگاہ رکھتے ہیں اور شروع مولانا روم پڑھنے کا شوق سے پڑھتے ہیں ۔ تصوف سے آپ کو اتنا شغف ہے کہ ہر وقت تاک ، کبیر ، سرمد ، حافظ ، اور مولانا روم کا کلام آپ کے زیر مطالعہ رہتا ہے ۔ اسی تحقیق اور مطالعہ کی برکت ہے کہ آپ کے کلام میں انسانیت اور روحانیت بھری ہوتی ہے ۔ مدہوش کی شاعری کا انداز محض عاشقانہ نہیں بلکہ والہانہ ہوتا ہے ۔ ان کے کلام میں وہ سب خصوصیات موجود ہیں ۔ جنہیں بقول فراق گورکھپوری ، شستگی اور گداز کہتے ہیں ۔ (دور جدید کے چند منتخب ہندو شعراء ص ۱۵۲ - ۱۵۱)

پیر مراد شاہ ۔ پیر مراد شاہ سادات قریش کے ایک واجب التعظیم بزرگ تھے ۔ آپ کے مشہور اسلاف میں سے ایک تو حضرت شیخ ابوالحسن ہکاری (متوفی یکم محرم ۶۳۳ھ / ۱۰۳۴ء) تھے جو حضرت سید عبدالقادر جیلانی کے دادا پیر تھے ۔ دوسرے سلطان التارکین شیخ حمیدالدین حاکم والیٔ ناگور جنہوں نے سلطنت چھوڑ کر ۶۰۹ھ / ۱۲۱۲ء میں فقر اختیار کیا اور ۹۲ برس کے سن میں ۶۹۳ھ / ۱۲۹۳ء میں واصل بحق ہوئے ۔ مزار آپ کا قلعہ مبارک ریاست بہاول پور میں ہے ۔ تیسرے بزرگ قطب العالم حضرت عبدالجلیل چوہڑ شاہ بندگی داتا سلطان بھلول لودھی تھے جو مبارک سے ۸۸۰ھ / ۱۴۷۵ء میں لاہور آئے اور ۹۱۰ھ / ۱۵۰۴ء میں فوت ہوئے ۔ ان کی خانقاہ میکلوڈ روڈ پر واقع ہے ۔ ان کے پوتے عبدالجلیل ثانی بن ابوالفتح ثانی کی پشت میں مراد شاہ ۱۱۸۹ھ / ۱۷۷۵ء میں بمقام لاہور پیدا ہوئے ۔ جب آپ کی عمر ۱۳ برس کی ہوئی تو آپ کے والد پیر کرم شاہ عرف میستا شاہ ۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۷ء میں پنجاب کی بدنظمی سے تنگ آکر اپنے خسر شیخ نورالحسن عقیلی الہاشمی سے ملنے لکھنؤ گئے ۔ مراد شاہ نے نامہ مراد (۱۲۰۳ھ) میں اور ان کے چھوٹے بھائی پیر فرخ بخش (متوفی ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء) نے اذکار قلندری میں اس سفر کی تفصیل بیان کی ہے ۔ کچھ عرصہ کی اقامت کے بعد ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۵ء میں یہ قافلہ لاہور واپس آرہا تھا کہ شاہجہان پور کے قریب قزاقوں نے پیر کرم شاہ کو شہید کر دیا ۔ وہاں سے مراد شاہ بانس بریلی پہنچے اور راجہ صورت سنگھ دیوان مرزا امانی لکھنوی کے پاس چھ سال مقیم رہے ۔ یہیں آپ نے مولوی بدرالدین رسکی کے ہاتھ پر بیعت کی اور شاعری میں شاہ اجمل کے ساتھ زانوئے ادب تہ کیا ۱۲۰۶ھ کے بعد آپ لاہور چلے آئے ۔ یہیں آپ نے ۲۸ برس کے سن میں نامہ یاراں لکھی اور یہیں رمضان ۱۲۱۲ھ میں میرامن سے پانچ سال قبل قصہ چہار درویش اردو نظم میں لکھنا شروع کیا مگر مکمل نہ ہوا تھا کہ ۳۰ مئی ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء کو بہتر تیس سال اپنے مریدوں کے گاؤں موضع تھیٹھوپورہ میں انتقال کیا ۔

مراد شاہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے لفظ اردو کو زبان کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور یہ بات کم از کم اہل پنجاب کے لئے باعث فخر ہے کہ اس کے ایک بزرگ نے اردو زبان کی خدمت کی اور ہندوستان میں رہ کر اس کو صاف کیا ۔ پیر غلام دستگیر تاثیر نے دیوان مراد انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ اردو بابت جولائی ۱۹۴۷ء میں چھپوا دیا ہے ۔

محسن ۔ محمد محسن نام ، خاں آرزو کے بھانجے اور میر تقی میر کے شاگرد تھے ۔ یہ قوی قائم نوجوانی ہی سے شعر و شاعری کی طرف مائل تھے ۔

محمود عالم رضا ۔ ضلع پٹنہ میں بیرا ایک بستی ہے، وہیں کے رہنے والے ہیں جذبۂ نوح ناروی کے شاگردوں میں رنگین طبیعت، دردمند دل اور شاعرانہ انداز پایا ہے۔ لکھتے بھی خوب ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں ترنم پسند شعراء میں بہت مقبول ہیں۔ شاعری کی ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن غزل میں آپ کا ممتاز رنگ ہے۔ نکہت گل اور رنگ نگار و فجستہ آپ کے شائع ہو چکے ہیں۔

مخمور ۔ محمد جعفر نام، لکھنؤ کے رہنے والے، صفی کے شاگرد تھے۔ ان کے کلام کی سب سے نمایاں خوبی ان کی زبان کی صفائی اور روانی ہے۔ ان کے یہاں ایسے الفاظ بہت کم ملتے ہیں جو بول چال میں متروک ہو گئے (جواہر سخن)

مسرور ۔ شیخ میر بخش نام، کانوری ضلع لکھنؤ کے رہنے والے، شیخ تصفی کے شاگرد تھے۔ دہلی کی سیاحت بھی کی تھی غزل کا رنگ اچھا ہے۔ بلند مضامین پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مضمون آفرینی میں تصفی کا انداز اختیار کیا ہے۔ حتی الوسع کوئی لفظ بیکار نہیں لاتے۔ زبان شستہ، ترکیب صاف اور بندش چست ہوتی ہے۔ بے ساختگی سے معلوم ہوتا ہے کہ دل چوٹ کھایا ہوا ہے۔

ممتاز ۔ حافظ فضل نام، سودا کے شاگرد تھے۔ دلی دہلی تھا مگر لکھنؤ میں قیام کر لیا تھا۔
ممتاز کی زبان میں صفائی اور روانی، بیان میں دردو اثر اور تشبیہات و تمثیلات میں جدت و ندرت ہے (جواہر سخن)

مجذوب ۔ مرزا غلام حیدر نام، دہلی کے رہنے والے، مرزا رفیع سودا کے قریبی اور شاگرد ہیں۔ خود کہتے ہیں ؎

بد کہنے کو کسی کے محبوب جانتے ہیں ۔ اپنے تئیں کو یارو ہم خوب جانتے ہیں
خاطر میں کون لاوے میر احسن کہ مجھ کو ۔ سودا کا بھانجا کو مجذوب جانتے ہیں

مجذوب کی غزل میں بھی سودا کا رنگ نمایاں ہے "صفائی میں سودا سے زیادہ، درد اور گداز میں کم ہیں" (جواہر سخن)

ماہر ۔ فخر الدین خاں نام، آبا و اجداد دہلی کے رہنے والے تھے مگر ماہر نے لکھنؤ میں قیام کر لیا تھا۔ اشرف علی خاں کے بیٹے اور سودا کے شاگرد تھے۔ (جواہر سخن)

ماہ ۔ مرزا عنایت علی بیگ نام، حاتم علی مہر کے چھوٹے بھائی اور خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ کی سکونت ترک کر کے اکبر آباد میں قیام کر لیا تھا۔ کلام میں معنی کی خوبی پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مضامین بلند اور پر کیف ہوتے ہیں اکثر اشعار کی گرمی میں آتش کا شعلہ موجود ہے۔

مفتی ۔ مرزا مہتاب بیگ نام، لکھنؤ کے رہنے والے، آتش کے شاگرد تھے۔ غدر کے بعد باندہ چلے گئے۔ نواب باندہ

سے بیٹ خاص مصاحبوں میں شامل کر لیا۔ پیچ دیوان غدر کی افراتفری میں ضائع ہو گیا۔ باقی میں جب دوسرا دیوان تکمیل کے قریب پہنچا تو وہاں کا بندوبست ہو گیا اور دوسرا دیوان بھی غدر کی بھینٹ چڑھ گیا۔ آخری عمر میں حیدرآباد چلے گئے۔ نواب میر خورشید علی خان نظام کے جانشین نے اپنے میں بھرتی ہونا مشورہ کیا۔ حیدرآباد کے قیام میں جو دیوان مرتب ہوا کارستان فصاحت کے نام سے شائع ہوا۔ غالباً ۱۸۶۱ء سے پہلے وفات پائی۔ سنہ وفات کا صحیح علم نہیں ہو سکا۔

منظور ۔ چودھری منظور احمد ضلع لائلپور پنجاب میں ۔ وہ وسط پنجاب کے ایک ممتاز گھرانے میں نومبر ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا چودھری حیات محمد مزید آباد میں آنریری مجسٹریٹ اور زمیندار تھے۔ آپ کے والد چودھری سلطان علی اور چچا خان بہادر چودھری نادر خان ریٹائرڈ پی سی ایس پنجاب کے زمیندار طبقہ میں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ منظور صاحب بی اے ایل ایل بی کی ڈگریاں پاتے ہوئے فائل پور میونسپل بورڈ کے سیکرٹری ہیں۔ ان کے دماغ میں شعریت بدرجہ اتم موجود ہے۔ تخیل بلند اور ہمہ گیر ہے۔ ان کے جذبات داخلیت کی رو میں اور احساسات خارجیت کی جان ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ دیر و حرم کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

منیر نیازی ۔ محمد منیر خان نام ہے۔ نیازی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۹ اپریل ۱۹۲۸ء کو ہوشیارپور کے نواح میں پیدا ہوئے ایک پٹھان بستی میں پلے بڑھے۔ تعلیم بی اے تک امرتسر کالج سرینگر (کشمیر) میں حاصل کی۔ نظموں اور غزلوں کا ایک مجموعہ "تیز ہوا اور تنہا پھول" چھپ چکا ہے۔ دوسرا مجموعہ زیر طبع ہیں۔ آج کل لاہور میں نظمیں لکھ رہے ہیں۔

بشیر منذر ۔ یکم جنوری ۱۹۲۵ء کو ضلع گجرات کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ چوتھی جماعت ہی میں شعر گنگنانا شروع کر دیئے تھے۔ آٹھویں جماعت میں وظیفہ حاصل کیا اور پہلی مکمل نظم بھی کہی۔ نویں جماعت میں ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کے امتحان میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ابتدائی زندگی مصائب کا مقابلہ کرتے گزری۔ حالات کی نامساعدت کی وجہ سے بی اے کے امتحان نہ دے سکے۔ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد (میٹرک) ٹائی سکول گجرات میں مدرس ہو گئے۔ بعد میں کچھ عرصہ گجرات کے ہفت روزہ "محب کسان" کی ادارت کی۔ جون ۱۹۴۸ء سے ایک سرکاری محکمے سے منسلک ہیں۔ شاعری میں نظمیں، غزلیں اور گیت بھی کہتے ہیں۔ نثر میں ایک ناول "عالیہ" لکھا ہے۔

نصرت ۔ نصرت تخلص تھا۔ جرأت کے شاگرد تھے۔ لفظی لحاظ سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کی طبیعت کا میلان سلاست اور محاورہ کی طرف معلوم ہوتا ہے (جواہر حسن)

ناظم لکھنوی ۔ میر ناظر حسین ناظم لکھنوی سادات بارہ کے مشہور بادشاہ گر خاندان کی یادگار تھے۔ بڑے خوش وضع، خوش گو اور خوش باش شاعر تھے۔ وہ مرثیہ میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے۔ اور اس فن میں انہیں میر انیس کے بڑے بیٹے میر خورشید علی نفیس سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ تاہم نے وطن کو خیرباد کہہ کر لاہور میں صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ پہلے کوہ نور کی ادارت کی۔ پھر اپنا ہفتہ وار اخبار ناظم ہند جاری کیا اور لاہور کے شاعروں میں خوب دھاک بٹھائی۔ ابتدا میں غزلیں بہت اچھی کہتے تھے لیکن آخری عمر میں صرف مرثیہ کے ہو گئے تھے۔ ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو لاہور ہی میں وفات پائی۔

نظیر ردھیانوی ۔ اصغر حسین خاں نام، نظیر تخلص، وطن ردھیانہ، منشی محمد نجیب خاں نشاط کے فرزند ہیں جو اردو فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ نظیر ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے شعر و شاعری کا مشغلہ شروع ہو گیا۔ ۱۹۲۰ء میں محکمہ ڈاک و تار میں ملازم ہو کر ایبٹ آباد دفتر میں متعین ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد سرکاری ملازمت اختیار کر کے ڈاکخانہ کھول دیا۔ پھر ریاست فرید کوٹ میں ملازمت کی۔ ۱۹۴۷ء میں ملازمت چھوڑ کر پھر ردھیانہ آ گئے۔ اس دوران میں ماہنامہ پاسبان گوناپور، ماہنامہ سچ اور ماہنامہ ادیب ردھیانہ کی ادارت بھی کی۔ ۱۹۴۸ء میں ریاست ساہ کا محمود تخلص نشاط کے نام سے بھی شائع کیا جاتا رہا۔ کر پھر اخبار زمیندار سے منسلک ہوئے۔ پھر نوائے وقت سے وابستہ ہو گئے۔ پاکستان کے قیام کے بعد روزنامہ شہباز کے ادارے سے منسلک ہو کر پشاور چلے گئے۔ وہیں سے ہفت روزہ تنویر بھی جاری کیا۔ آغاز ۱۹۵۰ء میں پھر لاہور واپس آ گئے اور اب روزنامہ امروز کے عملہ ادارت میں ہیں۔ آپ کے کلام پر علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر، اکبر الہ آبادی اور مولانا ظفر علی خاں کا رنگ غالب ہے۔

نور ۔ میر دین علی نام، نور تخلص، میر بادشاہ لکھنوی کپتان فیروز پور کے بیٹے، فتح پور میں دیوانی کے سررشتہ دار تھے۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں امین ہوئے۔ ان کے والد اپنے زمانے کے مشہور مرثیہ گو تھے۔ نور کو ابتدا ہی سے شعر و سخن کا ذوق تھا۔ شیخ امام بخش ناسخ نے نور تخلص تجویز کر کے اپنے شاگرد میر زا محمد رضا برق کے سپرد کیا ان کا دیوان "ضیائے نور" کے نام سے ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء میں چھپ چکا ہے۔ تغزل میں ناسخ کا رنگ ہے۔ روایت لفظی کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ (جواہر سخن جلد ۴ ص ۸۹ سخن شعرا)

حکیم نیر واسطی ۔ سید علی احمد نام، نیر تخلص ہے۔ ۱۹۰۰ء میں ضلع بجنور کے قصبہ نجھٹو کے حاسلی خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید مظفر حسین مجسٹریٹ ضلع بجنور کے ممتاز پلیڈر تھے۔ ابتدا میں فارسی اور عربی کی تعلیم مولینا امتیاز حسین اور مولانا حامد حسن گنگوہی سے حاصل کی اور طب کی چند کتابیں حکیم کفایت اللہ سے پڑھیں۔ پھر کیمل علوم کے لئے دہلی اور لکھنؤ کا سفر اختیار کیا۔ دہلی میں یونانی طبی کالج حکیم اجمل خاں کے قائم کردہ سے فارغ ہونے کے بعد لکھنؤ کے کنگ میڈیکل کالج سے سند فراغت حاصل کی۔ نیر حکیم مظفر حسین۔ حکیم مفتی آغا صاحب حکیم محمد تقی اور خلاصۃ الملک حکیم عبدالمجید کی شاگردی اختیار کر کے عملی تجارب حاصل کئے۔ ۱۹۳۲ء کے اواخر میں لاہور آ کر اپنے مطب کا آغاز کیا جو تھوڑے عرصہ میں مرجع خلائق بن گیا۔ اور اس وقت سے اب تک آپ طبی اداروں اور طبی سیاسیات میں بہت اونچا اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ طبی تحقیقات کے سلسلے میں آپ ایران ترکی انگلستان وغیرہ کی سیاحت بھی کر چکے ہیں اور طب عرب اور ترکی نظام طب کی تاریخ پر دو کتابیں بھی شائع کر چکے ہیں۔

شعر و سخن کا شوق آپ کو بچپن ہی سے ہے۔ شاعری کی ابتدا میں سید نقی حیدر سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد دہلی پہنچ کر نواب سائل۔ مولانا وحید الدین بجنوری اور میر ناصر قدیر فراقی کی صحبتوں سے اکتساب فیض کیا۔ جب لکھنؤ پہنچے تو حضرت عزیز لکھنوی اور صفدر مرزا پوری کی علمی مجلسوں سے فائدہ اٹھایا۔

تیس سال گذرے آپ کی ایک کتاب میکدہ کے نام سے شائع ہوئی تھی جو آپ کی نظموں کا ابتدائی مجموعہ تھا۔ چند سال ہوئے آپ نے ایک کتاب اختر و نظمی لکھی تھی جو اختر شیرانی کی حیات معاشقہ سے متعلق تھی۔ اب آپ کا مجموعہ کلام شعر و حکمت کے نام سے شائع ہوا ہے۔

آپ اردو۔ فارسی۔ عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔

نیرنگ ۔ میر غلام بھیک نیرنگ دورانہ ضلع انبالہ کے رہنے والے اور دارغ کے شاگرد تھے۔ تعلیم گورنمنٹ کالج لاہور سے حاصل کی۔ آپ بہت اچھے ادیب اور شاعر تھے۔ غزل، نظم، مضمون، تقریر ہر فن کے ماہر تھے۔ آپ کا شمار پنجاب اسکول کے اس گروہ سے ہوتا ہے جو مولانا حالی کے بعد سرسید سے متاثر ہوا اور جس نے شاعری میں زندگی کے مسائل داخل کئے۔ کلام نیرنگ (۱۹۰۷ء) اور خیالات (۱۹۱۰ء) ان کی یادگار ہیں۔ آخری عمر میں آپ نے شعر گوئی چھوڑ کر قومی کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ پاکستان کے قیام کے بعد کراچی چلے آئے پاک دستور دیہ کے رکن تھے۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو لاہور میں فوت ہو کر وہیں دفن ہوئے۔

واصلی ۔ سید فضل رسول خاں نام، سندیلہ کے رئیس تھے اور حضرت امام زین العابدین کی اولاد سے تھے۔ ان کے مورث میر طاؤالدین واصلی نے علاؤالدین کے عہد میں سندیلہ فتح کیا وہاں حکومت اختیار کی تھی۔ فضل رسول ۱۹ جمادی الاول ۱۲۲۶ھ میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے گھر میں ہوئی۔ عربی مشہد علامت پڑھی۔ علم طب اپنے والد سید عبدالغفور سے پڑھا شاعری میں امیر کے شاگرد تھے ان کے کلام کا مجموعہ دیوان کی صورت میں جمع ہوا۔ کتاب تہیل المعلومات کے ہنگامے میں ضائع ہو گئی۔ اخلاقی اشعار غزل سے بہتر ہیں۔ الفاظ کا اہتمام زیادہ معانی کا لحاظ کم ہے۔

وسیم خیرآبادی ۔ سید محمد عسکری نام، وسیم تخلص خیرآباد کے رہنے والے امیر مینائی کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔ مادہ تاریخ کی ایک جلد کی ترتیب انہی نے کی ہے۔ مدت تک ہمارا جوتپور کے درباری شعرا میں شامل رہے تحقیق و صحت الفاظ کا ان کو بہت شوق ہے۔ رسالہ گلچیں آپ کی ادارت میں عرصہ دراز تک شائع ہوتا رہا۔ تغزل کا رنگ ریاض خیرآبادی سے ملتا ہے تاریخ گوئی میں بھی کمال حاصل ہے۔ (آب بقا)

وفا ۔ نول رائے نام تھا، خوش گو، زبان اور خوش اوقات تھے۔ بعضوں کے قول کے مطابق خواجہ حسن کے معاصر تھے۔ کلام میں قدرت اور مہارت کا رنگ ہے اس کے ساتھ ضروریات غزل بھی ہیں۔ سلاست اور روانی بھی ہے، طرز بیان میں خوبی بھی ہے لیکن اثر کم ہے (جواہر حسن جلد اول ص ۳۸۲ محزن نکات)

وفا ۔ پنڈت بھلا رام سیالکوٹ کے موضع ویہوکے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا بچپن گھر کے ڈھور ڈنگر چرانے میں گزرا۔ دیہاتی سکول کی پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے کہ شعر موزوں کرنے لگے۔ سکول کی تعلیم ختم کر کے کالج میں آئے یہاں آپ کی شاعری نے اور ترقی کی۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد اخبار نویسی شروع کی۔ لاہور کے کئی اخباروں کے ایڈیٹر رہے۔ وقتاً فوقتاً اپنے اخبار بھی نکالے جو چل نہ سکے پاکستان کے قیام کے بعد آپ ہجرت چلے گئے۔

آپ نظم بھی کہتے ہیں اور غزل بھی۔ زبان نہایت شستہ، پاکیزہ اور روزمرہ استعمال کرتے ہیں۔

دلی ۔ سید شاہ ولی الرحمٰن نام، دلی تخلص ہے۔ ڈپٹی کلکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ بہاری شعرا میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں فارسی پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ اردو کے بھی بلند پایہ ادیب اور شاعر ہیں۔ آپ ضلع گیا کی ایک بستی کاکو کے رہنے والے ہیں۔ نظم اور غزل دونوں اصناف پر قادر ہیں۔

ہادی علی شہری ۔ ہادی علی شہری علی گڑھ کے فارغ التحصیل اور اردو فارسی نظم و نثر کے ایک ممتاز ادیب اور نہایت ہی پُرگو ادیب ہیں۔ طبیعت بحر بیکراں ہے۔ ولایت کرتے ہیں۔

ہوش ۔ نیاز احمد خاں نام، نواب خطاب تھا۔ بریلی کے رہنے والے تھے۔ عرصے تک لکھنؤ میں رہے، وہاں طب اور شاعری دونوں کی مشق ساتھ ساتھ جاری رکھی۔ معقولات اور منقولات کی تعلیم مشہور اساتذہ سے حاصل کی۔ فن شاعری میں حکیم محمد محسن علی خاں ہوش بریلوی سے استفادہ کیا۔ آخر میں امیر کے شاگرد ہوئے۔ ۵۵ سال کی عمر میں ۱۲۹۵ھ میں وفات پائی۔ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ کلام مرصع اور سلیس ہے۔ لیکن قصیدوں کے مقابلے میں غزلیں زیادہ کامیاب نہیں۔

یکرنگ ۔ مصطفےٰ قلی خاں نام تھا، خان جہاں لودھی کے نواسے اور بہلسد ملازمت شاہی میں وابستہ تھے۔ شعر میں آمد کا رنگ غالب ہے، تغزل میں سوز و گداز موجود ہے۔ اکثر اشعار سلیس اور صاف ہیں، بعض تذکرہ نگاروں نے شاہ آبرو کا اور بعض نے آرزو کا شاگرد لکھا ہے۔ بعض ظہیر کا شاگرد بتاتے ہیں۔ (جواہر سخن، مخزن نکات، نکات الشعرا، چمنستان شعرا، گلشن ہند)

مائدہ پیشکش

خالدؓ

حضرت خالد بن ولید کے جہاد بھرے کارناموں سے کون واقف نہیں۔ مگر اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ اس سپہ سالار کی شخصیت میں پیشتر انسانی کے کیا کیا عناصر تھے ذاتی کردار کیا تھا اور اس نے اپنی جنگی مہمات پر کیا اثر ڈالا۔ یہ کتاب عربی کے مشہور شخصیت نگار عباس محمود العقاد کی لکھی ہوئی ہے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے اردو ادب میں پہلی پیش کش ہے۔

قیمت فی جلد -/۱/۴

عرب کے تین مدبر

اسلام نے کئی صاحب تدبیر شخصیتیں پیدا کیں، مگر مغیرہ بن شعبہ، زیاد بن ابیہ، عمرو بن العاص ایسے مدبر اسلام کی پوری تاریخ میں کم ملیں گے۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ کیسے کیسے کٹھن موقعوں پر ان صاحبان تدبیر نے وقت کی نبضوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ عمر ابو النصر کی تصنیف ہے جس کے قلم کا لوہا اُردو دان طبقہ بھی مان چکا ہے۔

قیمت -/۱/۳

بھابی

"مجھے میرا بھائی ملی گئی میرا بھائی"۔ یہ کہاوت تو نہ جانے کب سے سننے میں آرہی ہے۔ مگر ناول بھابی کے ہیرو نے اس کو واقعہ کر دکھایا ہے کہ جب کبھی ملے ایک نئی خاتون کے ساتھ ملے اور ہر مرتبہ اس خاتون سے یہی کہہ کر تعارف کرایا کہ "ان سے ملئے یہ آپ کی بھابی ہیں"۔ ایسا بارخو بہار کردار اور شوکت تھانوی کا شگفتہ انداز بیان بس مزا آگیا۔

قیمت -/۸/۴

نیلوفر

شوکت تھانوی کا یہ ناول ہر جگہ مقبول ہو رہا ہے۔ اگر آپ نے ابھی تک اسے نہیں پڑھا تو آپ مزاحیہ ادب کی ایک نادر کتاب کے مطالعہ سے محروم ہیں۔

قیمت -/۱/۴

خدیجہؓ

اسلامی تاریخ کے نکھرے ہوئے ام المومنین حضرت خدیجہؓ کا بڑا ہالہ ہے۔ یہ کتاب اس پاکباز خاتون پیشوا خاتون کے حالات زندگی پر مشتمل ہے عبدالحمید الزہرادی کی اس کتاب کا مطالعہ ہدایت کا موجب ہوگا

قیمت -/۱/۴

نمک مرچ

شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہر مضمون جان ظرافت ہے۔

قیمت -/۱/۲

باغ و بہار

عبدالحمید عدم کے تازہ ترین قطعات کا مجموعہ

قیمت -/۱/۲

ادارہ فروغ اُردو، لاہور

ہماری کتابیں

نیلوفر	شوکت تھانوی	-/۶	نبی اتی	عمر ابوالنصر	-/۵
مولانا	"	۲/۸	خلفائے محمد	"	-/۱۰
غزالہ	"	-/۶	شعلۂ طور	جگر مراد آبادی	۷/۸
خدا خواستہ	"	۲/-	امراؤ جان ادا	رسوا	۴/-
سودیشی ریل	"	۲/-	غدشو	ابوسعید قریشی	۴/۴
کتبا	"	۲/۸	قول و قرار	عدم	۲/۸
سانچ کو آنچ	"	۲/۸	پیچ و خم	"	۲/-
مسسال	"	۲/۴	سرکنڈوں کے پیچھے	منٹو	۳/-
کارٹون	"	۲/۸	آنچل	احمد ندیم قاسمی	۳/-
مابدولت	"	۲/۸	بازار حیات	"	۳/-
بقراط	"	۲/۸	نقوش لطیف	"	۶/-
جورٹوڑ	"	۴/-	عزیزم کے نام	ڈاکٹر تاثیر	۲/۸
مضامین شوکت	"	۲/۸	بدیضا	عابد علی عابد	۵/-
قاضی جی (نئی جلد)	"	۱۰/۸	سیاست الہیہ	امام ابن تیمیہ	۲/۸
غالب کے ڈرامے	"	۲/۸	مضامین جمال الدین افغانی		۴/-
دخیرہ و دخیرہ	"	۳/-	پندرہ اگست	رشید اختر ندوی	۲/۴
بھائی	"	۴/۸	صاحب	محمد طفیل	۳/-
روزن	قتیل شفائی	۳/-	انتقاد	عابد علی عابد	۳/-

ادارہ فروغ اردو، لاہور

نقوش

غزل نمبر

ادارۂ فروغِ اُردو۔ لاہور کی وہ پیش قیمت پیش کش تھی، جسے ادبی حلقوں نے وقت کی سب سے بڑی ادبی خدمت قرار دیا۔ اب یہی ادارہ شعرائے اُردو کی غزلوں کے بہترین انتخابات کئی جلدوں میں شائع کر رہا ہے، جن کی اہمیت، افادیت اور قدر و قیمت کے لیے صرف اتنا کہہ دینا غالباً کافی ہے کہ وہ ادارۂ فروغِ اُردو۔ لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہو رہے ہیں۔ یہ انتخابات آپ پر شعرائے سلف کے متغزلانہ کمالات ہی واضح نہیں کریں گے، بلکہ نصف صدی پہلے تک کی غزل کے تمام ارتقائی مدارج اور موڑ بھی آپ کے سامنے آئینہ کر دیں گے۔

شائع ہونے والے انتخابات یہ ہیں

(۱) انتخاب میر	(۲) انتخاب سودا	(۳) انتخاب درد	(۴) انتخاب میر حسن
(۵) انتخاب جرأت	(۶) انتخاب مصحفی	(۷) انتخاب غالب	(۸) انتخاب مومن
(۹) انتخاب ذوق	(۱۰) انتخاب آتش	(۱۱) انتخاب امیر	(۱۲) انتخاب داغ
(۱۳) انتخاب نظیر	(۱۴) انتخاب عالی	(۱۵) انتخاب شیفتہ	(۱۶) دہلی اسکول

(۱۷) لکھنؤ اسکول

اور ابھی

صحت کے علاوہ، فنِ طباعت کی بھی تمام تر خوبیوں کے ساتھ پیش کیا جائیگا

اگر آپ

ہم ہمارے ہاں درج کرا دیں گے، تو جیسے جیسے انتخابات چھپتے جائیں گے۔ آپکو ملتے رہیں گے۔

ادارۂ فروغِ اُردو، لاہور